

پیشانی حضرت مولانا محمد رفیع الدین صاحب

فتاویٰ حکیمانی

جلد سوم

پیشانی مولانا محمد رفیع الدین صاحب

ترجمہ و تفسیر
مولانا محمد رفیع الدین صاحب

پیشانی مولانا محمد رفیع الدین صاحب

پینتالیس سالہ خود نوشتہ فتاویٰ کا مجموعہ

فتاویٰ عشمانی

جلد سوم

کتاب الشَّرْکَةِ وَالْمُضَارَبَةِ کتاب البیوع کتاب الربا والقمار والتأمين کتاب الإجازة کتاب الرهن کتاب الهبة
کتاب الودیعة والعارية کتاب للقطه کتاب الغضب والضمان کتاب الجهاد کتاب الامارة والسیاسة
کتاب الدعوى والشهادات والقضاء کتاب الحدود کتاب الجنایات کتاب الصلح کتاب الوكالة کتاب القسم

حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب

ترتیب و تخریج

مولانا محمد رفیع الحق نواز

استاذ جامعہ دارالعلوم کراچی

مکتبہ معارف القرآن کراچی

(Quranic Studies Publishers)

اجمالی فہرست

۳۳ کتاب الشركة والمضاربة
۷۵ کتاب البيوع
۲۶۵ کتاب الربا والقمار والتأمين
۳۵۹ کتاب الاجارة
۴۱۷ کتاب الرهن
۴۳۷ کتاب الهبة
۴۷۱ کتاب الوديعة والعارية
۴۷۳ کتاب اللقطة
۴۷۵ کتاب الغصب والضمان
۴۸۱ کتاب الجهاد
۵۰۱ کتاب الامارة والسياسة
۵۲۱ کتاب الدعوى والشهادات والقضاء
۵۳۵ کتاب الحدود
۵۶۱ کتاب الجنایات
۵۶۴ کتاب الصلح
۵۶۶ کتاب الوكالة
۵۶۸ کتاب القسمة

صفحہ نمبر	فہرست موضوعات فتاویٰ عثمانی جلد سوم
۲۷	پیش لفظ از حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم العالیہ
۲۹	عرض مرتب
	﴿ کتاب الشریکۃ والمضاربہ ﴾
۳۳	(شرکت و مضاربہ (پارٹنرشپ اور سرمایہ کاری) کے مسائل)
۳۵	۱:- پندرہ فیصد نفع، نقصان کی بنیاد پر ”شرکت“ کا حکم
۳۵	۲:- مضاربہ میں مضارب کے لئے نفع کا ایک حصہ اور تنخواہ مقرر کرنے کا حکم
	(شرکت و مضاربہ سے متعلق چند اہم سوالات اور ان کے جوابات)
۳۶	۱:- نفع کی ایک مقرر مقدار تک مضاربہ ختم نہ کرنے کے معاہدے کا حکم
۳۷	۲:- فسخ مضاربہ کی صورت میں سارا مال رب المال کے حوالے کرنے کے معاہدے کا حکم
۳۸	۳:- نقدی کے بجائے ”مضاربہ بالعروض“ کا حکم
	۴:- مضاربہ کے لئے فسخ مضاربہ کے وقت رب المال کے بجائے کسی اور کو مال فروخت کرنے کا حکم
۳۹	۵:- شرکت و مضاربہ اکٹھے کرنے کی صورت میں دونوں کا نفع اکٹھا فیصد کے طور پر مقرر کرنے کا حکم
۳۹	۶:- ایک شریک بغیر عمل کے پانچ لاکھ روپے دوسرا ایک لاکھ بمع عمل شرکت کریں تو کیا حکم ہے؟
	کم سے کم ۵ فیصد اور زیادہ سے زیادہ ۲۰ فیصد منافع دینے والے ادارے ”صمد پراپرٹی انوسٹمنٹ“ میں سرمایہ کاری کا حکم
۴۱	مشترک مال تجارت باہر سے منگوانے کی صورت میں اگر جہاز ڈوب جائے تو شریک سے نقصان کی تلافی کرانے کا حکم
۴۲	کاروبار میں شرکت کے لئے رقم دینے کے بعد نفع کے بجائے ماہانہ سود کا مطالبہ کرنے کا حکم
۴۳	تاج کمپنی لمیٹڈ میں ۱۵ تا ۲۰ فیصد منافع کی شرط پر سرمایہ کاری کا حکم
۴۴	کھانے میں روٹی، سالن، گوشت اور سبزی وغیرہ مختلف اجناس مشترک ہونے کی صورت میں تقسیم میں مساوات ضروری ہے یا نہیں؟
۴۵	

- کیا شرکت یا مضاربت میں اپنی لگائی ہوئی رقم واپس لی جاسکتی ہے؟ (الائنس موٹرز کمپنی میں جمع کرائی ہوئی رقم واپس لوٹانے کی شرط کا حکم) ۴۷
- والد کی طرف سے شروع کرائے ہوئے کاروبار میں والد کو بیٹوں کے حصے مقرر کرنے اور ان میں کمی بیشی کا اختیار ہے ۴۹
- شرکت میں فریقین کے لئے علیحدہ علیحدہ مال متعین کر کے اس پر نفع نقصان حاصل کرنے کی مخصوص صورت کا حکم ۵۲
- مضاربت میں تمام نقصان سرمایہ لگانے والے پر ہوگا، جبکہ شرکت (پارٹنرشپ) میں ہر فریق کو اپنے سرمائے کے بقدر نقصان برداشت کرنا ہوگا ۵۳
- مضارب کا مضاربت کے اختتام پر مال مضاربت کو قیمت اسمیہ پر خریدنے کی شرط کا حکم ۵۵
- شرکت متناقصہ میں بینک کو قیمت کی ادائیگی سے قبل قلب دین کی ایک مخصوص صورت کا حکم (اسلامی بینک بنگلہ دیش کے ایک سوال کا جواب) ۵۶
- (میاں فارم ٹرانسوال افریقہ کی ایک فیملی شراکتی کمپنی سے متعلق مختلف سوالات کے جوابات)
- (ایک معاہدہ شرکت کی حیثیت)
- ۱:- والد کی طرف سے اپنی تجارت و جائیداد چار بیٹوں کو مشترکہ طور پر فروخت کرنے کے ایک معاہدہ شرکت کا حکم ۵۷
- ۲:- معاہدہ شرکت کی خلاف ورزی کرنے والے شریک کا حکم ۵۷
- ۳:- معاہدہ شرکت میں سرمایہ تجارت کی مقدار متعین طور پر نہ لکھی ہوئی ہو تو کیا حکم ہے؟ ۵۷
- ۴:- کسی شریک کے کام نہ کرنے یا غائب ہو جانے سے شرکت ختم ہو جائے گی یا نہیں؟ ۵۷
- ۵:- یک طرفہ طور پر شرکت کو ختم کرنے کے لئے دوسرے شرکاء کا فسخ کو قبول کرنا ضروری نہیں ۵۸
- ۶:- معاہدے میں کسی شریک کے تحریراً استعفاء دینے کے چھ ماہ بعد اس کی شرکت ختم ہو جانے کے اصول کی شرعی حیثیت ۵۸
- ۷:- کسی شریک کے مستعفی ہو جانے کے چھ ماہ بعد بھی دیگر شرکاء اس کو حصہ دیتے رہے تو اس کی شرکت باقی ہوگی یا نہیں؟ ۵۸

۸:- فتح شرکت کے لئے دیگر شرکاء کو اطلاع دینا ضروری ہے، محض استعفاء لکھ کر اپنے پاس رکھ لینے سے شرکت ختم نہیں ہوگی..... ۵۸

۹:- کسی شریک کے انتقال کے بعد اس کی اولاد کاروبار میں شریک ہوگی یا نہیں؟ اور مرحوم شریک کی اولاد کو شریک کاروبار بنانے کی مجلس میں بعض شرکاء کے سکوت اختیار کرنے کا حکم..... ۵۸

شرکت میں ایک شریک کے انتقال کے بعد شرکت ختم ہو جاتی ہے..... ۷۲

بیٹے کا مال اپنے کاروبار میں لگا کر ماہوار اسے متعینہ رقم دینے کا حکم..... ۷۲

﴿کتاب البیوع﴾

(خرید و فروخت کے مسائل) ۷۵

﴿فصل فی البیع الفاسد والباطل والموقوف والمکروہ﴾

(بیع فاسد، باطل، موقوف اور مکروہ کا بیان) ۷۷

بیع اور اجارہ کا معاملہ اکٹھے کرنے کا حکم..... ۷۷

عورت کی خرید و فروخت اور اسے باندی بنانے کا حکم..... ۷۸

ذبح سے پہلے جانور کے مختلف اعضاء کی خرید و فروخت کا حکم..... ۷۹

یک طرفہ بیع مالک کی رضامندی پر موقوف ہے..... ۷۹

مذکورہ فتویٰ کی مزید وضاحت..... ۸۰

ہندوؤں کی متروکہ جائیداد پر قبضہ کر کے فروخت کرنے کا حکم..... ۸۱

مشرقی کے قبضے سے پہلے بیع اگر ہلاک ہو جائے تو نقصان بائع کا متصور ہوگا..... ۸۲

رمضان میں بیکری کا سامان فروخت کرنے کا حکم..... ۸۴

ریڈیو، ٹیپ ریکارڈر، ٹی وی اور وی سی آر کے کاروبار کا حکم..... ۸۴

وی سی آر کے کاروبار کی شرعی حیثیت اور غلطی سے خریدے ہوئے وی سی آر کو بیچنے کا حکم..... ۸۵

”بیع فضولی“ کی ایک مخصوص صورت کا حکم..... ۸۶

سودی بینک کے لئے مکان یا پلاٹ فروخت کرنے کا حکم..... ۸۸

اسمگل شدہ گھڑیوں کی خرید و فروخت کا حکم..... ۸۸

صفحہ نمبر	موضوعات
۸۸	سگریٹ کی خرید و فروخت کا حکم
۸۹	سگریٹ کی خرید و فروخت اور اس کی کمائی کا حکم
۸۹	اسمگلنگ کی شرعی حیثیت
۹۱	سوتر منڈی فیصل آباد میں پرچی کے ذریعے خرید و فروخت کا شرعی حکم
۹۸	زندہ جانور کو وزن کر کے فروخت کرنے کا حکم
	﴿فصل فی الغرر والعیب﴾
۱۰۲	(بیع میں دھوکا اور عیب کا بیان)
۱۰۲	اصلی کمپنی کے خالی ڈبوں میں دوسری قسم کا تیل ڈال کر فروخت کرنے کا حکم
۱۰۳	کسی اور سے مال بنا کر اپنے نام کا مونو گرام لگانے کا حکم
۱۰۴	پاکستان کی بنی ہوئی چیز پر امریکا یا اٹلی کا نام لکھ کر فروخت کرنے کا حکم
	﴿فصل فی أنواع البیوع المختلفة﴾
۱۰۶	(بیع کی مختلف اقسام بیع وفاء، سلم، استصناع اور بیع استجرار کا بیان)
۱۰۶	بیع بالوفاء کا حکم (فارسی فتویٰ)
۱۰۹	”أحسن الفتاویٰ“ میں بیع الثمار قبل بدو الصلاح کی صورت میں اسے بیع الأذہار مان کر جواز کا قول اختیار کرنے کا حکم
۱۱۰	شرکۃ خلیجیہ اور مجموعۃ سعودی بن لادن کے درمیان مشروع حرمین سے متعلق عقد استصناع کا مسئلہ
۱۱۲	ماہنامہ ”البلاغ“ کے قارئین کا پیشگی ماہانہ رقم کی ادائیگی کا معاملہ ”بیع استجرار“ میں شامل ہونے کی وضاحت
	﴿فصل فی البیع بالتقسیط﴾
۱۱۵	(قسطوں پر خرید و فروخت کا بیان)
۱۱۵	نقد کے مقابلے میں اُدھار مہنگے داموں فروخت کرنے کا حکم
۱۱۶	قسطوں کی خرید و فروخت کی شرعی حیثیت اور اُدھار کی وجہ سے قیمت میں اضافے کا حکم

- ۱۱۶ نقد ایک لاکھ کا پلاٹ چوبیس ماہ کی اقساط پر سوالا کھ میں خریدنے کا حکم
- ۱۱۷ گورنمنٹ سے قسطوں پر نیلام کی جانے والی زمین خریدنے کا حکم
- ۱۱۷ قسطوں پر گاڑی خریدنے کے بعد اس کی ٹوٹ پھوٹ کا ذمہ دار خریدنے والا ہوگا
- ۱۱۸ قسطوں پر خرید و فروخت کا حکم
- ۱۱۹ قسطوں پر خرید و فروخت اور اس کی شرائط

﴿فصل فی احکام المال الحرام والمخلوط﴾

- ۱۲۰ (مخلوط اور حرام مال کے احکام)
- ۱۲۰ مال حرام سے خریدی ہوئی چیز کا بعینہ صدقہ ضروری ہے یا اس کے بقدر رقم؟
- ۱۲۰ مال حرام سے خریدی ہوئی چیز کی موجودہ مالیت کا صدقہ ضروری ہے یا صرف حرام رقم کا؟
- ۱۲۰ مال حرام سے خریدی ہوئی چیز کو حلال کرنے کا طریقہ؟
- ۱۲۱ مال مخلوط کا نفع حلال ہے یا حرام؟ ("ہدایہ" اور "فتح القدیر" کی عبارات کی وضاحت)
- ۱۲۳ مال مخلوط کے نفع سے متعلق مذکورہ فتویٰ کی مزید وضاحت اور ایک اشکال کا جواب
- ۱۲۴ مال حرام کو حلال کرنے کے لئے غیر مسلم سے قرض والے حیلے کی شرعی حیثیت
- ۱۲۶ ناجائز طریقے سے آئی ہوئی رقم غلطی سے استعمال ہو جائے تو کیا حکم ہے؟
- ۱۲۶ ماں کے لئے مجبوراً بیٹے کی حرام کمائی استعمال کرنے کا حکم
- باپ کی طرف سے صدقے کے لئے دی گئی حلال رقم خود استعمال کر کے مال حرام سے صدقہ
- ۱۲۷ کرنے کا حکم
- ۱۲۸ مال حرام سے متعلق حضرت والا دامت برکاتہم کی ایک اہم تحقیق
- ۱۲۹ مال حرام کے تصدق میں تملیک ضروری ہے یا نہیں؟

﴿فصل فی بیع الصّرف وأحكام الحلی والأوراق النقدية﴾

- ۱۳۱ (بیع صرف، زیورات کی خرید و فروخت اور کرنسی نوٹوں کا بیان)
- ۱۳۱ کاغذی کرنسی کا باہم تبادلہ "بیع صرف" نہیں ہے
- ۱۳۵ ایک ملک کی کرنسی کے باہم تبادلے کی صورت میں تفاضل کے حرام ہونے کی بنیادی وجہ (عربی فتویٰ) ...

- ۱:- سو روپے والے نوٹ کو چالیس یا پچاس روپے کے بدلے فروخت کرنا ۱۴۷
- ۲:- ایک ملک کی کرنسی کا دوسرے ملک کی کرنسی کے ساتھ کمی بیشی کے ساتھ تبادلہ کرنا ۱۴۷
- ۳:- ڈالر کی خرید و فروخت کا حکم ۱۴۷
- مختلف ممالک کی کرنسی کے باہمی تبادلے کا حکم ۱۴۹
- چیک سے سونا چاندی کی خرید و فروخت سے متعلق ”تکملة فتح الملہم“ کی ایک عبارت کی توضیح و تصحیح ۱۴۹
- جیولری کے کاروبار اور سونے کی خرید و فروخت کے بارے میں اہم نوعیت کے مختلف سوالات کے جوابات (عربی فتویٰ) ۱۵۰
- عالمی مارکیٹ میں کرنسی کے کاروبار کا طریقہ کار اور اس کی شرعی حیثیت (کمپنی کے ذریعے ڈالر کی مخصوص مقدار کی لاٹ خرید کر کرنسی کے کاروبار کی شرعی حیثیت) ۱۵۵
- کرنسی نوٹ کی شرعی حیثیت سے متعلق حضرت والا دامت برکاتہم کی رائے اور ”نوٹ“ کے بدلے سونے چاندی کی نقد اور ادھار خرید و فروخت کا حکم ۱۵۸
- سونے کا زیور فروخت کرنے میں ٹانکے اور سونے کی مجموعی یا الگ الگ قیمت لگانے کا حکم ... ۱۶۰

﴿فصل فی احکام السندات المالیة﴾

﴿والصکوک والأوراق المالیة﴾

- (مختلف مالی دستاویزات، بانڈز اور چیک وغیرہ کا بیان) ۱۶۱
- فارن ایکسچینج بیئر سرٹیفکیٹ خریدنے اور ان پر نفع حاصل کرنے کا حکم ۱۶۱
- انکم ٹیکس سے بچنے کے لئے فارن ایکسچینج بیئر سرٹیفکیٹ خریدنے کا حکم ۱۶۳
- ”فارن ایکسچینج بیئر سرٹیفکیٹ“ کا شرعی حکم، چند شبہات اور ان کے جوابات ۱۶۵
- فارن کرنسی بیئر سرٹیفکیٹ کا شرعی حکم ۱۷۰
- ”نیشنل ڈیفنس سیونگ سرٹیفکیٹ“ میں ملنے والے منافع کا حکم ۱۷۳
- انعامی بونڈز کی شرعی حیثیت ۱۷۳

صفحہ نمبر	موضوعات
۱۷۳	پرائز بانڈز کی خرید و فروخت اور انعام کا شرعی حکم (اور اس سلسلے میں حضرت والا دامت برکاتہم کے سپریم کورٹ کے ایک فیصلے کی حقیقت اور قانونی نکتے کی وضاحت).....
۱۷۵	پرائز بانڈز اور اس پر ملنے والی انعامی رقم کا حکم.....
۱۷۵	پرائز بانڈز پر ملنے والی انعامی رقم کا حکم.....
۱۷۵	انعامی بانڈز اور اس کی رقم سے زکوٰۃ اور حج ادا کرنے کا حکم.....
۱۷۶	انعامی بانڈز کا حکم.....

﴿فصل فی احکام الأسهم﴾

۱۷۷	(شیرز کے احکام)
۱۷۷	حلال کاروبار کرنے والی کمپنی کے شیرز کی خرید و فروخت جائز ہے.....
۱۷۷	کوئی کمپنی کے شیرز کی خرید و فروخت جائز ہے؟ نیز اسٹاک ایکسچینج والوں کو کمیشن دینے کا حکم.....
۱۷۸	اسٹاک ایکسچینج میں شیرز کی خرید و فروخت اور شیرز پر قبضے سے متعلق حکم شرعی کی تحقیق.....
۱۹۰	۱:- ڈیلیوری سے پہلے شیرز فروخت کرنے کا حکم.....
۱۹۰	۲:- ایک ماہ بعد کے وعدے پر شیرز فروخت کرنے کا حکم.....
۱۹۰	۳:- شیرز فروخت کرنے کے بعد وصولی رقم کی ضمانت کے طور پر وہی شیرز بطور رہن رکھنے کا حکم.....
۱۹۱	۱:- شیرز کے نفع کو ذریعہ آمدنی بنانے کی غرض سے شیرز خریدنا.....
۱۹۱	۲:- کاروبار میں سودی رقم شامل کرنے والی کمپنی کے شیرز کی خرید و فروخت کا حکم.....
۱۹۱	۳:- تجارت کی غرض سے شیرز کی خرید و فروخت کا حکم.....
۱۹۲	اسلامی بینکاری اور شیرز کے بارے میں حضرت والا دامت برکاتہم کی رائے (اسلامی بینکاری اور شیرز سے متعلق خط و کتابت).....
۱۹۲	۱:- شیرز کی خرید و فروخت میں اُمت کی نوی مجبوری اور اضطرار ہے؟ (”امداد الفتاویٰ“ اور ”اسلام اور جدید معیشت و تجارت“ میں جواز کے فتویٰ کی روشنی میں اضطرار و مجبوری کے مفہوم اور درجے کی وضاحت).....
۱۹۲	۲:- شیرز کے فتویٰ جواز اور ”انعام الباری“ کی ایک عبارت کی وضاحت.....

- ۱۹۸ "Vested Stock" کے شیئرز کی خرید و فروخت کا حکم
- ﴿فصل فی القرض والدین﴾
- ۲۰۰ (قرض اور دین سے متعلق مسائل)
- ۲۰۰ ”قرض حسن“ سے کیا مراد ہے؟ اور قرض حسن کی واپسی کے اطمینان کا طریقہ
- ۲۰۱ سودی قرضے سے مکان بنوا کر بینک ملازمت کی پنشن کی رقم قرض میں ادا کرنے کا حکم
- والدین سے قرض لی گئی رقم والدین کے انتقال کے بعد ان کے ورثاء میں تقسیم کرنا لازم ہے،
- ۲۰۲ اور والدین اور بہن بھائیوں پر خرچ کی گئی رقم ”قرض“ شمار ہوگی یا نہیں؟
- ۲۰۳ قرض کے لین دین میں تحریر اور گواہی کا اہتمام کرنا بہتر ہے ضروری نہیں
- حوالہ میں محتال لہ (قرض خواہ) کی رضامندی ضروری ہے اور قرض کے حوالہ اور مقاصد کی ایک
- ۲۰۴ مخصوص صورت
- ۲۰۵ زکوٰۃ اور فطرے کی رقم سے مسجد کو قرض دینے کا حکم اور مسجد سے ایسا قرض اُتارنے کا طریقہ
- ۲۰۷ ۱:- راشی سے لئے ہوئے قرضے کی عدم واپسی کا حکم
- ۲۰۷ ۲:- بینک کی سودی رقم سے قرض ادا کرنے کا حکم
- ۲۰۸ سودی قرضہ لے کر کاروبار کرنے کا حکم
- کسی کا ”تروض“ سے رقم لے کر اس کے قرض خواہ کو دینے سے قرض کی ادائیگی کی ایک مخصوص
- ۲۰۸ صورت اور اس کا حکم
- ۲۱۰ قرض لینے اور اُدھار یا قسطوں پر خریداری کا شرعی حکم، نیز حج اور عمرہ کی ادائیگی کے لئے قرض لینے کا حکم
- ﴿فصل فی المسائل الجدیدة والمتفرقة المتعلقة بالبیع﴾
- ۲۲۲ (خرید و فروخت کے جدید اور متفرق مسائل)
- ۲۲۲ ۱- سی آئی ایف معاہدے کی شرعی حیثیت اور پورٹ تک پہنچنے سے پہلے مال بائع کی ملکیت ہے
- ۲۲۲ ۲- ایف او بی معاہدہ اور اس کی شرائط کا شرعی حکم
- دارالافتاء جامعہ دارالعلوم کراچی کے ”بزناس“ کے فتویٰ پر ڈاکٹر عبدالواحد صاحب کا اشکال اور
- ۲۲۴ اس کا جواب

- حضرت والا دامت برکاتہم کی کتاب ”فقہی مقالات“ (جلد اول) میں قسطوں پر خرید و فروخت،
 ۲۳۰ مراجعہ مؤجلہ، حقوق مجردہ کی خرید و فروخت وغیرہ سے متعلق چند شبہات اور ان کے جوابات
 ۲۳۵ حکومت کی طرف سے ملنے والی چیز اگر ضرورت سے زائد ہو تو اسے فروخت کرنا جائز ہے
 ۲۳۵ مکان بنا کر کرایہ پر دینے یا این آئی بی یونٹ میں شرکت کرنے میں سے کوئی صورت بہتر ہے؟
 ۲۳۶ حکومت کے لئے اشیاء کی قیمتوں پر کنٹرول کرنے کا حکم
 ۲۳۶ دکان دار کے بیٹے کا اپنے والد کی دکان سے مال کسی کے ہاتھ کم قیمت پر فروخت کرنا
 ۲۳۸ Sky Biz 2000 کی ویب سائٹ خریدنا اور اس کمپنی کا ممبر بن کر تعلیم حاصل کرنا
 ۲۳۹ مختلف کمپیوٹر سوفٹ ویئر خریدنے کا حکم (جبکہ بعض سوفٹ ویئر ز چوری کے ہوتے ہیں)
 اخبار کا بل ایڈوانس دینے کی صورت میں اخبار کے ادارے کی طرف سے مختلف رعایتوں اور
 ۲۵۱ گاہک کی انشورنس کرانے کا حکم
 ۲۵۳ کیا نفع کی شرعاً کوئی حد متعین ہے یا نہیں؟
 ۲۵۳ تجارتی انعامی اسکیموں کا شرعی حکم
 ۲۵۹ فروختگی کے لئے وکیل کو دیا ہوا سامان چوری ہو جائے تو نقصان وکیل کا ہوگا یا مالک کا؟
 کاروبار بیچنے کے بعد مشتری کی طرف سے مقررہ مدت تک ثمن ادا نہ کرنے کی صورت میں بیع
 ۲۵۹ کو فسخ کیا جاسکتا ہے یا نہیں؟
 ۲۶۳ ہاؤس بلڈنگ فنانس کارپوریشن سے جائیداد خریدنے کا حکم

﴿کتاب الربوا والقمار والتأمين﴾

۲۶۵ (سود، جوئے اور انشورنس وغیرہ سے متعلق مسائل)

﴿فصل فی الربوا وأحكام ربوا البنوک﴾

﴿والمؤسسات المالية الحديثة﴾

۲۶۷ (سود کے احکام اور مختلف بینکوں اور جدید مالیاتی اداروں سے متعلق مسائل کا بیان)

۲۶۷ ۱:- حربی یا ذمی کافروں سے سود لینے کا حکم

۲۶۷ ۲:- حفاظت کی غرض سے بینک میں رقم رکھوانے کا حکم اور اس کی صورت

- ۳:- بینک کے سود کا حکم ۲۶۷
- غیر مسلم ممالک میں بینک کے سود کا حکم (عربی فتویٰ) ۲۶۹
- بینک سے سود لینا، اس میں اکاؤنٹ کھولنا اور بینک میں ملازمت کرنا ۲۶۹
- بینک کی طرف سے ملنے والے منافع کی مختلف صورتیں اور اس کے استعمال کا حکم ۲۷۰
- بینکوں کا سود وصول کر کے صدقہ کیا جائے یا وصول ہی نہ کیا جائے؟ ۲۷۲
- بینک کے کرنٹ اکاؤنٹ کا حکم اور غلطی سے سودی اکاؤنٹ میں رقم رکھوانے کی صورت میں
ملنے والے سود کا حکم ۲۷۳
- حفاظت کی غرض سے بینک میں رقم رکھوانے کا حکم ۲۷۳
- بینک سے سود وصول کر کے غرباء میں تقسیم کرنے کا حکم ۲۷۳
- ۱:- ڈاک خانے میں جمع کرائی گئی رقم پر ملنے والے اضافے کا حکم ۲۷۴
- ۲:- پراویڈنٹ فنڈ پر ”سود“ کے نام سے ملنے والے اضافے کا حکم ۲۷۴
- بینک میں جمع کرائی گئی رقم پر ملنے والے منافع کا حکم ۲۷۵
- بینک کے سود کا حکم ۲۷۵
- سودی رقم مستحق زکوٰۃ کو دینے کا حکم ۲۷۵
- بینک میں رقم رکھوانے اور کرنٹ اکاؤنٹ کا حکم ۲۷۶
- فلکسڈ ڈپازٹ میں رقم رکھوانے اور اس پر ملنے والے اضافے کا حکم ۲۷۶
- بینکوں کے سود اور پراویڈنٹ فنڈ کا حکم ۲۷۷
- پراویڈنٹ فنڈ پر ملنے والی زائد رقم کا حکم ۲۷۸
- بینک کے سود اور جبری پراویڈنٹ فنڈ کا حکم ۲۷۸
- بینک کا سود صدقہ کرنے کی صورت ۲۷۹
- بینک کے سود کا حکم ۲۷۹
- ایک اکاؤنٹ سے سود لے کر دوسرے اکاؤنٹ میں سود ادا کرنے کا حکم ۲۸۰
- بینک سے وصول شدہ سود کا حکم ۲۸۰

- ۲۸۱ ڈاک خانے کے ڈپازٹ سرٹیفکیٹ پر ملنے والے منافع کا حکم
- ۲۸۱ بینک کا سود وصول کر کے صدقہ کیا جائے یا وصول ہی نہ کیا جائے؟
- ۲۸۲ بینک میں رقم رکھوانے اور کرنٹ اور سیونگ اکاؤنٹ کا حکم
- ۲۸۲ مسلم ممالک کے لئے غیر مسلم ممالک کے بینکوں میں رقم جمع کرا کر سود وصول کرنے کا حکم
- ۲۸۳ سیونگ اکاؤنٹ کے سودی منافع سے متعلق جامعہ ازہر کے شیخ طنطاویؒ کے فتویٰ کی حیثیت
- ۲۸۳ سیونگ اکاؤنٹ پر ملنے والے سود کا حکم، نیز حکومت کا بینک سے زکوٰۃ وصول کرنا
- ۲۸۴ سیونگ اور ڈپازٹ سرٹیفکیٹ پر اصل رقم سے زائد ملنے والی رقم ”سود“ ہے
- ۲۸۵ ضرورت کی بناء پر بینک سے سودی قرض لینے کا حکم
- ۲۸۵ بینک میں رقم رکھوانے کا حکم
- ۲۸۵ مستحق کے لئے سود کی رقم کسی بھی ضرورت میں استعمال کرنا جائز ہے
- ۲۸۶ قرض پر منافع حاصل کرنے کی دو صورتوں کا حکم
- ۲۸۷ مسجد کا چندہ سودی اکاؤنٹ میں جمع کرا کر سود وصول کرنے کا حکم
- ۲۸۷ ایل بی کھولتے وقت پوری رقم جمع نہ کرانے کی صورت میں دو خرابیوں کی وجہ سے معاملہ ناجائز ہے
- بینک کا کسی کمپنی کو ڈالر کے ڈسکاؤنٹ پر ایل بی کھول کر بعد میں ادا شدہ ڈالر کی قیمت سے زیادہ وصول کرنا
- ۲۸۸ ۲۸۸
- ۲۸۹ پراویڈنٹ فنڈ پر ملنے والے نفع کا حکم
- ۲۹۰ بینک کے سود کا حکم، بینک میں کونسا اکاؤنٹ کھلوانا درست ہے؟
- ۲۹۰ پراویڈنٹ فنڈ پر سود کے نام سے ملنے والی رقم کا حکم
- ۲۹۱ ہاؤسنگ سوسائٹی سے مکان خریدنے کا حکم
- ۲۹۱ ”این آئی بی“ یونٹ کی جدید صورت حال اور اس کا شرعی جائزہ
- ۲۹۲ ”این آئی بی“ کے کاروبار اور اس کے یونٹ خریدنے کا تفصیلی حکم
- ۲۹۷ ”این آئی بی“ کا جدید حکم (تفصیلی فتویٰ)
- ۳۰۲ ”این آئی بی“ کی نئی صورت حال (اداریہ ماہنامہ ”البلاغ“)

صفحہ نمبر	موضوعات
۳۰۵	”این آئی بی“ کے کاروبار اور اس کے یونٹ خریدنے کا حکم
۳۰۶	”این آئی بی“ میں سرمایہ کاری کا حکم
۳۰۶	بینک کے کرنٹ اکاؤنٹ اور انعامی بانڈز کا حکم
۳۰۷	جبری پراویڈنٹ فنڈ پر ملنے والی اصل رقم پر زیادتی ”سود“ نہیں
۳۰۷	جبری اور اختیاری پراویڈنٹ فنڈ پر اصل رقم پر زیادتی کا حکم
۳۰۸	پراویڈنٹ فنڈ سے قرض لینے کے بعد واپسی کے وقت اصل رقم سے زیادہ واپس کرنے کا حکم
۳۰۸	مغربی ممالک میں سودی قرضوں کے ذریعے گھر خریدنے کا طریقہ اور اس کا حکم
۳۱۱	بینک یا ہاؤس بلڈنگ فنانس کے ذریعے گھر خریدنے کا حکم
	”بینک آف خیبر“ کی طرف سے فوڈ ڈپارٹمنٹ سے مرابحہ کی منسوخی کی صورت میں بینک کو
۳۱۲	گفٹ کے طور پر ملنے والی رقم کا حکم

﴿فصل فی القمار والتأمين﴾

۳۱۴	(جوا اور انشورنس کا بیان)
۳۱۴	زندگی، گھر اور مال وغیرہ کے انشورنس کا حکم
۳۱۴	مروجہ انشورنس کا متبادل ”تکافل“
۳۱۴	شرکات التکافل پر چند اشکالات (از حضرت والا دامت برکاتہم)
۳۱۷	مجلس کی طرف سے مذکورہ اشکالات کا جواب اور ”تکافل“ سے متعلق اکابر علمائے کرام کی قرارداد
۳۲۴	مروجہ انشورنس کے متبادل ”تکافل“ کے طریقہ کار کا جائزہ اور اس کی بعض شقوں کی وضاحت
۳۲۷	مروجہ انشورنس کی مختلف اقسام کا حکم اور انشورنس کے جواز کے قائل علماء کی آراء کی شرعی حیثیت
۳۲۸	۱۔ انشورنس اور اس کی تمام اقسام کا حکم
۳۲۸	۲۔ بغیر سود والے انشورنس کے ناجائز ہونے کی وجہ
	۳۔ انشورنس کی حرمت کے دلائل اور اس کے جواز سے متعلق مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم اور
۳۲۸	بعض دیگر علماء کی رائے کی حقیقت
۳۲۹	شدید مجبوری میں انشورنس کی رقم بطور قرض استعمال کرنے کا حکم

صفحہ نمبر	موضوعات
۳۳۰	”بیمہ زندگی“ کا حکم
۳۳۰	مروجہ بیمے کی تمام اقسام کا حکم اور ”امدادِ باہمی“ کے اصول پر جائز بیمے کا تصور
۳۳۱	”بیمہ زندگی“ کی مختلف صورتوں کا حکم
۳۳۲	تجارتی مال بردار جہاز کے ڈوبنے کی صورت میں انشورنس کمپنی سے نقصان کی تلافی کرانے کا حکم ...
	مشترک مال تجارت کا جہاز ڈوبنے کی صورت میں انشورنس کمپنی یا شریک سے نقصان کی تلافی
۳۳۳	کرانے کا حکم
۳۳۵	غیر ملکی سفر کے لئے ”بیمہ زندگی“ کی قانونی پابندی اور اس سے چھٹکارا حاصل کرنے کی صورت
۳۳۵	گروپ انشورنس اور پراویڈنٹ فنڈ کا شرعی حکم
۳۳۷	”گروپ انشورنس“ کا حکم
۳۳۸	گروپ انشورنس کی تحقیق اور اس کا شرعی حکم
۳۴۰	انشورنس کی رقم وصول کرنے کا مشورہ دینا اور اسے استعمال کرنے کا حکم
۳۴۱	۱:- مختلف معموں کے ذریعے حاصل کئے گئے انعام کا حکم
۲۴۱	۲:- لائف انشورنس کی مختلف مروجہ صورتوں کا حکم
۳۴۱	انشورنس کی مروجہ صورتوں اور مسجد کا انشورنس کرانے کا حکم
۳۴۲	تقسیم انعامات کے لئے قرعہ اندازی کرنے کا حکم

﴿فصل فی احکام البنوک﴾

۳۴۳	(مختلف بینکوں کے احکام)
۳۴۳	حبیب بینک اور دوسرے بینکوں کے نفع، نقصان کے کھاتہ میں سرمایہ کاری کا حکم
۳۴۳	”فیصل اسلامک بینک“ کا طریقہ کار اور اس کی مختلف شاخوں کا حکم
	امارت اسلامی کے قیام کے بعد افغانستان کے اسلامی بینکوں کے لئے لوگوں سے پچھلے قرضوں
۳۴۵	پرسود وصول کرنا جائز ہے یا نہیں؟
۳۴۶	”البنک الاہلی التجاری“ میں سرمایہ کاری کا حکم

- سعودی عرب کے دو مالیاتی اداروں ”دار المال الاسلامی“ اور ”الشركة الإسلامية للاستثمار الخليجي“ کا حکم ۳۴۶
- ”دینی اسلامی بینک“ اور ”فیصل اسلامک بینک“ میں سرمایہ کاری کا حکم ۳۴۷
- ٹیکس اتھارٹیز کا تعامل اسلامی بینک کی تمویل سے ٹیکس کے استثناء کے لئے کافی ہے ۳۴۸
- ﴿فصل فی البطاقات وأحكامها﴾**
- (کریڈٹ کارڈ اور اس کی مختلف قسموں کے احکام) ۳۵۲
- کریڈٹ کارڈ کا حکم (بنوری ٹاؤن، ”جنگ“ اخبار اور حضرت والا دامت برکاتہم کا فتویٰ) ۳۵۲
- کریڈٹ کارڈ اور اس کی مختلف قسموں کا حکم ۳۶۵

﴿کتاب الإجارة﴾

- (کرایہ داری سے متعلق مسائل کا بیان) ۳۵۹

﴿فصل فی نفس الإجارة﴾

- (اجارہ ”کرایہ داری“ سے متعلق مسائل کا بیان) ۳۶۱
- پٹواری کے پیشہ اور نظام کی شرعی حیثیت ۳۶۱
- کیا سودی معاملات کرنے کی بناء پر حکومت کی ہر ملازمت ناجائز ہے؟ ۳۶۲
- آغا خانیوں کے عقائد اور ان کی سرگرمیوں کے پیش نظر آغا خان فاؤنڈیشن کو دکان کرایہ پر دینے کا حکم ۳۶۳
- محکمہ پولیس اور شراب کی کمپنی میں ملازمت کا حکم ۳۶۵
- ۱:- مدرّسین ایام تعطیلات کی تنخواہ کے حق دار ہیں یا نہیں؟ ۳۶۶
- ۲:- مدرّسین کو خارجی اوقات میں کسی دوسرے کام سے روکنا ۳۶۶
- ۳:- پیشگی اطلاع نہ دینے کی صورت میں مدرّس سے ایک ماہ کی تنخواہ کاٹنے کا حکم ۳۶۶
- کرایہ دار نے کرایہ کی دکان پر کمرہ اور غسل خانہ وغیرہ بنوایا ہو تو اس کا خرچ کس پر ہے؟ ۳۷۴
- معاهدے کی مدت ختم ہونے پر مکان خالی کرنا لازم ہے ۳۷۵

﴿فصل فی إجارة الأرض والأشجار والحيوان﴾

- ۳۷۷ (زمین، حیوان اور درختوں کے اجارہ سے متعلق مسائل)
- ۳۷۷ ”احکار“ یعنی ہمیشہ کے لئے زمین کرایہ پر لینے کا حکم اور تفصیلی شرائط
- ۳۷۹ ”إجارة أشجار“ درختوں کے اجارہ کی شرعی حیثیت اور جواز کا حیلہ
- ۳۸۰ زمین کی مال گزاری مؤجر پر ہے یا مستاجر پر؟
- ۳۸۱ گائے یا بھینس پر ورش کے لئے نصف حصے پر دینے کا حکم اور جواز کی صورت
- ۳۸۳ جانور کو نصف پر دینے کا حکم

﴿فصل فی نفس الأجرة﴾

- ۳۸۴ (”تنخواہ، اجرت“ اور مختلف الاؤنسز سے متعلق مسائل)
- ۳۸۴ شرعاً ملازم کی تنخواہ مقرر کرنے کا معیار کیا ہے؟ ملازم کی ضرورت یا اس کی قابلیت؟
- ۳۸۵ مزدور کی اجرت کی تعیین کا شرعی معیار کیا ہے؟
- ۳۸۷ مدرس کے لئے ایام غیر حاضری کی تنخواہ کا حکم
- ۳۸۷ امامت میں ناغہ کرنے کی بناء پر تنخواہ کاٹنے کا حکم
- ۳۸۸ سودی معاملات کرنے کی وجہ سے حکومت کے ہر ملازم کی تنخواہ کو ناجائز قرار دینے کا حکم
- ۳۹۸ غلط بیانی کر کے سواری کا الاؤنس وصول کرنے کا حکم
- ۳۹۸ قربانی کی کھال اور فطرے سے امام کو تنخواہ دینے کا حکم
- ۳۹۰ بغیر سواری کے آنے والے سرکاری ملازم کے لئے کرایہ سواری لینے کا حکم
- ۳۹۱ اُور ٹائم لگائے بغیر اس کی تنخواہ وصول کرنے کا حکم
- ۳۹۱ غلط بیانی کر کے تنخواہ میں اضافہ کرانے کا حکم
- ۳۹۲ زکوٰۃ و صدقات کی رقوم سے مہتمم اور مدرسین و ملازمین کی تنخواہیں ادا کرنے کا حکم

﴿فصل فی الإجارة علی المعاصی﴾

- ۳۹۳ (مختلف ناجائز اور معصیت کی ملازمتوں کے احکام)
- ۳۹۳ سودی کاروبار کرنے والے مالیاتی ادارے کی ملازمت اور آمدنی کا حکم

- حکومت کی طرف سے ”قابض“ کو الاٹمنٹ کا حق دینے کی صورت میں پلاٹ کا مالک موجد ہوگا یا کرایہ دار؟ ۴۱۲
- لیز پر گاڑی خریدنے کا حکم ۴۱۳
- سودی قرضہ لے کر خریدے گئے مکان کے کرائے کا حکم ۴۱۴

﴿کتاب الرهن﴾

- (رہن یعنی گروی رکھنے اور اس سے متعلق مختلف مسائل کا بیان) ۴۱۷
- ڈپازٹ کے طور پر رکھوائی جانے والی رقم رہن ہے یا قرض؟ (چند فقہی عبارات کی وضاحت) ۴۱۹
- رہن کے طور پر حاصل کی ہوئی دکان کو کرایہ پر دینے کا حکم ۴۲۱
- مرہون زمین پر کاشتکاری اور اس کی آمدنی سے اپنا قرض وصول کرنے کا حکم ۴۲۲
- رہن سے نفع اٹھانے اور بیس سال بعد زمین واپس راہن کو ملنے کے حکومتی قانون کا حکم ۴۲۲
- گروی موٹر سائیکل استعمال کر کے اس کا کرایہ قرض میں محسوب کرنے کا حکم ۴۲۳
- ۱- قرض کے عوض دکانیں رہن پر رکھوانے کی مخصوص صورت کا حکم ۴۲۴
- ۲- مرہن کی اجازت کے بغیر راہن کا گروی دکانیں فروخت کرنے کا حکم ۴۲۴
- ۳- گروی دکانوں میں سامان رکھنے سے رہن کا معاملہ ختم نہیں ہوگا ۴۲۴
- حق کرایہ داری اور پگڑی کو رہن کے طور پر رکھنے کی ایک مخصوص صورت اور اس کا حکم ۴۲۷
- مرابحہ، اجارہ یا مشارکہ کی تمویل میں رہن طلب کرنے کا حکم ۴۳۴

﴿کتاب الهبة﴾

- (ہبہ کے مسائل کا بیان) ۴۳۷
- ۱- مرض الوفات سے قبل ہبہ کیا جاسکتا ہے اور بیوی کو کتنا مال ہبہ کرنا چاہئے؟ ۴۳۹
- ۲- ہبہ زبانی بھی ہو سکتا ہے مگر قبضہ ضروری ہے ۴۳۹
- ہبہ کی گئی زمین موہوب لہ کی ملکیت ہے اور واہب کی موت کے بعد اس میں میراث جاری نہیں ہوگی ۴۴۱
- ہبہ درست ہونے کے لئے قبضہ ضروری ہے، محض کاغذات میں نام کرنے سے ہبہ نہیں ہوتا ۴۴۲

صفحہ نمبر	موضوعات
۴۴۳	ہبہ کئے گئے مکان کا کرایہ وغیرہ وصول کرنے کے معاملات انجام دینا شرعاً اس پر ”قبضہ“ شمار ہوگا
۴۴۳	بغیر قبضے کے دو بھائیوں کو مشترکہ طور پر جائیداد ہبہ کرنے کا حکم
۴۴۵	گھر کے استعمال کے لئے دی گئی رقم سے بچا کر زیور بنایا گیا ہو تو کس کی ملکیت ہے؟
۴۴۵	محض کاغذی طور پر جائیداد کسی کے نام کرنے یا کسی کے نام سے خریدنے کی شرعی حیثیت
۴۴۶	خصوصی خدمت اور تیمارداری کی بناء پر دیگر ورثاء کی رضامندی سے اپنا مکان صرف خدمت گزار بیٹے کو ہبہ کرنے کا حکم
۴۴۸	۱:- اولاد میں کسی کو زیادہ کسی کو کم دینے کا حکم اور مشترکہ کاروبار سے حاصل شدہ رقم سے کاروبار کے غیر شریک بیٹے کو محروم کرنے کا حکم
۴۴۸	۲:- زندگی میں علیحدہ ہو جانے والے بیٹے کو بھی میراث سے حصہ ملے گا
۴۴۹	مرض الوفات سے قبل ہبہ کی گئی رقم موہوب لہ کی ملکیت ہے
۴۴۹	مرحوم کے انتقال کے بعد ملنے والے ”ہبہ نامہ“ کی حیثیت اور چند ورثاء میں تقسیم میراث کا طریقہ
۴۵۰	کسی شریک کا قابل تقسیم مشترکہ زمین کسی کو ہبہ کرنے کا حکم
۴۵۱	اصل مالک کی طرف سے کوارٹر پر قبضہ دلائے بغیر محض الاٹمنٹ سے ملکیت نہیں آتی
۴۵۲	۱:- بیوی کے نام سے خریدی گئی زمین اور اُس پر تعمیر کی جانے والی کوٹھی بیوی کی ملکیت ہے
۴۵۲	۲:- تحریری اسٹامپ کے ساتھ دی گئی رقم کا ہبہ درست ہے
۴۵۲	۳:- کسی کے نام سے بینک میں رقم جمع کرائی یا جائیداد خریدنے سے ہبہ درست ہو جاتا ہے
۴۵۲	۴:- کسی کے نام سے جمع کرائی گئی رقم کی چیک بک پر قبضے سے ”ہبہ“ مکمل ہو گیا
۴۵۲	۵:- بیوی اور لڑکیوں کی دستبرداری کے بعد کل جائیداد بیٹوں کو ہبہ کرنے کا حکم
۴۵۳	سو تیلے بیٹے کی طرف سے والد کو قرض یا ہبہ کے طور پر بھیجی گئی رقم کا حکم
۴۵۷	۱:- ورثاء کے امیر یا غریب ہونے کی صورت میں کل جائیداد کسی کو ہبہ یا وقف کرنا
۴۵۷	۲:- متبنیٰ (لے پالک) شرعاً وارث نہیں ہے
۴۵۹	قبضے کے ساتھ جائیداد کسی کو دینے سے ہبہ درست ہو گیا اگرچہ کاغذات میں واہب کا نام ہو ...
۴۵۹	محرم کو ہبہ کرنے کے بعد رُجوع نہیں ہو سکتا

- ۴۶۰ ہبہ سے رجوع درست نہیں
- ۴۶۱ شرم و مروّت میں کئی دن تک کھانا کھلایا پھر اس کے بدلے رقم طلب کی تو کیا حکم ہے؟
- ایک بیوی کے نام سے خریدے گئے مکان میں واہب کی موت کے بعد دوسری بیوی کے ورثاء
- ۴۶۲ کا دعویٰ میراث کرنا
- ۴۶۳ بیوی بچوں کی نافرمانی کی بناء پر اپنی ساری رقم صدقہ کرنے یا تبلیغ میں خرچ کرنے کا حکم
- ۴۶۴ ساری جائیداد بیٹی کو قبضے کے ساتھ ہبہ کر دی تو ہبہ درست ہو گیا
- ۴۶۶ صرف کاغذات میں نام کرانے سے شرعاً ملکیت نہیں آئی
- ۴۶۷ زندگی میں تقسیم جائیداد کا حکم اور طریقہ کار
- ۴۶۷ مرض الموت میں ہبہ ”وصیت“ کے حکم میں ہوتا ہے
- ۴۶۸ والد کا کئی بیٹوں کو مکان ہبہ کرنا درست نہیں
- ۴۶۹ خدمت گار بیٹے کو چند اشیاء ہبہ کرنے کا حکم

﴿کتاب الودیعة والعاریة﴾

- ۴۷۱ (امانت اور عاریت کے مسائل کا بیان)
- ۴۷۱ عاریت پر دیئے ہوئے زیورات کی بعینہ واپسی یا پوری قیمت کا مطالبہ کرنا جائز ہے
- ۴۷۲ گھڑی ساز کے پاس عرصہ دراز سے رکھی ہوئی گھڑیوں کا حکم

﴿کتاب اللقطة﴾

- ۴۷۳ (گری پڑی ہوئی چیزوں کا بیان)
- ۴۷۳ سیلاب میں ملنے والی مختلف اشیاء کا حکم
- ۴۷۴ مسافر سامان رکھ کر چلا گیا ہو تو اُس کے سامان کا حکم

﴿کتاب الغصب والضمن﴾

- ۴۷۵ (غصب اور ضمان کے مسائل کا بیان)
- ۴۷۵ مسجد کی دکان پر ناجائز قبضہ کرنے اور کرایہ ادا نہ کرنے کا حکم

- مال برآمد کرنے کی صورت میں اگر مال راستے میں ہلاک ہو جائے تو جہاز کمپنی یا انشورنس کمپنی سے ضمان لینے کا حکم ۴۷۶
- واقعے کی صحیح صورت حال چھپانے کی وجہ سے کسی کا حق ضائع ہونے اور اس کے ضمان کا حکم ۴۷۹
- سرکاری گاڑی بغیر اجازت دوسرے کاموں میں استعمال کرنے کا حکم ۴۸۰

﴿کتاب الجہاد﴾

- (جہاد اور قتال کے مسائل کا بیان) ۴۸۱
- مسلم علاقے پر قبضہ کرنے والے کافر حکمران سے مسلمانوں کو طاقت ہونے کی صورت میں جہاد کرنا چاہئے، نیز ایسے حکمران کے ماتحت ملازمت اور حقوق حاصل کرنے کا حکم (فارسی فتویٰ) ۴۸۳
- عراق میں امریکی افواج کے تعاون کے لئے پاکستانی افواج بھیجنے کا حکم ۴۸۷
- تحریک نظام مصطفیٰ کے جلوسوں میں مرنے والے ”شہید“ ہیں یا نہیں؟ ۴۹۲
- خلیج کی لڑائی کی شرعی حیثیت اور اس میں کس فریق کی جانب سے لڑنا ”جہاد“ تھا؟ ۴۹۳
- ضیاء الحق مرحوم کی موت شہادت ہے یا نہیں؟ ۴۹۶
- وسائل نہ ہونے کی صورت میں دعوت و تبلیغ اور وسائل میسر ہونے کی صورت میں جہاد کیا جائے گا اور جہاد کے لئے امام مہدیؑ کے انتظار اور تبلیغی جماعت کے نظریے کا حکم ۴۹۷

﴿کتاب الامارۃ والسیاسة﴾

- (حکومت و امارت اور سیاست کے مسائل کا بیان) ۵۰۱
- دین میں سیاست و اقتدار کی حیثیت اور شرعی مقام اور دین کا اصل مقصد ۵۰۳
- ۱:- ”مغربی جمہوریت“ کی شرعی حیثیت ۵۰۶
- ۲:- عہدہ از خود طلب کرنا جائز نہیں ۵۰۶
- ۳:- اکثریت کو فیصلوں کی بنیاد بنانے کا حکم ۵۰۶
- سیاست میں دین اور ملک و ملت کے مفاد کی حامل جماعت کی حمایت کی جائے ۵۰۸

- برما میں تمام مسلمانوں یا مخصوص مسلم قبائل کے لئے جدوجہد کرنے والی دو جماعتوں میں سے کس کی حمایت کی جائے؟ ۵۰۸
- انتخابات میں کسی امیدوار کے بارے میں ”فلاں کو ووٹ دے کر ہم اللہ کے احتساب سے بچ سکتے ہیں“ کے الفاظ کا حکم ۵۰۹
- چہرے کے پردے کی شرعی حیثیت اور خاتون امیدوار کا انتخابی پوسٹروں میں فوٹو شائع کرنے کا حکم ۵۱۰
- (انتخابات میں قرآنی آیات و احادیث کو مخالف امیدواروں پر چسپاں کرنے کی مختلف صورتوں کا حکم)
- ۱:- ”وَكَانَ فِي الْمَدِينَةِ تِسْعَةُ رَهْطٍ“ الآیۃ میں ۹ مفسدوں کو قومی اتحاد کے ۹ لیڈروں پر چسپاں کرنا ۵۱۱
- ۲:- قرآن کریم کے لفظ ”هَلْ“ کو سیاسی جماعت کے انتخابی نشان پر چسپاں کرنا ۵۱۱
- ۳:- تلاعب بالقرآن کی مختلف صورتیں اور ایسی مجالس میں شرکت کا حکم ۵۱۱
- مرد امیدوار کی موجودگی میں عورت کو ”ووٹ“ دینے کا حکم ۵۱۳
- پاکستان سے الحاق کرنے والے ریاست کے ایک حکمران کو معاہدے کے تحت دی گئی مراعات واپس لینے کا حکم ۵۱۳
- سرکاری ملازمتوں اور املاک و اراضی میں ترجیح کی بنیاد علاقائی و جغرافیائی عصیت ہے یا اہلیت؟ ۵۱۵
- کسی سیاست دان کا انتخابات کے موقع پر سیاسی جماعت سے کئے ہوئے وعدے کو توڑنے کا حکم ۵۱۸
- جماعت اسلامی، جمہوریت اور جمعیت علمائے اسلام کے بارے میں ایک سوال کا جواب ۵۱۹

﴿کتاب الدعویٰ والشہادات والقضاء﴾

- (دعویٰ، گواہی اور فیصلوں کے مسائل کا بیان) ۵۲۱
- قانون ”میعادِ سماعت“ کی شرعی حیثیت (قانون ”میعادِ سماعت“ کی حقیقت، تاریخ، شرعی تصور، دلائل، پچھلے زمانوں میں اس کی موجودگی، اور اس قانون کی حکمت پر مفصل فتویٰ) ۵۲۳
- مسجد کو منہدم ہونے سے بچانے کے لئے بھی دعوے میں جھوٹ اور خلاف واقعہ بات کہنا جائز نہیں ۵۲۷
- حضرت ولید بن عقبہؓ کے واقعہ محد میں خلیفہ راشد حضرت عثمانؓ پر ایک اشکال کا جواب ۵۲۹
- مدعا علیہ کی غیر موجودگی میں مدعی سے رقم لے کر اس کے حق میں فیصلہ نافذ نہیں ہوگا ۵۳۱

﴿کتاب الحدود﴾

- ۵۳۵ (حدود کا بیان)
- ۵۳۷ اقرار کے ذریعے زنا کی شرعی سزا نافذ ہونے کی شرائط
- ۵۳۷ اقرار اور گواہی میں سے کچھ نہ ہونے کی صورت میں ”زنا“ کا جرم ثابت نہ ہوگا
- صرف ایک گواہی سے زنا کی شرعی سزا جاری نہیں ہو سکتی، البتہ گواہ کے معتبر ہونے کی صورت میں تعزیری سزا جاری کی جاسکتی ہے
- ۵۳۸ حدود ترمیمی بل میں زنا بالجبر کی سزا سے متعلق سورہ نور کی آیت نمبر ۳۳ سے استدلال کی وضاحت
- ۵۳۹ صرف توبہ اور ستر سے حد ساقط ہو سکنے کے باوجود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں خاتون نے اقرار زنا کیوں کیا؟ نیز زانی کے لئے ستر افضل ہے یا اقرار؟
- ۵۴۱

﴿فصل فی القصاص والدیات﴾

- ۵۴۲ (قصاص اور دیت کے مسائل کا بیان)
- ۵۴۲ گاڑی کی ٹکر سے کسی کے مرجانے پر قصاص و دیت کا حکم
- ایکسیڈینٹ میں موت واقع ہونے کی صورت میں ذمہ دار ڈرائیور کی انشورنس کمپنی سے حاصل ہونے والی رقم ”دیت“ میں شمار کر کے وصول کرنے کا حکم
- ۵۴۲ ۱:- موجودہ دور میں قتل شبہ عمد کی صاحبین کی بیان کردہ تعریف اختیار کرنے کا حکم
- ۵۴۵ ۲:- صلح عن دم العمد یا دیت عمد میں تین سال کی مہلت ضروری نہیں
- قتل شبہ عمد میں امام ابوحنیفہ کا مسلک اور ان کے دلائل کی تحقیق اور موجودہ دور میں شبہ عمد میں صاحبین کی تعریف اختیار کرنے کا حکم
- ۵۴۷ قتل خطا میں قاتل پر گناہ ہے یا نہیں؟ (مختلف عبارات کی تحقیق)
- ۵۴۹

﴿فصل فی التعزیر﴾

- ۵۵۲ (تعزیر اور سزا دینے کے مسائل کا بیان)
- ۵۵۲ بہتان اور الزام تراشی پر تعزیری سزا کا اختیار صرف عدالت کو ہے، عوام کو نہیں

- مجلس گناہ میں شرکت نہ کرنے کا وعدہ توڑنے پر شرعاً کوئی تعزیر مقرر نہیں، نیز تعزیری سزائیں
جاری کرنے کا اختیار صرف قاضی شرعی کو ہے ۵۵۶
- لواطت کی شرعی سزا جاری کرنے کا اختیار حکومت کو ہے ۵۵۸

﴿فصل فی القسامۃ﴾

- (قسامت یعنی کسی جگہ پائے جانے والے مقتول پر اہل محلہ سے قسم لینے کا بیان) ۵۵۹
- کسی بستی کی طرف منسوب اُس کی مخصوص شارع عام میں پائی جانے والی لاش کی قسامت
اُس بستی والوں پر ہوگی ۵۵۹

﴿کتاب الجنایات﴾

- (جنایت کے مسائل کا بیان) ۵۶۱
- مالک کی اجازت کے بغیر اس کے باڑے میں کسی کا اپنا اُونٹ لے جانا اور اس جانور کا
دوسرے جانوروں کو ہلاک کرنے کا حکم ۵۶۱

﴿کتاب الصلح﴾

- (صلح کے مسائل کا بیان) ۵۶۳
- کلیم کے ذریعے حاصل کی گئی جائیداد سے بدلِ صلح لے کر دستبردار ہونے والے کو دوبارہ
مطالبے کا اختیار نہیں ۵۶۳

﴿کتاب الوکالۃ﴾

- (وکالت کے مسائل کا بیان) ۵۶۶
- عقدِ وکالت میں مضاربت کے طور پر اُدھار چیز فروخت کرنے اور وکیل سے فوری ثمن کی
ادائیگی کا مطالبہ کرنے کا حکم ۵۶۶

﴿کتاب القسمۃ﴾

- (تقسیم کے مسائل کا بیان) ۵۶۸
- چار بھائیوں کے درمیان زمین کی تقسیم پر تنازعے کا حل ۵۶۸

پیش لفظ

بسم الله الرحمن الرحيم

الحمد لله رب العالمين، والصلوة والسلام على رسوله الكريم، وعلى آله

وأصحابه أجمعين، وعلى كل من تبعهم بإحسان إلى يوم الدين

اما بعد.

فتاویٰ عثمانی کی تیسری جلد آپ کی خدمت میں پیش کی جا رہی ہے۔ جیسا کہ پہلی جلد کے شروع میں میں نے عرض کیا تھا، اگرچہ بزرگوں کے ارشاد کی تعمیل میں فتویٰ نویسی کی خدمت عمر کے بالکل ابتدائی دور ہی میں شروع کر دی تھی، اور مشاغل کے ہجوم کے باوجود اب تک جاری ہے، لیکن یہ احساس ہمیشہ دامن گیر رہتا ہے کہ یہ بڑی نازک اور پر خطر ذمہ داری ہے، اور اللہ تعالیٰ کی توفیق اور بزرگوں کی دُعائیں شامل حال نہ ہوں، تو انسان اس ذمہ داری سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتا۔

یہ تیسری جلد بطور خاص ایسے مسائل پر مشتمل ہے جن کا تعلق زیادہ تر معاملات سے ہے۔ اور ہمارے دور میں معاملات کی ایسی نئی اور پیچیدہ صورتیں سامنے آ گئی ہیں کہ بسا اوقات اُن کا صریح حکم فقہ کی قدیم کتابوں میں نہیں ملتا، اس لئے فتویٰ کی ذمہ داری اور زیادہ مشکل اور نازک ہو جاتی ہے، کیونکہ ان مسائل میں فقہی اصولوں کو صورتِ مسئلہ پر منطبق کرنے کے لئے فقہی نظائر سے حکم مستنبط کرنا پڑتا ہے۔ اس استنباط میں غلطی کا امکان بھی ہے، اور آراء کے اختلاف کی بھی گنجائش رہتی ہے۔ بعض اوقات ایک ہی مسئلے کی کئی جہتیں ہوتی ہیں، اور ان میں سے کسی ایک کو ترجیح دینی پڑتی ہے۔ اس لئے یہ فتاویٰ لکھتے وقت اگرچہ اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہوئے اپنی بساط کے مطابق پوری تحقیق سے کام لینے کی کوشش کی گئی ہے۔ لیکن بہر صورت! یہ ایک بشری کاوش ہے، اور کاوش بھی ایک ایسے شخص کی جسے اپنی کم علمی اور بے مائیگی کا احساس ہے۔ اس لئے اسے اس توقع پر شائع کرنے کی اجازت دی ہے کہ ان شاء اللہ وہ اہل علم کی نظر سے گزرے گی تو یا اُس کی تصدیق ہو جائے گی، یا کوئی غلطی ہوئی ہو تو اُس

پر متنبہ ہونے کا موقع مل جائے گا۔ میں اس بات پر اللہ تعالیٰ کا جتنا شکر ادا کروں کم ہے کہ فتاویٰ عثمانی کی پہلی دو جلدوں کو بہت سے اہل علم و فتویٰ نے محبت کی نظر سے دیکھا ہے، اور ان میں سے کچھ حضرات نے اُس کی بعض فروگزاشتوں پر بھی متنبہ فرمایا ہے۔ چنانچہ ایسے اُمور کی تصحیح نئے ایڈیشنوں میں کر دی گئی ہے، اور جہاں ضروری سمجھا گیا، اس کا اعلان ماہنامہ ”البلاغ“ میں بھی شائع کر دیا گیا ہے۔ اس تیسری جلد کے بارے میں بھی اللہ تعالیٰ کی رحمت سے اُمید ہے کہ حضرات اہل علم اُس کو بھی اپنی شفقتوں سے محروم نہیں فرمائیں گے۔

عزیز گرامی قدر مولانا محمد زبیر حق نواز صاحب نے اس جلد کی ترتیب و تہذیب اور تیاری میں بطور خاص جس عرق ریزی کا مظاہرہ کیا ہے، اور جس قابلیت اور سلیقے کے ساتھ اُسے پیش کیا ہے، اُس کو خراج تحسین پیش نہ کرنا بڑی ناسپاسی ہوگی۔ مختلف رجسٹروں، کاپیوں اور فائلوں سے فتاویٰ کا انتخاب کر کے اُن کی ترتیب کے ساتھ تخریج اور تعلیق میں انہوں نے غیر معمولی محنت اٹھائی ہے، جس کا قارئین کو جزوی اندازہ ضرور ہو جائے گا، لیکن وہ اُن کی حقیقی محنت سے یقیناً بہت کم ہوگا۔ اُن کے لئے میں یہ دُعا ہی کر سکتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ اُن کی عمر، اُن کے علم اور عمل میں ظاہری و باطنی ترقیات عطا فرمائیں، اور ان کو صدق و اخلاص کے ساتھ دین کی خدمت کی بیش از بیش توفیق عطا فرمائیں۔ آمین ثم آمین۔

اگر اس کتاب کے کسی حصے سے کسی کو فائدہ پہنچے تو یہ محض اللہ تبارک و تعالیٰ کا کرم ہے، اور اُن سے میری درخواست ہے کہ وہ اس ناکارہ کو حیا و میتاً اپنی دُعاؤں میں یاد فرمائیں۔ جزاہم اللہ تعالیٰ خیراً۔ وما توفیقی إلا باللہ العلیّ العظیم۔

بندہ

محمد تقی عثمانی عفا اللہ تعالیٰ عنہ

دارالعلوم کراچی

۵ جمادی الثانیہ ۱۴۳۱ھ



بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

عرض مرتب

الْحَمْدُ لِلَّهِ وَكَفَى وَسَلَامٌ عَلَى عِبَادِهِ الَّذِينَ اصْطَفَى، أَمَّا بَعْدُ:

تقریباً تین سال پہلے حضرت والا دامت برکاتہم کے فتاویٰ کی دو جلدیں منظرِ عام پر آئیں جو ”کتاب الإیمان والعقائد“ سے ”کتاب الطلاق“ تک کے ابواب پر مشتمل تھیں۔ اب الحمد للہ ”فقہ المعاملات“ سے متعلق تیسری جلد آپ کے ہاتھوں میں ہے جو ”کتاب الشریکة والمضاربة“ سے لے کر ”کتاب القسمة“ تک کے ابواب پر مشتمل ہے، اس جلد میں درج ذیل ابواب سے متعلق مسائل ہیں:-

کتاب الشریکة والمضاربة، کتاب البیوع، کتاب الربا والقمار والتأمين، کتاب الإجارة، کتاب الرهن، کتاب الهبة، کتاب الودیعة والعارية، کتاب اللقطة، کتاب الغصب والضمان، کتاب الجہاد، کتاب الامارة والسیاسة، کتاب الدعوی والشهادات والقضاء، کتاب الحدود، کتاب الجنایات، کتاب الصلح، کتاب الوکالة، کتاب القسمة.

اللہ تعالیٰ نے حضرت والا دامت برکاتہم کو علمی دنیا میں جو امتیازی شان عطا فرمائی ہے، خصوصاً حدیث، فقہ اور فتویٰ کے میدان میں جو مقام بلند عطا فرمایا ہے اس کی بنا پر توقعات سے بڑھ کر بحمد اللہ ان فتاویٰ کو اہل علم اور اربابِ فتویٰ میں غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی، اور چونکہ حضرت والا دامت برکاتہم کے قلم میں خداداد کشش اور اندازِ بیان نہایت آسان و دلنشین ہے اس لئے کچھلی دونوں جلدیں اہل فتویٰ کے علاوہ عوام الناس میں بھی نہایت مقبول ہوئیں۔ چنانچہ کچھلی جلدوں کے منظرِ عام پر آنے کے بعد ان کے کئی ایڈیشنوں کی اشاعت، ان کی مانگ میں مسلسل اضافہ اور مختلف زبانوں میں ترجمے کی درخواستوں سے اس کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے بلکہ اطلاع کے مطابق انگلش اور بنگلہ زبانوں میں اس کا ترجمہ جاری ہے اور حال ہی میں پشتو میں ترجمہ ہو کر یہ جلدیں منظرِ عام پر آگئی ہیں۔ اُردو داں

عوامی طبقے میں بھی اس کتاب نے دیگر کتبِ فتاویٰ کی نسبت امتیازی حیثیت حاصل کی، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ کسی ایسے شخص کے سامنے جو حضرت کی شخصیت سے واقف ہو ان فتاویٰ کی اشاعت کا ذکر ہوتا ہے تو وہ نہایت بے چینی سے کتاب کے حصول کا متلاشی بن جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے کتبِ تفسیر میں جس طرح حضرت کے عظیم اور جلیل القدر والد ماجد مفتی اعظم پاکستان مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ کی معرکہ الآراء تفسیر ”معارف القرآن“ کو بلندی اور مقبولیت عطا فرمائی ہے، اسی طرح کتبِ فتاویٰ میں ”فتاویٰ عثمانی“ کو بھی عوام و خواص میں ایسی ہی مقبولیت عامہ عطا فرمائی ہے، فللہ الحمد ولہ الشکر۔

ایسی صورتِ حال میں بجاطور پر احباب کا اصرار تھا کہ اگلی جلد فوری طور پر منظرِ عام پر آنی چاہئے، ان کا اصرار اس وجہ سے بھی زیادہ تھا کہ یہ جلد معاملات سے متعلق مسائل پر مشتمل ہے جو حضرت والا دامت برکاتہم کا خصوصی میدان ہے، اور اس کی ضرورت بھی زیادہ پیش آتی ہے، نیز بندہ کی اپنی خواہش بھی یہی تھی کہ تیسری جلد حتی الامکان جلد تکمیل پذیر ہو، مگر بندہ کی کمزوری کے علاوہ ایک اہم سبب اس کی تاخیر کا یہ بھی تھا کہ یہ جلد فقہ المعاملات پر مشتمل تھی جس پر تحقیق و تخریج کا کام بقیہ حصوں کے مقابلے میں نسبتاً دشوار اور زیادہ توجہ طلب تھا، خصوصاً جدید فقہی مسائل کی تخریج میں اصولِ فتویٰ کے مطابق اولاً تو اس کا صریح جزئیہ اور حوالہ تلاش کیا جاتا ہے، ورنہ قریب ترین نظیر یا قدیم مثال سے استیناس کرنا پڑتا ہے، اور آخری درجے میں اصولی عبارات سے مسئلے کا حل نکالا جاتا ہے، نیز محض حوالہ جات کے اعتبار سے ہی نہیں بلکہ مسئلے کے عنوان، ابواب کی ترتیب، موضوعات کی تقدیم و تاخیر، غرض ہر پہلو سے اس جلد کے کام کا پہلی جلدوں کے مقابلے میں زیادہ ہونا ناگزیر تھا، تاہم اس کے باوجود بندہ اسے اپنی کمزوری قرار دیتے ہوئے اس تاخیر پر معذرت خواہ ہے، اب ان شاء اللہ چوتھی جلد توقع سے پہلے منظرِ عام پر لا کر اس تاخیر کے ازالے کی کوشش کی جائے گی۔

فتاویٰ کی دیگر جلدوں کے مقابلے میں اس جلد کو اس اعتبار سے امتیاز حاصل ہے کہ یہ حصہ فقہ المعاملات سے متعلق ہے جو حضرت والا دامت برکاتہم کا خصوصی موضوع اور میدان ہے، اور ایک بزرگ کے بقول اس باب میں اللہ تعالیٰ نے حضرت والا دامت برکاتہم کو اپنے وقت کا ”امام محمد“ بنایا ہے۔ دُنیا بھر میں معاملات کے متعلق جدید فقہی مسائل کے حل کے لئے اُمت کی نظریں حضرت والا دامت برکاتہم کی طرف اٹھتی ہیں اور مشرق و مغرب کے لوگ جدید مسائل کے متعلق حضرت والا دامت برکاتہم کے پاس سوالات بھیجتے اور حضرت کی رائے کے منتظر رہتے ہیں۔ اور عرب و عجم میں ہر بڑے علمی فورم پر جدید مسائل میں حضرت والا دامت برکاتہم کی رائے کا خصوصی وزن محسوس کیا جاتا ہے، چنانچہ اب تک کتبِ فتاویٰ میں سب سے زیادہ جدید مسائل اس کتاب میں ذکر کئے گئے ہیں۔

کتاب میں آنے والے فتاویٰ سے متعلق یہاں چند عمومی باتوں کی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے جو صرف اس جلد سے متعلق نہیں بلکہ دیگر جلدوں سے بھی متعلق ہیں۔ ایک یہ کہ بعض سوالات کے جوابات میں قاری کو اجمال و اختصار معلوم ہوتا ہے، قاری یہ سمجھتا ہے کہ اس کا جواب کسی قدر تفصیلی ہونا چاہئے تھا۔ یہاں قارئین پر یہ بات واضح ہو کہ ایسے مقامات پر اختصار کی کئی وجوہات ہوتی ہیں، ان میں ایک اہم وجہ جو درحقیقت قارئین کے علم میں نہیں ہوتی، یہ ہے کہ حضرت والا دامت برکاتہم کے پاس بذریعہ ڈاک جو سوالات آتے ہیں، ان میں بسا اوقات مستفتی ایک تفصیلی سوال نامہ بھیجتا ہے، جس میں سائل نے کئی سوالات پوچھے ہوتے ہیں، مگر سائل کا اصل مقصود کوئی ایک سوال ہوتا ہے، جس کی سائل نے مکمل تفصیل طلب کی ہوتی ہے، اور مستفتی کے باقی سوالات جو مختلف نوعیت اور مختلف ابواب سے متعلق ہوتے ہیں ضمنی ہوتے ہیں، جن کے متعلق وہ صرف جواز و عدم جواز جاننا چاہتا ہے، زیادہ تفصیل کا وہ طلب گار نہیں ہوتا، چنانچہ حضرت والا دامت برکاتہم سائل کے مقصودی اور مرکزی سوال کا تو تفصیلی جواب مرحمت فرماتے ہیں، اور اس کے مختلف النوع ضمنی و جزوی سوالات کا مختصر جواب عنایت فرماتے ہیں۔

اس کے بعد احقران مختلف النوع سوالات کو الگ الگ کر کے ہر سوال کو اس کے متعلق باب میں منتقل کرتا ہے، قارئین چونکہ سائل کے اصل سوال اور اصل حقیقت سے نا آشنا ہوتے ہیں، اس لئے جب وہ کسی سوال کا کوئی مختصر جواب دیکھتے ہیں تو اجمال محسوس کرتے ہیں، حالانکہ حقیقتاً وہ کسی تفصیلی سوال نامے کا کوئی ضمنی سوال ہوتا ہے جس کے جواب میں اس مقام پر حضرت والا دامت برکاتہم نے اصول فتویٰ کے مطابق ضروری اختصار سے کام لیا ہے۔

ایک وضاحت یہ بھی ضروری ہے کہ اس مجموعے میں بہت سے فتاویٰ ایسے ہیں جو کافی عرصہ تقریباً چالیس پچاس سال پہلے لکھے گئے تھے، اور اس عرصے میں بعض مسائل میں چونکہ تحقیق بدل گئی ہے، اس لئے کئی فتاویٰ میں حضرت والا دامت برکاتہم نے نظر ثانی کے دوران مناسب مقامات پر تبدیلی فرمادی ہے، تاہم اس کے باوجود اگر کہیں نفس مضمون یا فتویٰ یا حوالہ وغیرہ میں کوئی غلطی ہو تو اس کی ذمہ داری بندہ ناچیز پر ہے، حضرت والا کی ذات اس سے مستثنیٰ ہے۔

نیز ایک بات یہ بھی ذکر کرنا ضروری ہے جس کی طرف پہلی جلد میں اشارہ کیا گیا تھا، وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت والا دامت برکاتہم سے جو علمی و تحقیقی کام لیا ہے، خصوصاً فقہ و فتویٰ کے میدان میں حضرت کی تحقیقات اور فتاویٰ کا کام اتنا ہمہ جہت اور ہمہ گیر ہے کہ اسے منضبط کرنا مشکل ہے، اس لئے اس جلد کے بعد چوتھی جلد بھی بحمد اللہ تیاری کے مراحل میں ہے، اور بہت جلد ان شاء اللہ منصہ شہود پر

جلوہ گر ہوگی، تاہم چوتھی جلد کی اشاعت کے بعد بھی یہ کہنا درست نہیں ہوگا کہ اس مجموعے میں حضرت والا دامت برکاتہم کے تمام فتاویٰ آگئے ہیں، بلکہ جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا تھا کہ ”فتاویٰ عثمانی“ دراصل حضرت کے ان فتاویٰ کے مجموعے کا نام ہے جو دارالافتاء جامعہ دارالعلوم کراچی کے رجسٹروں میں محفوظ ہوئے ہیں، جبکہ بعض فتاویٰ ابتداء میں نقل و حفاظت کا انتظام نہ ہونے کی وجہ سے شامل اشاعت نہیں ہو سکے، اور ایک بڑی تعداد ان فتاویٰ کی ہے جو حضرت والا دامت برکاتہم نے دُنیا بھر سے اُردو، انگریزی اور عربی میں آنے والے خطوط کے جوابات میں تحریر فرمائے، اور چونکہ خطوط کی نقل محفوظ رکھنے کا کوئی انتظام نہیں ہے اس لئے ایسے فتاویٰ بھی شامل اشاعت نہیں ہو سکے۔ کچھ اہم نوعیت کے بعض خطوط محفوظ رکھے گئے ہیں، ان کو اگرچہ اس مجموعے میں شامل کیا گیا ہے مگر ان کی تعداد بہت کم ہے۔ اسی طرح انٹرنیٹ پر بھی بذریعہ ای میل حضرت جوابات عطا فرماتے ہیں جو عموماً معاملات سے متعلق جدید اور اہم نوعیت کے ہوتے ہیں، وہ بھی اس مجموعے میں شامل نہیں ہیں، اسی طرح ”البلاغ“ انگلش میں بھی سوالات کے جوابات کا ایک مستقل سلسلہ ہے جو حضرت والا تحریر فرماتے ہیں، وہ فتاویٰ بھی اس میں شامل نہیں ہیں (البتہ انگریزی فتاویٰ کا ایک مجموعہ زیر طبع ہے)۔

بہر حال! اس مجموعے کی اشاعت کے بعد یہ سمجھنا کہ یہ حضرت کے تمام فتاویٰ ہیں، غلط ہوگا، بلکہ اس کے علاوہ بھی کئی مجموعوں کی گنجائش ہے، ہماری دُعا ہے اور قارئین سے بھی اس خصوصی دُعا کی درخواست ہے کہ اللہ تعالیٰ حضرت والا کو بعافیت عمر دراز عطا فرمائیں اور حضرت والا دامت برکاتہم کا سایہ تادیر سلامتی کے ساتھ ہم پر قائم رکھیں تاکہ علوم و عرفان کا یہ سلسلہ چلتا رہے اور اُمت اسی طرح حضرت والا کی ذات سے استفادہ کرتی رہے۔

آخر میں قارئین سے درخواست ہے کہ اگر وہ حضرت والا دامت برکاتہم العالیہ کے ساتھ بندہ اور اس کے والدین و اساتذہ کو بھی اپنی نیک دُعاؤں میں یاد رکھیں گے تو یہ ان کا احسانِ عظیم ہوگا۔

والسلام

محمد زبیر حق نواز

۲ ربیع الاول ۱۴۳۱ھ



﴿کتاب الشركة والمضاربة﴾

(شرکت و مضاربت (پارٹنرشپ اور سرمایہ کاری) کے مسائل)

۱:- پندرہ فیصد نفع، نقصان کی بنیاد پر ”شرکت“ کا حکم

۲:- مضاربت میں مضارب کے لئے نفع کا ایک حصہ

اور تنخواہ مقرر کرنے کا حکم

سوال:- عرض اینکه کسی شخص کا سرمایہ بندہ اپنی تجارت میں لگا رہا ہے، اس شخص کو سرمایہ کی بنیاد پر نہیں بلکہ نفع و نقصان کی ایک خاص نسبت کی بنیاد پر مثلاً پندرہ فیصد منافع اور پندرہ فیصد نقصان کی بنیاد پر اپنے ساتھ شریک تجارت کر رہا ہوں، کیا از روئے شریعت ایسا کرنا جائز ہے؟

۲:- ایک شخص کا صرف سرمایہ ہے، دوسرے کی صرف محنت ہے سرمایہ نہیں، محنت والے شخص کو مثلاً ۳۰ فیصد فائدہ اور ایک فیصد خاص مقدار تنخواہ بھی دی جائے، جبکہ یہ محنت والا شخص نقصان میں شریک نہیں ہے، از روئے شریعت ایسا کرنا جائز ہے؟
اُمّتی گل، افغان اسٹور

(ابوظہبی، متحدہ عرب امارات)

جواب:- اگر آپ اس شخص سے یہ طے کریں کہ آپ کے اور میرے سرمائے سے تجارت کرنے کے بعد جو کچھ نفع ہوا اس نفع کا ۱۵ فیصد آپ کا ہوگا، تو یہ صورت جائز ہے۔^(۱) البتہ نقصان کی صورت میں ۱۵ فیصد کا تعین اسی صورت میں جائز ہوگا جب اس کا لگایا ہوا سرمایہ تجارت کے کل سرمائے کا ۱۵ فیصد ہو۔ اگر اس کا لگایا ہوا سرمایہ کل تجارت کے سرمائے کے ۱۵ فیصد سے کم یا زیادہ ہے تو اس صورت میں اُسے ۱۵ فیصد نقصان میں شریک کرنے سے شرکت فاسد ہو جائے گی۔ اُصول یہ ہے کہ نفع کا تناسب تو شرکاء باہمی رضامندی سے جو چاہیں مقرر کر سکتے ہیں، لیکن نقصان ہمیشہ سرمائے کے تناسب کے مطابق ہونا ضروری ہے، یعنی جس نے جتنا فی صد سرمایہ لگایا اتنا ہی فیصد نقصان بھی اُٹھائے۔^(۲)

(۲۱) وفی کنز العمال ج: ۱۵ رقم الحدیث: ۴۰۴۸۲ ص: ۱۷۶ الوضیعة علی المال والربح علی ما اصطلاحوا علیہ. وکذا فی مصنف ابن ابی شیبہ ج: ۵ ص: ۴ رقم الحدیث: ۱۰ ومصنف عبدالرزاق ج: ۸ ص: ۱۲۷ رقم الحدیث: ۱۵۰۸۵.

وفی بدائع الصنائع ج: ۶ ص: ۶۲ (طبع سعید) والوضیعة علی قدر المالین متساویاً ومتفاضلاً لأنّ الوضیعة اسم لجزء هالک من المال فیتقدر بقدر المال. وفی فتح القدیر کتاب الشریکة، فصل ولا تنعقد الشریکة الخ، ج: ۶ ص: ۱۷۷ (طبع مصطفى بابی مصر) وفی طبع مکتبه رشیدیہ کوئٹہ ج: ۵ ص: ۳۹۷ الربح علی ما شرط والوضیعة علی قدر المالین الخ. وکذا فی التتارخانیة ج: ۵ ص: ۶۵۵ (طبع ادارة القرآن) والمحیط البرهانی ج: ۶ ص: ۴۰۱ (طبع غفاریہ کوئٹہ)، وعامة کتب الفقہ.

۲:- یہ صورت جائز نہیں ہے، آپ یا تو اس کا نفع میں کچھ فیصد حصہ رکھیں، پھر تنخواہ مقرر کرنا جائز نہیں، کیونکہ یہ مضارب بت ہوگی،^(۱) یا تنخواہ مقرر کریں اور وہ متعین رقم ہو، نفع کا فی صد نہ ہو، نفع میں بحیثیت شریک حصہ دار کوئی فیصد حصہ مقرر نہ کریں، اس صورت میں یہ اجارہ ہوگا، دونوں چیزوں کو جمع کرنا درست نہیں۔^(۲)

واللہ اعلم

۱۲/۷/۱۴۰۸ھ

(فتویٰ نمبر ۱۳۶۵/۳۹ ہ)

(شرکت و مضاربیت سے متعلق چند اہم سوالات اور ان کے جوابات)

۱:- نفع کی ایک مقرر مقدار تک مضاربیت ختم نہ کرنے کے

معاہدے کا حکم

سوال:- دریافت یہ کرنا ہے کہ کیا رب المال مضارب سے یہ معاہدہ کر سکتا ہے کہ جب تک مضارب ایک لاکھ نفع نہ کمالے اس وقت تک مضاربیت ختم کرنے کا اختیار نہیں ہوگا؟ اگر یہ معاہدہ کر لیا تو کیا اس کا پورا کرنا لازم ہوگا یا نہیں؟

جواب:- جو شرط آپ نے لکھی ہے، اس کا جواز نظر نہیں آتا،^(۳) کیونکہ یہ غیر محدود مدت تک مضارب کو پابند کرنے کے مرادف ہے،^(۴) اور اس میں فی الجملہ رب المال کے نفع کی ضمانت بھی ہے۔^(۵)

(۱ و ۲) وفي رد المحتار ج: ۴ ص: ۳۲۶ کتاب الشركة فصل في الشركة الفاسدة مطلب يرجع القياس الخ (طبع سعيد). لا أجر للشريك في العمل بالمشترك.

وفي التنف في الفتاوى كتاب الاجارة اجارة الشريك شريكه ص: ۳۴۹ (طبع سعيد) ولو كان طعام بين رجلين فقال أحدهما لصاحبه احمله الى الموضع كذا ولك في نصيبى من الأجر كذا، أو قال اطحنه ولك في نصيبى كذا من الأجر، جاز ذلك في قول زفر ومحمد بن صاحب ولا يجوز في قول أبي حنيفة وأبي يوسف ومحمد رحمهم الله تعالى.

(۳) وفي المعجم الأوسط للطبرانی ج: ۲ ص: ۱۶۹ (طبع دار الحرمين قاهرة) قال رسول الله صلى الله عليه وسلم:

ثم لا تحل صفقتان في صفقة. وفي مجمع الزوائد ج: ۴ ص: ۸۴ (طبع دار الريان للتراث قاهرة و دار الكتاب العربي بيروت) عن عبد الله بن مسعود رضى الله عنه قال: نهى رسول الله صلى الله عليه وسلم عن صفقتين في صفقة واحدة.

(۴ و ۵) وفي البدائع للكاساني ج: ۶ ص: ۱۰۹ (طبع سعيد) وأما صفة هذا العقد يعنى المضاربة فهو أنه عقد غير

لازم ولكل واحد منهما اعنى رب المال والمضارب الفسخ لكن عند وجود شرطه وهو علم صاحبه.

نیز مضاربیت کی توقیت اور لزوم کی دو صورتوں اور ان کے حکم سے متعلق تفصیلی حوالہ جات کے لئے حضرت والا دامت برکاتہم العالیہ کی کتاب

بحوث فی قضایا فقہیة معاصرة ج: ۲ ص: ۱۷۳ تا ۱۷۷ ملاحظہ فرمائیں۔

(۶) دیکھئے صفحہ ۴۲ و ۴۸ کے حواشی۔

۲:- فسخ مضاربت کی صورت میں سارا مال رَبِّ المال کے حوالے کرنے کے معاہدے کا حکم

سوال:- کیا رَبِّ المال مضارب سے یہ معاہدہ کر سکتا ہے کہ اگر مضارب بت ختم کرنے کا ارادہ ہوا تو مضارب سارا مال رَبِّ المال کے حوالے کر دے، اور رَبِّ المال کی جگہ پر لے جا کر اس کی سیٹنگ کر دے، اگر ایسا معاہدہ کر لیا ہو تو کیا مضارب پر اس کی پابندی ضروری ہے؟

جواب:- فسخ مضارب بت پر اگر رقم نقد ہو تو مضارب اسے واپس کرنے کا پابند ہے، نقد نہ ہو تو تنضیض^(۱) کا، البتہ اگر رَبِّ المال عروض خریدنا چاہے تو جائز ہے، اس صورت میں اگر قیمت خرید میں نفع ہو تو وہ بھی جانبین میں تقسیم ہوگا، پہلے سے یہ شرط کہ فسخ ہونے پر مال رَبِّ المال کو بیچا جائے گا، عقد مضارب بت میں نہیں لگائی جاسکتی، ہاں اگر عقد اس شرط سے خالی ہو، اور بعد میں مضارب وعدہ کر لے تو جائز ہے۔ البتہ مال مضارب بت اگر عروض کی شکل میں ہو، اور ربح ظاہر ہو چکا ہو، اور مضارب رَبِّ المال سے یہ مطالبہ کرے کہ یہ مال میں خریدنا چاہتا ہوں تو رَبِّ المال انکار نہیں کر سکتا۔ چنانچہ امام طحاوی فرماتے ہیں:-

وان كان في تلك العروض فضل أجبر المضارب على بيعها على المضاربة حتى يستوفي رب المال رأس ماله، ويكون الفضل ان كان،

(۱) وفي الهداية كتاب المضاربة فصل في العزل والقسمة ج: ۳ ص: ۲۷۰ و ۲۷۱ (طبع مكتبة رحمانية) وفي طبع سعيد ج: ۳ ص: ۲۲۱ وأن كانا يقتسمان الربح والمضاربة بحالها ثم هلك المال بعضه أو كله ترادى الربح حتى يستوفي رب المال رأس المال لأن قسمة الربح لا تصح قبل استيفاء رأس المال لأنه هو الأصل وهذا بناء عليه وتبع له. وفي المبسوط للسرخسي: الربح لا يظهر ما لم يسلم جميع رأس المال لرب المال لأن الربح اسم للفضل فما لم يحصل ما هو الأصل لرب المال لا يظهر الفضل فقال صلى الله عليه وسلم مثل المؤمن كمثل التاجر لا تخلص له نوافله ما لم تخلص له فرائضه فالتاجر لا يسلم له الربح حتى يسلم له رأس ماله.... الخ.

وفي بدائع الصنائع ج: ۶ ص: ۱۰۷ وإنما يظهر الربح بالقسمة وشرط جواز القسمة قبض رأس المال فلا تصح قسمة الربح قبل قبض رأس المال.... الخ.

دیگر ائمہ کے نزدیک بھی فسخ مضارب بت پر نفع کی حتمی تقسیم کے لئے سرمایہ اور اثاثے کو نقد میں تبدیل کرنا ضروری ہے، دیکھئے: منهاج الطالبین ص: ۱۵، والشرح الصغير على اقرب المسالك ج: ۳ ص: ۷۰۰ لعلامہ احمد الدردیر المالکی و المغنی لابن قدامة ج: ۵ ص: ۳۳ (طبع دار الفکر)۔

(۲) وفي بدائع الصنائع ج: ۶ ص: ۱۰۱ (طبع سعيد) ويجوز شراء رب المال من المضارب وشراء المضارب من رب المال وان لم يكن في المضاربة ربح في قول أصحابنا الثلاثة، وقال زفر لا يجوز الشراء بينهما في مال المضاربة وجه قول زفر ان هذا بيع ماله بماله.... ولنا أن لرب المال في مال المضاربة ملك رقبة لا ملك تصرف وملكه في حق التصرف كملك الأجنبي وللمضارب فيه ملك التصرف لا الرقبة فكان في حق ملك الرقبة كملك الأجنبي حتى لا يملك رب المال منعه عن التصرف فكان مال المضاربة في حق كل واحد منهما كمال الأجنبي لذلك جاز الشراء بينهما.... الخ.

وفي الهندية الباب الرابع (المضاربة) إذا باع رب المال مال المضاربة من المضارب أو باعه المضارب من رب المال فهو جائز سواء كان في المال فضل على رأس المال أو لم يكن.

بینہما علی ما أشرطاً، إلا أن يشاء المضارب أن يعطى رب المال رأس ماله وحصلته من الربح ويحبس العروض بنفسه فلا يكون لرب المال الامتناع عنه. (الشروط الصغير للطحاوی ج: ۲ ص: ۷۳۱ طبع بغداد) (۱)

جہاں تک سیٹنگ کی شرط کا تعلق ہے وہ اموال مبیعہ کی حالت پر موقوف ہے، اگر اموال ایسے ہیں جن میں گھر پر لے جا کر سیٹ کرنا تجارت میں متعارف ہے، تو یہ شرط جائز ہے، ورنہ فاسد۔

۳:- نقدی کے بجائے ”مضاربت بالعروض“ کا حکم

سوال:- اگر رب المال نقدی کی بجائے عروض (سامان) مضارب کو دیتا ہے تو کیا اس

طرح مضاربت درست ہے؟

جواب:- حنفیہ اور جمہور کے نزدیک مضاربت بالعروض درست نہیں، (۲) الا یہ کہ انہیں بیچ کر

نقد بنالیا جائے، البتہ امام احمد کی ایک روایت میں جائز ہے، (۳) اور وقت عقد کی قیمت کو رأس مال

المضاربة قرار دیا جائے گا، (۴) (الانصاف للمرداوی ج: ۵ ص: ۴۰۹)۔ حاجت کے وقت حضرت

تھانوی رحمہ اللہ نے شرکتہ بالعروض میں مالکیہ کا قول (۶) اختیار کرنے کی گنجائش دی ہے۔ (امداد الفتاویٰ

(۱) وفي المبسوط للسرخسی ج: ۲۲ ص: ۶۷ طبع مکتبہ غفاریہ کوئٹہ (باب نفقة المضارب) وإذا اشترى المضارب بمال المضاربة متاعاً وفيه فضل أو لا فضل فيه فأراد المضارب أن يمسكه حتى يجد به ربحاً كثيراً وأراد رب المال أن يبيعه فإن كان لا فضل فيه أجبر المضارب على أن يبيعه أو يعطيه رب المال برأس ماله لأنه لا حق للمضارب في المال في الحال فهو يريد أن يحول بين رب المال وبين ماله بحق موهوم وان كان فيه فضل وكان رأس المال ألفاً والمتاع يساوي ألفين فالمضارب يجبر على بيعه لأن في تأخير حيلولة بين رب المال وبين ماله وهو لم يرض بذلك حين عاقده عقد المضاربة إلا أن للمضارب هنا أن يعطى رب المال ثلاثة أرباع المتاع برأس ماله وحصلته من الربح ويمسك ربع المتاع وحصلته من الربح وليس لرب المال أن يأبى ذلك عليه لأن الربح حق والانسان لا يجبر على بيع ملك نفسه لتحصيل مقصوده. (محمد بيرحق نواز)

(۲) وفي بدائع الصنائع ج: ۶ ص: ۵۹ لا تصح الشركة في العروض. وفيه أيضاً معنى الوكالة من لوازم الشركة والوكالة التي يتضمنها الشركة لا تصح في العروض الخ. وكذا في المبسوط للسرخسی ج: ۱۱ ص: ۱۵۹.

وفي مجلة الأحكام ج: ۴ ص: ۱۳۴۲ (طبع نور محمد کتب خانہ) لا تصح الشركة على الأموال التي ليست معهودة من النقود كالعروض والعقار أي لا تجوز أن تكون هذه رأس مال للشركة.

(۳ و ۴) وفي المغنی لابن قدامة ج: ۵ ص: ۱۰ و ۱۱ (طبع دار الفکر بیروت) فأما العروض فلا تجوز الشركة فيها في ظاهر المذهب نص عليه أحمد. وعن أحمد رواية أخرى أن الشركة والمضاربة تجوز بالعروض وتجعل قيمتها وقت العقد رأس المال، قال أحمد إذا اشتركا في العروض يقسم الربح على ما اشترطا.

(۵) كتاب الشركة (طبع مکتبہ علمية) فعلى الرواية الثانية ويجعل رأس المال قيمتها وقت العقد ... الخ.

(۶) وفي الشرح الصغير على أقرب المسالك للدردير ج: ۳ ص: ۴۵۹ وتصح (بعين) من جانب (وبعرض) من الآخر (بعرضين) من كل جانب عرض (مطلقاً) اتفاقاً جنساً أو اختلافاً كعبد وحمار أو ثوب.

وفي المغنی لابن قدامة ج: ۵ ص: ۱۱ (طبع دار الفکر) مقصود الشركة جواز تصرفهما في المالين جميعاً وكون ربح المالين بينهما وهذا يحصل في العروض كحصوله في الأثمان فيجب أن تصح الشركة والمضاربة بها كالأثمان.

ج: ۳ ص: ۴۹۵)۔^(۱) یہ گنجائش یہاں بھی ہو سکتی ہے۔^(۲)

۴:- مضارب کے لئے فسخ مضاربت کے وقت رَبِّ المال کے بجائے کسی اور کو مال فروخت کرنے کا حکم

سوال:- مضاربت ختم کرنے کا ارادہ ہوا تو رَبِّ المال نے کہا: ”سارا مال مجھ کو فروخت کر دو“ مگر مضارب کہتا ہے کہ: ”میں آپ کو نہیں دوں گا بلکہ میں اپنے فلاں دوست کو فروخت کروں گا“ تو کیا مضارب کو اس کا اختیار ہے کہ رَبِّ المال کے بجائے اپنے دوست کو فروخت کرے؟

جواب:- اگر مضارب کا دوست زیادہ قیمت دے رہا ہو تو یقیناً وہ مقدم ہے، لیکن اگر قیمت دونوں برابر دینا چاہتے ہوں تو اس کا صریح جزئیہ تو یاد نہیں، لیکن قاعدے کا تقاضا یہ ہے کہ رَبِّ المال اسے مجبور نہ کر سکے، کیونکہ مال مضاربت میں حق تصرف کلیۃً مضارب کو حاصل ہوتا ہے، رَبِّ المال کو^(۳) مداخلت کا حق نہیں ہوتا، اگرچہ دوسری جہت یہ ہے کہ رَبِّ المال کو ابتدائی ملک رقبہ حاصل ہونے کی بنا پر ترجیح دی جائے، لیکن بظاہر یہ محض اخلاقی ترجیح ہے، قضاء اس پر مجبور کرنے کی کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی۔

۵:- شرکت و مضاربت اکٹھے کرنے کی صورت میں دونوں کا نفع اکٹھا فیصد کے طور پر مقرر کرنے کا حکم

سوال:- اگر ایک شخص دوسرے کے ساتھ شرکت اور مضاربت دونوں معاملات اکٹھے کرنا چاہتا ہے تو دونوں معاملات کا نفع اکٹھے فیصد میں متعین ہو سکتا ہے؟ مثلاً ایک نے دوسرے کو لاکھ روپیہ بطور شرکت اور لاکھ روپیہ بطور مضاربت دیا اور کہا کہ: ”مجموعی طور پر جو نفع ہو اس کا ۴۰ فیصد دینا“ تو کیا اس طرح درست ہے؟

(۱) طبع مکتبہ دار العلوم کراچی۔
(۲) جیسا کہ المغنی لابن قدامة میں شرکت کے ساتھ مضاربت بالعروض کے جواز کی بھی صراحت کی گئی ہے۔
وفی المغنی لابن قدامة ج: ۵ ص: ۱۱ (طبع دار الفکر) مقصود الشریکۃ جواز تصرفہما فی المالین جمیعاً و کون ربح المالین بینہما و هذا یحصل فی العروض کحصولہ فی الاثمان فیجب أن تصح الشریکۃ و المضاربة بہا کالاثمان۔ نیز جس مال سے شرکت جائز ہے اس سے مضاربت بھی جائز ہے، کما فی الہدایۃ ج: ۳ ص: ۲۱۳ طبع سعید وفی طبع مکتبہ رحمانیہ ج: ۳ ص: ۲۶۳ ولا تصح إلا بالمال الذی تصح بہ الشریکۃ الخ۔
(۳ و ۴) وفی الہدایۃ ج: ۳ ص: ۲۱۴ (طبع سعید) و اذا صحت المضاربة مطلقة جاز للمضارب أن یبیع و یشتري و یوکل و یسافر و یضع و یودع. و فیہا أيضًا قبلہا ج: ۳ ص: ۲۱۴ (طبع سعید) ولا بد أن یکون المال مسلماً الی المضارب ولا یدل رب المال فیہ الخ۔

جواب:- یہ صورت اسی وقت متصور ہو سکتی ہے جب مضارب بھی اپنا سرمایہ لگا رہا ہو، لہذا اگر مجموعی کاروبار ایک ہی ہے تو اس کا حاصل یہ ہوا کہ دو لاکھ بطور مضارب بت دیئے اور مضارب کو اپنا سرمایہ لگانے کی اجازت دی^(۱)، اس صورت میں شرط صرف یہ ہے کہ رب المال کا حصہ نفع مال شرکت میں اس کے رأس المال کے تناسب سے زائد نہ ہو، لہذا چالیس فیصد نفع کا جواز اس بات پر موقوف ہے کہ مضارب اپنی طرف سے کتنا سرمایہ لگا رہا ہے؟ کیونکہ شرط عدم العمل کی صورت میں شریک اپنے رأس المال کے تناسب سے زیادہ حصہ متعین نہیں کر سکتا، وراجع البدائع^(۲)، ایسی صورت میں نفع کی تقسیم کے طریقے پر بندے نے اپنی اس انگریزی کتاب میں بحث کی ہے جس کا ترجمہ مولانا زاہد صاحب نے ”اسلامی بینکاری کے اصول“ کے نام سے کیا ہے۔

۶:- ایک شریک بغیر عمل کے پانچ لاکھ روپے دوسرا ایک لاکھ بمع عمل شرکت کریں تو کیا حکم ہے؟

سوال:- دو شخص شرکت کا معاملہ اس طرح کرتے ہیں کہ ایک شخص ۵ لاکھ روپیہ دے گا لیکن کام نہیں کرے گا، اور دوسرا ایک ہزار روپیہ دے گا لیکن ساتھ کام بھی کرے گا، لیکن نفع دونوں میں نصف نصف تقسیم ہوگا، تو کیا اس طرح درست ہے؟ اگر درست ہے تو اس میں اور مضارب بت میں کیا فرق ہوگا؟ بندے کے خیال میں صرف دو فرق ہیں، ۱- کام کرنے والا $\frac{۱}{۵}$ نقصان بھی برداشت کرے گا، ۲- مال خریدنے کے بعد اس کی مالیت میں اضافہ ہوا تو $\frac{۱}{۵}$ کے بقدر کام کرنے والا بھی شریک ہوگا۔ ان دو کے علاوہ کیا کچھ اور بھی فرق ہے؟

بندہ محمد عامر عفی عنہ

خادم جامعة الرشید، احسن آباد

جواب:- فرق نمبراً درست ہے، نمبر ۲ درست نہیں، کیونکہ کام کرنے والا نفع کے اضافے میں $\frac{۱}{۵}$ کے حساب سے نہیں بلکہ طے شدہ تناسب (یعنی نصف نصف) کے حساب سے شریک ہوگا۔^(۳)

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۲ محرم الحرام ۱۴۲۶ھ

(۱) وفي المبسوط للسرخسی ج: ۲۲ ص: ۱۳۳ خلط ألف المضاربة بألف من ماله قبل الشراء جاز.

(۲) بدائع الصنائع ج: ۶ ص: ۶۳ (طبع سعید).

(۳) وفي مصنف عبد الرزاق ج: ۸ ص: ۱۴۷ رقم الحديث: ۱۵۰۸۵ وكنز العمال ج: ۱۵ ص: ۱۷۶ رقم الحديث: ۴۰۴۸۲ الوضیعة علی المال والربح علی ما اصطلاحوا علیه وكذا فی مصنف ابن أبی شیبہ ج: ۵ ص: ۴ وفتح القدير ج: ۵ ص: ۳۹۷.

کم سے کم ۵ فیصد اور زیادہ سے زیادہ ۲۰ فیصد منافع دینے والے ادارے ”صمد پراپرٹی انوسٹمنٹ“ میں سرمایہ کاری کا حکم

سوال:- عرض یہ ہے کہ آج کل کراچی میں کاروباری ادارے عوام سے رقم لے کر اپنے کاروبار میں لگاتے ہیں، اور اس کے منافع عوام میں بھی تقسیم کر رہے ہیں، یہ ادارے پہلے سے مقرر کردہ منافع بھی دیتے ہیں، جو کہ سود ہے۔ بعض ادارے باقاعدہ منافع کی تقسیم کر رہے ہیں جو ہر ماہ کم یا زیادہ ہوتا رہتا ہے اور ان کا کام تقریباً بینک جیسا ہے، جو عوام کا پیسہ لے کر مختلف کاروباروں میں لگاتے ہیں اور منافع کھاتہ داروں میں تقسیم کرتے ہیں۔ اسی طرح کا ایک ادارہ ”صمد پراپرٹی انوسٹمنٹ کارپوریشن“ ہے جو زمینوں، پلاٹوں اور مکانات وغیرہ کا کاروبار کرتا ہے، اس کا منافع بھی بڑھتا یا کم ہوتا رہتا ہے، جو کہ سود کی تعریف میں نہیں آتا۔ پچھلے دنوں انہوں نے مختلف مہینوں میں سات فیصد، ساڑھے آٹھ فیصد اور نو فیصد منافع بھی دیا ہے، لیکن ان کے ساتھ حصے میں لکھا ہوتا ہے کہ پانچ فیصد سے بیس فیصد تک منافع دیا جائے گا۔ سوال یہ ہے کہ:

۱:- کم سے کم منافع پانچ فیصد مقرر کرنے سے کیا یہ سود کی تعریف میں آئے گا؟ جبکہ منافع بہر حال کم یا زیادہ ہوتا رہتا ہے۔

۲:- زیادہ سے زیادہ بیس فیصد حد مقرر کر دینے سے کوئی شرعی قباحت تو نہیں؟

۳:- اس کاروبار کو جائز شرعی صورت دینے کے لئے معاہدے میں کیا تبدیلی کرنی ہوگی؟ وضاحت فرمائیں۔

جواب:- اس قسم کے کاروبار کا جائز یا ناجائز ہونا اس کاروبار کے مفصل طریق کار پر موقوف ہے، صرف ایک آدھی بات دیکھ کر کوئی حتمی حکم لگانا درست نہیں، لہذا جس کاروبار کے بارے میں حکم معلوم کرنا ہو، اس کے طریق کار کی تفصیل لکھتے تب جواب دیا جاسکے گا۔

۱:- اگر معاہدے میں یہ طے کر لیا جائے کہ سرمایہ کا کم سے کم پانچ فیصد نفع ضرور دیا جائے گا

(۱)

تب یہ سود ہے۔

۲:- زیادہ سے زیادہ نفع مقرر کرنے کی کئی صورتیں ہو سکتی ہیں، متعلقہ کاروبار کی تفصیل لکھیں تو جواب دیا جاسکے گا۔ یہ دونوں باتیں اس وقت ہوں جب معاہدے میں کم سے کم منافع کی شرح سرمائے کے تناسب سے طے کی گئی ہو، لیکن اگر معاہدہ یہ ہو کہ جو کچھ بھی منافع ہوگا اس منافع کا ۵ یا دس فیصد دیا جائے گا، اور اگر کچھ منافع نہ ہو تو کچھ نہ دیا جائے گا، لیکن ساتھ ہی سرمایہ لگانے والے کو یہ بتا دیا گیا کہ عموماً اس کاروبار میں اتنے فیصد تک نفع ہوتا ہے، تو اس میں کچھ حرج نہیں۔

واللہ اعلم

۱۴۰۷/۱۱/۲ھ

(فتویٰ نمبر ۱۸۵۶/۳۸ھ)

مشترک مال تجارت باہر سے منگوانے کی صورت میں اگر جہاز دُوب جائے تو شریک سے نقصان کی تلافی کرانے کا حکم

سوال:- ہم نے ایک مال چائنا سے منگوا یا تھا، اس مال میں ایک صاحب کی شراکت تھی، نفع نقصان آدھا آدھا، مال منگوانے میں پورا پیسہ ہم نے لگایا کیونکہ ہمارا اور اُن کا اس طرح شرکت کا مال آتا رہتا ہے کہ کبھی ہم نے منگوا یا، کبھی انہوں نے منگوا یا، کبھی پیسہ بعد میں ہم نے دے دیا، کبھی پیسہ

(۱ و ۲) وفي الهندية ج: ۲ ص: ۳۰۲ (طبع رشیدیہ کوئٹہ) وأن يكون الربح معلوم القدر فان كان مجهولاً تفسد الشركة وأن يكون الربح جزءاً شائعاً في الجملة لا معيناً فان عيناً عشرة أو مائة أو نحو ذلك كانت الشركة فاسدة. وفي الهداية ج: ۲ ص: ۶۱۱ (طبع مکتبہ رحمانیہ) ولا يجوز الشركة اذا شرط لأحدهما دراهم مسماة من الربح لأنه شرط يوجب انقطاع الشركة فعساه لا يخرج إلا قدر المسمى لأحدهما ونظيره في المزارعة. وفي مجمع الأنهر ج: ۲ ص: ۵۴۴ (طبع مکتبہ غفاریہ) وركنها الايجاب والقبول وشرطها عدم ما يقطعها كشرط دراهم معينة من الربح لأحدهما. وفي الدر المنقي مع مجمع الأنهر كتاب المضاربة ج: ۳ ص: ۴۴۶ (طبع مکتبہ غفاریہ کوئٹہ) وكون الربح بينهما مشاعاً فتفسد ان شرط لأحدهما عشر دراهم مثلاً. وفي تبیین الحقائق ج: ۴ ص: ۲۴۸ كتاب الشركة (طبع سعید) وتفسد ان شرط لأحدهما دراهم مسماة من الربح لأنه شرط يوجب انقطاع الشركة في بعض الوجوه فلعله لا يخرج إلا القدر المسمى لأحدهما من الربح. وكذا في البحر الرائق ج: ۵ ص: ۱۷۷ (طبع سعید) وخلاصة الفتاوى ج: ۴ ص: ۲۹۴ (طبع امجد اکیڈمی لاہور) وفي شرح المجلة لسليم رستم باز رقم المادّة: ۱۳۳۷ ج: ۲ ص: ۷۱۳ (طبع دار الکتب العلمیہ بیروت) يشترط أن تكون حصص الربح التي تنقسم بين الشركاء جزءاً شائعاً كالنصف والثلث والربع فاذا اتفق الشركاء على اعطاء أحدهم قدرًا معينًا كانت الشركة باطلة. وكذا في شرح المجلة للأتاسی ج: ۴ ص: ۲۶۱ (طبع مکتبہ حبیبیہ کوئٹہ).

بعد میں انہوں نے دے دیا، بہر کیف دس بارہ سال سے کاروباری تعلقات ہیں، اور ایک دوسرے کو ایک دوسرے پر پورا بھروسہ ہے۔ یہ مال جس جہاز پر آرہا تھا وہ خداوند قدوس کی مرضی سے پورا کا پورا ڈوب گیا، کیا ہم اس مال کی جس کی ہم نے ادائیگی پوری کی پوری کردی ہے اس کی آدھی رقم حمید صاحب سے جو نفع و نقصان میں شریک تھے لے سکتے ہیں؟

جواب:- اگر مال منگوانے سے پہلے شرکت کا یہ معاہدہ ہو چکا تھا کہ مال منگوانے میں دونوں فریق آدھا آدھا روپیہ لگائیں گے اور نفع و نقصان میں نصف نصف شریک ہوں گے، اور پھر مال اسی معاہدے کے تحت ان کے علم اور اطلاع سے منگوا یا گیا تھا، تو اس مال کے منگوانے میں جو رقم خرچ ہوئی آپ کے شریک اس کا نصف حصہ آپ کو دینے کے ذمے دار ہیں، خواہ مال وصول ہوا ہو یا ڈوب گیا ہو۔ بدائع میں ہے:

”واختلاط الربح يوجدون اشترى كل واحد بمال نفسه على حدة، لأن الزيادة وهي الربح تحدث على الشركة حتى لو هلك بعد الشراء بأحدهما كان الهالك من المالكين جميعاً لأنه هلك بعد تمام العقد.“

(۱)
(بدائع ج: ۶ ص: ۶۰)

واللہ اعلم

ھ ۱۳۹۶/۱۱/۱۱

(فتویٰ نمبر ۲۵۲۸/۵۲۷)

کاروبار میں شرکت کے لئے رقم دینے کے بعد نفع کے بجائے ماہانہ سود کا مطالبہ کرنے کا حکم

سوال:- دو سال ہوئے والد صاحب کا انتقال ہو گیا ہے، بوقت انتقال والد صاحب پر قرضہ تھا، جو کہ والد صاحب کے کاروبار سے ادا کیا جا رہا ہے، ان شاء اللہ حال ہی میں تمام قرضہ ادا ہو جائے گا۔ ایک شخص ایسا بھی ہے کہ اُس نے چلتے ہوئے کاروبار یعنی والد صاحب کی دکان میں دس

(۱) طبع سعید، وفي فتح القدير ج: ۵ ص: ۳۹۹ (طبع رشیدیہ کوئٹہ) بخلاف ما بعد الخلط حيث يهلك على الشركة لأنه لا يتميز فيجعل الهالك من المالكين، وان اشترى أحدهما بماله وهلك مال الآخر قبل الشراء فالمشترى بينهما على ما شرط لأن الملك حين وقع وقع مشتركاً بينهما لقيام الشركة وقت الشراء... الخ. وفي درر الحکام شرح غرر الأحکام، أركان الشركة وشروطها وبعده أي بعد الخلط يهلك عليهما لأنه لا يتميز فيهلك من المالكين فان هلك مال أحدهما بعد شراء الآخر بماله فمشريه لهما على ما شرط لأن الملك حين وقع مشتركاً بينهما لقيام الشركة وقت الشراء فلا يتغير الحكم بهلاك مال الآخر. وراجع أيضاً الى الفتاوى الهندية ج: ۴ ص: ۳۰۹ الى ص: ۳۱۱ (طبع رشیدیہ کوئٹہ).

ہزار روپیہ لگا کر شراکت کی، لیکن دو ماہ کے بعد شرکت کی بجائے سود لینے کا مطالبہ کر دیا، ورنہ دس ہزار کی واپسی کا مطالبہ کر دیا، اس لئے مجبوراً ماہانہ سود دینا پڑا، اس طرح کچھ عرصہ سود دیا جاتا رہا لیکن دکان دن بدن منڈی والوں کی مقروض ہوتی چلی گئی اور دکان کا کاروبار ختم ہو گیا، مجبوراً والد صاحب بیرون ملک چلے گئے تاکہ اس شخص کا قرض ادا کیا جائے، قرض کی ادائیگی کے وقت سود کے نام پر جو رقم دی گئی ہے وہ منہا کر کے دی جائے یا پوری دی جائے؟

جواب:- سود کی رقم کا لین دین جائز نہیں ہے،^(۱) دو ماہ بعد سود کے مطالبے کا مطلب یہ ہے کہ انہوں نے شرکت ختم کر دی، ایسی صورت میں حساب ہونا چاہئے تھا، اور اس وقت نفع یا نقصان میں جو حصہ بنتا وہ ان کو دیا جاتا، لیکن چونکہ ایسا نہیں ہوا، اس لئے اب اندازہ لگائیں کہ جب شرکت ختم ہوئی، اس وقت دکان میں نفع تھا یا نہیں، اگر نفع تھا تو جو رقم سود کے طور پر دی گئی، وہ اگر نفع کے برابر ہو تو ٹھیک، اور زائد ہو تو اُسے منہا کر کے انہیں اصل رقم واپس کر دیں جو دس ہزار روپے ہے۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

ھ ۱۳۹۷/۹/۱۳

(فتویٰ نمبر ۹۵۰/۲۸ ج)

تاج کمپنی لمیٹڈ میں ۱۵ تا ۲۰ فیصد منافع کی شرط پر سرمایہ کاری کا حکم

سوال:- تاج کمپنی لمیٹڈ قرآن حکیم کی طباعت اور نشر و اشاعت کا ایک معروف ادارہ ہے، عوام الناس کو شرکت کی دعوت دیتا ہے، ۱۵ تا ۲۰ فیصد منافع کی پیشکش کرتا ہے، اس میں سرمایہ لگا کر منافع لینا جائز ہے یا نہیں؟

جواب:- یہ منافع اگر کاروبار کے مجموعی منافع کے بجائے لگائی ہوئی رقم کا ۱۵ یا ۲۰ فیصد ہوتا ہے تو یہ منافع نہیں بلکہ سود ہے،^(۲) اور اس کا لین دین جائز نہیں،^(۳) جائز صورت صرف یہ ہے کہ جو شخص جتنی رقم لگائے وہ کاروبار کے نفع و نقصان دونوں میں شریک ہو اور کل سرمایہ کی جتنی فیصد رقم اُس نے لگائی ہے نفع کا اتنا ہی فیصد وصول کرے، دی ہوئی رقم پر معین شرح سے فیصد وصول کرے اور کاروبار خواہ قرآن مجید کی نشر و اشاعت کا ہو اس کی بنا پر سود جائز نہیں ہو سکتا۔

واللہ سبحانہ اعلم

ھ ۱۳۹۶/۶/۱۲

(فتویٰ نمبر ۵۸۳/۲۸ ب)

(۱) حوالے کے لئے دیکھئے ص: ۲۶۷ کا حاشیہ نمبر ۱ اور ص: ۲۸۳ کا حاشیہ نمبر ۴۔

(۲ و ۳) حوالہ کے لئے دیکھئے ص: ۴۲، ۴۸، ۵۳، ۵۴ کے حواشی اور ص: ۲۸۳ کا حاشیہ نمبر ۴۔

کھانے میں روٹی، سالن، گوشت اور سبزی وغیرہ مختلف اجناس مشترک ہونے کی صورت میں تقسیم میں مساوات ضروری ہے یا نہیں؟

سوال:- چند احباب نے برابر اپنے کھانے کے لئے پیسے جمع کئے اور ان پیسوں سے سالن روٹی وغیرہ تیار ہوئی، سالن میں بھی اور روٹیوں میں بھی ہر ایک کی برابر رقم لگی ہوئی ہے، دسترخوان پر ہر چیز میں برابر ہر ایک شریک ہے، لیکن کھانا جب کھایا جاتا ہے تو اس میں ظاہر ہے کمی زیادتی ہونا لازمی امر ہے، ایک عالم اس کو جائز کہتے ہیں، مختلف اجناس ہونے کی وجہ سے کمی زیادتی جائز ہے، دوسرے صاحب کا کہنا یہ ہے کہ یہ شرکت اور اس میں بغیر تقسیم مال ہر ایک کا حصہ جدا کئے بغیر جائز نہیں، اور تقسیم بھی برابری میں ہو کیونکہ شرکت ہر چیز میں برابر ہے، ان کے دلائل یہ ہیں: فشرکۃ الأملاک العین یرثھا رجلان ویشتریانھا فلا یجوز لأحدهما أن یتصرف فی نصیب الآخر إلا باذنه وکل واحد منهما فی نصیب صاحبه کالأجنبی الی أن قال إلا فی صورة الخلط والاختلاط فانہ لا یجوز إلا باذنه. ہدایہ (ج: ۲ ص: ۶۰۵)۔ اور رد المحتار میں ہے: قوله من حیث الأمانة فان مال أحد الشریکین أمانة فی ید الآخر کما ان مال المفقود أمانة فی ید الحاضر. (ج: ۴ ص: ۲۹۸)۔^(۱)

اس لئے یا تو ہر ایک کا حصہ الگ پہلے کر دیا جائے اور سب کا برابر سالن بھی برابر اور روٹی بھی برابر یا روٹی کے بدلے سالن زیادہ لے یا سالن کے بدلے روٹی سب کی رضامندی سے ایسی شرکت کا امتیاز کر لیا جائے تو پھر صحیح ہے اور یہ مشکل ہے، اس لئے اس شرکت میں قباحتیں ہیں اوپر کی دو مختلف اجناس میں کمی زیادتی جائز ہے، یہ اصول تقسیم کا ہے جو یہاں واقع نہیں ہوا اس لئے جائز نہیں، اس لئے ایسا کر لیا جائے کہ یہ تمام احباب ایک شخص کو رقم دے دیں اور وہ ان سب کی اپنی طرف سے دعوت کر دے۔ پہلی صورت میں جواز کے بارے میں وضاحت فرمائیں۔

جواب:- صورت مسئلہ میں چونکہ روٹی، سالن، گوشت اور سبزی وغیرہ مختلف اجناس ہیں، اس لئے تقسیم میں مساوات ربا سے بچنے کے لئے ضروری نہیں بلکہ باہمی رضامندی سے تفاضل جائز ہے، چنانچہ جب سب نے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھایا تو ہر شخص جتنا کھا رہا ہے وہ اس کا حصہ سمجھا جائے گا، بشرطیکہ تمام شرکاء راضی ہوں، لہذا کوئی اشکال نہیں۔ البتہ اگر اس طرح صرف ایک ہی ایسی چیز خریدی جائے جو یا وزنی ہو یا کیلی تو قیاس کا تقاضا یہ ہے کہ اس کی تقسیم میں مساوات ضروری ہوگی، لہذا یا تو اس

(۱) ہدایہ، کتاب الشریکۃ ج: ۲ ص: ۶۰۵ (طبع مکتبہ رحمانیہ)۔

(۲) رد المحتار، کتاب الشریکۃ ج: ۴ ص: ۲۹۸ (طبع سعید)۔

کے ساتھ کوئی دوسری جنس کی چیز شامل کر لی جائے جیسے قربانی کے گوشت میں فقہائے کرام نے لکھا ہے، یا پھر سب لوگ مل کر اپنی اپنی رقم کا مالک ایک شخص کو بنادیں، وہ اپنے لئے وہ چیز خرید لے، پھر وہ اپنی خوشی سے سب کی دعوت کر دے، جیسا کہ سوال میں لکھا گیا ہے۔ لیکن امام بخاریؒ نے کتاب الشریکۃ میں اس قسم کے اشتراک کو ”نہد“ قرار دیا ہے، اور عہد رسالت میں اس کی کئی مثالیں پیش کی ہیں، چنانچہ فرماتے ہیں کہ:

”لم یر المسلمون فی النهد بأسا، أن يأکل هذا بعضا وهذا بعضا.

(صحیح البخاری، کتاب الشریکۃ ج: ۱ ص: ۳۳۷)

اس کے تحت حضرت علامہ انور شاہ صاحب کشمیری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

”انہا لیس من باب المعاوضات التي تجرى فيه المماكسة أو تدخل تحت الحكم وانما هي من باب التسامح والتعامل، وكيف تكون خلاف الاجماع مع انه قد جرى به التعامل من لدن عهد النبوة الى يومنا هذا.

(۱) (فیض الباری ج: ۳ ص: ۳۴۲)

واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم

ھ ۱۴۱۲/۱/۱۴

(فتویٰ نمبر ۵۹/۲۷)

(۱) طبع مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ.

وفی عمدة القاری شرح البخاری ج: ۱۳ ص: ۶۰ (طبع دار احیاء التراث) باب الشریکۃ فی الطعام والنہد والعروض وكيف قسمة ما یقال ویوزن مجازفة أو قبضة قبضة لما لم یر المسلمون فی النهد بأسا أن يأکل هذا بعضا وهذا بعضا وكذلك مجازفة الذهب والفضة والقران فی التمر أى هذا باب فی بیان حکم الشریکۃ فی الطعام وقد عقد لهذا باب مفردا مستقلا یأتی بعد أبواب إن شاء الله تعالیٰ قوله والنہد بفتح النون وكسرها وسكون الهاء وبدال مهملة قال الأزهري فی التهذيب النهذ إخراج القوم نفقاتهم على قدر عدد الرفقة يقال تناهدوا وقد ناهد بعضهم بعضا وفي المحکم النهذ العون وطرح نهذه مع القوم أعانهم وخارجهم وقد تناهدوا أى تخارجوا یكون ذلك فی الطعام والشراب وقيل النهذ إخراج الرفقاء النققة فی السفر وخلطها ویسمى بالمخارجة وذلك جائز فی جنس واحد وفي الأجناس وإن تفاوتوا فی الأكل وليس هذا من الربا فی شیء وإنما هو من باب الاباحة.

وفیه أيضًا ج: ۱۳ ص: ۶۱ (طبع دار احیاء التراث) قوله لما لم یر المسلمون اللام فیہ مکسورة والمیم مخففة هذا تعلیل لعدم جواز قسمة الذهب بالذهب والفضة بالفضة مجازفة أى لأجل عدم رؤية المسلمین بالنہد بأسا جوزوا مجازفة الذهب بالفضة لاختلاف الجنس بخلاف مجازفة الذهب بالذهب والفضة بالفضة لجریان الربا فیہ فکما ان مبنی النهذ على الاباحة وإن حصل التفاوت فی الأكل فکذلك مجازفة الذهب بالفضة وإن كان فیہ التفاوت بخلاف الذهب بالذهب والفضة بالفضة لما ذکرنا قوله أن يأکل هذا بعضا تقديره بأن يأکل وأشار به الى أنهم كما جوزوا النهذ الذى فیہ التفاوت فکذلك جوزوا مجازفة الذهب والفضة مع التفاوت لما ذکرنا قوله والقران فی التمر بالجر ویروى والاقران عطف على قوله أن يأکل هذا بعضا أى بأن يأکل هذا تمرتين تمرتين وهذا تمررة تمررة.

وفیه أيضًا ج: ۱۳ ص: ۶۲ (طبع دار احیاء التراث) مطابقته للترجمة تؤخذ من قوله فأمر أبو عبيدة بأزواد ذلك الجيش فجمع ذلك ذلك كله ولما كان یفرق علیهم کل يوم قليلاً قليلاً صار فی معنى النهذ واعتراض بأنه ليس فیہ ذکر المجازفة لأنهم لم یريدوا المبايعه ولا البدل وأجیب بأن حقوقهم تساوت فیہ بعد جمعه فتناولوه مجازفة كما جرت العادة.

.....(باقی اگلے صفحے پر)

کیا شرکت یا مضاربت میں اپنی لگائی ہوئی رقم واپس لی جاسکتی ہے؟

(الائنس موٹرز کمپنی میں جمع کرائی ہوئی رقم واپس لوٹانے کی شرط کا حکم)

وضاحت:- سائل نے پہلے یہ سوال دارالافتاء والا ارشاد میں بھیجا اور وہاں سے جواب حاصل کر کے حضرت والا دامت برکاتہم کی خدمت میں پیش کیا، سوال اور دارالافتاء والا ارشاد کی جانب سے اس کا جواب اور پھر حضرت والا دامت برکاتہم کا جواب درج ذیل ہے۔ (محمد زبیر)

سوال:- مسئلہ یہ ہے کہ الائنس موٹرز کے نام سے آپ بخوبی واقف ہوں گے کہ یہ ایک پرائیویٹ کمپنی ہے، جس میں لوگ اپنا سرمایہ بھی لگاتے ہیں، اور کمپنی کی جانب سے انہیں ہر ماہ حاصل شدہ منافع کا چالیس فیصد حصہ دیا جاتا ہے۔ میں کمپنی کا مقرر کردہ نمائندہ ہوں، اور کمپنی کے اصول کے مطابق لوگوں سے سرمایہ وصول کر کے کمپنی پہنچا دیتا ہوں۔ کمپنی کے اصولوں میں سے ایک اصول یہ بھی ہے کہ سرمایہ کار اگر اپنی جمع شدہ رقم کمپنی سے نکلوانا چاہے تو اُسے ایک ماہ پیشگی نوٹس دینا ہوتا ہے، جس کا منافع یعنی اس ماہ کا منافع سرمایہ کار کو نہیں ملتا۔

اب زید ایک سرمایہ کار نے اپنی رقم کمپنی سے نکلوانے کے لئے فرض کریں یکم جنوری کو نوٹس دیا، لہذا یکم فروری کو زید کی رقم لوٹادی جاتی ہے، جبکہ ماہ جنوری کا منافع زید کو نہیں دیا گیا (کمپنی کے اصول کے مطابق جس کا سرمایہ کار کو علم ہے)، خیال رہے کہ یکم فروری کو بکر کمپنی میں سرمایہ کاری کی غرض سے اتنی ہی رقم لے کر آئے تھے جتنی زید کو مطلوب تھی، لہذا یہی رقم زید کو لے کر دی گئی تھی، اور زید کی رقم بکر کی رقم شمار کی گئی، اب سوال یہ ہے کہ ماہ جنوری کے منافع کا حق دار کون ہے؟ کمپنی کے اصول کے مطابق یہ رقم مجھے دی گئی ہے، آیا میں اس کا حق دار ہوں یا نہیں؟

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)..... وفى فتح الباری، کتاب الشركة ج: ۵ ص: ۱۷۰، ۱۷۱ (طبع مكتبة الرشد) وأما بفتحها فجميع أصناف المال وما عدا النقد يدخل فيه الطعام فهو من الخاص بعد العام ويدخل فيه الربويات ولكنه اغتفر في النهي لثبوت الدليل على جوازه واختلف العلماء في صحة الشركة كما سيأتى قوله وكيف قسمة ما يكال ويوزن أى هل يجوز قسمته مجازفة أو لا بد من الكيل فى المكيل والوزن فى الموزون وأشار الى ذلك بقوله مجازفة أو قبضة قبضة أى متساوية قوله لما لم تر المسلمون بالنهد بأسا هو بكسر اللام وتخفيف الميم وكأنه أشار الى أحاديث الباب وقد ورد الترغيب فى ذلك وروى أبو عبيد فى الغريب عن الحسن قال أخرجوا نهديكم فانه أعظم للبركة وأحسن لأخلاقكم قوله وكذلك مجازفة الذهب والفضة كأنه ألحق النقد بالعرض للجامع بينهما وهو المالية لكن انما يتم ذلك فى قسمة الذهب مع الفضة أما قسمة أحدهما خاصة حيث يقع الاشتراك فى الاستحقاق فلا يجوز اجماعاً قاله بن بطلان وقال بن المنير شرط مالک فى منعه أن يكون مصكوكاً والتعامل فيه بالعدد فعلى هذا يجوز بيع ما عداه جزافاً ومقتضى الأصول منعه وظاهر كلام البخارى جوازه ويمكن أن يحتج له بحديث جابر فى مال البحرين والجواب عن ذلك أن قسمة العطاء ليست على حقيقة القسمة لأنه غير مملوك للأخذين قبل التمييز والله أعلم.

(جواب از دارالافتاء والارشاد ناظم آباد، کراچی)

جواب :- دراصل جس تاریخ کو نوٹس دیا جاتا ہے اس تاریخ میں سرمایہ کار کے حصص کمپنی خرید لیتی ہے، اور اس کے ثمن کی ادائیگی ایک ماہ بعد ہوتی ہے، لہذا وہ رقم آپ کے لئے حلال ہے۔

واللہ اعلم

محمد موسیٰ

دارالافتاء والارشاد، ناظم آباد کراچی

فتویٰ نمبر ۲۲۸۹۵

الجواب صحیح

عبدالرحیم

نائب مفتی دارالافتاء والارشاد، ناظم آباد کراچی

(جواب از حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم العالیہ)

شرکت یا مضاربت میں رقم لوٹانے کا سوال نہیں ہوتا، اور اس کی جو توجیہ دارالافتاء والارشاد کے مذکورہ جواب میں ذکر کی گئی ہے وہ درست ہو سکتی ہے لیکن اس کے لئے شرط یہ ہے کہ یا تو رقم لگانے والے کو یہ اختیار ہو کہ وہ اپنا حصہ جسے چاہے فروخت کر دے، یا پھر حصے کی قیمت پہلے سے اتنی مقرر نہ کی جائے جو اصل لگائی ہوئی رقم کے برابر ہو، کیونکہ اس صورت میں رأس المال مضمون ہو جائے گا جو شرکت اور مضاربت دونوں میں جائز نہیں ہے، اس کے بجائے یا تو خریداری کے وقت اثاثوں کی بازاری قیمت پر خریدے، یا باہمی رضامندی سے کوئی قیمت وقت پر مقرر کر لی جائے۔ اگر اس معاہدے میں یہ بات ہے تب تو درست ہے لیکن اگر ہر صورت میں اصل لگائی ہوئی رقم پر بیچنے کی شرط ہے تو اس سے رأس المال کے مضمون ہونے کی بنا پر یہ شرط فاسد ہوگی، البتہ مضاربت شرط فاسد سے فاسد نہیں

(۱) کیونکہ ایسی صورت میں اس شرط (یعنی اپنی لگائی ہوئی مکمل رقم واپس نکلوانے کی شرط) کا حاصل یہ ہوگا کہ نقصان برداشت نہ کرنے کی شرط لگائی گئی ہے، اور یہ شرط فاسد ہے۔

وفی مجمع الأنهر، کتاب المضاربة ج: ۳ ص: ۴۴۷ (طبع مکتبہ غفاریہ کوئٹہ) ویبطل الشرط کشرط الوضیعة ہی الخسران علی المضارب لأن الخسران جزء هالک من المال فلا يجوز أن يلزم غیر رب المال لکنه شرط زائد یوجب قطع الشریکۃ فی الربح.

وفی الفتاویٰ التاتاریخانیۃ کتاب الشریکۃ الفصل الرابع فی العنان ج: ۵ ص: ۶۵۵ (طبع إدارة القرآن کراچی) وان شرطاً أن يكون الربح والوضیعة بينهما نصفین فشرط الوضیعة بصفة فاسد ولكن بهذا لا تبطل الشریکۃ لأن الشریکۃ لا تبطل بالشروط الفاسدة وان وضعا فالوضیعة علی قدر رأس مالهما.

وفی الدر المختار ج: ۵ ص: ۶۴۸ (طبع سعید) کل شرط یوجب جهالة فی الربح أو یقطع الشریکۃ فیہ یفسدها وآلا بطل الشرط. وفی الشامیة تحتہ (قوله بطل الشرط) کشرط الخسران علی المضارب.

وفی المحيط البرهانی فی الفقہ النعمانی ج: ۶ ص: ۴۰۱ (طبع غفاریہ کوئٹہ) وان شرط الوضیعة والربح نصفان فشرط الوضیعة نصفان فاسد لأن الوضیعة هالک جزء من المال فکأن صاحب الألفین شرط ضمان شیء مما هالک من ماله علی صاحبه وشرط الضمان علی الآخر فاسد ولكن بهذا لا تبطل الشریکۃ حتی لو عملا وربحا فالربح بينهما علی ما شرط.

وفی تبیین الحقائق ج: ۵ ص: ۲۵۱ (طبع دار الکتب العلمیة بیروت) ویبطل الشرط کشرط الوضیعة علی المضارب. وكذا فی شرح المجلة ج: ۲ ص: ۷۵۷ (طبع مکتبہ حنفیہ کوئٹہ).

ہوتی، لہذا مضاربت کا عقد اس کے باوجود درست ہے، ہاں خلاف شرع شرط لگانے کا گناہ ہوگا اور یہ شرط واجب التعمیل نہ ہوگی۔^(۳) چنانچہ اس کا روبرو اس سے جو منافع تقسیم کیا گیا، اگر اس میں کوئی اور خلاف شرع امر نہ ہو تو اس کا استعمال بھی جائز ہے۔ رہی یہ بات کہ مہینے کے شروع میں بکر نے جو رقم لگائی، وہی زید کو دے دی گئی، سو اس سے مسئلے پر کوئی فرق نہیں پڑتا، اور اس کی وجہ سے بکر جنوری کے نفع کا مستحق نہیں ہوا، کیونکہ بکر کے دیتے ہی وہ رقم مال مضاربت میں شامل ہوگئی، اور نقد متعین نہیں ہوتے، لہذا چاہے وہ رقم زید کو دے دی گئی ہو، اس کا مطلب یہی ہے کہ زید کو اس کے حصے کی قیمت دی گئی۔

واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۴۰۸/۱۱/۶ھ

(فتویٰ نمبر ۲۲۸۸/۳۹)

والد کی طرف سے شروع کرائے ہوئے کاروبار میں والد کو بیٹوں کے حصے مقرر کرنے اور ان میں کمی بیشی کا اختیار ہے

سوال :- کیا فرماتے ہیں علمائے دین بیچ اس مسئلے کے: زید کے والد عبداللہ کے چار لڑکے: زید، حارث، بکر، خالد۔ زید اپنے والد کے ساتھ دکان پر کام کرتا ہے، زید کو اپنے والد کے ساتھ کام کرتے ہوئے جب تقریباً گیارہ سال کا عرصہ ہوا تو زید نے اپنی کوشش سے ایک دکان کرایہ پر لی اور باپ نے الگ دکان پر کام شروع کیا، اور اللہ کے حکم سے ایک اور کاروبار شروع کیا، یہ کاروبار رات کو شروع ہوتا ہے ٹرانسپورٹ کا، رات آٹھ بجے دکان بند کر کے گیرج پر بسوں کی مرمت وغیرہ کا کام، تقریباً تین سال بعد یہ کام بند کر دیا کیونکہ اس میں نقصان کا اندیشہ ہوا، اس دوران زید کی شادی ہوئی، شادی کے بھی نو ماہ بعد اتفاق سے کچھ قانونی کام کے لئے والد صاحب کی دکان پر اور زید کی دکان پر پارٹنرز بنانے کا سوال آیا، والد صاحب کی دکان پر چاروں بھائی کے چار چار آنے حصہ مقرر ہوا، زید کی

(۱ تا ۳) وفي رد المحتار، کتاب الشریکۃ ج: ۴ ص: ۳۱۶ (طبع سعید) لأن الشریکۃ لا تفسد بالشروط الفاسدة. وكذا في فتح القدير، کتاب الشریکۃ، فصل ولا تنعقد الشریکۃ ج: ۶ ص: ۱۷۷ (طبع مصطفى بابی مصر) وفي المحيط البرهانی فی الفقہ النعمانی ج: ۶ ص: ۴۰۲ (طبع غفاریہ کوئٹہ) فالشرکۃ مما لا تبطل بالشروط الفاسدة.... الخ. وفي الدر المختار ج: ۵ ص: ۶۲۸ (طبع سعید) بطل الشرط وصح العقد وفي الشامیة تحتہ کشرط الخسران علی المضارب الخ. وفي مجمع الأنهر ج: ۳ ص: ۴۴۷ (طبع غفاریہ کوئٹہ) شرط زائد فلا یفسد المضاربة لأنها لا تفسد بالشروط الفاسدة كالوكالة الخ. وكذا في الدر المنتقى علی مجمع الأنهر ج: ۳ ص: ۴۴۷ (طبع غفاریہ) وفي الفتاوی التاتاریخانیة ج: ۵ ص: ۶۵۵ (طبع ادارة القرآن کراچی) ان الشریکۃ لا تبطل بالشروط الفاسدة. (محمد زبیر حق نواز)۔

دُکان پر زید کے سات آنے، بکر، حارث، خالد کے تین تین آنے طے ہوئے، کیونکہ زید کو والد نے کام کے لئے روپے دیئے تھے، اور زید نے رات دن محنت کی تھی، زید رات دو تین بجے روز سوتا تھا، باپ نے زید کو تقریباً اٹھارہ ہزار روپے دیئے تھے، دُکان کر کے زید نے چھ سات سال بعد دُکان بھی خریدی، ۱۹۷۵ء میں والد صاحب حج بیت اللہ کے لئے تشریف لے گئے، جانے سے پہلے وصیت نامہ تحریر کیا، تحریر کرتے وقت خود اپنی دُکان میں حسب سابق زید، بکر، حارث، خالد کو چار چار آنے کا حصہ دار مقرر کیا، اور بعد میں فرمایا کہ زید کی دُکان میں سب کو چار چار آنے دیا جائے، زید نے والد صاحب کو یاد دہانی کرائی کہ آپ نے پہلے زید کی دُکان میں زید کو سات آنے اور حارث کو تین آنے، بکر کو تین آنے، خالد کو تین آنے تحریر کئے ہیں، زید کے احتجاج پر والد صاحب نے زید کو سات آنے کا حصہ دار تسلیم کیا، زید کی دُکان میں حج سے آنے کے بعد ایک بار پھر پارٹنرز بنانے کا نیا معاہدہ تحریر کرنا پڑا تو والد صاحب نے فرمایا کہ زید کے لئے سات آنے کے بجائے چار آنے مقرر کیا جائے، زید نے اپنے والد کو یاد دہانی کرائی اور اپنی والدہ کو سب حالات سے آگاہ کیا، والدہ نے کہا کہ وہ والد سے بات کریں گی، والدہ نے بات چیت کے بعد کہا کہ میں نے تمہارے والد کو اس بات پر راضی کیا ہے کہ تم چھ آنے لے لو، زید نے کہا دو بار تحریر کرنے کے بعد چھ آنے کی کیا وجہ ہے؟ مجھ کو سات آنے دیا جائے، چھ آنے سات آنے کے مسئلے پر ایک یا ڈیڑھ سال یہ بات تفصیل میں رہی، ایک بار پھر چھ آنے سات آنے پر بات ہوئی تو والد صاحب چھ آنے کو چھوڑ کر فرمانے لگے کہ زید کو زید کی دُکان میں چار آنے دیئے جائیں۔ زید نے اپنی والدہ کو پھر آگاہ کیا کہ آپ نے فرمایا تھا کہ والد صاحب چھ آنے دینا چاہتے ہیں، لیکن وہ تو پھر چار آنے کی بات کر رہے ہیں، والدہ نے کہا کہ وہ پھر بات کریں گی، والدہ نے آٹھ روز بعد جواب دیا کہ میں نے بات کی چھ آنے تم کو دیئے جائیں گے، میں نے والدہ سے کہا کہ آپ والد صاحب سے کہیں کہ سات آنے کر دیا جائے اور کچھ تجاویز بھی میری طرف سے پیش کریں، ۱- تجویز اگر آپ زید کو زید کی دُکان میں سات آنے نہیں دینا چاہتے تو آج تک حساب کر کے زید کو زید کی دُکان سے تین آنے دے دیں، آئندہ زید کو زید کی دُکان میں سب کے برابر دیا جائے، زید کو کوئی اعتراض نہیں ہوگا، حالانکہ زید کسی بھائی کو کچھ بھی نہ دینا چاہے تو کوئی کچھ نہیں کر سکتا، دُکان زید نے خریدی، زید کے نام پر ہے، تمام کاروبار زید کے نام پر ہے، لیکن زید اپنے وعدے سے نہیں پھرنا چاہتا، والد صاحب سے والدہ نے جو آٹھ روز پہلے بات کی تھی کہ زید کو چھ آنے دے دیا جائے اس بات کے بعد پھر اچانک فرمایا: نہیں! زید کو چار آنے دیا جائے، وجہ یہ بیان فرمائی کہ اگر زید کو سات آنے دے دوں تو حارث، بکر، خالد کے ساتھ بے ایمانی ہوگی۔ زید والد سے یہ تو نہیں کہتا کہ آپ اپنی دُکان میں سات

آنے دیں، زید تو صرف اپنی کمائی ہوئی رقم سے سات آنے چاہتا ہے، جو والد کے وعدے کے عین مطابق ہے، یہ وعدہ انہوں نے ۱۹۷۳ء میں کیا تھا اور پھر ۱۹۷۵ء میں تجدید کر لی۔ ازراہ کرم شریعت کی رو سے ایسا کرنے پر والد صاحب کیا بے ایمانی کے مرتکب ہوتے ہیں؟ یا زید کو اس کا حق دیتے ہیں؟ زید کے بھائی حارث عمر ۲۷ سال نے صرف ڈیڑھ یا دو سال کام کیا، بکر نے آٹھ سال یا نو سال کام کیا، عمر ۲۰ سال، خالد نے ساڑھے تین سال کام کیا، عمر ۱۸ سال۔ زید عمر ۳۳ سال، بائیس سال کام کیا، ایک لڑکی، دولڑکے، ۶ سال، ۵ سال، ۴ سال۔ زید عمر کا ایک بڑا حصہ والد صاحب کے ساتھ گزار چکا ہے، وہ کسی کام کی بے ایمانی نہیں کرنا چاہتا، اس لئے آپ کو یہ مسئلہ تحریر کر رہا ہے تاکہ وہ حق کی رہنمائی حاصل کر سکے اور کوئی بات غلط ہو تو اپنی غلطی دور کر لے ورنہ یہ فتویٰ اپنے والد کے روبرو پیش کر کے فیصلہ ان پر چھوڑ دے، زید کی معلومات کے مطابق اسلام وعدے کی پابندی لازمی قرار دیتا ہے۔

جواب:- اگر زید کے والد نے زید کو تجارت کے لئے رقم دیتے وقت یہ طے کیا تھا کہ کاروبار میں سات آنے زید کے اور تین تین آنے باقی بھائیوں کے ہوں گے، تو اس پر اس طے شدہ معاہدے کی پابندی لازم ہے،^(۱) اور اس کی خلاف ورزی ہرگز جائز نہیں۔^(۲)

البتہ سوال سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ شروع میں زید کی دکان پر زید تنہا کام کرتا تھا، اس کے بعد دوسرے بھائی بھی کام میں شریک ہوتے گئے، اگر صورت حال یہی ہے تو سات آنے والے معاہدے کی پابندی اسی وقت تک لازم ہے جب تک زید تنہا کام کرتا رہا، اور جس تاریخ سے دوسرا کوئی بھائی کام میں شریک ہوا اس تاریخ سے باپ کو نیا معاہدہ کرنے کا حق حاصل ہے،^(۳) جس میں زید کا حصہ کم کر کے دوسرے کام کرنے والے بھائیوں کا حصہ زیادہ بھی کر سکتا ہے۔^(۴) اور اگر شروع ہی سے تمام بھائی کام میں شریک تھے، یا اس وقت سے شریک تھے جب سے سات آنے کا معاہدہ ہوا تو سوال لکھ کر اس صورت کا مسئلہ دوبارہ پوچھ لیا جائے، اس صورت میں یہ کاغذ بھی ساتھ ضرور روانہ کریں۔

واللہ اعلم

۱۳۹۹/۱۰/۲ھ

(فتویٰ نمبر ۱۷۰۹/۳۰ د)

(۱) تا ۴ کیونکہ ایسی صورت میں یہ سارا کاروبار زید کے والد کی ملکیت ہوگا، اور زید کے والد نے زید اور اس کے بھائیوں کے لئے جتنا حصہ مقرر کیا ہو، وہ اتنے ہی حصے کے حق دار ہوں گے۔

وفی الشامیة ج: ۴ ص: ۳۲۵ (طبع سعید) لما فی القنیة الأب وابنه یکتسبان فی صنعة واحدة ولم یکن لهما شیء فالكسب کلہ للأب ان کان الابن فی عیالہ لکونه معیناً لہ.... الخ.

وفی الہندیة کتاب الشریکة الباب الرابع فی شریکة الوجوه وشریکة الأعمال ج: ۲ ص: ۳۲۹ (طبع رشیدیہ) أب وابن یکتسبان فی صنعة واحدة لم یکن لهما مال فالكسب کلہ للأب اذا کان الابن فی عیال الأب لکونه معیناً لہ، الا ترى انہ لو غرس شجرة تكون للأب.... الخ. (باقی اگلے صفحے پر)

شرکت میں فریقین کے لئے علیحدہ علیحدہ مال متعین کر کے اس پر نفع نقصان حاصل کرنے کی مخصوص صورت کا حکم

سوال :- ایک شخص نے چار گنارقم دوسرے شخص سے زیادہ ایک کاروبار میں ڈالی اور کاروبار کی صورت یہ رکھی کہ وہ پہلا شخص جس کی چار گنارقم ہے دوسرے شخص کو مال خرید کر دیتا ہے اور دوسرے شخص کی رقم پہلے شخص سے چوتھائی ہے، اور جب مال خرید کر دوسرے شخص کو دیتا ہے تو اس پر پانچ فیصد کے حساب سے نفع لگاتا ہے اور اس کے بعد نفع پہلے اور دوسرے شخص کو تقسیم کیا جاتا ہے کہ پہلے شخص کو تین فیصد اور دوسرے شخص کو دو فیصد نفع اس مال کی مالیت سے ملتا ہے، اور اس صورت میں سے شخص بری ہو جاتا ہے کہ دوسرے شخص کو مال میں سے نفع ہو یا نقصان، پھر دوسرا شخص مال اکٹھا کر کے پہلے شخص کو دیتا ہے اور وہ مال لاتا ہے اور پھر وہ اس طریقے سے نفع لگاتا ہے اور نفع دونوں میں تقسیم ہوتا ہے، کیا یہ کاروبار از روئے شریعت درست ہے؟

جواب :- سوال مجمل ہے، غور کرنے سے معاملے کی صورت یہ سمجھ میں آتی ہے کہ ”الف“ اور ”ب“ میں شرکت کا معاملہ ہے، اصل سرمائے میں چار حصے ”الف“ نے اور ایک حصہ ”ب“ نے لگایا ہے، اس مجموعی سرمائے سے جو سامان تجارت خریدا گیا، اسے فروخت کرنے سے قبل دونوں نے اندازہ کر لیا کہ اس پر پانچ فیصد نفع ہوگا، اور پھر اس کو فروخت سے پہلے ہی اس طرح تقسیم کر لیا کہ تین حصے ”الف“ کے اور دو حصے ”ب“ کے قرار پائے۔ ”الف“ نے اپنے تین حصے وصول کر کے سامان فروخت کے لئے ”ب“ کے حوالے کر دیا کہ اگر نفع زیادہ ہو تو بھی اس کا ہے، اور نقصان ہو تو بھی اس پر ہے۔ اگر معاملے کی صورت یہی ہے جو اوپر لکھی گئی تو یہ صورت ناجائز ہے، اس لئے کہ اس میں ”الف“ کا تین فیصد نفع معین ہے اور ”ب“ کا نفع مشتبہ ہے، معاملہ اس طرح کرنا چاہئے کہ نفع کا فروختگی سے پہلے

(بقیہ حاشیہ گزشتہ)..... وفى تنقیح الفتاوى الحامدية كتاب الشركة ج: ۱ ص: ۹۵ (طبع میمنیہ مصر) أب وابن اكتسبا ولم یکن لکھا مال فاجتمع لهما من الکسب أموال فالکل للأب لأن الابن اذا کان فی عیالہ فهو معین لہ الا ترى أنه لو غرس شجرة فهي للأب.... الخ. وفى الفتاوى الکاملية كتاب الشركة ص: ۵۱ (طبع رشیدیہ) اذا کان الولد فی عیال أبیہ ومعیناً لہ یكون جمیع ما تحصل من الکسب لأبیہ.... الخ.

وفى شرح المجلة لسليم رستم باز رقم المادۃ: ۱۳۹۸ ج: ۱ ص: ۷۱ (طبع مکتبہ حنفیہ کوئٹہ) اذا عمل رجل فی صنعة هو وابنه الذى فی عیالہ فجمیع الکسب لذلك الرجل وولده یعد معیناً لہ وكذا اذا اعانہ ولده الذى فی عیالہ عند غرسه شجرة فتلک الشجرة للأب لا یشارکہ ولده فیہا.... الخ. (و کذا فیہ شرح المجلة للأناسی ج: ۲ ص: ۳۱۹ طبع مکتبہ حبیبیہ کوئٹہ). (محمد زبیر حق نواز)

(۲۱۰) تفصیلی حوالہ جات کے لئے دیکھئے ص: ۳۲ و ۳۸ اور اگلے صفحے کے حواشی۔

اندازہ کرنے کے بجائے مثلاً یہ طے کر لیا جائے کہ اس سامان کو فروخت کر کے اس سے جو نفع حاصل ہوگا اس کا ایک چوتھائی ”ب“ کا اور تین چوتھائی ”الف“ کا ہوگا۔^(۱) باہمی رضامندی سے نفع کا کوئی اور تناسب بھی طے کیا جاسکتا ہے، لیکن وہ تناسب نفع کا ہونا چاہئے، اصل مال کا نہیں۔^(۲) اور اگر معاملے کی صورت کچھ اور ہے تو کسی عالم کو سمجھا کر اس سے دوبارہ سوال لکھوائیں اور بھیج دیں، اس کا جواب دے دیا جائے گا۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

۱۳۹۱/۵/۲۵
(فتویٰ نمبر ۶۸۸/۲۲ ب)

مضاربت میں تمام نقصان سرمایہ لگانے والے پر ہوگا،
جبکہ شرکت (پارٹنرشپ) میں ہر فریق کو اپنے سرمائے
کے بقدر نقصان برداشت کرنا ہوگا

سوال:- "Sleeping Partner" کے طور پر کسی کاروبار میں اس شرط کے ساتھ پیسہ لگانا کہ جو نفع و نقصان بھی ہوگا ایک متعین فیصد Sleeping Partner کے حصے میں آئے گا، مثلاً ۲۵ فیصد نفع اور نقصان دونوں میں۔ اس میں بھی دو ذیلی امکان موجود ہوں: ۱- Active Partner صرف محنت کر رہا ہے، اس کا سرمایہ شامل تجارت نہیں ہے، ۲- Active Partner نے محنت کے علاوہ سرمایہ بھی لگایا ہوا ہے۔

جواب:- اگر کام کرنے والا صرف محنت کر رہا ہے، اس کا کوئی سرمایہ شامل نہیں ہے، تو اس

(۱ و ۲) وفي شرح المجلة لسليم رستم باز رقم المادة: ۱۳۳۷ ج: ۲ ص: ۷۱۳ (طبع دار الكتب العلمية بيروت) يشترط أن تكون حصص الربح التي تنقسم بين الشركاء جزءاً شائعاً كالنصف والثلث والرّبع فإذا اتفق الشركاء على إعطاء أحدهم قدرًا معيّنًا كانت الشركة باطلة. وكذا في شرح المجلة للأستاذ ج: ۴ ص: ۲۶۰ (طبع مكتبة حبيبيه كوتله) وكذا في البحر الرائق ج: ۵ ص: ۱۷۷ (طبع سعيد) وخلاصة الفتاوى ج: ۴ ص: ۲۹۴ (طبع امجد اكيڈمی، لاہور). وفي بدائع الصنائع ج: ۶ ص: ۵۹ (طبع سعيد) ومنها أن يكون الربح معلوم القدر.... ومنها أن يكون الربح جزءاً شائعاً في الجملة لا معيّنًا فان عيّنّا عشرة أو مائة أو نحو ذلك كانت الشركة فاسدة لأنّ العقد يقتضي تحقق الشركة في الربح والتعيين يقطع الشركة لجواز أن لا يحصل من الربح إلا القدر المعين لأحدهما فلا يتحقق الشركة في الربح.... الخ. وفي الهداية ج: ۳ ص: ۲۶۳ (طبع مكتبة رحمانيه) ومن شرطها أن يكون الربح بينهما مشاعاً لا يستحق أحدهما دراهم مسمّاة من الربح..... الخ. (محمد بيرحق نواز)

صورت میں نقصان کی کوئی ذمہ داری اس پر ڈالنا شرعاً جائز نہیں^(۱)، معاملے کی صحت کے لئے یہ ضروری ہے کہ نفع کا کوئی فیصد حصہ دونوں کے لئے متعین کیا جائے، اور یہ طے کیا جائے کہ نقصان کی صورت میں تمام نقصان سرمایہ لگانے والے کا ہوگا۔^(۲)

اور اگر کام کرنے والے نے محنت کے علاوہ کچھ سرمایہ بھی لگایا ہے تو دونوں کے درمیان نفع کا تناسب باہمی رضامندی سے طے ہو سکتا ہے^(۳)، لیکن نقصان کی صورت میں دونوں اپنے اپنے لگائے ہوئے سرمائے کے تناسب سے اُسے برداشت کریں گے^(۴)، مثلاً کام کرنے والے نے کل سرمائے کا دس فیصد اپنے پاس سے لگایا ہو، اور نوے فیصد دوسرے فریق نے لگایا ہو تو نقصان کی صورت میں پہلا فریق دس فیصد اور دوسرا فریق نوے فیصد کا ذمہ دار ہوگا۔^(۵)

واللہ اعلم

۱۴۰۹/۱۲/۲۹ھ

(فتویٰ نمبر ۵۷۳۷/۲۰ و)

(۱ و ۲) وفي الدر المختار مع رد المحتار، كتاب المضاربة ج: ۵ ص: ۶۲۸ (طبع سعيد) كل شرط يوجب جهالة في الربح أو يقطع الشركة فيه يفسدها وإلا بطل الشرط وصح العقد.

وفي الشامية (قوله بطل الشرط) كشرط الخسران على المضارب الخ.

وفي مجمع الأنهر، كتاب المضاربة ج: ۳ ص: ۴۴۷ (طبع غفاريه كوثنه) ويبطل الشرط كشرط الوضعية أي الخسران على المضارب لأن الخسران جزء هالك من المال فلا يجوز أن يلزم غير رب المال لكنه شرط زائد لا يوجب قطع الشركة في الربح ولا الجهالة فيه فلا يفسد المضاربة لأنها لا تفسد بالشروط الفاسدة الخ.

وفي تبیین الحقائق، كتاب المضاربة ج: ۵ ص: ۵۲۱ (طبع دار الكتب العلمية بيروت) ويبطل الشرط كشرط الوضعية على المضارب وشرط الوضعية شرط زائد لا يوجب قطع الشركة في الربح ولا الجهالة فيه فلا يكون مفسداً وتكون الوضعية وهو الخسران على رب المال لأنه ما فات جزء من المال بالهلاك يلزم صاحب المال دون غيره. وكذا في شرح المجلة ج: ۲ ص: ۷۵۷ (طبع مكتبة حنفية كوثنه).

نیز دیکھئے ص: ۴۲ و ص: ۴۸ کے حواشی۔

(۳ تا ۵) وفي مصنف عبد الرزاق ومصنف ابن أبي شيبة: "عن علي رضي الله عنه: الوضعية على المال والربح على ما اصطلاحوا عليه" (كنز العمال ج: ۱۵ ص: ۱۷۶ رقم الحديث: ۴۰۳۸۲).

وفي موسوعة الاجماع: اتفقوا على أن الربح والخسران في الشركة بين الشركاء كل بقدر ماله.

وفي بدائع الصنائع ج: ۶ ص: ۶۲ (طبع سعيد) والوضعية على قدر المالكين متساوياً ومتفاضلاً لأن الوضعية اسم لجزء هالك من المال فيتقدر بقدر المال.

وكذا في فتح القدير ج: ۵ ص: ۳۹۷ (طبع مكتبة رشيدية كوثنه).

وفي المدونة الكبرى للإمام مالك ج: ۳ ص: ۶۰۹ (طبع دار الكتب العلمية بيروت) الوضعية عند مالك عليهما على قدر رؤس أموالهما.

وفي المجموع شرح المذهب ج: ۱۴ ص: ۷۱ (طبع دار احياء التراث بيروت) ويقسم الربح والخسران على قدر المالكين.

وفي المغني لابن قدامة ج: ۵ ص: ۲۲ (طبع دار الفكر بيروت) الخسران في الشركة على كل واحد منهما بقدر ماله

فان كان مالهما متساوياً في القدر فالخسران بينهما نصفين، وان كان اثلاً فالوضعية أثلاً لا نعلم في هذا خلافاً بين

أهل العلم وبه يقول أبو حنيفة والشافعي وغيرهما الخ.

مضارب کا مضاربیت کے اختتام پر مال مضاربیت کو قیمت اسمیہ پر خریدنے کی شرط کا حکم

سوال:- فضيلة الدكتور / عبدالستار أبو غدة المحترم^(۱)

نائب رئيس هيئة الفتوى والرقابة الشرعية ورئيس لجنتها التنفيذية وعضو الهيئة

المنتدب

السلام عليكم ورحمة الله وبركاته،

تعرض احدى شركات الطاقة الكبرى في أبوظبي على المصرف ترتيب اصدار صكوك مضاربة لصالحها بالتعاون مع بنك باركليز. والمسألة المتكررة دوماً، ونودُ أن نعالجها من البداية، هي مسألة الثمن الذي يتعهد المضارب بشراء اصول المضاربة به، وما يجرى عليه العمل - للأسف في معظم الصكوك - من اعتماد القيمة الاسمية مع المبالغ المتحققة وغير الموزعة من الأرباح. فهل يمكن للخروج من الاشكال الشرعي، أن نمسك العصا من الوسط، ونعالج الأمر على النحو الآتي:-

أولاً:- يذكر في اجراءات الاسترداد أنها تتم بإنهاء المضاربة باستخدام حامل الصك اشعاراً معيناً، ومن ثم يشتري المضارب اصول المضاربة منه.

ثانياً:- ينصُ في التعهد بالشراء بأن المضارب يتعهد بأن يشتري أصول المضاربة بالقيمة الاسمية ويكون هذا التعهد مضافاً الى ما بعد انتهاء أو انتهاء المضاربة بالنحو المتقدم. وبهذه الكيفية يكون تعهد المضارب مضافاً الى الوقت الذي لا يكون (لا يبقى) فيه مضارباً.

هذه هي المعالجة المقترحة بشكل مجمل، فهل ترونها مقبولة؟

وتقبلوا فائق الاحترام والتقدير.

محكم

أسيد كيلاني

جواب:- الى فضيلة الشيخ أسيد كيلاني، حفظه الله تعالى

السلام عليكم ورحمة الله وبركاته، وبعد:

فان تعهد المضارب بشراء الأصول بالقيمة الاسمية لا يجوز، ولو كان بعد انتهاء^(۲)

(۱) سائل نے شیخ عبدالستار ابو غدة کی طرف یہ استفتاء بھیجا تھا انہوں نے جواب کے لئے حضرت والا دامت برکاتہم کی خدمت میں ارسال کیا تھا۔

(۲) حوالہ کے لئے دیکھئے ص: ۳۷ اور ص: ۴۷ کے فتاویٰ اور ان کے حواشی۔

المضاربة، ما دام هذا التعهد موجوداً عند عقد المضاربة، بمعنى أنه يوقع عند ابرام عقد المضاربة، سواء كان منصوباً في عقد المضاربة أو منفصلاً عنه. والله سبحانه أعلم

أخوكم

محمد تقی العثماني عفا الله عنه

۷ جمادی الاولی ۱۳۲۸ھ

شرکت متناقضہ میں بینک کو قیمت کی ادائیگی سے قبل

قلب دین کی ایک مخصوص صورت کا حکم

(اسلامی بینک بنگلہ دیش کے ایک سوال کا جواب)

سوال:- فضيلة الشيخ / الأستاذ محمد تقی عثمانی حيّاه الله تعالى

نائب رئيس دار العلوم كراتشي، باكستان،

و عضو مجمع الفقه الاسلامي التابع لمنظمة المؤتمر الاسلامي

السلام عليكم ورحمة الله وبركاته وبعد:

فيسرنا أن نتقدم لفضيلتكم بأطيب التحيات وأخلص التقديرات متمنين لكم دوام الصحة والعافية، وبعد، فترجوه من فضيلتكم التكرم بابداء الرأي الشرعي في الصورة التالية:

ان أحد عملاء البنك الاسلامي يتمتع بتسهيلات استثمارية تحت صيغة بيع المربحة للامر بالشراء بمبلغ قدره ۳۵ مليون تاكا، وكان يتعامل مع البنك بصفة مرضية حيث كان يشتري من البنك بضائعه المطلوبة مربحة بالأجل في حدود المبلغ أعلاه فيبيعها في السوق فيسدد بقيمتها دينه المترتب عليه للبنك، قبل حلول الأجل. لكنه في الآونة الأخيرة اشترى سيارات وشاحنات عددها ۲۶ بقيمة البضائع المباعة دون أن يسدد بها دينه المترتب عليه بغير اذن مسبق من البنك. والجدير بالذكر أن الأجل لتسديد الدين المترتب عليه لم يحل الى الآن. وفي هذا الوضع اقترح العميل للبنك اقتراحاً جديداً من توقيع عقد جديد عقد اجازة بالبيع تحت شركة الملك حيث يشارك البنك مع العميل في ملكية السيارات والشاحنات المذكورة بمقابل ۱۰ مليون تاكا من دين المربحة الذي يستحقه البنك فبذلك يتخلص العميل من دين المربحة بقدر ۱۰ مليون تاكا الذي كان عليه تسديده للبنك فيكون البنك مالكا (أي شريكاً) للسيارات والشاحنات المذكورة أعلاه ويؤجرها للعميل ويدفع العميل للبنك أجرة معينة على أقساط كما أنه يشتريها من البنك تدريجياً بدفع قيمتها على أقساط معينة. فهل يجوز للبنك أن يوافق على اقتراح العميل في الصورة الموضحة أعلاه؟

شاكرين لكم حسن تعاونكم معنا، والسلام عليكم ورحمة الله وبركاته.

مع أطيب التقديرات

محمد سراج الاسلام

عضو وأمين اضافي هيئة الرقابة الشرعية

بنك بنغلاديش الاسلامي المحدود

جواب:- حيث ان المعاملة المقترحة تكون شركة متناقصة، ويراعى فى مبلغ

الأجرة ربح للبنك فوق أجرة المثل، فان هذه المعاملة تكون من قبيل قلب الدين، فلا تجوز، أما اذا كانت أجرة السيارات أجرة المثل وكان شراء حصص السيارات من قبل العميل على أساس القيمة السوقية فلا بأس بهذه المعاملة، بشرط أن لا تكون عقود البيع والاجارة مشروطاً بعضها ببعض، بل يكون كل عقد منفصلاً عن الآخر^(۱) والله سبحانه وتعالى أعلم^(۲)

محمد تقى العثماني

۴ شعبان ۱۴۲۸ھ

(فتوى نمبر ۹۸۹/۵)

(میاں فارم ٹرانسوال افریقہ کی ایک فیملی شراکتی کمپنی سے متعلق مختلف سوالات کے جوابات)
(ایک معاہدہ شرکت کی حیثیت)

۱:- والد کی طرف سے اپنی تجارت و جائیداد چار بیٹوں کو مشترکہ طور پر فروخت کرنے کے ایک معاہدہ شرکت کا حکم

۲:- معاہدہ شرکت کی خلاف ورزی کرنے والے شریک کا حکم

۳:- معاہدہ شرکت میں سرمایہ تجارت کی مقدار

متعین طور پر نہ لکھی ہوئی ہو تو کیا حکم ہے؟

۴:- کسی شریک کے کام نہ کرنے یا غائب ہو جانے سے

شرکت ختم ہو جائے گی یا نہیں؟

(۱ و ۲) وفى سنن أبى داود ج: ۳ ص: ۲۸۳ (طبع رحمانیہ) لا یحل سلف وبيع ولا شرطان فى بيع. وكذا فى جامع الترمذی ج: ۳ ص: ۵۳۵ (طبع سعید) وفى المعجم الأوسط للطبرانی ج: ۴ ص: ۳۳۵ ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم نهى عن بيع شرط. وفى الهدایة ج: ۳ ص: ۶۲ (طبع رحمانیہ) لو باع عبداً على أن یستخدمه البائع شهراً أو داراً على أن یسكنها لأنه شرط لا یقتضیه العقد وفيه منفعة لأحد المتعاقدين ولأنه نهى عن بيع وسلف ولأنه لو كان الخدمة والسكنی یقابلهما شيء من الثمن یكون اجارة فى بيع ولو كان لا یقابلها یكون اعارة فى بيع وقد نهى النبی صلی اللہ علیہ وسلم عن صفقتین فى صفقة. نیز دیکھئے ص: ۷۸ کا حاشیہ نمبر ۱۔

- ۵:- یک طرفہ طور پر شرکت کو ختم کرنے کے لئے
دوسرے شرکاء کا فسخ کو قبول کرنا ضروری نہیں
- ۶:- معاہدے میں کسی شریک کے تحریراً استعفاء دینے کے چھ ماہ بعد
اُس کی شرکت ختم ہو جانے کے اُصول کی شرعی حیثیت
- ۷:- کسی شریک کے مستعفی ہو جانے کے چھ ماہ بعد بھی دیگر شرکاء
اُس کو حصہ دیتے رہے تو اس کی شرکت باقی ہوگی یا نہیں؟
- ۸:- فسخ شرکت کے لئے دیگر شرکاء کو اطلاع دینا ضروری ہے،
محض استعفاء لکھ کر اپنے پاس رکھ لینے سے شرکت ختم نہیں ہوگی
- ۹:- کسی شریک کے انتقال کے بعد اس کی اولاد کا روبرو میں شریک
ہوگی یا نہیں؟ اور مرحوم شریک کی اولاد کو شریک کا روبرو بنانے کی
مجلس میں بعض شرکاء کے سکوت اختیار کرنے کا حکم

سوال:- ضروری تمہید مختصراً:-

حاجی موسیٰ اسماعیل رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی حیات میں اپنی تمام جائیداد و تجارت کو اپنے چار
فرزندوں کو زبانی طور پر فروخت کیا، بعد ازیں ان چار بیٹوں نے ان تجارت و جائیداد کو حاصل کر کے
اور اس پر قبضہ پانے کے بعد ایک تجارتی شرکت جاری کی، اس تجارتی شرکت کو باقاعدہ چلانے کی غرض
سے انہوں نے ایک معاہدہ شرکت مرتب کیا، جو آنحضور کی خدمتِ عالی میں مع استفتاء ہذا کے ارسال
ہے، اب دریافت طلب امور حسب ذیل ہیں، قوی اُمید ہے کہ حضرت والا توجہ خاص فرما کر جلد از جلد
استفتاء ہذا کے جوابات مفصل و مدلل تحریر فرما کر مرہونِ منت کریں گے، والا جرح عند اللہ۔

۱- ملفوف کردہ دستاویز (معاہدہ نامہ) آیا شرعاً معتبر ہے یا نہیں؟

۲- اگر کوئی معاہدہ اس معاہدے کے خلاف عمل کرے تو ایسی مخالفت از روئے شریعت مخالفت

ہوگی یا نہیں؟

(۱) شراکت کا یہ تفصیلی معاہدہ اس سوال کے آخر میں درج ہے، جس میں اس معاہدہ شراکت کی تمام جزوی تفصیلات اور دفعات موجود ہیں۔
(محمد زبیر)

۳- اگر معاہدہ نامے میں شرکت تجارت کا سرمایہ یعنی اس کی مقدار متعین طور پر مذکور نہ ہو، مگر کسی خاص وجہ سے اس کی متعین مقدار سالانہ گوشوارے میں مذکور ہو تو شرکت معتبر ہوگی یا نہیں؟

۴- اگر کوئی شریک معاہدے کے مطابق عمل کرنا چھوڑ دے یعنی تجارت میں ذاتی طور پر کام کرنا چھوڑ دے جبکہ تجارت میں ذاتی طور پر کام کرنا معاہدہ نامے میں شرط کے طور پر مذکور ہے، اور پھر کام چھوڑ کر کہیں چلا جائے اور پندرہ سال تک اسی طرح غائب رہے تو شرعاً ایسا غائب شریک تجارت میں شریک سمجھا جاتا ہے یا نہیں؟ اور اس کی شرکت ختم ہو جاتی ہے یا نہیں؟

۵- اگر کسی شریک کے مستغنی ہونے کے بعد باقی شرکاء ان کے استعفاء کا جواب (یعنی ان کو باقی شرکاء ان کے استعفاء کی قبولیت یا عدم قبولیت کی اطلاع) نہ دے تو ایسا استعفاء جو معاہدے کی دفعہ کے مطابق دیا گیا، شرعاً معتبر ہے یا نہیں؟

۶- معاہدہ شرکت میں ایک دفعہ یہ بھی ہے کہ اگر کسی شریک نے تحریراً شرکت سے الگ ہونے کا استعفاء دیا تو استعفاء کی تاریخ کے چھ ماہ بعد اس کی شرکت از خود ختم ہو جائے گی، آیا اس دفعہ کے مطابق اگر کسی شریک نے تحریراً استعفاء دیا تو اس کی شرکت ختم ہو جائے گی یا نہیں؟

۷- اگر کسی شریک کے اس طرح مستغنی ہونے کے بعد بھی باقی شرکاء ان کو شریک تجارت مانتے رہے یعنی تقسیم مال کے وقت ان کو باقی شرکاء ان کا چوتھا حصہ دیتے رہے تو آیا مستغنی ہونے کے بعد باقی شرکاء سے اپنا چوتھا حصہ ملنے کی بناء پر اس کی شرکت باقی رہتی ہے یا ختم ہو جاتی ہے؟

۸- اگر کسی شریک نے اپنی طرف سے استعفاء تحریر کیا لیکن اس کا علم کسی شریک کو نہیں ہوا، اب کئی برس کے بعد اتفاقاً کہیں سے مذکورہ استعفاء ملا تو جبکہ یہ استعفاء بظاہر کسی کے سامنے پیش نہیں کیا گیا، نہ کسی کو اس کا علم تھا، شرعاً معتبر ہوگا یا نہیں؟ اور اگر معتبر ہے تو کس تاریخ سے اس کا اعتبار ہوگا؟

۹- اگر کوئی شریک معاہدہ نامے کی مخصوص دفعہ کے خلاف اپنا استعفاء باقی شرکاء کو پیش کرے تو ایسا استعفاء شرعاً معتبر ہوگا یا نہیں؟

۱۰- ایک شریک کے انتقال کے بعد باقی تمام شرکاء نے ایک مجلس منعقد کر کے اس میں مرحوم شریک کی اولاد کو ان کی جگہ شریک تجارت بنانے کا عقد کیا، اب بعض شرکاء کا یہ کہنا ہے کہ اس مجلس میں یہ عقد ضرور کیا گیا اور ہماری موجودگی میں کیا گیا، اور ہم نے اس سے اس وقت انکار بھی نہیں کیا، لیکن ہم نے عقد ہونے کے وقت اس لئے اپنی نامظوری اور انکار اور عدم رضاء ظاہر نہیں کیا کہ ہمارا بڑا بھائی موجود تھا، اور چونکہ ان کی موجودگی میں ہم نے کبھی ان کی مرضی کے خلاف کچھ نہیں کیا تھا اس واسطے ہم نے بالارادہ سکوت اختیار کیا، تو آیا شرعاً ایسے سکوت کے باوجود مرحوم کی اولاد شریک تجارت مانی جائے

گی یا نہیں؟ (از راہِ کرمِ ضمیمہ متعلق بسوال نمبر ۵ اور ۶ ملاحظہ فرمائیں)۔

دُعا گو

بندہ بشیر احمد سنجالوی غفرلہ ولوالدیہ

از جوہانسبرگ جنوبی افریقہ

مخدومی وکرمی

اس مسئلے اور معاملے میں آنجناب کی خاص مدد کی اشد ضرورت ہے، پوری اُمید آنجناب سے وابستہ ہے کہ ہر طرح کی مدد فرمائیں گے، اللہ تبارک و تعالیٰ آنجناب کے درجات سرفراز فرمائیں، آمین۔

طالب دُعا

بندہ بشیر احمد

بندہ شعبہ غفرلہ

(ضمیمہ از مستفتی متعلق بسوال نمبر ۵ اور ۶)

۱- مذکورہ مستغنی نے زبانی طور پر استعفاء دیا، پھر دوبارہ تحریراً استعفاء دیا، اور اس کے بعد اپنے استعفاء کے پیش کرنے کی شرکاء یاد دہانی کراتے رہے، اور اس کے بعد انہوں نے خود شرکت کی تمام تجارتوں کا مکمل حساب و گوشوارہ تیار کیا جس میں انہوں نے اپنی شرکت کے حصے کی مجموعی قیمت لگا کر تحریر کی، اس مجموعہ قیمت سے کسی شریک نے انکار نہیں کیا تھا، اب مذکورہ تمام اُمور یعنی استعفاء پیش کرنے، نیز یاد دہانی کرنے اور نام بنام دُوسرے شرکاء سے اس مجموعہ قیمت کی نقلیں بھیج کر پھر تجارت سے دست بردار ہو کر کام چھوڑ کر چلے جانا، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ انہیں اپنے استعفاء کی پختگی مقصود تھی، اور یہ کہ وہ ہر طرح سے مکمل طور پر مستغنی ہونے کو چاہتے تھے، اب ایسے شریک کا اس طرح استعفاء دینا آیا من حیث الشریع مسموع و معتبر ہوگا یا نہیں؟

۲- نیز مذکورہ مستغنی استعفاء دینے کے بعد وقتاً فوقتاً حسب ضرورت مختلف رقمیں شرکت کی تجارت سے کچھ پندرہ بیس سال تک برابر وصول کرتے گئے، اب آیا ان مختلف رقموں کو کس چیز کے عوض میں شمار کیا جائے گا؟ آیا اس کی شرکت کا حصہ شمار ہوگا یا قرضہ مان لیا جائے؟ فقط۔

(معادہ شرکت)

(تمہید)

الف:- چاروں شریکوں نے اقرار کیا کہ موسیٰ اسماعیل کی تمام جائیداد اور دیگر ملکیتوں کو

انہوں نے حاصل کیا ہے۔

ب:- چاروں نے اس مجموعہ تجارت میں شریک بننے اور شرکت قائم کرنے پر اپنی رضامندی ظاہر کی، اور انہوں نے اس شرکت کو قائم کیا۔

ج:- عقد شرکت کے شروط و قیود کو تحریری طور پر ایک دستاویز میں قلم بند کرنے پر اپنی رضامندی ظاہر کی، جو حسب ذیل ہے:-

(دفعات)

۱- مذکورہ شرکاء اس بات کی رضاء ظاہر کرتے ہیں کہ وہ سب اس ”جنرل مرچنٹ“ کی تجارت میں شرکاء کی حیثیت رکھیں گے۔

۲- اس مجموعہ تجارت کی ظاہری صورت ”سلیمان اسماعیل میاں اینڈ کمپنی“ ہوگی، نیز یہ شرکت والی تجارت تینتالیس مارکیٹ اسٹریٹ سے جاری رکھی جائے گی، اور اس کے بعد جہاں سے شرکاء اپنی رضامندی ظاہر کریں گے۔

۳- باوجودیکہ شرکت شروع ہونے کی تاریخ اس دستاویز پر لکھی گئی ہے، لیکن اس شرکت کی ابتداء کی تاریخ پہلی جولائی انیس سو بتیس عیسوی ہوگی۔

۴- شرکت ہذا کے سرمایہ میں ہر شریک کا برابر حصہ ہوگا (لیکن دستاویز میں سرمایہ کی مقدار نہیں لکھی گئی، اور وہ درج نہیں ہے)۔

۵- اس تجارت کا نفع برابر حصوں میں شریکوں کا حق ہوگا، اور چاروں شریک برابر حصے سے تجارت کا نقصان اٹھائیں گے۔

۶- تجارت کے حساب کے دفاتر باقاعدہ اچھی طرح سے رکھے جائیں گے، نیز ہر عقد تجارت اور ہر معاملہ تجارت درج ہوتا رہے گا، اور مسلسل تاریخ بتاریخ اس کا ریکارڈ رکھا جائے گا، دیگر یہ کہ جہاں جہاں بھی تجارت جاری ہوگی وہاں بعینہ ہر جگہ ایسا دفتر رکھا جائے گا جس میں نقود و معاملات و حسابات پورے پورے لکھے جائیں گے، نیز یہ کہ ایسے دفاتر اور حسابات کے رجسٹر ہر شریک جب بھی چاہے گا ان کا معائنہ کرنے کا حق رکھے گا۔

۷- ہر سال کی تیس جون یا اس کے بعد جب بھی عملاً ممکن ہو ایک گوشوارہ نیز نفع / نقصان کا حساب تیار کیا جائے گا، جس میں شریکوں کی ملکیتوں میں نفع / نقصان درج کیا جائے گا، اور ہر شریک کا الگ حصہ اس کے نام پر درج کیا جائے گا، لیکن کسی شریک کا نفع بغیر تمام شریکوں کی تحریری اجازت کے نہیں نکالا جائے گا۔

۸- ہر شریک پر ضروری ہوگا کہ وہ حسب ذیل امور میں عملاً حصہ لے گا:-

الف:- ہر شریک اپنا پورا وقت اور پوری توجہ اس شرکت کی تجارت میں لگائے گا، اور اشتیاق و ایمان داری سے حتی الوسع اپنی ذمہ داریاں دیگر شرکاء کے باہم مشورے سے ادا کرے گا۔

ب:- شرکاء پر لازم ہوگا کہ وہ اپنے ہم شریک سے ایمان داری اور انصاف سے کام کرے گا، اور یہ کہ وہ ہر وقت آپس میں ایک دوسرے کو باخبر رکھتے جائیں گے، اور جہاں بھی جس وقت بھی کوئی وضاحت طلب بات پیش آئے گی تو وہ بخوشی وضاحت کریں گے، بغیر کسی اخفاء و جبر کے۔

ج:- حسب معمول تمام رقوم تجارت کو، نیز تمام چیکوں کو اور دیگر معاوضات تجارت کو بینک کے کھاتے میں رکھا جائے گا۔

د:- ہر شریک پر ضروری ہوگا کہ وہ اپنا ذاتی قرضہ خود ادا کرے تاکہ دوسرے شرکاء ایسے اخراجات سے ہر وقت بری اور منزہ رہیں۔

۹- ہر شریک حسب ذیل امور کا مستحق ہوگا:-

الف:- تجارت کی طرف سے چیک نکلوانا۔

ب:- اپنے نفع کے حصے سے ماہانہ پیچیس پونڈ نکالنا جو اس کے حساب سے منہا کیا جائے گا یعنی منہا ہوتا رہے گا۔

ج:- ہر چار سال میں ایک برس کی تعطیل ملے گی۔

۱۰- کسی شریک کو بغیر دیگر حاضرین شرکاء کی سابق رضامندی کے حسب ذیل امور کا حق نہیں

پہنچے گا:-

الف:- بالواسطہ یا بلاواسطہ کسی اور الگ تجارت میں مشغول ہونا۔

ب:- خود اپنے ذاتی سرمائے کے حصے سے کچھ رقم فوقاً فوقاً نکالنا۔

ج:- ایسے لوگوں اور گاہکوں کے بارے میں جن کو دوسرے شریکوں نے بھروسہ دار ماننے

سے سابق طور پر تحریر کے ذریعہ منع کیا ہو، ان کو قرضہ دینا یا ادھار پر مال فروخت کرنا۔

د:- کوئی بھی ایسا کام کرنا یا اپنی طرف سے کفالت یا ضمانت دینا جس سے شرکت کی تجارت یا

جائیداد کو کسی قسم کا نقصان پہنچے۔

ر:- تجارت کے ایسے کاغذات پر تصدیق یا ادائیگی کا سکہ لگانا جس سے تجارت کو نقصان ہو۔

س:- اپنے حصے سے تجارت کی جائیداد یا منافع کو بیچنا، تحویل کرنا، یا رہن رکھنا۔

ص:- تجارت کی رقم یا مال و متاع کو کام میں لانا یا رہن رکھنا، سوائے تجارت کے عام نفع کے

لئے یا روزمرہ تجارتی کاموں میں۔

ط:- تجارت کے کسی ملازم کو ملازمت پر رکھنا یا اس کو معزول کرنا، بجز فحش بد اخلاقی کی وجہ سے۔
ع:- تجارتی غرض سے ٹرانسوال صوبے کی حدود سے آگے سفر کرنا۔

ف:- ایک سو پونڈ سے زیادہ کا معاہدہ یا وعدہ یا اجارہ کرنا، بشرطیکہ ایسا معاملہ معمولی تجارتی کارروائی کے خلاف نہ ہو۔

ی:- کوئی بھی ایسا معاہدہ انجام دینا جو اس تجارت کی روزمرہ کارروائی کے خلاف ہو۔
۱۱- ہر شریک کو یہ حق رہے گا کہ وہ جس وقت بھی چاہے مستعفی ہو سکتا ہے، بشرطیکہ وہ مستعفی ہونے سے چھ مہینے پہلے اپنا استعفاء شریکوں کو پیش کرے یعنی جون ماہ کی تیس تاریخ کو یا اگر دسمبر ماہ کی تیس تاریخ کو طالب فسخ اپنا استعفاء دینے کا ارادہ کرے تو پھر ایسے شریک کے لئے ضروری ہوگا کہ وہ اپنا استعفاء چھ ماہ پہلے پیش کر دے یعنی جنوری کی پہلی تاریخ کو یا جولائی ماہ کی پہلی تاریخ کو، نیز استعفاء کا تحریری ہونا ضروری ہوگا، ایسے استعفاء کے پیش کر دینے کے بعد چھ ماہ گزرتے ہی اس کی شرکت ختم ہو جائے گی بر بناء استعفاء پیش کر دینے کے، لہذا مستعفی شریک کی شرکت کو فسخ سمجھنے پر دفعہ نمبر ۱۲ کی شرطیں اب مستلزم ہو جائیں گی گویا کہ فسخ کرنے والے شریک کا انتقال ہو گیا ہو، جس کی بنا پر وہی قواعد و ضوابط لازم سمجھے جائیں گے جو کہ کسی شریک کے انتقال کے وقت سمجھے جاتے ہیں، کسی شریک کی وفات یا استعفیٰ پر باقی شریکوں کے حق میں عقد شرکت قائم اور باقی سمجھا جائے گا۔

۱۲- شرکت جاری ہوتے ہوئے اگر کسی شریک کا انتقال ہو جائے تو باقی زندہ شرکاء میں سے ہر ایک اس کی موت کی تاریخ سے اپنے الگ حصے کے مطابق متوفی شریک کے تجارتی حصے میں مشترک طور پر مالک بن جائے گا، نیز تیس جون سے لے کر وفات تک جتنے ماہ گزرے ہیں ہر ماہ کے مقابلے میں ان کی اولاد کو ان کے حصے سے ماہانہ پچیس پونڈ مع ان کے تجارتی حصے کی قیمت ادا کی جائے گی (یعنی متوفی شریک کے حصے کو ان کی اولاد سے باقی زندہ شرکاء خرید لیں گے) جبکہ شریک دفعہ نمبر ۱۱ کے مطابق مستعفی ہو جائے تو یا تو استعفاء کی تاریخ تیس جون کی ہے یا پھر اکتیس دسمبر کی ہے تو اگر تیس جون کی ہوگی تو اس سے اگلے سال کی تیس جون کو اس کے حصے میں جتنی رقم تھی اتنی ہی رقم کا حق دار ہوگا مع اس سال کے تجارتی نفع کے، اور اگر اکتیس دسمبر کی ہوگی تو پھر اس سال کے تیس جون کو اس کے حصے میں جتنی رقم تھی اتنی ہی رقم کا وہ حق دار ہوگا مع ایک سو پچاس پونڈ کے، جو جون کی تیس تاریخ سے لے کر اکتیس دسمبر تک اس کے حصے کا نفع سمجھا جائے گا۔ کسی مستعفی شریک کو یہ حق نہیں پہنچے گا کہ وہ پگڑی کی رقم طلب کرے، نہ اس کو یہ حق پہنچے گا کہ تجارتی نقصان جو حساب تجارت سے منہا کیا گیا ہے اس کی بابت وہ کچھ تبدیل کرانے کا مطالبہ کرے، مستعفی شریک یا متوفی شریک کے نمائندے کو ثمن

بیع قسط وار ماہانہ پانچ سو پونڈ کے حساب سے چھتیس ماہانہ قسطوں میں (دونوں میں جو اقل مقدار ہوگی) ادا کیا جائے گا۔

۱۳- شرکت کی بابت اگر کچھ جھگڑا یا نا اتفاقی پیش آئے تو سب سے پہلے شریکوں کے والد محترم یعنی حاجی موسیٰ اسماعیل صاحب سے رجوع کیا جائے گا، اور ان کی عدم موجودگی میں شریکوں کی والدہ یعنی حاجیانہ امینہ سے رجوع کیا جائے گا، اور ان کی عدم موجودگی میں اس تجارت کے محاسب منشی سے رجوع کیا جائے گا، اور ان کی عدم موجودگی میں دو حکم ایسے مقرر کئے جائیں گے جن کا انتخاب فریقین کی طرف سے ہوگا، اور پھر یہ مقرر کئے ہوئے دو حکم اس معاملے میں اپنی طرف سے کام شروع کرنے سے پہلے کوئی ایسے شخص کو نامزد کریں جو ان دونوں حکم کے درمیان میں حاکم قرار دیا جائے گا تاکہ یہ حکم حکمین کی نا اتفاقی کی صورت میں قطعی فیصلہ کر سکے۔

۱۴- شرکاء تجارت ہذا اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ جب کوئی جھگڑا پیدا ہوگا درمیان تجارت کے مینیجر اور کسی شریک کے تو پھر یہی دفعہ نمبر ۱۳ کے مطابق فیصلہ کیا جائے گا، مذکورہ بالا شرطوں کے باوجود اگر شرکاء کے درمیان میں تجارت کے سلسلے میں کوئی نا اتفاقی پیدا ہوئی تو اکثر شریکوں کی رائے کا اعتبار ہوگا، نیز یہ کہ اگر کوئی شریک حاضر نہ ہو سکے تو پھر اس کو حق پہنچے گا کہ وہ اپنی طرف سے کسی شخص کو وکیل مقرر کرے۔ (ختم شد) شاہد نمبر ۱:- زید شاہد نمبر:- عمرو

امضاءات شرکاء

۱- ایوب ابن موسیٰ ۲- یونس بن موسیٰ

۳- ہارون بن موسیٰ ۴- سلیمان بن موسیٰ

جواب:- سوالات کے جوابات بالترتیب مندرجہ ذیل ہیں:-

۱:- صورت مسئلہ میں شرکت درست ہوگئی، اور اگرچہ حنفی مسلک میں ”شرکت بالعروض“ درست نہیں ہوتی،^(۱) لیکن چونکہ صورت مسئلہ میں حاجی موسیٰ اسماعیل صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے صاحبزادوں نے تمام جائیدادیں اپنے والد سے مشترک طور پر خرید لیں، اس لئے ان کے درمیان ”شرکت الملک“ متحقق ہوگئی،^(۲) اور ”شرکت الملک“ کے تحقق کے بعد ”شرکت العقد“ عروض میں بھی درست

(۱) راجع للتذیل والتفصیل إلى بدائع الصنائع ج: ۶ ص: ۵۹ لا تصح الشركة فی العروض، والمبسوط للسرخسی ج: ۱۱ ص: ۱۵۹ (طبع إدارة القرآن) والتاتارخانیة ج: ۵ ص: ۲۲۲ (طبع قدیمی کراچی) وفتح القدير ج: ۵ ص: ۳۸۹ (طبع رشیدیہ کوئٹہ) وشرح المجلة لعلی حیدر ج: ۱۰ ص: ۳۷۴ رقم المادۃ: ۱۳۴۲ (طبع دار الکتب بیروت) ومجلة الأحكام العدلیة ج: ۴ ص: ۱۳۴۲ (طبع نور محمد کراچی)۔
(۲) وفي البحر الرائق، کتاب الشركة ج: ۵ ص: ۱۶۶ (طبع سعید) أن یملک اثنان عیناً اثناً أو شراءً بیان للنوع الأول منها وقوله اثناً أو شراءً مثال لا قید والحاصل أنها نوعان جبرية واختيارية فإشار الى الجبرية بالارث والى الاختيارية بالشراء كما فی المحيط الخ۔

ہے، لما فی الہندیۃ:-

والحيلة فی جواز الشركة فی العروض وکل ما یتعین بالتعین أن یبیع کل واحد منهما نصف ماله بنصف مال صاحبه حتی یصیر مال کل واحد منهما نصفین، وتحصل شركة ملک بينهما، ثم یعقدان بعد ذلك عقد الشركة فیجوز بلا خلاف کذا فی البدائع.

(۱) (عالمگیریہ ج: ۲ ص: ۳۰۷، باب اول، فصل: ۳).

لہذا صحت شرکت میں عروض کی وجہ سے اشکال نہ رہا۔

جہاں تک اس معاہدہ شرکت کا تعلق ہے، جو ضمیمے کی دستاویز میں قلم بند ہے، سو اس کی اکثر شرائط درست ہیں، لیکن اس میں بعض شرطیں فاسد بھی ہیں، مثلاً وہ شرط جو دفعہ ۱۰ ذیل الف میں مذکور ہے کہ کوئی شریک بالواسطہ یا بلاواسطہ اپنی کوئی الگ تجارت نہیں کر سکے گا۔ یہ شرط شرکت عنان کے مقتضا کے خلاف ہے، اور شرکت مفاوضہ کی شرائط یہاں موجود نہیں، لہذا یہ شرط فاسد ہے، لیکن شرکت میں اگر کوئی شرط فاسد لگادی جائے تو اس سے شرکت باطل نہیں ہوتی، بلکہ صرف وہ شرط فاسد ہو جاتی ہے اور اس پر عمل ضروری نہیں ہوتا۔

لما فی رد المحتار: لأن الشركة لا تفسد بالشروط الفاسدة.

(۲) (شامی ج: ۳ ص: ۳۷۶).

ایک اور شرط فاسد معاہدے کی دفعہ ۱۲ میں یہ مذکور ہے کہ کسی ایک شریک کی وفات کی صورت میں ۳۰ جون سے لے کر وفات تک جتنے ماہ گزرتے ہیں، ہر ماہ کے مقابلے میں ان کی اولاد کو پچیس پونڈ ماہانہ مع ان کے تجارتی حصے کی قیمت ادا کیا جائے گا، انگریزی معاہدہ نامے میں یہ صراحت ہے کہ یہ پچیس پونڈ ماہانہ کی رقم اس نفع کے قائم مقام سمجھی جائے گی جو ۳۰ جون کے بعد وفات کی تاریخ تک مرحوم کے حصے میں آئی ہو۔

دفعہ ۱۱ میں بھی اسی قسم کی ایک شرط فاسد یہ ہے کہ اگر کوئی شریک ۳۱ دسمبر کو شرکت ختم کر دے تو وہ اتنی رقم کا حق دار ہوگا جو ۳۰ جون کو اس کے حصے میں تھی، مع ایک سو پچاس پونڈ کے جو ۳۰ جون سے ۳۱ دسمبر تک اس کے حصے کا نفع سمجھا جائے گا، یہ شرط بھی مذکورہ بالا وجہ کی بناء پر فاسد ہے، اگر اس

(۱) (طبع مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ)

وفی بدائع الصنائع، کتاب الشركة ج: ۶ ص: ۵۹ (طبع سعید) والحيلة فی جواز الشركة فی العروض وکل ما یتعین بالتعین أن یبیع کل واحد منهما نصف ماله بنصف مال صاحبه حتی یصیر مال کل واحد منهما نصفین، وتحصل شركة ملک بينهما ثم یعقدان بعد ذلك عقد الشركة فتجوز بلا خلاف. وکذا فی الدر المختار ج: ۲ ص: ۳۱۰ (طبع سعید) وکذا فی التاتارخانیة ج: ۵ ص: ۲۲۴ (طبع قدیمی کراچی).

(۲) رد المحتار، کتاب الشركة ج: ۴ ص: ۳۱۶ (طبع سعید) وکذا فی الہندیۃ ج: ۲ ص: ۳۰۳ (طبع مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ) (محمد زبیر حق نواز)

طرح کسی ایک شریک کے لئے کوئی متعین رقم بطور نفع اصل شرکت ہی میں مقرر کر لی جاتی تو اس سے شرکت ہی فاسد ہو جاتی۔

لما فی الدر المختار: وتفسد باشتراط دراهم مسماة من الربح لأحدهما لقطع الشركة كما مر لا لأنه شرط، لعدم فسادها بالشروط.

(۱) (در مختار مع شامی ج: ۳ ص: ۳۷۶ و ۳۷۷).

لیکن چونکہ اسی معاہدہ نامے کی دفعہ ۵ میں شرکاء کے درمیان نفع کی تقسیم کا عام طریقہ شریعت کے مطابق ہے اور اس میں کسی بھی فریق کے لئے کوئی معین رقم مقرر کرنے کے بجائے نفع و نقصان میں برابر کی شرکت طے کی گئی ہے، اور اصل شرکت کا معاہدہ اسی دفعہ پر مبنی ہے، اور دفعہ ۱۱ و ۱۲ میں جو طریق کار مقرر کیا گیا ہے وہ دفعہ ۵ سے متعارض ہے، اور صرف فتح شرکت کے وقت حساب کا ایک طریقہ طے کرنے کے لئے مقرر کیا گیا ہے، بلکہ انگریزی متن میں معین رقم کو ”نفع کا قائم مقام“ قرار دیا گیا ہے، جس کے معنی یہ ہیں کہ نفع تو وہی ہوگا جو دفعہ ۵ کے تحت مقرر ہوگا، لیکن یہ معین رقم اس کے قائم مقام سمجھی جائے گی، اس لئے اس شرط فاسد کی وجہ سے اصل عقد شرکت باطل نہ ہوگا، البتہ یہ شرط باطل ہو جائے گی۔

خلاصہ یہ ہے کہ ”معاہدہ شرکت“ کی وہ دستاویز جو استفتاء کے ساتھ منسلک ہے، اس حد تک تو شرعاً معتبر ہے کہ اس کی بنیاد پر شرکت درست ہوگئی، لیکن اس میں جو شرائط فاسدہ مذکور ہیں، جن کا ذکر اوپر آیا ہے، وہ شرائط شرعاً واجب العمل نہیں ہیں۔

۲:- جن شرائط فاسدہ کا ذکر سوال نمبر ۱ کے جواب میں آیا ہے، ان پر تو عمل واجب نہیں،

(۱) الدر المختار ج: ۳ ص: ۳۱۶ (طبع سعید)

وفی الهدایة ج: ۲ ص: ۶۱۱ (طبع رحمانیہ) ولا يجوز الشركة اذا شرط لأحدهما دراهم مسماة من الربح لأنه شرط يوجب انقطاع الشركة الخ.

وفی الہندیة ج: ۲ ص: ۳۰۲ (طبع مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ) وأن يكون الربح معلوم القدر فان كان مجهولاً تفسد الشركة وان يكون الربح جزءاً شائعاً في الجملة لا معيناً فان عيناً عشرة أو مائة أو نحو ذلك كانت الشركة فاسدة الخ. وفي بدائع الصنائع ج: ۶ ص: ۵۹ (طبع سعید) (ومنها) أن يكون الربح جزءاً شائعاً في الجملة لا معيناً فان عيناً عشرة أو مائة أو نحو ذلك كانت الشركة فاسدة لأن العقد يقتضي تحقق الشركة في الربح والتعيين يقطع الشركة لجواز أن لا يحصل من الربح إلا القدر المعين لأحدهما فلا يتحقق الشركة في الربح.

وفی فتح القدیر، کتاب الشركة ج: ۵ ص: ۴۰۲ (طبع رشیدیہ) ولا تجوز الشركة اذا شرط لأحدهما دراهم مسماة من الربح قال ابن المنذر لا خلاف في هذا لأحد من أهل العلم ووجه ما ذكره المصنف بقوله لأنه شرط يوجب انقطاع الشركة ففساداً لا يخرج الآ قدر المسمى.

وفی تبیین الحقائق، کتاب الشركة ج: ۴ ص: ۲۴۸ (طبع دار الکتب العلمیہ بیروت) وتفسد ان شرط لأحدهما دراهم مسماة من الربح لأنه شرط يوجب انقطاع الشركة في بعض الوجوه فلعلة لا يخرج الآ قدر المسمى لأحدهما من الربح. وكذا في خلاصة الفتاوى ج: ۴ ص: ۲۹۴ (طبع امجد اکیڈمی لاہور) والبحر الرائق ج: ۵ ص: ۱۷۷ (طبع سعید) وشرح المجلة لسليم رستم باز رقم المادة: ۱۳۳۷ ج: ۲ ص: ۷۱۳ (طبع دار الکتب العلمیہ بیروت). (محمد زبیر حق نواز)

لیکن باقی تمام شرائط جو شرعاً درست ہیں، ان کی مخالفت کسی بھی شریک کے لئے جائز نہیں، لائن المسلمین علیٰ شروطہم الا شرطاً حرم حلالاً أو أحلّ حراماً۔^(۱)

۳:- اگر یہ بات متعین طور پر معلوم ہو یا کسی جگہ لکھی ہوئی محفوظ تھی کہ چاروں بھائیوں نے اپنے والد سے جو جائیدادیں خریدی ہیں، وہ کیا کیا ہیں؟ اور کہاں کہاں ہیں؟ تو پھر معاہدہ نامہ شرکت میں ان کی جزوی تفصیلات اور مقدار بیان کرنا شرکت کی صحت کے لئے ضروری نہیں تھا، اس کے دو سبب ہیں:-

الف:- پہلا سبب یہ کہ سرمایہ شرکت کی مقدار کا تعین عقد کے وقت عقد کی صحت کے لئے ضروری نہیں ہوتا۔

لما فی البدائع: وأما العلم بمقدار رأس المال وقت العقد فليس بشرط لجواز الشركة بالأموال عندنا وعند الشافعي رحمه الله شرط ولنا أن الجهالة لا تمنع جواز العقد لعينها، بل لافضائها الى المنازعة وجهالة رأس المال وقت العقد لا تفضي الى المنازعة، لأنه يعلم مقداره ظاهراً وغالباً لأن الدراهم والدنانير توزنان وقت الشراء فيعلم مقدارها فلا يؤدي الى جهالة مقدار الربح وقت القسمة. (بدائع الصنائع ج: ۶ ص: ۶۳)^(۲)

ب:- دوسری وجہ یہ ہے کہ صورت مسئلہ میں چاروں بھائیوں کے درمیان عقد شرکت عنان سے پہلے شرکت ملک قائم ہو چکی تھی، جیسا کہ سوال نمبر ۱ کے جواب میں لکھا گیا ہے، اور سب کے حصے بھی برابر تھے، اور نفع بھی، اس لئے مقدار معلوم نہ ہونے سے جہالت مفضی الی المنازعة کا کوئی اندیشہ نہیں تھا، شرکت فی العروض کا جو حیلہ سوال نمبر ۱ کے جواب میں ذکر کیا گیا ہے، اس کے سلسلے میں علامہ ابن ہمام رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں:-

وهذا لأن المانع من كون رأس مال الشركة عروضاً كل من أمرين: لزوم ربح ما لم يضمن، وجهالة رأس مال كل منهما عند القسمة، وكل منهما منتف، فيكون كل ما ربحه أحدهما ما هو مضمون عليه، ولا تحصل جهالة

(۱) وفي جامع الترمذی رقم الحديث: ۱۲۷۲ "المسلمون علیٰ شروطہم الا شرطاً حرم حلالاً أو أحلّ حراماً" (وكذا فی الصحيح للبخاری، كتاب الاجارة).

(۲) (طبع سعید) وفي الهندية ج: ۲ ص: ۳۰۶ (طبع رشیدیہ کوئٹہ) اما العلم بمقدار رأس المال وقت العقد فليس بشرط عندنا.

فی رأس مال کل منهما، لأنه لا یحتاج الی تعرف رأس مال کل منهما عند
القسمة حتی یكون ذلک بالحذر فتقع الجهالة لأنهما مستویان فی المال
شریکان فیہ فبالضرورة یكون کل ما یحصل من الثمن بینهما نصفان.

(۱) (فتح القدیر ج: ۵ ص: ۳۹۶)

۴:- محض کام چھوڑ دینے اور غائب ہو جانے سے شرکت ختم نہیں ہوتی۔

لما فی العالمگیریۃ: وان عمل أحدهما ولم یعمل الآخر بعذر أو بغير عذر
صار کعملهما معاً، کذا فی المضمورات.

(۲) (فتاویٰ عالمگیری ج: ۲ ص: ۳۲۰، کتاب الشركة باب: ۳ فصل: ۲)

اگر دوسرے شرکاء اس کے کام چھوڑ دینے کی صورت میں اس کے ساتھ شرکت پسند نہیں
کرتے تھے تو ان کو اس کے ساتھ صراحتہ شرکت فسخ کر دینی چاہئے تھی۔

۵:- یک طرفہ طور پر شرکت فسخ کرنے کے لئے شرعاً ضروری نہیں کہ فریقِ ثانی فسخ کو

قبول کرے۔

لما فی الدر المختار: وتبطل أيضاً بانکارها وبقوله لا أعمل معک فتح

(۳) (شامی ج: ۳ ص: ۳۸۴) وبفسخ أحدهما.

اور جو معاہدہ شرکت صورتِ مسئلہ میں لکھا گیا ہے اس میں بھی استعفاء کے مؤثر ہونے کو
دوسرے شرکاء کی قبولیت پر موقوف نہیں رکھا گیا، لہذا جب کسی شریک نے معاہدے کے مطابق استعفاء
دیا تو اس کی شرکت معاہدے میں مذکورہ مدت سے ختم سمجھی جائے گی، خواہ دوسرے شرکاء نے استعفاء
قبول کیا ہو یا نہ کیا ہو۔

۶:- ہو جائے گی، دلیل نمبر ۵ میں گزر گئی۔

(۱ و ۲) (طبع مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ).

(۳) الدر المختار، کتاب الشركة، فصل فی الشركة الفاسدة ج: ۴ ص: ۳۲۷ (طبع سعید).
وفی الهندیۃ ج: ۲ ص: ۳۳۶ (طبع مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ) واذا قال أحد الشریکین لصاحبه لا أعمل معک بالشركة
فهو بمنزلة قوله فاسختک الشركة.

وفی التاتاریخانیۃ ج: ۵ ص: ۶۳۷ (طبع ادارة القرآن) واذا انکر أحد المتفاوضین المتفاوضة انفسخت المتفاوضة
هكذا ذکر شیخ الاسلام فیجب أن یكون الحکم فی جمیع الشركات هكذا وفی الظہیریۃ واذا أنکر أحد الشریکین
الشركة ومال الشركة امتعة کان هذا فسخاً للشركة.

وفی فتح القدیر ج: ۵ ص: ۳۸۰ (طبع رشیدیہ کوئٹہ) لأن عقد الشركة عقد غیر لازم فان لكل منهما ان یفسخه اذا شاء.
وفی درر الحکام شرح المجلة لعلی حیدر، تحت المادة رقم: ۱۳۵۳ تنفسخ الشركة بفسخ أحد الشریکین أو بانکاره
الشركة أو یقول أحدهما للآخر لا أعمل معک فانه بمنزلة فاسختک. (محمد بیزحق نواز)

۷:- اوپر گزر چکا ہے کہ معاہدے کے مطابق استعفاء دے دینے سے مستغنی شریک کی شرکت ختم ہوگئی، اب اس کو دوبارہ شریک قرار دینے کے لئے ضروری ہے کہ اس کے ساتھ از سر نو عقد شرکت کیا جائے، لہذا اگر اس کے بعد دوسرے شرکاء نے اس شخص کے ساتھ واضح طور پر دوبارہ تحریری یا زبانی عقد شرکت قائم کر لیا ہو، اور اس کی بناء پر وہ اسے چوتھا حصہ دیتے رہے ہوں تب تو وہ دوبارہ شریک سمجھا جائے گا، ورنہ نہیں۔ اس کے برعکس اگر کوئی نیا عقد شرکت نہیں ہوا اور اسے دوسرے شرکاء محض چوتھا حصہ دیتے رہے تو اس میں کئی احتمالات ہیں، ایک یہ کہ شرکاء اسے تبرعاً یہ رقم دیتے رہے ہوں، دوسرے یہ کہ شرکت کے فسخ کی بناء پر مستغنی شریک کے جس حصے کی ادائیگی دوسرے شرکاء پر واجب تھی یہ رقم اس کے حصے کے طور پر دیتے رہے ہوں، لہذا جب تک فریقین کے درمیان نئے عقد شرکت کا صریح معاہدہ نہ ہوا ہو ان احتمالات کی موجودگی میں محض چوتھے حصے کی ادائیگی کو عقد شرکت نہیں کہا جاسکتا، لأن الشركة لا تثبت بالاحتمال۔

۸:- شرعاً بھی شرکت کے فسخ کے لئے یہ ضروری ہے کہ فسخ کرنے والا دوسرے شرکاء کو اپنے فسخ کی اطلاع دے، اس کے اطلاع دیئے بغیر شرکت فسخ نہیں ہوتی۔

لما فی الدر المختار: وتبطل أيضاً بانكارها وبفسخ أحدهما

ويتوقف على علم الآخر لأنه عزل قصدي، وفي رد المحتار: (قوله لأنه

عزل قصدي) لأنه نوع حجر فيشترط علمه دفعا للضرر عنه فتح.

(۱)

(رد المحتار ج: ۳ ص: ۳۸۴ و ۳۸۵)

اور منسلک معاہدے میں بھی استعفاء کے لئے دوسرے شرکاء پر پیش کرنا ضروری قرار دیا گیا ہے، لہذا اگر کسی شریک نے استعفاء لکھ کر اپنے پاس رکھ لیا اور کسی دوسرے شریک کو پیش نہیں کیا، تو اس سے شرکت فسخ نہیں سمجھی جائے گی، ہاں جب کبھی وہ شریک از خود وہ استعفاء نکال کر دوسرے شرکاء کو پیش کر دے تو پیش کرنے کی تاریخ سے چھ ماہ بعد حسب معاہدہ شرکت فسخ ہوگی۔

(۱) رد المحتار ج: ۲ ص: ۳۲۷ (طبع سعید کراچی)

وفی التاتارخانیة ج: ۵ ص: ۶۳۷ (طبع ادارة القرآن) وهذا اذا فسخ بحضرة صاحبه اما لو فسخ بغیبة صاحبه ولم يعلم صاحبه بالفسخ لا یصح.

وفی الہندیة ج: ۲ ص: ۳۳۵ (طبع رشیدیہ کونٹہ) ولو لم یمت لکن فسخ أحدهما الشركة ولم یعلم شریکہ لا تنفسخ الشركة. وكذا فی فتح القدير، کتاب الشركة ج: ۵ ص: ۴۱۳ (طبع رشیدیہ).

وفی شرح المجلد لعلی حیدر ج: ۱۰ ص: ۳۹۰ (طبع دار الکتب بیروت) تنفسخ الشركة بفسخ أحد الشریکین ولكن یشرط ان یعلم الآخر بفسخه ولا تنفسخ الشركة ما لم یعلم الآخر فسخ الشریک.

۹:- یہ سوال واضح نہیں، معاہدہ نامے کی مخصوص دفعہ کے خلاف استعفاء پیش کرنے کی کیا شکل ہے؟ وضاحت سے لکھا جائے تو جواب ممکن ہوگا۔

۱۰:- یہ جزئیہ صراحتہً نظر سے نہیں گزرا، لیکن متعدد دوسرے جزئیات پر قیاس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ صورتِ مسئلہ میں مرحوم شریک کی اولاد کو شریکِ کاروبار تصور کیا جائے گا۔ اصل یہ ہے کہ مرحوم کی وفات پر ان کے ساتھ شرکت ختم ہوگئی، اب ان کے دوسرے شرکاء پر لازم ہو گیا کہ مرحوم کا حصہ ان کے ورثاء کو ادا کر دیں، اور اگر انہیں شریکِ کاروبار رکھنا چاہیں تو تمام شرکاء کی رضامندی لازمی ہوگی۔

لما فی الدر المختار: لا یملک الشریک الشركة الا باذن شریکہ
(ج: ۳ ص: ۳۷۸) (۱)

اب یہ رضامندی عام حالات میں صریح الفاظ کے ساتھ ہونی چاہئے، لأن الساکت لا ینسب الیہ قول، لیکن جب دو شریکوں نے اسی غرض کے لئے مجلس منعقد کی، اور اس میں مرحوم کی اولاد کو شریک بنانے کا فیصلہ کیا تو یہ فیصلہ تمام شرکاء کی طرف سے کیا گیا، اس وقت ایک شریک موجود ہونے کے باوجود خاموش رہا، اور اس پر اس نے کوئی اعتراض نہیں کیا، اس کے بعد مرحوم کی اولاد شریکِ کاروبار کی حیثیت سے مدت تک تصرف کرتی رہی، پھر بھی اس نے کوئی اعتراض نہیں کیا، تو یہ مجموعی طرزِ عمل رضامندی ثابت کرنے کے لئے کافی ہے۔

نظیرہ ما فی الاشباہ: سکوتہ عند بیع زوجته أو قریبہ عقاراً اقرار بأنہ لیس
لہ علی ما افتی بہ مشایخ سمرقند.
وفیہ بعد ذلک: راہ بیع أرضاً أو داراً فتصرف فیہ المشتري زماناً وهو
ساکت یسکت دعواہ.

اس کے تحت علامہ حموی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:-

فیہ عما قبلہ زیادة تصرف المشتري بعد الشراء زماناً وهو ساکت فهو قید
فی الأجنبی لا فی الزوجة والقریب کما یفہمہ اطلاقہ.

(۲)
(شرح الاشباہ والنظائر للحموی ج: ۱ ص: ۱۸۷)

یہی مسئلہ درمختار اور رد المحتار میں اشباہ سے نقل کر کے اسی طرح کتاب الوقف میں

(۱) الدر المختار، کتاب الشركة ج: ۲ ص: ۳۱۷ (طبع سعید).

(۲) رد المحتار ج: ۳ ص: ۶۲ قاعدة لا ینسب الی ساکت قول. وكذا فی الاشباہ والنظائر ج: ۲ ص: ۱۷۰ (طبع دار الکتب العلمیة).

(۳) القاعدة الثانية عشر ج: ۱ ص: ۷۹ (طبع سعید).

بھی ذکر کیا گیا ہے۔

(۱) (رد المحتار ج: ۳ ص: ۳۸۹)

۱۱:- مستفتیٰ مذکور ہی کی طرف سے زیر بحث معاملے ہی کے متعلق ایک اور استفتاء بعد میں موصول ہوا، اس میں انہی سوالات کا اعادہ ہے جن کا جواب پیچھے آچکا ہے، البتہ اس میں ایک سوال زائد ہے، اور وہ یہ کہ معاہدہ نامے میں یہ طے کیا گیا تھا کہ شرکت کا کاروبار صوبہ ٹرانسوال تک محدود رکھا جائے گا، بعد میں برضامندی شرکاء اس کاروبار کو دوسرے علاقوں تک بھی وسعت دی گئی، سوال یہ کیا گیا ہے کہ آیا اس عمل سے شرکت کی عرفی حیثیت پر کوئی فرق تو نہیں پڑا؟

اس کا جواب یہ ہے کہ اگر تمام شرکاء کی رضامندی سے تجارت ٹرانسوال سے باہر لے جائی گئی تو شرکت کی حیثیت پر کوئی فرق نہیں پڑا، شرکت بدستور قائم ہے۔ اور اگر دوسرے شرکاء کی رضامندی کے بغیر کوئی شریک مال تجارت ٹرانسوال سے باہر لے گیا تو شرکت تو پھر بھی باقی رہے گی، البتہ باہر تجارت کرنے سے اگر کوئی خسارہ ہو جائے تو خسارے کا تاوان صرف اس شریک پر آئے گا جو باہر لے گیا تھا۔

لما فی رد المحتار: وان خص له (أی المضارب) رب المال التصرف فی بلد بعینه أو فی سلعة بعینها لم یجز أن یتجاوز ذلک فان خرج الی غیر ذلک البلد أو دفع المال الی من أخرجه لا یكون مضموناً علیه بمجرّد الاخراج حتی یشتری به خارج البلد، فان هلك المال قبل التصرف فلا ضمان علیه، وكذا لو أعاده الی البلد عادت المضاربة کما كانت علی شرطها، وان اشتری به قبل العود صار مخالفاً ضامناً والظاهر أن الشریکة کذلک.

(شامی ج: ۳ ص: ۳۰۸) (۲)

هذا ما ظهر لی واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

وعلمہ اتم وأحکم

۲۰ رزی الحجہ ۱۴۰۶ھ

(فتویٰ نمبر ۱۸۳۹/۲۲ھ)

(۱) وفي الدر المختار ج: ۴ ص: ۳۸۲ (طبع سعید) (فی الاشباه السکوت کالنطق فی مسائل) عد منها سبعة وثلاثین. وفي الشامية تحته (مطلب المواضع التي يكون فيها السکوت كالقول) ۲۴ سکوته عند بیع زوجته أو قریبه عقاراً اقرار بأنه ليس له علی ما أفتی به مشائخ سمرقند الخ. ۲۵ رأه یبیع عرضاً أو داراً فتصرف فيه المشتري زماناً وهو ساکت تسقط دعواه.

(۲) رد المحتار کتاب الشریکة ج: ۴ ص: ۳۲۱ (طبع سعید)

وفي الهدایة کتاب المضاربة ج: ۳ ص: ۲۶۵ (طبع مکتبه رحمانیہ لاہور) وان خص له رب المال التصرف فی بلد بعینه أو فی سلعة بعینها لم یجز له أن یتجاوزها لأنه توکیل وفي التخصیص فائدة فی تخصص وكذا ليس له أن يدفعه بضاعة الی من یخرجها من تلك البلدة لأنه لا یملك الاخراج بنفسه فلا یملك تفویضه الی غیره فان خرج الی غیر تلك البلدة فاشتری ضمن وكان ذلک له وله ربحه لأنه تصرف بغير أمره وان لم یشتر حتی رده الی الکوفة وهي التي عینها بریء من الضمان كالمودع اذا خالف فی الودیعة ثم ترک الخ. (محمد زبیر)

شرکت میں ایک شریک کے انتقال کے بعد شرکت ختم ہو جاتی ہے

سوال:- زید اور بکر نے برابر کی شرکت سے ایک کاروبار کیا، کاروبار چالو ہو گیا، کچھ عرصہ بعد زید کا اچانک انتقال ہو گیا، مرحوم نے پسماندگان میں ایک بیوہ، تین نابالغ بچے، (جس میں ایک لڑکی اور دو لڑکے ہیں) اور ایک بڑا بھائی چھوڑا ہے۔

اب یہ بتایا جائے کہ آیا زید مرحوم کی شرکت اس کاروبار میں باقی ہے یا ختم ہو گئی؟ اگر ختم ہو گئی ہے تو اب زید مرحوم کا حصہ کس شخص کے حوالے کیا جائے؟ بیوہ کہتی ہے کہ مجھے دے دو، لہذا شرعی حکم سے مطلع فرمایا جائے، نیز اگر بچوں اور بیوی کی رضامندی سے مرحوم کا یہ حصہ شرعی حصوں کے مطابق تقسیم کر کے ہر ایک حصہ اس کے حوالے کر دیا جائے اور بچوں کا حصہ والدہ کے پاس رکھ دیا جائے تو کیا ایسا ہو سکتا ہے؟

جواب:- مذکورہ صورت میں زید کے انتقال ہو جانے کی وجہ سے مرحوم کی شرکت^(۱) بکر کے ہمراہ ختم ہو گئی، بکر پر واجب ہے کہ زید کا جس قدر حصہ کاروبار میں ہے، وہ جدا کر دے اور پھر جو شخص مرحوم کے ترکے کی تقسیم کا انتظام کر رہا ہو، اُس کے حوالے کر دے، اور بہتر یہ ہے کہ دو گواہوں کے سامنے حوالے کر دے تاکہ بعد میں کوئی فساد نہ ہو۔ اور ایسا بھی کر سکتا ہے کہ خود شرع کے مطابق تقسیم کرے۔

واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم

ھ ۱۳۹۷/۶/۲

(فتویٰ نمبر ۶۵۸/۲۸ ب)

بیٹے کا مال اپنے کاروبار میں لگا کر ماہوار اسے متعینہ رقم دینے کا حکم

سوال:- میں نے اپنے بیٹے کو مثلاً دس ہزار روپے دے دیئے اور پھر اپنے ہی کاروبار میں اس کے نام سے شریک کر لئے اور ہر ماہ اپنے لڑکے کو ایک رقم مثلاً سو روپیہ ماہوار دیتا ہے، اور بیٹا نہ محنت میں شریک ہے اور نہ نقصان میں، تو کیا یہ صورت جائز ہے؟

(۱) فی الدر المختار ج: ۴ ص: ۳۲۷ (طبع سعید) وتبطل الشركة أى شركة العقد بموت أحدهما علم الآخر أو لا. وفي الجوهرة النيرة (قبيل كتاب المضاربة) ج: ۳ ص: ۱۲۸ وإذا مات أحد الشريكين أو ارتد ولحق بدار الحرب بطلت الشركة.... الخ.

وفي تبیین الحقائق فصل فی الشركة الفاسدة ج: ۱۰ ص: ۱۷۸ وتبطل الشركة بموت أحدهما.

وفي فتح القدير فصل فی الشركة الفاسدة وإذا مات أحد الشريكين أو ارتد ولحق بدار الحرب بطلت الشركة.... الخ. وفي شرح مجلة الأحكام للأناسي ج: ۴ ص: ۲۷۷ رقم المأذة: ۱۳۵۲ (طبع مكتبة اسلاميه كونه) إذا مات أحد الشريكين أو جن جنونا مطبقاً تنفسخ الشركة.... الخ.

جواب:- آپ اپنے بچے کے مال کو تجارت میں لگا سکتے ہیں، اس صورت میں وہ آپ کا شریک ہوگا، لیکن اس شرکت کی حیثیت سے اسے نقصان سے بری رکھنا یا سو روپیہ ماہوار مقرر کر دینا شرعاً درست نہیں، تجارت چونکہ ایسا امر ہے جس میں نفع اور نقصان دونوں کا احتمال ہے، لہذا آپ کو بحیثیت باپ کے اپنے بیٹے کا مال تجارت میں لگانے کا اختیار ہے اور اس کے بعد وہ نفع و نقصان دونوں میں شریک ہوگا، ہاں اگر آپ بنظر شفقت اپنے حصے میں سے سو روپے ماہوار اس کے لئے مقرر کر دیں تو یہ الگ بات ہے، یا ایسا کریں کہ سو روپیہ ماہوار اس کے حصہ نفع میں سے علی الحساب دیتے رہیں، سال دو سال میں حساب سے جو صورت بنے اس کے مطابق کر لیں۔ وما تردد من العقود بین نفع و ضرر کالبيع والشراء توقف علی الاذن۔ (شامی ج: ۵ ص: ۱۶۸)۔^(۱) واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

۱۳۹۰/۳/۲۲ھ

(فتویٰ نمبر ۲۱۸/۲۲ الف)



کتاب البیوع

(خرید و فروخت کے مسائل)

﴿فصل فی البیع الفاسد والباطل﴾

﴿والموقوف والمکروه﴾

(بیع فاسد، باطل، موقوف اور مکروه کا بیان)

بیع اور اجارہ کا معاملہ اکٹھے کرنے کا حکم

سوال :- زید اپنی سوئی ہوئی بھینس بمع بچے کے بکر کو بیچتا ہے بعوض سترہ سو روپے کے، جبکہ اسی کے ساتھ زید زمین کی بٹائی کا معاملہ بکر سے کرتا ہے چالیس کنال زمین جس میں سے سترہ کنال گنا ہے، گنے کی قیمت چودہ سو روپے اور باقی زمین کی آئندہ بٹائی تیرہ سو روپے طے پایا۔

۲ :- یہ تمام معاملہ طرفین میں چار ہزار چار سو کا ہوا، جن میں سے بکر نے ایک ہزار نقد زید کو دے دیے، چودہ سو روپے ۱۵/۴/۱۹۷۷ء کو اور دو ہزار ۸/۷/۱۹۷۸ء کو دینے کا وعدہ کیا۔

۳ :- زید مذکور نے ہی زمین عمرو کو مزارعت پر مطابق نصف پر لئے، اس کا حصہ زید نے دینا تھا، اب رہا بعد کا حساب تو ۳۱/۸/۱۹۷۶ء سے ۱۵/۵/۱۹۷۸ء تک زمین کے جملہ اخراجات بکر مذکور پر ہوں گے، بکر نے زمین کی کاشت خود کرنے کا فیصلہ کیا تو مزارع عمرو نے ناراض ہو کر کہا کہ پھر میں تمہیں اس سال کا گنا جس میں نصف سے کہا گیا کہ تم بکر کو پندرہ سو روپے دے دو، زمین اور بھینس واپس لو جبکہ بکر نے بھینس کا بچہ ۷۰ روپیہ پر فروخت کیا ہے اور اس دوران زمین کی آمدنی گھاس وغیرہ بھی لیا ہے، وہ سب مفت میں، کیا شریعت کی رو سے بکر کے لئے اس رقم کے لینے کا جواز ہے؟ حالانکہ معاملے کی ابتداء میں ایک ہزار روپیہ دیا گیا تھا۔

جواب :- صورت مسئلہ میں ظاہر یہ ہے کہ زمین کے اجارے کو بھینس اور اس کے بچے کی بیع کے لئے مشروط قرار دے کر بیع اور اجارے کا معاملہ مجموعی طور پر کیا گیا تھا، لہذا یہ معاملہ ”صفقة فی

صفقة“ ہونے کی بنا پر فاسد^(۱) اور واجب الفسخ تھا،^(۲) اور فریقین نے اس کو جو منسوخ کیا وہ درست کیا، لیکن ایسی صورت میں بکر زید سے اتنی ہی رقم شرعاً وصول کر سکتا ہے جتنی اُس نے زید کو ادا کی ہے، اس سے زائد وصول کرنا اس کے لئے جائز نہیں بلکہ بھینس کے بچے کو بیچ کر جو قیمت اس نے وصول کی ہے وہ بھی زید کو واپس کرنی ضروری ہے۔ اور گھاس کا حکم یہ ہے کہ اگر وہ خود روگھاس تھی تو اسے بیچ کر جو پیسے بکر نے کمائے وہ اسی کے ہیں،^(۳) اور اگر وہ باقاعدہ کاشت کی ہوئی تھی تو اس کو بیچ کر جو رقم بکر نے حاصل کی وہ بھی زید کو واپس کرنی ضروری ہے، لما فی الدر المختار فی حکم فسخ البیع الفاسد لو نقص فی ید المشتري بفعل المشتري أو المبيع أو بأفة سماوية أخذه البائع مع الأرش. (شامی ج: ۴ ص: ۱۳۱)۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۱۳۹۷/۶/۲۲ھ

(فتویٰ نمبر ۵۴۳/۲۸ ب)

عورت کی خرید و فروخت اور اسے باندی بنانے کا حکم

سوال:- اگر ہم بازار سے کوئی لڑکی خریدیں تو اس سے باندیوں والے حقوق لے سکتے ہیں؟
جواب:- آج کل شرعی باندیوں کا کہیں وجود نہیں ہے، لہذا موجودہ حالت میں کسی لڑکی کو خریدنا بھی حرام ہے^(۵) اور اس سے باندیوں کی طرح انتفاع کرنا بھی حرام ہے۔ واللہ اعلم

محمد تقی عثمانی عفا اللہ عنہ

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع

۱۳۸۸/۶/۱۶ھ

(فتویٰ نمبر ۶۳۶/۱۹ الف)

(۱) وفي المعجم الأوسط للطبرانی ج: ۲ ص: ۱۶۹ (طبع دار الحرمین قاہرہ) قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: ثم لا تحل صفقتان فی صفقة. وفي مجمع الزوائد ج: ۴ ص: ۸۴ (طبع دار الریان للتراث قاہرہ و دار الكتاب العربی بیروت) عن عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ قال: نهی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن صفقتین فی صفقة واحدة.
(۲) وفي الدر المختار ج: ۵ ص: ۹۰ و ۹۱ (و) يجب (على كل واحد منهما فسخه) أي فسخ البیع الفاسد قبل القبض) ويكون امتناعاً عنه ابن ملک (أو بعده ما دام) المبيع بحاله جوہرہ (فی ید المشتري) اعدماً للفساد، لأنه معصية فيجب رفعها بحر.

وفي الهندية الباب الحادی عشر فی أحكام البیع الغير الجائز ج: ۳ ص: ۱۴۷ (طبع رشیدیہ) وثبت الملك قیاساً واستحساناً إلا أن هذا الملك يستحق النقص ويكره للمشتري أن يتصرف فيما اشترى شراءً فاسداً بتملك أو انتفاع الخ.

(۳) وفي مشکوة ص: ۲۶۶ (طبع رحمانیہ) المسلمون شركاء فی ثلاث فی الماء والكلاء والنار (الحديث).

(۴) الدر المختار ج: ۵ ص: ۱۰۰ (طبع سعید). وفي الهندية ج: ۳ ص: ۱۴۸ (طبع رشیدیہ) وان انتقض المبيع فی ید المشتري ان كان النقصان بأفة سماوية فلبائع أن يأخذ المبيع مع أرش النقصان وكذلك النقصان بفعل المشتري أو بفعل المعقود عليه الخ.

(۵) وفي الدر المختار ج: ۵ ص: ۵۲ وبطل بیع ما ليس بمال كالدم والميتة والحر. وكذا فی الهداية ج: ۳ ص: ۵۳.

ذبح سے پہلے جانور کے مختلف اعضاء کی خرید و فروخت کا حکم

سوال:- جانور کے ذبح کرنے سے پہلے سر، پیر، کلیجی، دل وغیرہ کا فروخت کرنا شرعاً کیسا ہے؟

جواب:- جانور کے کلیجی گردے اور دل پھینک دے وغیرہ کی بیع انہیں نکالنے سے پہلے جائز

نہیں ہے، قال فی الدر المختار: ولؤلؤ فی صدف للغرر وصوف علیٰ ظہر غنم.... وکذا کل

ما اتصالہ خلقی کجلد حیوان ونوی تمروبن وبطیخ لما مرّ أنه معدوم عرفاً (شامی ج: ۴)

(۱) ص: ۱۴۹-

واللہ سبحانہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۸/۶/۱ھ

(فتویٰ نمبر ۶۳۶/۱۹ الف)

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع

یک طرفہ بیع مالک کی رضا مندی پر موقوف ہے

سوال:- ایک خاندان کے دو حقیقی بھائیوں میں علیحدگی ہو گئی، ایک بھائی چند ماہ بعد ایک

حادثے میں مبتلا ہوا اور اپنے بڑے بھائی کے ساتھ کام کرنے لگا، اور صرف خانگی اخراجات لیا کرتا تھا،

بعد میں پاکستان آ گیا، مگر بیوی بچے ہندوستان ہی میں تھے، بڑے بھائی بیوی بچوں کو ۲-۳ سو روپیہ

ماہوار دیا کرتے تھے، اس کے علاوہ اور ضروریات بھی پورا کیا کرتے تھے، چھوٹا بھائی ہندوستان سے

پاکستان آتے وقت ایک چھوٹی سی جائیداد تقریباً ۹ بیگھ بڑے بھائی کے نام لکھ کر آیا تھا کہ فروخت کر کے

روپیہ دے دیجئے گا، میرے بیوی بچے ہندوستان سے ۱۹۶۵ء میں پاکستان چلے آئے، یہاں جو روپیہ

اور جائیداد میری تھی دُوسروں کے ہاتھ میں تھا، ان حالات میں ۱۹۷۰ء تک بڑے بھائی کو لکھا کہ جائیداد

فروخت کر کے میری امداد کریں، مگر ۱۹۶۵ء تا ۱۹۷۰ء کوئی جواب نہیں آیا، ۱۹۷۱ء میں لڑکا ہندوستان گیا

تو ۲۵ ہزار لڑکے کو دیا، لڑکا سمجھا کہ وہ امدادی طور پر دے رہے ہیں، لے لیا، ۱۹۷۶ء میں معلوم ہوا کہ رقم

مذکور جو کھیت کی قیمت کے طور پر دی تھی اُس سے زیادہ قیمت تھی۔ اس واقعے کے بعد لکھا کہ ۲۵ ہزار

(۱) الدر المختار ج: ۵ ص: ۶۳ باب البیع الفاسد (طبع سعید) وفي البحر الرائق ج: ۵ ص: ۲۷۶ (طبع سعید) وفي الخانية ولو اشترى لؤلؤة في صدفه قال ابو يوسف رحمه الله تعالى يجوز البیع وله الخيار اذا رای، وقال محمد رحمه الله تعالى لا يجوز وعليه الفتوى اهـ. وهكذا في النول الجية معللاً للفتوى بانها منه خلقة.... الخ.

وفي الهندية ج: ۳ ص: ۱۲۹ الفصل التاسع (طبع رشیدیہ): ولو باع الجلد والكرش قبل الذبح لا يجوز فان ذبح بعد ذلك ونزع الجلد والكرش وسلم لا ينقلب العقد جائزاً كذا في الذخيرة.

وفي شرح البديهة ج: ۳ ص: ۵۴ ولا بیع الحمل ولا النتاج ولا اللبن في الضرع ولا الصوف علی ظہر الغنم وجذع فی السقف.

وكذا في مجمع الأنهر ج: ۳ ص: ۸۱ وامداد الفتاوى ج: ۳ ص: ۶۱ وامداد الأحكام ج: ۳ ص: ۴۱۷ و ۴۱۸.

روپیہ لے کر زمین واپس کر دیں، بڑے بھائی کی صرف لڑکیاں ہیں، جائیداد اور نقد روپیہ لڑکیوں کو لکھ دیا، سوائے اس زمین کے اب وہ اس زمین کو بھی نو اسے کے لئے لکھنا چاہتے ہیں، شریعت کی رو سے کیا ہونا چاہئے؟ میں نہ صبر کر سکتا ہوں اور نہ بڑے بھائی دیتے ہیں۔

جواب:- اگر آپ کے بڑے بھائی نے آپ کی زمین کسی اور کو فروخت کئے بغیر اپنے پاس رکھ لی اور آپ کو یک طرفہ طور پر ۲۵ ہزار روپے دے دیئے تو یہ بیع آپ کی رضامندی پر موقوف تھی، اگر آپ نے ۲۵ ہزار میں زمین اُن کو دینے پر رضامندی کا اظہار کر دیا ہو تو بیع صحیح ہو گئی، اور بڑے بھائی اس کے مالک ہو گئے، اس میں جو چاہیں کر سکتے ہیں، اور اگر آپ نے اس بیع کو مسترد کر دیا تھا تو آپ کے بڑے بھائی پر واجب ہے کہ وہ زمین کو آپ کی امانت سمجھیں اور آپ پر واجب ہے کہ ان کے ۲۵ ہزار روپے واپس کر دیں، لیکن اگر معاملہ اب تک مبہم چل رہا ہے تو آپ کو یہ چاہئے کہ ان کو خط لکھ کر بتادیں کہ آپ کتنی رقم میں وہ زمین فروخت کرنا چاہتے ہیں، اس صورت میں آپ کے بھائی اگر اتنی رقم میں لینا چاہیں گے تو لے لیں گے۔

واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم

۱۳۹۷/۶/۲۰ھ

(فتویٰ نمبر ۶۳۷/۲۸ ب)

مذکورہ فتویٰ کی مزید وضاحت

سوال:- چھوٹا بھائی اس بیع و شراء کو امانت ہی خیال کرتا ہے، ۲۵ ہزار روپے دے دینے سے بیع نہیں ہو سکتی، جبکہ طرفین سے خرید و فروخت پر کوئی گفتگو نہیں ہوئی، یہ ضرور ہے کہ زمین مذکور چھوٹا بھائی کسی طرح بھی حاصل نہیں کر سکتا تھا اور نہ اب حاصل کر سکتا ہے، مجبور محض ہے۔ موجودہ زمانے میں یعنی ۱۹۷۱ء میں جائیداد کی قیمت لاکھوں تک پہنچ چکی تھی، چھوٹا بھائی نہ صبر کر سکتا ہے اور زر نقد جو انہوں

(۲۰۱) وفي مشکوة المصابيح ص: ۲۶۱ (طبع رحمانیہ) باب الغصب والعارية عن ابي حرة الرقاشي عن عمه قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: ألا لا تظلموا ألا لا يحل مال امرئ الا بطيب نفس منه. وفي شرحه: أي بالأمر أو بالاذن.

وفي المجلة: لا يجوز لأحد أن يأخذ مال أحد بلا سبب شرعي الخ.

وفي الشامية ج: ۴ ص: ۶۱ (طبع سعيد) إذ لا يجوز لأحد من المسلمين أخذ مال أحد بغير سبب شرعي. وفي الدر المختار ج: ۵ ص: ۱۰۶ من يتصرف في حق غيره بغير إذن شرعي كل تصرف صدر منه تملكاً كان كبيع وتزويج أو إسقاطاً كطلاق وأعتاق وله مجيز انعقد موقوفاً الخ.

وفي الهداية كتاب البيوع فصل في بيع الفضولي ج: ۳ ص: ۹۳ (طبع مكتبة رحمانیہ) ومن باع ملك غيره بغير أمره فالملك بالخيار ان شاء اجاز البيع وان شاء فسخ. وكذا في مجمع الأنهر ج: ۳ ص: ۱۳۴.

وفي مجلة الأحكام كتاب البيوع رقم المادة: ۳۶۸ البيع الذي يتعلق به حق الغير كبيع الفضولي وبيع المرهون ينعقد موقوفاً على اجازة ذلك الآخر الخ. وفي الهنديه ج: ۳ ص: ۱۵۲ (طبع رشيدیه) اذا باع الرجل مال الغير عندنا يتوقف البيع على اجازة المالك الخ. نیز دیکھئے آگے صفحہ: ۸۷ کا حاشیہ۔

نے دیا اس کو لینا چاہتا ہے، کل بھی اور آج بھی واپس کرنے کو تیار ہے۔ ۱۹۵۹ء سے قبل جب بیوی بچے ہندوستان میں تنگ دستی کے دن گزار رہے تھے، اگر یہ رقم قیمت جائیداد کہہ کر دیتے تو بہت ممکن تھا کہ یہ بات پیدا نہ ہوتی، اس لئے اتنی رقم سے بچے کچھ کام بھی کرتے اور تعلیم بھی جاری رکھتے، اور اللہ کی مرضی سے تنگ دستی بھی ختم ہو جاتی، جبکہ ایک شخص جائیداد مذکور کا ایک لاکھ سے بھی زیادہ دینے پر تیار ہو گیا تھا۔ چھوٹا بھائی اس وقت شریعت کا قانون جاننا چاہتا ہے اور اس پر عمل کرنا چاہتا ہے بڑا بھائی کروڑوں کا مالک ہے، چھوٹا بھائی اللہ تعالیٰ کی مرضی خیال کرتا ہے نہ کہ حسد و بغض۔

جواب:- آپ جواب غور سے پڑھتے تو دوبارہ سوال کی نوبت نہ آتی، جب آپ نے وہ ۲۵ ہزار روپے بطور امانت اپنے پاس رکھے ہوئے ہیں اور بیع پر رضامندی بھی ظاہر نہیں کی تو زمین بدستور آپ کی ملکیت ہے، آپ کے بھائی پر واجب ہے کہ وہ زمین آپ کی رضامندی سے اس کو فروخت کر کے اس کی قیمت آپ کے حوالے کریں، اور آپ ۲۵ ہزار روپے واپس کر دیں، لقولہ تعالیٰ: ”يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ إِلَّا أَنْ تَكُونَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ“^(۱)

واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم

۱۳۹۷/۷/۱ھ

(فتویٰ نمبر ۶۹۳/۲۸ ب)

ہندوؤں کی متروکہ جائیداد پر قبضہ کر کے فروخت کرنے کا حکم

سوال:- تقسیم ہند کے بعد جب مہاجر پاکستان آئے تو ہندو کی کئی جگہوں پر قبضہ ہوا، عموماً ایسا بھی ہوا کہ جس کو جو گھر خالی مل گیا اس نے قبضہ کر لیا، وغیرہ۔ ایسے ہی ایک زمین پر ایک شخص کا قبضہ تھا، دوسرے شخص نے اس سے وہ قطعہ خرید لیا اور قیمت ادا کر دی، مگر بعد میں جب پیمائش کی تو سودے کی مقررہ مقدار سے ۳ یا ۴ مرلے زیادہ زمین مشتری کے پاس آ گئی۔ اب اس کا کیا حل ہے؟ کیا ان چند مرلوں کی قیمت حکومت کو دیں یا بائع کے ورثاء کو دیں یا کچھ نہ کریں؟ کیونکہ قبضہ و مالکانہ تصرفات کا اختیار تھوڑے عرصے بعد ہی حکومت نے سنبھال لیا تھا، یہ معاملہ آج سے تقریباً ۳۸ سال قبل کا ہے۔ سائل متقی شخص ہے، کہتا ہے کہ مرنے کے بعد مجھ پر اس کا وبال نہ آئے۔

جواب:- اس سوال کا جواب اس تنقیح پر موقوف ہے کہ جن لوگوں نے اس علاقے میں ہندوؤں کی متروکہ جائیداد پر قبضہ کیا، ان کا وہ قبضہ حکومت نے تسلیم کر کے ان کو مالک قرار دے دیا تھا یا

نہیں؟ اگر مالک قرار دے دیا تھا تب تو یہ بیع درست ہوئی، اور جو زمین زائد مشتری کے پاس آئی وہ یا اس کی قیمت بائع کو لوٹانا ضروری ہے۔ لیکن اگر حکومت نے ان قابضین کو مالک قرار نہیں دیا تھا اور یہ بات مشتری کو بھی معلوم تھی تو یہ بیع درست نہیں ہوئی^(۱) اور اب زائد زمین کی قیمت تو یقیناً حکومت ہی کو دینی ہوگی لیکن جتنی زمین پہلے قابض سے خرید کر حاصل کی اس کی قیمت بھی دیانۃً حکومت کو دینی چاہئے۔ ہاں! اگر مشتری کو یہ معلوم نہ تھا کہ قابض زمین کا مالک نہیں ہے، تو اس صورت میں بائع پر واجب ہے کہ وہ قیمت حکومت کو ادا کرے اور حکومت سے اس بیع کی اجازت حاصل کر کے مشتری کو دے، اگر حکومت نے قیمت قبول کر لی تو یہ حکماً اجازت ہوگی۔^(۲)

واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم

۱۲/۱/۱۴۱۱ھ

(فتویٰ نمبر ۸۵/۳۵)

مشتری کے قبضے سے پہلے بیع اگر ہلاک ہو جائے

تو نقصان بائع کا متصور ہوگا

سوال:- مسئی حافظ عبدالرشید صاحب نے ایک بھینس کا بچہ جس کی قیمت ایک سو دس روپیہ ٹھہری، بیعانہ میں پچاس روپے بائع کو دے دیئے، اور بائع نے یہ کہا: حافظ صاحب! یہ بھینس کا بچہ کس وقت لے جاؤ گے؟ حافظ صاحب نے کہا کہ: شام کو لے جاؤں گا یا کل آ کر لے جاؤں گا۔ بیع کے وقت

(۱) کیونکہ ایسی صورت میں غیر مملوک کی بیع ہوئی جو درست نہیں۔

وفی جامع الترمذی وأبی داؤد والنسائی عن عمرو بن شعيب رضي الله عنهما قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: لا يحل سلف وبيع ولا شرطان في بيع ولا ربح ما لم يضمن ولا بيع ما ليس عندك. (مشکوۃ المصابيح ص: ۲۳۸).
وفی المرقاة ج: ۶ ص: ۸۷ عن حکیم بن حزام رضي الله عنه قال: نهاني رسول الله صلى الله عليه وسلم أن أبيع ما ليس عندي. رواه الترمذی فی رواية له ولأبی داؤد والنسائی: قال: قلت: يا رسول الله! يأتيني الرجل فيريد مني البيع وليس عندي فابتاع له من السوق، قال: لا تبع ما ليس عندك. هذا يحتمل أمرين.... والثاني أن يبيع منه متاعاً لا يملكه ثم يشتريه من مالكه ويدفعه اليه وهذا باطل لأنه باع ما ليس في ملكه وقت البيع وهذا معنى قوله (قال ولا تبع ما ليس عندك) أي شيئاً ليس في ملكك حال العقد.

وفی رد المحتار ج: ۴ ص: ۵۰۵ وشرط المعقود عليه ستة: كونه موجوداً مآلاً متقوماً مملوكاً في نفسه وكون الملك للبائع فيما يبيعه لنفسه وكونه مقدور التسليم فلم ينعقد بيع المعدوم..... ولا بيع ما ليس مملوكاً له.... الخ.
وفی بدائع الصنائع ج: ۵ ص: ۱۲۶ ومنها وهو شرط انعقاد البيع للبائع أن يكون مملوكاً للبائع عند البيع فان لم يكن لا ينعقد.... وهذا بيع ما ليس عنده، ونهى رسول الله صلى الله عليه وسلم عن بيع ما ليس عند الانسان.

وكذا في المبسوط للسرخسي ج: ۱۳ ص: ۸ وشرح المجلة ج: ۲ ص: ۳۲۹.

وفی الدر المختار كتاب البيوع ج: ۵ ص: ۵۸ (طبع سعيد) وبطل بيع ما ليس في ملكه.

(۲) اور حقیقتاً حکماً اجازت لینا اس لئے ضروری ہے کیونکہ فضولی کی بیع مالک کی اجازت پر موقوف ہوتی ہے، عبارات و جزئیات ص: ۸۰

اور ص: ۸۷ کے حاشیہ نمبر ۲۰ میں ملاحظہ فرمائیں۔

بچہ صحیح و سلامت تھا، پھر حافظ صاحب حسب وعدہ دوسرے روز نہیں جاسکے، تیسرے روز بچہ لینے گئے تو وہ بچہ مرچکا تھا۔ اب بائع بقایا قیمت کا حق دار ہے یا نہیں جو ادائیگی سے رہ گئی تھی یا بائع کو مشتری سے جو رقم لے چکا ہے وہ واپس کرنا ہوگا؟ شرع کا کیا حکم ہے؟

جواب:- صورت مسئلہ میں بھینس کے بچے کے مرنے سے نقصان بائع کا ہوا، مشتری کا نہیں، بائع نہ صرف باقی قیمت کا حق دار نہیں ہے بلکہ جو پچاس روپے اس نے وصول کئے تھے اُن کو بھی واپس کرنا اس پر واجب ہے، کیونکہ فریقین کے درمیان پچاس روپے کے بیعانہ پر جو بات چیت ہوئی اگر اسے عقد بیع کے بجائے وعدہ بیع قرار دیا جائے تو یہ حکم ظاہر ہے کہ ابھی بیع ہوئی ہی نہ تھی، اور اگر اس بات چیت کو عقد بیع قرار دیا جائے تب بھی مشتری نے اس پر قبضہ نہیں کیا، اور قبضے سے پہلے بیع بائع کے ضمان میں ہوتی ہے، قال فی رد المحتار وفي الفتح والدر المنتقى: لو هلك المبيع بفعل البائع أو بفعل المبيع أو بأمر سماوى بطل البيع ويرجع بالثمن لو مقبوضاً (شامی ج: ۴ ص: ۴۲، قبیل باب خيار الشرط)۔^(۱)

وفي الدر المختار: ثم التسليم يكون بالتخلية على وجه يتمكن من القبض بلا مانع ولا حائل، وقال الشامي: لو اشترى بقرًا في السرح فقال البائع: اذهب واقبض ان كان يرى بحيث يمكنه الاشارة اليه يكون قبضاً الخ. (ج: ۴ ص: ۴۳)۔^(۲)

واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم

۱۳۹۷/۹/۱۳ھ

(فتویٰ نمبر ۹۴۶/۲۸ ج)

(۱) رد المحتار ج: ۴ ص: ۵۶۰ (طبع سعید). وفي فتح القدير ج: ۵ ص: ۴۹۶ (طبع رشیدیہ کوئٹہ) فلو هلك في يد البائع بفعله أو بفعل المبيع بنفسه بأن كان حيواناً فقتل نفسه أو بأمر سماوى بطل البيع فان كان قبض الثمن أعاده الى المشتري الخ. نیز دیکھئے خلاصۃ الفتاویٰ ج: ۳ ص: ۹۰ (طبع رشیدیہ کوئٹہ).

(۲) الدر المختار مع رد المحتار ج: ۴ ص: ۵۶۱ (طبع سعید). وفي فتح القدير ج: ۵ ص: ۴۹۶ (طبع رشیدیہ کوئٹہ) في التجريد تسليم المبيع أن يخلّى بينه وبين المبيع على وجه يتمكن من قبضه من غير حائل. وفيه أيضاً ج: ۵ ص: ۴۹۷ (طبع رشیدیہ) اذا اشترى بقرًا في السرح فقال البائع: اذهب واقبض ان كان يرى بحيث يمكنه الاشارة اليه يكون قبضاً الخ.

وفي البحر الرائق كتاب البيوع ج: ۵ ص: ۳۰۸ (طبع سعید) وأما ما يصير به قابضاً حقيقة ففي التجريد تسليم المبيع أن يخلّى بينه وبين المبيع على وجه يتمكن من قبضه بغير حائل وكذا تسليم الثمن. وفيه أيضاً ج: ۵ ص: ۳۰۹ وكذا لو اشترى بقرًا في السرح فقال البائع: اذهب فاقبض ان كان يرى بحيث يمكنه الاشارة اليه يكون قبضاً الخ.

وفي الهندية ج: ۳ ص: ۱۶ وتسليم المبيع هو أن يخلّى بين المبيع وبين المشتري على وجه يتمكن المشتري من قبضه بغير حائل وأجمعوا على أن التخلية في البيع الجائز تكون قبضاً الخ. وكذا في خلاصه الفتاویٰ ج: ۳ ص: ۸۹ (طبع رشیدیہ کوئٹہ) وبدائع الصنائع ج: ۵ ص: ۲۴۴ (طبع سعید).

رمضان میں بیکری کا سامان فروخت کرنے کا حکم

سوال:- رمضان میں روزے کے دوران بیکری کا سامان فروخت کر سکتے ہیں یا نہیں؟ اور پتہ ہو کہ یہ شخص روزے کی حالت میں کھائے گا تو اُسے بھی فروخت کرنا جائز ہے یا نہیں؟

طلعت محمود، روالپنڈی

جواب:- برادر عزیز و مکرم جناب طلعت محمود صاحب، السلام علیکم ورحمۃ اللہ

رمضان میں بیکری کا سامان فروخت کرنا جائز ہے، البتہ جس شخص کے بارے میں یہ معلوم ہو کہ وہ بغیر کسی عذر کے دن کے وقت کھانے کے لئے خرید رہا ہے اسے بیچنا جائز نہیں^(۱)، معلوم نہ ہو کہ کیا کرے گا تو جائز ہے۔^(۲)

والسلام

واللہ اعلم

۸ شعبان ۱۴۰۸ھ

ریڈیو، ٹیپ ریکارڈر، ٹی وی اور وی سی آر کے کاروبار کا حکم

سوال:- ریڈیو، ٹیپ ریکارڈر اور ٹی وی، وی سی آر کی خرید و فروخت کا کیا حکم ہے؟ کرنا

طلعت محمود روالپنڈی

چاہئے یا نہیں؟

جواب:- برادر عزیز و مکرم طلعت محمود صاحب، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

ریڈیو اور ٹیپ ریکارڈر کی دکان میں تو مضائقہ نہیں^(۳)، لیکن ٹی وی اور وی سی آر کا کاروبار کراہت سے خالی معلوم نہیں ہوتا، لہذا اگر کوئی دوسرا کاروبار کر سکیں تو زیادہ بہتر ہے، حتی الامکان اسی کی کوشش کریں۔

والسلام

(۵) ۱۴۱۴/۴/۷ھ

(۱ و ۲) جیسا کہ حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ نے ان دونوں صورتوں کا یہی حکم ذکر کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ: ”... اگر (بیچنے والے کو) علم نہ ہو کہ یہ شخص شیرہ انگور خرید کر سرکہ بنائے گا یا شراب یا گھر کرایہ پر لے کر اس میں صرف سکونت کرے گا یا کوئی ناجائز کام فسق و فجور کا کرے گا، اس صورت میں یہ بیع واجارہ بلا کراہت جائز ہے، اور اگر اس کو علم ہے کہ یہ شخص شیرہ انگور خرید کر شراب بنائے گا یا مکان کرایہ پر لے کر فسق و فجور کرے گا یا سودی کاروبار کرے گا یا جاریہ خرید کر اس کو گانے کے کام میں لگائے گا وغیرہ تو ایسی صورت میں یہ بیع واجارہ مکروہ ہے.... اور معصیت اس کے عین کے ساتھ متعلق ہو بغیر کسی تغیر و تصرف کے.... تو یہ صورت مکروہ تحریمی ہے۔ تفصیل کے لئے حضرت مفتی اعظم رحمہ اللہ کا رسالہ ”تفصیل الکلام فی مسئلۃ الاعانة علی الحرام“ جواہر الفقہ ج: ۲ ص: ۳۵۷ تا ۳۶۲ میں ملاحظہ فرمائیں۔

(۳ و ۴) وفی بدائع الصنائع ج: ۵ ص: ۱۴۳ (طبع سعید) ویجوز بیع آلات الملاہی من البریط و الطبل و المزمار و الذف و نحو ذلک.... اَنہ یمکن الانتفاع بها شرعاً من جهة اخرى بأن تجعل ظروفًا لأشياء و نحو ذلک من المصالح.... الخ. وفی الفقہ الاسلامی وأدلّته ج: ۴ ص: ۳۰۲۹ (طبع دار الفکر) والضابط عندهم (أی عند فقہاء الحنفیة) أن کل ما فیہ منفعة تحلّ شرعاً فان بیعہ یجوز لأنّ الأعیان خلقت لمنفعة الانسان.

نیز مزید حوالہ جات کے لئے دیکھئے اگلا صفحہ: ۸۵ و ۸۶ کے حواشی۔

(۵) اس صفحے کے مذکورہ دونوں فتاویٰ حضرت والا دامت برکاتہم العالیہ نے سائل موصوف کے خط کے جواب میں تحریر فرمائے۔ (محمد زبیر)

وی سی آر کے کاروبار کی شرعی حیثیت اور غلطی سے خریدے ہوئے وی سی آر کو بیچنے کا حکم

سوال:- ایک شخص نے اپنی حلال آمدنی سے دس یا بارہ ہزار کا ایک وی سی آر سیٹ خریدا تھا، جس پر وہ خود بھی فلمیں دیکھتا تھا، دوسروں کو بھی دکھاتا تھا، حق تعالیٰ نے دعوت و تبلیغ کے ذریعے اس کو ہدایت دی، بُرے کام چھوڑ دیئے اور صلوٰۃ و صوم کا پابند ہو گیا ہے، وہ اُسے بالکل استعمال نہیں کرتا۔ وہ پوچھتا ہے کہ اگر وی سی آر کو فروخت کروں تو وہ پیسہ میرے لئے حلال ہوگا یا حرام؟ یا کسی درجے میں کوئی حل ہے؟ اگر نہ بیچوں ویسے توڑ دوں تو مالی نقصان بہت ہے، جس وقت خریدا تھا وہ حلال آمدنی سے خریدا تھا، مزید یہ کہ جس کو فروخت کروں گا وہ فلمیں دیکھے گا، تو کیا اس کا گناہ بائع کو ہوگا؟

جواب:- وی سی آر کی بیع کو کاروبار کے طور پر اختیار کرنا بحالت موجودہ تو درست نہیں،^(۱) لیکن جو اتفاقی صورت آپ نے لکھی ہے، اس میں بھی وی سی آر کی بیع کراہت سے خالی معلوم نہیں ہوتی،^(۲) اس لئے احتیاط کے خلاف ہے۔ تاہم اگر صورت مسئلہ میں اُسے بیچ دیا تو چونکہ اس آلے کا کچھ صورتوں میں جائز طور پر استعمال کرنا بھی ممکن ہے، اس لئے اس آمدنی کو حرام نہیں کہا جائے گا۔^(۳)

واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم

(۱) وفي الشامية ج: ۶ ص: ۲۱۱ و ۲۱۲ (طبع سعید) (وضمن بكسر معزف) بكسر الميم آلة اللهو. وقال لا يضمن ولا يصح بيعها وعليه الفتوى ملتي.

وفي البحر الرائق ج: ۸ ص: ۱۲۴ و ۱۲۵ (ومن كسر معزفًا ضمن) وهذا قول الامام وقال لا يضمنها لأنها معدة للمعصية فيسقط تقومها كالخمر — والفتوى في زماننا على قولهما لكثرة الفساد (وصح بيع هذه الأشياء) وهذا قول الامام وقال لا يجوز بيع هذه الأشياء لأنها ليست بمال متقوم.

وفي الهندية ج: ۳ ص: ۱۱۶ وما كان الغالب عليه الحرام لم يجز بيعه ولا هبته. وفيها أيضًا ج: ۵ ص: ۱۳۱ ويجوز بيع البربط والطلل والمزمار والذف والنرد والاشباه ذلك في قول أبي حنيفة رحمه الله وعندهما لا يجوز بيع هذه الأشياء قبل الكسر والفتوى على قولهما الخ. وكذا في تنقيح الفتاوى الحامدية ج: ۲ ص: ۳۵۴.

(۲ و ۳) وفي رد المحتار ج: ۴ ص: ۲۶۸ (طبع سعید) لا يكره بيع الجارية المغنية والكبش النطوح والديك المقاتل والحمامة الطيارة لأنه ليس عينها منكراً وإنما المنكر في استعمالها المحظور وعرف بهذا أنه لا يكره بيع ما لم تقم المعصية به كبيع الجارية المغنية والكبش النطوح والحمامة الطيارة العصير والخشب الذي يتخذ منه المعازف.

وفي بدائع الصنائع ج: ۵ ص: ۱۲۴ (طبع سعید) ويجوز بيع آلات الملاهي من البربط والطلل والمزمار والذف ونحو ذلك عند أبي حنيفة رحمه الله، لكنه يكره وعند أبي يوسف ومحمد لا ينعقد بيع هذه الأشياء لأنها آلات معدة للتلهي بها موضوعة للفسق والفساد ولأبي حنيفة انه يمكن الانتفاع بها شرعاً من جهة أخرى.

وفي فتح القدير فصل في غصب ما لا يتقوم ج: ۸ ص: ۲۹۳ (طبع مكتبة رشيدية كوئٹہ) ومن كسر لمسلم بربطاً أو مزماراً أو دفاً أو اراق له سكرًا أو منصفًا فهو ضامن وبيع هذه الأشياء جائز وهذا (بإني اطلع صفحہ پر)

”بیع فضولی“ کی ایک مخصوص صورت کا حکم

سوال :- مندرجہ ذیل فیصلہ ایک مولوی صاحب نے میری موجودگی میں کیا ہے، اُن کا کہنا ہے کہ یہ فیصلہ شریعت کے مطابق ہے۔ ایک عورت کو جہیز میں سامان کے ساتھ ایک بیل دیا گیا جس کی وہ مالک تھی، اُس کے شوہر نے وہ بیل چالاکی سے اپنی بیوی کے قبضے سے نکالنا چاہا، ایک آدمی کو اپنی بیوی کے پاس بھیجا کہ جا کر کہو کہ بیل تمہارا لڑکا مانگ رہا ہے، عورت نے اپنے فرزند کو دینے کے لئے وہ بیل آنے والے شخص کے حوالے کر دیا۔ دوسرے دن جب عورت کو معلوم ہوا کہ بیل لڑکے کو نہیں ملا تو اُسے تشویش ہوئی اور بیل لے جانے والے شخص سے معلوم کیا کہ بیل کہاں ہے؟ تو لے جانے والے شخص نے بتایا کہ وہ بیل دراصل تمہارے شوہر سے میں نے نو سو روپے میں خریدا ہے۔ اس پر عورت نے کہا کہ یہ بیل مجھے جہیز میں ملا ہے، میرے شوہر کی ملکیت نہیں ہے، تم نے کس طرح خریدا؟ مجھے بیل واپس کرو۔ عورت شوہر پر برہم ہوئی کہ تم نے پیسے کیوں لئے جبکہ یہ میری ملکیت ہے؟ مجھے واپس دلاؤ، کیوں فروخت کیا؟ بیل خریدنے والے نے یہ بیل اپنے بھائی کے ہاتھ فروخت کر دیا، عورت نے اُس کے بھائی سے کہا کہ یہ میرا بیل واپس کرو، اُس کے بھائی نے کہا کہ جتنے میں خریدا ہے میری رقم واپس کر دو، بیل دے دوں گا۔ بیل واپس لینے والے شخص نے اس شخص کے بھائی کا اُونٹ خریدنے والے بھائی کو دے دیا کہ یہ تمہارے بھائی کا اُونٹ ہے، اس کو رکھ لو، وہ تمہارے بیل کے پیسے دے کر اُونٹ لے جائے گا، اور بیل اس عورت کی ملکیت ہے اسے واپس کرو۔ دوسرے دن وہ چار آدمی لے کر بیل کے مالک کے پاس آئے اور کہا کہ بیل واپس کرو، شوہر نے کہا کہ بیل میرا نہیں ہے، میری بیوی کا ہے، وہ بیچنا نہیں چاہتی، اب تمہارے بیل کے پیسے جو میں نے بیل فروختگی کے عوض لئے تھے وہ رقم میری بقایا رقم چار ہزار میں سے وضع کر کے دیں، مجبوراً وہ لوگ واپس چلے گئے۔ تقریباً پندرہ یوم کے بعد وہ لوگ بیل چراکے لے گئے، تھانے میں رپورٹ درج کرائی، معاملہ مولوی صاحب پر ڈالا گیا کہ وہ فیصلہ کر دیں، بیل والی کے شوہر نے بیان دیا کہ بیل میں نے فروخت نہیں کیا تھا بلکہ زمین آباد کرنے کے لئے دیا تھا اور جو پیسے اس بیل پر لئے ہیں وہ میرے چار ہزار قرضے والی رقم سے وضع کر لیں۔ دونوں فریقین کے پاس بیل کے لین دین کا گواہ نہیں تھا، دونوں قرآن شریف اُٹھانے کو تیار تھے، اور کہتے ہیں

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) عند ابی حنیفہ، وقال أبو یوسف ومحمد رحمہما اللہ لا یجوز بیعہا ولأبی حنیفہ أنّہا أموال لصلاحتہا لما یحل من وجوہ الانتفاع وان صلحت لما لا یحل فصار کالأمۃ المغنیۃ وهذا لأنّ الفساد لفعل فاعل مختار فلا یوجب سقوط التقوم.

وفی الدر المختار ج: ۶ ص: ۳۹۱ وجاز بیع عصیر غنم ممن یعلم انه یتخذہ خمرًا لأنّ المعصیۃ لا تقوم بعینہ بل بعد تغیرہ وقیل یکرہ لاعتانہ علی المعصیۃ بخلاف بیع أمرء ممن یلوط بہ وبع سلاح من أهل الفتنۃ لأنّ المعصیۃ تقوم بعینہ. وكذا فی امداد الفتاویٰ ج: ۳ ص: ۱۱۰، وراجع للتفصیل جواهر الفقہ ج: ۲ ص: ۴۳۹ الی ص: ۴۶۲ (طبع مکتبہ دارالعلوم).

کہ بیل جو ہم رات کو لے گئے یہ چوری نہیں ہے بلکہ اپنی خریدی ہوئی چیز لے گئے، دوسرا فریق کہتا ہے کہ میں نے فروخت نہیں کیا، کوئی گواہ موجود ہو تو پیش کریں۔

مولوی صاحب کا فیصلہ

۱:- بیل فروخت ہو چکا ہے کیونکہ مالکہ سات سو روپے کے عوض بیل کیوں واپس لینے کو تیار تھی؟ آخر کیا مصلحت تھی؟

۲:- بیل چوری نہیں ہوا کیونکہ اُن کی خریدی ہوئی چیز تھی، اگر جرم ہے تو بیل فروخت کرنے والے کا، پھر تھانے میں کیوں رپورٹ درج کرائی؟ شوہر کہتا ہے کہ بیل میری بیوی کی ملکیت ہے، میرا چار ہزار باقی ہے اس میں یہ رقم منہا کر لی جائے۔ مولوی صاحب نے کہا کہ فیصلہ صحیح ہے، فریقین کو ماننا پڑے گا۔

جواب:- اگر سوال میں درج شدہ واقعات سب درست ہیں، تو بیل بدستور اُس عورت کی ملکیت ہے، اور اُس کے شوہر نے اگر اُس بیل کو فروخت کر دیا ہو تب بھی یہ بیع درست نہیں ہوئی،^(۱) کیونکہ وہ بیل کا مالک نہیں تھا، مالک اُس کی بیوی تھی جس نے نہ خود بیع کی اور نہ اس نے بیع کی اجازت دی، لہذا یہ بیع باطل ہوئی،^(۲) اور اب جبکہ بیل اصل مالک کے پاس آ گیا تو اس کی رضامندی کے بغیر اُسے وہاں سے لے جانا جائز نہیں۔ جو حالات سوال میں بیان کئے گئے ہیں ان کے مطابق مولوی صاحب کا فیصلہ درست نہیں، البتہ اُن کے سامنے معاملے کی کوئی دوسری صورت لائی گئی ہو تو بات دوسری ہے۔ عورت نے جو سات سو روپے کی ادائیگی کی پیشکش کی اُسے شرعاً بیع پر رضامندی نہیں کہا جاسکتا بلکہ یہ اپنے شوہر کے دین کی ادائیگی پر تبرعاً راضی ہو جانا ہے۔

واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم

ھ ۱۳۹۶/۱۱/۲۹

(فتویٰ نمبر ۲۷۶۰/۲۷ و)

(۱ و ۲) وفي الدر المختار ج: ۵ ص: ۱۰۶ فصل في الفضولي هو من يتصرف في حق غيره بغير اذن شرعي كل تصرف صدر منه تملیگا كان كبيع وتزويج أو إسقاطاً كطلاق وأعتاق (وله مجيز) أي لهذا التصرف من يقدر على اجازته حال وقوعه انعقد موقوفاً.

وفي الهندية ج: ۳ ص: ۱۵۲ إذا باع الرجل مال الغير عندنا يتوقف البيع على اجازة المالك الخ.

وكذا في مجمع الأنهر شرح ملتقى الأبحر ج: ۳ ص: ۱۳۴.

وفي الهداية كتاب البيوع فصل في بيع الفضولي ج: ۳ ص: ۸۸ ومن باع ملك غيره بغير أمره فالملك بالخيار ان شاء أجاز البيع وان شاء فسخ.

وفي مجلة الأحكام كتاب البيوع رقم المادة: ۳۶۸ البيع الذي يتعلق به حق الغير كبيع الفضولي وبيع المرهون انعقد موقوفاً على اجازة ذلك الآخر.

سودی بینک کے لئے مکان یا پلاٹ فروخت کرنے کا حکم

سوال:- سودی بینک کے لئے کوئی مکان یا پلاٹ فروخت کرنا جائز ہے یا نہیں؟ فروخت

کرنے کی صورت میں ملنے والی رقم حلال ہے یا حرام؟ محمد عامر (استاذ جامعۃ الرشید)

جواب:- چونکہ بینک کے سرمایہ کی اکثریت حرام نہیں، اس لئے بیچنے کی گنجائش تو معلوم

ہوتی ہے،^(۱) لیکن کراہتِ تنزیہی سے خالی نہیں۔^(۲) واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۱۴۲۵/۲/۲۹ھ

اسمگل شدہ گھڑیوں کی خرید و فروخت کا حکم

سوال:- اسمگلنگ کی گھڑیاں جو آدھی قیمت پر فروخت کی جاتی ہیں، ان کی خرید کیسی ہے؟

جواب:- اگر ان گھڑیوں کی خرید میں جھوٹ بولنا یا کسی اور گناہ کا ارتکاب نہ کرنا پڑے تو

واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۷/۱۲/۱۷ھ

(فتویٰ نمبر ۱۴۳۲/۱۸ الف)

خریدنا جائز ہے۔^(۳)

الجواب صحیح

محمد عاشق الہی عفی عنہ

سگریٹ کی خرید و فروخت کا حکم

سوال:- سگریٹ بیچنا کیسا ہے؟ دکان پر دیگر اشیاء کے ساتھ سگریٹ بھی فروخت کرنا جائز

طلعت محمود

ہے یا نہیں؟

(۱ و ۲) وفي رد المحتار ج: ۴ ص: ۲۶۸ باب البغاة (طبع سعید) قلت وافاد كلامهم ان ما قامت المعصية بعينه يكره بيعه تحريمًا وآلا فتريها (قوله نهر) وعبارته وعرف بهذا أنه لا يكره بيع ما لم تقم المعصية به كبيع الجارية المغنية به والكبش النطوح والحمامة الطيارة والعصير والخشب ممن يتخذ منه المعازف.

وكذا في البحر الرائق ج: ۵ ص: ۱۴۳ (طبع سعید) وفي تنقيح الفتاوى الحامدية كتاب الاجارة ج: ۲ ص: ۱۵۳. نیز تفصیل کے لئے دیکھئے جواہر الفقہ ج: ۲ ص: ۴۵۷ تا ۴۶۲۔

(۳) ”اسمگلنگ“ سے متعلق تفصیلی حکم اور حوالہ جات کے لئے ص: ۹۰ کا فتویٰ اور اس کے حواشی ملاحظہ فرمائیں۔ اور بیج میں جھوٹ اور دھوکے سے بیچنے سے متعلق حوالہ جات ص: ۱۰۲ تا ص: ۱۰۴ کے حواشی میں ملاحظہ فرمائیں۔

جواب:- سگریٹ فروخت کرنا حرام نہیں ہے، لیکن کچھ اچھا بھی نہیں ہے، اگر اس کے بغیر کام چل سکے تو خیر، ورنہ بیچنے کی گنجائش ہے۔
والسلام

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۵/شعبان ۱۴۰۷ھ

سگریٹ کی خرید و فروخت اور اس کی کمائی کا حکم

سوال:- سگریٹ ایجنسی کی کمائی کیسی ہے؟ اور سگریٹ پینا حرام تو نہیں؟

جواب:- سگریٹ پینا حرام نہیں، اس کی ایجنسی کی کمائی بھی حلال ہے۔^(۲) واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفا اللہ عنہ

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

۱۶/۶/۱۳۸۸ھ

(فتویٰ نمبر ۷۱۷/۱۹ الف)

اسمگلنگ کی شرعی حیثیت

سوال ۱:- اسمگلنگ جائز ہے یا ناجائز؟ بعض حضرات اس کو جائز کہتے ہیں، جبکہ حکومت کی طرف سے یہ کاروبار بند ہے اور عزت کا بھی خطرہ ہے۔

۲:- اگر ملک کے اندر یہ چیزیں پہنچ جائیں تو بعد میں ملک کے اندر علی الاعلان اُس کی تجارت کی جاتی ہے، کیا ایسا سامان خریدنا جائز ہے یا نہیں؟

۳:- بعض لوگ ملک کی سرحدوں پر رہتے ہیں، مثلاً ایران کی سرحد پر تو یہ لوگ اپنی ضروریات پاکستان اور ایران دونوں جگہ سے پوری کرتے ہیں، ان کے جواز کی صورت ہے؟

۴:- اگر کوئی شخص خود ایران نہ جائے بلکہ اپنے ایرانی دوست کو لکھ کر اپنے لئے سامان منگوائے اور وہ خرید کر روانہ کر دے۔ مثلاً ایران سے آج کل موٹر سائیکلیں مکران کے راستے بہت آرہی ہیں، لوگ ادھر خرید کر لوگ مجبوراً کراچی میں اُس کے کاغذات بنواتے ہیں، چونکہ بغیر کاغذات کے چلانا

(۱ و ۲) وفي الدر المختار ج: ۶ ص: ۴۵۴ (طبع سعید) وصح بيع غير الخمر ومفاده صحة بيع الحشيشة الخ. وفي تنقيح الفتاوى الحامدية مسائل وفوائد شتى ج: ۲ ص: ۳۶۶ (طبع مكتبة حبيبہ كونث) وبالجملة ان ثبت في هذا الدخان اضرارٌ صرف خال من المنافع فيجوز الافتاء بتحريمه ان لم يثبت انتفاعه فالأصل حله مع ان في الافتاء بحله دفع الحرج عن المسلمين فان أكثرهم مبتلون بتناوله مع ان تحليله أيسر من تحريمه وما خير رسول الله صلى الله عليه وسلم بين أمرين الا اختار أيسرهما.

وفي مجموعة الفتاوى كتاب البيوع ج: ۲ ص: ۱۲۷ أما بيعها وشرائها فيجوز لا مكان الانتفاع بها.

نیز دیکھئے: فتاویٰ رشیدیہ ص: ۴۸۸ و کفایت المفتی ج: ۹ ص: ۱۴۸ (طبع جدید دار الاشاعت).

منع ہے کراچی میں نمبر حاصل کرنے کے لئے ہزار ڈیڑھ ہزار خرچ ہوتا ہے، عوام و خواص اس میں مبتلا ہیں، کیا یہ جائز ہے؟

جواب ۱ تا ۴:- اصل یہ ہے کہ شرعاً ہر شخص کو یہ حق حاصل ہے کہ اپنے مملوک روپے سے اپنی ضرورت یا پسند کا جو مال جہاں سے چاہے خرید سکتا ہے، لہذا کسی بیرونی ملک سے مال خریدنا یا وہاں لے جا کر بیچنا شرعاً مباح ہے،^(۱) لیکن ایک صحیح اسلامی حکومت اگر عام مسلمانوں کے مفاد کی خاطر کسی مباح چیز پر پابندی عائد کر دے تو اس کی پابندی کرنا شرعاً بھی ضروری ہو جاتا ہے، اب موجودہ مسلمان حکومتوں نے چونکہ اسلامی قوانین کو ترک کر کے غیر اسلامی قوانین نافذ کر رکھے ہیں، لہذا ان کو وہ اختیارات نہیں دیئے جاسکتے جو صحیح اسلامی حکومت کو حاصل ہوتے ہیں، لیکن اُن کے احکام کی خلاف ورزی میں چونکہ بہت سے منکرات لازم آتے ہیں، مثلاً اکثر جھوٹ بولنا پڑتا ہے، نیز جان و مال یا

(۱ و ۲) وفي شرح المجلة للأناسي رقم المادة: ۱۱۹۲ ج: ۳ ص: ۱۳۲ (طبع مكتبة حبيبيه كوئٹہ) كل يتصرف في ملكه كيف شاء. وفي شرح المجلة للأناسي ج: ۴ ص: ۱۴۰ رقم المادة: ۱۱۹۷ (طبع مكتبة حبيبيه كوئٹہ) لا يمنع أحد من التصرف في ملكه أبداً إلا اذا كان ضرورة لغيره.

وكذا في رد المحتار ج: ۵ ص: ۴۴۸ (طبع سعيد). وفي الهداية ج: ۴ ص: ۴۷۲ (طبع مكتبة رحمانيه) ولا ينبغي للسلطان أن يسعر على الناس لقوله عليه السلام: "لا تسعروا فإن الله هو المسعر القابض الباسط الرزاق. ولأن الثمن حق العاقد فاليه تقديره فلا ينبغي للامام أن يتعرض لحقه إلا اذا تعلق به دفع ضرر العامة.

وكذا في بدائع الصنائع ج: ۵ ص: ۱۲۹ والذر المختار ج: ۶ ص: ۳۹۹. وفي بحوث في قضايا فقهية معاصرة ص: ۸ وللبيع أن يبيع بضاعته بما شاء من ثمن ولا يجب عليه أن يبيعه بسعر السوق دائماً وللتجار ملاحظة مختلفة في تعيين الاثمان وتقديرها الخ.

(۳) وفي أحكام القرآن للمحدث العلامة ظفر أحمد العثماني رحمه الله ج: ۲ ص: ۲۹۱ وهذا الحكم أي وجوب طاعة الأمير يختص بما اذا لم يخالف أمره الشرع يدل عليه سياق الآية فإن الله تعالى أمر الناس بطاعة أولى الأمر بعد ما أمرهم بالعدل في الحكم تنبيهاً على أن طاعتهم واجبة ما داموا على العمل اهـ. وكذا في تفسير المظهر ج: ۲ ص: ۱۵۲ والجامع لأحكام القرآن ج: ۵ ص: ۲۵۹.

وفي الذر المختار مطلب في وجوب طاعة الامام ج: ۲ ص: ۱۷۲ (طبع سعيد) تجب طاعة الامام فيما ليس بمعصية. وفيها أيضاً ج: ۶ ص: ۴۶۰ وفي شرح الجواهر تجب اطاعته فيما اباحه الشرع وهو ما يعود نفعه على العامة وقد نصوا في الجهاد على امتثال أمره في غير معصية.

وفي رد المحتار ج: ۵ ص: ۱۶۷ (طبع سعيد) (قوله يعزّر) لأن طاعة أمر السلطان بمباح واجبة. وفي الذر المختار كتاب الجهاد باب البغاة ج: ۴ ص: ۲۶۴ (طبع سعيد) لأن طاعة الامام فيما ليس بمعصية فرض الخ. وفي الأشباه والنظائر ج: ۱ ص: ۱۵۷ تصرف الامام بالرعية منوطاً بالمصلحة.

وفي تكملة فتح الملهم ج: ۳ ص: ۳۲۳ و ص: ۳۲۴ (طبع مكتبة دارالعلوم كراچی) المسلم يجب عليه أن يطيع أميره في الأمور المباحة فان أمر الأمير بفعل مباح وجبت مباشرته وان نهى عن أمر مباح حرم ارتكابه ومن هنا صرح الفقهاء بأن طاعة الامام فيما ليس بمعصية واجبة هذه الطاعة كما أنها مشروطة بكون أمر الحاكم غير معصية فإنها مشروطة أيضاً بكون الأمر صادراً عن مصلحة لا عن هوى أو ظلم لأن الحاكم لا يطاع لذاته وإنما يطاع من حيث أنه متول لمصالح العامة اهـ.

وفي بحوث قضايا فقهية معاصرة ص: ۱۶۶ (طبع مكتبة دارالعلوم كراچی) كل من يسكن دولة فإنه يلتزم قولاً أو عملاً بأنه يتبع قوانينها وحينئذ يجب عليه اتباع أحكامها الخ.

عزت کو خطرے میں ڈالنا پڑتا ہے، لہذا ان کے جائز قوانین کی پابندی کرنی چاہئے۔^(۱) اس کے علاوہ جب کوئی شخص کسی ملک کی شہریت اختیار کرتا ہے تو وہ قولاً یا عملاً یہ معاہدہ کرتا ہے کہ وہ اس حکومت کے قوانین کا پابند رہے گا، اس معاہدے کا تقاضا بھی یہ ہے کہ جب تک حکومت کا حکم معصیت پر مشتمل نہ ہو اس کی پابندی کی جائے۔^(۲) اسمگلنگ کا معاملہ بھی یہ ہے کہ اصلاً باہر کے ملک سے مال لے کر آنا یا یہاں سے باہر لے جانا شرعی اعتبار سے جائز ہے، لیکن چونکہ حکومت نے اس پر پابندی لگا رکھی ہے اور اس پابندی کی خلاف ورزی میں مذکورہ مفسد پائے جاتے ہیں، اس لئے علماء نے اس سے منع فرمایا ہے، اور اس سے اجتناب کی تاکید کی گئی ہے۔

واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم

۱۳۹۷/۷/۲۲ھ

(فتویٰ نمبر ۷۷۸/۲۸ ج)

سوتر منڈی فیصل آباد میں پرچی کے ذریعے خرید و فروخت کا شرعی حکم

سوال:- بخدمت اقدس سیدی و مرشدی حضرت شیخ الاسلام مدظلہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

خدا کرے حضرت والا بعافیت تمام ہوں، حق تعالیٰ حضرت والا کا قیمتی سایہ صحت و عافیت کاملہ کے ساتھ سلامت رکھیں، اور اس ناکارہ کو حضرت والا کے فیوض سے فہم سلیم کے ساتھ بہرہ ور ہونے کی توفیق عطا فرمائیں۔

یہاں سوتر منڈی میں پرچی کے کاروبار کی ایک صورت چل رہی ہے، جس کا حکم شرعی معلوم کرنے کے لئے احقر نے ایک تحریر مرتب کی ہے۔ یہ تحریر بغرض راہنمائی حضرت والا کی خدمت میں ارسال کر رہا ہوں۔ چونکہ کاروباری طبقے کو حضرت والا کی رائے گرامی پر کافی اعتماد ہے اس لئے حضرت والا سے درخواست ہے کہ اسے ملاحظہ فرمائیں۔ احقر ان شاء اللہ کسی وقت فون پر اس کاروبار کی صورت حال ذکر کر کے حضرت والا کی رائے معلوم کر لے گا۔

آخر میں حضرت والا سے دُعاؤں کی درخواست ہے۔

والسلام

خوید کم

محمد عالمگیر غفرلہ

دارالافتاء سوتر منڈی فیصل آباد

۱۳۲۳/۶/۱۸ھ

مسئلے کی تفصیلی صورت

سوتر منڈی فیصل آباد میں کاروبار کی ایک صورت عام چل رہی ہے کہ ایک شخص کسی دکان دار سے سوتر خریدتا ہے، دکان دار نے جو مال فروخت کیا ہے وہ اس کے گودام میں موجود ہوتا ہے اور خریدار کو بھی فروخت کنندہ کے گودام میں مال کی موجودگی کا بھروسہ ہوتا ہے۔ سودا طے پا جانے کے بعد فروخت کنندہ اس مال کی وصولی کی پرچی جسے ڈیلیوری آرڈر کہا جاتا ہے خریدار کے حوالے کر دیتا ہے۔ جس کا مطلب یہ سمجھا جاتا ہے کہ خریدار جب چاہے فروخت کنندہ کے گودام سے مال اٹھوا سکتا ہے۔ ڈیلیوری آرڈر کی وصولی کے بعد خریدار عموماً گودام سے مال نہیں اٹھواتا بلکہ اسی آرڈر کی بنیاد پر یہ مال آگے کسی تیسرے شخص کو فروخت کر دیتا ہے۔ خرید و فروخت کے مذکورہ معاملے کے بارے میں سوتر منڈی کے مختلف حضرات سے تفصیلات معلوم کرنے پر یہ امور سامنے آئے:

۱۔ جب تک فروخت شدہ مال اصل فروخت کنندہ کے گودام میں موجود ہے، اس وقت تک وہ مال اسی کے ضمان میں رہتا ہے، لہذا اگر خدا نخواستہ گودام کو آگ لگ جائے یا گودام میں موجود مال کسی اور طریقے سے ضائع ہو جائے تو یہ نقصان خریدار (ڈیلیوری آرڈر وصول کرنے والے) کا نہیں بلکہ اصل فروخت کنندہ کا سمجھا جاتا ہے۔

۲۔ گودام میں سوتر کے بورے کثیر تعداد میں موجود ہوتے ہیں، لہذا خریدار کے لئے گودام کے اندر اپنا مال دوسرے مال سے الگ جگہ پر رکھوانا یا کم از کم اس کی تعیین کرانا بہت مشکل ہے۔ اور اگر کوئی خریدار اس کا مطالبہ کر بھی لے تو پلے داروں (مال کی حفاظت اور اس کے اٹھوانے پر مامور ملازمین) کی طرف سے یہ جواب ملتا ہے کہ آپ کا خریدا ہوا مال پیچھے ہے، اور اس کے آگے دوسرے بورے رکھے ہوئے ہیں، لہذا مال الگ جگہ رکھوانے یا اپنی جگہ پر رہتے ہوئے اس کی تعیین کا مطلب یہ ہے کہ پہلے اس کے آگے موجود سارا مال اٹھایا جائے اور پھر تعیین یا تمیز کی جائے، اور یہ ان لوگوں کے لئے بہت مشکل بلکہ تقریباً ناممکن ہے۔

۳۔ فروخت کنندہ کے گودام میں کثیر مقدار میں مال آتا بھی رہتا ہے اور ساتھ ساتھ نکلتا بھی رہتا ہے، اب فروخت کنندہ اپنے آپ کو اس کا پابند نہیں سمجھتا کہ جو مال اس نے ایک شخص کو فروخت کر دیا ہے وہ اسے اپنے گودام میں سنبھال کر رکھے بلکہ وہ بسا اوقات اسی مال کی ڈیلیوری کسی اور کو بھی کروا دیتا ہے، لیکن چونکہ اس کے گودام میں مال بکثرت آ بھی رہا ہوتا ہے اس لئے اسے اطمینان ہوتا

ہے کہ جب بھی خریدار مال اٹھوانا چاہے گا تو اسے مطلوبہ کوالٹی کا مال اٹھوادیا جائے گا۔

۴- نیز اس پرچی (ڈیلیوری آرڈر) کی بنیاد پر تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد اس مال کی خرید و فروخت ہوتی رہتی ہے جبکہ مال ابھی اصل فروخت کنندہ کے گودام میں ہی ہوتا ہے۔ بسا اوقات ایک مختصر وقت میں یہ مال متعدد ہاتھوں میں فروخت ہو چکا ہوتا ہے۔ البتہ یہ بات یقینی ہے کہ آخری خریدار یہ مال سب سے پہلے فروخت کنندہ کے گودام سے اٹھوا لیتا ہے، محض فرق برابر کرنے یا سٹ کرنے کا امکان نہ ہونے کے برابر ہے۔ اب ایسی صورت میں تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد مال کی تعیین یا تفریق پر پلے دار قطعاً آمادہ نہیں ہوں گے، جس کی وجہ سے اس کی تعیین مشکل ہے۔

مذکورہ بالا صورت کے شرعی حکم پر غور کے نتیجے میں یہ بات سامنے آئی کہ پیچھے دی گئی تفصیل کے مطابق محض ڈیلیوری آرڈر کی وصولی شرعی قبضہ قرار نہیں دیا جاسکتا، کیونکہ ڈیلیوری آرڈر کی وصولی کے باوجود فروخت شدہ مال جب تک فروخت کنندہ کے گودام میں ہے اس وقت تک وہ اسی کے ضمان میں رہتا ہے، مارکیٹ کے عرف کے مطابق اس کا ضمان خریدار کی طرف منتقل نہیں ہوتا۔ لہذا گودام سے مال اٹھوائے یا اپنا مال الگ کئے بغیر محض ڈیلیوری آرڈر کی وصولی کی بنیاد پر ہی یہ مال آگے فروخت کیا جا رہا ہے، تو یہ بیع قبل القبض ہونے کی وجہ سے ناجائز ہے۔

اس صورت کے عدم جواز کے بارے میں مارکیٹ کے بعض متدین احباب سے جب گفتگو کی گئی تو ان کا سوال یہ تھا کہ اگر ہم مارکیٹ کے عام عرف کے خلاف دیانۂ خریدے ہوئے مال کا رسک قبول کر لیں، مثلاً اگر خدا نخواستہ فروخت کنندہ کے گودام کو آگ لگ جاتی ہے، جس کی وجہ سے اس میں موجود مال جل کر ضائع ہو جاتا ہے تو اپنے خریدے ہوئے بوروں کی حد تک ہم اس نقصان کے ذمہ دار ہوں گے (اگرچہ خریدار کے اس ضمان کے بارے میں فروخت کنندہ کو بتایا نہیں جائے گا، کیونکہ اس صورت میں فروخت کنندہ کی طرف سے بددیانتی کا خدشہ ہے) تو پھر ہمارے لئے محض ڈیلیوری آرڈر کی بنیاد پر اس مال کو آگے فروخت کرنا جائز ہوگا یا نہیں؟

اس سوال پر مزید غور و مشاورت کے بعد جو امور سامنے آئے، انہیں ذیل میں نمبر وار درج کیا

جا رہا ہے:-

۱- قبضے میں بنیادی چیز انتقال ضمان (رسک) ہے، لہذا اگر کسی جگہ حسی قبضہ نہ ہو سکے البتہ خریدی ہوئی چیز کا ضمان خریدار کی طرف منتقل ہو جائے تو اسے بھی قبضہ ہی تصور کیا جاتا ہے۔ اس کی نظیر

کمپنی کے شیئرز ہیں۔ شیئرز کی خرید و فروخت درحقیقت کمپنی کے مشاع اثاثوں کی خرید و فروخت ہے۔ ظاہر ہے کہ ان مشاع اثاثوں پر حسی قبضہ تو ہو نہیں سکتا، لہذا انتقالِ ضمان کو ہی کافی سمجھا گیا ہے۔ (ملاحظہ ہو: فقہی مقالات ج: ۱ ص: ۱۵۴)۔

لہذا مسئلہ صورت میں بھی اگر خریدار رسک قبول کرنے کے لئے تیار ہے تو اس کے لئے محض ڈیلیوری آرڈر کی بنیاد پر آگے خرید و فروخت جائز ہونی چاہئے۔

لیکن اس صورت کے جواز کا فتویٰ دینے میں کچھ اشکالات ہیں جو ذیل میں درج ہیں:

الف:- شیئرز اور مجوٹ عنہ صورت میں واضح فرق ہے، وہ یہ کہ شیئر ہولڈرز اگر خریدے ہوئے شیئرز کی پشت پر موجود اثاثوں کی تعیین یا ان کا افراز کرانا چاہے تو اس کے لئے یہ ناممکن ہے، اس لئے وہاں انتقالِ ضمان کو ہی کافی سمجھا گیا ہے، بخلاف مجوٹ عنہ صورت کے کہ اس میں فروخت شدہ مال کی تعیین و افراز مشکل ضرور ہے مگر ناممکن نہیں۔ اور درحقیقت یہ مشکل بھی کاروباری طبقے کے عام رواج اور کاروبار کی تیز رفتاری کا نتیجہ ہے۔ اس لئے کمپنی کو اس مسئلے کی نظیر بنانا مشکل ہے۔

ب:- پھر شیئرز کی خرید و فروخت کی صورت میں اسٹاک ایکسچینج اور شیئرز کا کاروبار کرنے والے لوگوں کا عام عرف ہی یہ ہے کہ شیئرز خریدتے ہی رسک خریدار کی طرف منتقل ہو جاتا ہے، اگرچہ شیئر سرٹیفکیٹ پر ابھی تک قبضہ نہ ہوا ہو۔ جبکہ مجوٹ عنہ صورت میں عرف اس کے خلاف ہے، خریدا ہوا مال جب تک فروخت کنندہ کے گودام میں ہے اس وقت تک وہ اسی کے ضمان میں سمجھا جاتا ہے۔ اس عرف عام کے خلاف اگر کوئی شخص انفرادی طور پر اس مال کی ضمان قبول کر لیتا ہے تو اسے قبضہ قرار دینے سے دیگر کاروباری افراد کے غلط فہمی میں واقع ہو جانے کا خطرہ ہے، خاص طور پر جبکہ خریدار اپنی اس ضمان کے متعلق فروخت کنندہ کو آگاہ کرنے کے لئے بھی تیار نہیں۔

ج:- زبانی گفتگو کے نتیجے میں یہ بات سامنے آئی کہ جو خریدار ڈیلیوری آرڈر ملتے ہی فروخت کنندہ کے گودام میں موجود خریدے ہوئے مال کا رسک قبول کرنے کے لئے تیار ہیں وہ بھی صرف اس صورت میں رسک قبول کریں گے جبکہ خدا نخواستہ فروخت کنندہ کے گودام میں موجود سارا کا سارا مال ضائع ہو جائے۔ اس صورت میں یہ اپنے خریدے ہوئے مال کی حد تک ضامن بننے کے لئے تیار ہیں۔ لیکن اگر گودام میں موجود سارا مال نہیں بلکہ کچھ مال ضائع ہوتا ہے تو اس صورت میں یہ تعیین کہ کس کا مال ضائع ہوا ہے؟ بہت مشکل ہے، اور اس میں نزاع کا بھی شدید خطرہ ہے، نیز خریدار اس صورت میں

ضامن بننے کے لئے بھی تیار نہیں۔ اس سے واضح ہے کہ خریدار نے خریدے ہوئے مال کا ریسک مکمل طور پر قبول نہیں کیا۔ جبکہ کمپنی میں یہ صورت حال نہیں، کیونکہ کمپنی کے تمام اثاثے مشاعاً تمام شیئر ہولڈرز کی ملکیت ہیں۔ لہذا جزوی طور پر اثاثوں کے ضائع ہونے کی صورت میں تمام شیئر ہولڈرز اپنے حصے کے تناسب سے اس نقصان کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔

د:- اور آخری اشکال یہ ہے کہ محض ڈیلیوری آرڈر کی بنیاد پر آگے خرید و فروخت کو جائز قرار دینے سے کہیں سٹے کا دروازہ نہ کھل جائے، چنانچہ مارکیٹ کے بعض حضرات کی زبانی معلوم ہوا کہ کسی زمانے میں سٹے کا کاروبار رہا ہے، اور اب بھی سٹے چلتا ہے، لیکن بہت کم۔

ان چار وجوہ کی بنیاد پر خریدار اگر اپنے طور پر خریدے ہوئے مال کا ریسک قبول کر بھی لے تو بھی اس کے جواز کا فتویٰ دینے میں تردد ہے۔

۲- ایک تجویز یہ بھی ہے کہ جس وقت مال فروخت کنندہ کے گودام میں بوروں کی شکل میں آرہا ہے اسی وقت یا مال تیار کرتے وقت ملز کی طرف سے ہی ان بوروں پر کوئی سیریل نمبر لگا دیا جائے۔ پھر جب بوروں کا سودا ہوا تو فروخت کنندہ ڈیلیوری آرڈر پر فروخت شدہ بوروں کا نمبر بھی لکھ دے۔ مثلاً اگر خریدار نے سو بورے خریدے ہیں تو دکان دار ڈیلیوری آرڈر پر تعین کردے کہ بورہ نمبر ۶۰۱ سے بورہ نمبر ۷۰۰ تک فروخت کیا گیا ہے۔ اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ فروخت شدہ مال کی تعین کے لئے افراز یا کسی اور عمل کی ضرورت نہیں رہے گی اور خریدار مارکیٹ کے عرف کے خلاف اپنے طور پر اگر اس مال کا ریسک قبول کرنا چاہے تو یہ بھی ممکن ہوگا اور خدا نخواستہ گودام میں موجود مال کا کچھ حصہ ضائع ہو جانے کی صورت میں یہ معلوم کرنا بھی آسان ہوگا کہ کس کا مال ضائع ہوا ہے؟ جس کی وجہ سے باہم نزاع کا اندیشہ نہیں ہوگا۔

لیکن اس تجویز کے بارے میں دو باتیں قابل غور ہیں:

الف:- جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے کہ مارکیٹ کا عام عرف یہی ہے کہ مال جب تک فروخت کنندہ کے گودام میں موجود رہے گا، اس وقت تک وہ اسی کے ضمان میں رہے گا، خریدار کی طرف اس کا ضمان منتقل نہیں ہوگا۔ اور مجوزہ صورت میں خریدار مارکیٹ کے عام عرف کے خلاف صرف اپنی دیانت پر خریدے ہوئے مال کا ریسک قبول کرے گا، اور قبولی ریسک کے بارے میں فروخت کنندہ کو بالکل آگاہ نہیں کرے گا۔ کیونکہ اسے خطرہ ہے کہ اگر میں فروخت کنندہ کو اپنے ریسک کے متعلق آگاہ کروں گا تو وہ

بددیانتی کا مرتکب ہوگا۔ مثلاً کسی تیسرے شخص کو یہی مال اٹھوادے گا اور مجھے یہ کہے گا کہ آپ کا مال چوری ہو گیا ہے، اور چونکہ رسک آپ کا تھا اس لئے یہ مال آپ کا ضائع ہوا ہے، میرا اس کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ اس جیسے خطرات کے پیش نظر خریدار فروخت کنندہ کو اپنے رسک کے متعلق آگاہ نہیں کرنا چاہتا۔ اب قابل غور یہ ہے کہ کیا قبضہ متحقق ہونے کے لئے اس طریقے پر رسک قبول کرنا کافی ہوگا؟

ب:- بوروں پر سیریل نمبر لگانے کی تجویز گوئی نفسہ قابل عمل ہے، لیکن تجار کے احکام شرعیہ کے ساتھ قلت اعتناء اور حلال و حرام کی فکر نہ ہونے کے پیش نظر اس پر عمل ہونا بظاہر ناممکن ہے۔ چند گنتی کے افراد اس تجویز کو قبول کرنے کے لئے تیار ہیں، لیکن یہ وہ لوگ ہیں جو سوتر کے خریدار ہیں، نہ کہ گودام مالکان اور فروخت کنندگان، اس لئے یہ تجویز صرف تصور کی حد تک ہوگی جس کا کوئی عملی وجود نہیں ہوگا۔

۳- یہ ساری تفصیل اس صورت میں ہے کہ خریدے ہوئے سوتر کو آگے فروخت کرنے کے لئے اس پر قبضے کو شرط قرار دیا جائے جیسا کہ حنفیہ اور شافعیہ کا مذہب ہے۔ لیکن مالکیہ کا مذہب یہ ہے کہ صرف طعام میں بیع قبل القبض ناجائز ہے۔ طعام کے علاوہ باقی اشیاء میں بیع قبل القبض ناجائز نہیں۔ امام احمد کی ایک روایت بھی یہی ہے۔ اس وقت خاص طور پر سوتر منڈی میں سوتر کی بیع قبل القبض کا عام ابتلاء ہے، اور مارکیٹ کی صورت حال یہ ہے کہ گو کچھ افراد بیع قبل القبض سے بچنے اور قبضے کے بعد مال فروخت کرنے پر تیار ہوں گے، لیکن عام لوگوں کے اعتبار سے یہ ناممکن ہے۔ اس لئے ایک تجویز یہ بھی ہے کہ اس صورت حال میں مالکیہ کے مذہب پر فتویٰ دے دیا جائے، کیونکہ معاملات میں توسع کی بناء پر افتاء بمذہب الغیر کے نظائر خاص طور پر موجودہ زمانے میں کم نہیں۔ نیز کاروبار کا ایک طریقہ جو لوگوں میں رواج پا چکا ہے، اس سے انہیں ہٹانا خاصا دشوار اور ان کے لئے حرج کا باعث ہے۔ چنانچہ علامہ شامی نے پھلوں کی بیع کی ایک صورت میں ظاہر الروایۃ سے عدول کرنے کی وجہ یہی ارشاد فرمائی ہے، فرماتے ہیں:

(قوله وأفتی الحلوانی بالجواز) وزعم أنه مروی عن أصحابنا وكذا حكي

عن الامام الفضلی، وقال استحسن فيه لتعامل الناس وفي نزاع الناس عن

عادتهم حرج، قال فی الفتح: وقد رأيت رواية فی نحو هذا عن محمد فی

بیع الورد علی الأشجار فان الورد متلاحق، وجوز البیع فی الكل وهو قول

مالک قال الزیلعی: وقال شمس الأئمة السرخسی: والأصح أنه لا يجوز لأن المصير الى مثل هذه الطريقة... عند تحقق الضرورة ولا ضرورة هنا لأنه يمكنه أن يبيع الأصول على ما بينا قلت: لكن لا يخفى تحقق الضرورة في زماننا ولا سيما في مثل دمشق الشام كثيرة الأشجار والثمار فانه لغلبة الجهل على الناس لا يمكن الزامهم بالتخلص بأحد الطرق المذكورة، وان أمكن ذلك بالنسبة الى بعض أفراد الناس لا يمكن بالنسبة الى عامتهم وفي نزاعهم عن عادتهم حرج كما علمت.

(شامی ج: ۴ ص: ۵۵۵).

لیکن مجبوث عنہ صورت میں مالکیہ کے مذہب کے مطابق بیع قبل القبض کے جواز کا فتویٰ دینے میں سٹے کا دروازہ بھی کھلنے کا خطرہ ہے، اس لئے اس کے جواز کا فتویٰ دینے میں تردد ہے۔

آنجناب سے درخواست ہے کہ مذکورہ مسئلے کے متعلق اپنی قیمتی رائے سے آگاہ فرمادیں اور پیچھے ذکر کی گئی صورتوں میں سے جو صورت زیادہ مناسب ہو یا کوئی اور صورت جو آنجناب کے ذہن میں ہو تحریر فرمادیں۔

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

محمد عالمگیر غفرلہ

دارالافتاء سوتر منڈی فیصل آباد

۱۴۲۳/۶/۱۷ھ

جواب:- پرچی کے ذریعے خرید و فروخت کے مروج طریقے میں دو خرابیاں ہیں، ایک بیع کا غیر متعین ہونا، دوسرے بیع قبل القبض۔ لہذا یہ طریقہ جائز نہیں ہے۔^(۱) اول تو پہلی خرابی کی موجودگی میں بظاہر مائیکہ کے مسلک پر بھی بیع جائز نہیں ہوگی،^(۲) دوسرے اس قول پر فتویٰ دینے کی نہ صرف یہ کہ ضرورت نہیں ہے، بلکہ موجودہ دور میں سٹہ وغیرہ کی خرابیوں سے بچنے کے لئے ضروری ہے کہ اس پر فتویٰ نہ دیا جائے، خود مالکی علماء بھی آج کل اس پر فتویٰ دینے میں تردد کرتے ہیں۔ البتہ مذکورہ کاروبار

(۱) بیع قبل القبض کے عدم جواز سے متعلق تفصیلی حوالہ جات کے لئے ص: ۸۲ کا حاشیہ نمبر ۱ اور ص: ۲۲۳ کا حاشیہ نمبر ۳ ملاحظہ فرمائیں۔

(۲) وفي مواهب الجليل لشرح مختصر خليل ج: ۶ ص: ۸۵ (طبع دار الكتب العلمية بيروت) وجهل بمشمون أو ثمن ولو تفصيلاً يعني أن من شرط صحة البيع أن يكون معلوم العوضين فإن جهل الثمن أو المشمون لم يصح البيع وظاهر كلامه أنه متى حصل الجهل بأحد العوضين من المتبايعين أو من أحدهما فسد البيع وصرح بذلك الشارح في الكبير وهو ظاهر التوضيح أيضاً.

کی جائز صورت صرف یہ ہو سکتی ہے کہ بوروں پر نمبر ڈال کر خریداری کے وقت نمبروں کے ذریعے ان کا تعین کر لیا جائے^(۱)، اور پرچی پر وہ نمبر درج ہوں، نیز بائع اپنی طرف سے تخلیہ کر دے، یعنی یہ کہہ دے کہ یہ بورے اب آپ کے ہیں، جب چاہیں اٹھا کر لے جائیں، اب میں ان بوروں کا ضامن نہیں ہوں، جب تک میرے گودام میں رہیں گے آپ کی امانت کے طور پر رہیں گے، میں ان کے نقصان کا ذمہ دار نہیں ہوں گا۔ یہ بات پرچی پر بھی لکھ دی جائے۔ اس صورت میں چونکہ بیع متعین بھی ہو جائے گی اور ضمان بھی بائع کے تخلیہ کے ذریعے مشتری کی طرف منتقل ہو جائے گا، اس لئے خریدار کے لئے آگے فروخت کرنا جائز ہوگا۔^(۲) صرف خریدار کا یہ سمجھ لینا کافی نہیں کہ بیع میرے ضمان میں آگئی ہے، خواہ بائع اسے اپنے ضمان میں سمجھتا ہو، اور عرف بھی یہ ہو کہ گودام میں رہنے تک بائع کا ضمان ختم نہیں ہوتا۔

واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم

بندہ محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۴۲۳/۶/۲۶ھ

(فتویٰ نمبر ۶۴۴/۴)

زندہ جانور کو وزن کر کے فروخت کرنے کا حکم

سوال:- آج کل جانور مرغی اور بکری وغیرہ کو وزن کر کے اور تول کر فروخت کیا جاتا ہے،

(مفتی عبدالواحد)

اس کے بارے میں آپ کی رائے کیا ہے؟

جواب:- آپ نے فرمایا ہے کہ آج کل مرغی اور بکری جوٹل کر بیچی جاتی ہیں، اُن کے

بارے میں احقر کی کیا رائے ہے؟ غالباً سوال کا مقصد یہ ہے کہ کیا اب اُن کو عددی کی بجائے وزنی قرار

دے دیا جائے؟^(۱) فی الحال احقر کا جواب نفی میں ہے۔^(۲) میرا خیال یہ ہے کہ اب بھی وہ عددی ہیں،^(۳) اور

اُن کا تولنا درحقیقت آحاد میں سے کسی ایک کے انتخاب میں مدد لینے کے لئے ہوتا ہے۔ ”وزنی“ ہونے

کے معنی یہ ہیں کہ اُس چیز کو مشتری جتنے وزن میں چاہے، جب چاہے، خرید سکے۔ مرغی اور بکری میں یہ

ممکن نہیں، کما هو ظاہر۔ لہذا امر واقعہ یہ ہے کہ تولنے کے ذریعے یہ جاننا مقصود ہوتا ہے کہ جانور کتنا

(۱ و ۲) وفي الهندية ج: ۳ ص: ۱۶ ويعتبر في التسليم أن يكون المبيع مفروضاً غير مشغول بحق غيره هنكذا في الوجيز للکردري واجمعوا على أن التخلية في البيع الجائز تكون قبضاً... الخ.

وفي البدائع ج: ۵ ص: ۲۴۴ فالتسليم والقبض عندنا هو التخلية والتخلي وهو أن يخلّي البائع بين المبيع وبين المشتري برفع الحائل بينهما على وجه يتمكن المشتري من التصرف فيه فيجعل البائع مسلماً للمبيع والمشتري قابضاً له اهـ. نیز مزید حوالہ جات کے لئے دیکھئے ص: ۸۳ کا حاشیہ نمبر ۲۔

پُر گوشت ہے؟ جب یہ بات ٹٹلنے سے واضح ہوگئی تو سودا عدداً ہی ہوتا ہے، لہذا وہ عددی ہی شمار ہوگا۔^(۴)

والسلام
محمد تقی عثمانی
یکم صفر ۱۴۱۲ھ

(۱ تا ۴) جانور کے ہمیشہ عددی رہنے اور جانور کو وزن کر کے فروخت کرنے سے متعلق مذکورہ تمام امور کی وضاحت اور تفصیلی حکم کے لئے حضرت والا دامت برکاتہم کا مصدقہ درج ذیل فتویٰ ملاحظہ فرمائیں:

زندہ جانور تول کر بیچنے کا مفصل و مدلل حکم

سوال:- کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلے کے بارے میں کہ زندہ جانور مثلاً مرغی، بکرا وغیرہ کو وزن کر کے خریدنا اور فروخت کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً

اگر خریدار اور فروخت کنندہ زندہ جانور کو وزن کر کے خرید و فروخت پر راضی ہوں، تو زندہ جانور کو وزن کر کے نقد رقم یا غیر جنس کے ذریعے خریدنا اور فروخت کرنا دونوں جائز ہیں، بشرطیکہ متعین جانور کا فی کلو کے حساب سے نرخ طے کر لیا گیا ہو، نیز جانور کا وزن کرنے کے بعد اس کی قیمت بھی متعین کر لی گئی ہو۔ جس کی صورت یوں ہوگی کہ خریدار کو مثلاً ایک بکرے کی ضرورت ہے، تاجر کے پاس جا کر وہ بکروں میں سے ایک بکرہ منتخب کر لیتا ہے اور تاجر اس کو بتا دیتا ہے کہ اس بکرے کا نرخ پچاس روپے کلو ہے اور اس بکرے کو خریدار کے سامنے وزن کر کے بتا دیتا ہے کہ مثلاً یہ بیس کلو کا ہے۔ اب اگر خریدار اس کو قبول کر لے تو بیع منعقد ہو جائے گی اور اس طرح کی گئی خرید و فروخت شرعاً جائز ہے۔

مسئلہ مذکورہ میں اس بات کو ذہن نشین کر لینا ضروری ہے کہ یہاں دو باتیں الگ الگ ہیں۔ ایک یہ کہ جانور کو وزن کر کے بیچنا اور خریدنا۔ دوسری بات یہ ہے کہ جانور کو موزون قرار دینا اور اس پر موزونی اشیاء کے فقہی احکامات جاری کرنا۔ جہاں تک پہلی بات کا تعلق ہے کہ جانور کو وزن کر کے بیچنا اور خریدنا، تو یہ بلاشبہ جائز ہے، اس لئے کہ عدم جواز کی کوئی وجہ نہیں ہے۔

لیکن دوسری بات کہ جانور کو موزون قرار دینا اور اس پر موزونی اشیاء پر جاری ہونے والے تمام احکام فقہیہ کو جاری کرنا۔ تو یہ درست نہیں۔ اس کی دو وجہ ہیں:-

۱- پہلی وجہ یہ ہے کہ جن چیزوں کا کیلی، وزنی یا عددی ہونا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں منصوص یا معلوم ہو، ان کی وہ حیثیت تبدیل نہیں ہوتی، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں جانوروں کا عددی ہونا معلوم ہے، البتہ جن اشیاء کا کیلی یا وزنی ہونا منصوص نہیں تو ان کا مدار عرف پر ہے۔ اگر عرف ان کے کیل کرنے کا ہے تو وہ کیلی ہیں، اور اگر عرف وزن کرنے کا ہے تو وہ وزنی ہیں۔ جیسا کہ عالمگیریہ میں ہے: وما لا نص فیہ ولم یعرف حالہ علی عہد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یعتبر فیہ عرف الناس۔ فان تعارفوا کیلہ فھو کیلی وان تعارفوا وزنہ فھو وزنی۔ کذا فی المحيط۔ (العالمگیریہ ج: ۳ ص: ۱۱۷) تو جب جانور کا عددی ہونا معلوم ہے تو اس کے عددی ہونے کی حیثیت وزنا بیع کرنے سے تبدیل نہ ہوگی، یہ الگ بات ہے کہ بیع صحیح ہو جائے گی، لعدم المانع۔

۲- دوسری وجہ یہ ہے کہ جانور کو دیگر اشیاء موزون کی طرح حسبِ منشا کم یا زیادہ کر کے وزن کرنا ناممکن ہے، مطلب یہ ہے کہ جس طرح دیگر اشیاء موزون کی جتنی مقدار مطلوب ہوتی ہے اتنی مقدار کو بلا تکلف وزن کر کے الگ کیا جاسکتا ہے۔ مثلاً چینی ۲۰ کلو ۱۵ گرام کی ضرورت ہے تو بلا تکلف چینی کی یہ مقدار وزن کے ذریعے الگ کی جاسکتی ہے، بخلاف جانور کے کہ اس میں یہ بات ممکن ہی نہیں مثلاً اگر کوئی یہ کہے کہ ۲۰ کلو ۱۵ گرام کا بکرا چاہئے، کچھ کم زیادہ نہ ہو، تو یہ بظاہر محال ہے، لہذا معلوم ہوا کہ جانور کو موزونی قرار نہیں دیا جاسکتا۔

(باقی اگلے صفحے پر)

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)

اس سے یہ بات بھی واضح ہوگئی کہ اگر بالفرض جانور کو سارے جہان میں وزن کر کے بیع کرنے کا عرف قائم ہو جائے تو بھی جانور کو بنیادی طور پر موزونی قرار نہیں دیا جاسکتا، کیونکہ اس میں موزونی اشیاء والی صفات ہی نہیں پائی جاتیں، کما مر۔

مذکورہ تفصیل کے بعد جانور کی بیع وزنا کے جائز ہونے کا حاصل یہ ہے کہ فی کلو کے حساب سے جانور کی قیمت کا ایک معیار مقرر کر لیا گیا ہے، جس کی بناء پر جانور کو وزن کر کے اس کے وزن کے اعتبار سے قیمت کا اندازہ لگا کر مناسب قیمت متعین کر لی جاتی ہے۔ صورت مذکورہ میں وزن کو صرف آلہ بنا کر قیمت متعین کرنے میں آسانی پیدا کی گئی ہے، لہذا عرفاً تو اس کو بیع وزنا کہا جاسکتا ہے لیکن حقیقتاً اس کا بیع وزنا ہونا محل تامل ہے۔ البتہ یہ بیع بہر حال جائز ہے جبکہ جانور بھی متعین ہو جائے اور قیمت بھی متعین ہو، فافہم۔

جانور کی اس بیع وزنا میں بعض لوگوں کو کچھ اشکالات پیدا ہو سکتے ہیں۔ اس لئے ان متوقع اشکالات کو نقل کر کے ان کے مختصر جوابات دیئے جاتے ہیں، تاکہ اوہام رفع ہو سکیں اور کوئی انتشار باقی نہ رہے۔

۱۔ پہلا اشکال بعض لوگوں کو یہ ہو سکتا ہے کہ ایک طرف تو یہ کہا جا رہا ہے کہ لیس بموزون یعنی جانور وزن کی جانے والی چیز نہیں ہے، اور یہی کتب فقہ میں مصرح ہے، لیکن دوسری طرف آپ نے کہا ہے کہ اس کو وزن کر کے بیچنا جائز ہے، فکیف التوفیق؟

تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ اشکال اس وقت ہو سکتا ہے جب اس بیع کو حقیقتاً بیع وزنا مانا جاتا لیکن جب یہ حقیقتاً بیع وزنا ہے ہی نہیں، جیسا کہ ماقبل میں وضاحت ہو چکی تو کوئی اشکال وارد ہی نہیں ہوتا، نہ مذکورہ اشکال اور نہ آئندہ آنے والے اشکالات، لیکن اگر اس کو بیع وزنا مان لیا جائے ولو عرفاً و مجازاً تو بھی اس کا جواب ماقبل کلام میں وضاحت سے ہو چکا کہ دونوں الگ الگ باتیں ہیں، جن کا مطلب بھی الگ الگ ہے۔ ”لیس بموزون“ کا مطلب یہ ہے کہ اس پر موزون اشیاء کے احکام فقہیہ جاری نہیں ہوں گے، مثلاً استقرار کا جائز ہونا، ربا الفضل کا اس میں جاری ہونا وغیرہ وغیرہ، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ اس کی بیع وزنا بھی جائز نہ ہو، بلکہ حدیث: اذا اختلف النوعان فبیعوا کیف شئتم کا عموم اس بیع کے جواز کا مؤید ہے، اس حدیث کو امام مسلم نے اپنی صحیح کی کتاب المساقاة میں اور ابوداؤد نے کتاب البیوع میں نقل کیا ہے۔ نیز کسی شے کی بیع وزنا کے جواز کے لئے اس کا موزون ہونا ضروری اور شرط نہیں ہے، بہت سی اشیاء موزون نہیں لیکن وزن کر کے ان کو خرید اور فروخت کیا جاتا ہے۔ آج کل کی بیوع میں اس کی واضح مثال یہ ہے کہ کپڑا بالاتفاق مذروع ہے یعنی ناپ کی جانے والی چیز ہے، لیکن بڑے شہروں کے بعض بازاروں میں کپڑے کو وزن کر کے ”لاٹوں“ کے حساب سے بیچا جاتا ہے۔ تو اگر کپڑا متعین ہو اور نرخ بھی طے ہو، تو اس طرح بیچنا بلاشبہ جائز ہے وغیرہ وغیرہ، اس قسم کی کئی مثالیں موجود ہیں۔

۲۔ دوسرا اشکال بعض لوگوں کو یہ ہو سکتا ہے کہ جانور کے وزن کی پوری پوری مقدار معلوم کرنا دشوار ہے ”لأنه یخفف نفسه مرة وینقله أخرى“ یعنی اس لئے کہ وہ کبھی اپنے آپ کو ہلکا کر لیتا ہے اور کبھی بوجھل، اور یہ وجہ کتب فقہ میں بھی موجود ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اول تو یہ بات یقینی نہیں کہ جانور اپنے آپ کو ہلکا اور بوجھل کر لیتا ہے بلکہ یہ صرف احتمال ہے۔ اور عبارت مذکورہ کو کتب فقہ میں باب ربا میں ذکر کیا گیا ہے اور باب ربا میں تفاضل کا احتمال بھی ممنوع ہے جیسا کہ شامی میں ہے: ”فانه لا یصح لاحتمال الربا واحتماله مانع کحقیقته“ (شامی ج ۴: ص ۵۳۱)۔ لہذا اگر جانور کو گوشت ہی کے بدلے میں خریدا جائے تو اس وقت تو بعض صورتوں میں منع کیا جاسکتا ہے کہ اس میں احتمال ربا ہے لیکن جب روپے کے بدلے خریدا جائے تو صرف اس احتمال کی بناء پر ممنوع نہ ہوگا۔

ثانیاً کہ اگر جانور کی اس حرکت کو ”کہ وہ اپنے آپ کو کبھی ہلکا اور کبھی بوجھل کر لیتا ہے“ تسلیم کر لیا جائے تو بھی یہ اس وقت عدم جواز کی دلیل نہیں بنتی جبکہ بیع روپوں کے عوض ہو رہی ہو، اس لئے کہ جانور کے اس عمل سے اگر وزن میں فرق پڑے تو وہ بہت قلیل ہوگا، اور اس کی وجہ سے زیادہ سے زیادہ وزن میں جہالت یسیرہ لازم آئے گی، اور عام بیوع میں جہالت یسیرہ کو برداشت کیا گیا ہے۔ اور جہالت یسیرہ کی وجہ سے عدم جواز کا قول کسی نے اختیار نہیں کیا، فتاویٰ شامی میں ہے: ”وقیدنا بالفاحشة لما قالوه، لو باعہ جمیع ما فی هذا التمرية أو هذه الدار والمشتري لا یعلم ما فیها لا یصح لفحش الجهالة، أما لو باعہ جمیع ما فی هذا البيت أو الصندوق أو الجوالق فانه یصح لأن الجهالة یسیرة“ (شامی ج ۴: ص ۵۲۹)۔ نیز ہمارے مسئلے میں جہالت کو بائع اور مشتری دونوں قبول کرنے پر راضی ہیں اور نزاع کا احتمال نہیں، اس لئے کہ بوقت بیع جانور نے حالت خفت اختیار کی ہوئی ہے یا حالت ثقل؟ اس کا بائع اور مشتری دونوں کو علم نہیں۔ حالانکہ حالت خفت میں بائع کا نقصان ہے کہ کم وزن کے پیسے ملیں گے..... (باقی اگلے صفحے پر)

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)

اور حالتِ ثقل میں مشتری کا نقصان ہے کہ زائد پیسے ادا کرنے پڑیں گے، لیکن دونوں اپنی اپنی جگہ اس نقصان کو برداشت کرنے پر راضی ہیں کیونکہ بیع بالتراضی ہو رہی ہے۔ لہذا یہ جہالتِ یسیرہ اس بیع کے عدم جواز کی وجہ کسی طرح بھی نہیں بن سکتی نہ عرفاً نہ شرعاً۔

تیسرا جواب یہ ہے کہ ہم تسلیم نہیں کرتے کہ جب بیع روپوں کے عوض ہو رہی ہو تو یہ اشکال وارد ہوتا ہے۔ اس صورت میں اشکال اس لئے نہ ہونا چاہئے کہ بیع کے وقت کا وزن معتبر ہے، خواہ جانور حالتِ خفت میں ہو یا حالتِ ثقل میں ہو، کیونکہ حالتِ خفت میں یہ نہ کہا جائے گا کہ جانور میں سے کوئی چیز نکالی گئی ہے یا جدا کر لی گئی ہے جس کی وجہ سے وزن کم ہو گیا ہے، جیسا کہ حالتِ ثقل میں یہ نہ کہا جائے گا کہ اس میں باہر سے کوئی اور چیز شامل کر دی گئی ہے جس کی وجہ سے وزن بڑھ گیا ہے، بلکہ ہر کوئی یہی کہے گا کہ خواہ حالتِ ثقل ہے یا حالتِ خفت اس وقت جانور کا یہی وزن ہے، اور یہ اسی جانور کا وزن ہے کسی خارجی چیز کا اس میں کوئی دخل نہیں۔ لہذا بوقتِ بیع جانور کا جو وزن ہوگا وہی معتبر ہوگا، اسی وزن کے ساتھ بیع ہوگی جو کہ صحیح ہوگی۔

۳۔ تیسرا اشکال بعض لوگوں کو یہ ہو سکتا ہے کہ ”لا یجوز بیع صبرۃ طعام کل قفیر بدرہم“ کی طرح یہ بیع بھی ناجائز ہونی چاہئے کیونکہ جس طرح وہاں یہ علت پائی جاتی ہے کہ بیع اور ثمن مجہول ہیں، پتہ نہیں کہ کتنے کلو اس ڈھیر میں ہوں گے اور یہ بھی معلوم نہیں کہ کل درہم کتنے ادا کرنے پڑیں گے وغیرہ۔

اس کا جواب یہ ہے کہ بیع الحیوان وزنا کی صورت جواز بیان کرتے ہوئے یہ قید اسی لئے لگائی گئی ہے کہ ”جانور کو مشتری کے سامنے وزن کر کے کل وزن بھی بتا دیا جائے“ تاکہ جہالتِ بیع اور جہالتِ ثمن دونوں رفع ہو جائیں۔ اس صورت میں یہ بیع جائز ہو جائے گی جیسا کہ اس صبرۃ طعام کی بیع کو جہاں ناجائز کہا ہے وہاں ساتھ ہی اس صورت کو جائز کہا ہے کہ جبکہ اس صبرۃ طعام کو اسی مجلس میں ناپ لیا جائے یا اس کی کل مقدار بتا دی جائے، لہذا فرمایا: ”وصح فی الكل ان کیلت فی المجلس لزوال المفسد قبل تقررہ أو سمی جملة قفزانہا“ (الدر المختار ج ۴ ص ۵۳۹)۔ اور اسی بحث کے تحت علامہ شامی نے فرمایا ہے کہ: ”وأراد اصبرۃ مشاراً الیہا کما سیأتی، ولیست قیداً بل کل مکیل أو موزون أو معدود من جنس واحد“ (فتاویٰ شامی ج ۴ ص ۵۳۹)۔ یعنی یہ صرف صبرۃ طعام کا حکم نہیں بلکہ ہر کیلی، وزنی اور عددی چیز جس کو وزن کر کے بیچا جائے اس کا بھی یہی حکم ہے کہ جب کل معلوم ہو جائے تو بیع صحیح ہو جائے گی۔ مذکورہ بالا عدم جواز کی ممکنہ وجوہات کہ جن کا جواب ہو چکا، ان کے علاوہ کوئی اور وجہ عدم جواز کی ہمیں ملی نہیں۔ فاعتنم تحقیق هذا المقام بما یرفع الظنون والأوهام یندفع به التناقض واللوم عن عبارات القوم۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ أعلم بالصواب وعلمہ أتم۔

العبد الضعیف

الیاس زمان رکن پوری

دارالافتاء جامعہ دارالعلوم کراچی ۱۴

الجواب صحیح

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۴۲۲/۱/۲۱ھ

الجواب صحیح

عبداللہ عفی عنہ

۱۴۲۲/۱/۲۳ھ

الجواب صحیح

احقر محمود اشرف غفر اللہ لہ

۱۴۲۲/۱/۱۷ھ

الجواب صحیح

بندہ عبدالرؤف سکھروی

۱۴۲۲/۱/۲۲ھ

الجواب صحیح

محمد عبدالمنان عفی عنہ

۱۴۲۲/۱/۲۲ھ

﴿فصل فی الغرر والعیب﴾

(بیع میں دھوکا اور عیب کا بیان)

اصلی کمپنی کے خالی ڈبوں میں دوسری قسم کا تیل ڈال کر فروخت کرنے کا حکم

سوال :- میں موبل آئل کا کام کرتا ہوں، وہ تیل گیلن والے ڈبوں میں بند ہوتا ہے، مختلف کمپنیوں کا ہوتا ہے، لیکن اکثر لوگ اصل کمپنی کے خالی ڈبوں میں اسی قسم کا تیل ڈال کر اپنی طرف سے کمپنی کا سیل لگا کر کم قیمت پر فروخت کرتے ہیں اور پچھتر فیصد یہی تیل بکتا ہے، اور لوگ اصل سمجھ کر خریدتے ہیں، اگر انہیں اصل کمپنی کا تیل زیادہ نرخ پر دیا جائے تو نہیں خریدتے اور اصل تیل ملتا بھی نہیں، اور اگر کبھی ملتا ہے تو بہت مہنگا ملتا ہے، اصل تیل کی اتنی کمی ہے کہ میں دو بار تیل خریدنے گیا کرایہ میں ساٹھ روپے خرچ ہو گئے اور تیل نہیں ملا۔ جس کی وجہ سے کمپنی کے ڈبوں میں دوسرا تیل جو بھرا ہوا ہوتا ہے اس کو یہ بتا کر فروخت کرتا ہوں کہ اصل تیل کمپنی کے ڈیلروں سے نہیں ملتا، ہم دکان داروں سے لے کر آتے ہیں جیسا وہ لوگ دیتے ہیں ویسا ہی ہم آپ کو دیتے ہیں۔ آیا اس طریقے سے تیل بیچنا حرام ہے یا نہیں؟

جواب :- اگر آپ گاہکوں کو اصل حقیقت بتا دیتے ہیں تو اس تیل کی فروخت آپ کے لئے جائز ہے^(۱) اور زیادہ بہتر طریقہ یہ ہے کہ آپ اصلی تیل بھی اپنے پاس رکھیں اور یہ دوسرا تیل بھی، اور گاہکوں کو دونوں دکھا کر دونوں کی قیمتیں بتا کر اور دونوں کا فرق واضح کر کے بیچا کریں۔^(۲)

واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم

ھ ۱۳۹۷/۱۲/۱۸

(فتویٰ نمبر ۱۲۹/۲۸ ج)

(۱ و ۲) وفي صحيح البخاری ج: ۱ ص: ۲۷۹ (طبع قديمی کتب خانہ) عن حکيم بن حزام رضى الله عنه قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: البيعان بالخيار ما لم يتفرقا أو قال: حتى يتفرقا، فان صدقا وبينا بورك لهما في بيعهما، وان كذبا وكتما محقت بركة بيعهما. وفيها أيضا قبله: بيع المسلم المسلم لا داء ولا خبث ولا غائلة وقال عقبه بن عامر لا يحل لامرئ ان يبيع سلعة يعلم أن بها داء ألا أخبره الخ. (باقی اگلے صفحے پر)

کسی اور سے مال بنوا کر اپنے نام کا مونوگرام لگانے کا حکم

سوال :- حکومتِ سندھ کا قانون ہے کہ جو کانٹے اور بٹے تولنے والے بنائے، وہ اپنا مونوگرام یعنی نام ڈالے، بعض مجبوریوں کی وجہ سے میں اپنا مال نہیں بنا سکتا اور پنجاب کے دوسرے کارخانوں سے مال بنواتا ہوں اور اُن پر اپنے نام کا مونوگرام ڈلواتا ہوں یا ڈال دیتا ہوں، اگر حکومتِ پنجاب کا مونوگرام ڈلوا دوں تو حکومتِ سندھ پاس نہیں کرتی، میرا لائسنس حکومتِ سندھ کا ہے، اُس کی سالانہ فیس بھرتا ہوں، مونوگرام کچھ اس طرح ہوتا مثلاً پنجاب کے بنانے والے کا نام عبدالشکور ہے تو وہ اُردو یا انگریزی میں اپنے نام کا مخفف ڈالے گا، اسی طرح میں محمد غیاث ہوں تو یہ مونوگرام ڈلواؤں گا ”جی ایچ“ اس سے گاہک کو دھوکا مقصود نہیں بلکہ حکومتِ سندھ کی خانہ پُری کرنا ہے، کیا ایسا کرنا جائز ہے؟

جواب :- اگر یہ مال سندھ کے مروّجہ اوزان اور پیمانوں کے مطابق ہے اور اس میں کوئی کمی بیشی نہیں ہے اور آپ پنجاب کے کارخانے سے آرڈر دے کر بنواتے ہیں، سارا مال آپ کی ملکیت ہوتا ہے تو آپ اُس پر اپنے نام کا مونوگرام ڈلوا سکتے ہیں۔ لیکن اگر پنجاب کے مروّجہ اوزان اور پیمانے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) وفي مشکوة المصابيح ص: ۲۴۹ (طبع قديمی کتب خانہ) من باع عيباً لم يبيعه لم يزل في مقت الله اولم تزل الملكة تلعه. رواه ابن ماجة.

وفي تكملة فتح الملهم ج: ۱ ص: ۳۷۷ عن حكيم بن حزام رضى الله عنه عن النبي صلى الله عليه وسلم قال: البيعان بالخيار ما لم يتفرقا فان صدقا وبينا بورك لهما في بيعهما وان كذبا وكتما محق بركة بيعهما. رواه مسلم. قوله فان صدقا وبينا أى صدق البائع فى اخبار المشتري صفة المبيع وبين العيب ان كان فى السعة اهـ. وفي البحر الرائق: كتمان عيب السلعة حرام. (ج: ۶ ص: ۲۵).

وفي الدر المختار ج: ۵ ص: ۴۷ (طبع سعيد) لا يحل كتمان العيب فى مبيع أو ثمن لأن الغش حرام اهـ. وفي الشامية: ذكر فى البحر أول الباب بعد ذلك عن البزازیة عن الفتاوى: اذا باع سلعة معيبة عليه البيان. (ج: ۵ ص: ۴۷).

وفي الهندية ج: ۳ ص: ۲۱۰ رجل أراد ان يبيع السلعة المعيبة وهو يعلم يجب أن يبينها فلو لم يبين قال بعض مشائخنا يصير فاسقاً مردود الشهادة وقال الصدر الشهيد: لا نأخذ به كذا فى الخلاصة.

وفي الفتاوى البزازیة على هامش الهندية ج: ۴ ص: ۵۲۱ (طبع رشيديه كونه) وفي الفتاوى: اذا باع سلعة معيبة عليه البيان الخ.

وكذا فى امداد الفتاوى ج: ۳ ص: ۴۳. وامداد الأحكام ج: ۳ ص: ۴۰۳. وكفايت المفتى باب نمبر: ۷ ج: ۸ ص: ۲۰ نیز دیکھئے اگلا فتویٰ اور اس کا حاشیہ۔ (محمد زبیر)

سندھ سے مختلف ہیں تو یہ دھوکا اور ناجائز ہے،^(۱) خلاصہ یہ کہ جھوٹ اور دھوکے سے بچتے ہوئے اگر آپ پنجاب میں مال بنا کر اپنا مونو گرام ڈلوالیں تو اس میں کچھ حرج نہیں۔^(۲) واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۷/۶/۱۶ھ

(فتویٰ نمبر ۶۰۴/۲۸ ج)

پاکستان کی بنی ہوئی چیز پر امریکا یا اٹلی کا نام لکھ کر فروخت کرنے کا حکم

سوال:- حال ہی میں یہاں پر میں نے اپنی آمدنی کو بڑھانے کی غرض سے کچھ تجارت کا سوچا، پاکستان کی بنی ہوئی چند مصنوعات یہاں درآمد کی جاتی ہیں۔ ہم نے پاکستان سے تولیہ اور بوتوں کے Samples منگوائے، کوالٹی کے اعتبار سے دونوں بہت اچھے ہیں، لیکن جس دکان دار کے پاس بھی گئے اس نے ایک ہی کہی کہ جب تک تولیہ پر "Made In USA" اور بوتوں پر "Made In Italy" نہ لکھا ہوا ہوگا، ہم انہیں لینے کے لئے تیار نہیں، کیونکہ یہاں کے عوام USA اور Italy کے لیبل کے بغیر خریدتے نہیں۔ یہاں پر مارکیٹ میں جتنا تولیہ بکتا ہے اس میں سے بیشتر پاکستان کا بنا ہوا ہے، لیکن اس پر سب لوگ Made in USA لکھوا کر لاتے ہیں، جس کی وجہ سے ہاتھوں ہاتھ پک جاتا ہے۔ میں آپ سے یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا ہم بھی ان حالات میں ایسا کر سکتے ہیں؟ ہمارا پروگرام پاکستان سے منگوا کر دکان داروں کو ہول سیل بیچنے کا ہے، ان دکان داروں کو معلوم ہوتا ہے کہ یہ تولیہ پاکستان کا بنا ہے لیکن USA لکھا ہوا ہے۔ اگر ہم ان کو بیچتے وقت بتادیں کہ اصل بات یہ ہے تو

(۱) وفی جامع الترمذی باب ما جاء فی کراہیۃ الغش فی البیوع ج: ۱ ص: ۲۴۵ (طبع سعید) عن أبی ہریرۃ رضی اللہ عنہ أن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ثم قال: من غش فليس منا. وقال الترمذی: حدیث أبی ہریرۃ حدیث حسن صحیح والعمل علی هذا عند أهل العلم کرهوا الغش وقالوا: الغش حرام. وكذا فی مشکوٰۃ ج: ۱ ص: ۲۲۸ من غش فليس منا.

وفی جمع الفوائد ج: ۱ ص: ۴۲۸ المسلم أخ المسلم، لا یحل لمسلم باع من أخیه بیعاً فیہ عیب ألا یبینه له. وفی اعلیاء السنن ج: ۱ ص: ۵۴ من علم بسلعة عیبا لم یجز بیعها حتی یبینه للمشتري فان لم یبینه فهو آثم عاص نص علیہ أحمد لما روی حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم أنه قال: البیعان بالخیار ما لم یترقا، فان صدقا وبینا بورک لهما وان کذبا وکتما محق برکة بیعهما اھ.

وفی البحر الرائق ج: ۶ ص: ۳۵ (تنبیہ) کتمان عیب السلعة حرام.

وفی البرازیة وفی الفتاوی اذا باع سلعة معیبة علیہ البیان.

وفی الہندیة ج: ۳ ص: ۲۱۵ ولا بأس ببيع المغشوش اذا كان الغش ظاهراً كالحنطة بالتراب وان طحنه لم یجز حتی یبینه.

وفی الدر المختار ج: ۵ ص: ۴۷ لا یحل کتمان العیب فی مبيع أو ثمن لأن الغش حرام.

نیز دیکھئے سابقہ فتویٰ اور اس کا حاشیہ۔ (محمد زبیر)

کیا شرعی اعتبار سے اس کی اجازت ہے؟ ڈاکٹر ظہور احمد بمعرفت مولانا خلیل احمد ابوظہبی (امارات)
 جواب:- پاکستان کی بنی ہوئی مصنوعات پر ایسا جملہ لکھنا جس سے اس کے امریکا یا اٹلی میں
 بننے کا دعویٰ کیا گیا ہو، صریح غلط بیانی ہے، جس کی شرعاً بالکل اجازت نہیں^(۱)، ہاں! اگر کسی اور نے یہ
 جملہ لکھ دیا اور پھر آپ کو بیچنا پڑا تو لکھنے کا گناہ لکھنے والے کے سر ہوگا، آپ یہ کہہ کر عہدہ برآ ہو سکتے ہیں
 کہ اگرچہ اس پر لکھا ہوا کچھ اور ہے لیکن یہ پاکستان کا بنا ہوا ہے^(۲)۔ رہا یہ عذر کہ لوگ ان مصنوعات کو اس
 کے بغیر خریدتے نہیں ہیں، تو اس کی وجہ سے غلط بیانی جائز نہیں ہو سکتی۔ والسلام



(۲۱) حوالہ اور تفصیلی عبارات کے لئے سابقہ دونوں فتاویٰ اور ان کے حواشی ملاحظہ فرمائیں۔

﴿فصل فی أنواع البیوع المختلفة﴾

(بیع کی مختلف اقسام بیع وفاء، سلم، استصناع اور بیع استرجار کا بیان)

بیع بالوفاء کا حکم (فارسی فتویٰ)

(حاشیہ میں اس فارسی سوال و جواب کا اردو ترجمہ کر دیا گیا ہے)

سوال:- زید از حکومت ایک ہزار روپیہ قرض گرفت وقتیکہ حکومت طلب کرد چونکہ نزد زید روپیہ نہ بود البتہ نو ایکڑ زمین نزد حکومت رہن بود حکومت گفت کہ اگر قرضہ ادا نمی کنید زمین تو نیلام کنم ازین ضرورت زید زمین خود را بہ عمر و فروخت کرد بعوض ۱۲۵۸ بایں شرط کہ اگر ایں رقم را وقتیکہ ادا کنم زمین من واپس کنید عمر و قبول کرد و نام عمر و بہ نیلام نوشت و روپیہ ۱۲۵۰ بحوالہ حکومت کرد و عمر و بر زمین قابض شد الحال زید بہ عمر و می گوید اکنون پیسہ شمار می دهم زمین بمن واپس کنید عمر و انکار کند و عمر و زمین را وقف کرد است سوال ایں است کہ زمین رہن را فروختن جائز است یا نہ؟ بر تقدیر جواز زید را از عمر و پیسہ واپس گرفتن جائز است یا نہ؟ و اگر بیع اول جائز نیست پس زید کہ زمین خود را از حکومت وقتہ نیلام بہ طور وکالت بنام عمر و گرفت و نام عمر و در نیلام نوشت در حق عمر و نافذ می شود یا نہ؟ عمر و را زمین زمین متنازع فیہا را وقف کردن جائز است یا نہ؟

جواب:- در صورت مسئلہ عقدے کہ میان زید و عمر و واقع شد بیع بالوفاء است و اورا در اصل مذہب بیع فاسد است بیشتر فقہاء کرام برو احکام رہن جاری کنند^(۱) و بیع را فاسد می گویند و نزد بعض فقہاء بیع صحیح^(۲) است، و مشتری راجح بود کہ از نفع گیر دکن اورا حق نمی بود کہ کسے را بیع کند در رد المحتار اقوال کثیر نقل کردہ قول جامع بایں طور ذکر میکند کہ قولہ (وقیل بیع یفید الانتفاع بہ) هذا محتمل لأحد القولین: الأول: أنه بیع صحیح مفید لبعض احکامہ من حل الانتفاع بہ إلا أنه لا یملک بیعہ قال الزیلعی فی الاکراه وعلیہ الفتوی. الثانی: القول الجامع لبعض المحققین أنه فاسد فی حق

(۱) وفي تنوير الأبصار ج: ۵ ص: ۲۷۶ قيل هو رهن. وفي الشامية تحت قوله (وصورته) هو أن يقول البائع للمشتري بعث منك علي أن تبيعه مني متى جئت بالثمن فهذا البيع باطل وهو رهن وحكمه حكم الرهن وهو الصحيح.

(۲) وفي الدر المختار (بحوالہ مذکورہ) وقيل بیع یفید بہ الانتفاع. تفصیلی عبارت آگے اسی فتویٰ میں آرہی ہے۔

بعض الأحكام حتى ملك كل منهما الفسخ، صحيح في حق بعض الأحكام كحل الانزال ومنافع البيع، ورهن في حق البعض حتى لم يملك المشتري بيعه من آخر ولا رهنه، وسقط الدين بهلاكه فهو مركب من العقود الثلاثة كالزرافة فيها صفة البعير والبقر والتمر جوز لحاجة الناس اليه بشرط سلامة البدلين لصاحبها، قال في البحر وينبغي أن لا يعدل في الافتاء عن القول الجامع. وفي النهر والعمل في ديارنا على ما رجحه الزيلعي. (رد المحتار، باب الصرف ج: ۴ ص: ۳۲۲) - (۱) ازیں معلوم شد کہ در بیع وفا مشتری راجع بیع ورهن ووقف وغیرہ نزد کسے حاصل نیست اختلاف فقط دریں صورت است کہ آیا اور راجع انتفاع حاصل است یا نہ کسانیکہ وایں عقد را رهن گویند انتفاع مشتری را جائز قرار نمی دهند، وکسانیکہ ایں عقد را بیع گویند انتفاعش را نیز جائز گویند اما بیع ووقف وغیرہ نزد کسے جائز نیست، (۲) پس دریں صورت مسئلہ وقفے کہ عمر و کرده است، درست نہ شد، واکنون برو لازم است کہ رقم از زید وصول کردہ زمین بدو واپس کند ودر حکم بیع اختلاف نیست زیرا کہ اگر ایں عقد موافق قول بعض فقہاء رهن است پس وقت ادائیگی رقم بر عمر و لازم بود زمین واپس دہد، و اگر ایں بر قول بعض فقہاء بیع است، ایں انرا واپس گردانیدن نزد ایشان ہم ضروری است۔

واللہ اعلم

محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۷/۲/۱۶ھ

الجواب صواب

محمد عاشق الہی بلند شہری

(فتویٰ نمبر ۱۳۲۸/۱۸ الف)

(۱) شامی ج: ۵ ص: ۲۷۶ (طبع سعید) وکذا فی البحر الرائق ج: ۶ ص: ۸ (طبع سعید) وتبيين الحقائق ج: ۵ ص: ۱۸۳.

(۲) کیونکہ شیء مرہون سے فائدہ اٹھانا جائز نہیں۔

كما في البحر الرائق ج: ۸ ص: ۲۳۸ (طبع سعید) ولا ينتفع المرتهن استخدامًا وسكني ولبسًا واجارة واعارة لأن الرهن يقتضي الحبس الى ان يستوفي دينه دون الانتفاع.

وفي ملتقى الأبحر مع مجمع الأنهر ج: ۴ ص: ۲۷۳ (طبع مكتبة غفاريه كوثه) وليس للمرتهن الانتفاع بالرهن ولا اجارته ولا اعارته.

وفي رد المحتار ج: ۶ ص: ۴۸۲ (طبع سعید) لا يحل له أن ينتفع بشئ منه بوجه من الوجوه وان أذن له الراهن لأنه اذن له في الربا.... الخ.

(۳) فتویٰ میں موجود حوالہ ملاحظہ ہو۔

(مذکورہ فارسی سوال و جواب کا اردو ترجمہ)

”بیع بالوفا“ کا حکم

سوال:- زید نے حکومت سے ایک ہزار روپے بطور قرض لئے، اور (وقت مقررہ پر) حکومت نے اپنے

قرض کا مطالبہ کیا، لیکن زید کے پاس پیسے نہیں تھے، ہاں البتہ اس کی نو ایکڑ زمین..... (باقی اگلے صفحے پر)

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)..... حکومت کے پاس بطور رہن موجود تھی اس لئے حکومت نے کہا کہ اگر پیسے ادا نہیں کرو گے تو تمہاری اس زمین کو نیلام کر دیں گے۔ لہذا مجبور ہو کر زید نے اپنی وہ زمین عمرو کو ۱۲۵۰ روپے کے عوض بیچ دی، لیکن شرط یہ رکھی کہ جب بھی میں آپ کو یہ رقم ادا کروں گا تو اپنی زمین واپس لے لوں گا، اور عمرو نے یہ شرط قبول کر لی، لہذا زید نے عمرو کا نام نیلام میں لکھوا کر ۱۲۵۰ روپے حکومت کے حوالے کر دیئے اور عمرو زمین پر قابض ہو گیا۔ اب (پیسوں پر) قادر ہونے کے بعد زید، عمرو سے کہتا ہے کہ میں آپ کو آپ کے پیسے دیتا ہوں آپ مجھے میری زمین واپس کر دیں، تو عمرو (ادائیگی سے) انکار کرتا ہے کیونکہ اس زمین کو وہ وقف کر چکا ہوتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ ارض مرہونہ کو بیچنا جائز ہے یا نہیں؟ بر تقدیر جواز زید کو عمرو سے (یا عمرو کو زید سے) پیسے واپس لینا جائز ہے یا نہیں؟ اور اگر بیع اول جائز نہیں تو زید نے جو اپنی زمین نیلام کے وقت حکومت سے وکالتہ عمرو کے نام پر لے لی تھی اور عمرو کا نام نیلام میں لکھوا دیا تو یہ بیع عمرو کے حق میں نافذ ہوگی یا نہیں؟ اور عمرو کا ارض متنازع فیہا کو وقف کرنا جائز ہے یا نہیں؟

جواب:- مسئلہ مذکورہ میں زید اور عمرو کے درمیان جو عقد ہوا ہے، یہ بیع بالوفاء ہے، اور اس کے بارے میں اصل مذہب یہ ہے کہ یہ فاسد ہے، اکثر فقہائے کرام اس عقد (مسئلے) میں رہن کا حکم جاری کرتے ہیں، اور بیع کو فاسد قرار دیتے ہیں، جبکہ بعض فقہاء کے نزدیک یہ بیع صحیح ہے اور مشتری کو بھی اس سے نفع اٹھانا جائز ہے، لیکن یہ حق حاصل نہیں کہ آگے کسی اور کو بیچ دے۔ اور رد المحتار میں اس کے متعلق کئی اقوال نقل کئے ہیں، لیکن جو قول جامع ہے اس کو بایں طور ذکر کرتے ہیں: قوله (وقیل بیع یفید الانتفاع به) هذا محتمل لأحد القولین: الأول: أنه بیع صحیح مفید لبعض أحكامه من حل الانتفاع به إلا أنه لا یملک بیعه، قال الزیلعی فی الاکراه وعلیه الفتوی. الثانی: القول الجامع لبعض المحققین أنه فاسد فی حق بعض الأحکام حتی ملک کل منهما الفسخ، صحیح فی حق بعض الأحکام کحل الانزال ومنافع البیع، ورهن فی حق البعض حتی لم یملک المشتري بیعه من آخر ولا رهنه، وسقط الذین بهلاکہ فهو مرکب من العقود الثلاثة کالزرافة فیها صفة البعیر والبقر والنمر جوز لحاجة الناس الیه بشرط سلامة البدلین لصاحبها، قال فی البحر ینبغی أن لا یعدل فی الافتاء عن القول الجامع. وفی النهر والعمل فی دیارنا علی ما رجحه الزیلعی. (رد المحتار، باب الصرف ج: ۴ ص: ۳۲۲). (شامی ج: ۵ ص: ۲۷۶ طبع سعید والبحر الرائق ج: ۶ ص: ۸ وتبیین الحقائق ج: ۵ ص: ۱۸۳)۔ اس ساری بحث سے یہ بات معلوم ہوگئی کہ بیع وفا میں مشتری کو بیع، رہن، وقف وغیرہ میں سے کسی کا بھی اختیار نہیں، اختلاف صرف اس صورت میں ہے کہ مشتری کو فائدہ اٹھانے کا حق حاصل ہے یا نہیں؟ لہذا جن حضرات نے اسے عقد رہن قرار دیا ہے، ان کے نزدیک تو مشتری کا فائدہ اٹھانا بھی ناجائز ہے، اور جن حضرات نے اسے عقد بیع قرار دیا ہے، ان کے نزدیک مشتری کا انتفاع جائز ہے، لیکن آگے کسی اور کو بیچنا یا وقف وغیرہ کرنا کسی کے نزدیک بھی جائز نہیں، لہذا مذکورہ مسئلے میں عمرو کا آگے وقف کرنا ناجائز ہے، اور اس پر لازم ہے کہ فی الفور زید سے رقم لے کر اس کی زمین اس کو واپس کر دے، اور اس حکم میں کسی کا بھی اختلاف نہیں کیونکہ اس عقد کو اگر ہم رہن قرار دیں ان فقہاء کے قول کے مطابق جو اس کو رہن کہتے ہیں، تب بھی زید کے رقم کی ادائیگی کے وقت عمرو پر لازم ہے کہ وہ زمین اس کو واپس کرے، اور اگر اس عقد کو ہم بیع قرار دیں ان فقہاء کے قول کے مطابق جو اس کو بیع کہتے ہیں، تو ان کے نزدیک بھی اس کا واپس کرنا واجب ہے۔ واللہ اعلم

”أحسن الفتاویٰ“ میں بیع الثمار قبل بدو الصّلاح کی صورت میں اسے بیع الأزهار مان کر جواز کا قول اختیار کرنے کا حکم

سوال :- بیع الثمار قبل الظهور کے سلسلے میں ”تکملة فتح الملہم“ ج: ۱ ص: ۳۸۳ تا ۴۰۰ اور کاپی درسِ ترمذی ج: ۴ میں جو تفصیلی اور محققانہ بحث مذکور ہے اس کی رُو سے بیع الثمار قبل الظهور کسی طرح جائز نہیں سواءً جرى به التعامل أو لا، اور بعض شرائط نہ پائی جانے کی وجہ سے اس کو بیعِ سلم میں بھی داخل کر کے جائز نہیں کہا جاسکتا۔ لیکن اس کے برعکس اس صورت کو مذہبِ مالک کی رُو سے احسن الفتاویٰ ج: ۶ ص: ۴۸۶ تا ۴۹۲ میں بیعِ سلم میں داخل مان کر جواز کا فتویٰ دیا گیا ہے کیونکہ مذہبِ مالک میں بعض شرائط ضروری نہیں بلکہ احسن الفتاویٰ میں تو حنفی مذہب کی رُو سے قبل بدو الصّلاح یعنی صرف ازہار کی صورت میں بیع الأزهار مان کر جواز کو اختیار کیا گیا ہے کہ ازہار بعض جہات سے قابلِ انتفاع ہے۔

۱:- اب عرض یہ ہے کہ مالکی مذہب کی رُو سے جو فتویٰ ”أحسن الفتاویٰ“ میں مذکور ہے آنجناب کی رائے میں وہ صحیح اور موجبہ ہے یا نہیں کہ عمومِ بلوئی کے وقت مالکی مذہب کی طرف رُجوع کیا جائے۔
۲:- اور بیع الأزهار کی تاویل قبل بدو الاثر کے بارے میں آنجناب کی رائے کیا ہے؟

جواب :- احقر نے اس مسئلے میں ”أحسن الفتاویٰ“ کی مراجعت کی، اس میں امام مالک رحمہ اللہ کا مسلک اس حد تک مفید ہو سکتا ہے کہ ثمن تین دن کے اندر اندر ادا کر دیا جائے، یا بلا شرط اس سے زیادہ تاخیر ہو، لیکن جہاں تک مقدارِ ثمر کی جہالت کا تعلق ہے اُس کے ساتھ تو عقدِ سلم کسی کے نزدیک جائز نہیں، اور نصِ صریح: ”فليسلم في كيل معلوم أو وزن معلوم“^(۱) میں بھی علم مقدار و أجل شرط ہے، ”أحسن الفتاویٰ“ میں اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ جہالتِ مفضی الی النزاع نہیں، اس لئے قابلِ تحمل ہے، لیکن مقدارِ بیع کی جہالت کو تراضی طرفین کی وجہ سے قابلِ تحمل قرار دینا سخت محلِ نظر معلوم

(۱) ج: ۶ ص: ۴۸۷ تا ۴۹۰ (طبع سعید)۔

(۲) فی جامع الترمذی کتاب البیوع ج: ۱ ص: ۲۴۵ (طبع سعید) عن ابن عباس رضی اللہ عنہما قال: قدم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم المدينة وهم یسلفون فی الثمر فقال: من أسلف فليسلف فی كيل معلوم ووزن معلوم الی أجل معلوم. وفي الدر المختار ج: ۵ ص: ۲۱۴ (طبع سعید) وشرطه بیان جنس ونوع وصفة وقدر وأجل وأقله شهر.... الخ، وهكذا فی البحر الرائق ج: ۶ ص: ۱۶۰۔

وفی المجلد ج: ۲ ص: ۳۹۲ رقم المادّة: ۳۸۶ یشرط لصحة السلم بین جنس المبیع مثلاً أنه حنطة.... وبيان مقدار الثمن والمبیع.... الخ. (وكذا فی عامة كتب الحديث والفقه)۔

حکیم الأمت حضرت مولانا محمد اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے خاص اس صورت (بیع قبل الأزهار کو سلم میں شامل کرنے) سے متعلق ابعاد الفتاویٰ ج: ۳ ص: ۱۰۵ میں یہ فتویٰ تحریر فرمایا ہے:-
(باقی اگلے صفحے پر)

ہوتا ہے کیونکہ جن عقود میں غرر شدید ہو، وہ تراخی طرفین سے بھی جائز نہیں ہوتے، شریعت متعاقدین میں سے ہر ایک کے جائز مفاد کا تحفظ کرتی ہے، خواہ وہ خود اپنے مفاد سے دست بردار ہو گیا ہو۔ لہذا ابھی تک احقر کو اس بات پر اطمینان نہیں ہوا کہ یہ امر مقدار بیع کے تعین کی منصوص شرط چھوڑنے کے لئے کافی ہے، اور علامہ شامیؒ نے اس کو سلم قرار نہیں دیا، بلکہ ضرورت کی نظیر کے طور پر سلم کو ذکر فرمایا ہے،^(۱) البتہ جب ازہار کا ظہور ہو گیا ہو تو ازہار کی بیع (من حیث الازہار) کی واقعی گنجائش معلوم ہوتی ہے اور اس کا ذکر ”تکملة فتح الملهم“ میں بھی کیا گیا ہے، اور خود فقہائے حنفیہ صاحب ہدایہ وغیرہ نے اس کی تصریح فرمائی ہے۔ رہا شرط ترک کا معاملہ تو وہ بھی متعارف ہونے کی بناء پر جائز قرار دینے کی گنجائش موجود ہے، مگر ظہور ازہار سے پہلے اس کو سلم قرار دے کر جائز کہنے پر ابھی تک اطمینان نہیں ہوا، ولعلّ الله يحدث بعد ذلك أمراً۔

واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم

۱۴۲۰/۲/۲۵ھ

(فتویٰ نمبر ۱۳/۳۶۵)

شرکۃ خلیجیہ اور مجموعۃ سعودی بن لادن کے درمیان مشروع حرمین سے متعلق عقدِ استصناع کا مسئلہ

سوال:- نرسل الیک عقدًا ترید شرکۃ خلیجیہ أن تدخل فیہ مع شرکۃ سعودی بن لادن لانجاز مشروع الحرمین، بحیث تطلب شرکۃ سعودی بن لادن صناعة هذا المشروع من شرکۃ خلیجیہ علی أساس الاستصناع، ثم ان الشرکۃ الخلیجیہ تعقد استصناعاً موازياً مع شرکۃ محمد بن لادن، فهل هذا العقد صحیح شرعاً؟
عصام الطواری

(ابقہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)..... ”خود ضرورت عامہ دلیل مستقل نہیں جب تک کسی کلیہ شرعیہ میں وہ صورت داخل نہ ہو، جیسا عبارات مذکورہ سوال میں صرف ضرورت کو جواز کے لئے کافی نہیں سمجھا گیا بلکہ ضرورت کو داعی قرار دیا کسی کلیہ میں داخل کرنے کا مثل الحاق بالسلم وغیرہ کے، اور بیع قبل ظہور الثمار میں یہ الحاق ہو نہیں سکتا، اسی طرح کوئی دوسرا کلیہ بھی نہیں چلتا، فلا یقاس احدهما علی الآخر، اور سلم میں اس کا داخل نہ ہونا ظاہر ہے، کیونکہ اگر اشتراط وجود مسلم فیہ من وقت العقد الی حلول الأجل سے قطع نظر کر کے شافعی کا مذہب بھی لے لیا جائے کہ ان کے نزدیک صرف وجود وقت الحلول کافی ہے، تب بھی یہ اس لئے سلم نہیں کہ اولاً مقدار ثمار کی متعین نہیں، ثانیاً کوئی اجل معین نہیں، ثالثاً اجل پر مشتری بائع سے مطالبہ نہیں کرتا، بلکہ بائع اول ہی سے اشجار کو مشتری کے سپرد کر دیتا ہے اور وہ اسی وقت سے اس پر قابض ہو جاتا ہے، پھر خواہ شمر قلیل ہو یا کثیر ہو، اور خواہ نہ ہو، رابعاً اکثر ثمار عددی متقارب یا وزنی متمثل نہیں، خامساً اکثر پورا ثمن پیشگی یک مشت بھی تسلیم نہیں کیا جاتا، غرض یہ سلم کسی طرح نہیں ہو سکتا۔“

(۱) دیکھئے رد المحتار علی الدر المختار ج: ۳ ص: ۵۵۶ (طبع سعید)۔

جواب:- الى الأخ العزيز السيد عصام الطوارى حفظه الله

السلام عليكم ورحمة الله وبركاته، وبعد:

فقد تسلمت الأوراق المتعلقة بمشروع الحرمين وطالعت في ضوءها العقود المرسلة من قبل، فوجدت أن هذا العقد في صورته الموجودة غير مقبول شرعاً، والأسباب الأساسية لهذا الحكم هي كالتالى:-

١- المفروض فى صيغة الاستصناع أن يكون هناك عقد استصناع بين شركة الخليج وبين مجموعة سعودى بن لادن، فيكون سعودى بن لادن هو المستصنع، وشركة الخليج هى الصانعة، ثم اذا شاءت شركة الخليجية فانها تعقد الاستصناع بينها وبين محمد بن لادن بصفة كونه صانعاً، وينبغى أن يكون هذا العقد منفصلاً كل الانفصال عن العقد الأول، ولكن العقد المقترح بين الشركة الخليجية وبين سعودى بن لادن يوضح أنه قد وقع هناك عقد مسبق للمقاوله بين سعودى بن لادن ومحمد بن لادن، وان هذا العقد هو المشار اليه فى بند التعريفات وفى عدة مواضع أخرى من العقد بما يدل بأن العقد حقيقةً انما وقع بين سعودى بن لادن ومحمد بن لادن، وان دخول الشركة الخليجية فى هذا العقد ليس إلا حيلة مصطنعة للتمويل فقط.

٢- ان كانت الشركة الخليجية هى الصانعة الحقيقية بازاء سعودى بن لادن، فينبغى أن تتحمل جميع المسئوليات لتسليم المشروع بجميع صفاته المطلوبة الى سعودى بن لادن، ولكن فى بند (3.2) فقرة B الى F من عقد الشركة مع السعودى بن لادن، قد صرحت الشركة بأنها لا تقبل أية مسئولية تجاه المستصنع فى هذا الصدد، ان هذا البند يجعل الاستصناع فاسداً لا يمكن أن يقبل من الناحية الشرعية.

٣- ان تسليم المشروع الى سعودى بن لادن قد جعل العقد متوقفاً على تسليم محمد بن لادن، للمشروع الى الشركة الخليجية، وذلك بحكم فقرة (4.1) وهذا أيضاً غير جائز شرعاً، لأن عقد الشركة الخليجية مع سعودى بن لادن يجب أن يكون منفصلاً تماماً عن العقد مع محمد بن لادن، كما ذكرت سابقاً.

هذه هى النكات الأساسية المخالف لأحكام الشرع، وهناك بنود فرعية أيضاً

تحتاج الى تعديل لا يمكن ذكرها بالمكاتبة، ويمكن أن تناقش فى الجلسة.

وانتظرت هاتفکم و حیث لم یتصل فانی أرسل رأیی عن طریق الفاکس .

والسلام علیکم ورحمة اللہ وبرکاتہ

محمد تقی عثمانی

ماہنامہ ”البلاغ“ کے قارئین کا پیشگی ماہانہ رقم کی ادائیگی کا معاملہ ”بیع استجرار“ میں شامل ہونے کی وضاحت

سوال :- بندہ ”البلاغ“ کا قاری ہے اور اس سلسلے میں بندے کو آنجناب سے ایک ترڈ اور خلیجان دُور کرنا مقصود ہے، اور وہ یہ کہ ”البلاغ“ کی جانب سے ذی الحجہ میں اگلے سال کے چندے کا مطالبہ کیا گیا ہے۔ حالانکہ ”البلاغ“ کے قارئین میں وہ حضرات بھی ہیں جو درمیان سال رسالے کے خریدار بنے ہیں اور اب تک ان کی خریداری کی مدت بھی پوری نہیں ہوئی، تو کیا ایسی صورت میں ماہ ذی الحجہ میں ان قارئین سے خریداری کی مدت پوری ہونے سے پہلے اگلے سال کے چندے کا مطالبہ شرعاً درست ہے؟ اسی طرح جب کسی قاری کا ”البلاغ“ سے سال بھر کا معاہدہ طے شدہ رقم میں ہو چکا ہے تو درمیان سال (مدت خریداری پوری ہونے سے پہلے) کاغذ وغیرہ کی گرانی کی صورت میں ”البلاغ“ کا ان قارئین سے مزید چندے کا مطالبہ درست ہے؟ نیز فقہی اعتبار سے یہ معاملہ کہ رقم شروع میں جمع کرادی جائے، پھر ماہانہ رسالہ لیا جائے، کس زمرے میں شامل ہوگا؟

جواب :- محترمی و مکرمی! السلام علیکم ورحمة اللہ وبرکاتہ،

گرامی نامہ باعث مسرت ہوا، آپ نے جس دینی مسئلے کی طرف توجہ دلائی اس پر آپ کا شکر گزار ہوں۔ ”البلاغ“ میں چندے کے اضافے کا مطالبہ انہی خریداروں سے کیا گیا ہے جن کی مدت خریداری ذوالحجہ ۱۴۰۹ھ پر ختم ہو رہی ہے۔ اور ہمارے یہاں خریداروں کی بھاری اکثریت وہی ہے۔ جو خریدار دوران سال بنتے ہیں، انہیں بھی محرم سے شمارے بھیج دیئے جاتے ہیں، اس کے باوجود جو حضرات یہ منظور نہ کریں، اور اثنائے سال سے خریداری شروع کریں، ان کی تعداد زیادہ نہیں ہے، اور ان سے زیادہ پیسے بھیجنے کا مطالبہ بھی نہیں کیا گیا، ان کی خریداری ختم ہونے تک انہیں کسی اضافی رقم کے بغیر رسالہ جاتا رہے گا، ان شاء اللہ۔

لیکن جہاں تک فقہی مسئلے کا تعلق ہے، اس کی رو سے کاغذ وغیرہ کی شدید گرانی کی صورت میں خریداروں سے درمیان سال بھی مطالبہ کرنے کا شرعاً حق حاصل ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ خریداروں کے

ساتھ ”البلاغ“ کا معاملہ فقہی اعتبار سے ”بیع استجرار“^(۱) کی تعریف میں آتا ہے، شرعاً جب تک کوئی چیز وجود میں نہ آجائے اس کی بیع نہیں ہو سکتی،^(۲) لہذا پیشگی چندہ ”البلاغ“ کے پاس بطور امانت ہے، (اس امانت میں چونکہ مالک نے استعمال کی اجازت دے دی ہے اس لئے وہ فقہی اعتبار سے قرض مضمون بن گیا ہے)^(۳) جب کوئی رسالہ شائع ہو جاتا ہے اس وقت بحصہ رسدی بیع ہوتی ہے^(۴) یہ امانت

(۱ و ۳ و ۴) وفي مؤطا الامام مالک كتاب البيوع باب جامع بيع الطعام ص: ۵۹۰ (طبع مير محمد كتب خانہ) ولا بأس بأن يضع الرجل عند الرجل درهما ثم يأخذ منه بثلث أو برقع أو بكسر معلوم سلعة معلومة.... الخ. وفي الدر المختار ج: ۴ ص: ۵۱۶ (طبع سعيد) ما يستجره الانسان من البياع اذا حاسبه على اثمانها بعد استهلاكها جاز استحسانا. وفي الشامية تحت قوله (ما يستجره الانسان.... الخ) ذكر في البحر أن من شرائط المعقود عليه أن يكون موجودا فلم ينعقد بيع المعدوم ثم قال ومما تسامحوا فيه وأخرجوه عن هذه القاعدة ما في القنية الأشياء التي تؤخذ من البياع على وجه الخرج كما هو العادة من غير بيع كالعدس والملح والزيت ونحوها ثم اشتراها بعد ما انعدمت صح فيجوز بيع المعدوم هنا..... وخرجها في النهر على كون المأخوذ من العدس ونحوه بيعا بالتعاطي وأنه لا يحتاج في مثله الى بيان الثمن لأنه معلوم لكنه على هذا لا يكون من بيع المعدوم بل كلما أخذ شيئا انعقد بيعا بثمنه المعلوم..... قلت ووجهه أن ثمن الخبز معلوم فاذا انعقد بيعا بالتعاطي وقت الأخذ مع دفع الثمن قبله فكذا اذا تأخر دفع الثمن بالأولى وهذا ظاهر فيما كان ثمنه معلوما وقت الأخذ مثل الخبز واللحم أما اذا كان ثمنه مجهولا فإنه وقت الأخذ لا ينعقد بيعا بالتعاطي لجهالة الثمن فاذا تصرف فيه الأخذ وقد دفعه البياع برضاه بالدفع وبالتصرف فيه على وجه التعويض عنه لم ينعقد بيعا وان كان على نية البيع لما علمت من ان البيع لا ينعقد بالنية فيكون شبهه القرض المضمون بمثله أو بقيمته فاذا توافقا على شيء بدل المثل أو القيمة برئت ذمة الأخذ.... الخ. (شامية ج: ۴ ص: ۵۱۶) وراجع أيضا الى الشامية تحت ”مطلب في بيع الاستجرار“ (ج: ۴ ص: ۵۱۷).

وفي البحر الرائق كتاب البيع ج: ۵ ص: ۴۳۴ (طبع رشيدية كوئته) ومما تسامحوا فيه وأخرجوه عن هذه القاعدة ما في القنية الأشياء التي تؤخذ من البياع على وجه الخرج كما هو العادة من غير بيع كالعدس والملح والزيت ونحوها ثم اشتراها بعد ما انعدمت صح فيجوز بيع المعدوم هنا.

وفي شرح المجلة (سليم رستم باز) رقم المادة: ۱۷۵ ص: ۸۰ (طبع مكتبة حنفية كوئته) ويصح أيضا ولو كان الاعطاء من أحد الجانبين فقط وبه يفتى وصورته أن يتفقا على الثمن ثم يأخذ المشتري المبتاع ويذهب برضا صاحبه من غير أن يدفع الثمن أو أن يدفع المشتري الثمن للبائع ويذهب بدون قبض المبيع فان البيع لازم على الصحيح. وكذا في شرح المجلة للخالد الأناسي رقم المادة: ۱۷۵ ج: ۲ ص: ۳۶ (طبع حقانيه پشاور).

وفي بحوث في قضايا فقهية معاصرة البيع بالتعاطي والاستجرار ص: ۶۷ والذي يظهر لي أن هذا المبلغ دفعة تحت الحساب وهي وان كانت قرضا في الاصطلاح الفقهي من حيث انه يجوز للمدفع له أن يصرفها في حوائج نفسه من حيث كونها مضمونة عليه ولكنها قرض يجوز فيه شرط البيع اللاحق لكونه شرطا متعارفا فان الدفعات تحت الحساب لا يقصد بها الاقراض وإنما يقصد بها تفريغ ذمة المشتري عن أداء الثمن عند البيع اللاحق وان يتيسر له شراء الحاجات دون أن يتكلف نقد الثمن في كل مرة فهذا فرض تعورف فيه شرط البيع والشرط كلما كان متعارفاً فإنه يجوز عند الحنفية وان كان مخالفاً لمقتضى العقد كما في شراء النعل بشرط أن يحذوه البائع.

نیز حضرت والا دامت برکاتہم نے ”فقه المعاملات“ سے متعلق اپنی ایک اہم غیر مطبوعہ کتاب میں مذکورہ مسئلے سے متعلق تحریر فرمایا: ”.... ويتفرع عليه حكم الاشتراك في الصحف والمجلات الدورية فان العادة في عصرنا أن الناس يدفعون بدل الاشتراك السنوي في بداية كل سنة الى ناشر المجلة وأنهم يعثون اليهم نشرة من المجلة في كل شهر أو في كل أسبوع وهذا استجرار بثمن مقدم ويقع بيع كل عدد من المجلة عند ما تصل المجلة الى المشتري فلو انقطعت المجلة في أثناء السنة لزم على ناشرها أن يرد ما بقي من بدل الاشتراك.“ نیز دیکھئے امداد الفتاویٰ ج: ۳ ص: ۱۳۲۔ (محمد زبیر)

(۲) وفي مسند أحمد ج: ۱۲ ص: ۱۳۰ رقم الحديث: ۱۵۲۵۳ عن حكيم بن حزام رضى الله عنه قال: قلت يا رسول الله انى اشترى بيوغا فما يحل لي منها وما يحرم على؟ قال: فاذا اشتريت بيعا فلا تبعه حتى يقبضه. وكذا في سنن البيهقي ج: ۵ ص: ۳۱۳، وراجع أيضا الى جامع الترمذى ابواب البيوع ج: ۱ ص: ۲۳۳ (طبع سعيد). وفي الهداية ج: ۳ ص: ۷۸ (طبع مكتبة رحمانية) ومن اشترى شيئا مما ينقل ويحول لم يجز له بيعه حتى يقبضه لأنه نهى عن بيع ما لم يقبض.

وكذا في شرح المجلة ج: ۲ ص: ۱۷۳ وتكملة فتح الملهم ج: ۱ ص: ۳۵۱ وشرح مجلة الأحكام للعلامة سليم باز، رقم المادة: ۳۵۳ ج: ۱ ص: ۱۲۸.

اس لئے رکھی ہوتی ہے کہ ہر ماہ اس میں سے رقم لے کر رسالہ خریدار کو بھیج دیا جائے۔ اور پچاس روپے میں بارہ رسالے دینا ایک وعدہ ہے، جس کا حکم یہ ہے کہ اگر کوئی ناگزیر عذر پیش آجائے تو خریدار کو اس عذر سے آگاہ کر کے اس وعدے کو فسخ کیا جاسکتا ہے^(۱)، ایسی صورت میں اگر خریدار اضافی رقم دینے پر آمادہ ہو تو خیر ورنہ معاملہ فسخ ہو جائے گا، اور اس کی جتنی رقم اپنے پاس باقی ہے وہ واپس کرنی ہوگی۔

والسلام

۱۳۱۰/۱/۳۰ھ

(فتویٰ نمبر ۱۹۱/۳۱ الف)



(۱) ”وعدہ“ کی حیثیت اور حکم نیز عذر کی صورت میں استثناء کی گنجائش سے متعلق حضرت والا دامت برکاتہم نے اپنی زیر تحریر غیر مطبوعہ کتاب میں تفسیر، حدیث اور ائمہ اربعہ کی کتب کے حوالے سے تفصیلی بحث فرمانے کے بعد فرمایا:-
فہذہ الآیات والأحادیث بمجموعہا لا تدع مجالاً للشک فی أن الوفاء بالوعد واجب واخلافہ اثم ألا إذا کان بعذر مقبول.... وبعد أسطر.... فالذی یتخلص من القرآن والسنة أن الوعد إذا کان جاذماً یجب الوفاء به دیانة ویأثم الإنسان بالاخلاف فیہ ألا إذا کان لعذر مقبول وجاء فی مجلة مجمع الفقه الاسلامی قرار رقم: ۲ و ۳ العدد الخامس ۱۵۹۹:۲ الوعد یکون ملزماً للواعد دیانة ألا لعذر.... الخ. (محمد زبیر)

﴿فصل فی البیع بالتقسیت﴾

(قسطوں پر خرید و فروخت کا بیان)

نقد کے مقابلے میں ادھار مہنگے داموں فروخت کرنے کا حکم

سوال:- کچھ بیج ایک آدمی دوسرے آدمی کو بیچتا ہے لیکن اُس وقت اُس آلو کے بیج کی قیمت ساٹھ روپے فی من تھی، اور یہ آدمی کہتا ہے کہ آپ لے لیں، جب آپ کی فصل تیار ہوگی اُس وقت قیمت سو روپے فی من ہوگی، اب میں سستا نہیں بیچتا، آیا شریعت میں یہ جائز ہے یا نہیں؟ بعض لوگ اس کو سود کہتے ہیں، اس پر اکثر یہاں جنگ و جدل ہو جاتا ہے، یعنی اگر اب یہ بیج لیتے ہو تو ساٹھ روپے میں لے لو، ورنہ کچھ دنوں کے بعد سو روپے فی من دو گے۔

جواب:- اگر بیج فروخت کرنے والا یہ کہے کہ ”قیمت نقد ادا کرو تو بیج کی قیمت ساٹھ روپے فی من ہوگی، اور ادھار خریدو تو سو روپیہ ہوگی“ اور پھر یہ طے ہو جائے کہ خریدنے والا ادھار خرید رہا ہے تو یہ بیج جائز ہے،^(۱) اس میں سود نہیں ہے۔

واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم

۱۳۹۸/۶/۲۲ھ

(فتویٰ نمبر ۶۷۳/۲۹ ب)

(۱) وفي جامع الترمذی نہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن بیعتین فی بیعة، وقال الترمذی: وقد فسّر بعض أهل العلم قالوا: بیعتین فی بیعة أن يقول: أبيعك هذا الثوب بنقدٍ عشرة وبنسنة بعشرين ولا يفارقه على أحد البعین فاذا فارقہ على أحدهما فلا بأس اذا كانت العقدۃ على أحد منهما. (الترمذی کتاب البیوع باب ما جاء فی النهی عن بیعتین فی بیعة ج: ۱ ص: ۲۳۳ طبع سعید).

وفي المبسوط للسرخسی ج: ۱۳ ص: ۸ و ۹ (طبع غفاریہ کوئٹہ) واذا عقد العقد على أنه الى أجل كذا بكذا وبالنقد كذا أو قال الى شهرين بكذا فهو فاسدٌ..... وهذا اذا افرقا على هذا فان كان يتراضيان بينهما ولم يتفرقا حتى قاطعه على ثمن معلوم وإنما العقد عليه فهو جائز.... الخ.

وفي رد المحتار ج: ۵ ص: ۱۲۲ ويزاد في الثمن لأجله اذا ذكر الأجل بمقابلة زيادة الثمن.... الخ. وكذا في فتح القدير ج: ۶ ص: ۲۶۲ (طبع مصطفى بابی مصر).

وفي الهداية ج: ۳ ص: ۷۸ (طبع مكتبه رحمانیہ) لأنّ للأجل شبهة بالمبيع ألا يرى أنه يزاد في الثمن لأجل الأجل.

وفيها أيضًا ج: ۳ ص: ۲۱ (طبع رحمانیہ) ويجوز البيع بثمن حال وموَجَّل اذا كان الأجل معلومًا.

وفي البحر الرائق ج: ۶ ص: ۱۱۲ لأنّ للأجل الا ترى أنه يزاد في الثمن لأجل الأجل.

وفي المجلة رقم المادّة: ۲۳۵ البيع مع تأجيل الثمن وتقسيطه صحيح.

وفي بحوث في قضايا فقهية معاصرة ص: ۷ أما الأئمة الأربعة وجمهور الفقهاء والمحدثين فقد أجازوا البيع المؤجل بأكثر من سعر النقد بشرط أن يبتّ العاقدان بأنّه بيع مؤجل بأجل معلوم بثمن متفق عليه عند العقد.

قسطوں کی خرید و فروخت کی شرعی حیثیت اور اُدھار کی وجہ سے قیمت میں اضافے کا حکم

سوال :- (خلاصہ سوال) ہمارا علاقہ سیم زدہ ہے، موسم گرما میں سیم کا پانی تین فٹ زمین کی سطح پر رہتا ہے، سردیوں میں جب پانی خشک ہو جاتا ہے تو اس پر ایسی گھاس ہوتی ہے جو بیلوں کے ذریعے ہل چلانے سے نہیں اکھڑتی، جس کے لئے ہمیں ٹریکٹر لانا پڑتا ہے، وہ دس روپیہ فی گھنٹہ سے کم ملتا نہیں، اور اس کے حصول کے لئے بینک کی طرف رُجوع کرنا پڑتا ہے، اس طرح بینک کے ذریعے سے پندرہ ہزار کا ٹریکٹر مل جاتا ہے، اس کی اقساط اور نفع ادا کرنے پر اٹھارہ ہزار روپے ادا کرنے پڑتے ہیں، مذکورہ اقساط سات سال کی مدت میں ادا کرنی پڑتی ہیں، اب اگر نقدی پر یہ ٹریکٹر خریدا جائے تب بھی اٹھارہ ہزار روپے میں خریدا جاسکتا ہے، اب نقدی سے تو ہم مجبور ہیں، اب اقساط پر ہم ٹریکٹر حاصل کر سکتے ہیں؟

جواب :- صورتِ مسئلہ میں اگر اور وجہ معاملے کے ناجائز ہونے کی نہ ہو تو ٹریکٹر کو قسطوں پر خریدنا جائز ہے، اور اُدھار کی وجہ سے اصل قیمت پر کچھ اضافہ کر دینا فقہاء کی تصریح کے مطابق معاملے کو ناجائز نہیں بناتا،^(۱) بشرطیکہ مجلسِ عقد میں قیمت کا نقد یا اُدھار ہونا معین ہو گیا ہو، لہذا معاملے کی جو صورت سوال میں ذکر کی گئی ہے وہ جائز ہے، بشرطیکہ اس معاملے میں کوئی اور شرطِ فاسد نہ لگائی جائے۔

واللہ اعلم بالصواب

۱۳۸۷/۱۲/۳ھ

(فتویٰ نمبر ۱۳۸۵/۱۸ الف)

نقد ایک لاکھ کا پلاٹ چوبیس ماہ کی اقساط پر سوال لاکھ میں خریدنے کا حکم

سوال :- اگر پلاٹ، مکان، دُکان کی نقد قیمت ایک ہو، اور اقساط پر اس سے زائد۔ مثلاً ایک پلاٹ نقد ایک لاکھ روپے میں اور ۲۴ ماہ کی اقساط پر سوال لاکھ روپے میں ملتا ہو تو کیا یہ پلاٹ اقساط پر خریدنا جائز ہے؟ یا ۲۵ ہزار روپے سود شمار کئے جائیں گے؟

جواب:- یہ اس شرط سے جائز ہے کہ جس وقت مکان وغیرہ کی خریداری عمل میں آئے اس وقت قیمت اور قسطیں کسی ابہام کے بغیر طے ہو جائیں^(۱)، اور پھر جو قیمت اس طرح طے ہوئی ہے خریدار سے ہر حال میں اسی کا مطالبہ ہو^(۲) ادائیگی میں تاخیر کی وجہ سے اس پر کوئی اضافہ نہ کیا جائے۔

واللہ اعلم

۱۴۰۹/۱۲/۲۹ھ

(فتویٰ نمبر ۶۲۳۷۶/۴۰ و)

گورنمنٹ سے قسطوں پر نیلام کی جانے والی زمین خریدنے کا حکم

سوال:- گورنمنٹ جو زمین نیلام کرتی ہے وہ رقم قسطوں میں بمع سود وصول کرتی ہے، یہ

خریدنا جائز ہے؟

جواب:- اگر حکومت یہ اعلان کرے کہ زمین اگر نقد روپے سے خریدی جائے تو اس کی

قیمت کم ہوگی اور اگر قسطوں پر ادھار خریدی جائے تو قیمت زیادہ ہوگی، تو یہ صورت جائز ہے،^(۳) لیکن اگر قسطوں کی صورت میں یہ کہے کہ قیمت تو وہی نقد کی ہے باقی سود لیا جائے گا، تو یہ صورت جائز نہیں۔

واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۸/۶/۵ھ

(فتویٰ نمبر ۶۷۷۷/۱۹ الف)

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع عفی عنہ

قسطوں پر گاڑی خریدنے کے بعد اس کی ٹوٹ پھوٹ کا

ذمہ دار خریدنے والا ہوگا

سوال:- زید ایک موٹر کار مبلغ پچاس ہزار میں لے کر ٹیکسی میں پاس کروا کر بکر کے ہاتھ مبلغ

ستر ہزار روپے میں قسط وار ادائیگی کی شرط پر فروخت کر دیتا ہے، اور ماہانہ دو ہزار روپے قسط ادا کرتا ہے۔ جس کے حوالے گاڑی کی ہے وہ تمام ٹوٹ پھوٹ اور دیگر مرمت کا ذمہ دار ہے، پوری قسط ہو جانے کے بعد زید گاڑی کے تمام مالکانہ حقوق بکر کو دے دیتا ہے، قسط کی ادائیگی کے درمیان گاڑی سے جو بھی نفع نقصان ہوگا بکر کا ہوگا، زید کا اُس سے کچھ تعلق نہیں۔ کیا یہ جائز ہے؟

جواب:- مذکورہ معاملہ اس شرط کے ساتھ جائز ہے کہ اس معاملے سے موٹر اس کی ملکیت

ہو جائے گی،^(۱) اور قبضہ کرنے کے بعد اس کی تمام ٹوٹ پھوٹ وغیرہ کا ذمہ دار وہ ہوگا، زید کو صرف قیمت یا اس کی قسطیں وصول کرنے کا حق باقی رہے گا۔ اور قسط پوری ہونے کے بعد مالکانہ حقوق بکر کو دینے کا مطلب بظاہر یہ ہے کہ اس وقت گاڑی بکر کے نام سرکاری کاغذات میں منتقل کر دی جائے گی، اس لئے اس شرط میں کچھ حرج نہیں۔

واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم

۱۳۹۷/۱۰/۵ھ

(فتویٰ نمبر ۱۰۲۰/۲۸ ج)

قسطوں پر خرید و فروخت کا حکم

سوال:- ایک شخص ”الف“ دوسرے شخص ”ب“ کو مال دلواتا ہے اور اس سے وہی مال فوراً بڑھتی میں خرید لیتا ہے اور پیسے کی ادائیگی روزانہ تھوڑی تھوڑی کرتا ہے یا روزانہ ایک مقررہ رقم ادا کرتا ہے اور وہ مال خود کسی بڑھتی میں بیچ دیتا ہے اور اس پیسے سے اور کام کرتا ہے جس میں نفع سے دوسرے فریق کا بالکل تعلق نہیں ہے تو کیا یہ طریقہ صحیح ہے؟

جواب:- ”مال دلوانے“ کا مطلب بظاہر یہ ہے کہ ”ب“ اس کی خریداری میں مدد کرتا ہے، اس صورت میں اگر ”الف“ نے ”ب“ سے جو مال خریدا ہے اس میں قیمت کی ادائیگی کی مدت اور اگر قسطیں مقرر کی گئی ہوں تو قسطوں کی مقدار اور میعاد سب طے کر لی ہیں، تو مذکورہ طریقہ جائز ہے، اور اس کے بعد ”الف“ جو مال آگے بیچ کر نفع کمائے گا وہ حلال ہوگا۔^(۲)

واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۷/۹/۱۳ھ

(فتویٰ نمبر ۹۵۱/۲۸ ج)

(۱) وفي رد المحتار كتاب البيوع ج: ۴ ص: ۵۰۶ (طبع سعيد) وحكمه ثبوت الملك أى فى البدلين لكل منهما فى بدل.... الخ.

وفى الهندية كتاب البيوع الباب الأول فى تعريف البيع وركنه.... الخ ج: ۳ ص: ۳ (طبع رشيدية كوثه) وأما حكمه فثبوت الملك فى المبيع للمشتري وفى الثمن للبائع اذا كان البيع باتاً.... الخ.

وفى شرح المجلة ج: ۲ ص: ۳۷۳ البيع النافذ يفيد الحكم فى الحال أى ثبوت الملك فى البدلين لكل منهما فى بدل وهذا هو الحكم الأصلى للبيع النافذ.... الخ. وفى شرح المجلة للأناسى ج: ۲ ص: ۳۵۷ رقم المادة: ۳۶۹ حكم البيع المنعقد الملكية يعنى صيرورة المشتري مالكا للمبيع والبائع مالكا للثمن.... الملكية تثبت بمجرد العقد اذا استجمع البيع شرائط الانعقاد والصحة وال لزوم النفاذ.... الخ.

وفى الهداية ج: ۳ ص: ۸ اذا حصل الايجاب والقبول لزم البيع ولا خيار لواحد منهما الا من عيب أو عدم رؤية.... الخ. وكذا فى الهندية ج: ۳ ص: ۸ (طبع بلوچستان بک ڈپو).

وفى البحر الرائق ج: ۵ ص: ۲۶۲ البيع يلزم بايجاب وقبول أى حكم البيع يلزم بهما. وفى شرح المجلة للأناسى ج: ۲ ص: ۱۶۶ رقم المادة: ۲۳۵ (طبع مكتبة حبيبيه كوثه) البيع مع تأجيل الثمن وتقسيطه صحيح. نیز قسطوں پر خرید و فروخت کے جواز سے متعلق حوالہ کے لئے ص: ۱۱۵ کا حاشیہ ملاحظہ فرمائیں۔

قسطوں پر خرید و فروخت اور اس کی شرائط

سوال:- زید بجلی کا پنکھا خریدنا چاہتا ہے، قسطوں کی صورت میں اس کو زیادہ رقم دینی پڑتی ہے اور اگر پوری رقم ایک دفعہ دی جائے تو کم رقم آتی ہے، کیا ایسی صورت میں قسطوں پر خریدنا جائز ہے؟

جواب:- صورتِ مسئلہ میں اگر اور کوئی وجہ بیع کے فاسد ہونے کی نہ ہو تو اس طرح قسطوں پر پنکھا خریدنا جائز ہے، کیونکہ ادھار کی صورت میں زیادہ قیمت کا لین دین فقہاء کی تصریح کے مطابق جائز ہے۔^(۱)

واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۷/۱۲/۱۲ھ

(فتویٰ نمبر ۹۶۸/۱۸ الف)

لیکن معاملہ اس طرح نہ کریں کہ قیمت مثلاً سو روپیہ اور سود اس پر پچیس روپے، بلکہ شروع سے ادھار کی وجہ سے ۱۲۵ قیمت مقرر کر لیں۔

محمد عاشق الہی عفی عنہ



(۱) فی الفتاویٰ الشامیة ج: ۵ ص: ۱۴۲ (طبع سعید) ویزاد فی الثمن لأجله اذا ذکر الأجل بمقابلة زیادة الثمن قصداً. وفي الهدایة ج: ۳ ص: ۷۸ (طبع مکتبہ رحمانیہ) لأن للأجل شبهة بالمبیع ألا یرى انه یزاد فی الثمن لأجل الأجل، کذا فی فتح القدیر ج: ۶ ص: ۲۶۲ کتاب البیوع. نیز مزید حوالہ جات کے لئے دیکھئے ص: ۱۱۵ کا حاشیہ۔

﴿فصل فی احکام المال الحرام والمخلوط﴾

(مخلوط اور حرام مال کے احکام)

مالِ حرام سے خریدی ہوئی چیز کا بعینہ صدقہ ضروری ہے یا
اس کے بقدر رقم؟

مالِ حرام سے خریدی ہوئی چیز کی موجودہ مالیت کا
صدقہ ضروری ہے یا صرف حرام رقم کا؟

مالِ حرام سے خریدی ہوئی چیز کو حلال کرنے کا طریقہ؟

سوال ۱:- حرام رقم سے خریدی ہوئی چیز کا بذاتِ خود تصدق بہتر ہے یا اس کے بقدر قیمت کا

تصدق بہتر ہے؟

جواب ۱:- اگر بعینہ حرام رقم سے خریدی گئی ہے تو بعینہ اس کا تصدق بہتر ہے، اور اگر حرام کو
حلال سے مخلوط کر کے خریدی گئی ہے تو اس چیز کا تصدق ضروری نہیں، رقم کا تصدق کافی ہے۔^(۱)

سوال ۲:- حرام رقم سے خریدی ہوئی چیز کو حلال کرنے کے لئے کیا موجودہ مالیت کے بقدر

تصدق لازم ہے یا فقط حرام رقم کے بقدر تصدق لازم ہے؟

جواب ۲:- اوپر کی صورتِ اولیٰ میں موجودہ مالیت کے بقدر،^(۲) ورنہ فقط حرام رقم کے بقدر۔^(۳)

(۱ و ۲) وفي رد المحتار كتاب البيوع باب المتفرقات مطلب اذا اكتسب حراماً ثم اشترى فهو على خمسة أوجه ج: ۵ ص: ۲۳۵ (طبع سعيد).

(قوله اكتسب حراماً) توضيح المسئلة ما في التتارخانية حيث قال رجل اكتسب مالاً من حرام ثم اشترى فهذا على خمسة أوجه أما ان دفع تلك الدراهم الى البائع أولاً ثم اشترى منه بها أو اشترى قبل الدفع بها ودفعها أو اشترى قبل الدفع بها ودفع غيرهما أو اشترى مطلقاً ودفع تلك الدراهم أو اشترى بدراهم آخر ودفع تلك الدراهم قال الكرخي في الوجه الأول والثاني لا يطيب وفي الثالث الأخيرة يطيب وقال أبو بكر لا يطيب في الكل لكن الفتوى الآن على قول الكرخي دفعا للخرج عن الناس اهـ.

وفي الهداية كتاب الغصب ج: ۳ ص: ۳۷۵ و ۳۷۶ (طبع رحمانيه) أما فيما لا يتعين كالشمنين فقوله في الكتاب "اشترى بها" إشارة الى أن التصدق إنما يجب اذا اشترى بها ونقد منها الشمن أما اذا أشار اليها ونقد من غيرها أو نقد منها وأشار الي غيرها أو أطلق إطلاقاً ونقد منها يطيب له وهكذا قال الكرخي لأن الإشارة اذا كانت لا تفيد التعيين، لا بد أن يتأكد بالنقد ليتحقق الخبث وقال مشائخنا رحمهم الله تعالى لا يطيب له قبل أن يضمن وكذا بعد الضمان بكل حال وهو المختار لإطلاق الجواب في الجامعين والمبسوط.

(حاشیہ نمبر ۲ و ۳ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں)

سوال ۳:- ایک شخص نے حرام رقم سے کوئی چیز خریدی، پھر وہ چیز کسی دوسرے کو فروخت کر دی، دوسرے کو خیال آیا کہ یہ چیز تو حرام رقم سے خریدی ہوئی تھی، تو اب اس کو حلال کس طرح کیا جائے؟ کیا حرام رقم کے بقدر بائع پر تصدق لازم ہے یا مشتری کا تصدق کرنا ہی کافی ہے؟ نیز مشتری کے تصدق کی صورت میں بائع کو بتانا ضروری ہے یا نہیں؟

محمد عامر، استاذ جامعۃ الرشید

جواب ۳:- اصل حکم یہ ہے کہ چیز لوٹا کر رقم واپس لے لے، اگر مجبوری ہو کہ بائع واپس نہ کرے تو بائع پر تصدق کا سوال ہی نہیں، کسی فقیر کو تصدق کر کے اس سے خرید لے (ثمن مثل پر)۔

واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم

۱۴۲۵/۱۲/۲۹ھ

مال مخلوط کا نفع حلال ہے یا حرام؟

(”ہدایہ“ اور ”فتح القدیر“ کی عبارات کی وضاحت)

سوال:- بخد مت شیخی و استاذی مدخکم۔

چند مسائل میں حضرت والا کی رائے معلوم کرنی ہے:-

۱:- وہ مال جو حلال و حرام سے مخلوط ہو اس سے جب کاروبار شروع کیا جائے تو منافع حلال ہے یا نہیں؟ ”فتح القدیر“ کی درج ذیل عبارت سے تو معلوم ہوتا ہے کہ مطلقاً حلال ہے چاہے حلال غالب ہو یا مغلوب۔ قال ابن الہمام رحمہ اللہ تعالیٰ: والخبث لفساد الملك دون الخبث لعدم الملك فيوجب شبهة الخبث فيما يوجب فيه عدم الملك حقيقة الخبث وهو ما يتعين

(حاشیہ نمبر ۲، متعلقہ صفحہ گزشتہ) (۲ و ۳ و ۱) وفي رد المحتار ج: ۲ ص: ۲۹۲ (طبع سعید) ان المراد ليس هو نفس الحرام لأنه ملكه بالخلط وإنما الحرام التصرف فيه قبل أداء بدله نعم لا يباح الانتفاع به قبل أداء البدل في صحيح من المذهب. وكذا في الطحطاوي على الدر المختار ج: ۳ ص: ۱۹۲.

وفی الہندیہ ج: ۵ ص: ۳۴۹ (طبع مکتبہ رشیدیہ) والسبیل فی المعاصی ردھا وذلك ههنا برد المأخوذ ان تمكن من ردّه بأن عرف صاحبه الخ. وفي رد المحتار على الدر المختار ج: ۵ ص: ۹۹ (طبع سعید) والحاصل أنه ان علم أرباب الأموال وجب ردّه عليهم وآلا فان علم عين الحرام لا يحل له ويتصدق به بنية صاحبه وبعد أسطر ومفاده الحرمة وان لم يعلم أربابه وينبغي تقييده بما اذا كان عين الحرام ليوافق ما نقلناه اذ لو اختلط بحيث لا يتميز يملكه ملكاً خبيثاً لكن لا يحل له التصرف فيه مالم يؤد بدله الخ.

وفی الدر المختار کتاب الغصب ج: ۶ ص: ۱۸۲ (طبع سعید) ويجب ردّ عين المغصوب في مكان غصبه ويرأ بردّها ولو بغير علم المالك أو يجب ردّ مثله ان هلك وهو مثلي.

وفی رد المحتار ج: ۶ ص: ۳۸۵ ويردونها على أربابها ان عرفوهم وآلا تصدقوا بها لأن سبيل الكسب الخبيث التصدق اذا تعذر الرد على صاحبه.

کالجاریۃ فی مسئلتنا ویتعدی الی بدلہا وشبہۃ الشبہۃ فیما یوجب فیہ عدم الملک الشبہۃ
وہو مالا یتعین وشبہۃ الشبہۃ غیر معتبرۃ۔ (فتح القدیر ج: ۶ ص: ۱۰۴ باب البیع الفاسد، فصل
فی احکامہ)۔

چند ماہ قبل بندے نے اسی عبارت کے پیش نظر منافع کے حلال ہونے کا ایک فتویٰ لکھا تھا،
جس پر اُستاذ محترم مفتی..... صاحب نے تصدیق بھی کر دی تھی، لیکن اب خیال ہوا کہ حضرت والا سے
بھی رہنمائی حاصل کر لوں۔

جواب:- مکرّمی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

”فتح القدیر“ کی مذکورہ عبارت سے علی الاطلاق یہ حکم نکالنا درست معلوم نہیں ہوتا کہ ہر مخلوط
مال کا رِبح حلال ہے، جس کی دو وجوہ ہیں۔ ایک یہ کہ مخلوط کا جو حصہ حرام ہے، اگر اس میں حرمت عدم
ملک کی وجہ سے آئی ہے، مثلاً غصب یا بحکم غصب ہے، یا عقد باطل کے ذریعے حاصل ہوا ہے، تو خود فتح
القدیر کی اس عبارت میں تصریح ہے کہ یہ شبہۃ الخبث پیدا کرے گا جو معتبر ہے، اور غصب کی صورت
میں تو محض شبہ نہیں، بلکہ حقیقت خبث پیدا کرے گا، کیونکہ غصب میں دراہم و دنانیر باتفاق حنفیہ متعین
ہو جاتے ہیں۔^(۱) دوسرے اگر حرمت فساد ملک کی وجہ سے آئی ہے تو بے شک ”فتح القدیر“ اور ”ہدایہ“ کے
اس مسئلے کی وجہ سے رِبح حلال ہوگا۔ مگر یہ مسئلہ اُس قول پر مبنی ہے جس کی رو سے دراہم و دنانیر عقود
فاسدہ میں بھی متعین نہیں ہوتے، حالانکہ صاحب ہدایہ نے اُصح اس کو قرار دیا ہے کہ عقود فاسدہ میں
دراہم و دنانیر متعین ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ اسی مسئلے کے بارے میں صاحب عنایہ فرماتے ہیں: ”وہذا
انما یستقیم علی الروایۃ الصحیحۃ، وہی أنّہا لا تتعین، لا علی الأصح، وہی أنّہا تقدمت أنّہا
تتعین فی البیع الفاسد لأنہا بمنزلۃ المغصوب۔“ (عنایۃ ج: ۶ ص: ۱۰۴)^(۲) (اگرچہ علامہ ابن ہمام
نے اُصح بھی عدم تعین کو قرار دیا ہے، کیونکہ جاریہ والا مسئلہ اصحاب مذاہب سے منقول ہے) البتہ عدم
ملک کی صورت میں رِبح کے حلال یا حرام ہونے میں دخل اس بات کا نہ ہوگا کہ مال مخلوط میں غالب

(۱) وفی الننف فی الفتاویٰ ص: ۲۵۴ ولو غصب دراہم أو دنانیر أو غیر ذلک من الکیلی والوزنی فاتجر فیہ وربح
فانہ یتصدّق بالربح. وكذا فی فتح القدیر ج: ۸ ص: ۲۵۵، والمبسوط للسرخسی ج: ۱۱ ص: ۷۷.
وفی بدائع الصنائع ج: ۶ ص: ۱۴۹ اذا غصب ألفا فاشترى جاریۃ فباعها بألفین ثم اشترى بالآلفین جاریۃ فباعها بثلاثۃ
آلاف انہ یتصدّق بجمیع الربح.

وفی الہدایۃ ج: ۳ ص: ۳۷۳ (طبع رشیدیہ کوئٹہ) ومن غصب عبداً فاستغله فنقصته الغلۃ فعليه النقصان لما بینا
ویتصدّق بالغلۃ لأنہ حصل بسبب خبیث وهو التصرف فی ملک الغیر.
وفی الشامیۃ ج: ۶ ص: ۱۸۹ (طبع سعید) قوله وتصدق أصله ان الغلۃ للغاصب عندنا لأن المنافع لا تتقوم إلا بالعقد
والعاقده هو الغاصب فهو الذى جعل منافع العبد مالا بعقده فكان هو أولى بدلها ویومر أن یتصدّق بها لاستفادتها ببدل
خبیث وهو التصرف فی مال الغیر.

(۲) دیکھئے فتح القدیر، باب البیع الفاسد فصل فی احکامہ ج: ۶ ص: ۱۰۴.

حلال ہے یا حرام، بلکہ دونوں صورتوں میں ربح کا وہ حصہ حرام ہوگا جو حرام کے مقابل ہو، مثلاً $\frac{1}{4}$ حلال تھا، اور $\frac{3}{4}$ حرام، تو ربح کا $\frac{1}{4}$ حصہ حلال اور باقی حرام۔ اور فسادِ ملک کی صورت میں بھی احتیاط اسی میں ہے، کیونکہ صاحبِ ہدایہ نے اَصْحٰ تَعْيِيْن الدَّرَاهِمِ فِي الْعُقُودِ الْفَاسِدَةِ کو قرار دیا ہے۔^(۱)

واللہ اعلم

۱۳۲۴/۳/۲۴ھ

(فتویٰ نمبر ۶۲۲/۳۰)

مالِ مخلوط کے نفع سے متعلق مذکورہ فتویٰ کی مزید وضاحت

اور ایک اشکال کا جواب

سوال :- بخدمتِ شیخی و اُستازی حفظکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

بندہ نے گزشتہ علمی خط میں حضرت والا کی خدمت میں مالِ مخلوط کے منافع کی مطلقاً حلت کا خیال ذکر کیا تھا اور اس کے لئے فتح القدیر کی عبارت پیش کی تھی، حضرت والا نے جواب تحریر فرمایا کہ ”فتح القدیر کی مذکورہ عبارت سے علی الاطلاق یہ حکم نکالنا درست معلوم نہیں ہوتا کہ ہر مخلوط مال کا ربح حلال ہے، جس کی دو وجوہ ہیں، ایک یہ کہ مخلوط کا جو حصہ حرام ہے، اگر اس میں حرمت عدمِ ملک کی وجہ سے آئی ہے..... تو خود فتح القدیر کی اس عبارت میں تصریح ہے کہ یہ شبہۃ النجث پیدا کرے گا جو معتبر ہے..... اگر حرمت فسادِ ملک کی وجہ سے آئی ہے تو بے شک فتح القدیر اور ہدایہ کے اس مسئلے کی وجہ سے ربح حلال ہوگا..... البتہ عدمِ ملک کی صورت میں ربح کے حلال یا حرام ہونے میں دخل اس بات کا نہ ہوگا کہ مالِ مخلوط میں غالب حلال ہے یا حرام، بلکہ دونوں صورتوں میں ربح کا وہ حصہ حرام ہوگا جو حرام کے مقابل ہو..... اور فسادِ ملک کی صورت میں بھی احتیاط اسی میں ہے..... واللہ اعلم۔“

اس بارے میں تردد یہ ہے کہ حضرت والا نے مالِ مخلوط کے دو حصے بنائے ہیں اور ہر ایک حصے کے ربح کا حکم الگ کیا ہے، لیکن بندہ شرح التتویر کی درج ذیل عبارت کے پیش نظر یہ سمجھا ہوا ہے کہ مالِ مخلوط مکمل خالص کی ملک میں آجاتا ہے لیکن ملک خبیث ہوتی ہے اور خالص حرام رقم کے بقدر ضامن بن جاتا ہے۔

قال الحصكفي رحمه الله تعالى: أو اختلط المغصوب بملك الغاصب

بحيث يمتنع امتيازہ كاختلاط برہ ببرہ أو يمكن بحرج كبرہ بشعيرہ

ضمنہ و ملکہ بلا حل انتفاع قبل أداء ضمانہ۔ (الدر مع الرد ج: ۶ ص: ۱۹۱)

اس عبارت سے تو معلوم ہوتا ہے کہ مال مخلوط علی الاطلاق مضمون ہوتا ہے اور اس میں فساد ملک ہوتا ہے، لہذا فتح القدیر کی تحقیق کے مطابق علی الاطلاق ربح بھی حلال ہونا چاہئے۔
حضرت والا سے مزید رہنمائی کی درخواست ہے۔

جواب :- - وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

اس وقت بہت تدقیق کے ساتھ مراجعت کا تو موقع نہیں ہے، لیکن ہدایہ کے مسئلہ جاریہ^(۱) کو غصب میں مال مخلوط کے مملوک ہو جانے کے مسئلے^(۲) سے ملا کر مذکورہ نتیجہ نکالنا بندے کو اب بھی درست معلوم نہیں ہوتا۔ وجہ یہ ہے کہ اول تو خلط المغصوب بغیر المغصوب کے مسئلے میں ملکیت التزام الضمان (بلکہ نیت اداء الضمان) سے آئے گی، جو شخص ضمان کا التزام ہی نہ کرے اسے مالک کیسے قرار دیا جاسکتا ہے؟ دوسرے جو عبارت آپ نے لکھی ہے، خود اسی میں تصریح ہے کہ قبل اداء الضمان اس سے انتفاع حلال نہیں۔ اور استرباح انتفاع کی اعلیٰ ترین صورت ہے۔ اور مسئلہ اسی صورت میں مفروض ہے جب ضمان ادا نہ کیا ہو، ضمان ادا کر دیا ہو تو پھر حلت میں کوئی اشکال نہیں۔ البتہ آج کل بنک وغیرہ کے ملازمین کو جو ہم یہ کہہ دیتے ہیں کہ اگر کوئی اور صورت گزارے کی نہ ہو تو التزام ضمان کر کے اور اس کی ادائیگی کی پکی نیت رکھ کر اس رقم کو استعمال کر لیں، یا کاروبار میں لگالیں، اس کا بنی یہ ہے کہ وہ غصب نہیں، بلکہ جانب آخر کی رضامندی سے ایک ناجائز عقد کیا گیا ہے جس میں جانب آخر کوئی مطالبہ بھی نہیں رکھتا، لہذا معاملہ صرف حق اللہ کا رہ جاتا ہے اور توبہ، التزام ضمان اور نیت اداء کی صورت میں اس کا وجوب علی الفور کے بجائے علی التراخی ہونے کی گنجائش معلوم ہوتی ہے، ضرورت کے وقت اس گنجائش سے فائدہ اٹھانے اور ساتھ ساتھ استغفار کرتے رہنے کا مشورہ دے دیا جاتا ہے۔

واللہ اعلم

۱۴۲۴/۵/۲۰ھ

مال حرام کو حلال کرنے کے لئے غیر مسلم سے قرض والے حیلے کی شرعی حیثیت

سوال :- حرام رقم کو حلال کرنے کا بعض علماء یہ حیلہ بتاتے ہیں کہ کسی غیر مسلم سے قرض لے لے اور حرام رقم سے قرضہ ادا کرے، کیا حضرت والا کے نزدیک یہ حیلہ درست ہے؟ اگر کسی نے

(۱) دیکھئے ہدایہ ج: ۳ ص: ۶۸ و ۶۹ (طبع رحمانیہ)۔

(۲) دیکھئے الدر المختار مع الرد المختار ج: ۶ ص: ۱۹۱ (طبع سعید)۔

ایسا کر لیا ہو تو اب کیا کرے؟

(محمد عامر)

جواب:- اس حیلے سے حرام رقم حلال نہیں ہوتی،^(۱) صرف اتنا ہوتا ہے کہ قرض سے جو کھانا خریدے گا وہ حلال ہو جائے گا،^(۲) لیکن حرام رقم ملکیت میں لانے، اور حرام رقم سے قرض ادا کرنے کا گناہ پھر بھی ملے گا۔^(۳)

واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم

۱۴۲۵/۱۲/۲۹ھ

(۱) جیسا کہ امداد الفتاویٰ میں ہے: ”حرام کو حلال کرنے کے لئے کوئی حیلہ مفید نہیں“ تفصیل کے لئے امداد الفتاویٰ ج: ۴ ص: ۱۳۴ (طبع دارالعلوم کراچی) ملاحظہ فرمائیں۔

(۱) وفي الهندية كتاب الكراهية الباب الثاني عشر في الهدايا والضيافات ج: ۵ ص: ۳۴۲ (طبع بلوچستان بک ڈپو) وفي شرح حيل الخصاص لشمس الأئمة رحمه الله تعالى ان الشيخ أبا القاسم الحكم كان يأخذ جائزة السلطان وكان يستقرض لجميع حوائجه وما يأخذ من الجائزة يقضى بها ديونه والحيلة في هذه المسائل أن يشتري نسيئة ثم ينقد ثمنه من أى مال شاء، وقال أبو يوسف رحمه الله: سألت أبا حنيفة عن الحيلة في مثل هذا فأجابني بما ذكرنا. وفي الدر المختار ج: ۶ ص: ۳۸۵ وجاز أخذ دين على كافر من ثمن خمر لصحة بيعه بخلاف دين على المسلم لبطلانه ألا اذا وكل ذميا ببيعه الخ.

وفي خلاصة الفتاوى كتاب الكراهية الفصل الرابع في المال من الاهداء والميراث وغير ذلك ج: ۴ ص: ۳۴۹ (طبع مكتبه رشيديه كوئٹہ) وفي شرح حيل الخصاص لشمس الأئمة الحلواني رحمه الله ان الشيخ الامام أبا القاسم الحكيم كان ممن يأخذ جائزة السلطان وكان يستقرض بجميع حوائجه وما يأخذ من الجائزة كان يقضى به دينه فالحيلة في مثل هذه المسائل ان يشتري شيئاً ثم ينقد ثمنه من أى مال أحب. قال أبو يوسف رحمه الله: سألت أبا حنيفة عن الحيلة في مثل هذا، قال: فأجابني بما ذكرناه الخ. وفي السراجية المغنية اذا قضى دينها من كسبها اجبر الطالب على الأخذ.

وفي الهندية كتاب الحيل الفصل الأول ج: ۶ ص: ۳۹۰ (طبع رشيديه) كل حيلة يحتال بها الرجل ليتخلص بها عن حرام أو ليتوصل بها الى حلال فهي حسنة. نيز دیکھئے: امداد المفتين ص: ۸۰۲ و ۸۰۳، ومجموعة الفتاوى ج: ۲ ص: ۲۶۷ (طبع سعيد).

(۳) وفي سنن الترمذی ج: ۱ ص: ۲۴۹ (طبع مكتبه رحمانيه) أنه لا يربوا لحم بنت من سحت إلا كانت النار أولى به. وفي صحيح ابن حبان ج: ۵ ص: ۹ (طبع مؤسسة الرسالة) يا كعب بن عجرة أنه لا يدخل الجنة لحم نبت من سحت.

وفي مسند أحمد بن حنبل رقم الحديث: ۵۷۳۲ ج: ۵ ص: ۲۱۸ و ۲۱۹ (طبع دار الحديث القاهرة) عن ابن عمر رضي الله عنهما أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: من اشترى ثوباً بعشرة دراهم وفيه درهم حرام لم يقبل الله تعالى له صلوة ما دام عليه.

وفي الصحيح للإمام المسلم ج: ۱ ص: ۳۲۶ (طبع مكتبة الحسن) عن أبي هريرة رضي الله عنه في حديث: ثم ذكر الرجل يطيل السفر أشعث أغبر يمد يديه الى السماء يا رب! يا رب! ومطعمه حرام ومشربه حرام وملبسه حرام وغذى بالحرام فأنى يستجاب لذلك. (مسلم).

وفي مسند أحمد رقم الحديث: ۳۶۷۲ ج: ۳ ص: ۵۳۹ (طبع دار الحديث القاهرة) عن عبد الله بن مسعود رضي الله عنه عن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: لا يكسب عبد مالا من حرام فينفق فيه فيبارك له فيه ولا يتصدق به فيقبل منه ولا يترك خلف ظهره ألا كان زاده الى النار. الحديث (رواه أحمد).

ناجائز طریقے سے آئی ہوئی رقم غلطی سے استعمال ہو جائے تو کیا حکم ہے؟

سوال:- کاروبار میں کبھی غلطی سے ناجائز اور حرام رقم آ جاتی ہے، جو کبھی استعمال ہو جاتی ہے، جس کی وجہ سے بعد میں دل میں کافی پریشانی پیدا ہو جاتی ہے اور اس پریشانی میں نماز چھوڑ دیتا ہوں، شرعاً کیا حکم ہے؟
طلعت محمود، راولپنڈی

جواب:- اگر کبھی غلطی سے کوئی ناجائز طریقے سے حاصل کی ہوئی رقم استعمال میں آ جائے تو توبہ اور استغفار کرنا چاہئے، اور تلافی کے لئے اتنی رقم صدقہ کر دینا چاہئے۔^(۱) لیکن اس کی وجہ سے نماز چھوڑ دینا تو کسی طرح بھی جائز نہیں، اس کے بعد تو اور زیادہ اہتمام سے نماز پڑھنے کی ضرورت ہے۔

واللہ اعلم
(۲) ۱۴۰۵/۴/۲۸ھ

ماں کے لئے مجبوراً بیٹے کی حرام کمائی استعمال کرنے کا حکم

سوال:- اگر کسی کا ایک ہی بیٹا ہو اور وہی اپنی ماں کا کفیل ہو، اور اُس کی آمدنی ناجائز ہو تو ماں کے لئے اُس کی کمائی جائز ہے یا نہیں؟ اور وہ مجبوراً اسی بیٹے کی کمائی کھاتی ہے جبکہ ظاہراً ماں اُس حرام مال کو دیکھ رہی ہے، لیکن کھانے پر مجبور ہے کیونکہ دوسرا کفیل نہیں، ایسی عورت کے لئے کیا حکم ہے؟

جواب:- حرام مال تو حرام ہی ہے، ایسی صورت میں ماں کو کوشش کرنی چاہئے کہ اُسے کسی حلال ذریعے سے آمدنی حاصل ہو جائے، نیز بیٹے کو حرام کمائی کے بجائے حلال کمائی پر آمادہ کرنا بھی اس کے ذمے واجب ہے اور جب تک انتظام نہ ہو، توبہ اور استغفار کرتی رہے اور حلال کی فکر اور کوشش

(۱) وفي الاختيار لتعليل المختار ج: ۳ ص: ۶۱ والملک الخبیث سبیلہ التصدق به ولو صرفه فی حاجة نفسه جاز ثم ان کان غنیاً تصدق بمثلہ وان کان فقیراً لا يتصدق. نیز دیکھئے ص: ۱۲۰ و ص: ۱۲۱ کے حواشی۔

(۲) یہ فتویٰ حضرت الامام برکاتہم نے سائل موصوف کے جوابی خط میں تحریر فرمایا۔

(۱) جاری رکھے۔

واللہ اعلم

۱۳۹۶/۱۲/۷ھ

(فتویٰ نمبر ۲۷۷۷/۲۷ و)

باپ کی طرف سے صدقے کے لئے دی گئی حلال رقم خود استعمال کر کے مالِ حرام سے صدقہ کرنے کا حکم

سوال:- باپ نے بیٹے کو حلال رقم کسی نیک کام میں کوئی چیز خرید کر دینے کے لئے دی کہ اس رقم سے فلاں چیز خرید کر فلاں مستحق کو دے دو، بیٹے کے ذرائع آمدنی ناجائز ہیں، بیٹے نے باپ کی دی ہوئی رقم خود خرچ کر کے بعد میں اپنی ناجائز آمدنی سے وہ چیز خرید کر مستحق کو دی۔ تو کیا اس صورت میں باپ کے ثواب میں فرق پڑے گا؟ کہیں باپ کا ثواب تو ختم نہیں ہوگا؟

طلعت محمود، راولپنڈی

جواب:- باپ کے ثواب میں تو ان شاء اللہ اس صورت میں فرق نہیں پڑے گا، لیکن بیٹے کو یہ گناہ ہوگا کہ اس نے باپ کی دی ہوئی رقم خرچ کر لی، اور ناجائز آمدنی حاصل کی^(۲) اور باپ نے اسے پاک صاف مال سے خریدنے کو کہا تھا، اس نے ناجائز آمدنی سے چیز خریدی، لہذا بیٹے پر اول تو یہ واجب ہے کہ وہ ان گناہوں سے توبہ کرے اور ناجائز ذرائع آمدنی کو ترک کرے، دوسرے! باپ جو مال کسی کام کے لئے دے، اسی سے خرچ کرے اور اسے الگ رکھے۔ وانما صح الشراء علی قول

(۱) وفي الشامية ج: ۶ ص: ۱۹۱ وفي جامع الجوامع: اشترى الزوج طعاماً أو كسوة من مال خبيث جاز للمرأة أكله ولبسها والاثم على الزوج.... الخ.

وفي رد المحتار أيضاً ج: ۶ ص: ۳۸۶ (طبع سعيد) امرأة زوجها في أرض الجور إذا أكلت من طعامه ولم يكن عينه غصباً أو اشترى طعاماً أو كسوة من مال أصله ليس بطيب فهي في سعة من ذلك والاثم على الزوج. وكذا في الخانية على الهندية ج: ۳ ص: ۴۰۳.

وفي أحكام المال الحرام ص: ۲۸۹، فإذا كان المال الحرام في يد الوالد ينفق منه على نفسه وأبنائه لغير حاجة أو فقر فإن الأب يكون آثماً بهذا الانفاق إذا وجد المال الحلال أو كان قادراً على تحصيله.... أما الأبناء ففي حكم انفاقهم من المال الحرام الذي عند الأب ينبغي التفريق بين حالتين، الأولى: أن يكون الابن غير قادر على تحصيل المال الحلال إما لعجزه أو لصغر سنّه وكانت نفقته واجبة على أبيه أو كان طالب علم ليس له مصدر رزق للعيش ودفع نفقات الدراسة ألا هذا المال الحرام الذي عند الأب فإن حكمه في الأخذ من هذا المال حكم المضطر إلى دفع الأذى عن نفسه بالميتة فيجوز له أن يأخذ ما ينفقه عليه والده وإن ينتفع به مع انكاره في قلبه لهذا الأمر إلى أن يصبح قادراً على الاعتماد على نفسه في تحصيل الكسب الحلال أو أن يأتيه مال من مصدر حلال فيستغني به عما عند والده من مال حرام لأنه عند حصول المال الحلال تزول ضرورته إلى الانفاق على نفسه من المال الحرام ويكون لزاماً عليه أن ينفق على نفسه من هذا المال الحلال ويحرم عليه أن يقبل نفقة والده من المال الحرام.

نیز دیکھئے صفحہ: ۱۲۵ کا حاشیہ نمبر ۳۔

(۲) مال حرام حاصل کرنے اور استعمال کرنے کے گناہ سے متعلق احادیث ص: ۱۲۵ کے حاشیہ نمبر ۳ میں ملاحظہ فرمائیں۔

(۱)

الکرخی رحمہ اللہ تعالیٰ، وصحت الصدقة۔

واللہ اعلم

(۲)

۱۴۰۶/۶/۲۸ھ

مالِ حرام سے متعلق حضرت والا دامت برکاتہم کی ایک اہم تحقیق

(وضاحت از مرتب) مالِ حرام کے بارے میں عام طور پر فتاویٰ میں یہ بات درج کی جاتی ہے کہ اسے بلا نیتِ ثواب کسی فقیر اور مستحقِ زکوٰۃ کو صدقہ کر دیا جائے، یعنی تصدق کے ساتھ ساتھ تملیک کی بھی شرط لگائی جاتی ہے، اور اسی کے مطابق پہلے دارالافتاء جامعہ دارالعلوم کراچی سے فتاویٰ جاری ہوتے تھے، مگر بعد میں حضرت والا دامت برکاتہم العالیہ نے اس موضوع پر خاص طور پر تحقیق فرمائی کہ

(۱) وفي الشامية مطلب اذا اكتسب حراماً ج: ۵ ص: ۲۳۵ (طبع سعید) مطلب اذا اكتسب حراماً ثم اشترى فهو على خمسة أوجه قوله (اكتسب حراماً... الخ) توضيح المسألة ما في التارخانية حيث قال رجل اكتسب مالا من حرام ثم اشترى فهذا على خمسة أوجه أما ان دفع تلك الدراهم الى البائع أولاً ثم اشترى منه بها أو اشترى قبل الدفع بها ودفعها أو اشترى قبل الدفع بها ودفع غيرها أو اشترى مطلقاً ودفع تلك الدراهم أو اشترى بدراهم آخر ودفع تلك الدراهم قال أبو نصر يطيب له ولا يجب عليه أن يتصدق إلا في الوجه الأول واليه ذهب الفقيه أبو الليث لكن هذا خلاف ظاهر الرواية فانه نص في الجامع الصغير اذا غصب ألفاً فاشترى بها جارية وباعها بألفين تصدق بالربح وقال الكرخی فی الوجه الأول والثانی لا یطیب و فی الثلاث الأخيرة یطیب۔ وقال أبو بكر لا یطیب فی الكل لكن الفتوى الآن على قول الكرخی دفعاً للخرج عن الناس اهـ۔ وفي الولوالجية وقال بعضهم لا یطیب فی الوجوه كلها وهو المختار لكن الفتوى اليوم على قول الكرخی دفعاً للخرج لكثرة الحرام اهـ۔

وفي الهندية، فصل في الاحتكار ج: ۳ ص: ۲۱۵ (طبع رشیدیہ کوئٹہ) اكتسب مالا من حرام ثم اشترى شيئا منه فان دفع تلك الدراهم الى البائع أولاً ثم اشترى منه بتلك الدراهم فانه لا یطیب له ويتصدق به وان اشترى قبل الدفع بتلك الدراهم ودفعها فكذلك في قول الكرخی وأبی بكر خلافاً لأبی نصر وان اشترى قبل الدفع بتلك الدراهم ودفع غيرها أو اشترى مطلقاً ودفع تلك الدراهم أو اشترى بدراهم أخرى ودفع تلك الدراهم قال أبو نصر يطيب ولا يجب عليه أن يتصدق وهو قول الكرخی والمختار قول أبي بكر إلا أن اليوم الفتوى على قول الكرخی كذا في الفتاوى الكبرى۔

وفي الهندية، فصل في تملك الغاصب الخ ج: ۵ ص: ۱۴۱ (طبع مكتبة رشیدیہ کوئٹہ) وان كان مما لا يتعين فقد قال الكرخی انه على أربعة أوجه إما ان أشار اليه ونقد منه أو أشار اليه ونقد من غيره أو أطلق إطلاقاً ونقد منه أو أشار اليه ونقد منه وفي كل ذلك يطيب له إلا في الوجه الأول وهو ما أشار اليه ونقد منه قال مشايخنا لا یطیب له بكل حال أن يتناول منه قبل أن يضمه وبعد الضمان لا یطیب الربح بكل حال وهو المختار والجواب في الجامعين والمضاربة يدل على ذلك واختار بعضهم الفتوى على قول الكرخی في زماننا لكثرة الحرام وهذا كله على قولهما۔

وفي العناية شرح الهداية: (اشترى بها إشارة الى أن التصديق انما يجب اذا اشترى بها ونقد منها) قال فخر الاسلام: لأن ظاهر هذه العبارة يدل على أنه أراد بها اذا أشار اليها ونقد منها، أما اذا أشار اليها ونقد من غيرها أو نقد منها وأشار الي غيرها أو أطلق إطلاقاً ونقد منها بطيب له، وهذه أربعة أوجه، ففي واحد منها لا یطیب، وفي الباقي یطیب۔ وذكر في المبسوط وجهاً آخر لا یطیب فيه أيضاً، وهو أنه اذا دفع الى البائع تلك الدراهم أولاً ثم اشترى منه بتلك الدراهم وهذا التفصيل في الجواب قول الكرخی رحمہ اللہ، لأن الإشارة اذا هانت لا تفيد التعيين كان وجودها وعدمها سواء، فلا بد أن يتأكد بالنقد ليتحقق الخبث۔ قالوا: والفتوى اليوم على قوله لكثرة الحرام دفعاً للخرج عن الناس۔

(۲) یہ فتویٰ حضرت والا دامت برکاتہم نے اپنے جوابی خط میں تحریر فرمایا۔ (محمد زبیر)

”کسبِ خبیث“ واجب التصدق ہونے کے ساتھ ساتھ واجب التملیک بھی ہے یا نہیں؟ یعنی مالِ حرام کا صرف صدقہ کر دینا کافی ہے یا اس کے ساتھ ساتھ کسی فقیر کو اس کا مالک بنانا بھی ضروری ہے؟ اس تحقیق کے نتیجے میں حضرت والا دامت برکاتہم العالیہ کا رُحمان اس طرف ہوا کہ کسبِ خبیث واجب التصدق تو ہے مگر واجب التملیک نہیں۔

حضرت والا دامت برکاتہم العالیہ نے یہ تحقیق فرما کر یہ تحریر صدرِ دارالعلوم کراچی مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب دامت برکاتہم کی خدمت میں بھیجی، جس پر حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب دامت برکاتہم العالیہ نے کئی جگہوں پر حواشی تحریر فرمانے کے بعد اس تحقیق کے آخر میں اپنا رُحمان بھی تحریر فرمایا۔

حضرت والا دامت برکاتہم العالیہ کی یہ اہم تحقیق، حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب دامت برکاتہم کے حواشی اور ان کی رائے کے ساتھ درج ذیل ہے۔ (محمد زبیر)

مالِ حرام کے تصدق میں تملیک ضروری ہے یا نہیں؟

(خط از حضرت والا دامت برکاتہم العالیہ بنام حضرت صدرِ دارالعلوم

کراچی دامت برکاتہم)

بگرامی خدمت حضرت صدر صاحب^(۱) مدظلہم العالی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

کسبِ خبیث جو واجب التصدق ہوتا ہے، اس کے بارے میں مدت سے ذہن میں یہ تردد تھا کہ اس کے ”واجب التملیک“ ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہونی چاہئے، کیونکہ مقصد اصل مالک کو ثواب پہنچانا ہے جو تملیک میں منحصر نہیں۔ بعد میں اس مسئلے کی کچھ تحقیق کی نوبت آئی، اس سلسلے میں کتبِ فقہ سے جو اُمور سمجھ میں آئے، وہ احقر نے منسلکہ تحریر میں اِلاء کر دیئے ہیں، مقصد یہ ہے کہ ان اُمور پر غور کیا جائے۔ آنجناب ملاحظہ فرما کر اپنی رائے تحریر فرمادیں، پھر حضرت ناظم صاحب اور مولانا محمود اشرف صاحب کو بھجوادیں تو کرم ہوگا۔ یہ سطور عجلت میں اسلام آباد جاتے ہوئے لکھ رہا ہوں۔

والسلام

محمد تقی عثمانی

۱۴۱۹/۱۰/۲۷ھ

(۱) صدر جامعہ دارالعلوم کراچی حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب دامت برکاتہم العالیہ۔

مولانا محمود اشرف صاحب سلمہ

میں نے یہ تحریر پڑھ لی ہے، کچھ اس پر لکھ بھی دیا ہے۔ آپ بھی دیکھ لیں، بعد ازاں حضرت

ناظم صاحب مدظلہم کی خدمت میں پیش کر دی جائے۔

والسلام

محمد رفیع عثمانی

۱۴۱۹/۱۲/۱۱ھ

بسم الله الرحمن الرحيم

الحمد لله وكفى وسلام على عباده الذين اصطفى أما بعد

کسی شخص کے پاس جو مال کسی حرام یا ناجائز ذریعے سے آگیا ہو، اور اس کو اصل مالک یا اس کے وارثوں تک پہنچانا ممکن نہ ہو تو اس کا حکم یہ ہے کہ اسے نیتِ ثواب کے بغیر ہی اپنی جان چھڑانے کے لئے صدقہ کر دیا جائے۔ عام طور سے تاثر یہ ہے کہ اس صدقے میں بھی تقریباً وہ تمام شرائط ملحوظ ہیں جو زکوٰۃ کے سلسلے میں معروف ہیں، چنانچہ عام طور سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ اس صدقے میں بھی تملیک فقراء ضروری ہے، اور کسی رفاہی کام میں تملیک کے بغیر خرچ نہیں کیا جاسکتا، ہمارے بزرگوں میں سے بعض نے اس کے بارے میں صراحۃً فتویٰ بھی دیا ہے۔

دیکھئے (امداد المفتین ص: ۴۵۴ کتاب الزکوٰۃ، طبع دار الاشاعت) البتہ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہ کا رجحان اس طرف ہے کہ اس قسم کا مال بحکم لقطہ ہے، اور لقطے کا حکم یہ ہے کہ وہ اصل مالک غیر معلوم کی طرف سے صدقہ نافلہ ہے، اور اس میں تملیک ضروری نہیں، اس سلسلے میں امداد الاحکام جلد سوم میں حضرت مولانا ظفر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے حکیم الامت رحمہ اللہ کا یہ رجحان صراحۃً نقل فرمایا ہے اور وجداناً اسی قول کی طرف رجحان کا اشارہ کیا ہے، ان کی عبارت درج ذیل ہے:

(الجواب) لقطہ کے بارے میں فقہاء کے اقوال سے اتنا تو ثابت ہے کہ غنی پر اس

کا تصدق واجب ہے، لیکن آیا اس کا مطلب یہ ہے کہ لقطہ کا حکم وقت تصدق

صدقہ واجبہ کا حکم ہے (حتیٰ یجب فیہ التملیک كالصدقات الواجبة) یا اس

کا مطلب یہ ہے کہ صرف تصدق واجب ہے اور صدقات واجبہ کی طرح نہیں ہے

”كما اذا جمع مالا من كسب حرام فيجب التصدق به ولا يكون مثل

صدقات واجبة حتی یرأ ذمتہ بالتصدق علی ابنہ الكبير الفقير“ احقر أب

تک اس کو مثل صدقات واجبہ کے لازم سمجھتا تھا، اور حضرت حکیم الامت واجب التصدق سمجھتے ہیں صدقہ واجبہ نہیں سمجھتے تھے، اور اب تک کسی جزئیہ صریحہ سے یہ اختلاف مرتفع نہیں ہوا، البتہ رجحان قول حکیم الامت کو معلوم ہوتا ہے وجداناً، بعد میں جزئیہ مل گیا کہ اس میں دونوں قول ہیں، مگر مشہور تملیک فقراء ہے۔

(۱) (امداد الاحکام ج: ۳ ص: ۴۷)

(تتمة الجواب الأول) قال فی الدر فی مصارف بیوت المال ما نصه:

ورابعها الضوائع مثل مالا

یکون له أناس وارثونا

ورابعها فمصرفه جهات

(۲) تساوی النفع فیها المسلمونا

قال الشامی: قوله الضوائع: جمع ضائعة أى اللقطات وقوله مثل مالا ای مثل ترکه لا وارث لها اصلاً أو لها وارث لا یردّ علیہ كأحد الزوجین الخ وقوله ورابعها فمصرفه جهات الخ موافق لما نقله ابن الضیاء فی شرح الغزنویہ عن البزدوی من انه یصرف الی المرضی والزمنی واللقیط وعمارة القناطر والرباطات والثغور والمساجد وما أشبه ذلك. (۳)

اس کے علاوہ امداد الفتاویٰ میں حضرت حکیم الامت قدس اللہ سرہ کے ایک فتویٰ سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس قسم کے صدقے کو واجب التملیک نہیں سمجھتے، کتاب الوقف میں اس سوال وجواب کی عبارت درج ذیل ہے:

سوال: زید نے بکر سے پتھر سنگ مرمر خریدے اور ان پتھروں سے مسجد میں منبر و مصلیٰ بنوایا، اب بعد میں زید کو معلوم ہوا کہ وہ پتھر جو بکر نے اس کے ہاتھ فروخت کئے تھے قبر کے پتھر تھے جو بکر نے قبرستان میں سے قبروں سے اُکھڑوادیئے تھے، اور جو قبریں اس کی ملکیت نہیں اس مصلیٰ پر نماز پڑھنا جائز ہے یا نہیں؟ اور نیز پتھر مسجد میں لگے رہنے جائز ہیں یا نہیں؟

(الجواب) پتھر قبر پر لگانے سے وقف نہیں ہوتا بلکہ لگانے والے کی ملک رہتا ہے،

(۱) ج: ۳ ص: ۴۸ (طبع مکتبہ دارالعلوم کراچی)۔

(۲ و ۳) الدر المختار مع رد المحتار ج: ۲ ص: ۳۳۸ (طبع سعید)

پس اجنبی آدمی کا بیع کرنا اس کو صحیح نہیں ہوا لیکن اگر لگانے والا معلوم نہ ہو یا معلوم ہو مگر اس کا کوئی وارث موجود نہ ہو تو وہ حکم لقطہ میں ہے،^(۱) اور لقطہ کا حکم یہ ہے کہ کسی نیک کام میں صرف کر دیا جائے اس صورت میں مسجد میں لگا رہنے دیا جاوے کہ اپنے مصرف میں لگ گیا ہے، البتہ جس نے بیع کیا ہے اس کے لئے قیمت درست نہیں اور اگر اس کا مالک یا مالک کا وارث معلوم ہو تو اس سے دریافت کیا جائے، اگر وہ اجازت دے، لگا رہنے دیا جائے خواہ مفت یا قیمت لے کر، اور وارث اگر اجازت نہ دے، اکھاڑ دیا جاوے، اور اگر کئی وارث ہوں سب سے اجازت لینا ضروری ہے اور نابالغ کے حصے کی قیمت دینا ضروری ہے۔

(امداد الفتاویٰ ج: ۲ ص: ۵۸۷ سوال نمبر ۷۰۹ طبع مکتبہ دارالعلوم کراچی)

حضرت نے اس مسئلے میں قبرستان کے پتھر کو لقطہ قرار دے کر اس کا مسجد میں لگا رہنا جائز قرار دیا اور فرمایا کہ وہ اپنے مصرف میں پہنچ گیا، نیز یہ صراحت فرمائی کہ لقطے کا حکم یہ ہے کہ اسے کسی نیک کام میں صرف کر دیا جائے، اس کے لئے تملیک کو ضروری قرار نہیں دیا اور ظاہر ہے کہ مسجد میں لگے رہنے سے تملیک متحقق نہیں ہوتی۔

حضرت حکیم الامت قدس سرہ کے اس رجحان کے پیش نظر مسئلے کی تحقیق کی ضرورت محسوس ہوئی، تو حضرت والا کی تائید میں متعدد دلائل سامنے آئے، جو اہل علم کے غور کے لئے پیش خدمت ہیں۔ ملک خبیث کا واجب التملیک ہونا فقہائے مذہب کی کتابوں میں کہیں صراحت کے ساتھ نہیں بلکہ اس پر لفظ تصدق سے استدلال کیا گیا ہے کہ چونکہ صدقہ عموماً تملیکاً ہوتا ہے اس لئے ملک خبیث کو بھی واجب التملیک سمجھا گیا، حالانکہ خاص طور پر صدقہ نافلہ میں لفظ صدقہ کا اطلاق ان وجوہ خیر میں خرچ کرنے پر بھی ہوا ہے جن میں تملیک کی ضرورت نہیں ہوتی، مثلاً حدیث معروف ہے کہ ”اذا مات ابن آدم انقطع عمله الا من ثلاث“^(۲) اس میں تیسرا عمل ”أو صدقة جاریة ینتفع بها“^(۳) قرار دیا گیا ہے، یہ صدقہ جاریہ واضح طور پر بغیر تملیک کے ہے، اسی طرح وقف پر صدقہ کا اطلاق بھی

(۱) حکم لقطہ میں ہونے پر احقر کو یہ اشکال ہے کہ پتھر لگانے والے نے جہاں لگائے تھے وہیں لگے رہنے پر وہ راضی تھا، پس وہیں کیوں نہ لگے رہنے دیئے جائیں، یا وہیں کیوں نہ لگادیئے جائیں کہ مالک نے ایک امر مباح میں ان کو اپنی مرضی سے لگادیا تھا، اس اشکال کا اثر اگرچہ ہمارے اپنے زیر بحث مسئلے پر نہیں پڑتا، لیکن ضمناً اسے ذکر کرنا بھی ناچیز کو مناسب معلوم ہوا۔ رفع

(حاشیہ از حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب دامت برکاتہم العالیہ)

(۲ و ۳) دیکھئے سنن ابن ماجہ، باب ثواب معلم الناس الخیر ص: ۲۱ (طبع سعید)، مشکوٰۃ المصابیح، کتاب العلم ج: ۱ ص: ۳۲ (طبع قدیمی کتب خانہ)۔

احادیث کی کتابوں میں شائع ہے، مثلاً صحیحین^(۱) میں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی خیبر کی زمین کے بارے میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مشورہ کیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”ان شئت حبست اصلها وتصدق بھا“^(۲)

ترجمہ:- اگر تم چاہو تو اس اصل زمین کو روک رکھو اور اس کو صدقہ کر دو۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس مشورے پر جس طرح عمل کیا اس کے الفاظ یہ ہیں:

”فتصدق بھا عمر أنه لا یباع أصلها لا یباع ولا یورث ولا یوہب قال

فتصدق عمر فی الفقراء والقربی هذا لفظ مسلم فی کتاب الوقف۔

(تکملة فتح الملہم ج: ۲ ص: ۱۱۷ تا ۱۲۰ طبع مکتبہ دارالعلوم کراچی)

لہذا صدقہ نافلہ میں صرف لفظ صدقہ سے اس بات پر استدلال نہیں ہو سکتا کہ اس میں تملیک ضروری ہے، اس کے علاوہ بعض فقہائے کرام نے اس بات کی صراحت فرمائی ہے کہ مال حرام کے لئے فقہائے کرام نے جو صدقہ کا لفظ استعمال کیا ہے تو اس سے مراد محض تملیکاً صدقہ کرنا نہیں بلکہ عام مصارف خیر میں خرچ کرنا ہے، علامہ قرانی نے لکھا ہے کہ:

انما یدکر الأصحاب صدقة فی فتاویہم فی هذه الأمور لأنه الغالب والا

فالأمر كما ذکرته لك. (الذخيرة للقرافی بحوالہ أحكام المال الحرام ص: ۱۹۰)^(۳)

اگرچہ علامہ قرانی رحمہ اللہ مالکی المذہب ہیں اور وہ اپنے اصحاب کے قول کی تشریح فرما رہے ہیں لیکن اس سے کم از کم یہ بات ضرور واضح ہوتی ہے کہ باوجود صدقے کا لفظ استعمال کرنے کے مصارف خیر میں بدون تملیک خرچ کرنا بھی فقہاء کی عبارتوں میں مراد ہو سکتا ہے۔

۲- فقہائے حنفیہ کی تصریحات سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ جو ملک خبیث واجب التصدق ہو وہ مصرف کے لحاظ سے من کل الوجوہ زکوٰۃ کی طرح نہیں ہے، بلکہ متعدد جہات سے زکوٰۃ اور واجب التصدق کے مصرف میں فرق ہے، مثلاً یہ بات تقریباً تمام فقہائے حنفیہ نے بیان فرمائی ہے کہ یہ مال متصدق اپنی بیوی اور اولاد کو بھی دے سکتا ہے، چنانچہ علامہ حموی لکھتے ہیں:

لو كان غنيا لم يحل له ذلك بل يتصدق على الفقير اجنبيا ولو زوجة أو

(۱ و ۲) الصحيح للبخاری، باب الشروط فی الوقف ج: ۱ ص: ۳۸۲ (طبع سعید) والصحيح للمسلم ج: ۲ ص: ۴۱ (طبع قدیمی کتب خانہ)۔

(۳) احکام المال الحرام ص: ۲۸۹ (طبع ماریہ اکیڈمی)

(۴) اس کی وجہ ناچیز کی سمجھ میں یہ آتی ہے کہ مال واجب التصدق کا صدقہ اصل مالک کی طرف سے ہوتا ہے اور متصدق کی بیوی اور اولاد اس کے حق میں اجنبی ہیں۔ رفع (حاشیہ از حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب دامت برکاتہم العالیہ)

قريباً ولو اصلاً أو فرعاً كما في التنوير اهـ.

(حاشیة الاشباه للحموی، کتاب الصيد والذبائع ج: ۲ ص: ۱۰۶ طبع ادارة القرآن)

ومثله في الدر المختار (ج: ۲ ص: ۲۷۸ تا ۲۸۰ طبع سعید) والأ تصدق بها علی

فقیر ولو علی أصله وفرعه وعمره الخ.

نیز چونکہ یہ اصل مالک کی طرف سے صدقہ نافلہ ہے اس لئے حنفیہ کے ظاہر الروایۃ کے

مطابق یہ بنی ہاشم کو بھی دیا جاسکتا ہے، الدر المختار میں ہے:

جازت التطوعات من الصدقات وغلة الأوقاف لهم ای لبنی ہاشم سواء

(ج: ۲ ص: ۳۵۱ طبع سعید)

سماهم الواقف أو لا الخ.

اس کے تحت علامہ شامیؒ لکھتے ہیں:

نقل في البحر عن عدة كتب ان النفل جائز لهم اجماعاً وذكر أنه المذهب

وأنه لا فرق بين التطوع والوقف كما في المحيط وكافي النسفی

(رد المحتار ج: ۲ ص: ۳۵۱، کتاب الزکوۃ باب المصروف طبع سعید)

لیکن اس کے بعد علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ نے زیلعی کے حوالے سے اس مسئلے کو مختلف فیہ قرار

دیا ہے، اور ذکر کیا ہے کہ علامہ ابن ہمام رحمۃ اللہ علیہ نے فتح القدر میں دلیل کے اعتبار سے اس بات کو

قوی قرار دیا ہے کہ بنی ہاشم کے لئے صدقات واجبہ اور نافلہ دونوں ناجائز ہیں، لیکن علامہ ابن نجیم رحمۃ

اللہ علیہ نے صدقہ نافلہ میں جواز کا قول فقہائے حنفیہ کے متعدد موثوق مراجع سے نقل کرنے کے بعد اسی

کو مذہب قرار دیا ہے، اور اس پر فقہائے مذہب کے اجماع تک کا دعویٰ کیا ہے، اور علامہ ابن ہمامؒ

کے بعض دلائل کی تردید کی ہے اور جواز کی وجہ بھی یہ بتائی ہے کہ زکوۃ تطہیر نفس کا موجب ہے لہذا اس کو

اوساخ ناس سے تشبیہ دی گئی ہے، لیکن صدقہ نافلہ تبرع محض ہے، اس لئے وہ اوساخ میں داخل نہیں^(۱)،

اس سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ بنی ہاشم کے لئے صدقات نافلہ جائز ہیں، چنانچہ شمس الائمہ سرخی

رحمۃ اللہ علیہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لفظ سے مبینہ انتفاع کی توجیہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

الا ان الصدقة الواجبة كانت لا تحل لهم وهذا لم یکن من تلک الجملة

فلهذا استجاز علی رضی اللہ عنہ الشراء بها لحاجته.

(المبسوط للسرخی ج: ۱ ص: ۸ کتاب اللقطة طبع مطبعة السعادة مصر ۱۳۲۲ھ)

(۱) فرق کی یہ وجہ سمجھ میں نہیں آئی، جبکہ صدقہ واجبہ کی طرح یہ بھی کفارہ سیئات اور موجب رفع درجات ہوتے ہیں۔ رفع

(حاشیہ از حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب دامت برکاتہم العالیہ)۔

غالباً یہی وجہ ہے کہ ہمارے متعدد بزرگوں نے صاحب بحر کے قول ہی کو اختیار کیا، چنانچہ حضرت علامہ انور شاہ صاحب کشمیری رحمۃ اللہ علیہ لقطے کے بارے میں فرماتے ہیں:

ونقول انه صدقة نافلة وهي جائزة لأهل البيت عند أكثرنا وان تردد فيه
فخرالدين الزيلعي وابن همام ولذا قلنا يجوز اللقطة على الفروع^(۱)
والأصول فافترق الزكوة والتصدق باللقطة.

(۲)
(العرف الشذی، کتاب اللقطة ص: ۲۵۷، طبع ایچ ایم سعید)

نیز علامہ ظفر احمد صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں:

وأيضاً فإن بنی هاشم إنما لا تحل لهم الزكوة والعشر وصدقة الفطر وأما
ما عدا ذلك من الصدقات النافلة فتحل لهم باتفاق أئمتنا رحمهم الله
واللقطة ان كانت واجبة التصديق ليست من الصدقات الواجبة بل
مصارفها مصارف الصدقة النافلة حيث جاز أن يتصدق بها على فقير ذمی.
(اعلاء السنن ج: ۱۳ ص: ۲۶ طبع ادارة القرآن)

نیز حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوری رحمۃ اللہ علیہ نے مبسوط سرحسی کے ہی اس قول کی بنیاد
پر اسی توجیہ کو اختیار کیا ہے کہ صدقہ نافلہ بنی ہاشم کے لئے جائز ہے۔ (بذل المجہود ص: ۲۸۵)^(۳)
اسی طرح زکوٰۃ ذمی کو نہیں دی جاسکتی لیکن واجب التصدق مال ذمی کو بھی دیا جاسکتا ہے جیسا
کہ درمختار و شامی میں کوئی اختلاف نقل کئے بغیر ذکر کیا گیا ہے۔ (شامی ج: ۴ ص: ۳۵۱)^(۴)
اس سے یہ بات واضح ہوئی کہ واجب التصدق مال کے مصرف کو من کل الوجوہ زکوٰۃ کے
مصرف کے مثل سمجھنا درست نہیں۔^(۵)

(۱) ناچیز کی سمجھ میں یہ تعلیل بھی نہیں آئی، کیونکہ جواز اللقطة على الفروع والاصول کی وجہ بظاہر یہ نہیں ہے کہ یہ صدقہ نافلہ ہے بلکہ
وجہ ناچیز کو یہ معلوم ہوتی ہے کہ یہ اصل مالک کی طرف سے صدقہ ہے اور ملقط کے اصول وفروع اصل مالک کے اصول وفروع
نہیں، لہذا اصل مالک کی طرف سے ان پر صدقہ جائز ہوا جیسا کہ اُس کی طرف سے ان کو زکوٰۃ دینا بھی جائز ہوتا۔ رفیع
(حاشیہ از حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب دامت برکاتہم العالیہ)

(۲) ص: ۴۱۳ (طبع مکتبہ رحیمیہ سہارنپور)۔

(۳) ج: ۲ ص: ۵۰ طبع معهد الخلیل وفي طبع دار الريان للتراث القاهرة ج: ۸ ص: ۱۹۵ وأما آل النبي صلى الله
عليه وسلم فقال أكثر الحنفية أنها تجوز لهم صدقة التطوع دون الفرض. قالوا لان المحرم عليهم إنما هو
أوساخ الناس وذلك هو الزكوة لا صدقة التطوع... الخ.

(۴) وفي الدر المختار ج: ۲ ص: ۳۵۱ (طبع سعید) ولا تدفع الى ذمی وجاز دفع غيرها.

(۵) چنانچہ مصرف میں وہی فرق ہوگا جو صدقہ واجبہ اور صدقہ نافلہ کے مصرف میں ہے۔ رفیع

(حاشیہ از حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب دامت برکاتہم العالیہ)

۳- یہ بات تقریباً مُسَلَّم ہے کہ کسبِ خبیث کا واجب التصدق ہونا اس بناء پر ہے کہ اس کا صحیح مالک یا تو معلوم نہیں یا اس تک مال پہنچانا معتذر ہے، لہذا وہ لقطے کے حکم میں ہو گیا، اور لقطے کا حکم یہ ہے کہ وہ واجب التصدق ہے، اور چونکہ فقہائے حنفیہ نے بیت المال کے مصارف ذکر کرتے ہوئے لقطے کا مصرف صرف فقراء کو قرار دیا ہے، اس لئے اس سے یہ استنباط کیا گیا کہ زکوٰۃ کی طرح اس کی بھی تملیک ضروری ہے، لیکن یہ استنباط محلِ نظر ہے۔

اول تو بعض فقہائے حنفیہ نے لقطے کو مصرف فقراء کے ساتھ خاص نہیں کیا بلکہ اسے تمام مصالحِ مسلمین میں خرچ کرنے کو درست قرار دیا ہے، چنانچہ علامہ شامی نے علامہ بزدوی سے نقل کیا ہے:

أنه يصرف الى المرضى والزمنى واللقيط وعمارۃ القناطر والرباطات
والثغور والمساجد وما أشبه ذلك. (۱)

الدر المختار میں علامہ ابن الشخہ سے مصارف بیت المال سے متعلق جو اشعار منقول ہیں ان میں بھی یہی موقف اختیار کیا گیا ہے، البتہ علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ نے آگے اس پر یہ اعتراض کیا ہے کہ عام کتابوں میں لقطے کا مصرف فقراء کو قرار دیا گیا ہے، چنانچہ علامہ شامی لکھتے ہیں:

واما الرابع فمصرفه المشهور هو اللقيط الفقير والفقراء الذين لا أولياء
لهم فيعطى منه نفقتهم وأدويتهم وكفنتهم وعقل جنائيتهم. (۲)

(رد المحتار ج: ۲ ص: ۳۳۸ طبع سعید)

بیت المال میں لقطے کے مصرف کے بارے میں اور بھی متعدد کتب میں یہی عبارت موجود ہے، لیکن اس عبارت پر غور کرنے سے یہی بات معلوم ہوتی ہے کہ اگرچہ فقہاء نے فقراء کو لقطے کا مصرف قرار دیا ہے، لیکن اس کے لئے تملیک ضروری نہیں قرار دی جس کی واضح دلیل یہ ہے کہ فقیر اموات کی تکفین کو بھی لقطے کے مصرف میں شامل کیا گیا ہے، حالانکہ میت کی تکفین میں تملیک متحقق نہیں ہوتی چنانچہ زکوٰۃ کے باب میں اکثر متون میں یہ صراحت ہے کہ اس کو تکفینِ میت میں صرف نہیں کیا جاسکتا، الدر المختار میں ہے:

ويشترط ان يكون الصرف (اي الزكوة) تملیكاً لا اباحةً كما مرّ لا يصرف

(۱) رد المحتار ج: ۲ ص: ۳۳۸ (طبع سعید).

(۲) علامہ شامی کے کلام میں کفن پر اس کو خرچ کرنے کا جواز تو علامت اس کی ہے کہ علامہ شامی کے نزدیک اس کی تملیک واجب نہیں، لہذا عمارۃ القناطر ونحو ذالک بھی اس کے مصرف ہو سکتے ہیں۔ رفیع

(حاشیہ از حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب دامت برکاتہم العالیہ)

الی بناء نحو مسجد ولا الی کفن میت.

علامہ شامی الی کفن میت پر لکھتے ہیں:

لعدم صحة تملیک منه. (رد المحتار ج: ۲ ص: ۳۴۳ طبع سعید)

اس سے یہ واضح ہوا کہ فقہائے کرام نے تکفین میت کو تملیک قرار نہیں دیا، اس کے باوجود لقطے کے مصارف میں تکفین کو بھی شامل کیا جاسکتا ہے اس سے معلوم ہوا کہ لقطہ تملیک کے بغیر بھی فقراء پر صرف کیا جاسکتا ہے۔

۴۔ لقطے اور کسبِ خبیث کے مصارف میں صرف فقراء کی تخصیص ائمہ اربعہ میں سے صرف حنفیہ کے ہاں ہے، دوسرے ائمہ کرام یہ تخصیص نہیں فرماتے بلکہ وہ اس کو عام مصالح مسلمین میں خرچ کرنے کی اجازت دیتے ہیں، جیسا کہ درج ذیل عبارت سے واضح ہے:

(فی المعیار المعرب: ج: ۶ ص: ۱۴۶) ^(۱) وسئل بغض الفقهاء عمن تاب

وبیده مال حرام، لا یعرف أربابه، وليس معه غیره هل يأخذ منه ما یقتات

منه أم لا؟ فأجاب: قال الدودی: توبته تزیل ما بیده اما للمساکین أو

للمساکین أو ما فیہ صلاح المسلمین... الخ.

وفی الذخیرة للقرافی ^(۲) بحوالہ احکام المال الحرام ص: ۲۹۰ ^(۳)

الأموال المحرمة من الغصوب وغیرها اذا علمت أربابها ردت الیهم، والا

فهی من أموال بیت المال تصرف فی مصارفه الأولى فالأولی من الأبواب

والأشخاص علی ما یقتضیه نظر الصارف من الامام أو نوابه أو من حصل

ذلك عنده من المسلمین فلا تتعین الصدقة قد یكون الغزو أولى فی وقت

أو بناء جامع أو قنطرة، فتحرم الصدقة لتعین غیرها من المصالح.

وفی المجموع شرح المذهب (ج: ۹ ص: ۳۵۱) ^(۴) (فرع) قال الغزالی اذا

كان معه مال حرام وأراد التوبة والبراءة منه فان كان له مالک معین وجب

صرفه الیه أو الی وکیله فان كان میتاً وجب دفعه الی وارثه وان كان

لمالک لا یعرفه ویئس من معرفته فینبغی أن یصرفه فی مصالح المسلمین

(۱) طبع دار المغرب الاسلامی بیروت.

(۲) کتاب القراض الباب الاول ج: ۵ ص: ۱۶۷ (طبع دار الکتب العلمیة).

(۳) ص: ۲۸۹ (طبع ماریه اکیڈمی).

(۴) ج: ۱۰ ص: ۵۲۰ (طبع دار الکتب العلمیة بیروت).

العامۃ کالقناطر، والربط، والمساجد، ومصالح طریق مکة، ونحو ذلك مما يشترک المسلمون فيه، وإلا فیتصدق به علی الفقراء.

وفی نهاية المحتاج الی شرح المنهاج (ج: ۵ ص: ۱۸۵) ^(۱) أما مع جهلهم فان لم يحصل الیاس من معرفتهم وجب اعطاؤها للإمام لیمسکها أو ثمنها لوجود ملاکها وله اقتراضها لبیت المال، وان أیس منها أى عادة کما هو ظاهر صارت من أموال بیت المال فلمتولیه التصرف فیها بالبیع واعطاؤها لمستحق شیء من بیت المال. (کذا فی تحفة المحتاج بشرح المنهاج ج: ۶ ص: ۴۵) ^(۲)

وفی الانصاف للمرداوی (ج: ۱۱ ص: ۲۱۳) ^(۳) قوله: واختار الشیخ تقی الدین رحمہ اللہ تعالیٰ فیمن کسب مالا محرما یرضی الدافع، ثم تاب کثمن خمر ومهر بغی، وحلوان کاهن، الی قوله: فی مال مکتسب من خمر ونحوه یتصدق به، فاذا تصدق به فللفقیہر أکله ولولی الأمر أن یعطیه لأعوانه وقال أيضا فیمن تاب ان علم صاحبه دفع الیه وإلا دفعه فی مصالح المسلمین وله مع حاجته أخذ کفایتہ.

^(۴) (هكذا فی کتاب الفروع لابن مفلح ص: ۴۴۹)

بندہ محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۴۱۹/۱۰/۲۷ھ

إضافہ از مولانا محمد افتخار بیگ:

حضرت اقدس مفتی کفایت اللہ دہلوی قدس سرہ کفایت المفتی میں ایک سوال کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں (سوال مسجد کے بنک میں جمع شدہ روپیہ پر سود کے استعمال سے متعلق ہے):

جواب:- جو روپیہ بنکوں میں جمع کیا جائے اس کا سود بنک سے وصول کر لیا جائے تاکہ اس کے ذریعے سے مسیحی مذہب کی تبلیغ اور مسلمانوں کو مرتد بنانے کی اعانت کا گناہ نہ ہو، وصول کرنے کے بعد اس روپے کو امور خیر میں جو رفاہ عام سے متعلق ہوں، یا فقراء و مساکین کی رفع حاجات کے لئے مفید ہوں، مثلاً یتامیٰ

(۱) طبع دار احیاء التراث العربی بیروت.

(۲) تحفة المحتاج علی صدر حواشی الشیروانی فصل فیما یطراً علی المغصوب.

(۳) طبع دار احیاء التراث العربی بیروت.

(۴) ج: ۶ ص: ۴۴۸ (طبع عالم الکتب بیروت).

ومساکین اور طلباء مدارس اسلامیہ کے وظائف اور امداد کتب وغیرہ میں خرچ کرنا یا مسافر خانہ، کنواں، سڑک وغیرہ تعمیر کرنا، سڑکوں پر روشنی کرنا، یہ سب صورتیں جائز ہیں، البتہ مسجد پر خرچ نہ کی جائے کہ یہ تقدس مسجد کے منافی ہے، واللہ اعلم وعلمہ اتم۔

جواب از حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ: اوّل تو مسجد کا روپیہ بنک میں جمع کرنا جب دوسرا طریق حفاظت کا ہو، خلاف احتیاط ہے، اور اگر غلطی سے یا غفلت سے یا مجبوری سے ایسا اتفاق ہو گیا تو اس وقت وصول کرنے میں تو وہی عمل کرے جو مجیب اوّل نے تحریر فرمایا، البتہ جزو اخیر یعنی مصارف مذکورہ میں صرف کرنا اس میں ترمیم کی ضرورت ہے، وہ یہ کہ خاص مسجد میں صرف کرنا تو تقدس مسجد کے خلاف ہے، اور دوسری جگہ صرف کرنا ملک مسجد کا غیر مسجد میں صرف ہے، اس لئے دونوں محذوروں سے بچنے کی صورت یہ ہے کہ اس قدر روپیہ کسی سے قرض لے کر مسجد میں صرف کر دے اور اس سود کی رقم سے وہ قرضہ ادا کرے، اور یہ ثابت ہے کہ مسجد کی نیت سے جو قرض لیا جائے اس کا مسجد کی آمدنی سے ادا کرنا جائز ہے۔

کتبہ: اشرف علی عفی عنہ ۱۱/ ذیقعدہ ۱۳۵۴ھ

الجواب الثانی صحیح: بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

مسعود احمد عفا اللہ عنہ

نائب مفتی دارالعلوم دیوبند ۱۴/ ذیقعدہ ۱۳۵۴ھ

(کفایت المفتی ج: ۷ ص: ۱۰۴) (۱)

اس سے بھی معلوم ہوا کہ حضرت اقدس حکیم الامت قدس سرہ اموال خبیثہ کو تصدق علی الفقراء تملیک کے قائل نہیں، کیونکہ یہاں حضرت نے اس رقم کو مسجد کی ملکیت قرار دیا ہے، البتہ مسجد میں یا کسی دوسری جگہ صرف کرنے کو دوسری وجوہات کی بنا پر درست قرار نہیں دیا، اس کے بجائے صرف علی المسجد کے لئے حیلہ بیان فرمایا، اور لفظ کے بارے میں حضرت کا موقف بالنفصیل شروع میں گزر چکا ہے۔
واللہ اعلم بالصواب

(رائے گرامی حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب دامت برکاتہم العالیہ)

ناچیز کا رُحجان عرصہ دراز سے اسی طرف ہوتا تھا کہ کسبِ خبیث (اموالِ واجبۃ التصدق) کے تصدق میں تملیک واجب نہ ہونی چاہئے، کیونکہ یہ صدقہ اصل مالک کی طرف سے بہ طور صدقہ نافلہ کے ہوتا ہے، اور صدقاتِ نافلہ میں صدقاتِ جاریہ بھی داخل ہیں، جن میں تملیک نہیں ہوتی۔

تحریرِ ہذا کو دیکھنے سے اس رُحجان میں اور اضافہ ہوا، البتہ جن بزرگوں نے تملیک کو شرط یا واجب قرار دیا ہے، تحریرِ ہذا میں ان کی دلیل صرف یہ مذکور ہے کہ ”فقہائے کرامؒ نے اسے صدقہ قرار دیا ہے، لہذا اس سے استنباط کیا گیا کہ اس میں بھی صدقاتِ واجبہ کی طرح تملیک واجب ہوگی“ اگر یہی دلیل ہے تو احقر کے مذکورہ بالا رُحجان میں اس سے کمی واقع نہیں ہوئی، کوئی اور دلیل بھی اگر ہو تو اُسے دیکھ کر ہی کچھ عرض کر سکتا ہوں۔

واللہ اعلم

محمد رفیع عثمانی عفا اللہ عنہ

۱۴۱۹/۱۲/۱۱ھ



﴿فصل فی بیع الصّرف وأحكام الحلّی﴾

﴿والأوراق النقدية﴾

(بیع صرف، زیورات کی خرید و فروخت اور کرنسی نوٹوں کا بیان)

کاغذی کرنسی کا باہم تبادلہ ”بیع صرف“ نہیں ہے

(حضرت والا دامت برکاتہم کا تفصیلی موقف)

سوال :- سونا، چاندی کا موجودہ نوٹوں سے مثلاً پاکستانی کرنسی یا ملائیشیا کی کرنسی سے تبادلہ بیع صرف ہے یا نہیں؟ یعنی اس کاروبار میں تقابض فی المجلس ضروری ہے یا نہیں؟ کیونکہ کاروبار عمومی طور پر نوٹوں کے ذریعے ہوا کرتا ہے، یہ اس لئے لکھا کہ حضرت کی تحقیق ”کاغذی نوٹ اور کرنسی کا حکم“ سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ نوٹ سونے یا چاندی کے حکم میں نہیں جیسا کہ صفحہ نمبر ۴۰ پر ہے: ”پھر ایک ہی ملک کے کرنسی نوٹوں کے درمیان تبادلے کے وقت اگرچہ کمی زیادتی جائز نہیں، لیکن یہ بیع صرف بھی نہیں ہے کیونکہ یہ نوٹ کرنسی خلقی ثمن نہیں ہے بلکہ ثمن عرفی یا اصطلاحی ہیں۔“ نوٹوں پر زکوٰۃ کے بارے میں صفحہ نمبر ۲۳ پر علامہ احمد ساعاتی کی عبارت یوں نقل کی گئی ہے:

”فالذی أراه حقاً وادین الله علیه ان حکم الورق المالی کحکم النقدين

.... الخ“

میرے نزدیک صحیح بات جس پر میں اللہ تعالیٰ کے حضور جوابدہ ہوں یہ ہے کہ زکوٰۃ کے وجوب اور اس کی ادائیگی کے مسئلے میں ان کاغذی نوٹوں کا حکم بھی بعینہ سونے چاندی کے حکم کی طرح ہے۔

چونکہ بندے سے یہ مسئلہ کئی دفعہ پوچھا گیا تو بندے نے جیسے اپنے اساتذہ کرام خصوصاً مفتی عبداللطیف صاحب دارالعلوم سرحد پشاور سے سیکھا تھا کہ: ”یہ معاملہ بیع صرف کا ہے، اس لئے اس میں ادھار جائز نہیں“ بتا دیا، حتیٰ کہ ہمارے علاقے کے جو لوگ ملائیشیا میں سونے چاندی کا ادھار پر کاروبار

کرتے ہیں تو حتی الوسع ان کو بھی اس کا روبرو سے منع کیا اور بہت سے متعلقین اور سنار حضرات منع بھی ہو گئے، لیکن جب حضرت کے مقالے کا مطالعہ کیا تو تردد پیدا ہوا، اس لئے بندے نے اپنے اُستادِ محترم مفتی عبداللطیف سے رجوع کیا، حضرت اُستادِ محترم نے مسئلہ مذکورہ کے بارے میں فرمایا کہ یہ معاملہ بیعِ صرف کا ہے، لہذا بغیر تقابض فی المجلس کے جائز نہیں۔ اسی طرح بندے نے بنوری ثاؤن سے جواب منگوایا تو وہ بھی یہی تھا کہ یہ مذکورہ معاملہ بیعِ صرف ہے، لہذا بغیر تقابض کے جائز نہیں۔ لہذا بندہ آپ کی طرف متوجہ ہوا کہ کرنسی نوٹ کے بارے میں ”ثمنِ عرفی ہونے کی وجہ سے باہم تبادلے کے وقت تقابض ضروری نہیں، احد البدلین کا قبض ہونا کافی ہے“ یہ حضرت کی ذاتی رائے ہے یا عصرِ حاضر کے فقہائے کرام و علمائے عظام کی موافقت بھی شامل ہے؟ کیونکہ مسئلہ حلال حرام کا ہے، پھر عمل آپ محترم کی رائے پر کیا جائے یا اور حضراتِ محترمین کی رائے پر؟ کیونکہ اسی اُصول پر بہت سی جزئیات متفرع ہیں۔

والسلام

بندہ شیر محمد، فاضل دارالعلوم سرحد پشاور

مدرسہ عربیہ مسجد بلال، بونیر

جواب:- مکرّمی و محترمی زید مجدّم السامی، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

آپ کا گرامی نامہ موصول ہوا، مختلف جنس کی کاغذی کرنسیوں کے باہم تبادلے کے بارے میں احقر کا موقف یہ ہے کہ یہ بیعِ صرف نہیں ہے، لہذا تقابض فی المجلس ضروری نہیں، احد البدلین پر قبضہ کافی ہے۔ اور مختلف جنس کی کرنسیوں کے تبادلے میں تفاضل بھی جائز ہے اور نسیئہ بھی، البتہ چونکہ نسیئہ کو ربا کے جواز کا حیلہ بنایا جاسکتا ہے اس لئے نسیئہ کی صورت میں یہ ضروری ہے کہ نسیئہ کی وجہ سے قیمت میں اضافہ نہ کیا جائے بلکہ ثمنِ مثل پر بیع ہو۔

آپ نے پوچھا ہے کہ کیا دوسرے علماء بھی اس رائے سے متفق ہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ احقر کی یہ رائے ہندوستان کے مولانا مجاہد الاسلام صاحب نے وہاں کے بہت سے مفتی حضرات کو بھیجی تھی، ان میں سے اکثر حضرات نے اس سے اتفاق فرمایا، البتہ صرف ایک صاحب کا اختلاف مجھے یاد ہے۔ پاکستان کے بعض علماء نے اتفاق فرمایا، اور اب آپ نے دو علماء کے بارے میں لکھا ہے کہ ان کا فتویٰ اس سے مختلف ہے، اب معلوم نہیں کہ احقر کے دلائل ان حضرات کے سامنے تھے یا نہیں تھے؟ البتہ عرب ممالک کے بیشتر علماء اس معاملے میں احقر سے اختلاف کرتے ہیں، واضح رہے کہ علامہ احمد ساعاتی رحمہ اللہ کی جو عبارت^(۱) احقر نے اپنے مقالے میں نقل کی ہے وہ صرف وجوبِ زکوٰۃ کی حد تک

ہے، مبادلے کے صرف ہونے یا نہ ہونے کے متعلق انہوں نے کوئی بحث نہیں کی۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ اب یہ نوٹ تمام احکام میں سونے چاندی کے قائم مقام ہیں، لہذا ان پر بیع صرف کے احکام کا ہی اطلاق ہوگا، احقر کو ابھی تک اس موقف پر اطمینان نہیں ہوا جس کی وجہ مندرجہ ذیل ہیں:-

۱:- کرنسی نوٹوں کا ثمن ہونا تو آب واضح ہو چکا ہے، لیکن یہ بات غور طلب ہے کہ ان کو ثمنِ خلقی کہا جائے گا یا ثمنِ اعتباری اور ثمنِ عرفی؟ ظاہر ہے کہ انہیں ثمنِ خلقی قرار دینے کا کوئی راستہ نہیں، لازماً انہیں ثمنِ اعتباری یا ثمنِ عرفی ہی کہا جاسکتا ہے، لہذا ان کا حکم فلوس جیسا ہوگا، کیونکہ وہ بھی ثمنِ اعتباری ہیں، بلکہ نوٹوں کا ثمنِ اعتباری ہونا زیادہ واضح ہے، کیونکہ ان کی ذاتی قدر و قیمت فلوس سے بھی کم ہوتی ہے، انہیں ثمن بنانے والی چیز اعتبار اور اصطلاح کے سوا کچھ نہیں، اور فلوس کے بارے میں فقہاء نے تصریح فرمائی ہے کہ ان کا باہم تبادلہ صرف نہیں، نہ اس میں تقابض فی مجلس ضروری ہے۔^(۱)

۲:- اگر کرنسی نوٹوں کے باہم تبادلے کو صرف کہا جائے تو لازم آئے گا کہ جن اشیاء میں صرف جاری ہوتا ہے، اُن میں ایک چیز کا اضافہ ہو گیا، یعنی نصوص سے صرف سونے چاندی میں صرف جاری ہونا ثابت ہوتا ہے، اب لازم آئے گا کہ کرنسی نوٹ میں بھی سونے چاندی کے علاوہ صرف جاری ہو، ”ما یجرى فیہ الصّرف“ میں اس اضافے کی کوئی بنیاد نصوص یا کلام فقہاء میں نہیں ملتی۔

۳:- یہ بات میں اپنے مقالے میں واضح کر چکا ہوں کہ نوٹوں کی پشت پر اب نہ کوئی سونا ہے، نہ چاندی ہے، لہذا ان کو سونے چاندی کا نمائندہ قرار دے کر بھی ان پر صرف کے احکام جاری کرنا مشکل ہے۔

۴:- اگر ان میں صرف جاری کیا جائے اور ساتھ ہی سونے چاندی میں بھی صرف کو بدستور جاری سمجھا جائے تو سوال یہ ہے کہ کرنسی نوٹ سے سونا یا چاندی خریدنے کو صرف کہا جائے گا یا نہیں؟ اگر کہا جائے گا تو عجیب بات یہ ہے کہ غالب الغش سکوں سے سونے یا چاندی کے تبادلے کو کلی طور پر صرف نہ کہا جائے جبکہ غالب الغش سکوں میں کچھ نہ کچھ سونا یا چاندی ہوتا ہے، اور صرف انہی کے وزن کی حد تک ان میں تقابض شرط ہوتا ہے، زیادہ میں نہیں، اور کرنسی نوٹوں کے تبادلے کو کلی طور پر صرف کہا جائے جبکہ ان میں سونا چاندی بالکل موجود نہیں ہے۔

(۱) راجع للتفصیل الدر المختار ج: ۵ ص: ۱۷۹ وفتح القدیر ج: ۶ ص: ۱۶۲ والعناية للباہرتی ج: ۶ ص: ۱۶۲ وتكملة فتح الملہم ج: ۱ ص: ۵۸۷ الى ۵۹۰.

(۲) راجع البحر الرائق ج: ۶ ص: ۳۳۴ (طبع رشیدیہ) ورد المختار ج: ۵ ص: ۲۶۵ و ۲۶۶ (طبع سعید) ومجمع الأنهر ج: ۳ ص: ۱۷۶ (طبع غفاریہ) والہندیہ ج: ۳ ص: ۲۱۹، وراجع للتفصیل الی تكملة فتح الملہم ج: ۱ ص: ۵۸۶.

ان وجوہ سے ابھی تک احقر کو اس بیع کے صرف قرار دینے پر اطمینان نہیں ہوا، اگر ان اشکالات کا کوئی واضح جواب مل جائے تو احقر کو کوئی اصرار نہیں ہے، لیکن ابھی تک بہت سے علماء سے گفتگو کے نتیجے میں ان اشکالات کا کوئی جواب احقر کو نہیں ملا۔ عرب علماء کا بنیادی نکتہ یا تو یہ ہے کہ ذہب و فضة میں احکام صرف جاری ہونے کی علت ثمنیت ہے^(۱)، اور مالکیہ کے مسلک کے مطابق وہ ثمنیت عرفیہ کو بھی شامل ہے^(۲)، اور نوٹوں میں یہ علت پائی جاتی ہے، لیکن حنفیہ کے مسلک کے مطابق نہ ثمنیت علت ہے^(۳) اور نہ ثمنیت عرفیہ تمام احکام میں ثمنیت خلقیہ کے مساوی ہے۔ یا پھر وہ حضرات یہ کہتے ہیں کہ اگر تقابض شرط قرار نہ دیا گیا اور نسیئہ کو جائز کہا گیا تو ربا کا یہ حیلہ آسان ہو جائے گا کہ قرض لینے والا کسی غیر ملکی کرنسی میں ثمن مثل سے زائد ادھار ادائیگی کا معاملہ کر لے گا، لیکن اس کا حل احقر یہ عرض کر چکا ہے کہ نسیئہ کی وجہ سے قیمت میں اضافے کو ممنوع قرار دے دیا جائے اور نسیئہ کی صورت میں مبادلے کے لئے ثمن مثل کو ضروری قرار دیا جائے، اور کسی محذور سے بچنے کے لئے ثمن مثل کی پابندی فقہائے کرام نے متعدد مسائل میں ضروری قرار دی ہے، مثلاً بیع العینہ میں^(۴)، نیز کتابت فتویٰ کی اجرت میں^(۵)، لہذا اس محذور کا سد باب آسانی ممکن ہے۔

دوسری بات یہ بھی پیش نظر رہے کہ جو عرب علماء کرنسیوں کے باہم تبادلے کو صرف قرار دیتے ہیں، وہ ساتھ ہی اس بات کے بھی قائل ہیں کہ تقابض کے لئے دونوں طرف سے چیک پر قبضہ کر لینا کافی ہے، جو احقر کے نزدیک محل اشکال ہے۔ نیز ان میں سے بعض حضرات نوٹوں کو سونے چاندی

(۱ و ۲) لأن الثمنیة علّة عند المالکیة لتحريم ربا الفضل سواء كانت الثمنیة حقیقیة أو عرفیة وجاء فی المدونة الكبرى للإمام مالک ج: ۳ ص: ۵ (طبع دار الکتب العلمیة بیروت) ولو أنّ الناس اجازوا بینهم الجلود حتی تكون لها سكة وعین لکرها أن تباع بالذهب والورق نظرة..... لأن مالکاً قال: لا يجوز فلس بفلسین ولا تجوز الفلوس بالذهب والفضة ولا بالذنانیر نظرة.... الخ.

وراجع للتفصیل الی تکملة فتح الملهم ج: ۱ ص: ۵۸۷ الی ص: ۵۹۰.

(۳) تفصیل کے لئے تکملة فتح الملهم ج: ۱ ص: ۵۸۷ تا ۵۹۰ و فقہی مقالات ج: ۱ ص: ۳۳ ملاحظہ فرمائیں۔

(۴) وفي فتح القدير ج: ۶ ص: ۶۸ (ومن باع جاریة بألف درهم حالة أو نسيئة فقبضها ثم باعها من البائع قبل نقد الثمن) بمثل الثمن أو أكثر جاز، وان باعها من البائع بأقل لا يجوز عندنا.

وفي البحر الرائق ج: ۶ ص: ۸۲ لم يجوز شراء البائع ما باع بأقل مما باع..... الخ..... وقيد بالأقل احترازاً عن المثل أو أكثر فإنه جاز.

وكذا في الدر المختار ج: ۵ ص: ۷۴ ومجمع الأنهر ج: ۳ ص: ۸۸ وخلاصة الفتاوى ج: ۳ ص: ۵۰ والكفاية ج: ۶ ص: ۳۲۳.

(۵) وفي الدر المختار كتاب الاجارة مسائل شتى ج: ۶ ص: ۹۲ (طبع سعيد) ويستحق القاضى الأجر على كتب الوثائق قدر ما يجوز بغيره كالمفتى، فانه يستحق أجر المثل على كتابة الفتوى لأن الواجب عليه الجواب باللسان دون الكتابة بالبنان..... الخ.

وكذا في البرازية على الهندية ج: ۵ ص: ۴۹ وخلاصة الفتاوى ج: ۴ ص: ۴۸ (طبع امجد اكيڈمی لاہور).

کے حکم میں قرار دینے کے بعد خود سونے یا چاندی کے عروض تجارت ہونے کے قائل ہو گئے ہیں، جس میں تفاضل اور نسیئہ کو جائز کہنے لگے ہیں، جو خلافِ نصوص ہے۔

جہاں تک برصغیر کے بعض ان علماء کا تعلق ہے جو کرنسیوں کی بیع کو صرف قرار دینے کی طرف مائل ہیں (اور ان کی تعداد احقر کے علم میں بہت کم ہے) اور احقر کو ان سے گفتگو کی نوبت آئی، سوان میں سے اکثر کا نقطہ نظر یہ ہے کہ نوٹوں کی پشت پر سونا یا چاندی ہوتا ہے، لہذا اس پر سونے چاندی ہی کے احکام جاری ہونے چاہئیں، لیکن یہ بات بحالات موجودہ واقعے کے بالکل خلاف ہے، جیسا کہ احقر اپنے مقالے میں اس کو تفصیل سے واضح کر چکا ہے۔

بہر کیف! یہ احقر کی سوچ بچار کا حاصل ہے، تاہم اگر آپ احقر کی یہ تحریر مع احقر کے مقالے کے ان علماء کی خدمت میں بھیج دیں جنہوں نے اس معاملے کو صرف قرار دیا ہے (تاکہ احقر کے دلائل ان کے سامنے آجائیں) تو اُمید ہے کہ ان شاء اللہ مفید ہوگا۔ اگر وہ حضرات احقر کے مذکورہ بالا اشکالات کا جواب عنایت فرمائیں تو براہِ کرم احقر کو بھی مطلع فرمادیں، اگر احقر کی سمجھ میں آ گیا تو ان شاء اللہ اس کا اعلان کر دوں گا۔ مسئلہ حلال و حرام کا ہے، اس لئے اس میں مثبت ضروری ہے، اللہم اُرنا الحق حقاً وارزقنا اتباعه و اُرنا الباطل باطلا وارزقنا اجتنابه۔

والسلام

۱۴۱۶/۵/۱۹ھ

(فتویٰ نمبر ۱۹۹/۲۹)

ایک ملک کی کرنسی کے باہم تبادلے کی صورت میں تفاضل

کے حرام ہونے کی بنیادی وجہ (عربی فتویٰ)

سوال:- يعلم من مؤلفاتكم - تكملة فتح الملهم والمقالات الفقهية - أن بيع الدولار بالروبيات الباكستانية نساءً يجوز. مع أنكم رجحتم مذهب الامام محمد لن لا يفتح باب الربوا، فاذا كان كذلك فلا سبيل الى جواز البيع المذكور لأنه اذا حرم التفاضل حرم النساء بدليل توقف حرمة التفاضل على وجود جزئي العلة (القدر والجنس) وتوقف حرمة النساء على وجود أحدهما، فبينهما عموم وخصوص من وجه، وان كنتم تحكمون في حرمة بمذهب الامام محمد وفي جواز البيع المذكور بمذهب الشيخين فهذا عند الأحقر، تلفيق، أرجو من سماحتكم أن تبينوا وتوجروا، والسلام۔

محمد حقانی

۱۴ شوال ۱۴۱۷ھ

جواب:- لا شک أن التفاضل الذى يحرم بوجود القدر والجنس يتلازم مع حرمة النسبته ولكن التفاضل الذى يحرم فى الفلوس ليس نتيجة لوجود القدر، لأن الفلوس عدديّة بالاجماع وليست وزنيّة، وانما حرمة التفاضل فيها عند اتحاد الجنس ناتجة عن كونها أمثالا متساوية قطعاً، فيؤدى التفاضل فيه الى الفضل الخالى عن العوض، وهذا المعنى صرح به السرخسى فى المبسوط^(۲) والبايرتى فى العناية^(۳) ولعلّى نقلت عبارتهما فى بحثى على هذا الموضوع، وحرمة التفاضل فى مثله لا تتلازم مع حرمة النسبته، ولهذا صرح العلامة ابن عابدين وغيره ان الفلس بالفلسين لا يجوز عند محمد رحمه الله^(۴) والفلس بالفلس جائز بشرط أن يقبض أحد البدلين فى المجلس^(۵)، وهذا يدلّ على أنه ان قبض أحد البدلين فى المجلس، وأجلّ البدل الآخر، فان ذلك يجوز، فهو تصريح باباحة النساء مع حرمة التفاضل عند محمد رحمه الله فى المتعنين، وعند كل من الأئمة الثلاثة اذا كانت بغير أعيانها. فليس هناك تلفيق.

هذا ما ظهر لى

۱۳۱۷/۱۱/۲۵ هـ

(فتوى نمبر ۱۰۰/۲۵۷)

(۱، ۳ و ۶) قال البايرتى رحمه الله فى العناية على فتح القدير (ج: ۶ ص: ۱۶۲ طبع مكتبه رشيديه كوئته): بيع الفلس بجنسه متفاضلاً على أوجه أربعة بيع فلس بغير عينه بفلسين بغير أعيانها وبيع فلس بعينه بفلسين بغير أعيانها وبيع فلس بغير عينه بفلسين بأعيانها وبيع فلس بعينه بفلسين بأعيانها والكل فاسد سوى الوجه الرابع. أما الأول فلأن الفلوس الرانجة أمثال متساوية قطعاً لا اصطلاح الناس على اهدار قيمة الجودة منها فيكون أحد الفلسين فضلاً خالياً عن العوض مشروطاً فى العقد وهو الربا. وأما الثانى فلأنه لو جاز أمسك البائع الفلس المعين وطلب الآخر وهو فضل خال عن العوض. وأما الثالث فلأنه لو جاز قبض البائع الفلسين وردّ اليه أحدهما مكان ما استوجه فى ذمته فيبقى الآخر له بلا عوض اهـ.

وفى تكملة فتح الملهم ج: ۱ ص: ۵۸۷ بيع فلوس غير معينة بالتفاضل، كبيع الفلس الواحد بالفلسين اذا لم يعين المتعاقدان أحد البدلين، فانه لا يجوز باتفاق العلماء الحنفية، أما اذا كان البدلان غير متعنين فلان الفلوس الرانجة أمثال متساوية قطعاً لا اصطلاح الناس على اهدار قيمة الجودة منها، فيكون أحد الفلسين فضلاً خالياً عن العوض، مشروطاً فى العقد، وهو الربا. واما اذا كان الفلس الواحد متعيناً بعينه والآخران بغير أعيانها، فلأنه لو جاز أمسك البائع الفلس المعين وطلب الآخر، وهو فضل خال عن العوض، واما اذا كان الفلس الواحد غير متعين والآخران متعنين، فلأنه لو جاز قبض البائع الفلسين، وردّ اليه أحدهما مكان ما استوجه فى ذمته، فيبقى الآخر له بلا عوض اهـ.

وفى الدر المختار ج: ۵ ص: ۱۷۹ باع فلوساً بمثلها أو بدراهم أو بدنابير فان نقد أحدهما جاز وان تفرقا بلا قبض أحدهما لم يجز.

وفى التكملة ج: ۱ ص: ۵۸۷ بيع الفلوس بمثلها، كالفلس الواحد بالفلس الواحد الآخر، وهذا انما يجوز اذا تحقق القبض فى أحد البدلين فى المجلس قبل أن يفترق المتبايعان فان تفرقا ولم يقبض أحد شيئاً فسد العقد لأن الفلوس لا تتعين فصارت ديناً على كل أحد والافتراق عن دين بدّين لا يجوز.

(۲) وفى المبسوط للسرخسى ج: ۱۲ ص: ۲۲۰ (طبع مكتبه غفاريه كوئته) لأن الفلوس الرانجة أمثال متساوية قطعاً لا اصطلاح الناس على سقوط قيمة الجودة فيها ليكون أحد الفلسين فضلاً خالياً عن العوض.

(۳ و ۵) راجع الى رد المحتار ج: ۵ ص: ۱۷۹ و ص: ۱۸۰ (طبع سعيد).

۱:- سو روپے والے نوٹ کو چالیس یا پچاس روپے کے

بدلے فروخت کرنا

۲:- ایک ملک کی کرنسی کا دوسرے ملک کی کرنسی کے ساتھ

کمی بیشی کے ساتھ تبادلہ کرنا

۳:- ڈالر کی خرید و فروخت کا حکم

سوال ۱:- ہماری بری حکومت نے ملک برما میں استعمال کرنے کے لئے ایک سو والا نوٹ رائج کیا تھا، اب ۳ نومبر ۱۹۸۵ء کو حکومت کی طرف سے اعلان کیا گیا کہ آج سے ایک سو والا نوٹ منسوخ کر دیا گیا ہے لہذا آج سے پورے برما میں اس کا استعمال نہیں کیا جاسکتا۔ اس لئے جن جن لوگوں کے پاس ایک سو والا نوٹ موجود ہے وہ ۳۱ دسمبر کے اندر اندر اپنے اپنے متعلقہ بینکوں میں داخل کر دیں، اس اعلان کے دو دن بعد یہ اعلان ہوا کہ ایک گھرانے کا صرف ایک ہی فرد ایک ہی مرتبہ بینک میں داخل ہو سکے گا اور جتنی رقم داخل کی جائے گی پانچ ہزار روپے تک فوراً تبدیل کر کے دے دیئے جائیں گے اور پانچ ہزار سے زائد ہوگا تو اس میں سے پچاس فیصد فوراً دیا جائے گا اور باقی پچاس فیصد پھر بعد میں تحقیق و تفتیش کے بعد واپس تبدیل کر کے دینے کے قابل ہوئے تو دے دیا جائے گا، ورنہ حکومت اس رقم کو ضبط کر لے گی۔ اس اعلان کے بعد ایک سو والے نوٹ کی خرید و فروخت شروع ہو گئی، اس طرح سو کا نوٹ چالیس، پچاس روپے میں بکنے لگا، کیونکہ جن لوگوں کے پاس لاکھوں کی تعداد میں سو کا نوٹ جمع ہے ان کو خطرہ ہو گیا کہ اگر زیادہ تعداد میں روپیہ جمع کیا جائے تو کہیں قانون کی زد میں نہ آجائے۔ اب سوال یہ ہے کہ اس طرح سو کا نوٹ کمی بیشی کے ساتھ بیچنا جائز ہے یا نہیں؟

سوال ۲:- ایک ملک کے مروجہ روپے کا دوسرے ملک کے مروجہ روپے سے کمی بیشی کے ساتھ تبادلہ کرنا جائز ہے یا نہیں؟ مثلاً ایک شخص پاکستان میں دوسرے شخص کو پاکستانی سو روپے دیدے تو وہ شخص ملک برما میں دو سو برمی روپے اس کے بدلے میں دے تو یہ کمی بیشی جائز ہے یا نہیں؟

سوال ۳:- بہت سے لوگ ڈالر کی خرید و فروخت کرتے ہیں، شرعاً اس کا حکم کیا ہے؟

جواب ۱:- سو روپے کے نوٹ کو چالیس یا پچاس روپے میں خریدنا جائز نہیں،^(۱) کیونکہ آج کل یہ نوٹ فلوس کے حکم میں آگئے ہیں اور بیع الفلوس بالفلسین امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کے قول پر مطلقاً اور شیخین کے قول پر غیر معین ہونے کی صورت میں ناجائز ہے،^(۲) اور فتویٰ امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کے قول پر ہے،^(۳) لہذا نوٹوں کا تبادلہ کمی بیشی کے ساتھ جائز نہیں۔ اور جو حضرات نوٹوں کو فلوس کے بجائے دین کی رسید قرار دیتے ہیں، ان کے قول پر بھی یہ بیع الکالی بالکالی ہونے کی بناء پر ناجائز ہوگی،^(۴) لہذا سوال میں جو معاملہ مذکور ہے وہ کسی بھی طرح شرعاً جائز نہیں ہے۔^(۵)

البتہ اگر اپنی مالیت کے نقصان سے بچنا ہو تو اپنے سو روپے کے نوٹ ایسے شخص کے ہاتھ سو ہی روپے میں فروخت کئے جائیں جس کے پاس پانچ ہزار سے کم نوٹ ہوں، تاکہ وہ یہ نوٹ بینک میں داخل کر کے متبادل نوٹ یقینی طور پر وصول کر سکے۔

جواب ۲:- مختلف ملکوں کی کرنسیوں کا کمی بیشی کے ساتھ تبادلہ جائز ہے، بشرطیکہ کم از کم ایک فریق اپنے روپے پر مجلس بیع ہی میں قبضہ کر لے، لئلا یكون افتراقاً عن دین بدین۔

جواب ۳:- ڈالر کی خرید و فروخت کا بھی یہی حکم ہے کہ اگر ڈالر کو ڈالر سے بیچا جائے تو مساوات ضروری ہے، اور اگر کسی اور ملک کی کرنسی سے بیچا جائے تو کمی بیشی جائز ہے،^(۶) بشرطیکہ کم از کم ایک فریق أحد العوضین پر مجلس بیع ہی میں قبضہ کر لے۔^(۸)

اگر مختلف ملکوں کی کرنسیوں کو سرکاری سطح پر مقرر کردہ نرخ کے مطابق فروخت کیا جائے تو نمبر ۲ و نمبر ۳ میں ذکر کردہ تفصیل کے مطابق بیع بالکل جائز ہوگی، لیکن اگر اس نرخ سے کم و بیش نرخ مقرر کیا جائے تو اس میں تفصیل ہے کہ اگر ملک ایسا ہے کہ جہاں سرکاری طور پر مقرر کردہ نرخ کی مخالفت قانوناً جائز نہیں ہے تو وہاں اس نرخ سے کمی بیشی کرنا سود تو نہیں ہوگا لیکن ملکی قوانین کی مخالفت^(۹) اور اپنے آپ کو خطرے میں ڈالنے کی بنا پر جائز نہیں ہوگا۔^(۱۰)

واللہ اعلم

۱۴۰۶/۶/۵ھ

(فتویٰ نمبر ۶۷۰/۳۷ ب)

(۱ و ۲ و ۳) فی الہدایۃ ج: ۳ ص: ۸۵ (طبع رحمانیہ) ویجوز بیع الفلوس بالفلسین بأعیانہا عند أبی حنیفۃ وأبی یوسف وقال محمد لا یجوز لأن الثمنیۃ تثبت باصطلاح الكل فلا تبطل باصطلاحهما وإذا بقیت اثمانا لا تتعین فصار کما اذا کان غیر اعیانہما.... اھ

(۴ و ۵ و ۶ و ۷ و ۸) فی المستدرک للحاکم: ج: ۲ ص: ۶۵ و ۶۶ (طبع دار الکتب العلمیۃ بیروت) ”عن ابن عمر رضی اللہ عنہما أن النبی صلی اللہ علیہ وسلم نہی عن بیع الکالی بالکالی.“ رقم: ۲۳۴۲. ”عن ابن عمر رضی اللہ عنہما عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم أنه نہی عن بیع الکالی بالکالی هو النسیئۃ بالنسیئۃ“ رقم: ۲۳۴۳. واللہ اعلم.

(۹) ”يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ“ سورة النساء آیت: ۵۹۔ نیز دیکھئے ص: ۹۰ کا حاشیہ نمبر ۳۔

(۱۰) فی القرآن الکریم: ”وَلَا تُلْقُوا بِأَيْدِيكُمْ إِلَى التَّهْلُكَةِ“ سورة البقرة آیت: ۱۹۵۔

مختلف ممالک کی کرنسی کے باہمی تبادلے کا حکم

سوال:- ایک ملک کی کرنسی کو دوسرے ملک کی کرنسی کے مقابلے میں بیچنے اور شرح تبادلہ کے بارے میں حکم سے آگاہ فرمائیں۔

جواب:- ایک ملک کی کرنسی کو دوسرے ملک کی کرنسی سے بیچنا جائز ہے اور دونوں کے درمیان جو شرح تبادلہ باہمی رضامندی سے طے ہو جائے اس کا لین دین درست ہے۔

واللہ اعلم

۱۴۱۲/۱/۸ھ

چیک سے سونا چاندی کی خرید و فروخت سے متعلق ”تکملة فتح الملهم“ کی ایک عبارت کی توضیح و تصحیح

سوال:- من العبد عبدالقادر العارفي عفى عنه، الى سماحة أستاذي وشيخي العلامة العثماني حفظه الله ورعاه، السلام عليكم ورحمة الله وبركاته!
أرجو الله العليّ القدير لكم الصّحة والعافية الدائمة التامة كما أدعوه تعالى أن يبقاكم ذخراً للإسلام والمسلمين ويرزقكم صحّة وعافية دائمة، وأنا بخير والحمد لله.
أستاذي المؤقر! أنا تلميذكم من ايران، قد زرتكم بدار العلوم قبل خمسة أيام بعد العصر ثم في يوم الأربعاء صاحبكم لصلاة الظهر بخارج دار العلوم في معمل يقع أمام باب دار العلوم، وتكلّمت حول بعض المسائل ومنها: شراء الذهب والفضّة نسيئة، وأيضاً شراء الذهب والفضّة ودفع الشيك المصرفي بدل ثمنها؟ فأجبتهموني بأن هاتين المسئلتين جائزتان ولا غبار على جوازهما. ولكن جاء في التكملة ۱/ ۵۱۵ في مبحث الشيك المصرفي هكذا ولا يجوز اشتراء الذهب والفضّة به لفقدان التقابض في المجلس.

أرجو منكم الافادة ولكم الشكر الجزيل، وأتمس منكم الدعاء

تلميذكم عبدالقادر العارفي

جامعه دارالعلوم أهل السنة

خیابان خیام، مسجد مکی، زاهدان

بلوچستان، ایران

جواب:- عزیز گرامی قدر مولانا عبدالقادر عارفی صاحب مدظلہم العالی

السلام علیکم ورحمة اللہ وبرکاتہ!

آپ کا گرامی نامہ ملا، آپ نے واقعتاً بہت صحیح بات کی نشان دہی فرمائی۔ تکملة فتح الملهم

(ج: ۱ ص: ۵۱۵) پر میں نے جو لکھا ہے کہ: ”ولا يجوز اشتراء الذهب والفضة به لفقدان التقابض فی المجلس“ اس میں احقر سے غلطی ہو گئی ہے، دراصل یہ حکم اس وقت تھا جب نوٹ یا سکے چاندی سونے کی نمائندگی کرتے تھے، لیکن اب جبکہ نہ سکے چاندی سونے کا ہے، نہ نوٹ کی پشت پر چاندی سونا ہے، اور چیک نوٹ ہی کے جاری ہوتے ہیں اور سونے چاندی کی خرید و فروخت نوٹوں سے ہوتی ہے تو چیک سے سونے چاندی کی خرید و فروخت جائز ہے، کیونکہ وہ صرف نہیں، اور تقابض شرط نہیں، کما أوضحته فی أحكام الأوراق النقدية^(۱)۔ چنانچہ ”تکملة فتح الملهم“^(۲) میں تصحیح کر دی گئی ہے۔ جزاکم اللہ تعالیٰ خیراً۔

والسلام

۱۴۱۹/۱/۹ھ

(فتویٰ نمبر ۵۱/۳۰۹)

جیولری کے کاروبار اور سونے کی خرید و فروخت کے بارے میں اہم نوعیت کے مختلف سوالات کے جوابات (عربی فتویٰ)

سوال:- صاحب الفضيلة الشيخ مولانا محمد تقی عثمانی حفظہ اللہ وأدام ثوابہ السلام علیکم ورحمة اللہ وبرکاتہ وبعد.

أَسْأَلُ اللَّهَ سُبْحَانَهُ وَتَعَالَى أَنْ يَدِيمَ عَلَيْكُمْ نِعْمَةَ الْعَفْوِ وَالْعَافِيَةِ وَأَنْ يَحْفَظَكُمْ وَآلَ بَيْتِكُمْ مِنْ كُلِّ سُوءٍ وَمَكْرُوهٍ، وَأَنْ يَجْزِيَكُمْ عَنَّا وَعَنِ الْإِسْلَامِ وَالْمُسْلِمِينَ خَيْرَ الْجَزَاءِ، إِنَّهُ سَمِيعٌ مُجِيبٌ.

صاحب الفضيلة: سبب کتابتی هذه الرسالة الى فضيلتكم كثرة السؤال عن بعض المعاملات التجارية في مجال بيع الذهب والفضة، ولا يخفى ما لفضيلتكم من باع طويل في الدراسات الفقهية، لا سيما الاقتصادية منها، فأحببت أن أفيد نفسي وغيري ناهلاً من عذبتكم الفياض، مسترشداً بآرائكم القيمة، آملاً عظيم الأجر لكم عند الله، راجياً أن يعين ذلك السائلين على السير على الصراط المستقيم.

صاحب الفضيلة: من المعاملات التي كثر عنها السؤال ما يأتي:

۱- زيد تاجر ذهب في المدينة المنورة يصنع مصوغاته لدى مصنع في جدة، فيحتاج الى شراء سبائك من الذهب بوزن (۱,۰۰۰) جم، فيتصل بالبنك أو بتاجر جملة للذهب (بكر) لشراء الذهب فيخبر بأن سعر الكيلو يساوي (۴۲,۰۰۰) ريال، فيطلب زيد من

(۱) أحكام الأوراق النقدية ص: ۱۵۵ تا ۱۵۹۔

(۲) ج: ۱ ص: ۵۱۵ (طبع مكتبة دارالعلوم کراچی)۔

بكر أن يحجز له كمية من الذهب بالسعر المذكور ثم يبعث بالقيمة عن طريق الحوالة (بالكمبيوتر) فإذا استلم البائع المبلغ سلم الذهب للمصنع.

٢- المعاملة الأخرى والتي تسمى بـ (الشراء على السعر المفتوح) وصورتها كالتالى:
زيد المرید شراء الذهب عند ما أراد شراءه وكان يتوقع سعر الكيلو يساوى (٤٢,٠٠٠) ريال، وجد أن سعر الذهب ارتفع فجاءة الى (٤٤,٠٠٠) ريال، وهو يتوقع نزول السعر عما قريب، لكنه بحاجة الى الذهب فيتفق مع بكر على أن يشتري منه الذهب ويرسل له المبلغ وقدره (٤٢,٠٠٠) ريال، على أن يبقى السعر مفتوحا، فإذا نزل السعر بعد فترة قفل السعر، وهنا يرد احتمالا ان:-

الاحتمال الأول: أن يرتفع السعر أكثر، ولنفترض أنه وصل الى (٤٥,٠٠٠) ريال فيطلب البائع فرق السعر، فيضطر المشتري الى الدفع، وهو بعد ذلك بالخيار بين أن يقفل السعر بالسعر الحالى، أو ينتظر نزول السعر ويستمر على تلك الحالة.

الاحتمال الثانى: أن ينزل السعر الى أدنى من (٤٢,٠٠٠) ريال، ولنفترض أنه وصل الى (٤١,٠٠٠) ريال فيطلب المشتري من البائع قفل السعر، فيقفل البائع السعر، ويرد له المبلغ المتبقى.

٣- يتعامل بعض الناس (بالشراء على المفتوح) السابق الذكر لا لقصد شراء الذهب نفسه، ولكن بقصد الاستثمار، وقصدهم من ذلك أن يشتروا الذهب بسعر يومه، ولنفترض أنه (٤٢,٠٠٠) ريال، ثم اذا ارتفع السعر باعوه، لكن هذه المعاملة تبقى من حيث البيع والشراء الفعلى على الورق فقط، اذ لا يكون فيه استلام ولا تسليم لأنه غير مقصود بذاته، بل المقصود هو الاستثمار فقط، وان كان البائع يلتزم بالبيع الفعلى وتسليم الذهب للمشتري لو طلب منه ذلك، وفي هذه المعاملة أمر آخر كذلك وهو أن البائع يتيح الفرصة للمستثمرين باستثمار كمية كبيرة من الذهب بمبلغ قليل وعلى سبيل المثال: يمكن للمستثمر أن يشتري ١٠ كيلو جرام من الذهب والذي يبلغ قيمته افتراضاً (٤٢٠,٠٠٠) ريال على أن لا يدفع سوى ٢٠٪ من قيمة الصفقة، ويبقى التعامل كما سبق ذكره فى الصورة السابقة، وواضح أن البائع لن يسلم الذهب للمشتري لأنه لم يستلم كامل القيمة بل يتولى بنفسه بيعها ليأخذ قيمتها ويدفع المكسب للمشتري الأول ان كان هناك مكسب، فان حصلت الخسارة فى البيع أخذه من المشتري، لأنه بمثابة الوكيل له.

٣- وضمن هذه الصورة صورة أخرى وهى أن يقوم بكر ببيع كمية من الذهب لزيد دون أن يكون زيد قد اشترى شيئاً ولنفترض أن بكرًا باع لزيد كيلو ذهب بسعر (٤٢,٠٠٠)

ریال، رغم أن زیڈاً لا یملک شیئاً من هذا الذهب، ولكن بکراً باع هذا من عنده له، والقصد من هذا البیع أن لو نزل السعر فيما بعد فان زیڈاً یشتري الذهب ویرده لبکر، فاذا زاد السعر خلاف المتوقع فان زیڈاً سیخسر فرق السعر وان نزل السعر کسب بقدره.

ویبقى أن أوضح لفضیلتکم أن بکراً یستفید من عملیتی البیع والشراء دلالة، وانه یحتفظ بمبلغ من المال أكثر من المنصرف فی البیع والشراء تحاشياً للخسارة فی حالة ما اذا تقاعس زیڈ عن تحمل الخسارة ان وجدت خلال عملیتی البیع والشراء.

۵- بیع آخر وهو أن یحتاج المرء لشراء الذهب عندما یكون السعر ۴۰,۰۰۰ (أربعین ألف) ریال، فیبیع علیه تاجر الجملة بسعر ۴۵,۰۰۰ (خمسة أربعین ألف) ریال علی أن یسدد له المبلغ بعد مدة (قد تطول الی سنة).

هذا وأرجو من فضیلتکم التفضل بالاجابة علیها مدعماً بالأدلة، ولو لا یقینى بوقف حیاتکم الکریمه فی خدمة الاسلام والمسلمین لما تجرأت بالكتابة الی فضیلتکم لما أعلم من كثرة مشاغلکم والمسئولیات المنوطة بفضیلتکم، الا أن شدة حاجة الناس الی ایجاد حل شرعى لهذه المعاملات التی هم واقعون فیها شجعنی الی الكتابة الیکم، فأرجو قبول عذری فی الكتابة، وقبول رجائی فی الاجابة.

أثابکم الله علی ما تقومون به من خدمات الجلیلة للاسلام والمسلمین، وجعل ذلك فی میزان حسناتکم يوم الدین، ویوفقنی وایاکم للعمل علی نهج سید المرسلین.

والسلام علیکم ورحمة الله وبرکاته

تلمیذکم / محمد یعقوب محمد یوسف الدهلوی

۲۱/ صفر ۱۴۱۸ هـ المدينة المنورة

جواب:- الی الأخ العزیز فی الله السید محمد یعقوب محمد یوسف الدهلوی،

حفظه الله تعالی.

انی أحمد الیکم الله الذی لا اله الا هو، وأصلی وأسلم علی نبیه الکریم الهادی

الأمین، وعلی آله وأصحابه أجمعین، وبعد:

فلا أدری کیف أعبر عن ندمی فی التأخیر فی الاجابة علی أسئلتکم الکریمه، وليس

لی الا أن أطلب منکم العفو والمعذرة فی ذلك، وأرجوکم أن تعذرونی بسبب ازدحام الأشغال وتتابع الأسفار الذی أعانیه کلّ حین.

والیکم الجواب عن الأسئلة:

۱- هذا الطریق للتعامل فی شراء الذهب سلیم من الناحیه الشرعیة، فان الاتصال

بتاجر الذهب بجدة وطلب حجز كمية من الذهب لیس إلا مساومة، والحجز التزام أو وعد

من قبل التاجر بأنه سيبيع هذا الذهب عندما يتسلم ثمنه، أما عقد البيع فانه يقع بعد ما يحول زيد ثمن الذهب الى حساب التاجر، وفي الوقت نفسه يسلم التاجر الذهب الى المصنع، ولئن كان هناك فصل بين تسلّم الثمن وتسليم الذهب، فالثمن يكون أمانة بيد التاجر الى أن يسلم الذهب الى المصنع، وحين يسلم الذهب اليه، فإن الأمانة تنقلب ثمنًا، وبهذا تصحّ المعاملة، حتّى على قول من يشترط التقابض في المجلس في مبادلة الذهب بالأوراق النقدية، ^(١) أما على قول من يقول: إنّ مبادلة الذهب بالنقود الورقية ليست صرفًا، ^(٢) ولا يشترط فيها التقابض، فلا اشكال أصلاً، وإن هذا القول هو الراجح عندي، ^(٣) وعند أغلبية علماء الهند وباكستان.

٢- الشراء على السعر المفتوح“ كما شرحتموه في السؤال الثاني، لا يجوز أصلاً لأنّ هذا البيع فيه غررٌ بجهالة الثمن عند العقد، ولا يقاس جوازه على جواز البيع بما ينعقد عليه السعر (كما أجازته الحنابلة وبعض الحنفية) لأنّ المراد من السعر هناك سعر السوق يوم العقد، أما في صورتنا المسئول عنها، فإنّ المراد من السعر ليس السعر يوم العقد، وأنما المراد السعر الذي تنتهي اليه السوق بعد العقد الى مدة مجهولة، فلا شك في أنّ هذه الجهالة مفسدة للعقد، ولا يجوز البيع بهذا الطريق.

٣- إنّ هذه الصّورة أشدّ حرمة، لأنه قد ازداد فيها محذور آخر غير الجهالة والغرر، وهو أنه ليس هناك بيع حقيقى يراد به التسليم والتسلّم، وأنما المقصود دفع فروق الثمن، فهو أشبه بالمضاربة القمارية الرائجة في البرصات، ولا يجوز بحال.

أما الصّورة الأخرى التي ذكرتموها في هذا السؤال، وهو أن البائع يتيح الفرصة للمستثمرين باستثمار كمية كبيرة من الذهب بمبلغ قليل ... الخ، فإن كان هذا على أساس السعر المفتوح، فهو غير جائز كما بينا، أمّا اذا كان السعر معلوماً متعيناً عند الشراء، ولكن انما يدفع المشتري ٢٠٪ من الثمن فقط، فلا يجوز عند من يشترط التقابض في شراء الذهب بالنقود الورقية. أما على القول الآخر، وهو عدم اشتراط التقابض في مبادلة الذهب بالنقود الورقية، وهو الراجح عندي، فإنما تجوز هذه المعاملة بشروط تالية:

- (ألف) - أن يقع البيع باتاً، ويكون الثمن متعيناً غير مذبذب.
- (ب) - أن يخلّى البائع بين الذهب والمشتري، بحيث يمكن للمشتري أن يقبض الذهب المبيع متى شاء.
- (ج) - أن يوكل المشتري نفس البائع ببيع ذلك الذهب نيابة عنه بعد التّخلية، ويجب أن لا يكون هذا التوكيل مشروطاً في عقد البيع.
- (د) - أن يكون الذهب المبيع مفصولاً عن غير المبيع، ويكون في ضمان المشتري،

بحیث إن هلك أو سُرق فانه يهلك من مال المشتري، وليس من مال البائع.
وانما تشترط هذه الشروط فى ٨٠٪ من المبيع الذى لم يدفع المشتري ثمنه، لئلا يكون بيع الكالى بالكالى. أما ٢٠٪ من الذهب المبيع الذى دُفع ثمنه، فيصح فيه التوكيل وان لم يقع الفصل والتخلية، لأنه لا يشترط قيام الأثمان فى ملك البائع أو فى قبضه عند العقد، كما فى مبسوط السرخسى ١٢: ٢٢.

٢- الظاهر من قولكم: "لو نزل السعر فيما بعد، فان زيدها يشتري الذهب ويرده لبكر" أن الذهب الذى يبيعه بكر لزيد، فكأنما يقرض بكر زيدا هذا القدر من الذهب، ثم يوكله زيد ببيعه نيابة عنه، فان كان هذا هو المقصود فان ذلك جائز بشرط أن يلتزم زيد أنه يرد عين ذلك المقدار الى بكر سواء أنزل السعر أم ارتفع، فمثلا: يستقرض ١٠٠٠ غرام من الذهب من بكر، ويلتزم رد ١٠٠٠ غرام من الذهب على سبيل القرض (دون البيع) ثم يوكله ببيع هذا الذهب نيابة عنه دون أن يشترط التوكيل فى عقد الإقراض، وفى النهاية يرد على بكر ألف غرام من الذهب، سواء أنزل السعر أم ارتفع، وفى هذه الحالة يجوز لبكر أن يطالب عمولة على خدماته كوكيل للبيع، ويجب أن تكون هذه العمولة مساوية لأجر مثل هذه الخدمات فى السوق، ولا يزداد على أجر المثل لئلا يكون قرضا جر نفعاً. وما ذكرتم من أن "بكرًا يستفيد من عمليتي البيع والشراء دلالة.... الخ" ان كان المقصود منه أنه يتقاضى أجره السمسرة فى عمليتي البيع والشراء، فقد ذكرت أن أجره السمسرة انما تجوز على عملية البيع بالنيابة عن زيد. أما إقراض الذهب كما ذكرت او بيع الذهب الى بكر فلا يجوز تقاضى الأجر عليه، وان كان المقصود غير ذلك فالمرجو الايضاح، فانى لم أفهم كلامكم هذا حق الفهم.

٥- هذا لا يجوز عند من يشترط التقابض فى مبادلة الذهب بالعملة الورقية، ولكن يجوز عند من لا يشترط ذلك، وهو الراجح عندى بشرط أن تكون مدة التسديد معلومة عند العقد، أما الأدلة فقد بسطتها فى كتابى "أحكام الأوراق النقدية". والخلاصة أن النقود الورقية ليست أثمانا خلقية وانما هى أثمان اعتبارية، فهى بمنزلة الفلوس، فيجرى فيها حرمة التفاضل فيما بينها اذا كانت من جنس واحد، ولكن لا تجرى أحكام الصرف فى مبادلة الذهب بها، كما أنها لا تجرى فى مبادلة الفلوس بالذهب. والله سبحانه وتعالى أعلم وعلمه أتم وأحكم، وأرجو أن فى هذا الجواب كفاية، فان كان لديكم مزيد من الاستيضاحات، فالمرجو الاستفسار مرة ثانية.

والله تعالى هو الموفق!

١٢١٨/٣/٢٤ هـ

(فتوى نمبر ٢٤٦/٣٦)

عالمی مارکیٹ میں کرنسی کے کاروبار کا طریقہ کار

اور اس کی شرعی حیثیت

(کمپنی کے ذریعے ڈالر کی مخصوص مقدار کی لاٹ خرید کر کرنسی کے کاروبار کی شرعی حیثیت)

سوال:- عرض ہے کہ میں کرنسی کا کاروبار کرتا ہوں، جس کی نوعیت اس طرح سے ہے کہ امریکا سے پوری دنیا میں مختلف ممالک کے کرنسی نوٹوں کی قیمتوں کا اجراء ہوتا ہے، ہم لاہور میں بیٹھ کر سیٹلائٹ کے ذریعے کمپیوٹر اسکرین پر وہ قیمتیں وصول کرتے ہیں، قیمتیں ملکی حالات کی وجہ سے کم یا زیادہ ہوتی رہتی ہیں، ہم ان قیمتوں پر کرنسی کی خرید و فروخت کرتے ہیں، جس کا طریقہ اس طرح سے ہے کہ ہم براہ راست کرنسی کی خرید و فروخت نہیں کر سکتے بلکہ ایک کمپنی کے ذریعے یہ کاروبار کرتے ہیں، انہوں نے ایک اصول وضع کیا ہوا ہے، وہ یہ کہ دو لاکھ ڈالر کی ایک لاٹ ہوتی ہے، جو آدمی خرید کر پھر اُس کو فروخت کر سکتا ہے، لیکن ہمیں صرف اس کا پانچ فیصد کمپنی کو اپنے نام پر جمع کروانا ہوتا ہے، جو کہ صرف ایک ہزار ڈالر بنتا ہے، ایک ہزار ڈالر سے اپنا اکاؤنٹ کھلوا کر اب ہم اس قابل ہیں کہ دنیا کی مارکیٹ میں ہم ایک لاٹ خرید سکتے ہیں، ہماری طرف سے بقیہ رقم بطور زر ضمانت کمپنی جمع کرواتی ہے، اس طرح ہمارا بظاہر ایک ہزار ڈالر کی سرمایہ کاری ہوئی، لیکن ہم کاروبار دو لاکھ ڈالر کا کر رہے ہوتے ہیں، یعنی ہم دو لاکھ ڈالر کی کرنسی کی خرید و فروخت کرتے ہیں۔ اب ہمیں نفع یا نقصان کیسے ہوتا ہے؟ اس کی صورت یہ ہے کہ ہم کمپیوٹر اسکرین پر دنیا کے مختلف بینکوں کی طرف سے دی گئی قیمتوں کا جائزہ لیتے ہیں، کرنسی کے ماہرین اپنی رائے دیتے رہتے ہیں کہ آیا یہ کرنسی آئندہ قیمت میں بڑھ جائے گی یا کم ہو جائے گی، آپ کے علم میں ہوگا، بہر حال اگر مزید کسی بات کی وضاحت درکار ہو تو میں حاضر ہوں، لیکن اس خط و کتابت میں وقت لگ جائے گا۔ مجھے اس کے متعلق چند گزارشات سے مطلع فرمائیں:-

۱- کیا یہ سارا کاروبار ناجائز ہے یا اس کی کچھ جزئیات؟

۲- اگر کچھ جزئیات ناجائز ہیں تو ان کی مختصر وضاحت فرمائیں۔

۳- کس طریقے سے یہ کاروبار جائز ہو سکتا ہے؟

اس کے علاوہ ہمیں کرنسی کے متعلق مختلف ملکوں کی خبریں بھی وصول ہوتی رہتی ہیں، اور پھر کمپیوٹر پر ہی مختلف گراف کے ذریعے اُس کرنسی کی صورت حال کا جائزہ لیتے ہیں کہ آئندہ لمحات میں اس کرنسی کی کیا صورت حال ہوگی۔ تو ان تمام قرائن کے ذریعے ہم ایک رائے قائم کر کے اس کو خرید

لیتے ہیں، مثلاً اسکرین پر ہمیں پاؤنڈ اسٹرلنگ کی قیمت 1.6700 نظر آرہی ہے، ہم کمپنی کے ذریعے بذریعہ ٹیلی فون اُس بینک سے اس قیمت کی تصدیق کرواتے ہیں کہ آیا آپ کی قیمت فروخت یہی ہے؟ وہ ہمیں اس قیمت کے معمولی فرق کے ساتھ قیمت بتاتے ہیں، تصدیق کے بعد ہم پہلے ان سے زبانی معاہدہ کرتے ہیں کہ ایک لاث ہم نے خرید لی، پھر اس معاہدے کو تحریری طور پر لکھ کر بذریعہ فیکس اُن تک پہنچاتے ہیں، اب یہ لاث ہم نے خرید لی، اور یہ ہماری ہوگئی، اب ہمیں ہر صورت میں اس کا نفع یا نقصان اٹھانا ہوگا، اس خریداری میں اُس کرنسی پر حسی قبضہ تو ہوا نہیں، اور نہ ہی ہو سکتا ہے، اس لئے کہ وہ کرنسی ہمارے ضمان (Risk) میں آگئی، اب جب اُس کرنسی کی قیمت بڑھ گئی تو اسی طریقے پر بذریعہ ٹیلی فون ہم نے اس کو فروخت کر دیا، مثلاً اگر 1.6700 پر خریدا اور 1.6710 پر اُس کو فروخت کر دیا، اور اس قیمت خرید کا بھی تحریری معاہدہ ہو گیا، یہ جو 10 اعشاریہ ہمیں نفع میں بچے اس کی قیمت 125 ڈالرز ہوئی، وہ اس طرح کہ انہوں نے ایک پوائنٹ کی قیمت 12.50 ڈالرز طے کی ہوئی ہے، اس طرح 10 پوائنٹ کی $125 = 10 \times 12.50$ ہوئی جو ہمارا نفع ہے، اگر کرنسی کی قیمت کم ہو جائے تو اس شرح سے ہمیں نقصان اٹھانا پڑے گا، قبضے کی صورت کا جو حوالہ میں نے عرض کیا ہے وہ آپ کی کتاب ”شیرز کی خرید و فروخت“ میں سے اخذ کر کے لکھا ہے۔

کمپنی کا مفاد:- کمپنی ہمیں کاروبار کروانے کے لئے یہ ساری سہولتیں میسر کرتی ہے: ۱- ٹیلی فون کے ذریعے رابطہ، ۲- مارکیٹ جہاں بیٹھ کر ہم کاروبار کرتے ہیں، ۳- انٹرنیٹ سسٹم، ۴- دو لاکھ ڈالرز کا زِ ضمانت۔ اس کے علاوہ چند اور سہولتیں بھی۔ ان تمام سہولتوں کے ساتھ ہم ایک ٹریڈ (یعنی ایک دفعہ کرنسی کو خرید کر پھر فروخت کرنے سے ایک ٹریڈ مکمل ہو جاتی ہے) اس ایک ٹریڈ پر کمپنی ہم سے 60 ڈالرز کمیشن وصول کرتی ہے، اس ٹریڈ میں ہمیں نفع ہو یا نقصان، کمپنی کا 60 ڈالرز کا کمیشن طے ہے، یہ اُس صورت میں ہے کہ اگر ہم ایک کرنسی کو اُسی دن خرید کر فروخت کر دیں، اگر آج ہم نے کرنسی خریدی ہے اور اُس کی قیمت مناسب نہیں مل رہی ہے، اُس کو ایک دن بعد یا چند دن بعد فروخت کرنا چاہتے ہیں تو کمپنی ہم سے 60 ڈالرز کے علاوہ ہر دن کے حساب سے 20 ڈالرز مزید وصول کرے گی، اس لئے کہ کمپنی کا دو لاکھ ڈالرز کاروبار میں بطور زِ ضمانت جمع ہوا ہے یا استعمال ہو رہا ہے، اس پر کمپنی 20 ڈالرز یومیہ وصول کرتی ہے، اگر ہم ایک ہی دن میں خرید و فروخت مکمل کر لیں تو پھر صرف 60 ڈالرز کمیشن ہی کمپنی لے گی اس کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ جواب عنایت فرمائیں۔

جواب:- کرنسی کے کاروبار کی جو تفصیل آپ نے اپنے خط میں لکھی ہے، اس تفصیل کے

مطابق یہ کاروبار جائز نہیں، جس کی وجوہات مندرجہ ذیل ہیں:-

۱- جہاں تک ہمیں معلوم ہے اس طرح کے کاروبار میں جب کوئی لاٹ خریدی جاتی ہے تو وہ خریدار کو متعین اور الگ کر کے حوالے نہیں کی جاتی،^(۱) بلکہ اس کے اکاؤنٹ میں تحریر کردی جاتی ہے، پھر جب وہ خریدار اسے آگے کسی شخص کو فروخت کرتا ہے تو اس وقت اگر اُسے نفع ہو تو صرف نفع واپس کر دیا جاتا ہے، اور اگر نقصان ہو تو اس سے وہ نقصان طلب کر لیا جاتا ہے۔ خلاصہ یہ کہ پوری خرید کردہ لاٹ تحویل میں نہیں دی جاتی بلکہ کاغذی طور پر اس کے اکاؤنٹ میں منتقل کردی جاتی ہے، اور آخر میں نفع اور نقصان کا فرق برابر کر لیا جاتا ہے، جو سٹے کی ایک قسم ہے۔

۲- یہ واضح رہے کہ کرنسی کے حکمی قبضے کے لئے بھی یہ کافی نہیں ہے کہ کرنسی کی قیمت بڑھنے یا گھٹنے کا نقصان متعلقہ شخص کے ذمے ہو جائے، بلکہ قبضے کے لئے یہ ضروری ہے کہ خریدی ہوئی کرنسی غیر خرید شدہ کرنسی سے بالکل ممتاز کر کے الگ کر لی جائے،^(۲) اور خریدار یا تو خود قبضہ کرے یا اس کا کوئی وکیل اس کی طرف سے اسے اپنی تحویل میں اس طرح لے لے کہ وہ متعین کرنسی جل جائے یا چوری ہو جائے تو نقصان خریدار کے ذمے سمجھا جائے،^(۳) ظاہر ہے کہ یہ صورت مذکورہ کاروبار میں نہیں کہ کرنسی کو الگ کر لیا گیا ہو، اور خریدار کے کسی نمائندے کی تحویل میں دے دیا گیا ہو۔

واضح رہے کہ شرعی اعتبار سے کرنسی اور دوسری اجناس کی تعیین میں یہ فرق ہے کہ دوسری اجناس اشارے یا علامتوں سے متعین ہو سکتی ہیں، لیکن کرنسی اس وقت تک متعین نہیں ہوتی جب تک کہ اس پر کوئی شخص خود یا اپنے کسی نمائندے کے ذریعے قبضہ نہ کر لے۔^(۴)

۳- آپ نے جو طریق کار لکھا ہے، اس کی رو سے خریدار صرف ایک ہزار ڈالر کی ادائیگی کرتا ہے، باقی کی ادائیگی نہیں کرتا، اگرچہ باقی رقم بطور زر ضمانت کمپنی جمع کراتی ہے، مگر رقم درحقیقت

(۱ و ۲) وفي الهندية ج: ۳ ص: ۱۶ ويعتبر في التسليم أن يكون المبيع مقررًا غير مشغول بحق غيره هكذا في الوجيز للکردري، وأجمعوا على أن التخلية في البيع الجائز تكون قبضًا الخ.

وفي البدائع ج: ۵ ص: ۲۴۲ فالتسليم والقبض عندنا هو التخلية والتخلي وهو أن يخلّي البائع بين المبيع وبين المشتري برفع الحائل بينهما على وجه يتمكن المشتري من التصرف فيه فيجعل البائع مسلمًا للمبيع والمشتري قابضًا له اهـ.

(۳) وفي البدائع ج: ۵ ص: ۲۱۸ (طبع سعيد) ان الدراهم والدنانير وان كانت لا تتعين بالعقد ولكنها تتعين بالقبض و قبضها واجب.

وفيه أيضًا ج: ۵ ص: ۲۱۹ ان الدراهم والدنانير لا تتعين بالتعيين وانما تتعين بالقبض فشرطنا التقابض للتعيين لا للقبض. وفي فتح القدير ج: ۶ ص: ۱۶۰ (طبع رشيدية كوئٹہ) فان الدراهم والدنانير لا تتعين مملوكة بالعقد الا بالقبض الخ. وفي المحيط البرهاني ج: ۸ ص: ۷۵ و ۷۶ (طبع رشيدية كوئٹہ) ان الدراهم والدنانير أن كانا لا يتعينان في عقود المعاوضات يتعينان عند القبض، فيعقد العقد فيما بين المتعاقدين في الحال مفيدًا الملك عند التعيين بالقبض الخ.

خریدار کے ذمے دین ہوتی ہے۔

دوسری طرف کرنسی بیچنے والا خریدار کو اس شرعی طریقے پر قبضہ نہیں دیتا جس کا ذکر اوپر نمبر ۲ میں کیا گیا، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ رقم دونوں طرف دین ہوتی ہے، لہذا یہ بیع الکالی بالکالی میں داخل ہونے کی وجہ سے جائز نہیں۔^(۱)

۴۔ درمیانی کمپنی جو کمیشن وصول کرتی ہے وہ یا تو ضمانت کی فیس ہے یا اس رقم کا معاوضہ ہے جو وہ خریدار کی طرف سے بیچنے والے کو ادا کرتی ہے، پہلی صورت میں یہ ”أجرت علی الکفالة“ ہے اور دوسری صورت میں یہ قرض پر سود ہے، اور دونوں طریقے ناجائز ہیں۔ واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم

۱۴۲۰/۲/۲ھ
(فتویٰ نمبر ۶/۳۶۳)

کرنسی نوٹ کی شرعی حیثیت سے متعلق حضرت والا دامت برکاتہم کی رائے اور ”نوٹ“ کے بدلے سونے چاندی کی نقد اور ادھار خرید و فروخت کا حکم

سوال:- الیٰ فضيلة الأستاذ القاضي مولانا محمد تقی عثمانی حفظہ اللہ تعالیٰ ورعاه السلام علیکم ورحمة اللہ وبرکاتہ، نتمنیٰ أن تكونوا بالصّحة والعافية وأن يجعلکم اللہ تعالیٰ علی الخیر فی الدارين وبعد:

أستاذنا الفاضل: نشغل بتجارة بضاعة الزينة مصنوع من الفضة بيعة وشراء، في بلدنا أكثر التجارة يدور بالشيك والسند موقوفًا وغير موقوف، وأحيانًا دون الشيك أي يدفع في المستقبل بدون تعيين الوقت في أثناء البيع. هكذا كُنّا نستمر بالتجارة الیٰ أن نسمع أن بيع الفضة والذهب أو بضاعة الزينة مصنوع من الفضة والذهب لا يجوز بالشيك والسند موقوفًا لا بد من دفع النقود في أثناء القبض. فنحن المسلمون ينبغي علينا أن نعيش بأحكام الشرعية في أمورنا الدنيوية من أجل ذلك ذهبنا الیٰ علمائنا الأتراک وسألنا عن المسئلة، بعضهم أجابوا بالجواز، لأن الفضة فقدت كيفية النقد وكأنها صارت كالْبضاعة والسلعة. والآخرون قالوا لا يجوز بيع الموقوف ولو كان بالشيك والسند، لأن فيه نص يحرمه. بین هذین جوابین تحیرنا وتعجبنا، حتی بعض مِنّا بدأنا أن نغیر عملنا ونبحث عن

(۱) عن ابن عمر رضی اللہ عنہما أن النبی صلی اللہ علیہ وسلم نهی عن بیع الکالی بالکالی هو النسيئة بالنسيئة. (مستدرک للحاکم ج: ۲ ص: ۶۵ و ۶۶) (طبع دار الکتب العلمیة بیروت) رقم الحدیث: ۲۳۴۲، ۲۳۴۳. وشرح معانی الآثار ج: ۴ ص: ۲۱.

عمل جدید لنجتنب عن الشبهات ولنطمئن من کسبنا، وأنا منهم.

الرجاء من فضيلتكم توضيح مشكلتنا وتبيين الحقيقة عند الشرع، لو فضلتكم جوابكم بالفاكس سريعاً فيكون أحسن.

بارک الله فيکم وجزاکم الله خير الجزاء فى الدارين. بمناسبة شهر رمضان والعید المبارک کل عام وأنتم بخير، تقبل الله طاعتنا، فى أمان الله، والسلام علیکم.

جواب:- الى الأخ العزيز الأستاذ خير الدين شاهين

السلام علیکم ورحمة الله وبرکاته!

أما الذهب سواء كان تبراً أو مصوغاً فقد أجمع الأئمة الأربعة على أنه لا يعامل معاملة البضائع، وإنما يعمل أحكام النقود فى جميع الأمور، لكن "الأوراق النقدية" قد وقع فيه خلاف بين العلماء المعاصرين، وإن كثيراً من علماء البلاد العربية جعلوها فى حكم الذهب سواء بسواء، ولكن خالفتهم فى رسالتى "أحكام الأوراق النقدية" وذكرت أنها ليست قائمة مقام الذهب فى جميع الأمور، فلا تجرى فيها أحكام الصرف، ولذلك يجوز عندى أن يشتري الذهب أو الفضة بالنقود، ويجوز أيضاً أن يشتري الذهب نسيئة بالأوراق النقدية، ولكن يجب أن يكون تقابض أحد البدلين فى المجلس إذا كان ذهباً خالصاً، وأن يعرف الأجل عند العقد وقد قبل هذا الموقف معظم علماء الهند وكثير من باكستان، والتفصيل فى رسالتى "أحكام الأوراق النقدية".^(٢)

أما كون الذهب والفضة فقدا صفة النقدية، فهذا غير مسلم حتى الآن.

والسلام علیکم ورحمة الله وبرکاته

محمد تقى العثمانى

بقلم: عبد الله ميمى

١٤٢١/٩/٢٢ هـ

(فتوى نمبر ٣٨/٣٥٩)

(١) وفى المبسوط للسرخسى ج: ١٣ ص: ٢٥ وان اشترى خاتم فضة أو خاتم ذهب فيه فص أو ليس فيه فص بكذا فلوساً وليست الفلوس عنده فهو جائز ان تقابضاً قبل التفرق أو لم يتقابضاً لأن هذا بيع وليس بصرف فأنما افتراقاً عن عين بدين لأن الختام يتعين بالتعيين بخلاف ما سبق فإن الدراهم والدنانير لا يتعين بالتعيين فلهذا شرط هناك قبض أحد البدلين فى المجلس ولم يشترط هنا.

وفى الهندية ج: ٣ ص: ٢٢٣ وان اشترى خاتم فضة أو خاتم ذهب فيه فص أو ليس فيه فص بكذا فلوساً وليست الفلوس عنده فهو جائز تقابضاً قبل التفرق أو لم يتقابضاً لأن هذا بيع وليس بصرف.

وكذا فى رد المحتار ج: ٤ ص: ٣١٣.

وفى البحر الرائق ج: ٦ ص: ١٩٣ (طبع سعيد) وقيد بالذهب والفضة لأنه لو باع فضة بفلوس أو ذهباً بفلوس فانه يشترط قبض أحد البدلين قبل الافتراق لا قبضهما، كذا فى الذخيرة.

وفى الهندية ج: ٣ ص: ٢٢٣ ولو باع تبر فضة بفلوس بغير أعيانها وتفرقا قبل أن يتقابضاً فهو جائز.

(٢) راجع للتفصيل اليه ص: ١٥٥ الى ١٥٩.

سونے کا زیور فروخت کرنے میں ٹانکے اور سونے کی مجموعی

یا الگ الگ قیمت لگانے کا حکم

سوال:- زرگروں کی کمائی حلال ہے یا حرام؟ جبکہ ان کے اُصول مندرجہ ذیل ہوں، ۱- سونا اور چاندی اصلی لگاتا ہو، ۲- نہایت قابلِ غور ہے اور وہ یہ ہے کہ زرگر جب کوئی زیور بناتا ہے تو اس کو جوڑتے وقت اس میں ٹانکے لگاتا ہے، یہ بھی سونا ہوتا ہے، مگر بہت خراب، بغیر اس کے زیور کو جوڑ نہیں لگتا، جیسے موٹر وغیرہ کو ٹانکہ لگایا جاتا ہے، اور اس ٹانکے کی قیمت بھی ہم اصل سونے کے حساب سے لیتے ہیں، اور جب گا ہک دوبارہ واپس دینا چاہتا ہے تو ہم اس ٹانکے کی قیمت اصل سونے کی نہیں دیتے، صرف اصل سونے کی قیمت ان کو دیتے ہیں۔

جواب:- بیچنے والے کو شرعاً اختیار ہے کہ وہ اپنی مملوک چیز جس قیمت پر چاہے فروخت کرے،^(۱) لہذا اگر کوئی زرگر سونے کے ٹانکے کو بھی سونے کی قیمت پر فروخت کرے تو جائز ہے، بشرطیکہ^(۲) تلپیس نہ کرے اور دھوکا نہ دے،^(۳) یعنی بتادے کہ اس میں ٹانکے کی قیمت بھی شامل ہے۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۸/۶/۶ھ

(فتویٰ نمبر ۶۶۲/۱۹ الف)

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع

۱۳۸۸/۶/۷ھ



(۱ و ۲) وفي الهدایة ج: ۴ ص: ۴۷۱ (طبع مکتبہ شرکت علمیہ وفي طبع مکتبہ رحمانیہ ج: ۴ ص: ۴۷۲) لأن الثمن حق العاقد فالیہ تقدیرہ فلا ینبغی للامام أن یتعرض لحقه ألا اذا تعلق به دفع ضرر العامة الخ. وكذا فی الدر المختار ج: ۶ ص: ۳۹۹ (طبع سعید) وبدائع الصنائع ج: ۵ ص: ۱۲۹. وفي البحوث فی قضایا فقہیة معاصرة ص: ۸ وللباع أن یبیع بضاعته بما شاء من ثمن ولا یجب علیه أن یبیعہ بسعر السوق دائماً وللتجار ملاحظ مختلفة فی تعیین الأثمان وتقديرها الخ. وفي شرح المجلة لسلم رستم باز رقم المادة: ۱۱۹۲ ص: ۶۵۴ (طبع حنفیہ کوئٹہ) كل يتصرف فی ملكه كيف شاء. وفي المبسوط للسرخسی ج: ۲ ص: ۲۴ وان اشترى خاتم فضة أو خاتم ذهب فيه فص أو ليس فيه فص بكذا فلوساً وليست الفلوس عنده فهو جائز ان تقابضه قبل التفريق أو لم يتقابض. وكذا فی الہندیة ج: ۳ ص: ۲۲۴، وفتح القدير ج: ۶ ص: ۲۷۸. (۱) دیکھئے ص: ۱۰۲ تا ۱۰۴ کے حواشی۔

﴿فصل فی احکام السندات المالیه والصکوک﴾

﴿والأوراق المالیه﴾

(مختلف مالی دستاویزات، بانڈز اور چیک وغیرہ کا بیان)

فارن ایکسچینج بیئر سرٹیفکیٹ خریدنے اور ان پر نفع حاصل کرنے کا حکم

سوال:- عرض اینکہ حکومت نے ان لوگوں کے لئے جو بیرون ملک رہتے ہیں اور اپنا زر مبادلہ باہر سے لے کر آتے ہیں، ان کے لئے فارن ایکسچینج بیئر سرٹیفکیٹس کے نام سے ایک اسکیم جاری کی ہے، جس کے ذریعے باہر سے لائے ہوئے زر مبادلہ کے عوض یہ سرٹیفکیٹ جاری کئے جاتے ہیں، اور اس کا حامل اس کو اسٹاک ایکسچینج میں بھی نفع پر فروخت کر سکتا ہے۔ از خود پاکستانی بینک بھی ایک سال کے بعد سو روپے کے سرٹیفکیٹ کو $1\frac{1}{4}$ روپے مزید نفع کے ساتھ دو سال کے بعد ۳۱، اور تین سال کے بعد ۵۲ روپے سود یا نفع کے ساتھ فروخت کر سکتے ہیں اور اگر چاہے تو اسی کے ذریعے بوقت ضرورت زر مبادلہ بھی حاصل کر سکتا ہے۔ ان سرٹیفکیٹ کا خریدنا اور ان پر نفع حاصل کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

(گل رشید، ابوظہبی امارات)

جواب:- فارن ایکسچینج بیئر سرٹیفکیٹ کے بارے میں تحقیق سے ان کی یہ حقیقت معلوم ہوئی

کہ جو لوگ پاکستان سے باہر ملازمت کرتے ہیں، وہ اگر زر مبادلہ پاکستان لے کر آئیں تو حکومت کا قانون یہ ہے کہ وہ بیرونی زر مبادلہ اسٹیٹ بینک میں جمع کرائیں اور اس کے بدلے حکومت کے طے کردہ نرخ کے مطابق پاکستانی روپیہ وصول کریں۔ پاکستان میں رہتے ہوئے زر مبادلہ اپنے پاس رکھنا بھی قانوناً جائز نہیں اور جب ایک مرتبہ یہ زر مبادلہ اسٹیٹ بینک میں جمع کر دیا جائے تو اس کے بعد کسی وقت اس کو واپس لینا بھی قانوناً ممکن نہیں، اب حکومت نے یہ فارن ایکسچینج بیئر سرٹیفکیٹ اس مقصد سے جاری کئے ہیں کہ جو شخص باہر سے زر مبادلہ لا کر ان کے بدلے یہ سرٹیفکیٹ حاصل کر لے تو اس کو تین فوائد حاصل ہوتے ہیں۔

پہلا فائدہ یہ حاصل ہوتا ہے کہ اس سرٹیفکیٹ کو دکھا کر اس کا حامل جب چاہے کسی بھی ملک کی کرنسی تبادلے کے دن کی قیمت کے اعتبار سے وصول کر سکتا ہے۔

دوسرا فائدہ یہ ہے کہ اگر کوئی شخص سال بھر تک یہ سرٹیفکیٹ اپنے پاس رکھے تو وہ اُسے ساڑھے بارہ فیصد نفع کے ساتھ پاکستانی روپیہ میں بھنا سکتا ہے۔

تیسرا فائدہ یہ ہے کہ سال گزرنے سے پہلے یا کسی بھی وقت وہ بازارِ حصص (اسٹاک ایکسچینج) میں جس قیمت پر چاہے فروخت کر سکتا ہے۔

چونکہ اس سرٹیفکیٹ کی وجہ سے اس کے حامل کو زرمبادلہ حاصل کرنے کا استحقاق پیدا ہو جاتا ہے، اس لئے عام طور پر اسٹاک ایکسچینج میں لوگ اُسے زیادہ قیمت پر خرید لیتے ہیں، مثلاً سو روپے کا سرٹیفکیٹ ایک سو دس روپے میں بک سکتا ہے۔

سرٹیفکیٹ کو دیکھنے اور اس کے متعلق مطبوعہ معلومات کے مطالعے سے یہ بات واضح ہوئی کہ یہ سرٹیفکیٹ غیر ملکی زرمبادلہ کی رسید نہیں، بلکہ اس پاکستانی روپیہ کی رسید ہے جو کسی باہر سے آنے والے کو زرمبادلہ حکومت کے حوالے کرنے کے نتیجے میں حاصل ہوا، فرق صرف اتنا ہے کہ عام پاکستانی روپیہ یا اس کی نمائندگی کرنے والے تمسکات کی بنیاد پر زرمبادلہ حاصل کرنے کا کوئی استحقاق نہیں ہوتا، لیکن اس سرٹیفکیٹ کے حامل کو زرمبادلہ کے حقوق کا استحقاق حاصل ہے، لہذا فقہی اعتبار سے اس کی صورت یہ بنی کہ حکومت نے باہر سے آنے والا زرمبادلہ پاکستانی روپے کے عوض میں خرید لیا، لیکن یہ پاکستانی روپیہ فوراً ادا کرنے کے بجائے اُسے اپنے ذمے میں دین بنالیا، اور اس دین کی توثیق کے لئے یہ سرٹیفکیٹ جاری کر دیا، اور اس کے حامل کو یہ اختیار دے دیا کہ اگر وہ چاہے تو یہ دین اپنے اصل پاکستانی روپے کی شکل میں وصول کرے یا اگر چاہے تو ادائیگی کے دن کی قیمت کے لحاظ سے زرمبادلہ کی شکل میں۔

خلاصہ یہ ہے کہ یہ سرٹیفکیٹ حامل کے اس پاکستانی روپے کا وثیقہ ہے جو حکومت کے ذمے دین ہے، اب اگر حکومت ایک سال کے بعد یہ سو روپے کا وثیقہ ایک سو ساڑھے بارہ روپے میں لیتی ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ دین پر ساڑھے بارہ فیصد زیادہ ادا کر رہی ہے، جو شرعاً واضح طور پر سود ہے۔ اسی طرح اگر اس سرٹیفکیٹ کا حامل یہ وثیقہ بازارِ حصص میں اس کی اصل قیمت سے زیادہ قیمت پر فروخت کرتا ہے تو اس کے معنی بھی یہ ہوئے کہ وہ اپنا دین زیادہ قیمت پر دوسرے کو فروخت کر رہا ہے اور یہ معاملہ بھی سود ہونے کی بناء پر ناجائز ہے۔

یہاں یہ شبہ نہ کیا جائے کہ یہ سرٹیفکیٹ غیر ملکی زرمبادلہ کی رسید ہے، اور اس وجہ سے ان کو پاکستانی روپے میں کسی بھی طے شدہ نرخ پر فروخت کرنا جائز ہونا چاہئے، اس لئے کہ یہ غیر ملکی زرمبادلہ

کی رسید نہیں ہے، جس کی ایک دلیل تو یہ ہے کہ اس سرٹیفکیٹ پر غیر ملکی زرمبادلہ کے بجائے صراحتہ پاکستانی روپے کا نام لکھا ہوا ہوتا ہے۔

اور دوسری وجہ یہ ہے کہ اس سرٹیفکیٹ کے ذریعے جب کبھی زرمبادلہ حاصل کیا جائے تو اتنا زرمبادلہ نہیں ملے گا جس کے بدلے یہ سرٹیفکیٹ حاصل ہوا تھا، بلکہ تبادلے کے دن غیر ملکی زرمبادلہ کے نرخ کے مطابق زرمبادلہ دیا جائے گا۔ مثلاً کسی شخص نے پچیس سعودی ریال دے کر سو روپے کا سرٹیفکیٹ حاصل کیا، اور چھ ماہ بعد جبکہ سعودی ریال مہنگا ہو چکا ہے، تو اُسے اتنے سعودی ریال دیئے جائیں گے جتنے اس روز سو پاکستانی روپے میں حاصل ہوتے ہیں، مثلاً اس دن کے زر کی شرح مبادلہ اگر ۲۳ ریال ہو تو اُسے اس سرٹیفکیٹ کے ذریعے ۲۳ ریال ہی حاصل ہوں گے۔ پس یہ واضح دلیل ہے کہ یہ سرٹیفکیٹ سعودی ریال کا وثیقہ نہیں، بلکہ پاکستانی روپے کا وثیقہ ہے، لہذا اس سرٹیفکیٹ کو اس بناء پر خریدنا کہ اُسے زیادہ قیمت پر اسٹاک ایکسچینج میں بیچ دیا جائے گا، یا سال بھر گزرنے کے بعد اس پر حکومت سے ساڑھے بارہ فیصد نفع حاصل کیا جائے گا، سودی معاملہ ہونے کی بناء پر قطعاً ناجائز و حرام ہے۔ البتہ اگر کوئی شخص اس غرض سے سرٹیفکیٹ خریدے کہ بوقت ضرورت اس کے ذریعے زرمبادلہ حاصل ہو سکے، اور اُسے اسٹاک ایکسچینج میں فروخت کرنے یا حکومت سے اس پر منافع حاصل کرنے کا کوئی ارادہ نہ ہو تو اس غرض سے خریدنے کی گنجائش ہے، لیکن خریدنے کے بعد اُسے زیادہ قیمت پر بیچنا یا اس پر حکومت سے منافع حاصل کرنا ہرگز جائز نہیں۔

واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم

۱۴۰۸/۸/۲۳ھ

(فتویٰ نمبر ۱۷۳۳/۳۹ و)

انکم ٹیکس سے بچنے کے لئے فارن ایکسچینج بیئر سرٹیفکیٹ خریدنے کا حکم

سوال:- جناب مولانا محمد تقی عثمانی صاحب، السلام علیکم

آپ کا مضمون ”فارن ایکسچینج بیئر سرٹیفکیٹ کا شرعی حکم“ نظر سے گزرا، اس مضمون میں آپ نے صفحہ نمبر ۴ پر تین فوائد ذکر کئے ہیں، جبکہ ان کا اہم مقصد ایک یہ بھی ہے کہ ان سرٹیفکیٹس کا حامل ان کو کیش کرانے کے بعد اس کی رقم کسی بھی کاروبار میں لگائے گا تو اس سے اس رقم کی پوچھ نہیں ہوگی، اور انکم ٹیکس میں رعایت دی جائے گی، یہ اس سرٹیفکیٹ کا اہم فائدہ ہے، اسی لئے یہ سرٹیفکیٹ اسٹاک ایکسچینج میں زیادہ قیمت پر فروخت ہوتے ہیں کہ لوگ اپنی Black Money کو White کر لیتے ہیں، اور کسی بھی کاروبار میں لگا سکتے ہیں۔

۱- اب معلوم یہ کرنا ہے کہ ان سرٹیفکیٹ کو اسٹاک ایکسچینج میں زیادہ قیمت پر خریدنا جائز ہے یا نہیں؟ کیونکہ گورنمنٹ کے انکم ٹیکس کے قوانین اتنے پیچیدہ ہیں کہ ان سے بچنے کے لئے White کی رقم کی ضرورت پڑتی ہے جو کہ اس سرٹیفکیٹ سے مہیا ہو سکتی ہے۔

۲- اکثر حضرات ان سرٹیفکیٹوں کو باہر سے منگواتے ہیں لیکن ان کے کاروبار میں لگانے کی نوبت ایک سال بعد آتی ہے، اور جب ان کو کیش کروانے جاتے ہیں تو حکومت سے ساڑھے بارہ فیصد منافع کے ساتھ رقم ملتی ہے، اب ہم اس منافع کی رقم کا کیا کریں؟ کیونکہ بعض اوقات حالات کے مطابق دو سال بھی گزر جاتے ہیں۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ ہماری نیت صرف رقم کو White کرانا ہے، منافع حاصل کرنا نہیں، لیکن منافع اس کو کیش کرانے پر گورنمنٹ خود دیتی ہے، اب اس رقم کو ہم کہاں صرف کریں؟

جواب:- محترمی و مکرمی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

فارن ایکسچینج بیئر سرٹیفکیٹ کے بارے میں یہ عرض ہے کہ جیسا کہ ”البلاغ“ کے فتوے میں کہا گیا ہے کہ اسٹاک ایکسچینج میں اس کو زیادہ قیمت پر بیچنا بھی ناجائز ہے، اور خریدنا بھی ناجائز، لہذا انکم ٹیکس سے بچنے کے لئے اگر ان کو خریدنا چاہیں تو اس کی جائز صورتیں صرف دو ہیں، ایک یہ کہ کوئی شخص واقعہً باہر سے زرمبادلہ لے کر آیا ہو، اور اس کے عوض وہ یہ سرٹیفکیٹ حاصل کرے، اور دوسرا راستہ یہ ہے کہ اگر کوئی شخص یہ سرٹیفکیٹ ان کی اصل قیمت پر دینے پر راضی ہو تو برابر سرابرقم پر اسے حاصل کیا جائے، شرعاً یہ بیع نہیں ہوگی، بلکہ حوالہ ہوگا۔ مثلاً اگر پانچ سو روپے کے سرٹیفکیٹ ہیں تو ان کو پانچ سو روپے کے عوض حاصل کیا جائے، اور اس کا مطلب یہ ہوگا کہ آپ نے اس شخص کو پانچ سو روپے نقد قرض دیئے اور اس نے اپنے قرض کا حوالہ حکومت پر کر دیا اور اس حوالے کی توثیق کے لئے یہ سرٹیفکیٹ آپ کو دیئے۔ (یہ تشریح اس لئے ضروری ہوگی کہ شرعاً دین کی خرید و فروخت جائز نہیں^(۱)) جس کو فقہاء ”بیع الدین من غیر من علیہ الدین“ کہتے ہیں۔^(۲)

مذکورہ بالا دو طریقوں کے ذریعے اگر کوئی سرٹیفکیٹ حاصل کیا جائے اور پھر اس کو کیش کراتے وقت حکومت کی طرف سے زیادہ رقم ملے تو اولاً یہ زیادہ رقم لینی نہیں چاہئے، لیکن اگر کسی وجہ سے

(۱ و ۲) وفي بدائع الصنائع ج: ۵ ص: ۱۳۸ (طبع سعید) ولا یعتقد بیع الدین من غیر من علیہ الدین لأن الدین اماناً ان یکون عبارة عن مال حکمی فی الذمة واما ان یکون عبارة عن فعل تمليک المال وتسليمه وکل ذلك غیر مقدور التسليم فی حق البائع ولو شرط التسليم علی المديون لا یصح أيضاً لأنه شرط التسليم علی غیر البائع فيكون شرطاً فاسداً فیفسد البیع اهـ۔

وراجع للتفصيل الى الشامية ج: ۴ ص: ۵۱۷ (طبع سعید) وتكملة فتح الملهم ج: ۱ ص: ۳۶۳ وبحوث فی قضایا فقہیة معاصرة ص: ۲۱ (طبع مكتبة دار العلوم كراچی)۔

لینی ضروری ہو تو جتنی رقم زیادہ ملی ہے اس کو اپنی جان چھڑانے کی نیت سے کسی مستحق زکوٰۃ کو صدقہ کر دیا جائے۔

واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم
۱۲/۱۰/۱۴۰۸ھ
(فتویٰ نمبر ۲۰۹۱/۳۹ ز)

”فارن ایکسچینج بیئر سرٹیفکیٹ“ کا شرعی حکم،

چند شبہات اور ان کے جوابات

سوال:- معظم و محترم جناب مولانا محمد تقی عثمانی صاحب، السلام علیکم
شوال المکرم ۱۴۰۸ھ یعنی جون ۱۹۸۸ء کے ”البلاغ“ میں فارن کرنسی سرٹیفکیٹ کے بارے میں جناب والا کی تحقیق اور رائے نظر سے گزری، اس سلسلے میں کچھ معروضات پیش خدمت ہیں۔
۱- یہ مفروضہ کہ ہر پاکستانی کو وطن واپسی پر سارا فارن ایکسچینج حکومت کے پاس جمع کرانا ہوتا ہے، درست نہیں۔ عرصہ دراز سے حکومت پاکستان نے یہ اجازت دی ہوئی تھی کہ واپس آنے والے پاکستانی چھ ماہ تک غیر ملکی زرمبادلہ اپنے پاس فارن کرنسی اکاؤنٹ میں رکھ سکتے ہیں، پھر ۱۹۸۵ء کے آخر میں یہ مدت بڑھا کر تین سال کر دی گئی، اس کا مطلب یہ ہوا کہ گزشتہ سال جب فارن کرنسی سرٹیفکیٹ جاری کئے گئے اس وقت خریدنے والے سارے حضرات یا بیشتر حضرات قانوناً اس بات کے مجاز تھے کہ حکومت کو زرمبادلہ نہ دیں، اور اپنے پاس ہی رکھیں، اور جن لوگوں نے یہ سرٹیفکیٹ خریدے، ان کے پیش نظر یا تو اور جگہوں سے ملنے والی منافع کی شرح تھی، یا وہ اپنے سرٹیفکیٹ کو لمٹاک ایکسچینج میں فروخت کر کے حکومت کی مقرر کردہ شرح تبادلہ سے زیادہ حاصل کرنا چاہتے تھے۔

۲- جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ ”سرٹیفکیٹ کا حامل جب چاہے کسی بھی ملک کی کرنسی تبادلے کے دن کی قیمت کے اعتبار سے وصول کر سکتا ہے“ یہ کچھ حد تک صحیح ہے، کیونکہ حامل کو یہ کرنسی پاکستان سے باہر ہی ملے گی، اگر وہ اس سے پاکستان میں فارن کرنسی اکاؤنٹ کھولنا چاہے گا تو اسے اس بات کی اجازت نہ ہوگی، البتہ وہ حامل جس کا پہلے سے فارن کرنسی اکاؤنٹ موجود ہے وہ سرٹیفکیٹ اس اکاؤنٹ میں جمع کر سکتا ہے۔

۳- گو کہ یہ درست ہے کہ حکومت باہر سے آنے والا زرمبادلہ پاکستانی روپے کے عوض خرید کر فوراً ادا کرنے کے بجائے اسے اپنے ذمے دین بناتی ہے، لیکن فروخت کرنے والا صرف اس لئے حال کے بجائے مستقبل کے روپے میں (جو کہ افراط زر کی وجہ سے روز بروز کمزور ہوتا جا رہا ہے) اور حقیقی شرح تبادلہ سے کم لینے کو تیار ہوتا ہے کہ وہ مستقبل میں زرمبادلہ لینے کا استحقاق برقرار رکھتا ہے،

ماہرین معاشیات کے مطابق صرف اور صرف "Floating Rate" ہی کسی کرنسی کی حقیقی قیمت تبادلہ ہوتا ہے حکومتوں کے مقرر کردہ ریٹ کرنسی کی صحیح "Worth" یعنی "Intrinsic Value" کو "Reflect" نہیں کرتے، اب اگر حکومت مصنوعی طور پر فارن کرنسی کے بدلے کم قیمت دے گی تو بازار میں اس پر "Premium" زیادہ ہوگا۔ مثال کے طور پر آج اگر حکومت زبردستی پر اُتر آئی اور ڈالر کی قیمت دس روپے طے کر دے تو مارکیٹ میں ڈالر دس فیصد (موجودہ) "Premium" کے بجائے نوے یا سو فیصد پر پیسہ پر کبے گا، جو کہ اس کی صحیح قیمت ہے۔ میں اس ضمن میں یاد دلانا چاہتا ہوں کہ آج سے تقریباً پندرہ سال پیشتر جب حکومت نے ڈالر کی شرح تبادلہ "4.75" روپے مقرر کی ہوئی تھی، ڈالر بازار میں چودہ روپے کا ملتا تھا، اور حکومت خود چودہ روپے کی قیمت کو بلا واسطہ بونس واؤچر اسکیم کے ذریعے "Support" کر رہی تھی۔ مختلف کرنسیوں میں ایک دوسرے کے مقابلے میں اُتار چڑھاؤ آتا رہتا ہے جو کہ ان ممالک میں افراط زر اور شرح سود کا ایک فنکشن ہے، لیکن جن ملکوں میں کرنسی کی نقل و حرکت پر کوئی پابندی نہیں یا جہاں حکومت مصنوعی طور پر شرح تبادلہ طے نہیں کرتی، وہاں مارکیٹ کی شرح اور حکومت کی شرح تبادلہ میں کوئی فرق نہیں ہوتا، کیونکہ دونوں شرحیں مقامی کرنسی کو ظاہر کرتی ہیں۔ اس سلسلے میں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ فقہی نقطہ نظر سے کسی حکومت کو (جو کہ اسلامی حکومت بھی نہیں) اس بات کا کیا حق پہنچتا ہے کہ وہ عوام کو ان غیر ممالک میں کمائی کی قیمت دے (جبکہ کسٹم، پولیس، عدالتیں، انکم ٹیکس، غرض ہر ادارہ انہیں لوٹنے پر تیار بیٹھا رہتا ہے) اور اگر وہ کم قیمت دیتی ہے تو عوام اس بات کے کس حد تک مجاز ہیں کہ وہ اپنے زرمبادلہ کی صحیح قیمت بازار سے حاصل کر لیں خصوصاً جبکہ اسی حکومت نے زرمبادلہ کی بازار میں فروخت قانونی قرار دی ہوئی ہے؟

۴- دوران تحقیق جناب والا کے علم میں یہ بات ضرور آئی ہوگی کہ حکومت پاکستان کو ہنڈی کے کاروبار سے ہر سال کروڑوں روپے کا نقصان ہو رہا تھا، کیونکہ لوگ حکومت کی مصنوعی شرح کو چھوڑ کر پرائیویٹ اداروں کے ذریعے رقوم کی ترسیل کر رہے تھے۔ بیئر فارن ایکسچینج سرٹیفکیٹ جاری کر کے اور ان کے اسٹاک ایکسچینج میں فروخت کو قانونی بنا کر دراصل حکومت نے ہنڈی کے کاروبار پر ضرب لگائی ہے، اور اس بات کا موقع فراہم کیا ہے کہ لوگ زرمبادلہ کی صحیح قیمت حاصل کر سکیں، لہذا ہنڈی کے کاروبار کے سلسلے میں فقہی نقطہ نظر سے آگاہ فرمائیں؟

ان باتوں کے پیش نظر کیا یہ کہا جاسکتا ہے کہ سرٹیفکیٹ کو بازار میں بیچنے سے جو دس یا بارہ فیصد منافع ہوتا ہے وہ جائز فارن کرنسی کی حقیقی قیمت ہونے کی وجہ سے؟ بالکل اسی طرح جس طرح کمپنیوں کے حصص وغیرہ بازار میں "Par Value" سے زیادہ یا کم اپنی "Intrensic Value" کی بناء پر

فروخت ہوتے ہیں، البتہ اس بات سے مکمل اتفاق کیا جاسکتا ہے کہ سال بھر گزرنے کے بعد اس پر حکومت کی طرف سے جو ساڑھے بارہ فیصد منافع حاصل کیا جائے گا وہ سودی معاملہ ہونے کی وجہ سے قطعاً ناجائز و حرام ہوگا۔

۵- آخری پیرا گراف میں جناب والا نے اجازت دی ہے کہ اگر کوئی شخص اس غرض سے یہ سرٹیفکیٹ خریدے کہ بوقت ضرورت اس کے ذریعے زرمبادلہ حاصل ہو سکے تو اس غرض سے خریدنے کی گنجائش ہے۔ یہ اجازت بھی عام آدمی کے لئے مسائل کھڑے کر سکتی ہے مثلاً اگر کوئی شخص پاکستان واپسی پر صرف اور صرف اسی غرض سے یہ سرٹیفکیٹ لیتا ہے کہ بوقت ضرورت اس سے زرمبادلہ حاصل ہو سکے گا لیکن تین سال بعد جب اس کے بدلے زرمبادلہ لینا چاہتا ہے تو ایک لاکھ روپے کے سرٹیفکیٹ کی "Surrender Value" ایک لاکھ باون ہزار روپے ہو جانے کی وجہ سے اُسے زیادہ زرمبادلہ ملتا ہے، یہ باون ہزار یقیناً سود ہے اور اس شخص کے پاس اس سے بچت کی کوئی صورت نہیں۔ حکومت یہ رقم اُسے زبردستی دے گی، ایسی صورت میں کیا وہ سود وصول کرنے کا گناہگار نہ ہوگا؟ بحالت مجبوری کیا وہ باون ہزار روپے خیرات کر دے یا جتنی فارن کرنسی اس نے حکومت کو دی تھی اتنی لے کر باقی خیرات میں دیدے؟ لیکن ایسی صورت میں روپے کی قیمت میں کمی سود سے پوری ہوگی؟

جواب:- محترمی و مکرمی جناب منٹسم مسعود صاحب، حفظہ اللہ تعالیٰ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، گرامی نامہ ملا، جواب کے لئے جس ذہنی یکسوئی کی ضرورت تھی، وہ پچھلے دنوں مفقود رہی، اس لئے جواب میں قدرے تاخیر ہوگئی، شرمندہ اور معذرت خواہ ہوں۔

آپ نے جس تفصیل کے ساتھ فارن ایکسچینج بیئرر سرٹیفکیٹ کا پورا پس منظر بیان فرمایا ہے، اس پر میں تہ دل سے آپ کا شکر گزار ہوں۔ باہر سے زرمبادلہ پاکستان منتقل کرنے والوں پر جو پابندیاں قانوناً عائد ہیں، اور جن کی وجہ سے وہ مشکلات کا شکار ہیں ان کا کچھ اندازہ پہلے بھی تھا، آپ کی مفصل تشریح سے اور زیادہ ہو گیا۔ لیکن ان تمام باتوں سے فارن ایکسچینج بیئرر سرٹیفکیٹ کی موجودہ شرعی حیثیت میں کوئی فرق واقع نہیں ہوتا، ان مشکلات کا اصل حل تو یہ ہے کہ حکومت زرمبادلہ بازاری نرخ پر حاصل کرے، یا پھر شرعاً اس بات کی گنجائش بھی نکل سکتی تھی کہ حکومت ان سرٹیفکیٹس کو پاکستانی روپے کا نہیں بلکہ اس زرمبادلہ کا نمائندہ قرار دے جو حکومت کے حوالے کیا گیا ہے۔ اگر یہ سرٹیفکیٹ زرمبادلہ کا نمائندہ ہو تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ حکومت کے ذمے زرمبادلہ دین ہے، اب اس کے بعد حکومت کسی بھی آئندہ مرحلے پر اُسے باہمی رضامندی سے طے شدہ قیمت پر خرید سکتی ہے، اور یہ قیمت بازاری قیمت سے زیادہ بھی ہو سکتی ہے بشرطیکہ زیادہ قیمت پہلے سے طے نہ ہو، بلکہ خریداری کے وقت طے کی

جائے۔ نیز متبادل طور پر یہ بھی ممکن ہے کہ سرٹیفکیٹ کا حامل بازار میں اُسے بطور حوالہ دے کر اس کے ذریعے زیادہ پاکستانی روپے حاصل کر لے۔

لیکن شرعاً دُشواری یہاں سے پیدا ہوئی ہے کہ اس سرٹیفکیٹ کو زرمبادلہ کے بجائے پاکستانی روپے کا وثیقہ قرار دیا گیا جس کا مطلب یہ ہے کہ حکومت نے اس وقت زرمبادلہ کو سرکاری نرخ پر پاکستانی روپے سے خرید لیا ہے اور اس پاکستانی روپے کے بدلے یہ سرٹیفکیٹ جاری کر دیا ہے۔ اب زرمبادلہ اس شخص کی ملکیت میں نہیں رہا، جس کی بنیاد پر مذکورہ دو طریقوں سے اس کی بیع ممکن ہوتی۔

رہا یہ کہنا کہ موجودہ صورت میں اسٹاک ایکسچینج کے اندر جو دس یا بارہ فیصد منافع ہوتا ہے وہ زرمبادلہ کی حقیقی قیمت ہونے کی بناء پر جائز ہونا چاہئے۔ سو یہ توجیہ دو وجہ سے ممکن نہیں، اول تو اس لئے کہ وہ زرمبادلہ کی نہیں بلکہ پاکستانی روپے کی قیمت ہے، کیونکہ سرٹیفکیٹ پاکستانی روپے ہی کا وثیقہ ہے، اور روپوں کے ہم جنس تبادلے میں کمی بیشی جائز نہیں۔ اور دوسری وجہ یہ ہے کہ سرٹیفکیٹ پر بازار میں جو دس یا بارہ فیصد منافع ملتا ہے، نہ وہ کلیۃً زرمبادلہ کے سرکاری اور بازاری نرخوں کے فرق پر مبنی ہوتا ہے، اور نہ اس فرق کے مساوی ہوتا ہے۔ اگر یہ منافع دس یا بارہ فیصد ہے تو سرکاری اور بازاری نرخوں کا فرق عموماً اس سے کم ہوتا ہے، یہی وجہ ہے کہ سرٹیفکیٹ کو بازار میں بیچنے سے حامل کو ہنڈی کے ذریعے زرمبادلہ بھیجنے سے زیادہ فائدہ ہوتا ہے، اس لحاظ سے جناب کا یہ فرمانا احقر کے نزدیک درست نہیں کہ حکومت کی طرف سے کھلے بازار میں اس سرٹیفکیٹ کی فروخت کی اجازت بازار سے زرمبادلہ کی صحیح قیمت حاصل کرنے کی اجازت کے مرادف ہے، اس کے برخلاف صحیح صورت حال یہ ہے کہ حکومت نے بازار میں زرمبادلہ کو اس کی بازاری قیمت پر بیچنا تو ممنوع قرار دے رکھا ہے، لیکن اس بات کی اجازت دے رکھی ہے کہ زرمبادلہ سرکار کو کم قیمت پر فروخت کر کے اس قیمت کی بنیاد پر سودی معاملہ کر کے اپنے اس نقصان کی تلافی کر سکتے ہو۔

یہ بات اپنی جگہ درست ہے کہ غیر ملکی کرنسی کا سرکاری نرخ اس کے بازاری نرخ سے بہت کم مقرر کرنا جبکہ کھلے بازار میں زرمبادلہ کی خرید و فروخت بھی قانوناً ممنوع ہو، ایک طرح کا ظلم ہے، جس کی عام حالات میں شرعاً اجازت نہیں ہے، لیکن اگر حکومت ایک غلط کام کر رہی ہو تو اس سے سودی معاملے کی شرعی حیثیت پر کوئی فرق نہیں پڑے گا، بلکہ وہ بدستور ناجائز ہی رہے گا۔

البتہ چونکہ حکومت نے سرٹیفکیٹ کے حامل سے زرمبادلہ جبراً کم قیمت پر خریدا ہے، اس لئے اگر حکومت اُسے سال بھر کے بعد سرٹیفکیٹ پر بارہ فیصد منافع دیتی ہے تو اگرچہ وہ سود ہے لیکن اس میں سے اتنی رقم رکھ لینے کی شرعاً گنجائش معلوم ہوتی ہے جو سرٹیفکیٹ خریدنے کے دن زرمبادلہ کے سرکاری

نرخ اور بازاری نرخ کے فرق کے برابر ہو، مثلاً کسی نے ایک سو ڈالر دے کر ۷۰۰ پاکستانی روپے کا سرٹیفکیٹ حاصل کیا جبکہ اس کی بازاری قیمت ۷۵۰ روپے تھی، اس میں اس کو پچاس روپے کا نقصان سرکاری جبر کی وجہ سے ہوا جس پر وہ دل سے راضی نہیں تھا، اب اگر سال بھر کے بعد حکومت اُسے سرٹیفکیٹ کے بدلے ۲۰۴۰ روپے دیتی ہے، تو ان روپوں میں سے ۵۰ روپے اگر وہ اپنے ذاتی نقصان کی تلافی کے طور پر وصول کر لے تو شرعاً اس کی گنجائش معلوم ہوتی ہے، لیکن باقی روپے اپنے استعمال میں لانے کی اجازت پھر بھی نہیں ہوگی۔

لیکن اگر اسٹاک ایکسچینج میں سرٹیفکیٹ بیچ کر بارہ فیصد منافع حاصل ہو تو اس میں سے یہ پچاس روپے وصول کرنا بھی شرعاً جائز نہیں ہوگا، وجہ یہ ہے کہ پہلی صورت میں یہ پچاس روپے کا نقصان اسی فریق سے وصول کیا جا رہا ہے جس نے یہ نقصان پہنچایا تھا، اور دوسری صورت میں منافع دینے والا فریق وہ نہیں ہے جس نے نقصان پہنچایا۔

اس کی مثال یہ ہے کہ اگر ”الف“ کسی ناجائز طریقے سے ”ب“ کے ۵۰ روپے غصب کرے، پھر وہی ”الف“ سود کے نام سے اس کو اپنی طرف سے ۵۰ روپے ادا کرے تو ”ب“ کے لئے یہ ۵۰ روپے بحیثیت سود نہیں بلکہ بحیثیت تلافی نقصان لینے کی گنجائش ہے، لیکن اگر ”ج“ اس کو اس کے کسی قرض پر ۵۰ روپے سود دے تو اس کا استعمال اس کے لئے اس بناء پر جائز نہیں ہو جائے گا کہ ”الف“ نے اسے ۵۰ روپے کا نقصان پہنچایا تھا۔

اس تفصیل سے آپ کے آخری سوال کا جواب بھی ہو جاتا ہے، اور وہ یہ کہ اگر کوئی شخص صرف زرمبادلہ وصول کرنے کے حق کا تحفظ کرنے کے لئے فارن ایکسچینج میسرر سرٹیفکیٹ خریدتا ہے اور سال بھر کے بعد اس پر حکومت سود دیتی ہے تو اُسے کیا کرنا چاہئے؟ اس کا جواب یہی ہے کہ وہ سرٹیفکیٹ کی اصل قیمت (Face Value) اپنے استعمال میں لاسکتا ہے، اور اس سے زائد رقم لینے کی بھی گنجائش ہے جو سرٹیفکیٹ خریدنے کے دن (نہ کہ منافع وصول ہونے کے دن) اس کے ادا کردہ زرمبادلہ کی بازاری قیمت اور سرکاری نرخ کے فرق کے برابر ہو۔ لیکن اس سے زیادہ جتنی رقم حکومت کی طرف سے ملے وہ یقیناً سود ہے اور اُسے ذاتی استعمال میں لانا جائز نہیں بلکہ اس سے اپنی جان چھڑانے کی نیت سے اُسے صدقہ کر دینا واجب ہے۔

یہاں یہ بھی واضح رہے کہ آپ نے جو لکھا ہے کہ ”بحالتِ مجبوری کیا وہ باون ہزار روپے خیرات کر دے یا جتنی فارن کرنسی اس نے حکومت کو دی تھی، اتنی لے کر باقی خیرات میں دیدے“ اس کے بارے میں عرض ہے کہ جتنی فارن کرنسی اس نے حکومت کو دی تھی، اتنی لینا درست نہیں، بلکہ اس

فارن کرنسی کے دیتے وقت اس کی بازاری قیمت سرٹیفکیٹ کی اصلی قیمت (Face Value) سے جتنی زائد تھی، صرف اتنی وصول کرنے کی گنجائش ہے، اس سے زائد نہیں، اور احتیاط تو بلاشبہ اس میں ہے کہ اصلی قیمت (Face Value) پاس رکھ کر باقی سب صدقہ کر دی جائے۔

ایک اور بات آخر میں قابل ذکر یہ ہے کہ آپ نے ایک جگہ افراط زر کی بنیاد پر روپے کی قیمت میں کمی کا بھی ذکر فرمایا ہے، جس سے ایسا لگتا ہے کہ ادائیگیوں میں روپے کی قیمت میں کمی کا بھی لحاظ ہونا چاہئے۔ شرعی نقطہ نظر سے قرض اور دیگر واجبات اور دیون کے لین دین میں افراط زر کی شرح میں تبدیلی کا اعتبار نہیں ہوتا، اس لئے ادائیگی کے وقت اس پہلو کو مد نظر نہیں رکھا جاسکتا۔ اس مسئلے کی مکمل تحقیق احقر نے اپنے ایک مفصل مقالے میں کی ہے جو ان شاء اللہ عنقریب ”البلاغ“ میں شائع ہو جائے گا۔

دُعا میں یاد رکھنے کی درخواست ہے۔

والسلام

۱۴۰۸/۱۲/۳ھ

(فتویٰ نمبر ۲۵۳۶/۳۹ ح)

فارن کرنسی بیئر سرٹیفکیٹ کا شرعی حکم

سوال:- محترم مولانا مفتی صاحب، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

ابھی فون پر بات ہوئی FCBC اسکیم کی تفصیل ارسال ہے، اپنی رائے سے مطلع فرمائیں۔ بصورت دیگر تجویز کریں کہ اس میں کیا ترامیم اس کو جائز بنانے کے لئے ضروری ہیں، اس اسکیم میں اصل زر اور نفع دونوں ڈالر میں لے سکتے ہیں۔

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلے کے بارے میں کہ:-

حکومت نے فروری ۱۹۹۸ء میں نئے فارن کرنسی بیئر سرٹیفکیٹ جاری کئے ہیں، یہ سرٹیفکیٹ امریکی ڈالر اور برطانوی پاؤنڈ کے ہوں گے، اس اسکیم کی مدت تین سال ہے، کم از کم مالیت ایک ہزار ڈالر یا پاؤنڈز ہیں۔ حکومت نے اس پر مندرجہ ذیل فوائد دینے کا اعلان کیا ہے:-

۱- اصل زر اور منافع پر حکومت پاکستان کی گارنٹی۔

۲- تین سالہ مختصر تکمیلی مدت۔

۳- انکم ٹیکس اور ویلتھ ٹیکس سے مستثنیٰ۔

۴- خریداری کی مالیت لامحدود۔

۵- زیادہ مدت کے لئے خریداری پر زیادہ سے زیادہ منافع۔

۶- معینہ مدت سے پہلے کیش کرانے پر کوئی کٹوتی نہیں۔

۷- اسٹاک ایکسچینج میں قابل خرید و فروخت۔

۸- مجاز ڈیلر سے سرٹیفکیٹ بنانے کی سہولت۔

اسٹیٹ بینک نے یہ اعلان کیا ہے کہ سرٹیفکیٹ کیش کراتے وقت حامل سرٹیفکیٹ کو اختیار ہوگا کہ وہ سرٹیفکیٹ میں مذکور فارن کرنسی کے مطابق فارن کرنسی لے لے، یعنی اتنی ہی مقدار میں کرنسی لے جتنی مقدار کا سرٹیفکیٹ ہے، اور منافع بھی اسی شکل میں وصول کرے یا اس دن کے ریٹ کے مطابق پاکستانی روپے وصول کرے۔

واضح رہے کہ ان سرٹیفکیٹ پر فارن کرنسی ہی لکھی ہوئی ہوتی ہے، پاکستانی روپے نہیں، یعنی ایک ہزار امریکی ڈالر دینے کے بعد بینک سے جو سرٹیفکیٹ جاری ہوگا اس میں ایک ہزار امریکی ڈالر مذکور ہوں گے، جس دن سرٹیفکیٹ جاری ہوا اس دن کے ریٹ کے مطابق پاکستانی روپے مذکور نہیں ہوں گے، اس سرٹیفکیٹ کی جو اسکیم اسٹیٹ بینک نے جاری کی ہے، وہ سوال کے ساتھ منسلک ہے (سائل نے استفتاء کے ہمراہ انگریزی زبان میں اسکیم کی فوٹوکاپی منسلک کی تھی)۔ ان سرٹیفکیٹ کو خریدنا، اس پر منافع حاصل کرنا اور منافع پر اسی کرنسی میں یا پاکستانی روپے میں اسے فروخت کرنا جائز ہے یا نہیں؟ (المستفتی: ارشد سعید)

جواب:- نئے فارن کرنسی بیئر سرٹیفکیٹ کی جو صورت حال سوال میں مذکور ہے اس کے مطابق اس کا حکم یہ ہے کہ فارن کرنسی دے کر سرٹیفکیٹ حاصل کرنا دراصل حکومت کو فارن کرنسی قرض دینا ہے اور یہ سرٹیفکیٹ اس کی سند ہے۔ قرض پر نفع حاصل کرنا حرام ہے،^(۱) اور قرض کو حوالے کرنا جائز ہے، لہذا ان سرٹیفکیٹ کو نفع حاصل کرنے کی نیت سے لینا ناجائز و حرام ہے، اور یہ حاصل ہونے والا نفع سود کے حکم میں ہوگا۔ البتہ ٹیکس سے بچنے کی قانونی سہولت حاصل کرنے کی نیت سے یا رقم کو محفوظ کرنے کی نیت سے یا حکومت کو قرض دینے کی نیت سے اگر کوئی شخص یہ سرٹیفکیٹ خریدے، اور اس پر منافع حاصل کرنے کا کوئی ارادہ نہ ہو تو اس غرض سے خریدنے کی گنجائش ہے، بشرطیکہ جب اس پر منافع کی پیشکش کی جائے تو گورنمنٹ سے منافع لیا ہی نہ جائے، اور اگر اپنے اختیار کے بغیر منافع ملے تو اسے بغیر نیت ثواب کے کسی مستحق زکوٰۃ پر صدقہ کر دیا جائے۔

(۱) وفي الدر المختار ج: ۵ ص: ۱۶۶ وفي الاشباه كل قرض جر نفعا حرام (كتاب المداینات ص: ۱۴۴، طبع سعید کراچی). نیز دیکھئے ص: ۲۸۴ کا حاشیہ نمبر ۴۔

جہاں تک اس سرٹیفکیٹ کو بازار میں فروخت کرنے کا تعلق ہے، تو اس کا حکم یہ ہے کہ اگر اسے ڈالر ہی میں فروخت کیا جائے تو اتنے ہی ڈالر لینے جائز ہوں گے جتنے ڈالر کا وہ سرٹیفکیٹ ہے، اس سے کم یا زائد میں بیچنا حرام اور سود کے حکم میں داخل ہے۔ اور اگر اس سرٹیفکیٹ کو پاکستانی روپے میں فروخت کیا جائے تو تبادلے کی شرح اس دن کی بازاری قیمت کے مطابق ہونی ضروری ہے۔ البتہ سرکاری شرح تبادلہ پر بیچنا ضروری نہیں، بلکہ مجاز ڈیلرز جس شرح پر اس دن ڈالر خرید رہے ہوں، اس شرح پر سرٹیفکیٹ بیچا جاسکتا ہے، مثلاً سرٹیفکیٹ ایک ہزار امریکی ڈالر کا ہے، اور تبادلے کے دن عام بازار میں ڈالر کا نرخ چھیالیس روپیہ فی ڈالر ہے، تو یہ سرٹیفکیٹ چھیالیس ہزار ہی میں فروخت کیا جاسکتا ہے۔ چھیالیس ہزار روپے سے زائد قیمت لگا کر بیچنا جائز نہیں۔ وجہ یہ ہے کہ فقہی اعتبار سے سرٹیفکیٹ کی فروخت کا مطلب یہ ہے کہ نقد پاکستانی روپے کے عوض ڈالر نسیئہ فروخت کئے، پھر جو ڈالر ز واجب الذمہ ہوئے ان کا حوالہ سرٹیفکیٹ جاری کرنے والے (یعنی حکومت) پر کر دیا۔ جو علماء نوٹوں کے تبادلے کو صرف قرار دیتے ہیں، ان کے نزدیک تو اس بیع میں نسیئہ بالکل ہی ناجائز ہے، اور احقر کے نزدیک اگرچہ یہ صرف نہیں ہے، اس لئے اس میں تقابض شرط نہیں، لیکن نسیئہ کی صورت میں ثمن مثل پر بیچنا اس لئے ضروری ہے تاکہ اسے ربا کا ذریعہ نہ بنایا جاسکے۔ اور یہ سرٹیفکیٹ چونکہ اصلاً سودی ہے، اس لئے بازار میں کوئی بھی شخص اسے بازاری شرح تبادلہ سے زائد پر اس وقت تک نہیں خریدے گا جب تک اس کا ارادہ اس سرٹیفکیٹ پر عائد ہونے والے سود سے انتفاع نہ ہو، لہذا اس سرٹیفکیٹ کے معاملے میں بطور خاص ثمن مثل کی شرط کی رعایت ضروری ہے۔ البتہ ثمن مثل سرکاری قیمت نہیں، بلکہ وہ بازاری قیمت ہے جو مجاز ڈیلروں کے یہاں معروف ہو۔

خلاصہ یہ ہے کہ نفع حاصل کرنے کی غرض سے اس سرٹیفکیٹ کی خریداری جائز نہیں، البتہ نفع حاصل نہ کرنے کے مستحکم ارادے کے ساتھ اس نیت سے خریدا جاسکتا ہے کہ اس سے ٹیکس میں قانونی رعایت حاصل کی جائے یا اپنی رقم کی مالیت کا تحفظ کیا جائے، اور روپے کی گرتی ہوئی قیمت کے مقابلے میں اپنی ملکیت مستحکم کرنسی میں محفوظ کی جائے، یا حکومت کو بلا سود قرض دیا جائے۔ لیکن جب یہ سرٹیفکیٹ حاصل کر لیا جائے تو خواہ حکومت کو واپس کیا جائے، یا بازار میں فروخت کیا جائے، دونوں صورتوں میں اس دن کی بازاری شرح تبادلہ کے مطابق ہی فروختگی ضروری ہے، بازاری شرح تبادلہ سے زائد پر فروخت کرنا جائز نہیں۔

واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم

۱۴۱۸/۱۱/۵ھ

(فتویٰ نمبر ۳۰۱/۲۲)

”نیشنل ڈیفنس سیونگ سرٹیفکیٹ“ میں ملنے والے منافع کا حکم

سوال:- مسئلہ یہ ہے کہ نیشنل ڈیفنس سیونگ سرٹیفکیٹ میں سرمایہ کاری کرنا کیسا ہے؟ اور

اس میں جو منافع ملتا ہے وہ سود ہے یا حلال ہے؟

جواب:- نیشنل ڈیفنس سیونگ سرٹیفکیٹ پر جو منافع ملتا ہے شرعاً وہ سود ہے، اور اس کا لینا

حرام ہے۔

واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم
۱۴۰۸/۱۱/۱
(فتویٰ نمبر ۲۲۵۱/۳۹ ز)

انعامی بونڈز کی شرعی حیثیت

سوال:- انعامی بانڈ کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ اس کا خریدنا درست ہے یا نہیں؟

جواب:- انعامی بانڈ کا انعام لینا شرعاً جائز نہیں^(۱)، اس میں سود بھی ہے اور قمار کی روح

واللہ اعلم

۱۴۰۲/۷/۱۸

بھی۔

پرائز بانڈز کی خرید و فروخت اور انعام کا شرعی حکم

(اور اس سلسلے میں حضرت والا دامت برکاتہم کے سپریم کورٹ کے ایک فیصلے کی

حقیقت اور قانونی نکتے کی وضاحت)

(سائل موصوف نے استفتاء سے قبل حضرت والا دامت برکاتہم کو درج ذیل خط لکھا)

بگرامی خدمت مکرم و محترم جناب حضرت مولانا تقی عثمانی صاحب زاد مجدکم

السلام علیکم، حضرت والا! ایک سوال یا مسئلہ وجہ اختلاف بنا ہوا ہے، وہ یہ کہ انعامی بانڈ اسکیم

جو حکومت پاکستان نے جاری کی ہوئی ہے، اس میں کوئی رقم لگانا اور انعامی بانڈ خریدنا اور انعام نکلنے کی

صورت میں انعام کی رقم حلال اور جائز ہے یا قمار اور حرام ہے؟ ہمارے ہاں بعض علماء اس کو حرام اور

قمار کہتے ہیں، اور بعض دوسرے اس کو حلال اور جائز کہتے ہیں۔ جو جائز کہتے ہیں وہ آپ کے فیصلے کو

بنیاد بناتے ہیں، جو اس کو حلال اور جائز کہتے ہیں وہ شریعت اپیلٹ بنچ کے فیصلے مندرجہ PLD 1992

(۱) ربا کی حرمت سے متعلق حوالہ جات ص: ۲۶۷ کے حاشیہ نمبر ۱ اور قمار کی حرمت سے متعلق تفصیلی دلائل کے لئے جواہر الفقہ ج: ۲

ص: ۳۳۹ میں رسالہ ”احکام القمار“ میں ملاحظہ فرمائیں۔

S,C 153 میں آپ کے، پیر کرم شاہ صاحب مرحوم اور تیسرے نج صاحب کے مندرجات کو بنیاد بنا کر حلال کہتے ہیں۔ یہ آپ ہی واضح کر سکتے ہیں۔ فیصلے کی نقل نوٹو کا پی لف ہذا ہے، اور استفتاء بھی لف ہے، اس مسئلے میں فتویٰ صادر فرمائیں تاکہ ابہام اور اختلاف ختم ہو۔

نیازمند

کفایت اللہ

بودلہ کالونی

شجاع آباد

(استفتاء)

سوال :- کیا فرماتے ہیں علمائے دین کہ گورنمنٹ پاکستان کی جاری کردہ انعامی اسکیم جس کو ”انعامی بانڈ“ (Prize Bond) کہتے ہیں، جس پر قرعہ اندازی کے ذریعے بعض نمبروں پر انعامات دیئے جاتے ہیں، جس کو انعام ملتے ہیں یا نہیں ملتے ان کی اصل رقم ہر حال میں محفوظ رہتی ہے، تو کیا ان بانڈز کا خریدنا، سرمایہ لگانا اور انعام ملنے کی صورت میں انعامی رقم حلال اور جائز ہے یا حرام یا قمار ہے؟ PLD 1992 SC 153 کی روشنی میں، بینوا تو جروا (سائل: کفایت اللہ بودلہ، شجاع آباد، ملتان)

جواب :- محترمی و مکرمی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کا گرامی نامہ ملا، پرائز بانڈ کے بارے میں بندہ کا فتویٰ شروع سے یہ ہے کہ اس کی خریداری اور اس پر ملنے والا انعام شرعاً ناجائز ہے۔^(۱) میرے جس فیصلے کا آپ نے حوالہ دیا ہے، اس میں یہ نہیں کہا گیا کہ پرائز بانڈ جائز ہے، بلکہ یہ کہا گیا ہے کہ جس وقت فیڈرل شریعت کورٹ نے اس کو ناجائز قرار دیا تھا، اس وقت اُسے مالیاتی معاملات میں کوئی حتمی فیصلہ دینے کا اختیار نہیں تھا، یہی موقف شفیع الرحمن صاحب کے فیصلے میں بھی اختیار کیا گیا ہے۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ پرائز بانڈ کی حلت و حرمت کے مسئلے کو سپریم کورٹ کی طرف سے کسی آئندہ موقع کے لئے کھلا رکھا جائے۔ البتہ پیر کرم شاہ صاحب مرحوم پرائز بانڈ کے جواز کے قائل تھے، اس لئے انہوں نے اپنے فیصلے میں صراحتاً اس کو جائز قرار دیا، لیکن میرے اور شفیع الرحمن صاحب کے فیصلے میں اس کے جواز یا عدم جواز سے بحث کئے بغیر اس بناء پر اپیل مسترد کی گئی کہ فیڈرل شریعت کورٹ کو اُس وقت حتمی فیصلہ دینے کا اختیار نہیں تھا، اس میں یہ مفہوم قانونی طور پر پنہاں ہے کہ جب فیڈرل شریعت کورٹ کو مالی امور میں فیصلے دینے کا حق ملے گا، اس وقت وہ بھی حتمی فیصلہ جاری کر سکتا ہے۔ لہذا میرے اس فیصلے کو پرائز بانڈ کے جواز میں دلیل

کے طور پر پیش کرنا درست نہیں ہے۔ اس کے عدم جواز پر میرے فتاویٰ جاری ہو چکے ہیں^(۱)، لیکن چونکہ اس فیصلے میں اس کے عدم جواز کا حکم لکھنے سے اس کی قانونی حیثیت کچھ نہ ہوتی، اور آئندہ اس مسئلے پر عدالتی چارہ جوئی کا راستہ بھی بند ہونے کا امکان تھا، اس لئے میں نے اس جملے پر اکتفا کیا جو ”نتائج بحث“ کے عنوان کے تحت پیرگراف نمبر ۳ میں درج ہے۔

والسلام

بندہ محمد تقی عثمانی

۱۳۲۵/۶/۷ھ

(فتویٰ نمبر ۵۲/۷۲۰)

پرائز بانڈز اور اس پر ملنے والی انعامی رقم کا حکم

سوال:- انعامی (پرائز) بانڈ کا مسئلہ درپیش ہے، اس پر انعام نکلنے پر ان روپوں کا استعمال جائز ہے یا نہیں؟ اور کن کن کاموں میں خرچ کر سکتے ہیں؟

جواب:- مروجہ انعامی بانڈز پر جو انعام ملتا ہے تحقیق سے معلوم ہوا کہ اس میں سود کو قمار کے ذریعے تقسیم کیا جاتا ہے، لہذا یہ انعام وصول کرنا شرعاً حرام ہے^(۲)، البتہ اگر کوئی رقم اس طرح غلطی سے وصول کر لی گئی ہو تو اُسے بغیر نیتِ ثواب کے صدقہ کر دینا ضروری ہے، اور یہ صدقہ ایسا ہے کہ اپنے مستحق قریبی رشتہ داروں کو بھی دیا جاسکتا ہے۔

واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم

۱۳۹۶/۱۰/۲۱ھ

(فتویٰ نمبر ۲۴۲/۲۷ھ)

پرائز بانڈز پر ملنے والی انعامی رقم کا حکم

سوال:- پرائز بانڈز کے جو انعامات ہیں وہ شرع کی رو سے جائز ہے یا ناجائز؟

جواب:- مروجہ انعامی بانڈز میں سود کو قمار کر کے بطور انعام دیا جاتا ہے، اس لئے اس انعام کو وصول کرنا شرعاً حرام ہے^(۳)۔

واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۶/۱۱/۲۶ھ

(فتویٰ نمبر ۲۷۱۰/۲۷ھ)

انعامی بانڈز اور اس کی رقم سے زکوٰۃ اور حج ادا کرنے کا حکم

سوال:- میری والدہ کی کفالت میرے ذمے ہے، علاوہ اس کے وہ اپنے تین بچوں کو تعلیم

قرآن بھی دیتی ہے، جو ہدیہ وہ وصول کرتی ہے وہ ان کے ذاتی مصرف کے علاوہ ہے۔ قربانی، زکوٰۃ، خیرات میں استعمال ہوتا ہے، اس رقم سے والدہ نے کچھ انعامی بانڈ بھی خرید رکھے تھے کہ وقتِ ضرورت کام آئے، قدرت کی کرم نوازی سے ان کے بانڈ پر ۵۰۰۰ روپیہ انعام آیا، رقم وصول ہوتے ہی جو زکوٰۃ واجب تھی وہ ادا کر دی، نیز کچھ حصہ گھر کے خرچ میں ملایا گیا، باقی محفوظ ہے، والدہ کی خواہش ہے کہ حج کی سعادت نصیب ہو، کیا وہ اس رقم سے حج کر سکتی ہے؟

جواب:- انعامی بانڈز پر جو رقم بطور انعام دی جاتی ہے، قواعد و ضوابط دیکھنے سے معلوم ہوا کہ وہ خالصتاً سود کی رقم ہے، جسے قمار کے طریقے پر تقسیم کیا جاتا ہے، لہذا اس کا لینا جائز نہیں^(۱)۔ اور اگر یہ رقم غلطی سے لے لی ہے تو اسے نیتِ ثواب کے بغیر صدقہ کرنا واجب ہے، اس رقم کو نہ حلال آمدنی کی زکوٰۃ پر خرچ کیا جاسکتا ہے، اور نہ اس سے حج کر سکتے ہیں، نہ ذاتی استعمال میں لاسکتے ہیں۔ لہذا جو رقم انہوں نے بطور زکوٰۃ نکالی ہے اگر وہ ان کی حلال آمدنی کی زکوٰۃ تھی تو وہ ادا نہیں ہوئی، دوبارہ زکوٰۃ دینا ضروری ہے، اور اگر اسی انعام کی رقم کی زکوٰۃ نکالی تھی تو اسے دوبارہ نہ نکالا جائے، اور اس رقم میں سے جس قدر حصہ گھر کے استعمال میں لائی ہیں، اسے بھی صدقہ کرنا واجب ہے۔

واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۸/۵/۲۳ھ

(فتویٰ نمبر ۵۹۷/۱۹ الف)

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع

انعامی بانڈز کا حکم

سوال:- انعامی بانڈز کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ اگر ناجائز ہے تو کیوں؟

جواب:- تحقیق سے معلوم ہوا کہ ہر بونڈ خریدنے والے کے نام پر ایک معین شرح سے سود لگایا جاتا رہتا ہے، لیکن پھر بجائے اس کے کہ ہر شخص کی رقم پر علیحدہ سود دیا جائے، تمام افراد کے سود کی مجموعی رقم کو قرعہ اندازی کے ذریعے صرف ان لوگوں پر تقسیم کیا جاتا ہے جن کا نام قرعہ میں نکل آئے، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ بانڈ کے انعام کی رقم سود کو قمار کر کے ادا کیا جاتا ہے، اس لئے یہ رقم لینا حرام ہے۔^(۲) والسلام^(۳)



(۲) دیکھئے ص: ۱۷۳ کا حاشیہ۔

(۳) یہ فتویٰ ”ابلاغ“ سے لیا گیا ہے۔

﴿فصل فی احکام الأسهم﴾

(شیرز کے احکام)

حلال کاروبار کرنے والی کمپنی کے شیرز کی خرید و فروخت جائز ہے
سوال:- شیرز خرید کر کسی کمپنی میں حصہ دار بننا اور نفع حاصل کرنا جائز ہے یا نہیں؟ بکر کہتا
ہے کہ جائز ہے، میں نے مفتی رشید احمد اور مولانا ظفر احمد تھانوی صاحب سے پہلے فتویٰ حاصل کیا تھا۔
جواب:- اگر کمپنی کا کاروبار خلاف شرع نہ ہو تو شیرز خریدنے میں کوئی حرج نہیں۔

واللہ اعلم

۱۳۹۲/۱۲/۵ھ

(فتویٰ نمبر ۲۷۸/۲۷۷ و)

کونسی کمپنی کے شیرز کی خرید و فروخت جائز ہے؟

نیز اسٹاک ایکسچینج والوں کو کمیشن دینے کا حکم

سوال:- کونسی کمپنی کے شیرز خریدنا جائز ہیں؟ اور کس حال میں یعنی جب کمپنی کس حالت
میں پہنچے تو اس کے شیرز کی خرید و فروخت جائز ہوگی؟ اور اسٹاک ایکسچینج والوں کو اس پر دلالی کا کمیشن
دینا جائز ہے یا نہیں؟

جواب:- اگر کمپنی کسی حرام کاروبار میں ملوث نہیں ہے اور اس کے کچھ اثاثے وجود میں
آچکے ہیں تو اس کے حصص کی خرید و فروخت جائز ہے،^(۱) اور اسٹاک ایکسچینج والوں کو اس پر دلالی کا کمیشن
دینا بھی جائز ہے،^(۲) لیکن جو کمپنی حرام کاروبار میں ملوث ہو، اس کے حصص کی خرید و فروخت جائز نہیں
ہے۔^(۳) نیز جس کمپنی کے اثاثے ابھی وجود میں نہ آئے ہوں، بلکہ اس کے سارے اثاثے نقد روپے کی
شکل میں ہوں اس کے حصے کو اس کی اصل قیمت (Face Value) سے کم یا زیادہ میں خریدنا بیچنا بھی
حرام ہے۔^(۴)

واللہ اعلم

۱۴۱۲/۱/۸ھ

(فتویٰ نمبر ۵۸/۳۷۵)

(۱ تا ۴) ان مسائل کی تفصیل کے لئے حضرت والا دامت برکاتہم کی کتاب ”اسلام اور جدید معیشت و تجارت“ ص: ۸۶ تا ص: ۹۲
ملاحظہ فرمائیں۔

اسٹاک ایکسچینج میں شیئرز کی خرید و فروخت اور شیئرز پر قبضے سے متعلق حکم شرعی کی تحقیق

سوال:- کیا فرماتے ہیں علمائے کرام درج ذیل مسئلے کے بارے میں کہ: آج کل شیئرز کی خرید و فروخت کثرت سے ہو رہی ہے، علمائے کرام کی طرف سے یہ کہا جاتا ہے کہ شیئرز کے قبضے میں آنے سے پہلے ان کو فروخت کرنا جائز نہیں، جبکہ اسٹاک ایکسچینج کی مروجہ صورت حال کے پیش نظر شیئرز پر قبضہ کس طرح ممکن ہے؟ اور شیئرز پر قبضہ کب سمجھا جائے گا؟ اور کب شیئرز کی خرید و فروخت جائز ہوگی اور کب جائز نہ ہوگی؟ براہ کرم اس بارے میں شریعت کی روشنی میں تفصیلی جواب مرحمت فرمائیں۔

سائل: عبداللہ، کورنگی

جواب:-

الحمد لله رب العالمین، والصلوة والسلام علی رسولہ الکریم، وعلی آلہ

و أصحابہ أجمعین، وعلی کل من تبعہم باحسان الی یوم الدین

آج کل کمپنیوں کے حصص کی بیع و شراء جن طریقوں سے ہوتی ہے، ان کی شرعی حیثیت کے بارے میں بہت سے سوالات پیدا ہوتے رہتے ہیں، اور پوچھے بھی جاتے ہیں، ان کا شرعی حکم معلوم کرنے کے لئے اس طریق کار کی صحیح واقفیت ضروری ہے جو اس بیع و شراء میں اختیار کیا جاتا ہے۔ واضح رہے کہ اس وقت گفتگو ان کمپنیوں کے حصص کے بارے میں ہو رہی ہے، جن کا کاروبار شرعاً حلال ہے اور ان کے حصص کی خریداری حضرت حکیم الامت مولانا تھانوی قدس سرہ کے فتویٰ ”القصص السنی فی حصص الكمبنی“ کی رو سے جائز ہے۔

یہ معلومات حاصل کرنے کے لئے دارالعلوم کراچی کے دارالافتاء سے اہل علم کی ایک جماعت نے کراچی کے اسٹاک ایکسچینج کا دورہ کیا، ایکسچینج کے ذمہ داروں سے عملی صورت حال معلوم کی، اور ان کے قواعد و ضوابط حاصل کر کے ان کا مطالعہ کیا۔ اس تحقیق کے نتیجے میں جو صورت حال واضح ہوئی وہ ذیل میں درج کی جا رہی ہے۔

بنیادی طور پر قابل تحقیق امور مندرجہ ذیل تھے:-

۱- ڈے ٹریڈنگ، یعنی ایک ہی دن میں حصص خرید کر اسی دن بیچ دینا۔

۲- مستقبل کے سودے (Forward)۔

۳- بدلے کے معاملات۔

ڈے ٹریڈنگ

ڈے ٹریڈنگ کا مطلب یہ ہے کہ ایک شخص ایک ہی دن میں حصص خرید کر اسی دن کسی اور شخص کو وہ حصص بیچ دیتا ہے، یہ ڈے ٹریڈنگ فوری سودوں (Spot Transactions) میں بھی ہوتی ہے، اور مستقبل کے سودوں (Forward Trading) میں بھی۔ پہلے ہم فوری سودوں کی تحقیق کرتے ہیں۔

فوری سودے (Spot Trading)

فوری سودوں کا طریق کار یہ ہوتا ہے کہ جب کوئی شخص کسی کمپنی کے حصص خریدتا ہے تو اس خریداری کا اندراج فوری طور سے KAT میں ہر جاتا ہے، جو اسٹاک ایکسچینج میں ہونے والے سودوں کا کمپیوٹرائزڈ ریکارڈ ہوتا ہے، اور اسٹاک ایکسچینج ان سودوں میں فریقین کی ذمہ داریوں کی ضمانت دیتا ہے، اس سودے کو حاضر سودا بھی کہا جاتا ہے، فوری سودوں میں ہر سودے کے تین دن بعد خریدار کو طے شدہ قیمت ادا کرنی ہوتی ہے، اور بیچنے والے کو بیچے ہوئے حصص کی ڈیلیوری دینی ہوتی ہے۔ ڈیلیوری کا مطلب حصص کی بیچ میں یہ ہوتا ہے کہ جس کمپنی کے حصص بیچے گئے ہیں اس کمپنی کے ریکارڈ میں سی ڈی سی کے ذریعے ان حصص کی منتقلی خریدار کے نام ہو جاتی ہے۔

فقہی نقطہ نظر سے یہاں قابل غور بات یہ ہے کہ اگر کوئی شخص کوئی چیز خریدے تو اس کے لئے شرعاً ضروری ہے کہ پہلے اس چیز پر قبضہ کرے، پھر اس کے لئے آگے فروخت کرنا جائز ہوتا ہے، قبضے سے پہلے بیع جائز نہیں۔ اب حصص کی خریداری میں صورت حال یہ ہے کہ ڈیلیوری، خریداری کے تین دن بعد ہوتی ہے، سوال یہ ہے کہ خریداری اور ڈیلیوری کے درمیان جو تین دن کی مدت ہے، کیا خریدار کے لئے جائز ہے کہ اس درمیانی مدت میں وہ اپنے خریدے ہوئے حصص کسی اور شخص کو فروخت کر دے؟ اگر ڈیلیوری کو شرعی قبضہ قرار دیا جائے تو ڈیلیوری سے پہلے فروخت کرنا بیع قبل القبض قرار پائے گا، اور ناجائز ہوگا، لیکن دوسرا احتمال یہ ہے کہ ”ڈیلیوری“ شرعی قبضے سے عبارت نہیں، بلکہ کمپنی میں حصص کے خریدار کے نام پر اندراج کو ”ڈیلیوری“ کہا جاتا ہے، ورنہ جہاں تک خریدے ہوئے حصص کے جملہ منافع اور نقصانات کا تعلق ہے، وہ خریداری کے متصل بعد خریدار کی طرف منتقل ہو جاتے ہیں، یعنی اگر خریداری اور ڈیلیوری کی درمیانی مدت میں کمپنی کو کوئی نقصان ہو جائے تو وہ نقصان خریدار ہی برداشت کرتا ہے، اور اگر کمپنی کو نفع ہو جائے تو اس نفع کا فائدہ بھی خریدار ہی کو پہنچتا ہے۔

یہ بات واضح رہنی چاہئے کہ حصص کی بیع کا مطلب کمپنی کے حصص مشاع کی بیع ہے، لہذا یہ ”بیع المشاع“ ہے اور مشاع میں حسی قبضہ ممکن نہیں ہوتا۔ دوسری طرف بیع قبل القبض کی ممانعت کی علت یہ ہے کہ جب تک مشتری بیع پر قبضہ نہ کرے، یا کم از کم بائع تخلیہ نہ کرے، بیع بائع ہی کے ضمان

میں رہتی ہے، یعنی اگر اس دوران وہ ہلاک ہو جائے تو بیع فسخ ہو جاتی ہے، لہذا اگر قبضہ کئے بغیر مشتری نے بیع کسی اور کو فروخت کر دی، بعد میں بائع اصلی ہی کے قبضے میں ہلاک ہو گئی تو پہلی بیع فسخ ہو جائے گی، تو اس کے نتیجے میں دوسری بیع بھی فسخ ہو جائے گی، لہذا اس دوسری بیع میں شروع ہی سے غرر انفساخ پایا جاتا ہے۔

علامہ کاسانی رحمہ اللہ بیع قبل القبض کی ممانعت کی وجہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-
ولأنه بيع فيه غرر الانفساخ بهلاك المعقود عليه، لأنه اذا هلك المعقود عليه قبل القبض يبطل البيع الأول، فينفسخ الثاني.

(۱) (بدائع الصنائع ج: ۴ ص: ۳۹۴، مؤسسة التاريخ العربی)

بیع قبل القبض کی ممانعت کی اس سے زیادہ واضح علت یہ ہے کہ اس سے ربح مالم یضمن لازم آتا ہے، کیونکہ قبضے سے پہلے بیع کا ضمان مشتری کی طرف منتقل نہیں ہوتا، اب اگر وہ اسے آگے فروخت کرے اور اس میں نفع کمائے تو یہ ربح مالم یضمن ہوگا، جس کی ممانعت مندرجہ ذیل حدیث میں آئی ہے:-

لا يحل سلف وبيع ولا شرطان في بيع، ولا ربح مالم يضمن.
(سنن ابی داؤد ج: ۳ ص: ۲۸۳، کتاب البیوع، باب فی الرجل یبیع ما لیس عنده)
جامع ترمذی میں یہ حدیث ان الفاظ سے مروی ہے:-

لا يحل سلف وبيع ولا شرطان في بيع ولا ربح ما لم يضمن.
(جامع الترمذی ج: ۳ ص: ۵۳۵، باب ما جاء فی کراهیة بیع ما لیس عنده)
اس حدیث کی تشریح کرتے ہوئے ملّا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں:-

یرید بہ الربح الحاصل من بیع ما اشتراه قبل أن یقبضه وینتقل من ضمان البائع الی ضمانه، فان بیعه فاسد، فی شرح السُّنّة: قیل: معناه ان الربح فی کل شیء انما یحل ان لو کان الخسران علیه، فان لم یکن الخسران علیه کالبيع قبل القبض اذا تلف فان ضمانه علی البائع.

(۲) (مرقاۃ المفاتیح ج: ۶ ص: ۸۹)

(۱) ج: ۵ ص: ۱۸۰ (طبع سعید).

(۲) سنن ابی داؤد ج: ۲ ص: ۱۳۹ (طبع مکتبہ رحمانیہ).

(۳) ابواب البیوع، ج: ۱ ص: ۲۳۳ (طبع سعید).

(۴) ج: ۶ ص: ۸۲ (طبع مکتبہ امدادیہ ملتان).

اور علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:-

وربح ما لم یضمن، یرید بہ الحاصل من بیع ما اشتراہ قبل أن یقبضہ وینتقل

من ضمان البائع الی ضمانہ، فان بیعہ فاسد. (شرح الطیبی ج: ۶ ص: ۸۲)^(۱)

علامہ سندھی رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں:-

(وربح ما لم یضمن) ہو ربح مبیع اشتراہ فباعہ قبل أن ینتقل من ضمان

البائع الأول الی ضمانہ بالقبض.

(۲) (حاشیہ السندی علی المجتبى للنسائی ج: ۷ ص: ۲۹۵)

اور حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوری قدس سرہ تحریر فرماتے ہیں:-

ولا ربح ما لم یضمن، أى لا یحل ربح شیء لم یدخل فی ضمانہ وهو ربح

مبیع اشتراہ فباعہ قبل أن ینتقل عن ضمان البائع الأول الی ضمانہ بالقبض.

(۳) (بذل المجہود ج: ۱۵ ص: ۱۸۰، کتاب البیوع، باب فی الرجل یبیع ما لیس عنده)

حاصل یہ ہے کہ کسی چیز کی بیع قبل القبض اس لئے ناجائز ہوتی ہے کہ قبضے کے بغیر اس کا

ضمان مشتری کی طرف منتقل نہیں ہوتا، لہذا اگر وہ نفع پر آگے بیچنا چاہتا ہے تو یہ ربح ما لم یضمن میں

داخل ہے، نیز جیسا کہ صاحب بدائع نے فرمایا، قبضے سے پہلے اگر مبیع ہلاک ہو جائے تو بائع کے ضمان

میں ہونے کی بناء پر بیع فسخ ہو جائے گی، اور اس کے نتیجے میں اگلی بیع بھی فسخ ہوگی، لہذا اگلی بیع میں

شروع ہی سے غرر انفساخ پایا جاتا ہے۔

لیکن اگر ضمان حسی اور حقیقی قبضے کے بغیر تخلیہ کے ذریعے مشتری کی طرف منتقل ہو جائے تو پھر

چونکہ نہ ربح ما لم یضمن کا اندیشہ ہے، نہ غرر انفساخ کا، اس لئے مشتری کے لئے اسے آگے بیچنا جائز

ہے، اسی لئے فقہائے کرام رحمہم اللہ نے تخلیہ کو قبضہ کے قائم مقام قرار دیا ہے، فتاویٰ عالمگیری میں ہے:-

وأجمعوا علی أن التخلية فی البیع الجائز تكون قبضاً، وفی البیع الفاسد

روایتان والصحیح انہا قبض رجل باع خلا فی دن فی بیتہ فخلی بینہ

وبین المشتري فحتم المشتري علی الدن وترکہ فی بیت البائع فہلک

(۱) (طبع ادارة القرآن کراچی).

(۲) ج: ۲ ص: ۲۲۶ (طبع مکتبۃ الحسن).

(۳) کتاب الإجارة ج: ۲ ص: ۲۸۷ و ۲۸۸ (طبع معهد الخلیل الاسلامی).

بعد ذلك فانه يهلك من مال المشتري في قول محمد، وعليه الفتوى.

(فتاویٰ عالمگیری ج: ۳ ص: ۱۶، کتاب البیوع، باب: ۴ فصل: ۲) (۱)

اب دیکھنا یہ ہے کہ مشاع کی بیع میں قبضہ کیسے متحقق ہوتا ہے؟ اس کے جواب میں بھی فقہائے کرام نے یہی فرمایا ہے کہ مشاع کی بیع میں تسلیم اور قبض کا تحقق تخلیہ ہی سے ہوتا ہے۔ علامہ سرخسی رحمہ اللہ اجارۃ المشاع (جو امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک جائز نہیں) اور بیع المشاع کے درمیان فرق بیان کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:-

وهذا بخلاف البيع، لأن التسليم هناك بالتخلية يتم وذلك في الجزء

الشائع يتم. (مبسوط السرخسی ج: ۱۵ ص: ۱۲۶، کتاب الاجارۃ) (۲)

صاحب ہدایہ رحمہ اللہ نے بھی اس فرق کو اس طرح بیان فرمایا ہے:-

ولأبى حنيفة أنه آجر ما لا يقدر على تسليمه فلا يجوز، وهذا لأن تسليم المشاع وحده لا يتصور، والتخلية اعتبرت تسليمًا لوقوعه تمكينًا، وهو الفعل الذي يحصل به التمكن، ولا تمكن في المشاع، بخلاف البيع لحصول التمكن فيه. (۳)

اس کا مطلب یہ ہے کہ اجارہ میں چونکہ مقصود صرف انتفاع ہوتا ہے، ملک نہیں، اور حصہ مشاع میں تمکین انتفاع نہیں ہو سکتی، اس لئے اس میں تخلیہ متصور نہیں ہے، اس کے برخلاف بیع میں مقصود ملک ہوتی ہے، لہذا تخلیہ کے ذریعے اس میں تمکین ہو سکتی ہے، چنانچہ صاحب عنایہ اس کی شرح میں فرماتے ہیں:-

بخلاف البيع فان المقصود به ليس الانتفاع، بل الرقبة، ولهذا جاز بيع

الجحش فكان التمكن بالتخلية فيه حاصلًا. (۴)

اور صاحب کفایہ اس کو مزید واضح کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:-

ان التخلية اعتبرت تسليمًا اذا كان تمكينًا من الانتفاع، وانما يكون

تمكينًا اذا حصل بها التمكن، والتمكن لا يحصل به فلم يعتبر فعله تمكينًا

(۱) طبع رشیدیہ کوئٹہ.

(۲) باب اجارۃ الدور والبیوت ج: ۱۵ ص: ۱۲۳ (طبع غفراریہ کوئٹہ).

(۳) ہدایۃ کتاب الأجارات ج: ۳ ص: ۳۰۶ (طبع مکتبہ رحمانیہ) یہاں یہ بات واضح رہے کہ ہدایہ کے مذکورہ نسخے میں "انہ آجر ما يقدر على تسليمه" کے الفاظ ہیں، بظاہر وہ کتابت کی غلطی ہے کیونکہ ایسی صورت میں یہ امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی دلیل نہیں بن سکتی۔ صحیح الفاظ وہی ہیں جو حضرت والا دامت برکاتہم نے اوپر ذکر فرمائے ہیں یعنی "انہ آجر ما لا يقدر على تسليمه" اور فتح القدیر ج: ۸ ص: ۲۱ (طبع رشیدیہ کوئٹہ) اور مکتبہ شرکت علمیہ ملتان کے طبع شدہ نسخہ ہدایہ ج: ۳ ص: ۳۰۳ اور مکتبہ البشری کراچی کے طبع شدہ ہدایہ (ج: ۶ ص: ۲۹۸) کے نسخے میں بھی اسی طرح ہے۔

(۴) عنایۃ علی فتح القدیر ج: ۸ ص: ۲۱ (طبع رشیدیہ).

بخلاف البیع، لحصول التمكن ثمة من البیع والاعتاق وغير ذلك.

(۱) (فتح القدیر مع العناية والكفاية ج: ۸ ص: ۴۱ و ۴۲ باب الاجارة الفاسدة)

صاحب کفایہ کی خط کشیدہ عبارت سے یہ بات واضح ہے کہ مشاع میں حسی قبضے کے بغیر تخلیہ قبضے کے قائم مقام ہو جاتا ہے اور مشتری کے لئے اس میں ملک کے تصرفات کرنا جائز ہو جاتا ہے، جن میں اسے آگے فروخت کرنا بھی شامل ہے۔

علامہ طوری رحمہ اللہ نے بھی تكملة البحر الرائق میں فرق کی وضاحت صاحب ہدایہ اور صاحب

عنایہ کے بیان کے مطابق کی ہے۔ (تكملة البحر ج: ۸ ص: ۳۶، باب الاجارة الفاسدة)

ان تصریحات سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ مشاع کی بیع میں حسی قبضہ تو ممکن نہیں ہوتا، لیکن تخلیہ اور تمکین سے قبضے کا مقصود حاصل ہو جاتا ہے، اور مشتری کے لئے اس تخلیہ یا تمکین کے بعد اسی مشاع کو آگے فروخت کرنا بھی جائز ہو جاتا ہے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ حصص کی بیع میں بائع کی طرف سے تمکین اور تخلیہ کا تحقق ہو جاتا ہے یا نہیں؟ اگرچہ اسٹاک ایکسچینج کے ذمہ دار اور اس میں کام کرنے والے اس بات پر متفق نظر آئے کہ سودا ہوتے ہی بیچے ہوئے شیئرز کے حقوق اور ذمہ داریاں خریدار کی طرف منتقل ہو جاتی ہیں، گویا شیئرز خریدار کے ضمان میں آ جاتے ہیں (اور اس لحاظ سے اگر خریدار انہیں آگے بیچے تو ”ربح مالم یضمن“ لازم نہیں آتا) لیکن اسٹاک ایکسچینج کے قواعد و ضوابط کے مطالعے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ قبضہ شرعی کا تحقق ڈیلیوری سے پہلے نہیں ہوتا، جس کے دلائل مندرجہ ذیل ہیں:-

۱- یہ بات فقہ اسلامی میں طے شدہ ہے کہ ”قبض کل شیء بحسبہ“^(۳) یعنی ہر چیز کا قبضہ اس شیء کی نوعیت کے لحاظ سے عرفاً مختلف ہوتا ہے، شیئرز کے بارے میں عرف عام یہی ہے کہ سودے کے وقت محض اسٹاک ایکسچینج کے فوری اندراج کو قبضہ نہیں کہا جاتا، بلکہ کہا جاتا ہے کہ ”ڈیلیوری“ تین دن بعد ہوگی، ڈیلیوری کے معنی ہی قبضہ دینے کے ہیں، لہذا عرف نے اسی کو قبضہ قرار دیا ہے۔

۲- اسٹاک ایکسچینج میں ”بیع مالا یملک الانسان“ (Short Sale) کا رواج عام ہے، جب ہم نے اسٹاک ایکسچینج کا دورہ کیا، اس وقت ہمیں یہ بتایا گیا کہ حاضر سودوں یعنی فوری سودوں میں شارٹ سیل ممنوع کر دی گئی ہے، لیکن قواعد و ضوابط سے پتہ چلتا ہے اور بعد میں اسٹاک ایکسچینج کے صدر

(۱) طبع رشیدیہ.

(۲) ج: ۸ ص: ۲۱ (طبع سعید).

(۳) کما فی البحر الرائق ج: ۵ ص: ۲۳۸ (طبع سعید) قبض کل شیء وتسليمه یكون بحسب ما یلیق به. وفيه بعد أسطر: قبض کل شیء یكون بما یلیق به.

صاحب نے بھی اس کی تصدیق کی کہ جو چیز منع کی گئی ہے وہ بلیнк سیل (Blank Sale) ہے، یعنی ایسی بیع جس میں بائع کے پاس نہ تو ملکیت میں ہوں، اور نہ اس نے شیئرز کی خریداری کے لئے کسی سے قرض کا معاہدہ کر رکھا ہو، لیکن حاضر سودوں میں شارٹ سیل کی اس شرط کے ساتھ اجازت دے دی گئی ہے کہ بیچنے والا خریدار کو بتادے کہ وہ شارٹ سیل کر رہا ہے اور یہ کہ اس نے وقت پر شیئرز کی ڈیلیوری کے لئے کسی سے قرض لینے کا انتظام کر رکھا ہے۔^(۱) اس سے معلوم ہوا کہ حاضر سودوں میں شارٹ سیل کا امکان موجود ہے، اور اگر بالفرض قواعد کے لحاظ سے شارٹ سیل منع بھی ہو تو اس بات کی گارنٹی نہیں ہے کہ وہ اس قاعدے کی خلاف ورزی نہیں کر رہا۔

اب ظاہر ہے کہ اگر کوئی شخص شارٹ سیل کر رہا ہے، یعنی شیئرز اس کی ملکیت میں نہیں ہیں، پھر بھی بیچ رہا ہے تو نہ صرف یہ کہ ”بیع مالا یملک“ ہونے کی بناء پر یہ بیع شرعاً باطل ہے، بلکہ اس سے یہ بھی واضح ہوا کہ جو حضرات یہ کہتے ہیں کہ سودا ہوتے ہی شیئرز کے حقوق و التزامات خریدار کی طرف منتقل ہو جاتے ہیں یا خریدار کے ضمان (Risk) میں آ جاتے ہیں، وہ یہ بات شرعی مفہوم میں نہیں کہتے، کیونکہ یہ بات وہ شارٹ سیل کی صورت میں بھی کہتے ہیں، حالانکہ شرعی مفہوم میں شارٹ سیل کی صورت میں ضمان منتقل ہونے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، جب شیئرز بائع ہی کی ملکیت میں نہیں ہیں تو وہ خریدار کو تمکین یا تخلیہ کیسے کر سکتا ہے؟ اور اس سے شرعی مفہوم میں ضمان کیسے منتقل ہو سکتا ہے؟

۳۔ کراچی اسٹاک ایکسچینج کی طرف سے ہمیں جو قواعد و ضوابط فراہم کئے گئے، ان میں حاضر سودوں کے قواعد و ضوابط (Rules For Ready Delivery Contracts) کی پہلی دفعہ میں یہ کہا گیا ہے کہ تمام حاضر سودوں کا تصفیہ آئندہ ہفتے میں پیر کے دن ہونا ضروری ہے، یعنی پیر کے دن بائع شیئرز کی ڈیلیوری دے گا، اور خریدار اس کی قیمت بائع کو ادا کرے گا، لیکن اسی دفعہ کی شق بی میں یہ صراحت ہے کہ اگر بائع نے مقررہ وقت تک ڈیلیوری نہ دی تو خریدار کو حق ہوگا کہ کسی کمپنی کے جتنے شیئرز اس نے بائع سے خریدے تھے، وہ بازار سے خرید لے (جس کو اسٹاک ایکسچینج کی اصطلاح میں "Buy In" کہا جاتا ہے) اور شق سی میں کہا گیا ہے کہ ایسی صورت میں اگر خریدار کو بازار سے خریداری کرنے میں کوئی نقصان ہو (مثلاً وہ شیئرز بازار سے زیادہ قیمت میں ملیں) تو بائع کا فرض ہوگا کہ وہ خریدار کے نقصان (Damages) کی تلافی کرے۔

یہ قاعدہ واضح طور پر اس بات کا اعتراف ہے کہ سودے کے وقت قبضہ نہیں ہوا تھا، کیونکہ بائع کی طرف سے ڈیلیوری نہ دینا، دو ہی صورتوں میں ممکن ہے، یا تو بائع نے شارٹ سیل کی تھی، یعنی

(1) Regulations For Short Selling Under Ready Market, 2002, Clause.

شیرز کے ملکیت میں ہونے کے بغیر فروخت کر دیئے تھے، اس صورت کا بطلان اوپر نمبر ۲ میں گزر چکا ہے، یا پھر اس نے شارٹ سیل نہ کی تھی، مگر خریدار سے سودا کرنے کے بعد اس کی رائے بدل گئی اور اس نے وہ خود رکھنے یا کسی اور کو بیچ دینے کا فیصلہ کر لیا، جب اس کے لئے رائے بدل کر شیرز کو خود رکھ لینا یا کسی اور کو بیچنا ممکن ہے تو یہ کیسے کہا جاسکتا ہے کہ سودے کے وقت اس نے خریدار کو تمکین کر دی ہے یا اس کے حق میں تخلیہ کر دیا ہے؟ نیز اس صورت میں اسٹاک ایکسچینج کے قواعد یہ نہیں کہتے کہ جو شیرز فروخت کئے گئے تھے بائع کو ان کی ڈیلیوری دینے پر مجبور کیا جائے، بلکہ خریدار کو یہ حق دیتے ہیں کہ وہ بائع کو ڈیلیوری پر مجبور کرنے کے بجائے بازار سے اسی کمپنی کے اسی مقدار میں دوسرے شیرز خرید لے، اور اس خریداری میں اسے کوئی نقصان ہو تو بائع کو اس کی تلافی پر مجبور کرے، جس کا حاصل یہ ہے کہ پہلی بیع ایک طرفہ طور پر فسخ کرے، اور کسی تیسرے شخص سے نئی بیع کرے۔

۴- اسٹاک ایکسچینج کے حضرات یہ بھی کہتے ہیں کہ حاضر سودوں کے علاوہ فارورڈ سودوں میں بھی حقوق و التزامات فوراً منتقل ہو جاتے ہیں، صرف کمپنی کے ریکارڈ میں نام کی منتقلی حاضر سودوں کے مقابلے میں زیادہ تاخیر سے ہوتی ہے، حالانکہ فارورڈ سودوں میں شارٹ سیل کا رواج حاضر سودوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہے، اس سے پتہ چلا کہ یہ حضرات حقوق و التزامات کی جس منتقلی کا ذکر کر رہے ہیں وہ شرعی مفہوم میں ضمان کی منتقلی نہیں ہے۔ اور اس سارے مجموعے سے جو بات واضح ہو رہی ہے، وہ یہ ہے کہ جس چیز کو اسٹاک ایکسچینج کی اصطلاح میں حاضر سودا کہا جا رہا ہے، اس میں سودے کے وقت شرعی مفہوم میں قبضہ متحقق نہیں ہوتا، اور جو حضرات یہ کہتے ہیں کہ سودا ہوتے ہی تمام حقوق و التزامات خریدار کی طرف منتقل ہو جاتے ہیں، وہ اس معنی میں کہتے ہیں کہ اسٹاک ایکسچینج معاملے کو انتہاء تک پہنچانے کا ذمہ دار ہے، اور شیرز کی قیمت بڑھے یا گھٹے، بائع اسی قیمت پر شیرز کی ڈیلیوری کرنے کا، اور خریدار وہی قیمت ادا کرنے کا پابند ہے، اور اگر کوئی فریق اپنی یہ ذمہ داری پوری نہ کرے اور خریدار کی عدم ادائیگی کی صورت میں بائع کو بازار میں شیرز فروخت کرنے (Sale Out) میں اور بائع کے قبضہ نہ دینے کی صورت میں خریدار کو بازار سے شیرز خریدنے میں جو نقصان ہو، دوسرا فریق اس کی تلافی کا ذمہ دار ہے۔

مذکورہ بالا دلائل کی روشنی میں شرعی حکم یہ ہے کہ شیرز کے خریدار کے لئے اس وقت تک شیرز کو آگے بیچنا جائز نہیں ہے جب تک کہ ڈیلیوری نہ مل جائے۔ اگر بیچنے والے نے شارٹ سیل کی ہے یعنی شیرز ملک میں لائے بغیر فروخت کئے ہیں تو یہ بیع ہی باطل ہے، اور اگر شیرز بائع کی ملک میں

تھے، اور عقد بیع کے ارکان متحقق ہو گئے ہیں تو یہ بیع درست ہے، اسے بیع الکالی، بالکالی^(۱) اس لئے نہیں کہا جاسکتا کہ کمپنی کے شیئرز بائع کی ملکیت میں ہیں اور بیع حال ہے، اور تاخیر تسلیم محض رسمی اجراءات کی وجہ سے ہے، یا حبس المبیع لاستیفاء الثمن^(۲) ہے، اور بیع عین ہے دین نہیں، لیکن خریدار کے لئے آگے بیع کرنا اسی وقت جائز ہوگا جب اسے باقاعدہ ڈیلیوری مل جائے، لہذا اس وقت جس طرح ڈے ٹریڈنگ ہو رہی ہے (جس میں ڈیلیوری سے پہلے شیئرز آگے بیچ دیئے جاتے ہیں) وہ شرعاً جائز نہیں ہے۔

مستقبل کے سودے (Futures)

مذکورہ بالا تفصیل حاضر سودوں کے بارے میں تھی، جنہیں "Spot Sales" یا "Ready Contracts" کہا جاتا ہے۔ جب حاضر سودوں میں صورت حال یہ ہے تو مستقبل کے سودوں میں جنہیں Future یا Forward کہا جاتا ہے۔ بطریق اولیٰ یہ حکم ہوگا کہ ڈیلیوری کے بغیر شیئرز کو آگے بیچنا جائز نہیں، اس لئے کہ ان سودوں میں شارٹ سیل کا رواج حاضر سودوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہے، اور شارٹ سیل پر جو پابندیاں حاضر سودوں میں ہوتی ہیں، مستقبل کے سودوں میں اتنی پابندیاں نہیں ہیں۔

اسٹاک ایکسچینج کے دورے کے دوران ہمیں یہ بھی بتایا گیا کہ حاضر سودوں اور مستقبل کے سودوں میں اس کے سوا کوئی فرق نہیں ہے کہ حاضر سودوں میں ڈیلیوری جلدی ہو جاتی ہے، اور مستقبل کے سودوں میں دیر سے ہوتی ہے، لیکن خریدے ہوئے شیئرز کے حقوق و التزامات فوراً منتقل ہو جاتے ہیں، لیکن ان حضرات کا یہ بیان اس بات کی دلیل ہے کہ حقوق و التزامات کی منتقلی کا لفظ وہ شرعی مفہوم میں استعمال نہیں کر رہے، بلکہ اس معنی میں استعمال کر رہے ہیں کہ شیئرز کی قیمت ڈیلیوری سے پہلے بڑھے یا گھٹے، ہر صورت میں بائع طے شدہ قیمت پر ڈیلیوری دینے اور خریدار طے شدہ قیمت ادا کرنے کا پابند ہوتا ہے۔

اس صورت حال کے پیش نظر مستقبل کے سودوں (Forward Sale) یا Future Sale کا

حکم یہ ہے کہ:-

۱۔ اگر بیچنے والے کی ملکیت میں شیئرز نہیں ہیں اور وہ شارٹ سیل یا بلینک سیل کر رہا ہے تو یہ

بیع مالا یملک ہونے کی وجہ سے ناجائز اور باطل ہے۔

(۱) مستدرک حاکم ج: ۲ ص: ۶۵ و ۶۶ (طبع دار الکتب العلمیہ بیروت)۔

(۲) فی الہدایۃ ج: ۳ ص: ۴۸ (طبع مکتبہ رحمانیہ) فصار کحبس المبیع لما تعلق زوالہ باستیفاء الثمن لا

یزول دون قبض جمیعہ۔

۲- اگر بیچنے والے کی ملکیت میں شیئرز ہیں اور وہ ان کی ڈیلیوری بھی لے چکا ہے، اور آئندہ کی تاریخ کے لئے آج ہی ایجاب و قبول کے ذریعے بیچ کی تکمیل کر رہا ہے، جسے (Forward Sale) کہا جاتا ہے، یعنی بیچ آج ہی مکمل ہوگئی ہے، لیکن وہ بیچ آئندہ تاریخ کے لئے ہے، تو یہ بیع مضاف الی المستقبل ہونے کی بناء پر ناجائز ہے۔

۳- اگر بیچنے والے کی ملکیت اور قبضے میں شیئرز ہیں (یعنی وہ ان کی ڈیلیوری لے چکا ہے) اور بیچ آئندہ تاریخ کے لئے نہیں، بلکہ آج ہی کی تاریخ کے لئے ہوئی ہے، البتہ قیمت اُدھار رکھی گئی ہے کہ خریدار قیمت آئندہ کسی تاریخ پر ادا کرے گا، تو اس صورت میں شیئرز کی ڈیلیوری خریدار کو دینی ہوگی، اور قیمت کی وصولی کے لئے ڈیلیوری دیئے بغیر شیئرز اپنے قبضے میں رکھنا جائز نہیں ہوگا، کیونکہ یہ بیع مؤجل ہے، اور بیچ مؤجل میں حبس المبیع لاستیفاء الثمن جائز نہیں ہے۔
فتاویٰ عالمگیریہ میں ہے:-

قال أصحابنا رحمهم الله تعالى: للبائع حق حبس المبيع لاستيفاء الثمن اذا كان حالاً كذا في المحيط، وان كان مؤجلاً فليس للبائع أن يحبس المبيع قبل حلول الأجل ولا بعده، كذا في المبسوط.

(۱) (فتاویٰ عالمگیریہ ج: ۳ ص: ۱۵، باب: ۴ من کتاب البیوع)

۴- اگر بیچنے والے کی ملکیت اور قبضے میں شیئرز ہیں، اور وہ آج کی تاریخ ہی کے لئے خریدار کو بیچ رہا ہے، اور ان کی ڈیلیوری بھی خریدار کو دیتا ہے، لیکن قیمت، آئندہ تاریخ کے لئے اُدھار رکھی گئی ہے اور خریدار کو ڈیلیوری دینے کے بعد پھر وہی شیئرز (جو خریدار کے نام منتقل ہو چکے ہیں) اپنے پاس گروی رکھ لیتا ہے تو یہ صورت جائز ہے۔

علامہ حنفی رحمہ اللہ، الدر المختار میں فرماتے ہیں:-

ولو كان ذلك الشيء الذي قال له المشتري: أمسكه، هو المبيع الذي اشتراه بعينه لو بعد قبضه، لأنه حينئذ يصلح أن يكون رهناً بضمنه، ولو قبله لا يكون رهناً، لأنه محبوس بالثمن.
(۲)

علامہ ابن عابدین شامی رحمہ اللہ اس کے تحت فرماتے ہیں:-

قوله: لأنه حينئذ يصلح ... الخ أي لتعيين ملكه فيه، حتى لو هلك يهلك

على المشتري، ولا يفسخ العقد ط قوله "لأنه محبوس بالثمن" أي
و ضمانه يخالف ضمان الرهن، فلا يكون مضموناً بضمانين مختلفين
(۱) الخ. (رد المحتار، کتاب الرهن ج: ۶ ص: ۴۹۷)

صورت نمبر ۳ اور صورت نمبر ۴ کا فرق بھی علامہ ابن عابدین رحمہ اللہ کی اس عبارت میں موجود ہے، اس کی مزید وضاحت بندہ کی کتاب "بحوث فی قضایا فقہیہ معاصرہ" (ص: ۱۶ تا ۱۸، طبع دارالقلم دمشق) میں دیکھی جاسکتی ہے۔

۵۔ پانچویں صورت یہ ممکن ہے کہ بیچنے والے کی ملک اور قبضے میں شیئرز ہیں، اور وہ بیع ابھی نہیں کرتا، بلکہ ایک خاص قیمت پر آئندہ بیچنے کا وعدہ کرتا ہے، اور خریدار آئندہ اس قیمت پر خریدنے کا صرف وعدہ کرتا ہے، بیع ابھی مکمل نہیں ہوتی، علمائے معاصرین کی ایک بڑی جماعت (جس میں مجمع الفقہ الاسلامی جدہ بھی داخل ہے) دو طرفہ وعدہ ملزم کو بھی عقد کے حکم میں قرار دے کر اسے ناجائز قرار دیتی ہے، اور جن فقہاء نے بعض معاملات (مثلاً بیع بالوفاء) میں وعدہ ملزم کو جائز قرار دیا ہے، وہ بھی اسے حاجت عامہ سے مشروط مانتے ہیں، چنانچہ فتاویٰ قاضی خان میں ہے:-

لأن المواعدة قد تكون لازمة فتجعل لازمة لحاجة الناس.

(۲) (الفتاویٰ الخانیة ج: ۲ ص: ۱۶۵)

مذکورہ صورت میں کوئی ایسی حاجت نظر نہیں آتی جس کی وجہ سے کوئی حرج عام لازم آئے، بلکہ اشاک ایکسچینج میں سٹہ بازی کے رجحان کو روکنے کے لئے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ یہاں "وعدہ" غیر ملزم ہی رہے،^(۳) لہذا اگر دونوں فریق وعدہ غیر ملزم (Non-Binding Promise) کر لیں تو یہ جائز ہے، اس صورت میں اگر کوئی فریق وعدے کو پورا نہ کرے تو وہ دیانۃً تو گناہگار ہوگا، لیکن قضاءً اسے مجبور نہ کیا جاسکے گا۔

بدلہ کے معاملات

اشاک ایکسچینج میں بدلہ کے معاملات اس طرح ہوتے ہیں کہ بعض اوقات ایک شخص بہت سے حصص خرید لیتا ہے، مگر قیمت ادا کرنے کے لئے اس کے پاس رقم نہیں ہوتی، ایسی صورت میں وہ خریدے ہوئے حصص کسی تیسرے شخص کو اس شرط کے ساتھ بیچ دیتا ہے کہ وہ ایک طے شدہ مدت کے

(۱) (طبع سعید).

(۲) (طبع رشیدیہ).

(۳) موجودہ قانون اور طریق کار میں یہ وعدہ ملزم ہوتا ہے، لہذا یہ صورت ناجائز ہے۔ (حاشیہ از حضرت والا دامت برکاتہم)۔

بعد خریدار سے وہی حصص زیادہ قیمت پر خرید لے گا، مثلاً الف نے ب سے یکم اپریل کو ایک لاکھ روپے کے دس ہزار حصص خریدے، لیکن اس کے پاس ایک لاکھ روپے نہیں ہیں، لہذا وہ یہ دس ہزار حصص ج کو اس شرط کے ساتھ بیچتا ہے کہ ۱۳/۱۳ اپریل کو وہ یہی حصص ایک لاکھ دو ہزار روپے میں واپس خرید لے گا۔ اس طریق کار میں شرعی اعتبار سے دو خرابیاں ہیں، ایک یہ کہ عموماً بدلے کا یہ معاملہ ڈیلیوری سے پہلے کیا جاتا ہے، جس کے بارے میں پیچھے بیان کیا جا چکا ہے کہ وہ بیع قبل القبض ہونے کی بناء پر ناجائز ہے۔ دوسرے ج کو جو شیئرز بیچے جارہے ہیں وہ زیادہ قیمت پر واپس خریدنے کی شرط کے ساتھ بیچے جارہے ہیں، یہ شرط فاسد ہے، جو بیع کو فاسد کر دیتی ہے، اور درحقیقت اس کا مقصد ایک لاکھ روپے لے کر ایک لاکھ دو ہزار روپے واپس کرنا ہے جو سود کی ایک شکل ہے، جس کے لئے اس بیع فاسد کو بہانہ بنایا گیا ہے، اس لئے بدلہ کے یہ معاملات بھی شرعاً ناجائز ہیں۔

واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم و علمہ اتم و احکم

بندہ محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۲۱/ صفر ۱۴۲۶ھ - ۲/ اپریل ۲۰۰۵ء

(فتویٰ نمبر ۸۰۳/۴۷)

الجواب صحیح

محمد رفیع عثمانی عفا اللہ عنہ

۲۶/ ۵/ ۱۴۲۶ھ

نوٹ:- دارالافتاء جامعہ دارالعلوم کراچی کی مجلس تحقیق مسائل حاضرہ کا اجلاس بروز پیر بتاریخ ۲۶/ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۶ھ مطابق ۴/ جولائی ۲۰۰۵ء منعقد ہوا، جس میں درج بالا تحریر لفظاً لفظاً پڑھی گئی اور مناقشہ کے بعد سب اہل مجلس نے اس سے اتفاق کیا۔ اس مجلس میں درج ذیل حضرات نے شرکت فرمائی:-

حضرت مولانا مفتی محمود اشرف عثمانی صاحب مدظلہم	(نائب مفتی جامعہ دارالعلوم کراچی)
حضرت مولانا مفتی عبدالرؤف سکھروی صاحب مدظلہم	(نائب مفتی جامعہ دارالعلوم کراچی)
حضرت مولانا مفتی محمد عبداللہ صاحب مدظلہم	(استاذ حدیث جامعہ دارالعلوم کراچی)
مفتی محمد عبدالمنان صاحب مدظلہم	(نائب مفتی جامعہ دارالعلوم کراچی)
مفتی اصغر علی ربانی صاحب مدظلہم	(رفیق دارالافتاء جامعہ دارالعلوم کراچی)
مولانا عصمت اللہ صاحب مدظلہ	(رفیق دارالافتاء جامعہ دارالعلوم کراچی)
مولانا محفوظ احمد صاحب مدظلہ	(استاذ جامعہ دارالعلوم کراچی)
مولانا زبیر اشرف عثمانی صاحب مدظلہ	(استاذ جامعہ دارالعلوم کراچی)
مولانا محمد عمران اشرف عثمانی صاحب مدظلہ	(استاذ جامعہ دارالعلوم کراچی)

(رفیق دارالافتاء جامعہ دارالعلوم کراچی)

مولانا محمد یعقوب صاحب مدظلہ

(رفیق دارالافتاء جامعہ دارالعلوم کراچی)

مولانا محمد افتخار بیگ صاحب مدظلہ

(اُستاذ جامعہ دارالعلوم کراچی)

مولانا خلیل احمد اعظمی صاحب مدظلہ

(اُستاذ جامعہ دارالعلوم کراچی)

مولانا احسان کلیم صاحب مدظلہ

(رفیق دارالافتاء جامعہ دارالعلوم کراچی)

مولانا محمد زبیر حق نواز صاحب مدظلہ

(اُستاذ جامعہ دارالعلوم کراچی)

مولانا اعجاز احمد صدانی صاحب مدظلہ

۱:- ڈیلیوری سے پہلے شیئرز فروخت کرنے کا حکم

۲:- ایک ماہ بعد کے وعدے پر شیئرز فروخت کرنے کا حکم

۳:- شیئرز فروخت کرنے کے بعد وصولی رقم کی ضمانت کے طور پر وہی

شیئرز بطور رہن رکھنے کا حکم

محترم جناب حضرت جی، دامت برکاتہم حفظہ اللہ، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ! شیئرز سے متعلق جو آپ نے فرمایا ہے، اُس میں ایک بات کی سمجھ نہیں آئی، میں تفصیل علیحدہ لکھ رہا ہوں۔

سوال:- کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلے کے بارے میں کہ شیئرز میں نے آج خرید لئے، ایجنٹ کی معرفت وہ شیئرز میں اُسی ایجنٹ کی معرفت فروخت کرنا چاہتا ہوں، ڈیلیوی یعنی CDC میں دو تین دن بعد آتا ہے۔

جواب:- مکرم بندہ، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

ڈیلیوری سے پہلے آگے فروخت کرنا جائز نہیں ہے۔^(۱)

سوال:- شیئرز میں نے خریدے اور اُن کو مہینے بعد کے وعدے پر فروخت کر دیئے، اُسی ایجنٹ کی معرفت جس سے لئے تھے، آپ نے فرمایا کہ یہ ٹھیک نہیں، البتہ آپ ادائیگی کرنے کے بعد اُس کی ڈیلیوری دیں، لیکن آپ نے جو یہ فرمایا کہ میں اس کو ضمانت کے طور پر رکھ سکتا ہوں، اس کی سمجھ نہیں آئی، ہو سکے تو مہربانی فرما کر وضاحت فرمادیں، آپ کی مہربانی ہوگی۔ والسلام طالب دُعا

الطاف حسین برخوردار یہ

جواب:- مطلب یہ ہے کہ جس شخص کو ایک ماہ بعد فروخت کرنا ہے، اس میں دو کام ضروری ہیں، ایک یہ کہ آپ پہلے خریدے ہوئے شیئرز کی ڈیلیوری لے لیں^(۱)، پھر اس کو فروخت کریں۔ دوسرے یہ کہ ایک ماہ بعد کا سودا آج کرنا تو درست نہیں ہے^(۲)، مگر یہ ہو سکتا ہے کہ آپ اسے فروخت تو آج ہی کر دیں، اور ڈیلیوری بھی اس کو دے دیں^(۳)، لیکن بعد میں وہی شیئرز آپ اس سے گروی کے طور پر رکھ لیں، تاکہ ایک ماہ بعد اس کو جو رقم ادا کرنی ہے، اس کی ضمانت میں یہ شیئرز رہن بن جائیں۔

واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم

ھ ۱۴۲۶/۲/۵

۱:- شیئرز کے نفع کو ذریعہ آمدنی بنانے کی غرض سے شیئرز خریدنا

۲:- کاروبار میں سودی رقم شامل کرنے والی کمپنی کے شیئرز کی

خرید و فروخت کا حکم

۳:- تجارت کی غرض سے شیئرز کی خرید و فروخت کا حکم

سوال ۱:- "Join Stock Companies" کے شیئرز خرید کر اس کے Dividend کو ذریعہ آمدنی بنانا، شیئرز "Ordinary" ہیں، یعنی نفع و نقصان کی گارنٹی کے بغیر اور نفع و نقصان کے فیصد کے تعین کے بغیر ہیں۔ اور "Companies" جائز تجارت اور صنعت کا کاروبار کرتی ہیں۔ "Capital Financing" بھی بغیر سود کے کی گئی ہے۔

۲:- اوپر والی صورت، مگر اس فرق کے ساتھ کہ "Financing" کے لئے رقم سود پر حاصل کی گئی ہے۔

۳:- نمبر ۱ کی صورت، مگر اب شیئرز کی خرید "Dividend" کے بجائے کلیۃً اس شیئرز کی خرید و فروخت کے لئے کی گئی ہے، یعنی آمدنی کی صورت اب "Capital Gain" پر منحصر ہے، نہ کہ "Dividend" کی آمدنی پر۔

۴:- نمبر ۲ کی صورت، مگر شیئرز کی خریداری صرف "Capital Gain" کے لئے ہے۔

- جواب ۱:- اس صورت میں شیئرز خریدنا جائز ہے۔^(۱)
- ۲:- اس صورت میں بھی شیئرز خریدنے کی گنجائش ہے، البتہ کمپنی والوں کو یہ لکھ دیا جائے کہ سود کے لین دین پر ہم راضی نہیں ہیں۔ اور کمپنی کے سالانہ اجتماع میں بھی اس بات کا اظہار کر دیا جائے، خواہ پھر وہ اس پر عمل نہ کریں۔^(۲)
- ۳ و ۴:- خرید و فروخت کی غرض سے بھی شیئرز خریدنے میں کوئی حرج نہیں،^(۳) البتہ سوال نمبر ۳ کی صورت میں بھی سودی معاملے کے ساتھ اپنی عدم رضامندی کا اظہار کرنا چاہئے، جیسا کہ نمبر ۲ میں گزرا۔ نیز ڈیلیوری سے پہلے آگے فروخت نہ کئے جائیں۔
- واللہ اعلم

۱۴۰۹/۱۲/۲۹ھ

(فتویٰ نمبر ۲۳۷۵/۴۰ و)

اسلامی بینکاری اور شیئرز کے بارے میں حضرت والا دامت برکاتہم کی رائے

(اسلامی بینکاری اور شیئرز سے متعلق خط و کتابت)

لندن کے ایک عالم مولانا موسیٰ کرماڑی صاحب نے ایک خط کے ذریعے حضرت والا دامت برکاتہم سے شیئرز کی خرید و فروخت سے متعلق دریافت کیا، لیکن وہ خط ڈاک کے ریکارڈ میں دستیاب نہ ہو سکنے کی بناء پر حضرت والا دامت برکاتہم نے اُن کے فیکس کے جواب میں ”اسلامی بینکاری“ سے متعلق اپنی رائے تحریر فرمائی۔ بعد میں سائل موصوف کی طرف سے وہ سابقہ اصلی خط دوبارہ بھیجا گیا جس میں درحقیقت شیئرز سے متعلق دریافت کیا گیا تھا، چنانچہ پھر حضرت والا دامت برکاتہم نے شیئرز سے متعلق ان کے دریافت کردہ امور کا تفصیلی جواب دیا۔ یہ خط و کتابت ذیل میں پیش کی جا رہی ہے۔ (محمد زبیر)

سوال:- محترم المقام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہ العالی
السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

بعدہ اُمید ہے کہ آنجناب بخیر و عافیت ہوں گے، دیگر چار ہفتے پہلے الحاج الطاف حسین

(۲۱) تفصیل کے لئے حضرت والا دامت برکاتہم کی کتاب ”اسلام اور جدید معیشت و تجارت“ ص: ۸۵ تا ۸۹ ملاحظہ فرمائیں۔

(۳) تفصیل اور حوالہ کے لئے امداد الفتاویٰ ج: ۳ ص: ۴۹۱ (طبع مکتبہ دارالعلوم کراچی) اور ”اسلام اور جدید معیشت و تجارت“ ص: ۸۷ و ۸۸ ملاحظہ فرمائیں۔

(۴) شیئرز سے تجارت یعنی ”Capital Gain“ کے بارے میں علماء کی مختلف آراء اور تفصیل کے لئے حضرت والا دامت برکاتہم العالیہ کی

کتاب ”اسلام اور جدید معیشت و تجارت“ ص: ۸۹ تا ۹۲ ملاحظہ فرمائیں۔ (محمد زبیر)

برخورداریہ صاحب کی معرفت ایک تفصیلی مراسلہ^(۱) ارسال کیا تھا، نہ آنے پر یاد دہانی کے لئے فیکس کر رہا ہوں، سخت انتظار ہے، اُمید ہے کہ حضرت والا اپنی گوناگوں مصروفیات میں کچھ وقت فارغ کر کے جواب سے آگاہ فرمائیں گے۔

فقط والسلام

موسیٰ کرماڑی، لندن

جواب:- گرامی قدر مکرم جناب مولانا موسیٰ کرماڑی صاحب مدظلہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کا گرامی نامہ الطاف برخورداریہ صاحب کی معرفت ایسے طریقے سے ملا کہ وہ جواب طلب ڈاک میں شامل نہ ہو سکا، اور کاموں کے ہجوم میں ذہن سے نکل گیا۔ اب آپ کا براہ راست فیکس موصول ہوا تو یاد آیا، اور اب وہ گرامی نامہ مل نہیں رہا ہے، تاہم جہاں تک یاد ہے، آپ نے یہ استفسار فرمایا تھا کہ کیا اسلامی بینکاری کے بارے میں میری رائے تبدیل ہوئی ہے؟ اس کے جواب میں عرض ہے کہ اسلامی بینکاری کے بارے میں جو کچھ بندہ نے اپنی کتاب ”اسلام اور جدید معیشت و تجارت“ میں لکھا ہے، یا انگریزی کتاب ”انٹروڈکشن ٹو اسلامک فنانس“ میں لکھا ہے، چند بہت جزوی معاملات کے سوا اس کے بارے میں بندہ کی رائے تبدیل نہیں ہوئی۔ اس پر تنقید میں جو رسائل نظر سے گزرے، جن میں سے ایک پر آنجناب کی تقریظ بھی ہے، اُن کے مطالعے کے بعد بھی بندہ کی رائے وہی ہے جو ان کتابوں میں مذکور ہے۔ البتہ اس بات کا اظہار میں نے متعدد مقامات پر کیا ہے کہ میں اس موضوع میں ضرورت کی وجہ سے داخل ہوا تھا، یہ میری ذاتی دلچسپی کا موضوع نہیں ہے، نیز میں سمجھتا ہوں کہ اسلامی مالیاتی اداروں کو مراجمہ، اجارہ وغیرہ پر ہی قانع ہو کر نہ بیٹھنا چاہئے بلکہ شرکت اور مضاربیت کی طرف پیش قدمی کرنی چاہئے۔ نیز میں اپنے دیگر علمی منصوبوں پر کام کرنے کے لئے اپنے آپ کو فارغ کرنا چاہتا ہوں، اس لئے ان اداروں کے شریعہ بورڈ کی رکنیت سے رفتہ رفتہ علیحدگی اختیار کر رہا ہوں۔ اُمید ہے کہ اس وضاحت سے بندہ کا موقف واضح ہو گیا ہوگا، اگر مزید کوئی بات دریافت طلب ہو تو بندہ سے براہ راست رابطہ فرمائیں۔

والسلام

بندہ محمد تقی عثمانی

۱۴۲۷/۱۲/۱۸ھ

(۱) یہ مراسلہ جوشیراز سے متعلق کئی سوالات پر مشتمل تھا، آگے اس سوال کے جواب کے بعد آ رہا ہے۔

۱:- شیئرز کی خرید و فروخت میں اُمت کی کونسی مجبوری اور اضطرار ہے؟

(”إمداد الفتاویٰ“ اور ”اسلام اور جدید معیشت و تجارت“ میں جواز کے فتویٰ

کی روشنی میں اضطرار و مجبوری کے مفہوم اور درجے کی وضاحت)

۲:- شیئرز کے فتویٰ جواز اور ”انعام الباری“ کی

ایک عبارت کی وضاحت

محترم المقام جناب حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہ العالی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

بعدہ اُمید ہے کہ آپ حضرت بخیر و عافیت ہوں گے۔ دیگر آنجناب کا ارسال کردہ فیکس

موصول ہوا، میرا اگلا خط سامنے ہوتا تو شاید جواب تشنہ نہ رہتا، بہر حال اس خط کی کاپی دوبارہ ارسال

خدمت ہے۔ اس کے علاوہ مکتبہ دارالعلوم کراچی کی شائع کردہ کتاب ”إمداد الفتاویٰ“ جلد: ۳ کے

صفحہ: ۴۹۹ کی کاپی بھی ارسال ہے، جس میں حضرت تھانویؒ نے پچھلے چند صفحات کی دس باتوں پر عربی

زبان میں تبصرہ فرماتے ہوئے اخیر میں لکھا ہے کہ: ”يقول اشرف على ان هذا التوسع كله في امثال

هذه المعاملات لمن ابتلى بها او اضطر اليها واما غيره فالتوقي الورع“ اس عبارت میں حضرتؒ

نے صاف لفظوں میں کہہ دیا ہے کہ کچھلی ساری سہولتیں صرف اضطراری یا مجبوری کی حالت میں ہیں۔

بناء بریں آنجناب نے ”اسلام اور جدید معیشت و تجارت“ کے صفحہ: ۸۷، ۸۸ پر جواز کی جو

صورت نکالی ہے، اس میں اُمت کے سامنے شیئرز خریدنے کے لئے کونسی ایسی مجبوری ہے یہ میری ناقص

سمجھ میں نہیں آتا، بلکہ ”انعام الباری“ جلد: ۶ میں شیئرز کو مثل سٹہ، سرمایہ دارانہ نظام اور عجیب و غریب

قسم کا بازار جو لکھا ہے مجھے قرین قیاس معلوم ہوتا ہے، لہذا:-

۱- شیئرز کی خرید و فروخت کے جواز پر اُمت کے لئے کونسی ایسی اضطراری اور مجبوری کی

حالت آپ کے نزدیک ہے؟ کچھ وضاحت فرمائیں تو مناسب ہوگا۔ نیز

۲- شیئرز کے جواز اور جلد: ۶ کی سٹہ ہونے میں کوئی تضاد تو نہیں؟ یا مجھے غلط فہمی ہو رہی ہے؟

فقط

برائے مہربانی تکلیف فرما کر مطلع فرمائیں تاکہ اطمینان ہو۔

موسیٰ کرماڑی، لندی

محترمی جناب حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہ العالی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

بعدہ اُمید ہے کہ آنجناب بخیر و عافیت ہوں گے۔ دیگر آپ کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ تقریباً دو سال کی محنت کے بعد ہند و پاک اور برطانیہ کے مختلف مفتیانِ کرام کے مطبوعہ اور غیر مطبوعہ فتاویٰ اور موجودہ زمانے کے پیچیدہ مسائل کافی تعداد میں میرے پاس جمع ہو گئے ہیں، جس کے سترہ سو صفحے کی تین جلدیں تیار ہوئی ہیں۔ اس کتاب کا نام ”عصر حاضر کے پیچیدہ مسائل اور اُن کا حل“ تجویز کیا ہے۔

ان تین جلدوں میں آنجناب کے بھی حسبِ منشاء مختلف فتاویٰ شامل کئے ہیں، جن میں سے ایک فتویٰ ”اسٹاک ایکسچینج میں شیئرز کی خرید و فروخت اور ان پر قبضے کا شرعی حکم“ اور دوسرا ”شیئرز کی خرید و فروخت“ بھی شامل ہے۔

ان تین جلدوں کی کتابت، تصحیح وغیرہ مکمل ہونے پر طباعت کے لئے کراچی کا سفر کرنے ہی والا تھا کہ اس درمیان دارالعلوم لندن کے مہتمم حضرت مولانا مفتی محمد مصطفیٰ صاحب کا ایک تفصیلی فتویٰ بنام ”شیئرز کے متعلق ایک استفتاء اور اس کا جواب“..... صاحب نے مجھے دیا، جس میں حضرت والا کے شیئرز کے جواز پر عدم اتفاق کا اظہار ہے (کاپی ارسال خدمت ہے)۔

اس کے علاوہ مکتبہ حبیبیہ کراچی کا شائع کردہ رسالہ بنام ”تکملة الرد الفقهی علیٰ جسٹس مفتی محمد تقی عثمانی“ بھی پڑھنے کو ملا، یہ رسالہ بڑی تعداد میں برطانیہ کے علمائے کرام تک پہنچایا گیا ہے، اس کے مقدمے کے صفحہ نمبر ۶ پر حضرت مفتی حبیب اللہ صاحب شیخ الحدیث و صدر مفتی جامعہ کلفٹن کراچی نے آپ کے متعلق لکھا ہے کہ:

چنانچہ مفتی صاحب نے اپنی کتاب انعام الباری شرح صحیح البخاری جلد: ۶ صفحہ: ۲۵۱ پر وضاحت کے ساتھ اسٹاک ایکسچینج میں شیئرز کی خرید و فروخت کے متعلق لکھا ہے کہ ”شیئرز کی خرید و فروخت اسٹاک ایکسچینج میں سٹہ ہے، سرمایہ دارانہ نظام ہے، اور عجیب و غریب قسم کا بازار ہے“ بحوالہ ماہنامہ ”ندائے شاہی مراد آباد“ آگے اس صفحے پر مکتہ المکرمۃ کی ایک علمی گفتگو کا آنجناب کا فرمان نقل کیا ہے کہ ”یہ ایک حیلہ نکالا گیا ہے، اس کے حیلہ ہونے میں کوئی شبہ نہیں، میں رفتہ رفتہ ان معاملات سے الگ بھی ہو رہا ہوں، اس لئے کہ بہت ہو گیا اور پووی سرگرمیاں اس پر لگا دینا نہیں چاہتا۔“

آگے صفحہ: ۷ پر مفتی حبیب اللہ صاحب نے آپ حضرات نے جو اسٹاک ایکسچینج کا دورہ کیا تھا، اس کی روئیداد تحریر کر کے لکھا ہے کہ وہاں سے جو معلومات حاصل کیں اس کے نتیجے میں ان تمام طریقوں کو ناجائز، حرام، سود اور باطل قرار دیا ہے۔ جس پر آنجناب اور حضرت مفتی محمد رفیع صاحب عثمانی کے علاوہ دارالعلوم کراچی کے دیگر مفتیان کرام کے دستخط موجود ہیں۔

آگے صفحہ: ۷، ۸ پر مفتی حبیب اللہ صاحب نے جس درد و کرب کے ساتھ ”مایوس کن صورتِ حال“ کے ذیلی عنوان کے ماتحت جو کچھ لکھا، حقیقت یہ ہے کہ نہایت ہی قابلِ توجہ ہے.....
حاصلِ کلام:-

حضرت مفتی صاحب! چونکہ میں نے ”عصرِ حاضر کے پیچیدہ مسائل اور اُن کا حل“ میں آنجناب کے ذکر کردہ یہ دو فتوے بھی شامل کئے ہیں، اور اس میں شیئرز کی حلت اور جواز موجود ہے، جبکہ حضرت مفتی حبیب اللہ صاحب کی عبارت کے مطابق شیئرز کے سٹہ ہونے، حرام، ناجائز اور باطل ہونے پر آنجناب کے تصدیق دستخط ہونے سے میں عجیب کشمکش کا شکار ہو گیا ہوں، میرے ناقص علم کے مطابق مجھے تو اس میں تضادِ بیان کا شبہ ہو رہا ہے، برائے مہربانی اول فرصت میں مجھے مطلع فرمائیں اور بتائیں:-

الف:- کیا آنجناب نے شیئرز کی حلت کے فتویٰ سے رُجوع فرمالیا ہے؟ جیسا کہ مفتی حبیب اللہ صاحب کے ”انعام الباری“ کے حوالے سے ظاہر ہوتا ہے۔

اگر رُجوع کر لیا گیا ہے تو صاف الفاظ میں وضاحت فرما کر ہمیں مطلع فرمائیں، اور اگر آپ اپنی سابقہ تحقیق پر قائم ہیں تو برائے مہربانی حسبِ بالا عبارت پر تبصرہ فرما کر ہمیں آگاہ فرمائیں۔ اُمید ہے کہ تکلیف فرما کر اطمینان بخش جواب سے جلد مطلع فرمائیں گے۔

نوٹ:- شاید آپ نے مجھے پہچان لیا ہوگا، پچھلے سال برطانیہ میں ایک دن کے لئے آپ کی تشریف آوری پر اوقاتِ نماز کے مشاہدات پر گفتگو کے لئے مولانا یعقوب مفتاحی صاحب سیکریٹری حزب العلماء (یو. کے) کے ساتھ بندہ بھی حاضر خدمت ہوا تھا۔
فقط والسلام

احقر موسیٰ کرماڑی، لندن

۱۴۲۶/۱۱/۶ھ

گرامی قدر مکرم جناب مولانا موسیٰ سلیمان کرماڑی صاحب زید مجدکم السامی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آنجناب کا گرامی نامہ بذریعہ فیکس موصول ہوا، اور اس کے ساتھ پچھلے گرامی نامے کی کاپی بھی

ملی۔ آپ نے اولاً ”امداد الفتاویٰ“ ص: ۴۹۹ کی عبارت نقل کر کے فرمایا ہے کہ: ”اس عبارت میں حضرت نے صاف لفظوں میں کہہ دیا ہے کہ پچھلی ساری سہولتیں صرف اضطراری یا مجبوری کی حالت میں ہیں..... اُمت کے سامنے شیئرز خریدنے کے لئے کوئی ایسی مجبوری ہے؟“ اس سلسلے میں عرض یہ ہے کہ حضرت نے یہ عبارت اول تو مال مخلوط کے سلسلے میں لکھی ہے، دوسرے حضرت نے خود شیئرز کی خریداری کو بشرط جائز قرار دیا ہے۔ اگر یہ اجازت صرف اضطراری حالات کے لئے ہے تو یہ سوال حضرت کی تحریر پر بھی ہو سکتا ہے کہ اُمت کے سامنے شیئرز خریدنے کے لئے کوئی ایسی مجبوری ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ حضرت کا مقصد اصطلاحی اضطرار نہیں ہے جس میں میتہ کھانا حلال ہو جاتا ہے، بلکہ کاروباری حاجت اور ابتلائے عام ہے، جیسا کہ خود حضرت نے ص: ۴۹۵ پر فرمایا ہے کہ: ”پس ابتلائے عام کی وجہ سے اس مسئلے میں دیگر ائمہ کے قول پر فتویٰ دے کر شرکت مذکورہ کے جواز کا فتویٰ دیا جاتا ہے“ نیز جو عبارت حضرت نے ص: ۴۹۹ پر لکھی ہے، اس میں ”فالتوقی الودع“ کے الفاظ واضح فرما رہے ہیں کہ یہ ورع یعنی تقویٰ کی بات ہے، جہاں تک فتویٰ کا تعلق ہے، فتویٰ جواز ہی کا ہے۔

ثانیاً آنجناب نے ”انعام الباری“ جلد: ۶ کے حوالے سے پوچھا ہے کہ بندہ نے شیئرز کو سٹہ اور سرمایہ دارانہ نظام کا حصہ قرار دیا ہے۔ اس سلسلے میں گزارش ہے کہ بندہ نے صرف ”انعام الباری“ میں نہیں، بلکہ دوسری متعدد تحریروں میں بھی یہ عرض کیا ہے کہ شیئرز کی خرید و فروخت میں اگر احکام شریعت کی رعایت نہ کی جائے تو اُس سے سٹہ بازی کا دروازہ کھلتا ہے، لیکن اگر احکام شریعت کا لحاظ رکھا جائے تو سٹہ بازی ہو ہی نہیں سکتی، مثلاً شریعت کا حکم یہ ہے کہ کسی بھی چیز کی بیع قبل القبض نہیں ہو سکتی، اگر تنہا اس حکم کو اسٹاک ایکسچینج پر نافذ کر دیا جائے تو سٹہ بازی کا دروازہ مکمل طور پر بند ہو جاتا ہے، کیونکہ سٹہ کے کاروبار کی ساری بنیاد ہی بیع قبل القبض اور بیع مضاف الی المستقبل پر ہے۔ اگر یہ دونوں چیزیں ختم ہو جائیں تو سٹہ ختم ہو جائے۔ لیکن اگر شیئرز کی خرید و فروخت حاضر سودوں میں ہو، اور قبضے سے پہلے آگے بیع نہ کی جائے تو اس میں نہ سٹہ کا کوئی احتمال ہے، نہ سرمایہ دارانہ نظام کی کوئی اور خرابی اس میں لازم آتی ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے روٹی، گندم اور دوسری اجناس میں بھی سٹہ ہوتا ہے، لیکن اس لئے ہوتا ہے کہ ان اجناس کی بیع قبل القبض یا مضاف الی المستقبل کی جاتی ہے، ان محظورات شرعیہ سے اجتناب کے ساتھ اگر ان اجناس کی خرید و فروخت ہو تو نہ اس میں سٹہ ہے، اور نہ وہ شرعاً ناجائز ہیں۔

ہم نے دارالعلوم کے علماء کے ساتھ اسٹاک ایکسچینج کا دورہ کر کے جس معاملے کی تحقیق کی تھی،

وہ یہ تھی کہ شیئرز پر قبضہ کب اور کس طرح ہوتا ہے؟ اس کے نتیجے میں یہ بات ثابت ہوئی کہ قبضہ خریداری کے فوراً بعد نہیں ہوتا، بلکہ اس میں کچھ وقت لگتا ہے، لہذا ہم نے یہ فتویٰ^(۱) جاری کیا کہ جس دن خریداری ہوئی ہے، اگر اُس دن قبضہ نہیں ملا (جیسا کہ پاکستان میں یہی صورت ہے) تو پھر اُسی دن شیئرز کو آگے بیچنا جائز نہیں ہے، بلکہ قبضہ ملنے کے بعد بیچنا جائز ہوگا۔ نیز اسٹاک ایکسچینج میں بدلے کے نام سے جو سودے ہوتے ہیں وہ شرعاً جائز نہیں ہیں۔ ہماری یہ تحریر ”البلاغ“ میں شائع ہو چکی ہے، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اگر قبضے وغیرہ کی شرعی شرائط پوری کر کے کوئی خرید و فروخت کی جائے تو وہ بھی ناجائز ہے۔

مکہ مکرمہ میں بندہ کی جس گفتگو کا حوالہ دیا گیا ہے، اس میں میں نے شیئرز کی خرید و فروخت کو حیلہ نہیں کہا تھا، بلکہ اس کا صحیح سیاق و سباق اسلامی بینکاری کے بعض طریقوں سے متعلق تھا، جس کی حقیقت میں اپنے پہلے خط میں آپ کو لکھ چکا ہوں۔

اُمید ہے کہ مذکورہ بالا گزارشات سے شیئرز کے بارے میں بندہ کا موقف واضح ہو گیا ہوگا۔

اللَّهُمَّ ارِنَا الْحَقَّ حَقًّا وَارْزُقْنَا اتِّبَاعَهُ، وَارِنَا الْبَاطِلَ بَاطِلًا وَارْزُقْنَا اجْتِنَابَهُ۔ والسلام

بندہ محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۱ محرم الحرام ۱۴۲۸ھ

(فتویٰ نمبر ۱۲/۹۳۶)

"Vested Stock" کے شیئرز کی خرید و فروخت کا حکم

سوال:- محترم مفتی تقی عثمانی صاحب! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کے خط کا شکریہ، اُمید ہے مزاج گرامی بخیر ہوں گے، اس خط کے ساتھ دو اُمور کے

کاغذات منسلک ہیں۔

۱- "Stock Options" پر زکوٰۃ کا مسئلہ، آپ کے ارشاد کی تعمیل میں میں نے کمپنی کے

ذمہ دار افراد سے پوچھا کہ اسٹاک شروع میں کسی کی ملکیت میں ہوتا ہے اور "Issued Capital" کا

حصہ ہوتا ہے یا نہیں؟ کمپنی کے لوگ مجھے تسلی بخش جواب نہیں دے سکے اور انہوں نے کسی اور "Tax

Advisor" سے مشورہ کرنے کو کہا ہے۔ میں نے دوسرے مسلمان برادران سے پوچھا جو اسی کمپنی میں

(۱) وہ فتویٰ اسی ”فصل فی احکام الأسهم“ کے ص: ۱۷۸ تا ص: ۱۹۰ میں ملاحظہ فرمائیں۔

کام کرتے ہیں اور ان کے نزدیک اسٹاک پہلے کمپنی کی ملکیت ہوتا ہے اور بعد میں ملازم کو دیا جاتا ہے، اس خط و کتابت کی نقل منسلک ہے، اب اس کے مطابق ایسا راستہ بتادیں کہ شک و شبہ رفع ہو جائے اور اگر زکوٰۃ دینی ہے تو دی جائے، پوری تفصیل دوسرے کاغذ (پہلے خط) میں موجود ہے۔ والسلام

جواب:- محترمی و مکرمی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

"Vested Stock" کے بارے میں آپ کا سوال دوبارہ موصول ہوا، جو جوابات آپ نے منسلک کئے ہیں ان سے صورتِ حال پوری طرح واضح نہیں ہوئی، لیکن ان سوالات کا مقصد اصل میں یہ تھا کہ "Vested Stock" کے حق کو استعمال کر کے ان شیئرز کو "Face Value" پر خریدنے کا جواز ان سوالات کے جواب پر موقف ہے۔ لہذا ان سوالات کے واضح جواب کے بغیر میں یہ تو عرض نہیں کر سکتا کہ ایسے شیئرز لینا جائز ہے یا نہیں؟ لیکن جہاں تک آپ کے اس سوال کا تعلق ہے کہ جس شخص نے اپنا یہ حق ابھی استعمال نہ کیا ہو، یعنی شیئرز نہ لئے ہوں، اُس پر ان کی زکوٰۃ فرض ہے یا نہیں؟ اس سوال کا جواب واضح ہے کہ جب تک شیئرز عملاً نہ لئے ہوں، ان پر زکوٰۃ فرض نہیں ہے۔

والسلام

۱۴۱۹/۸/۶ھ

(فتویٰ نمبر ۳۳۹/۹۱)



﴿فصل فی القرض والدين﴾ (قرض اور دین سے متعلق مسائل)

”قرض حسن“ سے کیا مراد ہے؟ اور قرض حسن کی واپسی کے
اطمینان کا طریقہ

سوال:- ایک بیوہ اپنی زر خرید زمین پر اپنا ذاتی رہائشی مکان بنوانے کے لئے ایک کروڑ پتی شخص سے بلا سودی قرضہ بطور قرض حسنہ لینا چاہتی ہے، اور ہر ماہ قسط وار ادا کرتی رہے گی، وہ شخص بینک کے تحفظ پر قرض حسنہ دینے کو تیار ہے تاکہ اگر قسط کی ادائیگی میں تاخیر یا ناغہ ہو تو بینک عدالتی کارروائی کر کے وصول کر سکے۔ قرض حسنہ کی واپسی کے لئے مقروض کو عدالتی مروجہ قوانین کے تحت پابند کرنا ضروری اور لا بدی ہے یا نہیں؟ شرعاً قرض حسنہ کی واپسی کا اطمینان کس طرح کیا جائے؟ بیوہ کا کوئی ذاتی مکان نہیں ہے عزیز واقارب کے یہاں رہ رہی ہے۔

جواب:- قرض حسن سے مراد وہ قرض ہے جس پر سود کا کوئی معاملہ نہ کیا جائے، البتہ قرض کی واپسی کے لئے اطمینان کا کوئی انتظامی معاملہ کرنا قرض حسن کے منافی نہیں ہے، مثلاً اگر کسی شخص کی کفالت طلب کی جائے، یا کوئی چیز رہن رکھ لی جائے،^(۱) (بشرطیکہ اس رہن شدہ چیز سے قرض دینے والا کوئی فائدہ نہ اٹھائے)،^(۲) تو شرعاً جائز ہے۔ اسی طرح قرض لینے والے سے کوئی تحریر لے لی جائے جس کے تحت اسے عدالت کے ذریعے قرض کی واپسی پر مجبور کیا جاسکے تو یہ بھی درست ہے۔ آپ نے بینک

(۱) وفي الهداية كتاب الكفالة ج: ۳ ص: ۱۲۲ (طبع مكتبة رحمانيه) وأما الكفالة بالمال فجائزة معلوماً كان المكفول به أو مجهولاً إذا كان ديناً صحيحاً الخ.

(۲) وفي صحيح البخاري ج: ۱ ص: ۲۹۳ (طبع قديمي كتب خانة) عن الأعمش قال: ذكرنا عند ابراهيم الرهن في السلف فقال: لا بأس به الخ.

وفي الهداية كتاب الرهن ج: ۴ ص: ۵۱۸ (طبع رحمانيه) ولا يصح الرهن إلا بدين مضمون لأن حكمه ثبوت يد الاستيفاء والاستيفاء يتلو الوجوب الخ.

(۳) في الدر المختار كتاب الرهن ج: ۶ ص: ۴۸۲ (طبع سعيد) لا يحل له أن ينتفع بشيء منه بوجه من الوجوه وإن أذن له الرهن لأنه أذن له في الربا لأنه يستوفي دينه كاملاً فتبقى له المنفعة فضلاً فيكون ربا وهذا أمر عظيم.

وفي رد المحتار ج: ۶ ص: ۴۸۲ لا يحل للمرتهن الانتفاع به مطلقاً الخ.

وكذا في البحر الرائق ج: ۶ ص: ۴۳۸ (طبع رشيديه) وملتقى الأبحر مع مجمع الأنهر ج: ۴ ص: ۲۷۳ (طبع مكتبة غفاريه كونه).

کے تحفظ کے بارے میں جو پوچھا ہے اس کی پوری صورت واضح نہیں ہوئی، اس معاملے کی تفصیل لکھیں تو اُس کا حکم بتایا جاسکتا ہے، البتہ مذکورہ بالا صورتوں میں سے جو صورت بھی اختیار کی جائے جائز ہے، اور اس سے مقروض کی امداد کا ثواب ان شاء اللہ ضائع نہیں ہوگا۔

واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۷/۲/۱۱ھ

(فتویٰ نمبر ۲۱۴/۲۸ الف)

سودی قرضے سے مکان بنوا کر بینک ملازمت کی پنشن کی رقم قرض میں ادا کرنے کا حکم

سوال:- ایک شخص سودی بینک میں ملازم تھا، اُس نے اس دوران بینک سے قرضہ لے کر مکان بنوایا، بعد میں یہ شخص ریٹائر ہو گیا تو کیا یہ شخص پنشن خود لینے کے بجائے اس کو قرضے کی ادائیگی میں دیدے تو اس کی گنجائش ہے؟

(مولانا محمد عامر)

استاذ جامعۃ الرشید، احسن آباد کراچی

جواب:- سودی بینک سے جو قرض لیا گیا وہ قرض صحیح ہو گیا، اگرچہ سودی معاملہ کرنے کا سخت گناہ ہوا، اس اصل قرض کا لوٹانا حلال مال سے واجب ہے، لہذا اگر نوکری حرام تھی تو اس کی پنشن سے قرض ادا کرنا درست نہیں۔^(۳)

والسلام

۱۴۲۵/۱۲/۲۹ھ

(۱) وفي بدائع الصنائع ج: ۷ ص: ۳۹۶ (طبع سعيد) وأما حكم القرض فهو ثبوت الملك للمستقرض في القرض للحال وثبوت مثله في ذمة المستقرض الخ.

وفي الدر المختار ج: ۵ ص: ۱۶۳ (طبع سعيد) ويملك المستقرض القرض بنفس القبض عندهما الخ. اور بینک سے قرض لینے میں اگرچہ واپسی کے وقت ”سود“ دینے کی شرط ہوتی ہے، مگر اس کے باوجود ”قرض“ کا معاملہ درست ہو جائے گا کیونکہ ”قرض“ ان معاملات میں شامل ہے جو شرط لگانے سے فاسد نہیں ہوتے بلکہ شرط خود باطل ہو جاتی ہے۔

وفي الدر المختار ج: ۵ ص: ۱۶۵ (طبع سعيد) القرض لا يتعلق بالجائز من الشروط فالفاسد منها لا يبطله ولكنه يلغو شرط. وفيه أيضا ج: ۵ ص: ۲۴۹ وما يصح ولا يبطل بالشرط الفاسد سبعة وعشرون القرض الخ.

وفي الشامية ما يصح أي في نفسه ويلغو الشرط. نيز دیکھئے امداد الفتاویٰ ج: ۳ ص: ۱۶۹. (۲ و ۳) وفي الهندية باب: ۲۷ ج: ۵ ص: ۳۶۷ (طبع رشيدية) ولو كان الدين لمسلم على مسلم فباع المسلم خمرًا وأخذ ثمنها وقضاه صاحب الدين كره له أن يقبض ذلك من دينه كذا في السراج الوهاج.

وفي الدر المختار ج: ۶ ص: ۳۸۵ (طبع سعيد) وجاز أخذ دين على كافر من ثمن خمر لصحة بيعه بخلاف دين على المسلم لبطلانه بخلاف المسلم لعدم تقومها في حقه فبقى الثمن على ملك المشتري.

وفي البحر الرائق ج: ۸ ص: ۲۰۱ (طبع سعيد) اذا كان لشخص مسلم دين على مسلم فباع الذي عليه الدين خمرًا وأخذ ثمنها وقضى الدين لا يحل للمدين أن يأخذ ذلك بدينه الخ.

وفي ملتقى الأبحر مع مجمع الأنهر كتاب الكراهية، فصل في البيع ج: ۴ ص: ۲۱۳ (طبع مكتبة غفاريه كوثه) ولو باع مسلم خمرًا وأوفى دينه من ثمنها كره لرب الدين أخذه وان كان المديون ذميًا لا يكرهه.

وكذا في الدر المنتقى على مجمع الأنهر ج: ۴ ص: ۲۱۳ (طبع غفاريه).

وفي الهداية كتاب الكراهية ج: ۴ ص: ۴۶۸ (طبع امداديه ملتان).

وفي تبیین الحقائق، کتاب الکراهیہ، فصل فی البيع ج: ۷ ص: ۶۰ (طبع دار الكتب العلمية بيروت). (محمد بیرحق نواز)

والدین سے قرض لی گئی رقم والدین کے انتقال کے بعد ان کے ورثاء میں تقسیم کرنا لازم ہے، اور والدین اور بہن بھائیوں پر خرچ کی گئی رقم ”قرض“ شمار ہوگی یا نہیں؟

سوال:- مکرّمی و محترمى، السلام علیکم! براہ کرم مندرجہ ذیل مسئلے کے متعلق جواب ارسال فرما کر مشکور فرمائیے۔ میری عمر اس وقت تقریباً ۷۰ سال ہے، میرے پانچ بھائی اور دو ہمشیرگان ہیں، قبلہ والد صاحب مرحوم گورنمنٹ ملازم تھے اور اعلیٰ عہدے پر فائز تھے، ۱۹۳۵ء میں پنشن لے لی تھی، ۱۹۲۸ء سے میری صحت خراب ہو گئی تھی اس لئے اعلیٰ تعلیم حاصل نہیں کر سکا تھا، اور پریشان رہا کرتا تھا، جب والد صاحب ریٹائر ہو گئے تو میری پریشانیوں میں اضافہ ہو گیا، کیونکہ مجھے اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کی فکر تھی، لہذا تجارت کو میں نے اپنا ذریعہ معاش بنانا چاہا تھا، جس کی والد صاحب نے رضامندی دے دی تھی اور میں نے دکان داری شروع کر دی تھی، والد صاحب ہمیشہ مذہبی خیال کے تھے اور تبلیغی کاموں میں دلچسپی لیا کرتے تھے، پنشن کا بیشتر حصہ اس قسم کے کاموں میں خرچ ہوا کرتا تھا، لہذا اخراجات کا بیشتر بار مجھ پر پڑا، اس وقت میرے ایک بڑے بھائی اور چھوٹے بھائی بہن سب زیر تعلیم ہی تھے، دکان میں تھوڑی سی پونجی لگی تھی، آمدنی کم اور اخراجات بہت زیادہ تھے، دیگر چیزوں کو ملا کر پندرہ بیس افراد کا خرچ تھا، میں نے سوچا کہ اس طرح تو دکان کا دیوالیہ نکل جائے گا، لہذا اہلیہ کا زیور فروخت کیا اور دیگر لوگوں سے قرض لے کر تجارت میں لگایا اور شب و روز محنت کی، ڈاکٹروں نے مجھے کہا کہ آب و ہوا کی تبدیلی کے لئے کہیں نکل جاؤں، مگر گھر کے حالات اور بھائی بہنوں کی تعلیم کا خیال کرتے ہوئے میں نے ایسا نہیں کیا، اور اپنی صحت کی بھی پروا نہیں کی، خداوند تعالیٰ نے فضل و کرم کیا اور سب بھائی بہن اپنی اپنی تعلیم مکمل کر چکے تھے اور برسرِ روزگار بھی ہو گئے تھے کہ ۱۹۴۷ء میں پاکستان بن گیا، ہندوستان میں ہم سب ایک ہی جگہ رہتے تھے مگر ۱۹۴۸ء میں پاکستان آنے کے بعد شروع میں دو جگہ تقسیم ہو گئے تھے، چونکہ میرے پاس فلیٹ میں جگہ کم تھی اس لئے والدین مرحوم اور دیگر بھائی بہن دوسرے بھائی کے ساتھ تھے، والدہ صاحبہ نے یہاں آنے کے بعد ہی حالات دیکھ کر مجھ سے اخراجات دینے کی فرمائش کی، جس کی میں نے تعمیل کی، چونکہ یہاں تجارت کی ابتدا ہی تھی اور دو بھائیوں نے مجھے فریب دیا اس لئے میری مالی حالت جلد خراب ہو گئی اور میں مقروض ہو گیا، میں نے دوسرے بھائیوں سے مدد طلب کی مگر بے سود، ”پڑھی نماز جنازہ بھی اپنی غیروں نے، مرے تھے جن کے لئے وہ رہے وضو کرتے“ والدین سے ہی کچھ روپیہ بطور قرض لیا تھا، دوسروں کا بھی ابھی تک

مقروض ہوں۔ ہندوستان میں میں نے بہت پریشانیاں اٹھائیں اور پاکستان میں ان سے زیادہ ابھی تک اٹھا رہا ہوں۔ ۱۹۵۷ء میں والد صاحب نے والدہ صاحبہ سے مشورہ کر کے مجھے ایک خط لکھ کر دیا تھا، جس میں لکھا ہے کہ یہ تمہاری جدوجہد و جانفشانی کا نتیجہ ہے کہ تمہارے بھائی بہن تعلیم حاصل کر سکے، ورنہ میری ذرا سی پنشن میں کیا ہو سکتا تھا، یہ سب خداوند تعالیٰ کی مہربانی کا نتیجہ ہے۔ والد صاحب اکثر والدہ صاحبہ سے یہ بھی کہا کرتے تھے کہ عبدالقیوم کے ساتھ بہت بے انصافی ہوئی ہے اور نیز بہت ظلم ہوا ہے۔ والدین کا انتقال شروع میں ہو چکا ہے، میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ والدین سے جو رقم بطور قرض لی تھی مندرجہ بالا حالات میں اس کا کیا ہوگا؟ زکوٰۃ کا حساب کرنا ہے اس لئے براہ کرم جلد از جلد جواب عنایت فرما کر مشکور و ممنون فرمائیے گا۔

جواب:- آپ نے والدین سے جو رقم قرض لی تھی، اگر انہوں نے قرض زندگی میں معاف نہیں کیا تو اس کی ادائیگی آپ پر واجب ہے، جب بھی موقع ملے یہ رقم والدین کے ترکے میں شامل کر کے ان کے دوسرے ترکے کی طرح اس کو ان تمام ورثاء پر تقسیم کریں جن میں خود آپ بھی شامل ہوں گے، یعنی جتنا حصہ آپ کے حصے میں آئے وہ چھوڑ کر باقی رقم ان کے دوسرے ورثاء تک پہنچانی ہوگی، اس سے پہلے آپ نے اپنے والدین یا بہن بھائیوں پر جو خرچ کیا، اگر اس وقت اس تصریح کے ساتھ کیا تھا کہ یہ آپ ان کو قرض دے رہے ہیں تب تو آپ ان سے واپس لے سکتے ہیں، لیکن اگر خرچ کرتے وقت یہ تصریح نہیں کی تھی تو وہ آپ کی طرف سے ہدیہ شمار ہوگا، جس کا آپ کو ان شاء اللہ ثواب ملے گا، لیکن آپ واپسی کا مطالبہ نہیں کر سکتے۔

واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم

ھ ۱۳۹۹/۹/۱۴

(فتویٰ نمبر ۱۶۰۸/۳۰ ج)

قرض کے لین دین میں تحریر اور گواہی کا اہتمام کرنا

بہتر ہے ضروری نہیں

سوال ۱:- رشتہ داری ہونے کی صورت میں دوسرے کو ایسی رقم دینا جس کی واپسی ضروری ہو، گواہوں کی موجودگی میں تحریر لکھنا ضروری ہے یا نہیں؟

۲:- گواہ موجود ہونے کی صورت میں بھی کسی کو ایسی رقم دی جائے جس کا واپس لینا ضروری ہو اور تحریر نہ لکھی جائے تو کیا رقم دینے والا گنہگار ہے یا نہیں؟

جواب ۱:- قرض کے معاملے میں بہتر یہی ہے کہ تحریر لکھی جائے اور دو گواہ موجود ہوں،

قرآن کریم^(۱) میں دیون کے سلسلے میں اسی طریقے کی تعلیم دی گئی ہے، لیکن اگر اس کے بغیر بھی قرض دے دیا جائے تو کچھ گناہ نہیں ہے۔

۲:- نہیں۔

واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم

۱۳۹۷/۶/۱۷ھ

(فتویٰ نمبر ۶۲۴/۲۸ ب)

حوالہ میں محتال لہ (قرض خواہ) کی رضامندی ضروری ہے اور قرض کے حوالہ اور مقاصد کی ایک مخصوص صورت

سوال:- عرض اینکہ میں عبدالمجید ولد نور محمد حلیفہ مندرجہ ذیل بیان لکھواتا ہوں کہ میرا سودا سیکورٹی آفیسر شکیل احمد کے ساتھ ایک کوارٹر کے بارے میں مبلغ دس ہزار روپے میں ہوا تھا، کوارٹر کے سودے میں متفق ہو کر امان گل دکان دار کے پاس آئے، امان گل کے سامنے شکیل احمد نے کہا کہ ہم نے کوارٹر آٹھ ہزار روپے میں لیا، دو ہزار منافع لوں گا، سودا اس طرح ہوا کہ دو ہزار روپے نقد دو، باقی ایک ہزار روپے ماہانہ قسط میں ادا کی جائے۔ اس پر امان گل دکان دار نے کہا کہ میں شکیل احمد کو اوپر دکان کے ادھار پندرہ سو روپے ہے، باقی پانچ سو روپے میں نے امان دکان دار سے قرضہ لے کر شکیل احمد کو دیئے، بعد میں شکیل احمد کو کوارٹر کا قبضہ دینے کے لئے کہا کہ کوارٹر ہم کو دو، اور کوارٹر کے لئے کاغذات لکھ کر دو، میں اور شکیل احمد عدالت میں گئے، اور شکیل احمد نے دستاویز لکھ دی۔ بعد میں ہم نے پندرہ سو قرضہ لے کر شکیل احمد کو دیئے۔ جب کوارٹر پر قبضہ دینے چلا تو اصل مالک آگئے اور پتہ چلا کہ شکیل احمد نے یہ مکان کرایہ پر لیا تھا، اس فراڈ کا کیس مکان کے مالک نے کیا، مجھے اور شکیل احمد کو تھانے میں بلایا گیا، وہاں جا کر معلوم ہوا کہ شکیل احمد بہت فراڈی آدمی ہے، جعلی کام کئی دفعہ کر چکا ہے، میں شکیل احمد کو تھانے میں چھوڑ کر امان کے پاس گیا اور اُس کے فراڈ کی تمام حالت بیان کی، پھر ہم امان گل کو تھانے میں لے کر آئے، امان گل کو کہا کہ یہ شکیل احمد فراڈی آدمی ہے لہذا دکان فروخت نہ ہوگی، پندرہ سو روپے ان سے لے لو، میں اب ان پیسوں کا ذمہ دار نہیں ہوں، اور ابھی شکیل احمد جواب موجود ہے ان سے وصول کرو، میری ذمہ داری ختم ہے، آپ جانو اور شکیل احمد جانے، میری کوئی ذمہ داری نہیں ہے، اس کے بعد شکیل احمد تین چار ماہ یہاں رہا، اب وہ چلا گیا۔ اس صورت حال کا شرعی حکم بیان فرمائیں۔

(۱) قال اللہ تعالیٰ فی کلامہ المجید: ”يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا تَدَايَنْتُمْ بِدِينٍ إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسَمًّى فَاكْتُبُوهُ“ (سورة البقرة: ۲۸۲)۔

جواب:- اس معاملے کی حقیقت یہ ہوئی کہ عبدالمجید نے امان گل دکان دار سے دو ہزار روپے تشکیل احمد کو مکان کی قیمت میں ادا کرنے کے لئے قرض لئے، ان دو ہزار میں سے پانچ سو روپے نقد امان گل سے وصول کئے اور ڈیڑھ ہزار روپے کا تشکیل احمد کے ذین سے مقاصہ کر لیا۔ بہر صورت! عبدالمجید پر امان گل کے دو ہزار روپے بطور قرض واجب ہو گئے، اس معاملے کا کوارٹر کی اس بیع سے کوئی تعلق نہیں ہے، جو عبدالمجید اور تشکیل احمد کے درمیان ہوئی، لہذا اس بیع کے ختم ہو جانے سے اس قرض پر کوئی اثر نہیں پڑا۔ عبدالمجید پر واجب ہے کہ وہ امان گل کا پورا قرضہ دو ہزار روپے ادا کرے، اور تشکیل احمد نے اس کے ساتھ جو دھوکا کیا ہے اس میں تشکیل احمد کے خلاف چارہ جوئی کر کے اپنے دو ہزار روپے اس سے وصول کرے، تشکیل احمد سے وصول کرنے کی ذمہ داری امان گل پر ڈالنا جبکہ امان گل نے اس کو بطور حوالہ قبول نہیں کیا، شرعاً درست نہیں ہے، امان گل، عبدالمجید سے دو ہزار روپے کا مطالبہ کرنے میں حق بجانب ہے۔

واللہ اعلم

۱۴۰۸/۸/۳ھ

(فتویٰ نمبر ۱۵۵۷/۳۹ و)

زکوٰۃ اور فطرے کی رقم سے مسجد کو قرض دینے کا

حکم اور مسجد سے ایسا قرض اُتارنے کا طریقہ

سوال:- محترمی و مکرمی جناب مفتی تقی عثمانی دامت برکاتہم، السلام علیکم ورحمۃ اللہ

بحوالہ جناب کا فتویٰ مورخہ ۲۹ ربیع الاول ۱۴۱۷ھ جس کی کاپی منسلک ہے، مزید صورت

حال کی وضاحت کے لئے عرض ہے کہ:

۱:- جناب کے فتویٰ کی نقل سابقہ کمیٹی کے جملہ ممبران کو اس استدعا کے ساتھ ارسال کی گئی کہ

حسب فتویٰ فطرے کی رقم کی وصولی کے لئے بندوبست کریں اور موجودہ کمیٹی تعاون کے لئے حاضر ہے، جواباً مکمل خاموشی ہے۔

(۱) وفي الدر المختار كتاب الحواله ج: ۵ ص: ۳۴۱ (طبع سعيد) الحواله شرط لصحتها رضا الكل بلا خلاف. وفي الشاميه تحت (قوله رضا الكل) أما رضا المحتال فلأن فيها انتقال حقه الى ذمة أخرى والذمم متفاوتة الخ. وفي البحر الرائق ج: ۶ ص: ۲۴۷ (طبع سعيد كراتشي) وتصح في الدين لا في العين برضا المحتال والمحال عليه لأن المحتال هو صاحب الحق وتختلف عليه الذمم فلا بد من رضا لاختلاف الناس في الايفاء. وفي الهنديه ج: ۳ ص: ۲۹۵ و ۲۹۶ (طبع رشيديه كوئٹہ) وأما شرائطها وبعضها يرجع الى المحتال له وأما الذي يرجع الى المحتال له ومنه الرضا. وفي البدائع ج: ۶ ص: ۱۶ (طبع سعيد كراتشي) وأما الشرائط وبعضها يرجع الى المحال وأما الذي يرجع الى المحال عليه فأنواع ومنها الرضا. وفي الهداية كتاب الحواله ج: ۳ ص: ۱۳۶ (طبع رحمانيه) وتصح الحواله برضاء المحيل والمحتال والمحتال عليه.

۲:- لوگوں کو یہ بخوبی علم ہے کہ مذکورہ رقم مسجد کے اخراجات کے ساتھ بے جا عدالتی کارروائی پر خرچ ہوئی ہے، جس نے یہ اقدام کیا، وہی ذمہ دار ہے، قرض کی ادائیگی کے لئے چندہ دینے سے گریزاں ہیں، بات آگے بڑھتی نظر نہیں آتی، سات سال سے زیر تعمیر مسجد امریکا میں موجود اُمت مسلمہ کے لئے باعثِ ننگ و عار ہے، اور ہماری بد اعمالیوں کا مظہر بھی۔

۳:- موجودہ کمیٹی نے اپنے پہلے اجلاس عام میں یہ اعلان کیا ہے کہ وہ ایک مد کی رقم دوسری مد میں خرچ کرنے کی رسم ترک کرتی ہے، اس اصول پر سختی سے کاربند بھی ہے۔

اب لوگوں نے جو چندہ تعمیر مسجد کے لئے دیا ہے اسی اعتماد پر دیا ہے کہ ان کی رقم تعمیر مسجد پر خرچ ہوگی، اگر یہ رقم قرض کی ادائیگی میں صرف کی جاتی ہے تو چندہ دہندگان کے ساتھ وعدہ خلافی اور آئندہ کے لئے عدم اعتماد کا باعث بھی ہو سکتی ہے، جس کا انہیں سابق میں تجربہ بھی ہو چکا ہے۔ موصولہ رقم چیک، ڈرافٹ کے علاوہ نامعلوم مسلمانوں کی نقد رقم بھی ہے، جس کی واپسی یا قرض میں ادائیگی کی اجازت محال ہے، مندرجہ بالا حالات کے پیش نظر از روئے فتویٰ نہ تو فی الحال قرض مذکورہ کی ادائیگی ممکن نظر آرہی ہے اور نہ ہی تعمیر مسجد کے امکانات، ہر دو کام فی الوقت مفلوج ہیں۔ تعمیری کام کو جاری رکھتے ہوئے قرض مذکورہ کی طرف لوگوں کو توجہ دلاتے رہیں تو اُمید ہے کہ اس مد میں بھی وہ ابتداء کریں گے، جبکہ وہ اپنی رقم جو تعمیر پر خرچ کرنے کے لئے دی ہے خرچ ہوتے دیکھ لیں تو اطمینان ہو جائے۔

دریافت طلب مسئلہ اب یہ ہے کہ:-

الف:- کیا از روئے شرع ایسا ممکن ہو سکتا ہے کہ تعمیر مسجد کی مد میں جمع شدہ رقم تعمیر مسجد ہی پر صرف کی جائے، یعنی تعمیر مسجد کو آگے بڑھایا جائے، اور کام کی ابتداء کی جائے جو رُک چکی ہوئی ہے؟

ب:- دریں اثناء قرض، فطرہ کی مد میں جو رقم وصول ہو اسی مد میں خرچ کی جائے۔ بینوا تو جروا!
جواب:- زکوٰۃ اور فطرے کی رقم سے کسی ایسی مد کے لئے قرض لینا جائز نہیں جس کی وصول یابی یقینی نہ ہو، مسجد کے چندے کا معاملہ بھی ایسا ہی ہے کہ اس کی وصول یابی یقینی نہیں، لہذا مسجد کو قرض دینا پہلی انتظامیہ کے لئے جائز نہیں تھا، لیکن اب جبکہ یہ رقم مسجد کے ذمے قرض ہو چکی ہے تو مسجد کے چندے سے اس کی ادائیگی ضروری ہے، اور پہلی انتظامیہ ہی اس بات کی ذمہ دار ہے کہ وہ لوگوں سے مسجد کا قرض اُتارنے کے لئے چندہ کرے، اور اسے زکوٰۃ اور فطرے کے مستحقین پر خرچ کرے۔ مسجد کی نئی انتظامیہ کو بھی اس میں تعاون کرنا چاہئے، اور بہتر یہ ہے کہ دونوں انتظامیہ مل جل کر مسجد کے لئے چندہ فراہم کریں، تاکہ مسجد کا قرض اُتر جائے۔ چونکہ قرض کی رقم سے مسجد کے اخراجات پورے کئے گئے تھے اس لئے جو لوگ مسجد میں قرض اُتارنے کے لئے چندہ دیں گے ان شاء اللہ انہیں مسجد ہی کو

چندہ دینے کا ثواب ملے گا۔ جب تک یہ قرض ادا نہ ہو مسجد کی مزید تعمیر روک دینی چاہئے، اور قرض ادا کرنے کے بعد تعمیر شروع کرنی چاہئے، البتہ اس مسجد میں نماز پڑھنا بلاشبہ جائز ہے۔

واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم

۲۹ ربیع الاول ۱۴۱۷ھ

(فتویٰ نمبر ۷۰/۲۴۷)

۱:- راشی سے لئے ہوئے قرضے کی عدم واپسی کا حکم

۲:- بینک کی سودی رقم سے قرض ادا کرنے کا حکم

سوال ۱:- (خلاصہ سوال) ایک افسر کا رشوت کا روپیہ کسی شخص پر قرض ہے، اگر مقروض اس افسر کا قرضہ ادا نہ کرے جس طرح کہ سود کا روپیہ دینا ضروری نہیں ہے، اسی طرح رشوت سے کمائے ہوئے روپے کا قرضہ نہ دیا جائے، کیا گناہ ہوگا؟ توبہ کی تو ضرورت نہیں ہے؟

سوال ۲:- اگر بینک سے سود لے کر کسی شخص کا قرضہ ادا کر دیا جائے یا کہ جو قرضہ بلا سود ہے اس بلا سود قرضے کو بینک سے سود لے کر ادا کر دیا جائے؟

جواب ۱:- رشوت کا معاملہ کرنا ہی سرے سے ناجائز تھا، اس گناہ پر استغفار کرنا چاہئے،^(۱) پھر اگر ابھی تک وہ روپیہ اس نے رشوت خور افسر کو نہیں دیا ہے تو وہ اسے اپنے پاس ہی رکھ سکتا ہے، لیکن معاملہ رشوت پر توبہ استغفار کرنا چاہئے، اور اگر افسر نے رشوت کی رقم کسی دوسرے سے وصول کر کے قرض دیا ہے تو اس کی ادائیگی ضروری ہے۔

جواب ۲:- جس شخص کا قرضہ ادا کیا جا رہا ہے اگر وہ مستحق صدقہ ہے (خواہ قرض ہی کی وجہ سے ہو) تو ایسا کرنے کی گنجائش ہے کہ سود کی رقم اس کو دے دی جائے پھر وہ اپنا قرض ادا کر دے، مگر خود اپنا دوسرا قرضہ اس سے ادا کرنا جائز نہیں، اور بہر صورت بہتر یہی ہے کہ بینک سے سود لیا ہی نہ جائے۔

واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفا اللہ عنہ

۱۲/۱۲/۱۳۸۷ھ

(فتویٰ نمبر ۱۴۲۵/۱۸ الف)

الجواب صحیح

محمد عاشق الہی بلند شہری

(۱) فی المشکوۃ کتاب الامارۃ والقضاء ج: ۱ ص: ۳۳۷ (طبع مکتبہ رحمانیہ) "عن عبد اللہ بن عمرو قال: لعن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الراشی والمرتشی۔"

سودی قرضہ لے کر کاروبار کرنے کا حکم

سوال ۱:- عرصہ سولہ سال سے میں ایک کمپنی میں بحیثیت تقسیم کار کے کاروبار کرتا ہوں، گزشتہ سال تک تو سرمایہ کافی تھا مگر اب کام کی خرابی کی وجہ سے سرمایہ بالکل قلیل ہے، شرکاء نے مجبوری سے بینک سے بذریعہ اوور ڈرافٹ روپیہ لینا شروع کیا جس کا سود بھی دینا پڑتا ہے، ایسے کام کے متعلق شریعت کا کیا حکم ہے؟

۲- مندرجہ بالا کاروبار کسی حیلے سے جائز ہو سکتا ہے؟

۳- اگر مندرجہ بالا کاروبار ناجائز ہے تو ہم اپنی حلال کمائی کیسے الگ کریں؟

۴- استغفار اور توبہ سے یہ گناہ معاف ہو جائے گا؟

جواب ۱ و ۲:- سود پر قرض لے کر کاروبار کرنا بالکل حرام ہے، اس سے بہر صورت بچنا ضروری ہے، اب راستہ یہ ہے کہ آئندہ کے لئے سودی قرضہ نہ لینے کا عزم کر کے اپنے گناہوں پر توبہ و استغفار کیا جائے، اور آئندہ کاروبار چلانے کے لئے سود پر قرض لینے کے بجائے کسی صاحب ثروت شخص کو کاروبار میں شریک کر لیا جائے۔

۳- سود پر قرض لینے کا معاملہ ناجائز و حرام ہے، لیکن چونکہ آمدنی میں کوئی سود کی رقم شامل نہیں ہے اس لئے توبہ و استغفار کے بعد اس آمدنی کو استعمال کیا جاسکتا ہے۔^(۱)

۴- توبہ و استغفار خلوص دل کے ساتھ اور اس کے آداب و شرائط کو ملحوظ رکھ کر کی جائے تو ہر

واللہ سبحانہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۷/۱۲/۵ھ

(فتویٰ نمبر ۱۴۱۲/۱۸ الف)

گناہ کی مغفرت کی امید ہے۔

الجواب صحیح

محمد عاشق الہی بلند شہری

کسی کا مقروض سے رقم لے کر اس کے قرض خواہ کو دینے سے قرض کی ادائیگی کی ایک مخصوص صورت اور اس کا حکم

سوال:- حاجی امام بخش کی سالی کے لڑکے کا لڑکا اللہ ڈنو اور حاجی امام بخش کے بھانجے

(۱ و ۲) فی الشامیہ ج: ۵ ص: ۱۶۶ کتاب البیوع، کل قرض جر نفعاً.... الخ فهو حرام. کذا فی الأشباہ والنظائر، الفن الثانی ص: ۲۵۷ (طبع قدیمی). کذا فی تکملة فتح الملمہم ج: ۱ ص: ۵۷۵ کتاب المساقات (طبع دارالعلوم). نیز دیکھئے ص: ۲۷۸ کا حاشیہ۔

(۳) حوالہ کے لئے دیکھئے ص: ۲۰۱ کا حاشیہ نمبر ۱۔

سوڈھو، غلام قادر ہے، یہ سب اہل معاملہ ہیں، واقعے کی تفصیل یہ ہے:-

اللہ ڈنو نے غلام قادر سے ایک بوری گندم قیمتاً حاصل کی، اللہ ڈنو نے سوڈھو سے ایک عدد ریڈیو حاصل کیا، مگر مذکورہ بالا دونوں اشیاء کی قیمت ادا نہیں کی۔ کچھ عرصہ بعد اللہ ڈنو نے بھینس فروخت کی تو غلام قادر نے بزرگ ہونے کی حیثیت سے حاجی امام بخش سے کہا کہ: ”اللہ ڈنو کے پاس پیسے ہیں، ہمیں پیسوں کی ضرورت ہے، اس لئے ہمیں پیسے دلا دیں، آپ کہیں گے تو وہ ہمیں پیسے دیدے گا ویسے نہیں دے گا۔“ غلام قادر کے دل میں یہ بات تھی کہ اگر اللہ ڈنو پیسے دے گا تو ہم ریڈیو اور گندم میں قطع کر لیں۔

حاجی امام بخش نے اللہ ڈنو سے کہا کہ: ”کیا تمہارے پاس پیسے ہیں؟“ اللہ ڈنو نے جواب دیا: ”ہاں! پیسے ہیں“ حاجی امام بخش نے کہا کہ: ”دو سو روپے مجھے دے دو“ اللہ ڈنو نے امام بخش کو دو صد روپے دیئے جو امام بخش نے اپنے بھانجے غلام قادر کو اُسی وقت دے دیئے۔ کچھ دنوں کے بعد حاجی امام بخش اور بھانجوں مذکورہ بالا کے درمیان ناراضگی ہو گئی، ادھر اللہ ڈنو اور مذکورہ بالا دونوں بھانجوں میں دوستی بڑھ گئی۔ ایک فیصلے میں غلام قادر نے حاجی امام بخش سے کہا کہ: ”آپ نے جو اللہ ڈنو سے دو صد روپے لئے تھے وہ ادا کریں“ اس پر حاجی امام بخش نے کہا کہ: ”وہ روپے تو لے کر میں نے تم کو دے دیئے تھے، تم جانو اور وہ جانے، تم دونوں دوست ہو۔“ لیکن غلام قادر نے دو صد روپے کی وصولی سے قطعی انکار کر دیا، حاجی امام بخش نے غلام قادر کے بڑے بھائی سوڈھو سے کہا کہ: ”میں نے دو صد روپے اللہ ڈنو سے لے کر غلام قادر کو دیئے تھے، اس میں سے ایک صد روپے غلام قادر نے آپ کو بعض ریڈیو ادا کئے ہیں، کیا یہ درست ہے؟“ سوڈھو نے اقرار کیا کہ غلام قادر نے ریڈیو کے عوض ایک صد روپیہ دیا ہے، مگر غلام قادر نے انکار کیا کہ میں نے سوڈھو کو اپنی طرف سے ایک صد روپے دیئے۔ ایک فیصلہ کنندہ نے یہ بیانات سن کر کہا کہ: ”تم کو پیسے ملے ہیں، تم جھوٹے ہو“ دوسرے فیصلہ کنندہ کا یہ اصرار ہے کہ: ”امام بخش نے اللہ ڈنو سے غلام قادر شاہد کے رو برو پیسے لئے ہیں، لہذا تم دو صد روپے بھرو۔“ اس مضمون پر غور فرما کر شریعت کا فیصلہ صادر فرمائیں۔

جواب:- اگر حاجی امام بخش نے اللہ ڈنو کو یہ بتا کر روپیہ لیا تھا یا بعد میں بتا دیا تھا کہ اس روپے کے ذریعے غلام قادر کی واجب الادا رقم جو تمہارے ذمے تھی تمہاری طرف سے ادا کر دی ہے، اور غلام قادر نے واقعہً وہ رقم وصولی کر لی ہے تو حاجی امام بخش پر کوئی تاوان نہیں آتا۔ اور غلام قادر کے انکار کا حل یہ ہے کہ حاجی امام بخش اس بات پر گواہ پیش کرے کہ اُس نے غلام قادر کو روپیہ دیا ہے، اگر

دو مرد یا ایک مرد اور دو عورتیں اس کے حق میں گواہی دیں تو فیصلہ اس کے حق میں ہوگا، اور اگر وہ گواہ پیش نہ کر سکے تو غلام قادر اللہ کی قسم کھائے کہ میں نے حاجی امام بخش سے مذکورہ روپیہ نہیں لیا، اگر وہ یہ قسم کھانے سے انکار کرے تب بھی حاجی امام بخش کے حق میں فیصلہ ہوگا، اور اگر قسم کھالے تو غلام قادر کے حق میں فیصلہ ہو جائے گا،^(۱) اور حاجی امام بخش کو یہ روپے بھرنے پڑیں گے، لیکن اگر غلام قادر نے جھوٹی قسم کھائی تو اس پر دُنیا و آخرت میں سخت وبال کا اندیشہ ہے، لہذا وہ اپنی موت و آخرت کو دیکھ کر کام کرے۔

واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۷ھ/۱۲/۲۱

(فتویٰ نمبر ۱۳۷/۲۸ الف)

قرض لینے اور اُدھار یا قسطوں پر خریداری کا شرعی حکم نیز حج اور عمرہ کی ادائیگی کے لئے قرض لینے کا حکم

سوال:- آج کل قرض لینے اور اُدھار یا قسطوں پر خریداری کا بہت رواج ہو گیا ہے، سوال یہ ہے کہ قسطوں پر قرض لینے یا اُدھار معاملہ کرنے کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ نیز حج اور عمرہ ادا کرنے کے لئے قرض لینے یا اُدھار معاملہ کرنا جائز ہے یا نہیں؟

جواب:- سود کے بغیر قرض لینا اگرچہ جائز ہے، جبکہ ادائیگی کی نیت پکی ہو، لیکن احادیث شریفہ سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ مقروض بننا کوئی پسندیدہ بات نہیں ہے، اور جب تک کوئی واقعی حاجت درپیش نہ ہو، حتی الامکان اس سے بچنا ہی بہتر ہے۔ اس ناپسندیدگی کا ثبوت اس بات سے ملتا ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مقروض بننے سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگا کرتے تھے۔ چنانچہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا روایت فرماتی ہیں:

ان رسول الله صلى الله عليه وسلم كان يدعو في الصلاة ويقول اللهم اني أعوذ بك من المأثم والمغرم، فقال له قائل: ما أكثر ما تستعيز يا رسول الله من المغرم، قال: ان الرجل اذا غرم حدث فكذب ووعد فأخلف.

(صحیح البخاری، کتاب الاستقراض، باب من استعاض من الدين ۲۳۹۷، طبع: دار السلام)

(۱) فی مشکوٰۃ المصابیح، باب الأقضية والشهادات ج: ۲ ص: ۳۳۸ (طبع مکتبہ رحمانیہ) عن عمرو بن شعيب عن أبيه عن جده أن النبي صلى الله عليه وسلم قال: "البينة على المدعى واليمين على المدعى عليه." رواه الترمذی ج: ۱ ص: ۳۸۱ (طبع مکتبہ رحمانیہ).

(۲) فی صحیح المسلم ج: ۲ ص: ۳۲۶ (طبع قدیمی) قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: "عليكم بالصدق! فان الصدق يهدي الى البر، وان البر يهدي الى الجنة.... واياكم والكذب! فان الكذب يهدي الى الفجور، وان الفجور يهدي الى النار...." اهـ (رقم الحديث: ۴۷۲۱، باب قبح الكذب وحسن الصدق وفضله).

ترجمہ:- رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نماز میں دُعا فرمایا کرتے تھے، اور فرماتے تھے: یا اللہ! میں گناہ سے اور مقروض بننے سے آپ کی پناہ مانگتا ہوں۔ تو کسی کہنے والے نے آپ سے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! آپ بکثرت قرض سے کیوں پناہ مانگتے ہیں؟ آپ نے فرمایا: جب کوئی شخص مقروض بن جاتا ہے تو بات کرتا ہے تو جھوٹ بولتا ہے، اور وعدہ کرتا ہے تو اُس کی خلاف ورزی کرتا ہے۔

اور روایات میں ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کسی ایسے صاحب کا جنازہ لایا جاتا جن کا انتقال مقروض ہونے کی حالت میں ہی ہو گیا ہو، اور ان کے ترکے میں اتنا مال نہ ہو جس سے اُن کا قرض ادا کیا جاسکے تو آپ اُس پر بذاتِ خود نمازِ جنازہ پڑھانے کے بجائے دُوسرے صحابہ کو نماز پڑھانے کا حکم دیتے تھے۔ چنانچہ صحیح بخاری میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ:

ان رسول الله صلى الله عليه وسلم كان يؤتى بالرجل المتوفى عليه الدين،
فيسأل: هل ترك لدينه فضلا؟ فان حُذِث أنه ترك لدينه وفاء صلى، والّا
قال للمسلمين: صلوا على صاحبكم.

(۱) (صحیح البخاری، کتاب الکفالة حدیث: ۲۲۹۸)

اسی طرح ایک مرتبہ آپ نے ایک ایسے ہی جنازے کی نماز پڑھانے سے انکار فرمادیا، لیکن جب ایک صحابی (حضرت ابوقتادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ) نے اعلان فرمایا کہ میں ان کا پورا قرض اُتارنے کا ذمہ لیتا ہوں، تب آپ نے اُن کی نمازِ جنازہ پڑھی۔ حضرت سلمہ بن اکوع رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں:

أن النبي صلى الله عليه وسلم أتى بجنازة ليصلي عليها، فقال: هل عليه من دين؟ قالوا: لا، فصلى عليه، ثم أتى بجنازة أخرى، فقال: هل عليه من دين؟ قالوا: نعم، قال: فصلوا على صاحبكم. قال أبو قتادة: على دينه يا رسول الله! فصلى عليه.

(۲) (أيضاً حدیث: ۲۲۹۵)

مستدرک حاکم میں اس پر یہ اضافہ ہے کہ جب حضرت ابوقتادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اُس کا قرض ادا کر دیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”الآن بردت عليه جلدته“ (رواہ الحاکم فی

کتاب البیوع، حدیث: ۲۳۴۶، وقال: صحیح، وأقره علیہ الذہبی، طبع: دار الکتب العلمیۃ۔
نیز حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نقل فرماتے ہیں:

لا تخیفوا أنفسکم بعد أمنہا، قالوا: وما ذاک یا رسول اللہ؟ قال: الدین.

(مسند أحمد، مسند عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ، حدیث: ۷۳۲۰، طبع: مؤسسة الرسالة)

ترجمہ:- تم اپنے آپ کو آمن حاصل کرنے کے بعد خوف میں مبتلا نہ کرو۔ صحابہ کرامؓ نے پوچھا: یا رسول اللہ! وہ خوف کی بات کیا ہے؟ آپ نے فرمایا: مقروض بننا۔

ان تمام روایات سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ مدیون یا مقروض بننا کوئی پسندیدہ بات نہیں ہے، اسی لئے فقہائے کرامؓ نے فرمایا ہے کہ اپنے اوپر قرض کا بوجھ کسی حقیقی حاجت کی وجہ ہی سے لینا چاہئے، اس کے بغیر نہیں۔

البتہ بعض صحابہؓ سے ایسی روایتیں بھی منقول ہیں کہ وہ مقروض یا مدیون بننے کو پسند کرتے تھے، مثلاً حضرت میمونہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے بارے میں روایت ہے کہ:

كانت ميمونة تَدان فتكثُر، فقال لها أهلها في ذلك ولا موها ووجدوا عليها، فقالت: لا أترك الدين، وقد سمعت خليلي وصفيي صلى الله عليه وسلم يقول: ما من أحد يدان ديناً فعلم الله عز وجل أنه يريد قضاءه إلا أدى الله عز وجل عنه في الدنيا.

(السنن الكبرى للنسائي، كتاب البیوع، حدیث: ۶۲۸۵) (۱)

ترجمہ:- حضرت میمونہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا اُدھار لیا کرتی تھیں، اور بہت لیتی تھیں، چنانچہ اُن کے گھر والوں نے اُن سے بات کی، اور انہیں ملامت کی، اور ناراضگی کا اظہار کیا۔ اس پر حضرت میمونہؓ نے فرمایا: میں اُدھار لینا نہیں چھوڑ سکتی، جبکہ میں نے اپنے محبوب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ: ”جو شخص بھی کوئی ایسا اُدھار لیتا ہے جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ کو معلوم ہے کہ اُس کا ارادہ اُس اُدھار کو ادا کرنے کا ہے، تو اللہ تعالیٰ اُس کی طرف سے دُنیا ہی میں ادائیگی فرمادیتے ہیں۔“

یہی حدیث امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی روایت کی ہے، اور اُس کے الفاظ یہ ہیں:

عن ميمونة أنها كانت تدان، فقيل لها: انك تدانين فتكثرين وأنت

موسرۃ؟ فقالت: انی سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم يقول: من اَدان دینا ینوی قضاءہ کان معہ عون من اللہ علی ذلک، فأنا أَلتمس ذلک العون. (السنن الکبریٰ للبیہقی، کتاب البیوع، باب ما جاء فی جواز الاستقراض وحسن النیة، ج: ۵ ص: ۳۵۴، طبع: شرح السنة ملتان)

اس سے معلوم ہوا کہ حضرت میمونہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا مالی اعتبار سے خوش حال ہونے کے باوجود ادھار کا معاملہ کرتی تھیں، اور اُسے حدیث کے مطابق اللہ تعالیٰ کی طرف سے مدد کا وسیلہ قرار دیتی تھیں۔

اسی طرح حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے بارے میں روایت ہے کہ:
أنها كانت تداين فقيل لها: ما لك والدين، وليس عندك قضاء؟ فقالت: سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول: ما من عبد كانت له نية في أداء دينه إلا كان له من الله عون، فأنا أَلتمس ذلک العون.

(السنن الکبریٰ للبیہقی، کتاب البیوع، ج: ۵ ص: ۳۵۴ طبع شرح السنة ملتان)
ترجمہ:- وہ ادھار لیا کرتی تھیں، تو ان سے کہا گیا کہ: آپ کیوں ادھار لیتی ہیں جبکہ آپ کے پاس ادائیگی کا انتظام نہیں؟ اس پر انہوں نے فرمایا کہ: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ: جس بندے کی بھی یہ نیت ہوتی ہے کہ وہ اپنا قرض ادا کرے، تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اُس کی مدد ہوتی ہے، اس لئے میں وہ مدد تلاش کرتی ہوں۔

اور امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس روایت کی مزید تفصیل اس طرح ذکر فرمائی ہے:
كان عمر بن الخطاب رضي الله تعالى عنه اذا صلى الصبح يمر على أبواب أزواج النبي صلى الله عليه وسلم فرأى على باب عائشة رجلاً جالساً فقال: ما لي أراك جالساً ههنا؟ قال: دين لي أطلب به أم المؤمنين، فبعث اليها عمر: يا أم المؤمنين! أما لك في سبعة آلاف درهم أبعث بها اليك في كل سنة كفاية؟ فقالت: بلى! ولكن علينا فيها حقوق وقد سمعت النبي صلى الله عليه وسلم يقول: من اَدان دینا ینوی قضاءہ کان معہ من اللہ عزّ وجلّ حارس، فأنا أحب أن يكون معي من الله عزّ وجلّ حارس.

(شرح مشکل الآثار للطحاوی، حدیث: ۴۲۸۹ طبع مؤسسة الرسالة)

ترجمہ:- حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ جب صبح کی نماز پڑھ لیتے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات کے دروازوں کے پاس سے گزرا کرتے تھے، اس طرح انہوں نے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے دروازے پر ایک شخص کو بیٹھا دیکھا، تو اُس سے پوچھا کہ کیا بات ہے کہ تم مجھے یہاں بیٹھے نظر آرہے ہو؟ اُس نے کہا کہ: میرا قرض ہے جو میں اُمّ المؤمنین سے مانگنے آیا ہوں۔ اس پر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے پاس پیغام بھیجا کہ: ”اُمّ المؤمنین! میں جو ہر سال سات ہزار درہم آپ کے پاس بھیجتا ہوں، کیا وہ آپ کے لئے کافی نہیں ہوتے؟“ حضرت عائشہ نے جواب دیا: ”بے شک کافی ہوتے ہیں، لیکن ہم پر ان میں بہت سے حقوق ہیں، اور میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ: ”جو شخص بھی ایسا ادھار لے جس کی ادائیگی کا وہ ارادہ رکھتا ہو، تو اللہ کی طرف سے اُس کے لئے ایک حفاظت کرنے والا مقرر کر دیا جاتا ہے“ لہذا میں یہ پسند کرتی ہوں کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک حفاظت کرنے والا میرے ساتھ رہے۔“

ان احادیث و آثار سے ادھار لینے کی جو بظاہر پسندیدگی نظر آرہی ہے، وہ اُن احادیث سے متعارض معلوم ہوتی ہے جو اوپر ذکر کی گئی ہیں، اس ظاہری تعارض کو حل کرنے کے لئے امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے مفصلی بحث کی ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ناجائز اور مذموم ادھار وہ ہے جس میں انسان اُس کی ادائیگی سے غافل ہو جائے، اور غفلت میں پڑا رہنے کی وجہ سے وہ قرض اُس پر سوار ہوتا چلا جائے، اور اُس کا خوف اُس پر مسلط ہو جائے۔ چنانچہ وہ یہ حدیث روایت فرماتے ہیں:

عن عبد اللہ بن عمرو بن العاص قال: قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: الغفلة فی ثلاث: الغفلة عن ذکر اللہ عزّ وجلّ، ومن لدن أن یصلی صلاة الصبح حتی تطلع الشمس، وأن یغفل الرجل عن نفسه فی الدین حتی یرکبہ۔ (شرح مشکل الآثار للطحاوی حدیث: ۴۲۸۵) (۱)

چنانچہ حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث: ”لا تخیفوا أنفسکم“ روایت کرنے کے بعد امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

فتأملنا هذا الحديث لنقف على المراد به ما هو ان شاء الله فوجدنا النهی

الذی فیہ مقصودا بہ الی اخافۃ الأنفس بالدیون و کان معقولاً أنه لا ینخف
الأنفس الا ما غلب علیہا حتی صارت بذلک خائفۃ منه و کان ذلک
کمثل ما قد روی عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غیر هذا الحدیث.

اس کے بعد حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث روایت کر کے امام

طحاوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

و کان ما کان من الدیون التی لا ترکب من ہی علیہ العمل فی خلاصہ منها
وبراءتہ منها الی أهلہا بخلاف الدیون التی یغفل من ہی علیہ عن براءتہ
منہا والخروج منها الی أهلہا فمن کان من أهل هذه المنزلة الثانية کان
مذموماً و کان مخیفاً لنفسہ من الدین الذی علیہ سوء العاقبة فی الدنیا
بسوء المطالبة و فی الآخرة بما هو أغلظ من ذلک فأما ما کان من الدین
الذی هو علیہ علی الحال الأول من ہاتین الحالتین فغیر خائف علی نفسه
ما ینخافہ علی نفسه من کان علی الحال الأخری فی الدین الذی علیہ بل
من کان علی الحال المحمودۃ من ہاتین الحالتین فی الدین الذی علیہ
مرجوا لہ الثواب فیما هو علیہ من ذلک والعون من اللہ عزّ وجلّ ایاہ علی
ما هو علیہ فیہ کما روی عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فیہ. (شرح

مشکل الآثار للطحاوی، باب: ۶۶۳، ج: ۱۱، ص: ۶۷، ۶۸، ۶۹ طبع مؤسسة الرسالة)

امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ کی تطبیق کا حاصل یہ ہے کہ جب انسان غفلت کی حالت میں کوئی
قرض اپنے ذمہ لے، اور اُس کی ادائیگی کا اہتمام نہ ہو تو یہ ناجائز اور مذموم ہے، اور حضرت میمونہ اور
حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے واقعات اس غفلت والے دین میں داخل نہیں، بلکہ وہ چونکہ ادائیگی
کا ارادہ رکھتی تھیں، اور اس کے اسباب بھی اُن کے پاس موجود تھے، اس لئے اُن کا مدیون بننا جائز تھا،
اور یہ بات بھی ظاہر ہے کہ انہوں نے یہ ادھار کسی حاجت ہی کی وجہ سے لیا ہوگا، اس لئے امام طحاوی
نے اُس کو ذکر کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی، اور چونکہ ان کی نیت اللہ تعالیٰ کی مدد حاصل کرنے کی تھی،
اس لئے نہ صرف یہ کہ اُس میں کوئی کراہت نہیں تھی، بلکہ وہ موجبِ ثواب بھی تھا، لیکن ہر شخص اپنے
آپ کو اُمہات المؤمنین پر قیاس نہیں کر سکتا، جب کوئی مقروض بنتا ہے تو جس غفلت، خوف اور دُوسرے
مذموم حالات کا ذکر احادیث میں آیا ہے، اُن کا احتمال رہتا ہی ہے، اس لئے فقہائے کرام نے
استقراض کے جواز کو حاجت کے ساتھ مشروط فرمایا ہے، جس کا مأخذ وہ حدیث ہے جس میں قرض دینے

کو صدقہ سے افضل قرار دیا گیا ہے، اُس میں الفاظ یہ ہیں کہ:

فقلت: یا جبریل! ما بال القرض أفضل من الصدقة؟ قال: ان السائل قد
يسئل وعنده والمستقرض لا يستقرض إلا من حاجة.

(سنن ابن ماجہ، أبواب الصدقات، حدیث: ۲۴۳۱ طبع دار السلام)

یہ حدیث اگرچہ ایک راوی خالد بن یزید کی وجہ سے ضعیف ہے، (کما فی مصباح الزجاجة) لیکن اتنی بات کہ مستقرض کو کسی حاجت ہی کی وجہ سے قرض لینا چاہئے، احادیث کے مجموعی مزاج سے بھی واضح ہوتی ہے۔ چنانچہ فقہائے کرامؒ نے حاجت کے وقت بھی جواز کے لئے ”لا بأس“ کی تعبیر اختیار کی ہے جس کا تقاضا یہ ہے کہ حتی الامکان اس سے پرہیز کرنا ہی بہتر ہے، چنانچہ فتاویٰ عالمگیریہ میں فرمایا گیا ہے:

لا بأس بأن يستدين الرجل اذا كانت له حاجة لا بد منها، وهو يريد
قضاءها. (عالمگیریہ، کتاب الکراہیۃ ج: ۵ ص: ۳۶۶) ^(۱)

البتہ حاجت میں دُنیوی اور دینی دونوں طرح کی حاجتیں داخل ہیں، اور ان کے تعین میں اختلافِ رائے بھی ممکن ہے۔ اُمہات المؤمنینؓ کا جو عمل اُوپر ذکر کیا گیا ہے، اُس میں یہ بات واضح ہے کہ اُن کو اپنے کھانے پینے کی ضروریات کے لئے قرض لینے کی اس لئے ضرورت نہیں تھی کہ اُن کا سال بھر کا نفقہ اُنہیں مل جایا کرتا تھا، حضرت عائشہ اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے مذکورہ بالا سوال و جواب میں اس کی تصریح ہے، اور حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا یہ اعتراف بھی اُس روایت میں موجود ہے کہ اُن کو دیا جانے والا سالانہ نفقہ اُن کے لئے کافی ہوتا ہے، لیکن انہوں نے کچھ دوسرے حقوق کا ذکر فرمایا ہے، اور حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا یہ عمل متعدد روایات سے ثابت ہے کہ وہ بکثرت صدقات و خیرات کیا کرتی تھیں، چنانچہ صحیح بخاری میں ہے کہ:

و كانت لا تمسک شیئاً مما جاءها من رزق الله إلا تصدقت.

(صحیح البخاری، مناقب قریش، حدیث: ۳۵۰۵) ^(۲)

لہذا ظاہر یہ ہے کہ انہیں قرض لینے کی ضرورت صدقات و خیرات کی وجہ سے پیش آتی تھی، اور اُن کا مزاج یہ تھا کہ کسی ضرورت مند کو اُس کی ضرورت پوری کئے بغیر واپس کرنا اُنہیں گوارا نہیں تھا، چاہے اس کے لئے خود تنگی گوارا کرنی پڑے۔ اس سے معلوم ہوا کہ دینی اور دُنیوی دونوں قسم کی

(۱) طبع رشیدیہ و بلوچستان بک ڈپو.

(۲) الصحیح للبخاری ج ۱ ص: ۴۹۷ (طبع سعید).

حاجتوں میں قرض لینے کی گنجائش ہے۔

احادیث مذکورہ بالا، صحابہؓ کے آثار اور فقہائے کرامؒ کی تصریحات کی روشنی میں مندرجہ ذیل

احکام مستنبط ہوتے ہیں:

۱۔ اگر قرض لیتے وقت ادائیگی کی نیت ہی نہ ہو تو ایسا قرض لینا حرام ہے، چنانچہ فتاویٰ

عالمگیریہ میں ہے: ”ولو استدان دینا وقصد أن لا یقضیہ فہو آکل السحت“^(۱)۔

۲۔ اگر کسی دینی یا دنیوی حاجت کے لئے قرض لیا جائے، اور ادائیگی کی نیت بھی ہو، اور

ادائیگی کے ظاہری اسباب بھی موجود ہوں تو ایسا قرض لینا بلا کراہت جائز ہے۔

۳۔ اگر قرض کسی حاجت کے واسطے لیا جا رہا ہو، اور لیتے وقت ادائیگی کی نیت تو ہو، لیکن

ادائیگی کے اسباب موجود نہ ہوں، تو ایسا قرض لینا عام حالات میں مکروہ ہے، الا یہ کہ ضرورت کے

درجے تک پہنچ جائے۔

۴۔ قرض لینے کی کوئی حقیقی دینی و دنیوی حاجت ہی نہ ہو، خواہ ادائیگی کی نیت اور اسباب بھی

موجود ہوں، تو اُس صورت میں قرض لینا کم از کم مکروہ ضرور ہے۔

ان اُصولوں کو مد نظر رکھتے ہوئے آج کل اُدھار پر چیزیں خریدنے کا جو عام رجحان پیدا ہو گیا

ہے، اُس میں یہ دیکھنا ضروری ہے کہ جو چیز اُدھار خریدی جا رہی ہے، کیا اُس کی واقعی حاجت ہے؟ اگر

واقعی کوئی ایسی حاجت کی چیز ہو جو ایک متوسط زندگی گزارنے کے لئے عرفاً ضروری سمجھی جاتی ہو، مثلاً وہ

گھریلو سامان جو متوسط درجے کے آدمی کے گھر میں ہوتا ہی ہے، تو بے شک اُدھار یا قسطوں پر خریدنے

کی گنجائش ہے، بشرطیکہ قرض کی ادائیگی کی نیت اور اُمید بھی ہو، لیکن صرف اشیائے تعیش کی خریداری

کے لئے اپنے آپ کو مقروض بنانا کراہت سے خالی نہیں۔

جہاں تک دینی حاجتوں کا تعلق ہے، ان کے بارے میں فقہائے کرامؒ نے اس مسئلے پر بحث

فرمائی ہے کہ اگر کسی شخص پر زکوٰۃ یا حج فرض ہو گیا ہو، اور اُن کی ادائیگی کے لئے اُس کے پاس مال نہ ہو

تو کیا وہ قرض لے کر حج یا زکوٰۃ ادا کرے؟

اس سلسلے میں ایک اثر حضرت طارق بن عبد الرحمن رحمہ اللہ تعالیٰ سے مروی ہے، وہ فرماتے

ہیں کہ:

سمعت ابن ابی اوفیٰ یُسئل عن الرجل یستقرض ویحج، قال:

یستزق الله، ولا يستقرض. قال: وكنا نقول: لا يستقرض إلا أن يكون له وفاء.

(السنن الكبرى للبيهقي، كتاب الحج، باب الاستسلاف للحج ج: ۴ ص: ۳۳۳) ^(۱)

(واضح رہے کہ معرفۃ السنن والآثار (کتاب الحج، حدیث: ۲۶۶۳) ^(۲) اور کتاب الأم

(کتاب الحج ج: ۵ ص: ۳۵) ^(۳) میں یہ حدیث جس طرح نقل کی گئی ہے، اُس سے اس کے مرفوع ہونے کا شبہ ہوتا ہے، لیکن بظاہر سنن کبریٰ کی اس روایت سے اس کا حضرت عبداللہ بن ابی اوفی رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر موقوف ہونا زیادہ واضح ہے)

لیکن فقہائے کرام کی تصریحات کی روشنی میں اس کا مطلب وجوب استقراض کی نفی ہے، جواز کی نفی نہیں۔ چنانچہ حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اس حدیث کو نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

ومن لم یکن فی ماله سعة یحج بها من غیر أن یتقرض فهو لا یجد السبیل، ولكن اذا کان ذا عرض کثیر فعليه أن یبیع بعض عرضه أو الاستدانة فيه حتی یحج. (کتاب الأم للشافعی ج: ۵ ص: ۳۵ طبع: دار قتیبة)

اور حنفیہ میں سے امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ سے ایک روایت تو یہ منقول ہے کہ اُس پر واجب ہے کہ قرض لے، لیکن دوسرے فقہاء نے فرمایا ہے کہ واجب تو نہیں ہے، لیکن اگر اُس کا غالب گمان یہ ہے کہ وہ کوشش کر کے قرض ادا کر دے گا تو اُس کے لئے افضل یہی ہے کہ وہ قرض لے کر فرض زکوٰۃ یا حج ادا کر دے، لیکن اگر غالب گمان یہ ہو کہ ادائیگی کی نیت کے باوجود وہ قرض ادا نہیں کر سکے گا تو افضل یہ ہے کہ قرض نہ لے، چنانچہ درمختار میں ہے:

وقالوا: لو لم یحج حتی أتلّف ماله وسعه أن یتقرض ویحج ولو غیر قادر علی وفاء، ویرجی أن لا یؤاخذه الله بذلك، أي لو ناویا وفاء اذا قدر کما قیده فی الظهیرة.

اس کے تحت علامہ شامیؒ لکھتے ہیں:

”قوله وسعه أن یتقرض الخ“ ای جاز له ذلك، وقیل: یلزمه الاستقراض کما فی لباب المناسک، قال مُلاً علی القاری فی شرحه علیه: وهو رواية عن أبي يوسف، وضعفه ظاهر، فان تحمل حقوق الله تعالى أخف من ثقل حقوق العباد، انتهى. قلت: وهذا یرد علی القول الأول أيضاً ان کان

(۱) ص: ۵۳۴ (طبع دار الکتب العلمیة بیروت).

(۲) باب الاستسلاف للحج ج: ۷ ص: ۳۶۳ (طبع موقع جامع الحدیث).

(۳) باب الاستسلاف للحج ج: ۲ ص: ۱۱۶ (طبع دار المعارف).

المراد بقوله "ولو غير قادر على وفاءه" أن يعلم أنه ليس له جهة وفاء أصلاً، أما لو علم أنه غير قادر في الحال وغلب على ظنه أنه لو اجتهد قدر على الوفاء فلا يرد، والظاهر أن هذا هو المراد أخذاً مما ذكره في الظهيرية أيضاً في الزكوة حيث قال: ان لم يكن عنده مال وأراد أن يستقرض لأداء الزكوة فإن كان في أكبر رأيه أنه إذا اجتهد بقضاء دينه قدر، كان الأفضل أن يستقرض، فإن استقرض وأدى ولم يقدر على قضاءه حتى مات، يرجي أن يقضى الله تبارك وتعالى دينه في الآخرة. وإن كان أكبر رأيه أنه لو استقرض لا يقدر على قضاءه، كان الأفضل له عدمه، انتهى. وإذا كان هذا في الزكوة المتعلق بها حق الفقراء، ففي الحج أولى.

(رد المحتار، كتاب الحج ج: ۲ ص: ۴۵۷ و ۴۵۸ طبع: ایچ ایم سعید)

یہ ساری بحث حج فرض سے متعلق تھی، جس کا حاصل یہ ہے کہ اگر حج فرض ہو چکا ہو، اور کسی کے پاس ادائیگی کا انتظام نہ ہو، تو اُس کے لئے نہ صرف یہ کہ قرض لینا بلا کراہت جائز ہے، بلکہ اگر اُس کا غالب گمان یہ ہو کہ وہ کوشش کر کے قرض ادا کر دے گا تو قرض لینا افضل ہے۔

عمرے کا معاملہ یہ ہے کہ مذہب میں رائج یہ ہے کہ عمر میں کم از کم ایک مرتبہ عمرہ کرنا سنت مؤکدہ ہے، اور اُس کے بعد مستحب ہے، چنانچہ درمختار میں ہے:

والعمرة في العمر مرة سنة مؤكدة على المذهب وصحح في الجوهرة

وجوبها. (شامی ج: ۲ ص: ۴۷۲) (۱)

چونکہ عمرہ واجب نہیں ہے، اس لئے اگر کسی شخص کے پاس ادائیگی کا فوری انتظام نہ ہو تو اُس کے لئے عمرے کی خاطر قرض لینا بظاہر مکروہ ہوگا، اور اگر فوری طور پر رقم کا انتظام نہیں ہے، لیکن اُس کے ذرائع آمدنی کے لحاظ سے اُمید ہے کہ عنقریب اتنی رقم کا انتظام ہو جائے گا جو عمرے کے اخراجات کے لئے کافی ہو تو اُس کے لئے بھی افضل یہ ہے کہ وہ انتظار کرے، اور قرض لینے کے بجائے اُس وقت عمرہ کرے جب انتظام ہو جائے، اس سے پہلے قرض لے کر عمرہ کرنا عام حالات میں خلافِ اولیٰ ہے، کیونکہ فقہائے کرام نے حج کو جانے والے کے لئے مستحب قرار دیا ہے کہ اگر اُس کے ذمے پہلے سے کوئی دین ہے تو حج کو جانے سے پہلے اُسے ادا کر کے جائے، اگر وہ دین معجل ہے تب تو اُس کی ادائیگی حج سے پہلے واجب ہے، اور اگر مؤجل ہے تو بھی افضل یہ ہے کہ دین ادا کرے، پھر جائے۔ چنانچہ

غنیۃ المناسک میں ہے:

و کذا مدیون لا مال له یقضى، فانه یکره له الخروج الى الحج والغزو الا
بإذن الغريم هذا فی الدین الحال. أما فی المؤجل فله أن یسافر قبل
حلول الأجل ولكن یتحب أن لا ینخرج حتی یوکل من یقضى
عنه عند حلوله ولو کان له مال فیه وفاء للدين یقضى الدين أولاً
وجوباً اذا کان معجلاً، وان کان مؤجلاً فالأفضل أن یقضى الدين.

(۱) (غنیۃ المناسک ص: ۳۵)

جب پہلے سے واجب دین مؤجل میں بھی افضل یہ ہے کہ وہ اُسے ادا کر کے جائے تو خاص
حج نفل یا نفلی عمرے کے لئے ایک دین پیدا کرنا بھی یقیناً خلافِ اولیٰ ہوگا۔

لیکن بعض صورتیں ایسی ہو سکتی ہیں جن میں اُسے یہ خیال ہو کہ جب رقم کا انتظام ہوگا، اُس
وقت عملی طور پر عمرہ کرنا ممکن نہیں رہے گا، مثلاً یہ کہ اُس وقت ویزا نہیں مل سکے گا، یا کوئی عورت ہے جسے
محرم نہیں مل سکے گا، یا جن ساتھیوں کے ساتھ جانا چاہتا ہے، وہ میسر نہیں آسکیں گے، یا اُس کے اپنے
حالات اُس وقت کسی اور وجہ سے سفر کی اجازت نہیں دیں گے، تو اس صورت میں جبکہ اُس کے ذرائع
آمدنی کے لحاظ سے قوی اُمید ہو کہ وہ قرض ادا کر سکے گا، تو اُمید ہے کہ ان شاء اللہ اُس کے لئے قرض
لینا یا قسطوں پر اخراجات کی ادائیگی کرنا خلافِ اولیٰ بھی نہیں ہوگا، کیونکہ حج فرض کے لئے اگر ادائیگی کا
انتظام نہ ہونے کے باوجود قرض لینا افضل قرار دیا گیا ہے، تو حج نفل یا عمرے کے لئے ادائیگی کا انتظام
ہونے کی شرط کے ساتھ ایسا کرنا بلا کراہت جائز ہونا چاہئے، واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم۔

یہاں یہ بات بھی واضح کرنا مناسب ہے کہ قرض لینے کی جو کراہت یا مذمت ہے، اس سے
مراد وہ صورت ہے جسے عرف میں مقروض بننا کہا جاتا ہے، لیکن بعض مرتبہ دو اشخاص یا تاجر و ر کے
درمیان اس قسم کے معاملات چلتے رہتے ہیں کہ وہ مال کی کمی کی وجہ سے نہیں، بلکہ عملی سہولت بنانا پر مختصر
مدت کے لئے ادھار کے معاملات کرتے رہتے ہیں، پھر کسی قریبی تاریخ میں حساب کر لیتے ہیں، مثلاً
بیعِ استجرار یا اُس کے مشابہ معاملات میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ یہ بھی اگرچہ ٹھیکہ معنی میں استقراض ہی ہے،
لیکن عرف عام میں اس کو قرض کا معاملہ نہیں سمجھا جاتا، کیونکہ ہر شخص ہر وقت ادائیگی یا مقاصہ کر سکتا ہے،
اور یہ استقراض کسی مالی تنگی کی وجہ سے نہیں ہوتا، بلکہ معاملات کی کثرت کی وجہ سے بار بار ادائیگی کرنے
کے بجائے کئی معاملات کے اکٹھے ہونے پر یکبارگی ادا کرنے کو فریقین آسان سمجھتے ہیں، اور اُسی کی

بنیاد پر کام کرتے رہتے ہیں، لہذا بظاہر اس میں کوئی کراہت نہیں ہے، اور فقہائے کرام نے بیع استجرار کو کسی کراہت کے بغیر جو جائز قرار دیا ہے،^(۱) وہ اس کی دلیل ہے۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

محمد تقی عثمانی

دارالافتاء دارالعلوم کراچی

۱۳ شعبان ۱۴۳۰ھ



(۱) حوالہ کے لئے دیکھئے ص: ۱۱۲ تا ص: ۱۱۴ کا فتویٰ اور اس کے حواشی۔

﴿فصل فی المسائل الجديدة والمتفرقة﴾

المتعلقة بالبيع ﴿﴾

(خرید و فروخت کے جدید اور متفرق مسائل)

۱- سی آئی ایف معاہدے کی شرعی حیثیت اور پورٹ

تک پہنچنے سے پہلے مال بائع کی ملکیت ہے

۲- ایف او بی معاہدہ اور اس کی شرائط کا شرعی حکم

سوال :- قابل احترام جسٹس مولانا تقی عثمانی صاحب، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

امید ہے آپ بخیر و عافیت ہوں گے۔ میں ایک کتاب ”اسلام کا قانون معاہدہ“ تحریر کر رہا ہوں، یہ تصنیف انگریزی میں ہوگی، عنوان "Islamic Law of Contract" (اسلامک لاء آف کنٹریکٹ) ہے۔ چند عنوانات کے بارے میں مواد کافی کاوش کے باوجود نہیں مل سکا، براہ کرم مجھے فتویٰ کی شکل میں اس کا جواب مہیا فرمائیں، جواب بے شک اردو میں مہیا فرمائیں، میں انگریزی میں ترجمہ کر لوں گا، اگر جواب عربی میں دینا چاہیں تو اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ میں اُسے من و عن شائع کر سکوں گا۔ کتاب مذکورہ بالا آخری مراحل میں ہے اور ان شاء اللہ جلد منصفہ شہود پر آجائے گی، شائع ہونے پر ایک کاپی آپ کی خدمت میں ارسال کروں گا۔ ان سوالات پر فتویٰ درکار ہے جو دوسرے صفحے پر ہیں۔^(۱)

(۱) یہ سوالات نقل فتاویٰ کے رجسٹر یعنی ریکارڈ میں موجود نہیں ہیں، لہذا اس خط میں سائل کے ذکر کردہ سی آئی ایف اور ایف او بی معاہدات اور ان کی شرائط کی تفصیل معلوم نہیں ہو سکی۔ تاہم آگے حضرت والا دامت برکاتہم کے جوابات سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ مال کی خریداری کے ان دو معاہدات میں سے سی آئی ایف میں ”انشورنس“ کی شرط کے علاوہ اس قسم کی شرائط طے کی گئیں کہ جن سے بائع کی طرف سے مال جہاز تک پہنچانے کے باوجود بائع کی ملکیت رہے گا، جبکہ ایف او بی معاہدہ میں اس قسم کی کئی شرائط طے کی گئیں جن کی رو سے پورٹ پر مال پہنچنے کے بعد بائع کا ذمہ ختم ہو کر جہاز راں کمپنی خریداری کی وکیل طے پائی۔ بہر حال ان دونوں صورتوں میں خریدار کا قبضہ شرعاً کب متحقق ہوگا؟ اور پورٹ پر پہنچنے سے پہلے ہلاکت کی صورت میں نقصان کس کا متصور ہوگا؟ نیز پورٹ پر پہنچنے سے قبل خریدار مال آگے فروخت کر سکتا ہے یا نہیں؟ چنانچہ حضرت والا دامت برکاتہم نے ان دونوں معاہدوں کی مختلف شرائط کی رو سے الگ الگ جواب مرحمت فرمائے۔ سوالات کی کچھ مزید تفصیل خود حضرت والا دامت برکاتہم کے جوابات سے بھی معلوم ہو سکتی ہے۔ (محمد زبیر)

جواب:- سی آئی ایف معاہدے کی جو شرائط اُوپر ذکر کی گئی ہیں ان میں سے انشورنس کی شرط اس لئے درست نہیں کہ انشورنس کے مروجہ طریقے عموماً سود یا قمار پر مشتمل ہوتے ہیں^(۱)، باقی تمام شرائط درست ہیں۔ اور ان کا اثر یہ ہوگا کہ جب تک مال اس پورٹ پر نہ پہنچ جائے جہاں پہنچانا طے ہوا ہے، اس وقت تک یہ سمجھا جائے گا کہ مال ابھی بیچنے والے کی تحویل میں ہے، خریدار کے قبضے میں نہیں آیا، لہذا اگر اس دوران مال ضائع یا خراب ہو تو بیچنے والے کا نقصان سمجھا جائے گا۔^(۲) نیز جب تک مال مذکورہ پورٹ تک نہ پہنچ جائے اس وقت تک خریدار اُسے اپنی ملکیت ہونے کی بناء پر آگے کسی کو فروخت نہیں کر سکتا۔^(۳) اس کے علاوہ اگر انشورنس اسلامی اصولوں کے مطابق ہو تو پہنچنے سے پہلے نقصان کی صورت میں ہر جانے کا دعوے دار خریدار کے بجائے بیچنے والا ہوگا۔

(۱) تفصیل کے لئے مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ کا رسالہ ”بیمہ زندگی“ ملاحظہ فرمائیں۔

(۲) وفی خلاصة الفتاویٰ ج: ۳ ص: ۹۰ (طبع مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ) ہلاک المعقود علیہ قبل القبض ان کان بأفة سماویة أو بفعل البائع أو بفعل المعقود علیہ بأن کان المعقود علیہ حیواناً فقتل نفسه فإن البیع یطل فی هذا کلّہ اما اذا کان الهلاک بأفة سماویة أو بفعل المعقود علیہ فلا یشکل وکذلک اذا کان بفعل البائع لأن المبیع فی یدہ مضمون بالثمن قبل القبض بدلالة أنه لو هلك سقط ثمنه من المشتري ولا يجوز أن يكون مضموناً بالقيمة الخ.

وفی الشامیة ج: ۴ ص: ۵۶۰ (طبع سعید) لو هلك المبیع بفعل البائع أو بفعل المبیع أو بأمر سماوی بطل البیع ويرجع بالثمن لو مقبوضاً الخ. وکذا فی فتح القدير ج: ۵ ص: ۴۹۶ (طبع رشیدیہ).

(۳) کیونکہ ایسی صورت میں یہ بیع قبل القبض ہوگی جو ناجائز ہے۔

وفی مسند أحمد ج: ۳ ص: ۴۰۲ عن حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ قال: قلت: یا رسول اللہ! انی اشتری بیوعاً فما یحل لی منها وما یحرم علیّ؟ قال: فاذا اشتریت بیعاً فلا تبعه حتی تقبضه.

وفی سنن الترمذی رقم الحدیث: ۱۱۵۵ و سنن أبی داؤد رقم الحدیث: ۳۰۴۱ و سنن النسائی رقم الحدیث: ۴۵۵۱ عن عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما قال: قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: لا یحلّ سلف و بیع ولا شرطان فی بیع ولا ربح مالم یضمن ولا بیع ما لیس عندک. (بحوالہ مشکوٰۃ المصابیح ص: ۲۴۸).

فی الہدایة ج: ۳ ص: ۷۸ و ۷۹ (طبع مکتبہ رحمانیہ) ومن اشتری شیئاً مما ینقل ویحول لم یجز له بیعه حتی یقبضه لأنه نہی عن بیع مالم یقبض ولأن فیہ غرر انفساخ العقد علی اعتبار الهلاک اھ.

وفی فتح القدير ج: ۵ ص: ۲۶۶ قال أبو حنیفة وأبو یوسف یمتنع البیع قبل القبض فی سائر المنقولات ویجوز فی العقار الذی لا یخشى هلاکہ اھ.

وفی المبسوط للامام السرخسی ج: ۱۳ ص: ۸ قال ومن اشتری شیئاً فلا یجوز له أن یبیعه قبل أن یقبضه ولا یولیہ أحدًا ولا یشرک فیہ لیس لمشتري الطعام أن یبیعه قبل أن یقبضه لما روى أن النبی صلی اللہ علیہ وسلم نہی عن بیع الطعام قبل أن یقبض وکذلک ما سوى الطعام من المنقولات لا یجوز بیعه قبل القبض عندنا اھ.

وفی الدر المختار ج: ۵ ص: ۱۴۷ (فلا) یصح (بیع منقول) قبل قبضہ ولو من بائعہ اھ.

وفی البدائع ج: ۵ ص: ۱۴۶ (ومنها) وهو شرط انعقاد البیع للبائع أن یكون مملوکاً للبائع عند البیع فان لم یکن لا ینعقد وان ملکہ بعد ذلک بوجه من الوجوه الا السلم خاصة وهذا بیع ما لیس عنده ونہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن بیع ما لیس عند الانسان ورخص فی السلم اھ.

وفی تکملة فتح الملہم ج: ۱ ص: ۳۵۱ (طبع مکتبہ دار العلوم) قال أبو حنیفة وأبو یوسف یمتنع البیع قبل القبض فی سائر المنقولات، ویجوز فی العقار لا یخشى هلاکہ.

۲:- ایف او بی معاہدے کی جو شرائط اُوپر ذکر کی گئی ہیں، ان کی رُو سے یہ معاہدہ شرعاً درست ہے، اور ان کا اثر یہ ہے کہ جس جہاز پر سامان لادا گیا ہے، اس کی جہاز راں کمپنی کو یہ سمجھا جائے گا کہ وہ خریدار کی طرف سے مال پر قبضہ کرنے کی وکیل یا ایجنٹ ہے، اس کے جہاز پر مال سوار ہونے سے یہ سمجھا جائے گا کہ بیچنے والے کی تحویل ختم ہوگئی اور خریدار نے اپنے نمائندے کے ذریعے مال پر قبضہ کر لیا، اب اگر سامان راستے میں خراب یا ضائع ہو تو اس کی ذمہ داری خریدار پر ہوگی^(۱)، اور خریدار کے لئے یہ بھی جائز ہوگا کہ جب اُسے یہ اطلاع مل جائے کہ جہاز راں کمپنی نے مال وصول کر لیا ہے تو اس کے بعد وہ اُسے آگے کسی اور کو فروخت کر دے۔

واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم

۱۴۰۹/۲/۱ھ

(فتویٰ نمبر ۲۳۹/۴۰ الف)

دارالافتاء جامعہ دارالعلوم کراچی کے ”بزناس“ کے فتویٰ

پروڈاکٹر عبدالواحد صاحب کا اشکال اور اس کا جواب

سوال:- بخدمت گرامی حضرت مولانا تقی عثمانی صاحب مدظلہ العالی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

کچھ عرصے سے دارالعلوم کے دارالافتاء سے چند ایک ایسے فتوے دیئے گئے ہیں جن پر تعجب ہوا، اور خیال ہوا کہ توثیق و تصحیح سے قبل جناب کو ان پر بھرپور نظر ڈالنے کی فرصت نہ ملی ہوگی۔ یہ بھی احتمال ہے کہ میں ان کو صحیح طریقے سے نہ سمجھ سکا ہوں گا اور میں نے اصل کتب سے صحیح نتیجہ اخذ نہ کیا ہوگا۔ بہر حال میرے لئے یہ یقیناً ایک الجھن کی بات بن گئی ہے کیونکہ جناب کی ذات اور دارالعلوم کا ادارہ عام لوگوں میں ایک سند کی حیثیت رکھتا ہے، لوگ جب معارضے کے طور پر آپ کا نام استعمال کرتے ہیں تو کچھ کہنا بہت مشکل ہو جاتا ہے، فوری اہمیت کے چند ایک مسائل یہ ہیں:-

۱:- Biznas کے بارے میں فتویٰ، اس کے بارے میں جو میں نے لکھا تھا اس کی ایک کاپی

ملفوف ہے۔ دارالعلوم سے ۱۴۲۳/۶/۲۰ھ کو جو فتویٰ لکھا گیا اس میں اوّل تو یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ دوسری صورت میں اگر Product کی قیمت بازاری قیمت سے زیادہ لی گئی ہو تو واضح قمار ہوگا، کمپنی

(۱) وفي الهداية ج: ۳ ص: ۱۹۰ باب الوكالة بالبيع والشراء (طبع مكتبة رحمانيه) فان هلك المبيع في يده قبل حبسه هلك من مال المؤكل ولم يسقط الثمن لأن يده كيد المؤكل فاذا لم يحبسه يصير المؤكل قابضاً بيده. وكذا في البحر الرائق ج: ۷ ص: ۱۵۶ باب الوكالة بالبيع والشراء (طبع سعيد) فلو هلك في يده قبل حبسه هلك من مال المؤكل ولم يسقط الثمن لأن يده كيد المؤكل فاذا لم يحبسه يصير المؤكل قابضاً بيده. وكذا في خلاصة الفتاوى ج: ۴ ص: ۱۵۸ الفصل الخامس في الوكالة بالشراء.

کے حق میں اس کا رشوت ہونا تو سمجھ میں آتا ہے، قمار نہیں، واللہ اعلم۔ بہر حال یہ تو پریشانی کی چیز نہیں، لیکن اس کے بعد جو یہ لکھا ہے کہ: ”اب رہی یہ بات کہ یہ فیس زیادہ ہے یا برابر ہے یا کم ہے، اس کی تحقیق مفتی کی ذمہ داری نہیں، بلکہ جو شخص اس میں شامل ہونا چاہتا ہے وہ خود تحقیق کرے، اگر تحقیق کے نتیجے میں اس کا دل اس بات پر مطمئن ہو کہ پروڈکٹ کی جو فیس اس نے ادا کی ہے وہ واقعہً بازاری قیمت کے برابر ہے تو اس میں شمولیت اختیار کرے ورنہ اس سے اجتناب کرے۔“

حالانکہ عام لوگ اس کی کیا تحقیق کر سکتے ہیں؟ دارالعلوم کے مفتی صاحبان تو اپنے جاننے والوں سے اس کی بآسانی تحقیق کر سکتے ہیں، وہ معلوم کر کے حتمی جواب لکھتے تو عام لوگوں کو سہولت ہوتی۔ ہم لوگ کمپنی والوں سے پوچھیں گے جو ان کو بازاری قیمت کے برابر یا کم ہونے کا ہی یقین دلائیں گے۔

تیسری صورت میں یہ تو لکھا ہے کہ: ”اگر پروڈکٹ کی بازاری قیمت جمع کردہ رقم کے کم از کم برابر بھی ہو تب بھی پروڈکٹ کے مقصود نہ ہونے کی وجہ سے یہ قمار کے مشابہ ضرور ہے، نیز اس میں کمیشن ایجنسی پروڈکٹ کی خریداری کے ساتھ مشروط ہونے کی خرابی بھی ہے، لہذا اس سے اجتناب کرنا چاہئے“ ممبر شپ حاصل کرنے والوں کی عظیم اکثریت اسی تیسری صورت میں داخل ہے، اس حقیقت اور واقع نفس الامری کو نظر انداز کر کے ”اگر“ کے ساتھ جواب دینا عجیب لگتا ہے، پھر اس بات کو اگلی بات کہہ کر بالکل ہی کمزور کر دیا، یعنی ”اس میں وکالت پروڈکٹ کے معاملے کے ساتھ مشروط ہے... الخ۔“ پھر جو اشکال اور اس کا جواب لکھا گیا ہے وہ بھی ناقابل فہم ہے، شاید اصل صورت حال ذہن میں متحضر نہ رہی ہو، اس کو میں نے اپنے جواب میں خاصی وضاحت سے لکھا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ ”بزناس“ والے ہر ایک کے سامنے آپ کے فتوے کو اپنے حق میں پیش کر رہے ہیں۔

والسلام علیکم

عبدالواحد غفرلہ

۱۳/ رمضان المبارک ۱۴۲۳ھ

(مذکورہ استفتاء کے ساتھ ڈاکٹر عبدالواحد صاحب نے اپنا درج ذیل مضمون بھی ارسال فرمایا)

بزناس یا دین و دنیا کا ناس

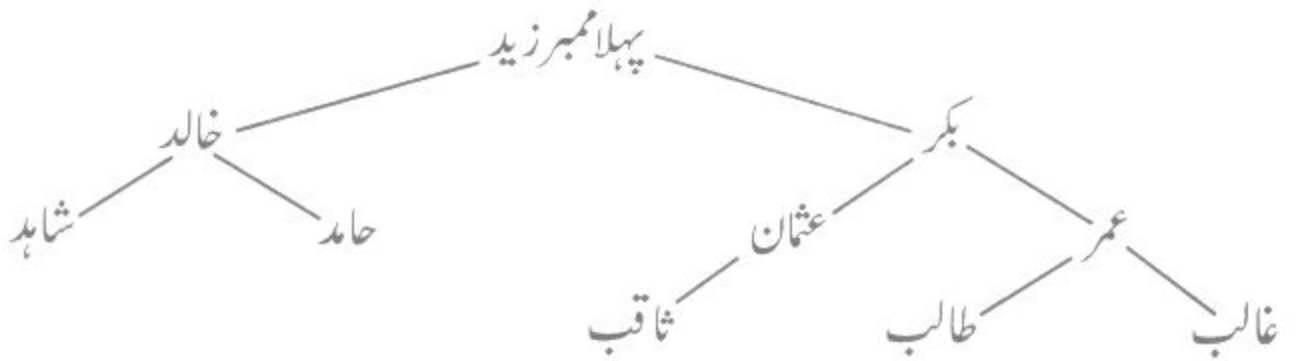
توجہ فرمائیے

(حضرت مولانا مفتی ڈاکٹر عبدالواحد صاحب، جامعہ مدنیہ لاہور)

کچھ عرصے سے بزناس (Biznas) کے نام سے ایک کمپنی کام کر رہی ہے، کراچی اور اسلام

آباد کے بعد اس نے لاہور میں زور پکڑا ہے، یہ کمپنی انٹرنیٹ (Internet) پر کام کرتی ہے، اور ستر ڈالر کی فیس کے عوض ممبر کو کمپیوٹر کے کچھ کورس اور ویب سائٹ کی پیش کش کی جاتی ہے، اس حد تک تو معاملہ بظاہر ٹھیک نظر آتا ہے، کیونکہ جس کو پیش کش سے فائدہ اٹھانے میں دلچسپی ہو وہ فیس دے تو معاملہ جائز ہے۔

لیکن اس کمپنی کے کام کے پھیلاؤ کا راز اس کے کام کے دوسرے رخ کی وجہ سے ہے۔ وہ رخ یہ ہے کہ ستر ڈالر کی فیس دے کر بننے والے ممبر کو کمپنی آگے کمائی کرنے کی پیش کش کرتی ہے، جس کے مطابق اگر یہ ممبر براہ راست اور بلا واسطہ دو مزید ممبر بنائے اور ان دونوں میں سے ہر ایک آگے مزید دو دو ممبر بنائے یہاں تک کہ بالآخر کم از کم نو ممبر بن جائیں تو کمپنی پہلے ممبر کو اپنی کمائی میں حصہ دار بنالیتی ہے۔



دائیں طرف تین ممبر اور بائیں طرف چھ ممبر ہوئے۔

کمپنی والے کہتے ہیں کہ کل ممبر جب مثلاً چودہ ہو جائیں گے تو کمپنی آپ کو پچاس ڈالر دے گی، اور جب کل تیس ہو جائیں تو وہ آپ کو سو ڈالر دے گی، بلا واسطہ مزید ممبر بنانے پر وہ آپ کو پانچ ڈالر فی کس اور دے گی۔

حکم:

یہ کاروبار مکمل طور پر ناجائز ہے۔ جس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ اگرچہ یہ دلالی کی صورت ہے لیکن اس میں دلالی کی شرائط مفقود ہیں۔ دلال (Broker) کو اپنی محنت پر دلالی ملتی ہے لیکن بزناس کے گورکھ دھندے میں اپنی محنت پر اولاً تو کوئی اجرت نہیں ملتی اور اگر اجرت ملتی ہے تو دوسرے کی محنت کی شرط پر۔ مثلاً اوپر دیئے گئے نقشے کے مطابق زید نے اپنی محنت سے دو ممبر بنائے یعنی بکر اور خالد، لیکن فقط اس محنت پر جو کہ زید کی اپنی محنت ہے، زید کو کوئی اجرت و کمیشن نہیں ملتی، اگر زید آگے مزید محنت نہ کرے اور صرف بکر اور خالد محنت کریں اور ممبر بنائیں اور وہ بھی آگے ممبر بنائیں یہاں تک کہ دیئے گئے نقشے کے مطابق کم از کم نو ممبر بن جائیں تب زید کو کمیشن ملے گا جو کہ تمام ممبران کے عدد کے تناسب سے ہوگا، اور اگر بکر اور خالد بھی آگے محنت نہ کریں اور ممبر سازی کا سلسلہ آگے نہ

چلے تو زید کو اپنی محنت پر بھی کچھ نہ ملے گا، حاصل یہ ہے کہ اس معاملے میں مندرجہ ذیل خرابیاں ہیں:-
۱:- زید کی اپنی محنت کی اجرت اس شرط کے ساتھ مشروط ہے کہ آگے سات ممبر اور بنیں، اور وہ بھی وہ سات ممبر جو دُوسروں نے بنائے ہوں۔ اجرت کو اس طرح کی شرط کے ساتھ مشروط کرنے سے خود معاملہ فاسد اور ناجائز ہو جاتا ہے۔

۲:- زید دو ممبر بنانے کے بعد بالکل محنت نہ کرے، بنائے ہوئے ممبر آگے محنت کریں اور یہ سلسلہ دراز ہوتا چلا جائے تو دُوسروں کی محنت کے معاوضے میں زید بھی شریک ہوتا ہے، اس لئے کمپنی چودہ ممبر پورے ہونے پر زید کو پچاس ڈالر دیتی ہے اور تیس ممبر مکمل ہونے پر زید کو سو ڈالر دیتی ہے، یہ بھی ناجائز ہے اور حرام ہے۔

عام طور پر یہ مغالطہ دیا جاتا ہے کہ آگے جو ممبر بنے آخر ان کی بنیاد زید ہی کی تو محنت تھی، اگر وہ بکر اور خالد کو ممبر نہ بناتا تو آگے سلسلہ کیسے چلتا؟ علاوہ ازیں زید اب بھی دُوسروں کو محنت کی ترغیب تو دیتا ہے، اس مغالطے کا جواب یہ ہے کہ محض محنت کی ترغیب دینا تو خود محنت نہیں ہے، جس کا عوض ہو، اِلَّا یہ کہ کسی کو اس کام پر ملازم رکھ لیا جائے، دُوسرے کو کام کر۔ ز کی ترغیب دینے کو دلائی نہیں کہتے۔ اس لئے زید صرف اپنی محنت پر عوض کا حق دار ہو سکتا ہے، اس کی بنیاد پر آگے جو دُوسرے لوگ کام کریں ان کے محنتانہ میں شریک نہیں ہو سکتا۔

تنبیہ:- شریعت کا ضابطہ ہے کہ: ”الأمور بمقاصدھا“ یعنی کاموں اور معاملات کا دار و مدار مقاصد پر ہوتا ہے، جب ہم بزناس (Biznas) کمپنی کے کام کی نوعیت کو دیکھتے ہیں تو اس کے دو حصے ہیں۔ ایک وہ حصہ جس کو وہ اپنی Products کہتے ہیں، یعنی کمپیوٹر کے ٹریننگ کورس اور ویب سائٹ کی فراہمی۔ دُوسرا وہ حصہ جس کو وہ Marketing کہتے ہیں، یعنی آگے ممبر بنانا، اور اس پر اپنے ممبروں کو اپنی آمدنی میں شریک کرنا۔ ان دو حصوں میں سے کمپنی کا جو اصل مقصد ہے وہ اس کی Marketing یعنی ممبر سازی کا حصہ ہے، اور Products کا حصہ تو محض یہ دکھانے کے لئے ہے کہ وہ فی الواقع تجارتی بنیادوں پر کام کر رہی ہے۔ ہمارے اس دعوے پر یہ مشاہدہ کافی دلیل ہے کہ اس کمپنی کے جو لوگ ممبر بن رہے ہیں ان میں سے اکثریت کے پاس تو اپنے کمپیوٹر بھی نہیں ہیں اور ان کو کمپیوٹر کی الف ب سے بھی کوئی واقفیت نہیں ہے، اور نہ ہی کسی کمپیوٹر کورس یا ویب سائٹ سے ان کو کوئی دلچسپی ہے، یا اس سے ان کا کوئی بھی مفاد وابستہ ہے۔ غرض کمپنی کا اصل مقصد تو مارکیٹنگ (Marketing) ہے اور اس کے طریقہ کار کے بارے میں ہم وضاحت سے بتا چکے ہیں کہ وہ سرے سے ناجائز اور حرام ہے، اور اصل بات یہ ہے کہ یہ کوئی انوکھی چیز نہیں ہے۔ اس سے ملتے جلتے طریقے پہلے بھی چلائے گئے اور

چلائے بھی جا رہے ہیں، یہ سب درحقیقت لوٹ کھسوٹ کے طریقے ہیں، البتہ حکمت یہ اختیار کی ہے کہ لوٹ کھسوٹ میں دوسروں کو بھی شریک کر لو تا کہ اصل جرم لوگوں کی نظروں میں نہ آئے بلکہ وہ خود مال کے لالچ میں زیادہ سے زیادہ لوٹ کھسوٹ کروائیں۔

عبدالواحد

جامعہ مدنیہ لاہور

جواب:- گرامی قدر مکرم جناب مولانا ڈاکٹر عبدالواحد صاحب، زید مجدکم السامی السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

میں انتہائی ندامت کے ساتھ آپ کے ایک گرامی نامے کا جواب غیر معمولی تاخیر سے دے رہا ہوں، جو غالباً سوال میں مجھے ملا تھا اور اس میں دارالعلوم سے جاری ہونے والے تین فتوؤں^(۱) کے بارے میں توجہ دلائی گئی تھی، جو خطوط مراجعت اور غور و فکر چاہتے ہیں، ان کی میرے پاس الگ ترتیب رہتی ہے، اور اب صورت حال ایسی ہو گئی ہے کہ ہر وقت کوئی نہ کوئی فوری تقاضا مسلط رہتا ہے، آنے والوں کی کثرت، فوری ڈاک کی بھرمار اور اسفار کا سلسلہ، ان کی وجہ سے قابل مراجعت امور ٹلتے چلے جاتے ہیں۔ آنجناب کے مکتوب میں چونکہ تین مسائل تھے، کسی وقت ایک مسئلے پر کچھ دیر غور یا مراجعت کا وقت ملا، مگر پھر کوئی عارض سامنے آ گیا، اسی طرح باوجودیکہ وہ مکتوب ہر روز میری میز پر رہا، لیکن جواب لکھنے کی پوزیشن میں نہ آ سکا، یہاں تک کہ یہ وقت آ گیا۔ بہر حال! اس تاخیر پر تہ دل سے معذرت خواہ ہوں، اور ساتھ ہی شکر گزار ہوں کہ آپ نے ان امور کی طرف توجہ دلائی۔

آپ نے تحریر فرمایا ہے کہ: ”توثیق و تصحیح سے قبل جناب کو ان پر بھرپور نظر ڈالنے کی فرصت نہ ملی ہوگی“ واقعہ یہ ہے کہ اپنی طرف سے کوشش تو یہی کرتا ہوں کہ دوسرے فتاویٰ کی توثیق سوچ سمجھ کر ہی کروں، چنانچہ ایسے اوقات میں لوگوں کو فتوے لانے سے روکتا ہوں جب ذہن فارغ نہ ہو، لیکن فتویٰ کا کام ہی ایسا ہے کہ ہر وقت غلطی کا ڈر لگا رہتا ہے، بالخصوص ایسے مسائل میں جہاں صریح جزئیہ دستیاب نہ ہو، اور میرے پاس زیادہ تر ایسے ہی مسائل دارالافتاء سے آتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہی سے دعا ہے کہ وہ حفاظت فرمائیں۔

اب ان تین مسائل کے بارے میں اپنی گزارشات عرض کرتا ہوں۔

۱:- پہلا مسئلہ بزناس کا ہے، بندے نے آنجناب کے ارشادات پر بار بار غور کیا، اس سلسلے میں آنجناب نے تین باتیں ارشاد فرمائی ہیں، پہلی یہ کہ ”اگر پروڈکٹ کی قیمت بازاری قیمت سے زیادہ لی گئی ہو تو کمپنی کے حق میں اس کا رشوت ہونا تو سمجھ میں آتا ہے، قمار ہونا نہیں۔“ بندے کی ناقص رائے میں اس میں قمار کا پہلو اس طرح ہے کہ جو قیمت زیادہ دی جا رہی ہے وہ اس موہوم اُمید پر داؤ پر لگائی

(۱) مزید سوالات اور ان کے جوابات متعلقہ باب کے تحت آئیں گے، ان شاء اللہ۔ (محمد زبیر)

جارہی ہے کہ مارکیٹنگ سسٹم کے نتیجے میں اس سے کہیں زیادہ رقم حاصل ہوگی، اور اس طرح اس میں تعلیق التملیک علی الخطر پایا جا رہا ہے، البتہ اگر اس کو اس پہلو سے دیکھا جائے کہ یہ زائد قیمت دلالی کا عقد کرنے کے لئے دی جا رہی ہے تو اس میں رشوت کا پہلو بھی ہے، بہر صورت یہ حرام ہے۔

آنجناب نے دوسری بات یہ لکھی ہے کہ: ”پروڈکٹ کی قیمت کے کم یا زیادہ ہونے کا فیصلہ عام آدمی پر چھوڑنے کے بجائے خود تحقیق کر کے اس کا حکم لکھنا چاہئے تھا“ تو واقعہ یہ ہے کہ ہم نے متعدد جاننے والوں سے تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ پروڈکٹ کی قیمت یا فیس بازار میں مروج قیمت سے زیادہ نہیں ہے، لیکن چونکہ ہم اس کی تکنیکی باریکیوں سے براہ راست واقف نہیں، اس لئے بہ نظر احتیاط مناسب سمجھا کہ اس واقعے کے بیان کی ذمہ داری خود لینے کے بجائے متعلقہ افراد کو پابند کیا جائے کہ وہ خود بھی اس کی تحقیق کر لیں۔

تیسری بات آپ نے جو فتوے میں لکھی ہے کہ: ”دلال کو اپنی محنت پر دلالی ملتی ہے، لیکن بزناس کے گورکھ دھندے میں اپنی محنت پر اولاً تو کوئی اُبرت ملتی نہیں، اور اگر اُبرت ملتی ہے تو دوسرے کی محنت کی شرط پر۔“ یہ بڑی اہم بات ہے، اور فتویٰ لکھنے سے پہلے بندے نے اس پر خصوصی اہمیت کے ساتھ فتویٰ لکھنے والے صاحب کو متنبہ کیا تھا، لیکن پھر انہوں نے متعلقہ افراد سے تحقیق کی اور صراحت بتایا کہ ہر شخص ابتدا میں جو دو گاہک یا ممبر بناتا ہے، اس پر بھی اس کو ساٹھ روپے فی ممبر ملتے ہیں، جیسا کہ ان کے بیان کردہ پلان اور استفتاء میں صفحہ ۴ اور ۵ پر یونی لیول پلان کے زیر عنوان بیان کیا گیا ہے۔ بندے نے اسی فہم کی بنیاد پر مذکورہ فتوے کی توثیق کی ہے، آنجناب کے ارشاد کے بعد بندے نے ان سے مکرر اس پہلو کی تصدیق کے لئے کہا، اور انہوں نے تصدیق کی، لیکن اگر واقعہ صورت حال وہی ہے جو آپ نے بیان فرمائی ہے کہ اپنی محنت پر کچھ نہیں ملتا، بلکہ کمیشن دوسروں کی محنت پر موقوف رہتا ہے، اور یہ بات ثابت ہو جائے تو بندہ اس فتوے سے یقیناً رجوع کر لے گا، اگر اس بارے میں یقینی بات آپ کو بہ درجہ ثبوت معلوم ہو تو ضرور مطلع فرمائیں۔

اور اگر یہ ثابت نہ بھی ہو سکے تب بھی چونکہ اس قسم کی اسکیمیں یکے بعد دیگرے آرہی ہے، اس لئے ان کے بارے میں اجتماعی غور و فکر مناسب معلوم ہوتا ہے، اور بندے نے اپنے دارالافتاء کے حضرات سے کہا ہے کہ وہ اہل فتویٰ کی ایک مجلس میں اس مسئلے کو رکھ کر اجتماعی غور کا اہتمام کریں۔

والسلام

ھ ۱۴۲۳/۶/۲۰

(فتویٰ نمبر ۶۴۱/۱۸)

حضرت والا دامت برکاتہم کی کتاب ”فقہی مقالات“ (جلد اول) میں
قسطوں پر خرید و فروخت، مرابحہ مؤجلہ، حقوق مجردہ کی خرید و فروخت
وغیرہ سے متعلق چند شبہات اور ان کے جوابات

(وضاحت)

(دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک کے مفتی غلام قادر نعمانی صاحب نے بیج بالتقسیت، مرابحہ مؤجلہ اور بینکوں میں
اس کے اجرا قرض، حقوق مجردہ کی خرید و فروخت اور مروّجہ پگڑی سے متعلق حضرت والا دامت برکاتہم کے مقالوں پر
کچھ اشکالات تحریر فرمائے، اور حضرت والا دامت برکاتہم کو خط لکھا جس کے ساتھ ان شبہات پر مشتمل اپنی مطبوعہ تحریر بھی
بھیجی۔ پہلے وہ خط، اس کے بعد ان کی تحریر، پھر حضرت والا دامت برکاتہم کا جوابی خط اور اشکالات کے جوابات پر
مشتمل فتویٰ ذیل میں پیش خدمت ہیں) (مرتب عنی عنہ)

(خط از مفتی غلام قادر نعمانی صاحب)

گرامی قدر محترم المقام جناب شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی صاحب عثمانی مدظلہ العالی
سلام مسنون کے بعد، اُمید ہے مزاج گرامی خیریت سے ہوں گے، گزارش یہ ہے کہ بندے
نے ”فقہی مقالات“ جلد اول کا کچھ سرسری مطالعہ کیا، اس میں کچھ اشکالات سامنے آئے، وہ ارسال
خدمت ہے، اُمید ہے کہ ہمیں جواب سے نوازا جائے گا۔

والسلام

اخوکم فی اللہ

غلام قادر عنفی عنہ

دارالعلوم حقانیہ، اکوڑہ خٹک

(شبہات پر مشتمل تحریر)

دورِ حاضر کے محقق اور جدید معاشیات کے ماہر شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی صاحب
عثمانی کی فقہی خدمت قابلِ تعریف ہے۔ مولانا عثمانی صاحب نے اس دور کے نو وارد جدید مسائل کے
حل کا راستہ تلاش کیا ہے، اور علمائے اُمت کے لئے اکثر مسائل میں راہنمائی فرما کر تحقیق کی راہ ہموار
کی۔ اور علماء خصوصاً اور عوام عموماً ان کی تحقیق کے فائدے سے مستفید ہوئے۔ لیکن یہ بھی ظاہر بات
ہے کہ قدیم زمانے سے اکثر مسائل میں علماء کا اختلاف رائے پایا جاتا ہے، اور اس اختلافِ رائے کی
وجہ سے اسلام میں مذاہبِ اربعہ مرتب ہوئے ہیں، اور اُمتِ مسلمہ نے تسلیم کئے ہیں۔ تاہم بندے نے
جناب والا کی گراں قدر تصنیف ”فقہی مقالات“ جلد اول کا مطالعہ کیا، اس تصنیف میں بعض مسائل میں
مصنف صاحب نے اپنی رائے قائم کی ہے، اور اس رائے میں کچھ اشکالات ہیں، لہذا مصنف صاحب

کی آراء پر نظر ثانی کی ضرورت ہے تاکہ یہ اشکالات زائل ہو کر کتاب کی تنقیح کی جاسکے۔ اور چونکہ یہ کتاب عام ہو چکی ہے لہذا مناسب یہ ہے کہ یہ تحریر نشر کی جائے تاکہ قارئین حضرات کے شکوک و شبہات رفع ہو جائیں۔ ترتیب یہ ہے کہ ہم پہلے وہ مسئلہ لکھتے ہیں جس مسئلے میں مصنف صاحب نے اپنی رائے قائم کی ہے، اور پھر مصنف صاحب کی رائے ذکر کرتے ہیں، اور اس کے بعد اشکال لکھتے ہیں۔

اشکال ۱:- مسئلہ یہ ہے کہ اگر کوئی شخص کچھ سامان وغیرہ اشیاء نفع کے ساتھ قرض فروخت کر دیتا ہے تو اس کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں، ایک صورت یہ ہے کہ بائع نفع کی مقدار بیان نہ کرے اور سامان فروخت کر دے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ بائع نفع کی مقدار بیان کرے، مثلاً یوں کہے کہ دس مہینے تک مدت قرض ہوگی اور اصل قیمت کے علاوہ ایک ہزار نفع ہوگا۔ فقہ میں پہلی صورت کو مساومہ کہتے ہیں اور دوسری صورت کو مرابحہ مؤجلہ کہتے ہیں۔ اب دونوں صورتوں میں بیع تام ہونے کے بعد اگر بائع، مشتری سے یہ کہے کہ اگر آپ قرض کی مدت پوری ہونے سے پہلے قرض ادا کریں تو میں اس مدت کے عوض میں آپ کو اتنی رقم معاف کر دوں گا۔ تو یہ مدت کے مقابلے نفع میں معافی اور کمی بیع مساومہ میں جائز نہیں ہے، اور مرابحہ مؤجلہ کی صورت میں اس تعجیل کی وجہ سے نفع میں کمی کرنا جائز ہے۔ بلکہ فقہائے کرام نے تصریح کی ہے کہ جب دائن مدیون سے تعجیل دین کا مطالبہ کرے تو اس تعجیل کی صورت میں بقدر تعجیل مدت دائن مدیون سے نفع میں کمی کرے گا۔ مثلاً بائع نے دس مہینوں تک ایک ہزار نفع پر مرابحہ مؤجلہ کا معاملہ کیا ہے، اب بائع پانچ مہینے پہلے دین کا مطالبہ کر رہا ہے، تو اس مطالبے کی صورت میں مدیون سے پانچ مہینوں کے حساب سے نفع کم لیا جائے گا، تو ایک ہزار کے نفع میں پانچ سو نفع چھوڑ دے گا، اور پانچ سو نفع وصول کرے گا۔ مصنف صاحب نے اس مسئلے کی توثیق کے لئے اپنی کتاب ”فقہی مقالات“ ج: ۱ ص: ۱۱۶ پر متعدد کتابوں کے حوالے پیش کئے ہیں، چنانچہ وہ لکھتے ہیں (رد المحتار لابن عابدین ج: ۶ ص: ۷۵۷ آخر الحظر والاباحۃ) یہی مسئلہ کتاب البیوع میں فصل فی القرض سے پہلے بھی ذکر کیا ہے۔ وہاں یہ بھی لکھا ہے کہ علامہ حانوتی، علامہ نجم الدین اور علامہ ابوالسعود نے بھی اسی پر فتویٰ دیا ہے۔ دیکھئے: شامی ج: ۵ ص: ۱۶۰۔ اور یہی مسئلہ حاشیۃ الطحطاوی علی الدر میں بھی مذکور ہے، دیکھئے: ج: ۳ ص: ۱۴۰ و ج: ۴ ص: ۳۶۳۔ بعینہ یہی مسئلہ تنقیح الفتاویٰ الحامدیہ میں بھی مذکور ہے۔ ان حوالہ جات کے علاوہ جناب مصنف صاحب کی عبارت میں ص: ۱۷۱ پر اسی مسئلے پر فتاویٰ الانقروی، التئویر اور شرح المجلة للاتاسی کے حوالے بھی مذکور ہیں۔ مصنف صاحب کے حوالوں کا خلاصہ یہ ہے کہ ان مذکورہ کتابوں میں اسی پر فتویٰ ہے کہ تعجیل دین کی صورت میں مرابحہ مؤجلہ میں بائع نفع میں کمی کرے گا۔

مصنف صاحب کی رائے:- مذکورہ بحث کے بعد مصنف صاحب ص: ۱۱۸ پر اپنی رائے قائم کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اس مسئلے میں بیع مساومہ اور بیع مراحہ کا کوئی فرق نہیں ہے (یعنی فقہائے کرام نے جو فرق بیان کیا ہے وہ صحیح نہیں ہے) اس کے بعد فرماتے ہیں: لہذا میری رائے میں بیع بالتقسیط اور بیع مراحہ کے وہ معاملات جو اسلامی بینکوں میں رائج ہیں ان میں مندرجہ بالا فتویٰ پر عمل کرنا مناسب نہیں ہے۔

مصنف صاحب کی رائے پر اشکال:- اشکال یہ ہے کہ اتنے بڑے بڑے فقہائے کرام نے (جو مذکورہ بالا حوالہ جات میں ان کا ذکر کیا گیا ہے) بیع مساومہ اور بیع مراحہ کے حکم میں فرق کیا ہے اور مصنف صاحب فرماتے ہیں کہ بیع مساومہ اور بیع مراحہ کا کوئی فرق نہیں ہے۔ فقہائے کرام کے فرق سے انکار محل تامل ہے۔ اور فرق یقیناً موجود ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ بیع مساومہ میں مدت کے مقابلے میں قیمت میں کوئی اضافہ نہیں ہے، جبکہ مراحہ مؤجلہ میں مدت کے مقابلے میں قیمت میں اضافہ ہے۔ دوسرا فرق یہ ہے کہ جہاں فقہائے کرام نے نفع میں کمی بیشی کو ناجائز قرار دیا ہے وہ مشروط ہے، اور جہاں فقہائے کرام نے نفع میں کمی کا قول کیا ہے تو اس صورت میں ہے کہ پہلے سے کمی بیشی مشروط نہ ہو۔ اور مصنف صاحب فرماتے ہیں کہ وہ معاملات جو اسلامی بینکوں میں رائج ہیں ان میں مندرجہ ذیل فتویٰ پر عمل کرنا مناسب نہیں ہے۔ تو جہاں تک بینک کے معاملات کا تعلق ہے تو عدم جواز اس صورت میں ہے کہ بینک کے معاملات میں سامان کی اصل قیمت میں تردد ہو یا تعین اجل میں تردد ہو اور اگر مراحہ مؤجلہ میں سامان کی قیمت بھی متعین ہو اور اجل بھی متعین ہو تو اس صورت میں جواز ہے اور مصنف صاحب نے اس صورت کے جواز پر ص: ۸۳ پر قول کیا ہے، اور اس کے جواز پر ائمہ اربعہ اور جمہور فقہاء کا مسلک نقل کیا ہے، لہذا فقہائے کرام کا فتویٰ مطلقاً غیر مناسب سمجھنا درست نہیں ہے، بلکہ مناسب مسئلے کی تفصیل ہے، تاکہ مسئلے کی نوعیت بھی واضح ہو اور فقہائے کرام کا فتویٰ بھی مجروح نہ ہو۔ مصنف صاحب نے اپنی رائے کی توثیق کے لئے یہ وجہ بیان کی ہے کہ اگر مندرجہ بالا فتویٰ پر عمل کیا گیا تو اس صورت میں بیع مراحہ اور قسطوں پر بیع کی ان سودی معاملات سے زیادہ مشابہت ہو جائے گی جن میں مختلف مدتوں کے ساتھ ارتباط کی وجہ سے اصل واجب ہونے والی رقم میں شک رہتا ہے کہ وہ کم ہوگی یا زیادہ۔ مصنف صاحب نے اپنی رائے کی توثیق کے لئے جو وجہ بیان کی ہے، یہ انتہائی کمزور ہے، اس وجہ سے کہ فقہائے کرام کے فتویٰ پر عمل کرنے سے اگرچہ سودی معاملات سے مشابہت ہو جائے گی لیکن یہ مشابہت نقصان دہ نہیں ہے، اس لئے کہ فقہاء نے مراحہ مؤجلہ میں قلت نفع پر قول کیا ہے، اور سودی معاملات میں زیادت نفع پر اصرار کیا جاتا ہے، لہذا قلت نفع پر قول کرنے

سے سودی معاملات سے مشابہت کم ہو جائے گی، اور زیادتِ نفع پر قول کرنے سے سودی معاملات سے مشابہت زیادہ ہو جائے گی، جیسا کہ مصنف صاحب کی رائے ہے، لہذا فقہائے کرام کی رائے رائج ہے، اور مصنف صاحب کی رائے مرجوح ہے۔

اشکال ۲:- مسئلہ یہ ہے کہ اگر قرض کی ادائیگی کی مدت پوری ہونے سے پہلے مدیون کا انتقال ہو جائے تو کیا وہ دین پہلے کی طرح مؤجل ہی رہے گا یا وہ دین فی الفور واجب الاداء ہوگا، اور دائن کو مدیون کے ورثاء سے اس دین کی ادائیگی کا فوری مطالبے کا حق حاصل ہو جائے گا یا نہیں؟ اس مسئلے میں فقہاء کے مختلف اقوال ہیں۔ حنفیہ، شافعیہ اور مالکیہ کے جمہور فقہاء کا مسلک یہ ہے کہ مدیون کی موت کی وجہ سے دین مؤجل فوری واجب الادا ہو جاتا ہے، اور امام احمد بن حنبلؒ سے بھی ایک روایت اسی طرح منقول ہے، لیکن حنابلہ کے نزدیک مختار قول یہ ہے کہ اگر مدیون کے ورثاء اس دین کی توثیق کر دیں اور اس کی ادائیگی پر اطمینانِ دلادیں تو اس صورت میں وہ دین مدیون کی موت سے فوری واجب الادا نہیں ہوگا، بلکہ وہ پہلے کی طرح مؤجل ہی رہے گا۔

مصنف صاحب کی رائے:- مصنف صاحب مذکورہ مسئلے میں اپنی رائے قائم کرتے ہوئے ”فقہی مقالات“ ج: ۱ ص: ۱۳۷ پر لکھتے ہیں: میرے نزدیک اس مسئلے کا حل یہ ہے کہ اگرچہ جمہور فقہاء کا مسلک یہ ہے کہ مدیون کی موت سے وہ دین فی الفور واجب الادا ہو جائے گا لیکن بیع بالتقسیط اور مرابحہ مؤجلہ جن میں ثمن کا کچھ حصہ مدت کے مقابلے میں بھی ہوتا ہے اگر ان میں ہم فوری واجب الادا کے قول لے لیں تو اس صورت میں مدیون کے ورثاء کا نقصان ہے، لہذا مناسب یہ ہے کہ دو قولوں میں سے ایک قول کو اختیار کر لیا جائے، یا تو متاخرین حنفیہ کا قول لے لیا جائے کہ ادائے دین کی جو مدت متفق علیہ تھی اس کے آنے میں جتنا وقت باقی ہے اس وقت کے مقابلے میں جتنا ثمن آتا ہے، وہ ساقط کر دیا جائے، لہذا مدیون کے ترکے میں سے صرف ایام گزشتہ کے مقابل جو ثمن ہو وہ وصول کر لیا جائے۔ یا پھر حنابلہ کا قول اختیار کرتے ہوئے جس طرح وہ دین مؤجل تھا اب بھی اسی طرح مؤجل رہنے دیا جائے البتہ اس کے لئے شرط یہ ہے کہ مدیون کے ورثاء کسی قابلِ اعتماد ذریعے سے اس دین کی توثیق کر دیں۔ شاید حنابلہ کا یہ قول اختیار کرنا زیادہ بہتر ہے اس لئے کہ مدتوں کے اختلاف کی وجہ سے ثمن میں جو تذبذب کی صورت ہوتی اور جس کی وجہ سے صورۃ سودی معاملات سے مشابہت ہو جاتی ہے وہ تذبذب اس صورت میں نہیں۔

مصنف صاحب کی رائے پر اشکال:- اس رائے میں دو قسم کے اشکال ہیں:-

۱- اپنا مذہب چھوڑ کر کسی دوسرے مذہب کو اختیار کرنا اس وقت جائز ہے جب کوئی ضرورت

شدیدہ پیش آجائے اور جب کوئی ضرورتِ شدیدہ نہ ہو تو دوسرے مذہب کو اختیار کرنا یا ترجیح دینا اصولِ افتاء کے خلاف ہے اور تقلید کے منافی ہے۔ مولانا مفتی محمد شفیع صاحب فرماتے ہیں: ”ان اختیار مذہب الغیر فی بعض المسائل والافتاء بہ يجوز للمجتهد فلا يجوز الا بشرائط“ اس بحث کے آخر میں فرماتے ہیں: ”فلا يجوز الا بشروط الضرورة الشديدة وعموم البلوی والاضطرار“ (جواہر الفقہ ج: ۱ ص: ۱۶۶)۔

۲۔ حنابلہ کے مذہب کو ترجیح دینے میں یہ اشکال ہے کہ اگر ترکہ تقسیم نہ کیا جائے، اور مدتِ قرض تک موقوف کیا جائے تو پھر یتیموں اور بیواؤں کے ان حقوق میں تاخیر آجائے گی جو ترکہ میت سے متعلق ہیں، اور اگر ترکہ تقسیم کیا جائے یعنی دین ادا کرنے سے پہلے تو اس ترکہ سے دین متعلق ہے، اور دین کی ادائیگی سے پہلے ترکہ تقسیم کرنا ارشادِ خداوندی کے خلاف ہے، ارشادِ خداوندی ہے: ”مَنْ بَعْدَ وَصِيَّةٍ يُوصِي بِهَا أَوْ دَيْنٍ“۔

۳۔ مصنف صاحب نے اس سے پہلے بیع بالتقسيط کے جواز کا قول کیا ہے، اس قول کے بعد مراجعہ مؤجلہ میں تاویلات کی کیا ضرورت ہے، کیونکہ بیع بالتقسيط اور مراجعہ مؤجلہ کا حکم ایک ہی ہے۔ اشکال ۳:- مسئلہ یہ ہے کہ اگر کسی صاحب کا حق شرب یعنی کسی نہر یا چشمے سے پانی لینے کا حق ہو، تو اس حق شرب کی بیع جائز ہے یا نہیں؟ اس حق شرب کی بیع کے بارے میں فقہائے احناف کے اقوال مختلف ہیں، چنانچہ حنفی مسلک کی ظاہر روایت یہ ہے کہ حق شرب کی بیع جائز نہیں ہے، اور بعض فقہائے کرام نے عرف کی بنیاد پر حق شرب کی بیع جائز قرار دی ہے، لیکن جمہور کا مسلک یہ ہے کہ حق شرب کی بیع جائز نہیں ہے، چنانچہ رد المحتار، مبسوط السرخسی، فتح القدیر، عنایہ، ان کتابوں میں عدم جواز پر فتویٰ ہے۔

مصنف صاحب کی رائے:- جناب مصنف نے ”فقہی مقالات“ ج: ۱ ص: ۱۸۷ پر اس مسئلے پر تحقیق قلم بند کی ہے، اور اپنی رائے صراحتہً قائم نہیں کی ہے۔ لیکن ان کی تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف صاحب کی رائے حق شرب کی بیع کے جواز کا ہے۔ مصنف صاحب کی عبارت ملاحظہ فرمائیں، مصنف صاحب لکھتے ہیں: حنفی مسلک کی ظاہر روایت یہ ہے کہ حق شرب کی بیع جائز نہیں ہے، پھر بہت سے مشائخ نے عرف کی بنیاد پر حق شرب کی بیع جائز قرار دی ہے۔ (اس کے بعد لکھتے ہیں) لیکن نظر غائر سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ جن فقہاء نے حق شرب کی بیع کا عرف قائم ہونے کے باوجود اس کے جواز سے منع کیا ہے، ان حضرات نے غرر اور جہالت کی وجہ سے منع کیا ہے، اس وجہ سے نہیں کہ حق شرب مال نہیں۔ اور ص: ۱۹۸ پر لکھتے ہیں: امام سرخسی نے دوبارہ یہ مسئلہ کتاب المزارعة میں

زیادہ تفصیل کے ساتھ لکھا ہے۔ اور اخیر میں بیع شرب کو عرف کی وجہ سے جائز کہنے والے مشائخ متاخرین کا قول ذکر کیا اور ان کے قول پر کوئی تنقید نہیں کی ہے۔ اور اسی صفحے کے اخیر میں لکھتے ہیں: بعض متاخرین احناف نے لکھا ہے جن حقوق کی بیع جائز نہیں ہے، مثلاً حق تعلی، حق میل، حق شرب، ان کا عوض لینا بطریق بیع تو جائز نہیں ہے، لیکن صلح کے طریقے پر ان کا عوض لینا جائز ہے۔ علامہ خالد اتاسی مال کے بدلے میں وظائف سے دستبرداری کا مسئلہ ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں: ”اقول وعلیٰ ما ذکرہ من جواز الاعتیاض عن الحقوق المجردة بمال ینبغی ان یجوز الاعتیاض عن حق التعلیٰ وعن حق الشرب وعن حق المسیل بمال... الخ“ جناب مصنف صاحب کی ص: ۱۹۲ پر عبارت اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ جناب مصنف صاحب حق شرب کی بیع کے جواز کی طرف رجحان رکھتے ہیں۔

مصنف صاحب کی رائے پر اشکال:- مصنف صاحب ص: ۱۸۷ پر فرماتے ہیں کہ ظاہر روایت یہ ہے کہ حق شرب کی بیع جائز نہیں ہے، پھر بہت سے مشائخ نے عرف کی بنیاد پر حق شرب کی بیع جائز قرار دی ہے۔ مصنف صاحب کا یہ دعویٰ درست نہیں ہے کہ بہت سے مشائخ نے حق شرب کی بیع جائز قرار دی ہے، کیونکہ مصنف صاحب نے حق شرب کی بیع کے جواز پر دو حوالے پیش کئے ہیں، جبکہ خود مصنف صاحب نے عدم جواز پر چار حوالے پیش کئے ہیں، اور عدم جواز ظاہر روایت ہے، اور جواز بعض متاخرین کی رائے ہے۔ پھر کیسے یہ کہا جاسکتا ہے کہ بہت سے مشائخ نے حق شرب کی بیع جائز قرار دی ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ مصنف صاحب نے اپنی رائے کے اثبات کے لئے مبسوط سرحسی کا حوالہ دیا ہے اور یہ حوالہ محل تامل ہے کیونکہ صاحب مبسوط نے حق شرب کی بیع کا عدم جواز صراحۃً نقل کیا ہے، اور جواز کا قول ضمناً نقل کیا ہے۔ اور پھر اس جواز کے قول پر ردّ بھی کیا ہے۔ نیز مصنف ص: ۱۸۹ پر لکھتے ہیں: امام سرحسی نے دوبارہ یہ مسئلہ کتاب المزاعۃ میں زیادہ تفصیل کے ساتھ لکھا ہے اور اخیر میں بیع شرب کو عرف کی وجہ سے جائز کہنے والے مشائخ متاخرین کا قول نقل کیا ہے اور ان کے قول پر کوئی تنقید نہیں کی ہے۔ ”وبعض المتأخرین من مشائخنا.... الخ“ مصنف صاحب نے اہتمام کے ساتھ مبسوط کا حوالہ نقل کیا ہے اور اس کی نسبت مشائخ متاخرین کی طرف کی ہے۔ حالانکہ اسی جگہ یہ تصریح ہے کہ جمہور متاخرین نہیں بلکہ بعض متاخرین مراد ہیں اور اس بعض متاخرین کا مصداق صاحب مبسوط کے نزدیک ایک ہی شیخ ہے، صاحب مبسوط لکھتے ہیں: ”وکان شیخنا الاسلام یحکی عن استاذہ انه کان یفتی بجواز بیع الشرب.... الخ“ پھر ایک ہی شیخ سے بہت سے مشائخ سے تعبیر کرنا بے جا ہے۔ نیز مصنف صاحب نے ص: ۱۸۹ پر اپنی رائے کے اثبات کے لئے بعض متاخرین کا قول

نقل کیا ہے اور جمہور کے قول سے چشم پوشی کی ہے۔ جبکہ انصاف کا تقاضا یہ تھا کہ دونوں اقوال نقل کرتے۔ اور جمہور کے مقابلے میں بعض متاخرین کے قول کو ترجیح دینا اصولِ افتاء کے خلاف ہے۔ مصنف صاحب ص: ۱۸۹ پر لکھتے ہیں کہ بعض متاخرین احناف نے لکھا ہے کہ حق شرب کی بیع جائز نہیں ہے، لیکن صلح کے طریقے پر ان کا عوض لینا جائز ہے۔

مصنف صاحب نے اس تحریر کے بعد علامہ خالد اتاسیؒ کا قول نقل کیا ہے، یہاں بھی یہ وہم ہوتا ہے کہ متاخرین احناف کوئی جماعت ہے، حالانکہ مصنف صاحب نے ایک ہی عالم خالد اتاسیؒ کا قول نقل کیا ہے، اور خالد اتاسیؒ نے فتویٰ نہیں دیا ہے، انہوں نے ایک تجویز پیش کی ہے، وہ لکھتے ہیں: ”اقول وعلى ما ذكره من جواز الاعتياض عن الحقوق المجردة بمال ينبغي ان يجوز الاعتياض عن حق التعلی وعن حق الشرب وعن حق المسيل بمال... الخ“ اور مصنف صاحب نے علامہ خالد اتاسیؒ کی تجویز کو جواز پر حمل کر کے متاخرین احناف کو منسوب کیا، مطلقاً متاخرین احناف کو جواز کی نسبت درست نہیں ہے۔

اشکال ۴:- مسئلہ یہ ہے کہ حقوق مجرّدہ یعنی آں حقوق کہ اعیان نہ ہو، ان میں ایک حق اسبقیت ہے، حق اسبقیت سے مراد یہ ہے کہ مباح الاصل چیز پر سب سے پہلے قابض ہونے کی وجہ سے انسان کو مالک بننے کا جو حق یا اس مال کے ساتھ جو خصوصیت حاصل ہوتی ہے، اس کو حق اسبقیت کہا جاتا ہے، مثلاً افتادہ بنجر زمین کو قابل استعمال بنانے سے مالک بننے کا حق حاصل ہو جاتا ہے۔

مصنف صاحب کی رائے:- مصنف صاحب ص: ۱۹۷ پر لکھتے ہیں: فقہائے احناف اور مالکیہ کی کتابوں میں مجھے نہیں ملا کہ کس فقیہ نے حق اسبقیت کی بیع کا مسئلہ چھیڑا ہوا، فقہائے احناف اور مالکیہ نے تو یہ ذکر کیا ہے کہ افتادہ بنجر زمین پر نشان لگانے سے وہ شخص زمین کے استعمال کرنے اور زمین کا مالک بننے کا زیادہ حق دار ہو جاتا ہے، لیکن مجھے اس حق کی بیع کی بحث ان فقہاء کے یہاں نہیں ملی، قیاس کا تقاضا یہ ہے کہ ان کے نزدیک بھی حق اسبقیت کی بیع جائز نہ ہو، الا یہ کہ دست برداری کے طور پر ہو۔

خلاصہ یہ ہے کہ اگرچہ بعض فقہاء اس بیع کو جائز کہتے ہیں، لیکن فقہاء کی بڑی جماعت کی رائے اس کے عدم جواز کی ہے، البتہ حق اسبقیت سے مال لے کر بطور صلح کے دست بردار ہو جانا فقہاء کے نزدیک جائز ہے۔

مصنف صاحب کی رائے پر اشکال:- مصنف صاحب پہلے یہ فرماتے ہیں کہ فقہائے احناف اور مالکیہ کی کتابوں میں مجھے نہیں ملا کہ کس فقیہ نے حق اسبقیت کی بیع کا مسئلہ چھیڑا ہوا، اور

بعد میں فرماتے ہیں البتہ حق اسبقیت سے مال لے کر بطور صلح کے دست بردار ہو جانا فقہاء کے نزدیک جائز ہے۔

۱- مصنف صاحب کے کلام میں تعارض ہے، کیونکہ پہلے یہ فرماتے ہیں کہ مجھے فقہائے احناف اور مالکیہ کی کتابوں میں نہیں ملا، اور بعد میں یوں کہتے ہیں کہ حق اسبقیت سے مال لے کر بطور صلح کے دست بردار ہو جانا فقہاء کے نزدیک جائز ہے۔ جب مصنف صاحب کو پہلے یہ مسئلہ کتابوں میں ملا نہیں پھر فقہاء سے جواز کہاں سے ثابت ہوا؟ لہذا فقہائے احناف کی طرف یہ نسبت جواز درست نہیں ہے۔

۲- مصنف صاحب نے حق اسبقیت کے مسئلے میں احناف کی کوئی دلیل ذکر نہیں کی ہے، محض قیاس آرائی پر مسئلہ حمل کیا ہے۔ آخر اس قیاس آرائی کی کیا ضرورت ہے؟ رائج یہ ہے کہ حق اسبقیت کی بیع بھی جائز نہیں ہے جیسا کہ فقہائے کرام نے تصریح کی ہے، اور حق اسبقیت سے دستبرداری کے طور پر بھی مال لینا جائز نہیں ہے، کیونکہ اگر جواز کا فتویٰ دیا جائے تو بہت سے لوگ سرکاری زمینوں میں نشانات لگا کر اس کی بیع اور دستبرداری کے طور پر مال لینے میں مصروف ہو جائیں گے۔

اشکال ۵:- مصنف صاحب ص: ۲۱۷ پر لکھتے ہیں: ہمارے زمانے کی موجودہ پگڑی جو مالک کرایہ دار سے لیتا ہے جائز نہیں ہے۔ اور پگڑی کے نام پر لی جانے والی یہ رقم شریعت کے کسی قاعدے پر منطبق نہیں ہوتی، لہذا یہ رقم رشوت اور حرام ہے، البتہ پگڑی کے مروجہ نظام میں مندرجہ ذیل تبدیلیاں ممکن ہیں۔

۱- مالک مکان و دکان کے لئے جائز ہے کہ وہ کرایہ دار سے خاص مقدار میں یکمشت رقم لے لے، جسے متعینہ مدت کا پیشگی کرایہ قرار دیا جائے، یہ یکمشت رقم سالانہ یا ماہانہ کرایہ کے علاوہ ہوگی۔ اس یکمشت لی ہوئی رقم پر اجارہ کے سارے احکام جاری ہوں گے۔ یہاں مصنف صاحب مروجہ پگڑی کی متبادل صورت بتا رہے ہیں، اور اس متبادل صورت میں اسی مروجہ پگڑی کو فروغ ملتا ہے، کیونکہ مصنف صاحب فرماتے ہیں کہ یہ یکمشت رقم سالانہ یا ماہانہ کرایہ کے علاوہ ہوگی، جب یہ یکمشت رقم سالانہ یا ماہانہ کرایہ کے علاوہ ہو پھر تو یہ وہی پگڑی ہوگی جو پہلے اس کی حرمت پر بحث کی گئی ہے، لہذا عبارتِ ھذا کی وضاحت چاہئے۔

اشکال ۶:- مصنف صاحب مکان و دکان کے اجارے کے مسئلے کی وضاحت کرتے ہوئے ص: ۲۱۷، ۲۱۸ پر لکھتے ہیں: اگر اجارہ متعین مدت کے لئے ہو تو مالک مکان و دکان کے لئے جائز نہیں کہ شرعی عذر کے بغیر اجارہ فسخ کر دے، اگر مالک عذر شرعی کے بغیر دوران مدت اجارہ فسخ کرنا چاہے

تو کرایہ دار کے لئے جائز ہے کہ اس سے عوض کا مطالبہ کرے اور اس کا یہ اقدام بالعوض اپنے حق سے دستبرداری ہوگی، یہ عوض اس کے علاوہ ہوگا جس کا کرایہ دار اپنی یکمشت دی ہوئی رقم میں سے اجارہ کی باقی مدت کے حساب سے حق دار ہوگا۔ مجمع الفقہ الاسلامی جدہ نے اپنے چوتھے اجلاس منعقدہ ۱۴۰۸ھ میں یہی فیصلہ کیا ہے۔

مصنف صاحب کی رائے:- مصنف صاحب آگے چل کر ص: ۲۱۹ پر لکھتے ہیں: احناف کے یہاں رائج یہ ہے کہ حق وظیفہ کی بیع جائز نہیں ہے، لیکن مال کے بدلے میں اس سے دستبرداری جائز ہے، اسی طرح مکان یا دکان کے حق کرایہ داری کی بیع جائز نہیں ہے، لیکن مالی معاوضہ لے کر اس سے دستبردار ہونا جائز ہے۔

مصنف صاحب کی رائے پر اشکال:- مصنف صاحب نے حق وظیفہ سے دستبرداری کی صورت میں مالی معاوضہ اور اسی طرح حق کرایہ داری سے دستبرداری کی صورت میں مالی معاوضے کو جائز قرار دیا ہے، اور اس جواز کی نسبت فقہائے احناف کی طرف کی ہے۔ یہ جواز کی نسبت فقہائے احناف کی طرف درست نہیں ہے (یعنی حق کرایہ داری کے معاوضے کی نسبت)، کیونکہ مکان یا دکان سے دستبرداری کی صورت میں مالی معاوضہ لینا یہ احناف کا مسلک نہیں ہے، اور نہ مصنف صاحب نے اس پر احناف کی کوئی دلیل پیش کی ہے، بلکہ یہ مصنف صاحب کا قیاس ہے جو انہوں نے ص: ۲۱۷ پر قائم کیا ہے۔ البتہ اگر اس کو علمائے جدہ کا فیصلہ کہا جائے تو درست ہے، جیسا کہ مصنف صاحب نے ص: ۲۱۸ پر اس کی تصریح کی ہے۔

(جوابی خط از حضرت والا دامت برکاتہم)

گرامی قدر مکرم جناب مفتی غلام قادر صاحب مدظلہم العالی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

آپ کا گرامی نامہ مورخہ ۹ دسمبر ۲۰۰۰ء آپ کے اس مضمون کے ساتھ ملا جس میں آپ نے احقر کے ”فقہی مقالات“ کے بارے میں کچھ اشکالات ذکر فرمائے تھے۔ میں نے اس کا جواب اسی زمانے میں لکھنا شروع کر دیا تھا، لیکن بعض مسائل میں مراجعت کی ضرورت تھی، اس لئے دوسری مصروفیات حائل ہو گئیں، اور میں جواب مکمل نہ کر سکا۔ اتفاق سے مولانا محمد زاہد صاحب کچھ عرصہ پہلے تشریف لائے اور احقر نے آپ کی تحریر انہیں دکھائی، میرا مقصد یہ تھا کہ وہ بھی اس پر غور فرمائیں، انہوں نے باقی ماندہ حصے کے بارے میں اپنی رائے خود ہی لکھ دی، میں نے اسے دیکھا تو مجھے وہ

دُست معلوم ہوئی، اب یہ تحریر جس کا تقریباً نصف حصہ میرا لکھا ہوا ہے اور باقی نصف مولانا محمد زاہد صاحب کا (اور احقر کو اس سے اتفاق ہے) آپ کی خدمت میں بھیج رہا ہوں، اور تاخیر پر شرمندہ و معذرت خواہ ہوں۔

والسلام
محمد تقی عثمانی
۱۳۲۲/۷/۲ھ

(اشکالات کے جوابات از حضرت والا دامت برکاتہم العالیہ)

گرامی قدر و مکرم جناب مفتی غلام قادر صاحب مدظلہم العالی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

آپ کا گرامی نامہ اور اس کے ساتھ منسلک تحریر موصول ہوئی، آپ نے جس وقت نظر کے ساتھ احقر کے ”فقہی مقالات“ کا مطالعہ کیا، اور اس سلسلے میں اپنی آراء سے نوازا، اس کے لئے میں آپ کا تہ دل سے شکر گزار ہوں۔ احقر کی جب کوئی فقہی تحریر اہل علم کی نظر سے گزرتی ہے تو احقر کو خوشی ہوتی ہے، اور اس بات کی توقع قائم ہوتی ہے کہ اس سے تحریر پر نظر ثانی کا موقع ملے گا، جس سے غلطیوں کی اصلاح ہو سکتی ہے۔ چونکہ آپ نے تبصرہ ارسال فرما کر احقر سے بھی رد عمل معلوم کیا ہے، اس لئے چند گزارشات پیش خدمت ہیں:-

۱- ”مراجعة موجدہ“ کے سلسلے میں احقر نے علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ کی متعلقہ عبارتیں^(۱) نقل کرنے کے باوجود جو خیال ظاہر کیا ہے کہ مصارف اسلامیہ کو اس پر عمل نہیں کرنا چاہئے، اس کی وجہ مندرجہ ذیل ہیں:-

(الف) مراجعہ کے سلسلے میں یہ فتویٰ جو علامہ ابن عابدینؒ اور علامہ نجم الدین وغیرہ نے دیا ہے، یہ اصحاب مذہب سے منقول نہیں، اصحاب مذہب کا قول ”ضع وتعجل“ کے سلسلے میں معروف ہے، جو احقر نے بھی نقل کیا ہے، اس میں اصحاب مذہب نے مراجعہ اور غیر مراجعہ میں کوئی تفریق نہیں فرمائی،^(۲) لہذا یہ علمائے متاخرین کا فتویٰ ہے، جسے نہ اصحاب مذہب کی طرف منسوب کیا جاسکتا ہے، اور نہ اسے اس درجے کی قوت حاصل ہے جو اصحاب مذہب کے اقوال کو ہوتی ہے۔

(۱) دیکھئے رد المحتار ج: ۶ ص: ۷۵۷، قبیل کتاب الفرائض، وج: ۵ ص: ۱۶۰، و حاشیۃ الطحطاوی علی الدر المختار ج: ۳ ص: ۱۰۴، وج: ۴ ص: ۳۶۳۔

(۲) وفی شرح السیر الکبیر للسرخسی رقم: ۲۷۳۸ ج: ۴ ص: ۱۴۱۲ ضعوا وتعجلوا ومعلوم ان مثل هذه المعاملة لا يجوز بین المسلمین فان من كان له علی غیره دین الی أجل فوضع عنه بعضه بشرط أن یعجل بعضه لم یجز کره ذلك عمر و زید بن ثابت وابن عمر رضی اللہ عنہم۔

نیز دیگر حوالہ جات کے لئے ”فقہی مقالات“ ج: ۱ ص: ۱۰۰ تا ۱۱۴ ملاحظہ فرمائیں۔

(ب) یہ درست ہے کہ ”مرابحہ مؤجلہ“ میں قیمت کا کچھ حصہ ”اجل“ کے مقابلے میں ہوتا ہے، لیکن ”اجل“ کے مقابلے میں ”عوض“ کا کچھ حصہ ہونا اس وقت جائز ہے جب یہ معاوضہ کسی بیع کے ضمن میں ہو، چنانچہ جہاں ”اعتیاض عن الأجل“ کو جائز کہا ہے اس سے مراد یہ ہے کہ اصل بیع کسی اور چیز کی ہے، اور ضمن میں ”اجل“ کی وجہ سے اس بیع کی قیمت میں اضافہ کر دیا ہے۔ اسی کو ”ہدایۃ“^(۱) میں ان الفاظ سے بیان فرمایا ہے: ”ألا ترى أن الثمن يزداد لأجل الأجل“^(۲) لیکن ”اجل“ ہی کو مقصود بنا کر اس کا معاوضہ لینا جائز نہیں، جس کو صاحب ہدایہ نے فرمایا: ”الاعتیاض عن الأجل حرام“^(۳) لہذا اگر اصل مرابحہ میں اجل کی وجہ سے بیع کی قیمت میں اضافہ کیا گیا تو یہ ”اعتیاض عن الأجل“ ضمنی ہے، بلکہ یہ کہنا زیادہ موزوں ہے کہ یہ ”اعتیاض عن الأجل“ ہے ہی نہیں، بلکہ پورا ثمن بیع ہی کا ہے، البتہ اس کے تعین کے وقت ”اجل“ کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔

لیکن اگر متاخرین کے مذکورہ بالا فتویٰ پر عمل کرتے ہوئے یہ کہا جائے کہ اگر مشتری ”اجل“ سے پہلے ادائیگی کر دے تو وہ قیمت میں کمی کا حق دار ہے تو اس صورت میں یہ ”اعتیاض عن الأجل“ ضمنی نہیں، بلکہ مقصود ہوگا، کیونکہ قیمت میں کمی کے وقت سوائے اجل کے اور کوئی چیز موجود نہیں۔

(ج) یہ کہنا کہ چونکہ ثمن میں اضافہ ”اجل“ کی وجہ سے کیا گیا ہے، لہذا تعجیل کے وقت وہ اضافہ ساقط ہونا چاہئے، اس لئے بھی محل نظر ہے کہ یہ استدلال اس وقت درست ہو سکتا ہے جب بائع نے اپنے طور پر مشتری کو تعجیل پر مجبور کیا ہو، لیکن جہاں مشتری خود اپنی طرف سے ثمن جلدی لے آیا، جبکہ بائع نے ایسا کوئی مطالبہ مشتری سے نہیں کیا تو یہ استدلال درست نہیں بنتا، کیونکہ اجل مشتری کا حق ہے، اور یہ حق بائع نے اس کو دیا ہوا ہے، پھر مشتری اس کو استعمال کرے یا نہ کرے، اس سے عقد کے مؤجل ہونے پر کوئی فرق نہیں پڑتا، یعنی بائع اب بھی اس بات کے لئے تیار ہے کہ وہ اجل کو استعمال کرے، لہذا اپنی طرف سے تعجیل کی صورت میں ثمن میں کمی کا لازمی مطالبہ درست نہیں۔

(د) مصارف اسلامیہ کے حالات کے پیش نظر میرا ذاتی تجربہ یہ ہے کہ اگر وہاں اس فتویٰ پر عمل کیا گیا تو مال کار سود کا وہی میٹر چلنا شروع ہو جائے گا۔

اشکال نمبر ۲:-

مرابحہ مؤجلہ اور بیع بالتقسیط میں حنابلہ کا یہ قول^(۴) اختیار کرنے کی تجویز دی گئی ہے کہ مدیون

(۱ و ۲) وفي الهدایة کتاب البیوع ج: ۳ ص: ۷۸ (طبع مکتبہ رحمانیہ) الا یرى انه یزاد فی الثمن لأجل الأجل.
(۳) وفي الهدایة کتاب الصلح باب الصلح فی الدین ج: ۳ ص: ۲۵۷ (طبع مکتبہ رحمانیہ) وذلك اعتیاض عن الأجل وهو حرام.

(۴) دیکھئے: المغنی لابن قدامة کتاب المفلس ج: ۴ ص: ۴۸۶۔

کی موت کی صورت میں اگر ورثہ دین کی رہن یا کفیل وغیرہ کے ذریعے توثیق کر دیں تو دین بدستور مَوْجَل رہے گا، اور موت کی وجہ سے حال نہیں ہوگا۔ اس پر یہ اشکال کیا گیا ہے کہ یہ افتاء بمذہب الغیر ہے جو بلا ضرورتِ شدیدہ جائز نہیں۔ تو اس کے بارے میں عرض یہ ہے کہ عام مسائل میں بالعموم اور معاملاتِ مالیہ کے مسائل میں بالخصوص ضرورتِ شدیدہ کی بجائے محض حاجتِ عامہ یا ابتلائے عام کی وجہ سے بھی اکابر سے افتاء بمذہب الغیر منقول ہے،^(۲) حضرت گنگوہی رحمہ اللہ نے بھی حکیم الأمت حضرت تھانویؒ کو یہ نصیحت فرمائی تھی،^(۳) اور امداد الفتاویٰ جلد سوم میں بھی اس کی متعدد مثالیں ملتی ہیں،^(۴) لہذا جن بزرگوں نے ضرورتِ شدیدہ کا لفظ استعمال فرمایا ہے، ان کی مراد بھی ضرورت سے حاجت ہی ہے، اور فقہائے کرام کے کلام میں حاجت پر لفظ ضرورت کے اطلاق کی مثالیں بہت سی ہیں۔^(۵) یہاں جس حاجت کی وجہ سے یا جس مشقت اور ضرر سے بچنے کے لئے یہ تجویز دی گئی ہے اس کا ذکر مذکورہ مقالہ ”قسطوں پر خرید و فروخت“ میں موجود ہے۔ باقی یہ بات کہ ایسی کوئی حاجت یا مشقت متحقق ہے یا نہیں تو اس کا تعلق امر واقعہ سے ہے جس میں ذوق یا تجربے یا مشاہدے کے اختلاف کی وجہ سے اختلاف ہو جانا کوئی بعید بات نہیں۔ مذکورہ مقالہ دراصل مالیاتی اداروں کے معاملات کے پس منظر میں لکھا گیا ہے، اور مالیاتی اداروں کے معاملات میں مدیون کی موت پر دین کے حال ہو جانے سے بہت سی مشکلات پیدا ہو سکتی ہیں، جس کا اندازہ ان اداروں کے ساتھ تعامل رکھنے والوں کو بخوبی ہے، تاہم اگر یہ مشکل کسی طرح حل کر لی جائے تو یقیناً دین کا حال ہو جانا رائج ہوگا۔

رہی یہ بات کہ اس صورت میں دین اگر مَوْجَل رکھا جائے اور ترکہ حلول اجل سے پہلے تقسیم

(۱) دیکھئے: المغنی لابن قدامة کتاب المفلس ج: ۴ ص: ۴۸۶۔

(۳) نیز حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک فتویٰ میں بھی تحریر فرمایا کہ: ضرورت کے وقت روایتِ غیر مفتی بہا پر اور مذہبِ غیر پر عمل کرنا درست ہے، اگرچہ اولیٰ نہیں خصوصاً اضطراری و عمومِ بلویٰ میں۔ کذا فی رد المحتار، دیکھئے فتاویٰ رشیدیہ ص: ۱۹۸ (طبع قدیم ایچ ایم سعید)۔

(۴ و ۲) جیسا کہ حکیم الأمت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ نے امداد الفتاویٰ ج: ۳ ص: ۱۰۶ میں سلم کے ایک مسئلے (وقتِ میعاد تک بیع کے برابر پائے جانے میں ضرورت کی بناء پر امام شافعی رحمہ اللہ کے مسلک پر، اور ج: ۳ ص: ۴۹۵ میں شرکت کے ایک مسئلے (عروض میں شرکت) میں ابتلائے عام کی بناء پر امام مالک رحمہ اللہ کے مسلک پر فتویٰ دیا ہے۔ اسی طرح اور بھی کئی مثالیں موجود ہیں۔

(۵) منها ما جاء فی تبیین الحقائق للزیلعی کتاب الکراہیة ج: ۷ ص: ۲۷ (طبع سعید) ولا یقبل قول الکافر فی الدیانات وانما یقبل قوله فی المعاملات خاصة للضرورة... والحاجة ماسة الى قبول قوله لكثرة وقوع المعاملات ولا یقبل فی الدیانات لعدم الحاجة... الخ.

وفی الاشباه والنظائر لابن نجیم ج: ۱ ص: ۱۲۶ الحاجة تنزل منزلة الضرورة عامة كانت أو خاصة.

کر لیا جائے تو آیت: ”مَنْ بَعْدَ وَصِيَّةٍ يُوصِي بِهَا أَوْ ذَيْنَ“ (النساء: ۱۲) کے خلاف ہوگا تو اس کے بارے میں گزارش ہے کہ آیت کا مقصود یہ ہے کہ انفاذِ وصیت اور ادائے دین کے بعد جو کچھ بچے ورثہ کا حق صرف اسی میں ہے، یہ مقصد نہیں کہ عملاً بھی جب تک دین اداء نہ ہو جائے اس وقت تک ورثہ کے لئے ترکے میں سے اپنا حصہ لینا بھی ناجائز ہے، آخر دین کو حال قرار دے کر بھی تو یہ ممکن ہے کہ دائن از خود ورثہ کو مہلت دیدے، ظاہر ہے کہ اس صورت میں اس مدتِ مہلت کے دوران ورثہ ترکہ تقسیم کر لیتے ہیں تو فقہ حنفی کی رو سے بھی یہ ناجائز نہیں ہوگا۔

اشکال نمبر ۳:-

اس اشکال کے بارے میں کچھ عرض کرنے سے پہلے بطور تمہید یہ عرض کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ رسالہ ”حقوقِ مجردہ کی خرید و فروخت“ کا اصل مقصود (جیسا کہ اس رسالے کی تمہید میں بھی ذکر کیا گیا ہے) حقِ مرور، حقِ تعلیٰ، حقِ تسبیل اور حقِ شرب وغیرہ ان حقوق کے حکم کی تحقیق نہیں ہے جو فقہاء کے کلام میں صراحتاً مذکور ہیں، بلکہ اصل مقصود اس دور میں نئے پیدا ہونے والے حقوق جن کی خرید و فروخت آج کل بکثرت ہو رہی ہے کا حکم جاننے کی کوشش کرنا ہے، اس کے لئے ظاہر ہے کہ حقوق کی قدیم اقسام کے بارے میں فقہاء کی عبارات اور دلائل میں غور کر کے ان اصول کا استنباط کرنا ہوگا جن کی بنیاد پر فقہاء نے یہ احکام ذکر کئے ہیں، اور ان اصول کی روشنی میں حقوق کی جدید اقسام کی بیع یا نزول بعوض کا حکم معلوم ہو سکے گا۔

حقِ شرب کے بارے میں بھی رسالہ مذکورہ میں جو کچھ لکھا گیا ہے اس کا مقصود بھی بذاتِ خود حقِ شرب کی بیع کے جواز یا عدمِ جواز کے بارے میں فیصلہ کن بات کہنا نہیں ہے، یہ ایک مستقل مسئلہ ہے، اصل مقصود اس مسئلے میں بھی فقہاء کی عبارات سے عمومی ضابطے کا استنباط ہے، اور لبِ لباب پوری بحث کا یہ ہے کہ بعض فقہاء نے تو عرف کی وجہ سے حقِ شرب کی بیع کو جائز قرار دیا ہے، اور جن حضرات نے عرف کے باوجود ناجائز قرار دیا ہے اس کی وجہ بھی یہ نہیں ہے کہ یہ عرف و تعامل کے باوجود قابلِ بیع نہیں بنا، بلکہ ناجائز ہونے کی اصل وجہ ان فقہاء کے نزدیک غرر اور جہالت ہے، اور یہ بات ثابت کرنے کے لئے متعدد عبارات کا حوالہ دیا گیا ہے اور آخر میں ان سے جو نتیجہ نکالا گیا ہے اس کے الفاظ یہ ہیں:-

فقہائے احناف نے بیعِ شرب کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے اس سے حقوق کے مسئلے میں بعینہ وہی باتیں معلوم ہوں جو حقِ مرور اور حقِ تسبیل کی بیع کے مسئلے میں ان کی بحثوں سے معلوم ہوں، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ”حق اگر کسی عین مال

سے متعلق ہو تو اس کی بیع جائز ہوگی، بشرطیکہ وہاں کوئی مانع مثلاً غرر اور جہالت وغیرہ نہ پایا جائے۔^(۱)

جناب کے اشکال کا بغور مطالعہ کرنے کے باوجود اس میں کوئی ایسی بات نہیں مل سکی جو رسالے میں ذکر مذاہب اور عبارات سے اس قاعدے کے استنباط میں مانع ہو۔

باقی رہی جناب کی یہ بات کہ مذکورہ رسالے میں بیع شرب کے بارے میں صراحۃً رائے قائم نہیں کی گئی لیکن مصنف کی تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ جواز کے قائل ہیں۔ تو صریح رائے ذکر نہ کرنے کی وجہ وہی ہے جو اوپر تمہید میں ذکر کی گئی کہ بذات خود اس مسئلے کی تحقیق مقصود نہیں بلکہ مقصود اصول کا استنباط ہے، مصنف کی رائے جو پوری بحث سے سمجھ میں آتی ہے وہ مطلقاً جواز کی نہیں ہے بلکہ پوری بات جو سمجھ میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ شرب کی بیع غرر اور جہالت کی وجہ سے ناجائز ہے، اس وجہ سے نہیں کہ وہ عرف اور تعامل کے باوجود قابل بیع بننے کی بذات خود صلاحیت نہیں رکھتا، لہذا اگر کہیں اس کی بیع کا عرف ہو اور غرر اور جہالت بھی نہ پائی جائے (مثلاً جدید آلات سے پانی کی پیمائش ممکن ہو) تو ان فقہاء کی عبارات کی رو سے یہ بیع جائز ہوگی، اور یہ محض ایک آدھ فقیہ کی رائے نہیں ہے بلکہ رسالے میں ذکر کردہ تمام عبارات سے یہی بات لگتی ہے۔

اشکال نمبر ۴:-

جناب نے یہ اشکال فرمایا ہے کہ پہلے تو لکھا گیا ہے کہ فقہائے مالکیہ و حنفیہ کے ہاں حق اسبقیت کی بیع کا حکم ان کی کتابوں میں نہیں ملا، اور پھر آگے چل کر حکم لکھ بھی دیا ہے، ان دونوں باتوں میں تعارض ہے۔ تو عرض یہ ہے کہ حکم لکھتے وقت یہ دعویٰ نہیں کیا گیا کہ یہ حکم ان کتابوں میں مصرح ہے بلکہ یہ کہا گیا ہے کہ یہ حکم ان کے قواعد سے سمجھ میں آتا ہے اور یہ قواعد رسالے میں پہلے تفصیل سے بیان ہو چکے ہیں۔ جناب نے تحریر فرمایا ہے: ”آخر اس قیاس آرائی کی کیا ضرورت ہے؟ راجح یہ ہے کہ حق اسبقیت کی بیع بھی جائز نہیں“ مذکورہ رسالے میں بھی عدم جواز ہی کو قیاس کا تقاضا قرار دیا گیا ہے، البتہ اگر یہ بات قیاس آرائی کے بغیر کسی صریح جزئیہ سے ثابت ہو رہی ہے تو اُمید ہے کہ جناب اس سے مطلع فرما کر احسان فرمائیں گے۔

باقی رہی حق اسبقیت سے نزول بعوض کی بات تو یہ بات پہلے ص: ۱۶۶ پر پیری، شامی اور

(۱) ”فقہی مقالات“ ج: ۱ ص: ۱۸۹ (طبع میمن اسلامک پبلشرز)۔

ص: ۱۹۰ پر اتاسی کے حوالے سے لکھی جا چکی ہے کہ جو حق اصالۃً ثابت ہو دفعِ ضرر کے طور پر نہ ہو ان سے صلح کرنا اور عوض لینا جائز ہے، یاد رہے کہ یہ قاعدہ اتاسی نے اپنی رائے کے طور پر نہیں لکھا بلکہ دوسرے فقہاء سے نقل کیا ہے، چنانچہ ان کی عبارت ان لفظوں سے شروع ہوتی ہے: ”أقول: وعلى ما ذكره من جواز الاعتياض عن الحقوق المجردة بمال.... الخ.“^(۱)

اشکال نمبر ۵ و ۶:-

اس اشکال کا حاصل بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ پگڑی کی مروجہ شکل کا جو متبادل پیش کیا گیا ہے اس میں بھی اسی پگڑی کی اجازت دے دی گئی ہے۔ یہ اشتباہ بظاہر درج ذیل اُمور کی طرف دھیان نہ جانے کی وجہ سے پیدا ہوا ہے:-

۱- مروجہ پگڑی میں لی گئی رقم شرعاً کسی بھی قابلِ اعتیاض چیز کا عوض نہیں ہے، بلکہ یہاں پیشگی لی گئی رقم اجرت کا حصہ ہے، یہ جو کہا گیا ہے کہ یہ یکمشت رقم ماہانہ یا سالانہ کرایہ کے علاوہ ہوگی، اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہ کرائے کا حصہ ہی نہیں، بلکہ مطلب یہ ہے کہ کرایہ کو دو حصوں میں تقسیم کر لیا گیا ہے، ایک حصہ یکمشت پیشگی وصول کر لیا گیا ہے اور دوسرا ماہانہ یا سالانہ وصول ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ اگر کسی عذر کی وجہ سے اجارہ فسخ ہو جائے تو یکمشت رقم میں سے باقی ماندہ مدت کے مقابل جو رقم آئے گی وہ مؤجر مستأجر کو واپس کرے گا، اسی طرح اگر مالک مکان یا دکان مستأجر کو مقررہ مدت سے پہلے نکالنا اور بغیر عذر شرعی کے اجارہ کرنا چاہتا ہے اور مستأجر نے عوض کا مطالبہ کئے بغیر رضامندی سے اجارہ فسخ کر دیا تو بعد میں کسی عوض کا مطالبہ نہیں کر سکتا صرف باقی ماندہ مدت کی رقم وصول کر سکتا ہے۔

۲- مکان یا دکان مقررہ مدت سے پہلے خالی کرنے کی صورت میں مستأجر پگڑی کی جو رقم واپس لیتا ہے وہ مروجہ پگڑی میں کسی ثابت شدہ حق کا عوض نہیں ہوتا، جبکہ یہاں مدت مقررہ تک اجارہ کرنے سے اسے قرار کا حق حاصل ہو گیا ہے جو ایک عین کے ساتھ متعلق ہے، اور شفعہ کی طرح صرف دفعِ ضرر کے لئے مشروع نہیں ہے، اس لئے اس کی بیع جائز نہ بھی ہو تب بھی پہلے ثابت شدہ قاعدے کے مطابق نزولِ بعوض جائز ہے، یہاں مستأجر کو اصل حق رقم وصول کرنے کا نہیں مل رہا، بلکہ قرار کا حق مل رہا ہے، لہذا اس کے پاس پہلا اختیار یہی ہے کہ وہ اڑ جائے کہ میں مقررہ مدت سے پہلے نہیں نکلوں گا، معاوضہ لے کر دستبرداری تو صلح کی ایک شکل ہے۔

(۱) دیکھئے: ”فقہی مقالات“ ج: ۱ ص: ۱۹۰ (طبع میمن اسلامک پبلشرز)۔

جناب نے یہ جو کہا ہے کہ حق کرایہ داری کا عوض لینے کے جواز کی نسبت فقہائے حنفیہ کی طرف درست نہیں، بلکہ یہ محض مصنف کا قیاس اور علمائے جدہ کی رائے ہے، تو اصل بات یہ ہے کہ یہ مسئلہ کتب فقہ میں صراحۃً تو مذکور نہیں، جس طرح جواز مصرح نہیں، اسی طرح عدم جواز بھی مصرح نہیں، ایسی صورت میں دوسری فقہی نظائر اور قواعد سے ہی حکم لگانا پڑتا ہے، یہاں بھی یہ حکم پہلے تفصیل سے ذکر کردہ قواعد اور نظائر ہی کی روشنی میں لگایا گیا ہے۔^(۱)

حکومت کی طرف سے ملنے والی چیز اگر ضرورت سے زائد ہو تو اسے فروخت کرنا جائز ہے

سوال:- میں جو دھندا کرتا ہوں اُس کے لئے چینی کی ضرورت ہوتی ہے، اور مجھے حکومت کی طرف سے ڈیڑھ من چینی ملتی ہے، دھندا کم ہونے سے کبھی وہ چینی بچ جاتی ہے، کیا یہ چینی مناسب نفع پر بیچ سکتا ہوں؟

جواب:- بیچ سکتے ہیں۔

واللہ اعلم

۱۳۹۷/۲/۱۴ھ

مکان بنا کر کرایہ پر دینے یا این.آئی.ٹی یونٹ میں شرکت کرنے میں سے کونسی صورت بہتر ہے؟

سوال:- زید کے پاس کچھ رقم ہے، اس کے ذہن میں آمدنی حاصل کرنے کی چند صورتیں ہیں، آپ ہی اس کا فیصلہ کریں۔ ایک تو یہ کہ مکان بنا کر کرایہ پر دیں۔ ثانیاً گورنمنٹ کے جاری کردہ این.آئی.ٹی یونٹ میں شرکت ہے۔ بعض لوگ تجارتی مکان بنانے کو درست نہیں جانتے۔

جواب:- مکان بنا کر کرایہ پر دینا بلاشبہ جائز ہے، اور اس کام میں رقم لگائی جاسکتی ہے۔ البتہ این.آئی.ٹی کے طریقہ کار کی ہمیں تحقیق نہیں ہے، اس کا مفصل طریقہ کار معلوم کر کے آپ بھیج دیں تو جواب دیا جاسکے گا، خاص طور سے مندرجہ ذیل باتیں معلوم کی جائیں: ۱- اس میں نفع کسی معین شرح سے تقسیم ہوتا ہے یا متناسب طریقے سے؟ ۲- یونٹ خریدنے والا نقصان کی صورت میں نقصان برداشت کرتا ہے یا نہیں؟ ۳- عوام کی رقم کس کام میں لگائی جاتی ہے؟

واللہ اعلم

۱۳۸۸/۵/۲۶ھ

(فتویٰ نمبر ۶۱۸/۱۹ الف)

(۱) تفصیل کے لئے ”فقہی مقالات“ ج: ۱ ص: ۲۱۷ و ۲۱۸ (طبع میمن اسلامک پبلشرز) ملاحظہ فرمائیں۔ (محمد زبیر)

حکومت کے لئے اشیاء کی قیمتوں پر کنٹرول کرنے کا حکم

سوال:- جن چیزوں پر کمپنی کی طرف سے قیمت نوٹ ہوتی ہے ان سے زائد رقم پر ڈیلر فروخت کر سکتا ہے؟ اور جن چیزوں پر گورنمنٹ نے کنٹرول کر دیا ہے ان کو مقررہ قیمت سے زائد پر فروخت کرنا کیسا ہے؟

جواب:- جب عوام کو ضرر پہنچنے کا اندیشہ ہو تو حکومت کو اشیاء کے نرخ پر کنٹرول کرنا جائز ہے، ایسی صورت میں متعین قیمت سے زائد میں مال فروخت کرنا تاجروں کے لئے جائز نہیں ہے۔ درمختار میں ہے: ”اذا تعدی لأرباب غیر القوتین وظلموا علی العامة فیسعر علیہم الحاکم بناء علی ما قال ابو یوسف ینبغی أن یجوز“^(۱) اور علامہ شامی تحریر فرماتے ہیں: ”ان الامام یری الحجر اذا عم الضرر کما فی المفتی الماجن والمکاری المفلس والطیب الجاهل وهذه قضية عامة فتدخل مسئلتنا فیها لأن التسعیر الحجر معنی لأنه منع عن البیع بزیادة فاحشة وعلیه فلا یكون مبنیاً علی قول ابی یوسف“ فقط۔ (شامی ج: ۵ ص: ۳۵۳)^(۲) واللہ اعلم بالصواب

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

ھ ۱۳۸۷/۱۱/۴

(فتویٰ نمبر ۱۴۰۱/۱۸ الف)

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع عفی عنہ

ھ ۱۳۸۷/۱۱/۴

دکان دار کے بیٹے کا اپنے والد کی دکان سے مال

کسی کے ہاتھ کم قیمت پر فروخت کرنا

سوال:- ایک شخص دکان دار ہے، اس کے تین بیٹے ہیں، دو دکان پر والد کے ساتھ کام کرتے ہیں، ایک تعلیم حاصل کر رہا ہے۔ اس شخص کا بڑا لڑکا جو ہے وہ بندہ کے ساتھ تعاون کرنا چاہتا ہے، وہ کہتا ہے کہ آپ کی چھوٹی سی دکان ہے، غریب آدمی ہیں، آپ میرے سے سامان قیمت خرید پر کم و بیش خرید لیا کریں، میں رعایت پر دے دیا کروں گا بشرطیکہ میرے والد اور میرے چھوٹے بھائی کو

(۱) الدر المختار ج: ۶ ص: ۴۰۰ کتاب الحظر والاباحۃ، فصل فی البیع (طبع سعید).

(۲) رد المحتار علی الدر المختار ج: ۶ ص: ۴۰۱، وکذا فی البحر الرائق ج: ۸ ص: ۳۷۰، کتاب الکراہیۃ (طبع

رشیدیہ)، کذا فی المحيط البرہانی ج: ۸ ص: ۲۶۸ (طبع مکتبہ غفراریہ).

علم نہ ہو، اگر ان کو علم ہو گیا تو وہ ناراض ہوں گے۔ آپ فتویٰ دیں کہ بندہ لے سکتا ہے یا نہیں؟
 جواب:- وہ بڑا لڑکا اگر بحیثیت ملازم کے دکان پر کام کرتا ہے تو اس کے لئے مالک یعنی والد کی مرضی کے بغیر رعایت سامان فروخت کرنا جائز نہیں^(۱)، ایسی صورت میں اس سے رعایت پر سامان خریدنا بھی جائز نہ ہوگا^(۲) اور اگر وہ دکان میں حصہ دار ہے تب بھی یہی حکم ہے کہ باقی شرکاء کی مرضی کے بغیر ایسی رعایت سے سامان فروخت کرنا اس کے لئے جائز نہیں جو عام طور سے تاجر نہ کرتے ہوں^(۳)، ہاں اگر دکان کا مالک وہی ہو اور باپ اور بھائی اس میں بطور ملازم یا تبرعاً کام کرتے ہوں تو اس صورت میں اس کے لئے رعایت کرنا بھی جائز ہے^(۴) اور آپ کے لئے اس سے رعایت پر سامان خریدنا بھی۔

واللہ سبحانہ اعلم

۱۴۰۱/۱۰/۲۱ھ

(فتویٰ نمبر ۱۵۹۸/۳۲ ج)

- (۱) فی مشکوٰۃ المصابیح ج: ۱ ص: ۲۶۱ (طبع رحمانیہ) ”قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: ألا لا تظلموا، ألا لا يحل مال امرئ الا بطيب نفس منه.“
- فی الدر ج: ۶ ص: ۲۰۰ لا يجوز التصرف في مال غيره بلا اذنه ولا ولايته اهـ.
- (۲) فی الدر المختار ج: ۵ ص: ۹۸ (طبع سعید) الحرمة تتعدد مع العلم بها. وقال الشامي تحته: اما لو رأى المكاس مثلاً يأخذ من أحد شيئاً من المكس ثم يعطيه آخر ثم يأخذ من ذلك الآخر فهو حرام.
- وفيه أيضاً قبل ذلك وما نقل عن بعض الحنفية من أن الحرام لا يتعدى ذمتين سألت عنه الشهاب بن الشلبی فقال: هو محمول على ما اذا لم يعلم بذلك.
- وفی الاشباه الحظر والاباحة ص: ۸۸ الحرمة تتعدى مع الأموال مع العلم ألا في حق الوارث الخ.
- (۳) وفي شرح المجلة لسليم رستم باز ص: ۶۵۴ رقم المادّة ۱۱۹۲ (طبع حنفیہ کوئٹہ) كل يتصرف في ملكه كيف يشاء. وكذا في شرح المجلة للأناسي ج: ۴ ص: ۱۳۲ (طبع مكتبة حبيبيه كوئٹہ).
- وفی بدائع الصنائع كتاب الشرب ج: ۶ ص: ۱۶۰ (طبع سعید) وحق الكل متعلق بالماء ولا سبيل الى التصرف في الملك والمشارك والمشارك المشترك الا برضاء الشركاء.
- وفی تبیین الحقائق شرح كنز الدقائق كتاب الشركة ج: ۴ ص: ۲۳۵ (طبع سعید) وكل اجنبي في قسط صاحبه أي وكل واحد منهما أجنبي في نصيب صاحبه حتى لا يجوز له أن يتصرف فيه إلا باذنه كما لغيره من الأجانب الخ.
- وفی مجمع الأنهر شرح ملتقى الأبحر أوائل كتاب الشركة (الشركة ضربان) (وكل منهما) أي كل واحد من الشريكين أو الشركاء شركة ملك أجنبي في نصيب الآخر حتى لا يجوز له التصرف فيه إلا باذن الآخر كغير الشريك لعدم تضمنها الوكالة الخ.
- (۴) وفي الهداية باب الكراهية فصل في البيع ج: ۴ ص: ۴۷۲ (طبع رحمانیہ) ولأن الثمن حق العاقد فاليه تقديره الخ.
- وفی الهندية ج: ۳ ص: ۱۷۳ حطّ بعض الثمن صحيح ويلتحق بأصل العقد عندنا كالزيادة الخ.
- وفی الهداية ج: ۳ ص: ۸۰ (طبع رحمانیہ) ويجوز للمشتري ان يزيد البائع في الثمن ويجوز للبائع ان يزيد للمشتري في المبيع ويجوز ان يحط عن الثمن ويتعلق الاستحقاق بجميع ذلك الخ.
- وكذا في الدر المختار فصل في التصرف في المبيع والثمن قبل القبض والزيادة والحط فيها ج: ۵ ص: ۱۵۴.

Sky Biz 2000 کی ویب سائٹ خریدنا

اور اس کمپنی کا ممبر بن کر تعلیم حاصل کرنا

سوال:- محترم و مکرم عالی جناب قبلہ حضرت مفتی محمد تقی صاحب، زادکم اللہ علماً و شرفاً
بعد سلام مسنون، امریکا میں تلسا اوکلا میں دسمبر ۱۹۹۸ء میں ایک کمپنی کی ابتداء ہوئی ہے،
اس کمپنی کا نام ”اسکائے بیز ۲۰۰۰“ (Sky Biz 2000) ہے، اس کمپنی کا کام ملٹی لیول مارکیٹنگ
(Multy Level Marketing) کا ہے۔

۱- سوال یہ ہے کہ میں نے اس کمپنی کی ویب سائٹ (Web-Site) خریدی ہے جس کے
ذریعے میں اپنے کاروبار کو پوری دنیا میں پھیلا سکتا ہوں، جبکہ اخبارات کے ذریعے یہی اشتہار اگر دیا
جاتا تو جہاں تک وہ اخبار جاتا ہے وہاں تک اپنے کاروبار کی پبلٹی (Publicity) ہوتی ہے، لیکن ویب
سائٹ کے ذریعے عالمی پیمانے پر پبلٹی ہو سکتی ہے۔ اس کمپنی کے ممبر بننے سے دوسرا فائدہ یہ ہے کہ کمپنی
انٹرنیٹ کے ذریعے مختلف قسم کی تعلیمات دیتی ہے، مثلاً یہ کمپنی حسب ذیل تعلیم اپنے ممبران کو دیتی ہے:
۱- ونڈوز ۹۵ (Windows 95)، ۲- ونڈوز ۹۸ (Windows 98)، ۳- ونڈوز ۳.۱ (Windows 3.1)،
۴- انٹرنیٹ ایجوکیشن، ۵- ویب سائٹ ایجوکیشن، ۶- ویب بلڈر (Web Builder)، ۷- لنک سرچنگ،
۸- ہوم بیزک بزنس وغیرہ۔

اگر مذکورہ تعلیمات مجھے اور میرے گھر کے افراد کو کسی کلاس میں جا کر حاصل کرنا ہو تو اس
سب ہی افراد کی مجھے الگ الگ فیس دینی پڑے گی۔ دوم یہ کہ ہمیں اس کلاس کے اوقات کی پابندی
کرنی ہوگی، جبکہ اس کمپنی سے ویب سائٹ خرید کر اور ممبر بن کر ایک ہی فیس سے میں اور میرے گھر
کے سارے افراد اپنی فرصت کے وقت مذکورہ تعلیمات حاصل کر سکتے ہیں، جس میں ظاہر ہے کہ پیسوں
کی بھی بچت ہے اور وقت کی عدم پابندی یہ بھی بہت بڑا فائدہ ہے۔

۲- اس کمپنی سے جو بھی چھ ہزار ایک سو روپے دے کر ویب سائٹ خریدتا ہے یا اس کمپنی کا
ممبر بن کر تعلیم حاصل کرتا ہے تو کمپنی اپنی ویب سائٹ کے خریدار کو ایک کاروبار بھی دیتی ہے، اپنی کمپنی
کے ممبر کو ایک ایجنسی دیتی ہے، جس میں کمپنی کی طرف سے یہ شرط ہے کہ بننے والا ممبر کمپنی کے نو ویب
سائٹ کے خریدار کو تیار کرے جس میں ایک دایاں اور ایک باایاں (Left, Right) ہوتا ہے، ایک ہی
طرف نو ممبر نہ ہوں، بلکہ ایک طرف چار ہوں تو دوسری طرف پانچ، ایک طرف چھ تو دوسری طرف تین،
اس طریقے سے ویب سائٹ کے خریدار کو تیار کرنے پر کمپنی ستر ڈالر کا چیک ایجنٹ پر بھیجتی ہے، اسی

طرح یہ سلسلہ چلتا رہتا ہے مثلاً نو خریدار تیار کرنے پر ستر ڈالر، پھر اٹھارہ پر ۳۵ ڈالر، پھر ۲۷ پر ۳۵ ڈالر، پھر ۲۶ پر ۷۰ ڈالر علیٰ ہذا القیاس، اسی طرح یہ کمپنی اپنے ایجنٹ کو کمیشن دیتی رہتی ہے۔

۳۔ یہ کمپنی کمپیوٹر سوفٹ ویئر، ہارڈ ویئر، اور پہننے کے کپڑے وغیرہ بناتی ہے، تو اس طریقے سے ویب سائٹ خرید کر ایجنٹ بن کر کاروبار کرنے میں جس کی تفصیل اوپر بتائی گئی ہے، نیز ویب سائٹ کے خریدار کو تیار کرنے میں ہمیں اپنا وقت لگانا پڑتا ہے، اپنی گاڑی، اپنا فون استعمال کرنا ہوتا ہے، یعنی کہ اچھی خاص محنت کے بعد خریدار تیار ہوتے ہیں، جس کے نتیجے میں کمپنی کمیشن کے طور پر اپنے نفع میں سے ایجنٹ کو نفع دیتی ہے، جس کی تفصیل اوپر ذکر کی گئی۔

اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ میں اس کمپنی سے ویب سائٹ خرید کر انٹرنیٹ کے ذریعے اپنے کاروبار کو عالمی پیمانے کا بنانا چاہتا ہوں، نیز کمپنی کا ممبر بن کر مذکورہ بالا تعلیمات حاصل کرنا چاہتا ہوں، نیز ایجنٹ اس طریقے پر محنت کر کے کمپنی کے ویب سائٹ کے خریدار تیار کر کے اپنی محنت کے عوض کمپنی سے کمیشن لینا چاہتا ہوں، تو میرا یہ کمیشن لینا کیسا ہے؟ کیا شرعی اعتبار سے مجھے اجازت حاصل ہے یا نہیں؟ اُمید ہے کہ جواب سے مطلع فرمائیں گے۔

والسلام

محمد علی سیرگر

نگینہ محل، راندر، سورت

محمد کلیم لوہاروی

محمد اکرام الدین غفرلہ

عارف حسن عثمانی

خادم دارالافتاء اشرفیہ

خادم دارالافتاء اشرفیہ، راندر

خادم دارالافتاء دارالعلوم اشرفیہ راندر

جواب:- صورت مسئلہ میں ویب سائٹ خریدنا اور اس کمپنی کا ممبر بن کر تعلیم حاصل کرنا، نیز اس کمپنی کا ایجنٹ بن کر کمیشن حاصل کرنا جائز ہے، البتہ یہ تمام معاملات الگ الگ ہونے چاہئیں،^(۱) یعنی کمپنی کا ممبر بن کر تعلیم حاصل کرنا ایجنٹ بننے سے مشروط نہ ہو،^(۲) بلکہ تمام معاملات ایک دوسرے سے الگ ہوں۔^(۳)

واللہ سبحانہ اعلم

۱۴۲۱/۱۲/۲۵ھ

(فتویٰ نمبر ۳۸/۴۷۰)

مختلف کمپیوٹر سوفٹ ویئر خریدنے کا حکم

(جبکہ بعض سوفٹ ویئر ز چوری کے ہوتے ہیں)

سوال:- میں ایک کمپیوٹر سائنس کالج کا طالب علم ہوں، ہمیں سوفٹ ویئر کی اکثر ضرورت

رہتی ہے، اور نئے سے نئے کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ ہم کمپیوٹر اور انفارمیشن ٹیکنالوجی میں پوری دُنیا کے برابر چل سکیں، اس ضرورت کے پیش نظر ہم چند طلباء نے مل کر ایک سوسائٹی کے تحت یہ کام شروع کیا کہ ہم کالج کے پیسوں سے یا طلباء کے پیسوں سے مختلف اور نئے سوفٹ ویئر خرید کر طلباء کو مفت گھر میں Instalation کے لئے دیں، کیونکہ تمام طلباء یہ سوفٹ ویئر نہیں خرید سکتے اس کے لئے کالج نے اجازت اور سرمایہ بھی ہمیں دے دیا تھا، مگر چند لوگوں نے کہا کہ پاکستان میں استعمال ہونے والے سوفٹ ویئرز چوری کے (Pirated) ہوتے ہیں، پھر لوگ اس کی کاپیاں کر کے تقسیم کرتے ہیں، کیا تعلیم اور فلاح و بہبود کے لئے ایسا سوفٹ ویئر استعمال کرنا جائز ہے؟

جواب:- مکرم بندہ، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

کلی طور پر یہ کہنا تو ممکن نہیں کہ پاکستان میں استعمال ہونے والے تمام سوفٹ ویئرز چوری کے ہوتے ہیں، لہذا اس مفروضے پر خریداری کو بالکل نا جائز نہیں کہہ سکتے۔ جو شخص سوفٹ ویئر بیچ رہا ہے، اس بات کا ذمہ دار وہ خود ہے کہ وہ کہاں سے کس طرح لایا؟ جب تک ہمیں متعین طور پر یقین سے معلوم نہ ہو کہ یہ چوری کا ہے، ہم خرید سکتے ہیں۔^(۱)

والسلام

۱۴۲۰/۹/۲۵ھ

(۱) وفي فیض القدیر رقم الحدیث: ۸۴۴۳ ج: ۱۱ ص: ۵۶۵۳ (طبع مکتبہ مصطفیٰ الباز، الرياض) من اشترى سرقة وهو يعلم أنها سرقة فقد شرك في عارها واثمها.

وفي الشامية ج: ۵ ص: ۹۸ نقل الحموی عن سیدی عبدالوہاب الشعرانی أنه قال فی کتابہ المنن، وما نقل عن بعض الحنفیة من أن الحرام لا يتعدى ذمتين سألت عنه الشهاب بن الشلبی فقال هو محمول علی ما اذا لم يعلم بذلك، اما لو رای المکاس مثلاً یاخذ من أحد شیئاً من المکس ثم يعطيه آخر ثم یاخذ من ذلك الآخر فهو حرام. وفي أحكام المال الحرام ص: ۲۳۳ فمن علمت أنه سرقة أو خاثة فی أمانة لم یجز ان أخذه منه لا بطریق الهبة ولا بطریق المعاوضة الخ.

وفي الدر المختار ج: ۵ ص: ۹۸ الحرمة تتعدّد مع العلم بها ألا فی حق الوارث الخ.

وفي الهندیة ج: ۵ ص: ۳۶۴ كل عين قائمة يغلب علی ظنه أنهم أخذوها من الغير بالظلم وباعوها فی السوق فإنه لا ینبغی أن یشترى ذلك وان تداولتها الأیدی.

وفي خلاصة الفتاوى ج: ۴ ص: ۳۵۴ رجل علم بجارية أنها لرجل فرأى یبعتها ویقول وکلنی صاحبها بیعها وسعه أن یتاعها منه.

نیز ”چوری کے مال کی بیع“ سے متعلق دیکھئے: فتاویٰ رشیدیہ ص: ۴۹۹ (طبع سعید)۔

اخبار کا بل ایڈوانس دینے کی صورت میں اخبار کے ادارے کی طرف سے مختلف رعایتوں اور گاہک کی انشورنس کرانے کا حکم

سوال:- میں یہاں پر شائع کردہ انگریزی زبان کا اخبار روزانہ خریدتا ہوں، اس کی Payment کی صورت مندرجہ ذیل طریقے سے ہو سکتی ہے:-

ہر ماہ کے اختتام پر مہینہ کا بل دے دیا جائے۔

ہر ۳ ماہ کا ایڈوانس دے دیا جائے۔

ہر ۶ ماہ کا ایڈوانس دے دیا جائے۔

پورے ایک سال ایڈوانس دے دیا جائے۔

ان تینوں صورتوں میں اخبار والوں کی طرف سے دو سہولتیں ملتی ہیں، ۱- اخبار مجموعی طور پر سستا پڑتا ہے، ۲- اخبار والے بغیر کوئی اضافی رقم لئے اسی اخبار کے ایڈوانس میں اتنی ہی مدت کے لئے Accident Insurance کر لیتے ہیں، یعنی اگر موت کسی حادثے کی وجہ سے ہو جائے تو اخبار کی طرف سے لواحقین کو مخصوص رقم دے دی جاتی ہے۔ یہ طریقہ اخبار والوں نے اپنے اخبار کی Sale کو بڑھانے کے لئے کیا ہوا ہے، کیا اس ٹائپ کی Insurance کروانا جائز ہے؟ جہاں کہ کوئی اضافی Premium وغیرہ نہ دینا پڑے۔

ڈاکٹر ظہور احمد بمعرفت مولانا خلیل احمد صاحب

(ابوظہبی، متحدہ عرب امارات)

جواب:- اخبار کا بل ایڈوانس دینے کی صورت میں جو رعایت خریدار کو ملتی ہے، اس کی دو حیثیتیں ہیں، ایک حیثیت سے یوں کہا جاسکتا ہے کہ چونکہ خریدار نے ادارے کو رقم قرض دے دی ہے، اس لئے وہ قرض کے مقابلے میں رعایت دے رہا ہے، اس کا تقاضا یہ ہے کہ یہ رعایت جائز نہ ہو،^(۱) کیونکہ یہ ایک نفع ہے جو قرض سے حاصل کیا گیا۔^(۲) لیکن دوسری حیثیت یہ ہے کہ یہ رعایت قرض کی وجہ سے نہیں، بلکہ خریدار کے مستقل گاہک ہونے کی وجہ سے ہے، اور چونکہ یہ تاجروں کا طریقہ ہے کہ اپنے

مستقل گا کہوں کو رعایت دیا کرتے ہیں، اس لئے وہ یہ رعایت دے رہے ہیں اور پیشگی رقم کا مطالبہ یہ اطمینان حاصل کرنے کے لئے ہے کہ یہ شخص واقعہً مقررہ مدت تک اخبار خریدتا رہے گا۔ اس صورت میں یہ رعایت شرعاً جائز ہے،^(۱) اور مذکورہ معاملے میں احقر کو یہی صورت رائج معلوم ہوتی ہے،^(۲) تاجروں کا عرف اور علمائے عصر کا تعامل بھی اس کی تائید کرتا ہے،^(۳) لہذا احقر کے نزدیک رائج یہی ہے کہ اس رعایت کو لینے کی شرعاً گنجائش ہے۔ رہا انشورنس کا معاملہ! سواگر انشورنس کی یہ رقم اخبار کا ادارہ خود ادا کرتا ہے، اور یہ کسی بیمہ کمپنی سے وصول نہیں کرنی پڑتی، تو مذکورہ صورت میں اس کے لینے کی بھی گنجائش معلوم ہوتی ہے، کیونکہ اس انشورنس کے لئے اخبار کے خریدار نے کوئی پریمیم ادا نہیں کیا، یہ ایک طرفہ انعام ہے، اور اس کی مثال ایسی ہے جیسے مختلف تاجر اپنی مصنوعات کو فروغ دینے کے لئے ایک طرفہ طور پر مختلف انعامات کا اعلان کرتے رہتے ہیں، خریدار کو اپنی رقم کا پورا پورا معاوضہ خریدی ہوئی چیز کی صورت میں مل جاتا ہے، اور ملنے والا انعام تاجر کی طرف سے ایک طرفہ انعام ہوتا ہے۔^(۴)

البتہ اگر یہ رقم انشورنس کمپنی سے وصول کرنی پڑتی ہو، تو وہ دو وجہ سے ناجائز ہے، اول تو اس لئے کہ اس صورت میں اخبار کا ادارہ ضرور انشورنس کمپنی کو کوئی پریمیم ادا کرے گا، جس کا حاصل یہ ہے کہ وہ کمپنی کے ساتھ سود اور قمار کا معاملہ کرے گا، اور یہ رقم اس حرام معاملے کے نتیجے میں حاصل ہوگی، دوسرے یہ کہ انشورنس کمپنی کی بیشتر آمدنی سود یا قمار پر مشتمل ہوتی ہے، اس لئے اس سے رقم لینا بھی جائز نہ ہوگا۔

والسلام

۱۴۱۴/۱۱/۲۲ھ

(۱ تا ۳) وفي الشامية ج: ۳ ص: ۵۱۶ ولو أعطاه دراهم وجعل يأخذ منه كل يوم خمسة أمناء ولم يقل في الابتداء اشتریت منك يجوز وهذا حلال وان كانت نيته وقت الدفع الشراء لأنه بمجرد النية لا ينعقد البيع وانما ينعقد البيع الآن بالتعاطى والآن البيع معلوم فينعقد البيع صحيحاً قلت ووجهه ان ثمن الخبز معلوم فاذا انعقد بيعاً بالتعاطى وقت الأخذ مع دفع الثمن قبله... الخ. اور جب یہ رقم اخبارات کا ثمن ہے تو ثمن میں رعایت شرعاً جائز ہے۔

وفي الهندية ج: ۳ ص: ۱۷۱ (طبع رشيدية) الزيادة في الثمن والمثمن جائزة حال قيامهما... الخ (الباب السادس عشر في الزيادة في الثمن والمثمن والحط والبراء عن الثمن).

وفي الهداية ج: ۳ ص: ۸۰ (طبع رحمانيه) ويجوز للبائع أن يزيد للمشتري في المبيع ويجوز أن يحط عن الثمن ويتعلق الاستحقاق بجميع ذلك. وفي حاشيته لأن الزيادة لما التحقت بأصل العقد صارت كالموجودة عند العقد. نیز تفصیل کے لئے دیکھئے ص: ۱۱۳ کا فتویٰ اور اس کا حاشیہ نمبر ۴۔

(۴) وفي الهندية ج: ۳ ص: ۱۷۳ حط بعض الثمن صحيح ويلتحق بأصل العقد عندنا كالزيادة.... الخ. وفي شرح المجلة لخالدة الأتاسي ج: ۲ ص: ۱۸۲ رقم المادّة: ۲۵۶ حطّ البائع مقداراً من الثمن المسمّى بعد العقد صحيحٌ ومعتبرٌ وكذا حطّ جميعه..... وبعد أسطر..... وهذا اذا كان بلفظ الحطّ ومثله. وكذا في شرح المجلة. وكذا في الدر المختار ج: ۵ ص: ۱۵۴ فصل في التصرف في المبيع والثمن قبل القبض والزياره والحط فيها... الخ. وكذا في مجمع الأنهر شرح ملتقى الأبحر ج: ۴ ص: ۱۱۶.

کیا نفع کی شرعاً کوئی حد متعین ہے یا نہیں؟

سوال:- کیا کاروبار میں نفع کی کوئی حد شرعاً مقرر ہے؟ شرعی نقطہ نظر سے اگر کوئی شخص زیادہ

نفع لے تو یہ درست ہے؟

طلعت محمود، راولپنڈی

جواب:- کاروبار میں شرعاً نفع کی کوئی حد مقرر نہیں ہے،^(۱) البتہ دھوکا نہیں ہونا چاہئے، پھر

اپنے حالات کے لحاظ سے جتنا نفع کوئی لینا چاہے اس پر شرعاً کوئی پابندی نہیں ہے۔^(۲) والسلام

۱۴۱۱/۶/۲۸ھ

تجارتی انعامی اسکیموں کا شرعی حکم

حضرت مولانا مفتی عبدالواحد صاحب نے تجارتی انعامی اسکیموں سے متعلق درج ذیل مضمون لکھ کر حضرت والا دامت برکاتہم سے رائے طلب کرنے کے لئے ارسال فرمایا، جس کا حضرت والا دامت برکاتہم نے جواب تحریر فرمایا، مضمون اور اس پر حضرت والا دامت برکاتہم کی رائے درج ذیل ہے۔ (مرتب)

انعام وہ ہوتا ہے جو کسی مطلوب وصف پر حوصلہ افزائی کے لئے دیا جاتا ہے، مثلاً امتحان میں اوّل و دوم وغیرہ آنے پر انعام دیا جاتا ہے تاکہ علم میں جس کا سیکھنا مطلوب وصف ہے طلبہ کی حوصلہ افزائی کی جائے یا گھڑ دوڑ میں جو اوّل و دوم آئے اس کو انعام دیا جاتا ہے کیونکہ گھڑ دوڑ میں جہاد کی تربیت ہے اور یہ تربیت حاصل کرنا وصف مطلوب ہے، پیدل دوڑ اور تیراکی وغیرہ بھی جہاد کی تربیت کی نیت سے ہوں تو یہ بھی مطلوب ہیں۔

ولا بأس بالمسابقة في الرمي والفرس والبغل والحمار والابل وعلى الأقدام لأنه من أسباب الجهاد فكان مندوباً وعند الثلاثة لا يجوز في الأقدام أى بالجعل أما بدونه فيباح في كل الملاعب. (در مختار ج: ۵ ص: ۲۸۵).

(۱ و ۳) وفي سنن ابن ماجه باب من كره أن يسعر ص: ۱۵۹ (طبع قديمي كتب خانة) عن أنس بن مالك رضي الله عنه قال: غلا السعر على عهد رسول الله صلى الله عليه وسلم فقالوا: يا رسول الله! قد غلا السعر فسعر لنا، فقال: ان الله هو المسعر القابض الباسط الرّازق.

وفي الهدية ج: ۳ ص: ۱۳۱ (طبع رشيدية) من اشترى شيئاً وأغلى في ثمنه جاز الخ. وفي الهدية ج: ۴ ص: ۴۷۲ (طبع مكتبة رحمانية) ولا ينبغي للسلطان أن يسعر على الناس لقوله عليه السلام: لا تسعروا فإن الله هو المسعر القابض الباسط الرّازق. ولأن الثمن حق العاقد فاليه تقديره فلا ينبغي للامام أن يتعرض لحقه ألا إذا تعلق به دفع ضرر العامة.

وكذا في بدائع الصنائع ج: ۵ ص: ۱۲۹ والدر المختار ج: ۶ ص: ۳۹۹ (طبع سعيد) وفي البحوث في قضايا فقهاء معاصرة ص: ۸ وللبيع أن يبيع بضاعته بما شاء من ثمن ولا يجب عليه أن يبيعه بسعر السوق دائماً وللتجار ملاحظ مختلفة في تعيين الأثمان وتقديرها الخ.

(۲) حوالہ کے لئے دیکھئے ص: ۱۰۲ تا ص: ۱۰۴ کے حواشی۔

(قوله فيباح في كل الملاعب) أى التى تعلم الفروسية وتعين على الجهاد لأن جواز الجعل فيما مر انما ثبت بالحديث على خلاف القياس فيجوز ما عداها بدون الجعل وفى القهستانی عن الملتقط من لعب بالصولجان يريد الفروسية يجوز وعن الجواهر قد جاء الأثر فى رخصة المصارعة لتحصيل القدرة على المقاتلة دون التلهى فانه مكروه. (رد المحتار ج: ۶ ص: ۴۰۲).

حل الجعل وطاب ان شرط المال فى المسابقة من جانب واحد وحرم لو شرط فيها من الجانبين لأنه يصير قماراً ألا اذا ادخلا ثلاثاً محللاً بينهما بفارس كفؤ لفرسيهما يتوهم أن يسبقهما وألا لم يجز وكذا الحكم فى المتفقهة فاذا شرط لمن معه الصواب صح. (در مختار ج: ۶ ص: ۴۰۳) وان شرطاه لكل على صاحبه ولا والمصارعة ليست ببدعة ألا للتلهى فتكره وأما السباق بلا جعل فيجوز فى كل شىء (أى مما يعلم الفروسية ويعين على الجهاد بلا قصد التلهى (در مختار ورد المحتار ج: ۶ ص: ۴۰۳).

مذکورہ بالا ان عبارتوں کا حاصل یہ ہے کہ مسابقت یا تو علم میں مہارت حاصل کرنے میں جائز ہے یا صرف ان کاموں میں جائز ہے جن میں جہاد کی تربیت ہو اور وہ بھی جبکہ جہاد کی نیت سے ہو، اگر محض کھیل کود کے طور پر ہو تو اس وقت مسابقت اگرچہ بغیر انعام کے ہو مکروہ ہے، جہاد کی تربیت کو اتنی اہمیت حاصل ہے کہ اس کے لئے دوطرفہ انعام تک کو جائز رکھا، مگر قمار سے نکالنے کے لئے اس میں محلل کو داخل کیا۔

اب ہم کاروباری انعام کے بارے میں گفتگو کرتے ہیں۔

۱:- پہلی بات یہ ہے کہ زیادہ خریداری خواہ دکان دار کی ہو یا صارف کی، یہ کوئی وصف مطلوب نہیں ہے، اس میں نہ تو جہاد کی تربیت ہے، نہ علمی مہارت کی تحصیل ہے، اور نہ ہی کسی اور پسندیدہ خلق مثلاً خدمت خلق وغیرہ کی تحصیل ہے، لہذا اس میں مسابقت کی ترغیب دینا اصولی طور پر غلط بات ہے۔

۲:- دوسری بات یہ ہے کہ بائع جس کسی صورت میں بھی بیع میں اضافہ کرتا ہے خواہ وہ انعام کے نام سے ہو، وہ اصل بیع کا حصہ قرار پاتا ہے، اور مشتری قیمت میں جس نام سے بھی اضافہ کرے وہ اصل قیمت میں اضافہ شمار ہوتا ہے۔

وصح الزيادة فى المبيع ولزم البائع دفعها ان فى غير سلم زيلعى وقبل المشتري وتلتحق أيضاً بالعقد، فلو هلكت الزيادة سقط حصتها من الثمن وكذا لو زاد فى الثمن عرضاً فهلك قبل تسليمه انفسخ العقد بقدره. (در مختار ج: ۴ ص: ۱۸۷).

جب یہ بات واضح ہوئی کہ مزعومہ انعام کی صورت درحقیقت بیع یا ثمن میں کمی بیشی ہوتی ہے تو اس میں مندرجہ ذیل شرطوں کا لحاظ رکھنا ضروری ہے:-

۱:- انعام ایسی چیز ہو جو بیع اور ثمن بن سکے۔

۲:- اس کے وجود میں خطر و اندیشہ نہ ہو کہ نہ جانے ہو یا نہ ہو۔

۳:- اس کی مقدار میں جہالت یا تردد نہ ہو۔

اگر ایسی صورت پائی جائے کہ جس میں یہ تینوں شرطیں پائی جاتی ہوں تو وہ انعام صحیح ہوگا، اور اگر کوئی ایسی صورت ہو جس میں پہلی یا دوسری یا تیسری شرط یا تینوں ہی مفقود ہوں تو انعام صحیح نہ ہوگا۔
انعام صحیح ہونے کی مثال

لپٹن چائے کی پیکنگ کے اندر بسکٹ کی ایک چھوٹی پیکنگ ملتی رہی ہے، اسی طرح کسی ٹوتھ پیسٹ کے ساتھ دانتوں کا برش رکھ دیا جائے یا کسی فریج کے ساتھ ٹوسٹر یا سینڈوچ میکرو دیا جائے یا گھی کی مقدار میں ۲۰ فیصد اضافہ دیا جائے تو صحیح ہے کیونکہ یہ اشیاء بیع بھی بن سکتی ہیں اور ان کے وجود اور ان کی مقدار میں کسی قسم کی جہالت اور تردد نہیں ہے۔

انعام صحیح نہ ہونے کی مثالیں

۱:- پہلی شرط مفقود ہو

اس کی مثال یہ ہے کہ کمپنی والا یہ طے کرے کہ جو ہم سے اتنی مالیت کا سامان خریدے گا، ہم اس کو عمرہ کرائیں گے یا ہم اس کو ڈرائیور سمیت گاڑی فراہم کریں گے جس پر وہ مری کی سیر کے لئے جاسکتا ہے۔ ان صورتوں میں کمپنی منافع مہیا کر رہی ہے جن پر اجارہ ہوتا ہے بیع نہیں ہوتی، لہذا وہ بیع بننے کی صلاحیت نہیں رکھتے، اس لئے یہ انعام بھی درست نہیں ہے۔

۲:- دوسری شرط مفقود ہو

اس کی مثال یہ ہے کہ کمپنی دکان داروں سے یا کوئی بھی بائع اپنے خریداروں سے کہے کہ جو لوگ اتنا اتنا سامان خریدیں گے ہم ان کو کوپن دیں گے اور ان کے درمیان قرعہ اندازی کریں گے جس کے ذریعے صرف ان خریداروں کو انعام ملے گا جن کے نام کا قرعہ نکلے گا۔ اس صورت میں ہو سکتا ہے کہ زید کے نام کا قرعہ نکلے اور ہو سکتا ہے کہ نہ نکلے۔

۳:- تیسری شرط مفقود ہو

اس کی مثال یہ ہے کہ کمپنی دکان داروں سے کہے کہ جو ہم سے اتنا سامان خریدیں گے ہم سب کو انعام دیں گے، لیکن قرعہ اندازی سے خریداروں کو کم و بیش مالیتوں کے انعام دیں گے۔

۴:- تینوں شرطیں مفقود ہوں

اس کی مثال یہ ہے کہ کمپنی اپنے خریداروں سے کہے کہ جو کوئی ہم سے اتنی اتنی خریداری

کرے گا ہم اس کو کوپن دیں گے، اور پھر قرعہ اندازی کریں گے، جس کے نام کا قرعہ نکلے گا اس کو ہم عمرہ کرائیں گے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ ہم سعودیہ آنے جانے کا اور وہاں رہائش کا بندوبست کریں گے، لیکن اس کو ٹکٹ نہیں دیں گے۔

۳:- تیسری بات یہ ہے کہ چونکہ انعام مشروط ہوتا ہے اور بعض صورتوں میں شرط فاسد ہوتی ہے تو اس سے سودا بھی فاسد ہو جاتا ہے۔

۱- جب کمپنی کے اعلان کے مطابق خریدار سامان خریدتے ہوئے یوں کہے کہ میں اس شرط پر اتنا سامان خریدتا ہوں کہ آپ کو مجھے عمرہ کرانا ہوگا یا مری کی سیر کے لئے گاڑی فراہم کرنا ہوگی، چونکہ یہ شرط سودے کے تقاضے کے خلاف ہے اور اس میں خریدار کا فائدہ ہے، لہذا یہ شرط فاسد ہے، اور اس کی وجہ سے سارا سودا ہی فاسد ہو جاتا ہے، اور بائع اور خریدار دونوں گناہگار ہوتے ہیں، اور دونوں پر لازم ہے کہ وہ اس سودے کو ختم کریں اور اگر چاہیں تو اس شرط کے بغیر نئے سرے سے سودا کریں۔

۲- انعامی اسکیم یہ ہو کہ جو اتنا سودا خریدے گا اس کو کار کی قرعہ اندازی میں شریک کیا جائے گا، اب جو شخص اس انعامی اسکیم کے مطابق سودا خریدتا ہے اور کوپن بھر کر دیتا ہے تو جیسا کہ ہم نے اوپر ذکر کیا کار بھی بیع کا حصہ بنے گی لیکن چونکہ یہ معلوم نہیں کہ وہ ملے گی یا نہیں، اس لئے بیع کی مقدار بھی مجہول ہے، اس لئے اس میں قمار کے ساتھ بیع بھی فاسد ہوئی۔

تنبیہات

۱- بعض اوقات کمپنی کے ملازم، خریدار کو کہتے ہیں کہ اگر تمہیں اس انعامی اسکیم میں کچھ تردد ہے تو ہم تمہاری طرف سے کوپن خود بھر دیتے ہیں، اور اس کو قرعہ اندازی میں شامل کر دیتے ہیں۔ کمپنی کے ملازم کے اس طرح کرنے سے قباحت میں کچھ کمی نہیں آتی کیونکہ جب انہوں نے کہا کہ ہم کوپن خود بھر دیتے ہیں تو وہ خریدار کے وکیل بن گئے اور وکیل کا تصرف مؤکل کی طرف منسوب ہوتا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ جب یہ ایک منکر ہے تو اس وقت ملازموں کے کہنے پر خاموشی درست نہیں بلکہ نہی کرنا واجب ہے۔

۲- کمپنیوں والے جو اتنے بیش قیمت انعامات دکان داروں کو دیتے ہیں یہ سرمایہ دارانہ نظام کا طریقہ ہے، اصل ہمدردی تو صارف سے ہونی چاہئے کہ اس کو رعایت ملے، ورنہ دکان داروں کو دیئے گئے انعامات کا بوجھ بھی بالآخر صارفین پر پڑے گا، کیونکہ عام طور سے انعامات کو بھی اخراجات میں شمار کر کے اشیاء کی قیمت طے کی جاتی ہے۔

۳- بعض اوقات کمپنی والے اپنی مصنوعات کی کسی ایک یا چند ایک پیکنگ میں انعامی پرچی

رکھ دیتے ہیں تاکہ لوگ اس انعام کے لالچ میں زیادہ خریداری کریں، چونکہ وہ انعام کسی ایک کا یا چند ایک کا نکلنا ہے اس لئے ہر خریدار کے لئے اس انعام کے نکلنے کا وجود خطر و اندیشہ کا شکار ہے، اور چونکہ جوئے کے معنی میں یہ بات شامل ہوتی ہے اس لئے جو خریدار اس موہوم انعام کے لالچ میں وہ سامان خریدتا ہے وہ ایک درجے میں جوا کرتا ہے۔

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ اسی کی مثل ایک صورت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ”مختلف قسم کی نمائشوں کے اندر داخلے کا ٹکٹ ہوتا ہے، اور نمائش کے منتظمین یہ اعلان کرتے ہیں کہ جو شخص مثلاً دس روپے کا ٹکٹ یک مشت خریدے گا وہ اپنے اس ٹکٹ کے ذریعے عام لوگوں کی طرح نمائش میں بھی داخل ہو سکے گا اور ان ٹکٹوں پر بذریعہ قرعہ اندازی کچھ انعام مقرر ہوتے ہیں، جس کا نمبر نکل آئے اس کو وہ انعام بھی ملتا ہے۔

یہ صورت صریح قمار سے تو نکل جاتی ہے کیونکہ ٹکٹ خریدنے والے کو اس ٹکٹ کا معاوضہ بصورت داخلہ نمائش مل جاتا ہے، لیکن اب مدارنیت پر رہ جاتا ہے، جو شخص موہوم انعام کی غرض سے یہ ٹکٹ خریدتا ہے وہ ایک گونہ قمار کا ارتکاب کر رہا ہے“ (جواہر الفقہ ج: ۲ ص: ۳۵۱)۔

ایک شخص نے ایسی کوئی شے خریدی اور اس میں انعامی پرچی نکل آئی جبکہ اس کو پرچی اسکیم کا علم تھا اور اگر علم نہ تھا تو اس نے شے کو اپنی ضرورت سے خریدا تھا، انعام کے لالچ میں نہیں خریدا تھا، اس صورت میں بھی اس شخص کو اس پرچی پر انعام لینا جائز نہیں، کیونکہ ایک تو اس میں ناجائز اسکیم کے ساتھ تعاون اور شراکت ہے اور دوسرے نیت تو ایک مخفی چیز ہوتی ہے لہذا حکم اس پر نہیں لگتا بلکہ ظاہر پر لگتا ہے، اور ظاہر یہ ہے کہ جب یہ انعام وصول کر رہا ہے تو اسی کے لئے اس نے شے خریدی ہوگی۔ واللہ تعالیٰ اعلم

عبدالواحد

(حضرت والا دامت برکاتہم کا جواب)

جواب:- گرامی قدر مکرم جناب مولانا مفتی عبدالواحد صاحب زید مجدکم السامی

آپ کا مضمون ”تجارتی انعامی اسکیموں کا شرعی حکم“ دارالافتاء کے توسط سے بندے کو موصول ہوا، آنجناب نے چونکہ فرمائش کی ہے کہ اس پر اپنی رائے کا اظہار کروں، اس لئے عرض ہے کہ بندے کے خیال میں یہ انعام زیادة فی المبیع نہیں ہے، بلکہ ایک ہبہ متبداء کا ایک طرفہ وعدہ ہے۔ بائع اور مشتری میں سے کوئی بھی اسے زیادة فی المبیع نہیں سمجھتا، نہ عرف عام میں اسے زیادة فی المبیع سمجھا جاتا ہے، اور شرعاً بھی یہ ضروری نہیں ہے کہ بیع تام ہونے کے بعد جب بھی بائع مشتری کو کوئی چیز بلا قیمت دے تو اسے زیادة فی المبیع قرار دیا جائے، نیز یہ بھی ضروری نہیں کہ انعام ہمیشہ مسابقت پر ہی دیا جائے،

نہ یہ ضروری ہے کہ جو ہبہ انعام کے نام سے کیا جائے وہ مسابقت کی مشروع صورتوں سے منسلک ہو^(۱)

آنجناب نے ”جواہر الفقہ“ کی عبارت پر جو اشکال فرمایا ہے کہ: ”نیت تو ایک مخفی چیز ہے لہذا حکم اس پر نہیں لگتا“ اس سلسلے میں عرض یہ ہے کہ قضاء کا حکم تو واقعی اکثر نیت پر نہیں لگتا، لیکن دیانت کے بہت سے احکام نیت پر موقوف ہیں، کما لا یخفی علیکم، مثلاً کوئی چیز جو معصیت اور غیر معصیت دونوں میں استعمال ہو سکتی ہو اسے بہ نیت معصیت خریدنا ناجائز ہے، اور نیت معصیت کی نہ ہو تو جائز^(۲) اور ”جواہر الفقہ“ میں حکم دیانت ہی کا بیان فرمایا گیا ہے، قضاء کا نہیں۔

لہذا آنجناب کی تحریر بار بار پڑھنے اور غور کرنے کے باوجود صحیح بات وہی معلوم ہوتی ہے جو حضرت والد صاحب قدس سرہ نے ”جواہر الفقہ“ میں تحریر فرمائی ہے۔

واللہ سبحانہ اعلم

بندہ محمد تقی عثمانی

۱۴۲۸/۴/۲۱ھ

(فتویٰ نمبر ۳۷/۹۶۱)

(۱) انعام کا کسی مسابقت یا مسابقت مشروع کے ساتھ مختص و منسلک ہونا ضروری نہیں جیسا کہ انعام سے متعلق درج ذیل عبارات سے واضح ہے: فی مجموعة قواعد الفقہ ص: ۱۹۴ والانعام بالكسر عرفا الارض التي أعطاها السلطان أو نائبه. فی القاموس الفقہی ص: ۷۳ الجائزة العطية.

فی تاج العروس ج: ۴ ص: ۱۹ الجائزة العطية من اجاز یجیز اذا أعطاه وأصلها ان أمیراً وافق عدوا بينهما نهر فقال: من جاز هذا النهر فله كذا، فكلما جاز منهم واحداً أخذ جائزة. وقال أبو بكر فی قولهم أجاز السلطان فلانا بجائزة. أصل الجائزة أن يعطى الرجل الرجل ماء ويحيره ليذهب لوجهه فيقول الرجل اذا ورد ماء لقيم الماء اى أعطنى ماء حتى اذهب لوجهى وأجوز عند ثم كثر هذا حتى العطية جائزة فقال الجوهرى اجاهزه بجائزة سنية أى بعتاء ومن المجاز الجائزة التحفة واللفظ ومثله فى جمهرة اللغة.

فی القاموس المحيط ج: ۴ ص: ۲۵۶ أنعمهما الله تعالى عليه وأنعم بها ونعيم الله تعالى عطيته ونعم الله تعالى بك كسمع ونعمك وأنعم بك عينا أقر بك عين من تحبه أو أقر عينك بمن تحبه. وفيه ج: ۲ ص: ۲۴۳ الجائزة العطية والتحفة واللفظ ومقام الساقى من البشر.

فی روح المعانی ج: ۱ ص: ۲۵۸ والانعام ایصال الاحسان الى الغير من العقلاء كما قاله الراغب فلا يقال أنعم على فرسه ولذا قيل ان النعمة نفع الانسان من دونه بغير عوض.

فی البيضاوى ج: ۱ ص: ۴۰ (طبع رحمانیہ) والانعام ایصال النعمة وهى فى الأصل الحالة التى يستلذه الانسان فأطلقت لما يستلذها من النعمة وهى اللين.

فی البحوث لشيخنا العثماني حفظه الله ورعاه ج: ۲ ص: ۲۲۹ وان مثل هذه الجوائز التى تمنح على أساس عمل عمله أحد لا تخرج عن كونه تبرعا وهبة لأنها ليس لها مقابل وان العمل الذى عمله الموهوب له لم يكن على أساس الاجارة أو الجعالة حتى يقال ان الجائزة أجرة لعمله وانما كان على أساس الهبة للتشجيع وجاء فى الموسوعة الفقهية (الكويتية) الأصل اباحة الجائزة على عمل مشروع سواء كان دينياً أو دنيوياً لأنه من باب الحث على الخير والاعانة عليه بالمال وهو من قبيل الهبة.

نیز ”انعام“ سے متعلق مزید تفصیلات کے لئے حضرت والا دامت برکاتہم کی کتاب بحوث فى قضايا فقهية معاصرة میں رسالہ ”احکام الجوائز“ ج: ۲ ص: ۲۴۳ تا ۲۴۴ ملاحظہ فرمائیں۔

(۲) وفى قاضى خان ج: ۲ ص: ۲۸۱ ويكره أن يبيع المكعب المفصض من الرجال اذا علم أنه يشتري ليلبس الخ. نیز دیکھئے ص: ۸۳ تا ۸۶ کے حواشی۔

فروختگی کے لئے وکیل کو دیا ہوا سامان چوری ہو جائے تو نقصان وکیل کا ہوگا یا مالک کا؟

سوال:- زید نے مبلغ دس ہزار کی شکر بازار سے خرید کر بکر آڑھتی کی دکان کرایہ پر اس کے اندر جمع کر دی، اور بکر سے کہہ دیا کہ بازار جب مہنگا ہو تو اس کو فروخت کر دینا، میں آپ کو کمیشن دے دوں گا۔ دکان کی چابی بھی زید نے بکر کے سپرد کر دی تو اب اس آڑھت سے شکر تقریباً آٹھ بوری چوری ہو گئی، تو اس کا تاوان زید پر ہوگا یا بکر پر؟ جبکہ یہ تمام شکر بکر کے قبضے میں ہو اور بازار کا قانون یہ ہے کہ جو چیز آڑھتی کے قبضے سے چوری ہو اس کا ذمہ دار آڑھتی ہوگا مالک نہیں ہوگا، شرعاً کیا حکم ہے؟

جواب:- صورتِ مسئلہ میں اگر چوری بکر کی بے احتیاطی کی وجہ سے نہیں ہوئی تو نقصان کا بار زید پر ہوگا، اور اگر بکر کی بے احتیاطی کی وجہ سے چوری ہوئی تو وہ نقصان کا ذمہ دار ہوگا، کیونکہ وہ وکیل بالبیع ہے، اور وکیل کا قبضہ قبضِ امانت ہوتا ہے۔^(۲) اور اگر بازار میں شکر کی قلت ہو تو اس طرح کی ذخیرہ اندوزی کرنا سخت گناہ ہے۔^(۳)

واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۷/۱۱/۴ھ

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع عفی عنہ

(فتویٰ نمبر ۱۳۵۷/۱۸ الف)

کاروبار بیچنے کے بعد مشتری کی طرف سے مقررہ مدت تک ثمن ادانہ کرنے کی صورت میں بیع کو فسخ کیا جاسکتا ہے یا نہیں؟

سوال:- اگر ایک شخص دوسرے کو کاروبار بیچے لیکن مشتری نے مقررہ مدت تک مکمل ثمن یا اس کا کچھ حصہ ادا نہیں کیا، جبکہ وہ دیوالیہ بھی نہیں ہوا ہے، تو چونکہ مشتری نے معاہدہ توڑ دیا ہے تو کیا بائع کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ بیع کو فسخ کرے اور اس کے نتیجے میں اپنا کاروبار واپس لے لے، اور ثمن کا

(۲۱) حوالہ کے لئے دیکھئے شرح المجلة لسليم رستم باز ص: ۷۸۴ رقم المادة: ۱۴۶۳ و ص: ۴۳۶ رقم المادة: ۷۸۷ (طبع مكتبة حنفية كوئٹہ)۔

(۳) وفي شعب الايمان للبيهقي ج: ۱۳ ص: ۵۱۱ رقم الحديث: ۱۰۷۰۲ عن معاذ بن جبل رضي الله عنه قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: بنس العبد المحتكر اذا رخص الله الاسعار حزن واذا غلى فرح.

وفي المستدرک على الصحيحين للحاكم ج: ۲ ص: ۱۴ کتاب البیوع رقم الحديث: ۲۱۶۴ قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: المحتكر ملعون، وكذا في مصنف عبد الرزاق، باب الحكرة ج: ۸ ص: ۲۰۴ رقم الحديث: ۱۳۸۹۳.

وفي الدر المختار ج: ۶ ص: ۳۹۸ وكره احتكار قوت البشر كتين وعنب ولوز والبهايم في بلد يضر بأهله.

وفي الهداية ج: ۴ ص: ۳۹۸ ويكره الاحتكار في اقوات الآدميين والبهايم اذا كان ذلك في بلد يضر الاحتكار بأهله.

وكذا في البدائع للکاسانی ج: ۵ ص: ۱۲۹ وخلاصة الفتاوى ج: ۴ ص: ۳۵۳ والبحر الرائق ج: ۸ ص: ۲۰۲.

جتنا حصہ وصول کر چکا ہے وہ مشتری کو واپس لوٹا دے؟ مثال کے طور پر بائع نے ایک کروڑ روپے کا کاروبار بیچا اور مشتری نے اس پر قبضہ بھی کر لیا لیکن مقررہ مدت تک مکمل ثمن یا اس کا کچھ حصہ ادا نہیں کیا جبکہ وہ دیوالیہ بھی نہیں ہوا ہے، تو چونکہ مشتری نے اس معاہدے کے مطابق ثمن ادا نہیں کیا تو کیا یہ جائز ہے کہ بائع بیع کو فسخ کر کے اپنی بیع (کاروبار) واپس لے لے اور جتنا ثمن اس نے وصول کیا ہے وہ مشتری کو واپس لوٹا دے؟ مجھے اس کے جواز کی کوئی عبارت فقہاء کے کلام میں نہیں ملی ہے، کیونکہ جب بیع مکمل ہوگئی تو بائع کا حق صرف ثمن میں باقی ہے اور وہ کاروبار بائع کی ملکیت سے نکل کر مشتری کی ملکیت میں منتقل ہو گیا ہے، لہذا بائع کے لئے اسے واپس لینا جائز نہیں۔ برائے مہربانی یہ وضاحت کیجئے کہ کیا ایسا کرنا بائع کے لئے جائز ہے؟

المستفتی

ایم ایس عمر ایڈووکیٹ

ڈربن، جنوبی افریقہ

جواب:- اگر کسی چیز کے بیچنے وقت عقد میں یہ شرط لگائی جائے کہ: ”اگر خریدنے والے نے مقررہ مدت تک کل رقم یا اس کا کچھ حصہ ادا نہیں کیا تو یہ بیع ختم ہو جائے گی“ تو یہ صورت ”خیار النقص“ کی ہے اور بیع میں یہ شرط لگانا جائز ہے، اور یہ شرط اپنے وقت پر مؤثر بھی ہوگی، چنانچہ فقہائے کرام رحمہم اللہ نے فرمایا ہے کہ اگر خریدنے والے نے مقررہ مدت تک کل رقم یا اس کا کچھ حصہ ادا نہیں کیا تو یہ بیع فاسد ہو جائے گی^(۱) اور خریدنے والے اور بیچنے والے دونوں پر واجب ہوگا کہ اس بیع کو فسخ کریں^(۲)، لہذا ایسی صورت حال میں اگر وہ بیع اس حالت پر باقی ہو جس حالت میں اسے بیچا گیا تھا تو ایسی صورت میں بائع کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ بیع خریدنے والے سے واپس لے لے اور ثمن کا جتنا حصہ اس نے وصول کیا ہے وہ خریدنے والے کو واپس لوٹا دے۔

تاہم اگر بیع میں ”خیار النقص“ کی شرط نہ لگائی جائے تو ایسی صورت میں بیچنے والے کے لئے ایک طرفہ طور پر بیع کو فسخ کرنا اور بیع کو خریدنے والے سے واپس لینا جائز نہیں کیونکہ جب ایک بار طرفین کی رضامندی کے ساتھ ایجاب و قبول ہو کر بیع مکمل ہو جائے تو فریقین میں سے کسی کے لئے بھی ایک طرفہ طور پر بیع کو فسخ کرنے کا حق حاصل نہیں رہتا بلکہ ایسی صورت میں بیچنی ہوئی چیز خریدنے والے کی ملکیت میں منتقل ہو جاتی ہے اور بیچنے والے کا حق صرف ثمن میں باقی رہتا ہے، جس کی ادائیگی پر وہ خریدنے والے کو مجبور کرے گا، لیکن اگر اس کے باوجود وہ ثمن ادا نہ کرے تو ایسی صورت میں بیچنے والے کو دو اختیار حاصل ہیں:-

۱:- خریدنے والے کو راضی کر کے اصل ثمن پر اقالہ کرے۔

۲:- ثمن کی وصول یابی کے لئے اس کے خلاف مقدمہ دائر کرے۔

البتہ حضرت مولانا مفتی رشید احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ”أحسن الفتاویٰ“ ج: ۲ ص: ۵۳۳ میں تحریر فرمایا ہے کہ: ”بلکہ بدون شرط بھی جب مشتری سے ثمن کا وصول کرنا متعذر ہو جائے تو بائع کو فسخ بیع کا حق حاصل ہے“ ان کے اس فتویٰ کی بنیاد صاحب ہدایہ علامہ مرغینانی رحمہ اللہ کی مذکورہ عبارت ہے:-

ولأنه لما تعذر استيفاء الثمن من المشتري فات رضا البائع، فيستبد
(۱) بفسخه. (هداية ج: ۳ ص: ۱۱۵)

ترجمہ:- جب مشتری سے ثمن کا وصول کرنا متعذر ہو جائے تو اس بیع میں بائع کی رضامندی فوت ہوگئی ہے، لہذا بائع کو بیع کے فسخ کرنے کا حق حاصل ہے۔

لیکن درحقیقت صاحب ہدایہ کی مذکورہ عبارت سے ذکر کردہ مسئلے پر استدلال کرنے میں تسامح معلوم ہوتا ہے، کیونکہ صاحب ہدایہ کی یہ عبارت خاص اس صورت حال سے متعلق ہے جس میں خریدنے والے نے اس بات سے انکار کر دیا ہو کہ وہ بائع سے بیع خرید چکا ہے، جس کا مطلب یہ ہوا کہ بیع پہلے ہی خریدنے والے کو تسلیم نہیں ہے، لہذا اگر بیچنے والا بھی ثمن وصول نہ ہونے کی وجہ سے اس بیع کو ختم کر دے تو یہ فسخ فریقین کی طرف سے ہو جائے گا جو کہ معتبر ہے۔ لیکن ایک طرفہ طور پر بیع کو فسخ کرنا صاحب ہدایہ علامہ مرغینانی رحمہ اللہ کے نزدیک بھی جائز نہیں، چنانچہ صاحب ہدایہ نے اسی صفحے پر آگے جا کر یہ بیان فرمایا ہے کہ جب بیع ایک بار مکمل ہو جائے تو بائع اور مشتری دونوں میں سے کسی کو بھی ایک طرفہ طور پر بیع کو فسخ کرنے کا حق حاصل نہیں ہے، عبارت درج ذیل ہے:-

لأن أحد المتعاقدين لا يتفرد بالفسخ كما لا يتفرد بالعقد.
(۲) (هداية ج: ۳ ص: ۱۱۵)

ترجمہ:- متعاقدين میں سے کوئی ایک ایک طرفہ طور پر بیع کو فسخ نہیں کر سکتا جس طرح ان دونوں میں سے کوئی ایک ایک طرفہ طور پر عقد نہیں کر سکتا۔

اس کے برخلاف آپ نے سوال میں جس صورت حال کو ذکر کیا ہے وہ بالکل ہی مختلف ہے، اس میں نہ تو مشتری نے کاروبار کے بائع سے خریدنے سے انکار کیا ہے اور نہ اس نے بائع کو بیع کے فسخ کرنے کی پیشکش کی ہے، بلکہ وہ صرف وقت مقررہ پر ثمن ادا نہیں کر سکا ہے، ایسی صورت حال میں بائع

(۱) کتاب ادب القاضی ج: ۳ ص: ۱۵۳ (طبع مکتبہ رحمانیہ)۔

(۲) کتاب ادب القاضی ج: ۲ ص: ۱۵۴ (طبع مکتبہ رحمانیہ)۔

کے لئے ایک طرفہ طور پر بیع کو فسخ کرنے کا حق حاصل نہیں ہے، الا یہ کہ بیع کرتے وقت خيار النقد کی شرط لگائی جائے، جس کی تفصیل اوپر ذکر کی جا چکی ہے۔

فی شرح المجلة ج: ۲ ص: ۲۵۷

المادة: ۳۱۳ اذا تبایعا علی ان یؤدی المشتري الثمن فی وقت کذا وان لم یؤده فلا بیع بينهما صح البیع، وهذا یقال له خيار النقد (الی قوله) وان بین المدة أكثر من ثلاثة أيام، قال أبو حنیفة رحمه الله: البیع فاسد، وقال محمد رحمه الله: البیع جائز. وفي البحر عن غایة البیان ان أبا یوسف مع الامام فی قوله الأول والذي رجع الیه انه مع محمد، وقد اختارت جمعية المجلة قول محمد رحمه الله مراعاة لمصلحة الناس فی هذا الزمان، كما صرحت بذلك فی تقريرها المتقدم للمرحوم عالی باشا الصدر الأعظم.^(۱)

فی شرح المجلة لسلم رستم باز ص: ۱۶۶

المادة: ۳۱۴ اذا لم یؤد المشتري الثمن فی المدة المعینة كان البیع الذي فیہ خيار النقد فاسداً^(۲) ولكل من العاقدین فسخه اذا بقى المبیع علی حاله.

وفي الكفاية بهامش فتح القدير ج: ۶ ص: ۴۲۱

والعلامة النسفی ذکر فی الکافی اشکالاً فی هذا الموضع فقال ذکر فی الهدایة لأن أحد المتعاقدين لا یتفرد بالفسخ كما لا یتفرد بالعقد لأنه حقهما فبقى العقد فعمل التصدیق وذكر قبله ولأنه لما تعذر استيفاء الثمن من المشتري فات رضا البائع فیستبد بفسخه، والتوفیق بین کلامیه صعب، قلت لا تناقض بین کلامیه فیحتاج الی التوفیق لأن مراده بقوله لأن أحد المتعاقدين لا یتفرد بالفسخ فیما اذا كان الآخر علی العقد معترفاً به كما اذا قال أحدهما اشتریت وأنکر الآخر لا یكون انکاره فسخاً للعقد، اذ لا يتم به الفسخ وفيما اذا قال اشتریت منی هذه الجارية وأنکر فالمدعی للعقد هو البائع والمشتري ينکر العقد والبائع بانفراده علی العقد فیستبد بفسخه أيضاً.^(۳)

(۱) رقم المادة: ۳۱۳ ج: ۲ ص: ۲۵۷ (طبع مکتبه حبیبہ کوئٹہ).

(۲) شرح المجلة للأناسی رقم المادة: ۳۱۴ ج: ۲ ص: ۲۵۸ (طبع مکتبه حبیبہ کوئٹہ).

(۳) طبع رشیدیہ کوئٹہ.

وفی بدائع الصنائع ج: ۵ ص: ۳۰۶

وأما بيان ما يرفع حكم البيع فنقول وبالله التوفيق حكم البيع نوعان، نوع يرتفع بالفسخ وهو الذي يقوم برفعه أحد العاقلين وهو حكم كل بيع غير لازم كالبيع الذي فيه أحد الخيارات الأربع والبيع الفاسد ونوع لا يرتفع إلا بالاقالة وهو حكم كل بيع لازم وهو البيع الصحيح الخالي عن الخيار.^(۱)

والله سبحانه وتعالى اعلم

۱۳۲۷/۵/۳ھ

(فتویٰ نمبر ۸۷۳/۳۹)

ہاؤس بلڈنگ فنانس کارپوریشن سے جائیداد خریدنے کا حکم

سوال:- مولانا مفتی عبدالواحد صاحب نے حضرت والا دامت برکاتہم کی خدمت میں ایک سوال بھیجا جس میں انہوں نے ہاؤس بلڈنگ فنانس کارپوریشن کے تفصیلی طریقہ کار کا ذکر فرما کر حضرت سے رائے دریافت کی، یہ سوال ریکارڈ میں موجود نہیں، مگر جواب سے سوال کی وضاحت ہو جاتی ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ H.B.F.C کے تفصیلی طریقہ کار کی روشنی میں اس سے جائیداد خریدنا یا بنوانا جائز ہے یا نہیں؟ حضرت والا دامت برکاتہم کا جواب درج ذیل ہے۔ (مرتب)

جواب:- ہاؤس بلڈنگ فنانس کارپوریشن جس طریق کار پر عمل کر رہی ہے، اس کا جائزہ^(۲) لینے کے بعد دارالعلوم اور احقر کی طرف سے جو فتویٰ دیا جا رہا ہے، وہ یہی ہے کہ یہ معاملہ بحیثیت مجموعی جائز نہیں۔

آپ نے جو مسائل اٹھائے ہیں، ان میں سے دو مسئلے تو ایسے ہیں جن کا شرعاً کوئی جواز نہیں ہے، ایک شریک سے ابتدائے معاملہ میں فیس وصول کرنا، اور دوسرے عدم ادائیگی کے نوٹس کی قیمت رقم کے تناسب سے مقرر کرنا

البتہ جہاں تک معدوم کے اجارے یا معدوم کی بیع کا تعلق ہے، اس کے بارے میں ہمارے ذہن میں جو صورت تھی وہ یہ تھی کہ یہ ”شرکت ملک“ (نہ کہ شرکت عقد) قرار دے کر شرکت، اجارہ اور بیع، تینوں عقود الگ الگ اپنے اپنے وقت پر کئے جائیں۔ البتہ شروع میں فریقین کے درمیان ایک

(۱) طبع سعید.

(۲) H.B.F.C کے ذریعے جائیداد خریدنے اور بنوانے کے بارے میں ۱۳ جمادی الاولیٰ ۱۴۰۳ھ کو جامعہ دارالعلوم کراچی میں مجلس تحقیق مسائل حاضرہ کا اجلاس ہوا، جس میں طویل غور و فکر کے بعد عدم جواز کا فیصلہ کیا گیا تھا، جس کی تفصیل حضرت والا دامت برکاتہم کے جواب میں مذکور ہے۔

معاهدہ طے پا جائے کہ فلاں تاریخ سے ”شرکتِ ملک“ منعقد ہوگی، اس کے بعد فلاں تاریخ یا فلاں مرحلے پر ”اجارہ“ ہوگا، اور فلاں تاریخ یا فلاں مرحلے پر بیع بالاقساط ہوگی۔ پھر ان میں سے ہر عقد اپنے اپنے وقت پر انجام پائے۔ معاہدے کی حیثیت میں فریقین پر لازم ہو کہ وہ معینہ اوقات پر ان عقود کا انشاء کریں۔ اس صورت کے جواز پر بہت سے علماء اور مفتی حضرات سے مشورہ بھی کر لیا گیا تھا۔ لیکن جب عملاً یہ اسکیم نافذ کی گئی ہے تو یہ شرائط بھی ملحوظ نہ رہ سکیں۔ چنانچہ اس اسکیم کے اجراء کے بعد احقر نے مالیاتی اداروں کے ایک اجتماع میں جس میں ایچ بی ایف سی کے سربراہ بھی موجود تھے یہ مسائل اٹھائے، لیکن جو غلط طریق کار چل نکلا تھا، وہ بدل نہیں سکا۔ احقر کئی سال سے مالیاتی اداروں کے طریق کار کے درست کرنے کے لئے کوشاں ہے، لیکن ابھی تک کامیابی نہیں ہوئی۔^(۱)

جو صورت احقر نے اوپر لکھی ہے، اس پر اپنی رائے سے بھی مطلع فرمائیں، اور اگر ایچ بی ایف سی کو کسی اور بہتر طریق پر چلانا آپ کی رائے میں ممکن ہو تو اس سے بھی احقر کو آگاہ فرمائیں۔ احقر چونکہ ان مسائل پر کام کرتا رہتا ہے اس لئے آپ کی رائے اور تجاویز احقر کی رہنمائی کریں گی۔
جزاکم اللہ تعالیٰ۔

والسلام

۲۰ ربیع الاول ۱۴۰۷ھ



(۱) گزشتہ صفحے کا حاشیہ نمبر ۲ ملاحظہ فرمائیں۔

﴿کتاب الربوا والقمار﴾

﴿والتأمين﴾

(سود، جوئے اور انشورنس وغیرہ سے متعلق مسائل)

﴿فصل فی الربوا وأحكام ربوا البنوك﴾

والمؤسسات المالية الحديثة ﴿﴾

(سود کے احکام اور مختلف بینکوں اور جدید مالیاتی اداروں سے متعلق مسائل کا بیان)

- ۱:- حربی یا ذمی کافروں سے سود لینے کا حکم
- ۲:- حفاظت کی غرض سے بینک میں رقم رکھوانے کا حکم اور اس کی صورت
- ۳:- بینک کے سود کا حکم

سوال ۱:- کیا حربی یا ذمی کافروں سے سود لینا جائز ہے یا نہیں؟
 ۲:- بینک میں رقم جمع کرنا حفاظت کی غرض سے جبکہ اُس پر سود نہ لیا جائے جائز ہے یا نہیں؟
 ۳:- بعض عالم کہتے ہیں کہ بینک سے سود حاصل کرلو، پھر اس کو غریبوں میں تقسیم کر دو، تو اس میں کوئی حرج تو نہیں؟

جواب ۱:- سود قرآن و سنت کے صریح ارشادات کے مطابق حرام قطعی ہے، اس کا لینا دینا سب ناجائز ہے،^(۱) مسلمان اور ذمی سے سود کے لین دین کی حرمت پر تو اجماع ہے،^(۲) البتہ دار الحرب کے

(۱) قال الله تعالى: "وَأَحَلَّ اللَّهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبَا" (البقرة: ۲۷۵).

"يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَذَرُوا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبَا" (البقرة: ۲۷۸)

"يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَأْكُلُوا الرِّبَا أَضْعَافًا مُضَاعَفَةً" (آل عمران: ۱۳۰)

وفی صحیح المسلم: لعن رسول الله صلى الله عليه وسلم آكل الربا وموكله وكتابه وشاهديه وقال هم سواء. ج: ۲ ص: ۲۷ (طبع قديمی کتب خانہ) وجامع الترمذی کتاب البيوع ج: ۱ ص: ۲۲۹ (طبع سعيد) وسنن أبي داود ج: ۲ ص: ۱۱۷ (طبع مكتبة امداديه ملتان).

(۲) وفي الدر المختار ج: ۵ ص: ۱۸۶ (طبع سعيد) ولا ربوا بين حربى ومسلم. وفي رد المحتار احتراز بالحربى عن المسلم الأصلي والذمي وكذا عن المسلم الحربى. نیز دیکھئے: امداد الفتاوى ج: ۳ ص: ۱۵۷.

کافروں سے سود کا لین دین بعض فقہاء جائز کہتے ہیں^(۱)، دوسرے فقہاء اسے بھی ناجائز قرار دیتے ہیں^(۲) اور فتویٰ اسی پر ہے۔^(۳)

۲:- بینک میں حفاظت کی غرض سے رقم رکھوائی ہے تو سب سے بہتر اور بے غبار صورت یہ ہے کہ لا کر میں رکھوائے، البتہ کرنٹ اکاؤنٹ میں رکھوانے کی بھی گنجائش ہے جس پر سود نہیں لگایا جاتا، اور جن مدات پر سود لگتا ہے مثلاً سیونگ اکاؤنٹ یا فلکسڈ ڈپازٹ، ان میں رقم رکھوانا درست نہیں۔

۳:- سود بینک سے وصول نہ کرنا چاہئے، اگر غلطی سے وصول کر لیا ہو تو صدقہ کر دے،^(۴) کیونکہ وصول کر کے صدقہ کرنا ایسا ہے جیسے گناہ کر کے کفارہ کیا جائے، اس سے بہتر یہ ہے کہ شروع ہی سے گناہ نہ کرے۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

ھ ۱۳۹۸/۲/۱۸

(فتویٰ نمبر ۱۹۲/۲۹ الف)

اس فتویٰ کے جواب نمبر ۳ سے متعلق اس مقام پر حضرت والا دامت برکاتہم العالیہ نے ایک اہم وضاحت تحریر فرمائی ہے جو درج ذیل ہے:

(اہم وضاحت از حضرت والا دامت برکاتہم العالیہ)

یہ اور آگے بھی اس قسم کے متعدد فتاویٰ میں یہی موقف اختیار کیا گیا ہے کہ بینکوں سے سود لیا ہی نہ جائے، اور عام حالات میں یہی موقف احتیاط کا تقاضا بھی ہے، لیکن بعد میں بعض علمائے کرام،

(۱ تا ۳) وفي الدر المختار كتاب البيوع باب الربا ج: ۵ ص: ۱۸۶ (طبع سعيد) ولا ربا بين حربى ومسلم ثمه لأن ماله ثمة مباح فيحل برضاه مطلقاً بلا عذر الخ.

وفي البحر الرائق باب الربا ج: ۶ ص: ۱۳۵ (طبع سعيد) لا ربا بينهما في دار الحرب عندهما خلافاً لأبى يوسف الخ.

وراجع أيضاً هداية باب الربوا ج: ۳ ص: ۸۷ (طبع رشيدية كونته) وتبيين الحقائق ج: ۴ ص: ۴۷۲ وفتح القدير ج: ۶ ص: ۱۷۸ واعلاء السنن ج: ۱۳ ص: ۳۳۵ وأحكام القرآن للتهانوى ج: ۱ ص: ۶۷۴.

در اصل جمہور فقہاء حضرت امام مالک، امام احمد بن حنبل، امام شافعی رحمہم اللہ اور علمائے احناف میں سے امام ابو یوسف رحمہ اللہ کے نزدیک دار الحرب میں کفار سے سود لینا ناجائز ہے، جبکہ امام ابو حنیفہ اور امام محمد رحمہما اللہ کے نزدیک اس کی گنجائش ہے، تاہم احتیاط کا تقاضا یہی ہے کہ اس سے مطلقاً احتراز کیا جائے، جیسا کہ مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ نے فتاویٰ دارالعلوم دیوبند میں تحریر فرمایا ہے، تفصیل کے لئے امداد المفتین ص: ۸۵۱ تا ۸۴۹، اور امداد الفتاویٰ ج: ۳ ص: ۱۵۸ ملاحظہ فرمائیں۔ نیز دیکھئے حضرت والا

دامت برکاتہم العالیہ کی کتاب بحوث فی قضایا فقہیہ معاصرة ج: ۱ ص: ۳۵۶ (طبع: دار القلم)۔

(۴) اوپر حضرت والا کی اہم وضاحت کے ساتھ ساتھ صفحہ نمبر ۱۲۰ و ۱۲۱ و ۱۲۸ کے حواشی اور مزید اہم تفصیل کے لئے ص: ۱۲۹ کا فتویٰ ملاحظہ فرمائیں۔

بالخصوص حضرت مفتی عبدالرحیم صاحب لا جپوری رحمۃ اللہ علیہ کے توجہ دلانے پر اس موقف میں بھی وزن معلوم ہوا کہ سود کی رقم لے کر بغیر نیتِ ثواب صدقہ کر دی جائے، چنانچہ بہت سے علماء کا فتویٰ یہی ہے، اور خاص طور پر غیر مسلم ممالک میں رکھی ہوئی رقوم کے بارے میں اب بندہ کا رجحان بھی یہی ہے۔

واللہ سبحانہ اعلم

بندہ محمد تقی عثمانی

۱۰/۵/۱۴۳۱ھ

غیر مسلم ممالک میں بینک کے سود کا حکم (عربی فتویٰ)

سوال:- فضيلة الشيخ حضرة مولانا مفتي محمد تقى عثمانى حفظه الله

السلام عليكم ورحمة الله وبركاته، وبعد:

فانى اعرض الى سماحتكم أن يفتينى بما أشكل علىّ، أوّلاً أعرفكم بما أشكل علىّ، نحن نسكن فى سنكيانغ كاشغر فيض آباد (الصين الشعبية) كما تعرف أحوالنا والناس يضع الفلوس فى البنك والبنك للدولة والدولة كافرة وسياستهم وقانونهم الشيوعية. اذا يضع الفلوس يرجع مع الربح اذا أخذ الفلوس يرجع مع الربح هل يجوز ربح البنك أم لا؟ والمسئلة فى الهداية: "لا ربا بين المسلم والكافر" أفتونى بما نزل والحديث والاجماع والقياس والواضح لأنكم عندى أفقه الأمة فى هذا العصر.

جواب:- السلام عليكم ورحمة الله وبركاته، وبعد:

تسلمت رسالتكم واليكم جواب الأسئلة التى قد ارسلتموها الىّ:

۱- ان الربح أو الفائدة التى تعطىها البنوك اليوم داخله فى الربا قطعاً، وقد أفتى معظم الحنفية بأن الربا حرام فى دار الحرب أيضاً، وما ذكرتم من المسئلة المذكورة فى الهداية^(۱) من أنه لا ربا بين المسلم والحربى، فان ذلك قول مرجوح لم يأخذ به الفقهاء المحققون، وان أدلة ذلك مبسوطه فى المجلد الثالث من امداد الفتاوى للشيخ أشرف على التهانوى رحمه الله تعالى^(۲). والسلام عليكم ورحمة الله وبركاته

۱۴۱۴/۶/۲۹ھ

(فتویٰ نمبر ۱۲۳/۲۸)

بینک سے سود لینا، اس میں اکاؤنٹ کھولنا اور بینک میں ملازمت کرنا

سوال:- بینک سے سود لینا اور بینک میں اکاؤنٹ کھولنا جائز ہے یا نہیں؟ اور بینک کی

(۱) ہدایۃ باب الربوا ج: ۳ ص: ۸۷ (طبع رشیدیہ).

(۲) وراجع للتفصیل الى ص: ۱۵۷.

ملازمت کا کیا حکم ہے؟

جواب:- بینکوں کا سود لینا اور دینا حرام ہے،^(۱) شدید ضرورت ہو تو روپیہ کرنٹ اکاؤنٹ میں رکھوایا جائے، اور تصریح کردی جائے کہ اس روپیہ پر سود نہ لگائیں، بینکوں میں چونکہ زیادہ تر سود کا کاروبار ہوتا ہے اس لئے اس میں ملازمت درست نہیں۔^(۲) واللہ اعلم

۱۳۸۷/۱۲/۲ھ

(فتویٰ نمبر ۱۴۰۰/۱۸ الف)

بینک کی طرف سے ملنے والے منافع کی مختلف صورتیں اور اس کے استعمال کا حکم

سوال:- میری عمر تقریباً ۶۵ سال ہے، کئی سال سے بیمار ہوں، نمازیں مسجد میں جماعت سے ادا کرنے سے قاصر ہوں، گھر میں بھی فرض نماز کے علاوہ بقیہ نمازیں بیٹھ کر ادا کرتا ہوں، میں اس قابل نہیں رہا کہ کوئی تجارت، ملازمت یا ٹیوشن وغیرہ کر سکوں، نہ کوئی ایسا ادارہ ہے جہاں روپے رکھنے سے اندیشہ نہ ہو، میرے پاس جو پیسہ تھا میں نے سال بہ سال اس کی زکوٰۃ ادا کی ہے اور بینک سے جو سود ملا اس کو اس سال تک اپنے اوپر صرف نہیں کیا ہے، ضرورت مندوں اور مستحقین کو دے دیا ہے، کیونکہ مجھے یہ معلوم ہوا ہے کہ بینک میں جو پیسہ سود کا چھوڑ دیا جاتا ہے وہ ناجائز طریقوں میں خرچ کر لیا جاتا ہے۔ مئی ۱۹۷۵ء میں، میں اپنا مکان فروخت کر کے اور جو کچھ پیسہ تھا وہ لے کر لاہور اپنے لڑکے کے پاس جو بینک میں ملازم ہے چلا آیا تھا، یہاں پہنچ کر میں بہت زیادہ بیمار ہو گیا اور جب سے اب تک مختلف حکیموں اور ڈاکٹروں کا علاج کر رہا ہوں، جس میں کافی روپیہ خرچ ہو گیا، میرے لڑکے نے وہ روپے بینک میں جمع کر دیئے کہ اس سے جو سال بہ سال منافع ملے گا وہ خرچ کرتے رہیں گے، چنانچہ میں نے یہی کیا، پانچ سال کے لئے روپیہ جمع کرنے کے بعد جو رقم میرے پاس تھی اس میں سے کچھ باقی ہے باقی پیسہ خرچ ہو چکا ہے۔ دوم مجھے علاج کے لئے دوسری جگہ جانے کا مشورہ دیا جاتا ہے مگر اب میرے پاس ضروری اخراجات کے لئے بھی پیسہ نہیں ہے، اور نہ بینک سے پانچ سال تک نکل سکتا ہے، اب کیا ایسا کر سکتا ہوں کہ: ۱- اکتوبر ۱۹۷۶ء میں جو منافع کا پیسہ ملے گا اس کو میں اپنے مذکورہ بالا اخراجات میں صرف کر سکتا ہوں؟ اور پانچ سال بعد جب اصل رقم ملے گی اس میں سے کسی مستحق کو

(۱) دیکھئے ص: ۲۸۴ کا حاشیہ نمبر ۴ نیز مزید دیکھئے ص: ۲۶۷ کا حاشیہ نمبر ۱۔

(۲) یہ بینک کی اس ملازمت کا حکم ہے جس میں براہ راست سودی معاملات انجام دیئے جاتے ہوں۔ اور جس ملازمت کا سودی معاملات سے تعلق نہ ہو اس کا یہ حکم نہیں۔ بینک ملازمت کی یہ دو قسمیں اور ان کی مکمل تفصیل کے لئے اسی جلد کی کتاب الاجارة میں ص: ۳۹۳ تا ص: ۳۹۶ ملاحظہ فرمائیں۔

دے دوں گا۔ ۲:- دوسری صورت یہ ہے کہ کسی سے بلا سودی قرض لے لوں، جب منافع کا پیسہ ملے اس کو ادا کر دوں؟ ۳:- یا جب اصل رقم واپس ہو اس وقت یہ سب حساب کر کے اس میں سے نکال دوں، اگر مذکورہ بالا تینوں شکلیں جائز نہ ہوں تو پھر کیا صورت جائز ہو سکتی ہے؟

جواب:- بینک، منافع کے عنوان سے جو کچھ دیتا ہے شرعاً وہ سود ہے^(۱) جو قطعاً حرام ہے، اس کا لینا دینا، کھانا اور کھلانا سب حرام ہے،^(۲) قرآن و حدیث میں اس کے متعلق سخت سخت وعیدیں آئی ہیں،^(۳) ایک حدیث کی رو سے سود خوری کا ادنیٰ درجہ ایسا ہے جیسے اپنی ماں کے ساتھ زنا کرنا،^(۴) اس لئے مذکورہ حالات میں بھی سود لینا حلال نہیں بلکہ سود لینے کی نیت سے پیسہ جمع کرنا بھی درست نہیں، اگر بینک میں روپیہ رکھنا ہی ہو تو ایسے اکاؤنٹ میں رکھنا لازم ہے جس میں سود نہ ملتا ہو، جیسے کرنٹ اکاؤنٹ اور لاکرز وغیرہ، اور موجودہ جمع شدہ رقم پر اگر بینک نے سود دے دیا ہے تو اس کا وصول کرنا جائز نہیں ہے،^(۵) صرف اصل جمع شدہ رقم واپس لے سکتے ہیں، غرباء کو دینے کی نیت سے بھی سود نہیں لے سکتے، البتہ اگر غلطی سے وصول کر ہی لیا ہے تو اس حرام سے جان چھڑانے کی نیت سے کسی غریب محتاج کو دے دیں،^(۶) مذکورہ صورتیں ناجائز ہیں۔

اگر آپ کی بیوی اور کوئی نابالغ اولاد نہیں ہے اور کوئی ایسا عزیز رشتہ دار بھی نہیں ہے جس کا نفقہ آپ پر واجب ہو تو آپ پر مذکورہ بالغ لڑکے اور اس کی بہو کا کوئی نان نفقہ کسی طرح کا واجب نہیں، صرف آپ پر اپنا خرچ واجب ہے جسے آپ اپنی موجودہ رقم سے کرتے رہیں، بالفرض اگر یہ رقم ختم ہوگئی اور آپ کمانے کے لائق نہ ہوئے تو شرعاً آپ کا نفقہ آپ کے بالغ لڑکے کے ذمے ہوگا، وہ برداشت کرے گا۔ بہر حال حرام کے استعمال کا کوئی راستہ نہیں، البتہ جو صورت آپ نے لکھی ہے کہ بینک فی الحال جو رقم سود کے نام سے دے رہا ہے اُس کو وصول کر کے خرچ کر لیں پھر پانچ سال بعد جو اصل رقم ملے اُس میں سے سود کی رقم کی مقدار صدقہ کر دیں، شرعاً اس کی گنجائش معلوم ہوتی ہے، جب اکتوبر میں بینک کچھ رقم منافع کے نام سے دے، اُس کو آپ اس نیت سے وصول کریں کہ یہ آپ کے اصل قرض

(۱) حوالہ کے لئے دیکھئے ص: ۲۸۳ کا حاشیہ نمبر ۴۔

(۲ و ۳) حوالہ کے لئے دیکھئے ص: ۲۶۷ کا حاشیہ نمبر ۱۔

(۴) وفي مشکوة المصابيح باب الربوا الفصل الثالث ج: ۱ ص: ۲۳۶ (طبع قديمی کتب خانہ)

عن أبي هريرة رضي الله عنه قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: الربوا سبعون جزءاً أيسرها أن ينكح الرجل أمه. وفي المرقاة ج: ۶ ص: ۶۵ أن ينكح الرجل أمه أى يطأها، وفي رواية الربا ثلاثة وسبعون باباً أيسرها مثل أن ينكح الرجل أمه.... وفي رواية الربا اثنان وسبعون باباً أدناها مثل اتيان الرجل أمه.... الخ.

(۵ و ۶) دیکھئے ص: ۲۶۸ پر حضرت والا کی اہم وضاحت نیز دیکھئے ص: ۱۲۰ و ص: ۱۲۱ کے حواشی اور مزید اہم تفصیل کے لئے ص: ۱۲۹ کا فتویٰ۔

کی رقم ہے، اور پھر جب پوری رقم اس طرح واپس مل جائے تو اُس کے بعد حاصل ہونے والی رقم کو صدقہ کر دیں، کیونکہ بینک میں روپیہ رکھوانے کا معاملہ شرعاً قرض ہے اور قرض دینے والے کو اختیار ہے کہ وہ اپنی رقم جب چاہے واپس کرنے کا مطالبہ کر دے، خواہ قرض مؤجل کہہ کر دیا گیا ہو۔

واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم

۱۳۹۶/۹/۲۹ھ

(فتویٰ نمبر ۲۳۹۱/۵۲۷)

بینکوں کا سود وصول کر کے صدقہ کیا جائے یا وصول ہی نہ کیا جائے؟

سوال:- بینک میں جمع شدہ رقم سے اگر ہم سود حاصل نہ کریں تو بینک اس کو خلاف شرع کاموں میں خرچ کریں گے، خلاف شرع کاموں سے اس رقم کو بچانے کے لئے اگر ہم سود لے کر کسی غریب طالب علم، بیوہ یا یتیم بچے کی مدد کر دیں تو جائز ہے یا نہیں؟

جواب:- پہلے یہ سمجھ لیجئے کہ بینک آپ کے جمع شدہ روپے پر جو رقم سود کے طور پر لگاتے ہیں وہ شرعی اعتبار سے آپ کی ملک نہیں ہوتی، اور جو رقم آپ کی ملکیت نہ ہو، آپ کے لئے جائز نہیں ہے کہ وہ کسی اور کو صدقہ یا ہبہ کریں، یہ درست ہے کہ بینک عام طور سے یہ رقم ناجائز کاروبار سے حاصل کرتے ہیں، لیکن اگر کوئی شخص حرام مال کمائے تو یہ اس کا اپنا فعل ہے، آپ اسے نصیحت تو کر سکتے ہیں مگر اس سے وہ مال ناجائز طریقے سے لے کر کسی غریب کو نہیں دے سکتے۔

رہا یہ معاملہ کہ سود کی رقم اگر بینکوں میں چھوڑ دی جائے تو اس سے ان کے ناجائز کاموں میں اعانت ہوگی، سو اس قسم کی اعانت تو محض بینک میں روپیہ جمع کرانے سے بھی ہوتی ہے، اسی لئے علماء کا کہنا یہ ہے کہ بینک میں روپیہ جمع کرانا ضروری ہو تو اُسے چالو کھاتہ (Current Account) میں جمع کرایا جائے، جس میں گردش کا احتمال چونکہ کم ہوتا ہے اس لئے اس پر عام طور سے سود لگایا ہی نہیں جاتا۔

خلاصہ یہ کہ سود کی رقم از خود لینا تو جائز نہیں، ہاں اگر اتفاقاً کسی وجہ سے سود آپ کے پاس پہنچ جائے تو مجبوراً اس کا راستہ یہ ہے کہ اُسے کسی غریب پر صدقہ کر دیا جائے۔^(۱)

واللہ اعلم

(۲) ۱۳۸۷/۳/۵ھ

(۱) ملاحظہ ہو ص: ۲۶۸ پر حضرت والا دامت برکاتہم کی اہم وضاحت نیز دیکھئے ص: ۱۲۱، ۱۲۰ کے حواشی اور ص: ۲۸۳ کا حاشیہ نمبر ۴ اور مزید اہم تفصیل کے لئے ص: ۱۲۹ کا فتویٰ ملاحظہ فرمائیں۔

(۲) یہ فتویٰ ”الباغ“ شمارہ ربیع الثانی ۱۳۸۷ھ سے لیا گیا ہے۔

بینک کے کرنٹ اکاؤنٹ کا حکم اور غلطی سے سودی اکاؤنٹ میں رقم رکھوانے کی صورت میں ملنے والے سود کا حکم

سوال:- بینک میں رقم جمع کرنے پر کچھ سود بھی ملتا ہے، اگر سود بینک سے نہ لیا جائے تو بینک کا عملہ سود کی رقم اپنے مصارف میں لاتا ہے، اگر لیا جائے تو اس کا کیا مصرف ہے؟

جواب:- بینک میں اکاؤنٹ رکھنا ہو تو کرنٹ اکاؤنٹ یا لا کرز میں رکھنا چاہئے، جس پر سود نہیں لگایا جاتا، اور غلطی سے اگر سود والے اکاؤنٹ میں رکھ دیا اور اس پر سود لگ گیا تو سود کی رقم کسی غیر صاحبِ نصاب آدمی کو صدقہ کر دی جائے، لیکن ابتداء سے ہی اپنے اختیار کے ذریعے سودی اکاؤنٹ میں روپیہ رکھوانا اور سود وصول کرنا جائز نہیں۔^(۱)

واللہ اعلم

ھ ۱۳۹۷/۱/۲

(فتویٰ نمبر ۱۳/۲۸ الف)

حفاظت کی غرض سے بینک میں رقم رکھوانے کا حکم

سوال:- کیا بینک میں حفاظت کی غرض سے رقم رکھوانے کی اجازت ہے؟

جواب:- بینک میں اگر حفاظت کی غرض سے رقم جمع کرائی جائے اور اس پر سود نہ لیا جائے تو اس کی شرعاً اجازت ہے۔

واللہ اعلم

ھ ۱۳۹۷/۹/۱۳

(فتویٰ نمبر ۹۵۰/۲۸ ج)

بینک سے سود وصول کر کے غرباء میں تقسیم کرنے کا حکم

سوال:- سود لے کر غرباء میں تقسیم کر دیا جائے، بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ حکومتی قانون کے خلاف ہے، شریعت میں کیا حکم ہے؟

جواب:- بینکوں سے سودی رقم کے بارے میں تحقیق یہی ہے کہ اس کو وصول ہی نہ کیا

(۱) ملاحظہ ہو ص: ۲۶۸ پر حضرت والا دامت برکاتہم کی اہم وضاحت نیز دیکھئے ص: ۱۲۱، ۱۲۰ کے حواشی اور ص: ۲۸۴ کا حاشیہ نمبر ۴ اور مزید اہم تفصیل کے لئے ص: ۱۲۹ کا فتویٰ ملاحظہ فرمائیں۔

جائے، البتہ اگر کسی وجہ سے وصول ہو جائے تو اس کو غرباء میں صدقہ کر دیا جائے۔^(۲) واللہ اعلم
الجواب صحیح
محمد عاشق الہی عفی عنہ

ھ ۱۳۸۷/۱۲/۱۴

(فتویٰ نمبر ۱۳۳۸/۱۸ الف)

۱:- ڈاک خانے میں جمع کرائی گئی رقم پر ملنے والے اضافے کا حکم

۲:- پراویڈنٹ فنڈ پر ”سود“ کے نام سے ملنے والے اضافے کا حکم

سوال ۱:- ہم چند افراد ایک ادارے کے ملازم ہیں، ہم لوگوں کا کچھ روپیہ بطور ضمانت کافی عرصہ ہوا محکمے نے ہماری تنخواہوں سے وضع کر کے پوسٹ آفس میں جمع کر دیا ہے، اب کافی عرصے کے بعد ہم نے وہ روپیہ ڈاک خانے سے مع سود وصول کیا جو وقتی طور پر ہم لوگوں کو اصل رقم کے ساتھ مل گیا، باقی احتیاطاً ہم نے یہ ضرور کیا کہ اصل رقم ہم نے صرف کردی، مگر سود کو صرف نہ کیا، اب اگر یہ رقم کسی مستحق کو بغیر نیت ثواب دے دیں تو جائز ہے؟

جواب ۱:- آپ کو ڈاک خانے سے جو سود کی رقم ملی ہے، اسے کسی غیر صاحب نصاب آدمی پر بغیر نیت ثواب کے صدقہ کر دیں،^(۳) کیونکہ اس کا معاملہ پراویڈنٹ فنڈ سے مختلف ہے۔

سوال ۲:- جی پی فنڈ کی رقم مع سود وصول کرنا جائز ہے یا نہیں؟ (یعنی گورنمنٹ جو رقم تنخواہ سے وضع کر کے ریٹائر ہونے کے بعد مع سود دیتی ہے)۔

جواب ۲:- پراویڈنٹ فنڈ پر جو زیادتی ”سود“ کے نام سے دی جاتی ہے، وہ درحقیقت سود نہیں ہے، لہذا اس کو حاصل کر کے استعمال کرنا جائز ہے۔^(۴) واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

ھ ۱۳۸۸/۲/۱۰

(فتویٰ نمبر ۲۳۳/۱۹ الف)

الجواب صحیح

محمد عاشق الہی عفی عنہ

(۳ تا ۱) دیکھئے ص: ۲۶۸ پر حضرت والا دامت برکاتہم کی اہم وضاحت، نیز مال حرام کے صدقہ کے بارے میں حضرت والا دامت برکاتہم کی ایک اہم تحقیق کتاب البیوع کی ”فصل فی احکام المال الحرام والمخلوط“ میں ص: ۱۲۹ تا ص: ۱۴۰ پر ملاحظہ فرمائیں۔
(۴) تفصیل کے لئے دیکھئے رسالہ ”پراویڈنٹ فنڈ پر زکوٰۃ اور سود کا مسئلہ“ از مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ اور اعداد الفتاویٰ ج: ۳ ص: ۱۵۲ (طبع مکتبہ دارالعلوم کراچی)۔

بینک میں جمع کرائی گئی رقم پر ملنے والے منافع کا حکم

سوال ۱:- جو رقم بینک میں جمع کرائی جاتی ہے اس پر جو منافع ملتا ہے کیا وہ سود ہے؟
 ۲:- اگر بینک سے ملنے والا نفع سود ہے تو اس رقم پر اگر سود لگ چکا ہو تو اس سود کا مصرف کیا ہے؟

۳:- اگر بینک میں اس شرط پر رقم جمع کرائی جائے کہ سود نہیں لیا جائے گا کیا یہ جائز ہے؟ اور اس طرح سودی کاروبار میں معاون تو شمار نہیں ہوگا؟ جبکہ رقم کی حفاظت کا کوئی اور ذریعہ نہ ہو۔
 جواب ۱:- جی ہاں سود ہے۔^(۱)

۲:- اسے وصول نہ کریں^(۲) اور اگر وصول کر لیا ہو تو کسی غریب کو بلا نیتِ ثواب صدقہ کر دیں،^(۳) اس سے سود وصول کرنے کا کفارہ ہو جائے گا۔

۳:- جب رقم کی حفاظت کا اور کوئی ذریعہ نہ ہو تو اس شرط کے ساتھ بینک میں روپیہ رکھوانے کی گنجائش ہے۔
 واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۱۳۹۷/۸/۲۹ھ
 (فتویٰ نمبر ۸۹۶/۲۸ ج)

بینک کے سود کا حکم

سوال:- بینک سے حاصل کئے ہوئے سود کا کیا حکم ہے؟
 جواب:- بینک سے سود نہ لینا چاہئے، بلکہ روپیہ کرنٹ اکاؤنٹ میں رکھوائیں جس پر سود نہ لگے، البتہ اگر غلطی سے وصول کر لیا ہو تو کسی فقیر کو بغیر نیتِ ثواب صدقہ کر دیں۔^(۴) واللہ اعلم
 ۱۳۹۷/۹/۱۸ھ
 (فتویٰ نمبر ۹۷۰/۲۸ ج)

سودی رقم مستحقِ زکوٰۃ کو دینے کا حکم

سوال:- میرے پاس کچھ سودی رقم تھی، چونکہ میں خود سود نہیں لیتا اس واسطے میں نے اپنی ایک عزیزہ کو وہ سودی رقم دے دی، کیا میں بری الذمہ ہو گیا؟

جواب:- اپنی جس عزیزہ کو آپ نے سود کی وہ رقم دی، اگر وہ مستحقِ زکوٰۃ تھیں (یعنی ان کے پاس ساڑھے باون تولہ چاندی یا اس کے مساوی نقد یا سونا موجود نہیں تھا)^(۵) تو آپ کا یہ فعل

(۵۱۱) ص: ۲۶۸ پر حضرت والا دامت برکاتہم کی اہم وضاحت ملاحظہ فرمائیں، نیز دیکھئے ص: ۱۲۰ و ص: ۱۲۱ کے حواشی، ص: ۲۸۳ کا حاشیہ نمبر ۴ اور مزید اہم تفصیل کے لئے ص: ۱۲۹ کا فتویٰ ملاحظہ فرمائیں۔

دُست تھا، اس کے بعد آپ پر اس سلسلے میں کوئی ذمہ داری نہیں ہے، انہیں یہ بتادینا بھی ضروری نہیں تھا کہ یہ رقم سود کی ہے۔

واللہ اعلم
محمد تقی عثمانی عفی عنہ

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

ھ ۱۳۸۸/۷/۶

(فتویٰ نمبر ۷۷۶/۱۹ الف)

بینک میں رقم رکھوانے اور کرنٹ اکاؤنٹ کا حکم

سوال:- مکرمی محترمی عالی جناب مفتی صاحب، کیا فرماتے ہیں مفتیانِ دینِ شرع متین درمیان اس مسئلے کے کہ:- زید کو اتفاق سے امسال پہلی مرتبہ بینک سے ۶۵۰ روپے بینک سے سود کے طور پر ملے، اس سے پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا، اب زید اس رقم کو لینا نہیں چاہتا، مگر یہ سود والی رقم بینک میں چھوڑ دی جاوے تو وہ لوگ خرد برد کر لیں گے۔ یا یہ رقم کسی غریب یتیم، مسکین، محتاج، اپاج مجبور لوگوں میں تقسیم کی جاسکتی ہے یا کسی غریب بیوہ عورت کو سلائی مشین خرید کر دی جاسکتی ہے؟ تاکہ وہ اپنی گزر بسر کر سکے یا نقدی کی صورت میں ضرورت مند کو دی جائے تاکہ وہ صاحب اپنے کام میں لاسکے، جواب سے مطلع فرمادیں۔ انتظار ہوگا۔

جواب:- اگر بینک میں رقم رکھوانی ہو تو یا کرنٹ اکاؤنٹ میں رکھوانی چاہئے جس پر سود نہیں دیا جاتا، یا اپنے اکاؤنٹ کے ساتھ بینک کو لکھ کر دینا چاہئے کہ میری رقم پر سود نہ لگایا جائے، آئندہ آپ ان دونوں صورتوں میں سے کوئی صورت اختیار کر لیں، البتہ اب جو سود کی رقم آپ کے اکاؤنٹ میں جمع ہو گئی ہے اسے کسی غریب کو صدقہ کر سکتے ہیں، نیت اس میں حرام مال سے جان چھڑانے کی ہونی چاہئے۔^(۱)

واللہ سبحانہ اعلم

ھ ۱۳۹۹/۹/۷

(فتویٰ نمبر ۱۵۸۹/۳۰ ج)

فلکسڈ ڈپازٹ میں رقم رکھوانے اور اس پر ملنے والے اضافے کا حکم

سوال:- فلکسڈ اکاؤنٹ کے انٹرسٹ کی رقم اگر مسلم بینک کے ذمہ داران اصولِ تملیک پر عمل کر کے وہ رقم بشکل چندہ کسی دینی ادارے کو دے دیں تو آیا اس رقم کا دینی اداروں میں استعمال کرنا جائز ہے یا نہیں؟

(۱) حوالہ جات کے لئے دیکھئے ص: ۱۲۰، ص: ۱۲۱ کے حواشی اور مزید اہم تفصیل کے لئے ص: ۱۲۹ کا فتویٰ۔

جواب:- فسکڈ ڈپازٹ پر چونکہ سود دیا جاتا ہے اس لئے اس میں رقم رکھوانا جائز نہیں،^(۱) رقم کی حفاظت کے لئے بینک میں رکھوانا ضروری ہو تو کرنٹ اکاؤنٹ میں رکھوائی جائے، جس پر سود نہیں دیا جاتا، لیکن اگر غلطی سے رقم فسکڈ ڈپازٹ میں رکھ دی اور اُس پر سود مل گیا تو اسے بغیر نیتِ ثواب کے صدقہ کر دینا چاہئے، البتہ جسے صدقہ کیا گیا، وہ مالک و مختار ہونے کے بعد کسی دباؤ کے بغیر اپنی مرضی سے کسی دینی ادارے میں چندہ دیدے تو اس دینی ادارے کے لئے اس کا استعمال جائز ہے۔

واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۸/۵/۲۹ھ

(فتویٰ نمبر ۵۵۸/۲۹ ب)

بینکوں کے سود اور پراویڈنٹ فنڈ کا حکم

سوال:- ۱- بینک کا سود، ۲- پراویڈنٹ فنڈ کی رقم کا سود، کیا قابل قبول اور قابل استعمال ہے؟ یا ان کو مذکورہ اداروں کے پاس ہی چھوڑ دیا جائے؟

جواب:- بینکوں میں جس سود کا لین دین ہوتا ہے وہ بلاشبہ ”سود“ اور ”ربا“ کی تعریف میں داخل ہے،^(۲) اور اس کا لین دین حرام اور گناہ کبیرہ ہے، لما فی الجامع الصغیر من الحدیث المرفوع أو الموقوف: کل قرض جرّ منفعة فهو ربا۔^(۳) لہذا اگر بینک میں رقم رکھوانی ہو تو کرنٹ اکاؤنٹ میں رکھوانی جائے تاکہ اس پر سود نہ لگے، اور اگر لاعلمی کی حالت میں رقم پر سود لگ جائے تو اسے وصول نہ کرنا چاہئے یا وصول کر کے صدقہ کر دینا چاہئے۔

۲:- پراویڈنٹ فنڈ اگر جبری ہو تو اس پر جو زیادتی محکموں کی طرف سے ملتی ہے وہ شرعاً ”سود“ کی تعریف میں داخل نہیں، لہذا اس کا لینا جائز ہے، البتہ احتیاط اس میں ہے کہ اس زیادہ رقم کو صدقہ کر دیا جائے۔

واللہ سبحانہ اعلم وعلمہ اتم واحکم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۷/۱/۲۶ھ

(فتویٰ نمبر ۱۳۲۱/۱۸ الف)

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع عہدہ اللہ عنہ

۱۳۸۷/۱/۲۷ھ

(۱ و ۲) تفصیلی حوالہ جات کے لئے دیکھئے ص: ۲۸۳ کا حاشیہ نمبر ۴۔

(۳) تفصیل کے لئے مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ کا رسالہ ”پراویڈنٹ فنڈ پر زکوٰۃ اور سود کا مسئلہ“ ملاحظہ فرمائیں۔

پراویڈنٹ فنڈ پر ملنے والی زائد رقم کا حکم

سوال:- پراویڈنٹ فنڈ پر جو سود دیا جاتا ہے وہ لینا جائز ہے یا نہیں؟

جواب:- احتیاط تو اسی میں ہے کہ پراویڈنٹ فنڈ کے طور پر جو رقم ملازم نے اپنے اختیار سے کٹوائی ہے اس پر ملنے والی زیادہ رقم کو صدقہ کر دیا جائے۔ لیکن شرعی نقطہ نظر سے یہ زیادہ کی رقم سود کے حکم میں نہیں ہے، اس لئے اسے اپنے استعمال میں لانے کی گنجائش ہے۔^(۱) واللہ اعلم

۱۳۸۸/۵/۲۶ھ

(فتویٰ نمبر ۶۱۸/۱۱۹ الف)

بینک کے سود اور جبری پراویڈنٹ فنڈ کا حکم

سوال:- میں محکمہ زراعت میں ملازم ہوں، میری تنخواہ سے جی پی فنڈ مبلغ پانچ روپے ماہانہ کاٹے جاتے ہیں، اس رقم پر حکومت ایک مقررہ فیصد سالانہ سود ادا کرتی ہے، میں نے ان کو لکھ دیا ہے کہ میں اس رقم پر سود نہیں لوں گا، اور اصل زر کا حق دار ہوں گا، اس طرح بینک اور ڈاک خانے میں بھی رقم بحیثیت اصل جمع ہے تو کیا میں حکومت سے سود کی رقم لے کر کسی غریب کو دے سکتا ہوں؟

جواب:- جہاں تک بینک کے سود کا تعلق ہے وہ تو ناجائز اور حرام ہے،^(۲) اور اس میں بہتر یہ ہے کہ اسے لیا ہی نہ جائے،^(۳) جس کی شکل یہ ہے کہ کرنٹ اکاؤنٹ میں رقم رکھوائی جائے، ہاں اگر کبھی غلطی سے سود لگ کر مل گیا تو اسے بغیر نیتِ ثواب صدقہ کر دینا چاہئے۔ البتہ جبری پراویڈنٹ فنڈ پر جو زیادہ رقم محکمے کی طرف سے ملتی ہے وہ شرعاً سود کے حکم میں نہیں ہے،^(۴) اسے وصول کر کے اپنے استعمال میں لانا بھی شرعاً جائز ہے، ہاں اگر کوئی شخص تقویٰ اور احتیاط پر عمل کرے تو اسے رقم لے کر صدقہ کر دینا چاہئے،^(۵) اور یہ صدقہ ایسا ہے کہ اپنے بیوی، بچوں اور دوسرے اعزہ اور رشتہ داروں پر بھی صرف کیا جاسکتا ہے۔

واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفا اللہ عنہ

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

۱۳۹۱/۵/۲۳ھ

(فتویٰ نمبر ۶۸۲/۲۲ ب)

(۱ و ۲ و ۵) تفصیل کے لئے مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ کا رسالہ ”پراویڈنٹ فنڈ پر زکوٰۃ اور سود کا مسئلہ“ ملاحظہ فرمائیں۔

(۳ و ۴) ۲۶۸ ص پر حضرت والا دامت برکاتہم کی اہم وضاحت کے ساتھ ساتھ دیکھئے ص: ۲۸۴ کا حاشیہ نمبر ۴ اور مزید تفصیل کے لئے ص: ۱۲۰ و ۱۲۱ کے حواشی اور ص: ۱۲۹ کا فتویٰ ملاحظہ فرمائیں۔

بینک کا سود صدقہ کرنے کی صورت

سوال:- میں کئی سالوں سے موجودہ پاکستانی بینکوں میں پیسہ جمع کر رہا ہوں، اس دوران بینک کی طرف سے میری جمع شدہ رقموں میں بہت سود بھی شامل ہو گیا ہے، سود جس قدر ہے اس کا اندازہ بینک والوں کو ہے، اب میں دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ یہ سود کی رقم کسی فقیر یا بیوہ، نادار شخص کو دی جاسکتی ہے؟ یا اس رقم کو کسی اور جگہ لگایا جاسکتا ہے؟

جواب:- بینک سے سود کی رقم لینا جائز نہیں^(۱)، بلکہ اگر رقم بینک میں رکھوانی ہو تو کرنٹ اکاؤنٹ میں رکھوائی جائے جس پر سود نہیں دیا جاتا، تاہم اگر غلطی سے سود وصول کر لیا تو یہ رقم اپنی جان چھڑانے کی نیت سے کسی فقیر یا مسکین کو صدقہ کر دیں^(۲)، اس میں بھی مالک بنا کر دینا ضروری ہے، تعمیر وغیرہ رفاہی کاموں میں یہ رقم استعمال نہیں ہو سکتی۔^(۳)

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

ھ ۱۳۹۸/۷/۱۷

(فتویٰ نمبر ۸۰۱/۲۹ ب)

بینک کے سود کا حکم

سوال:- ہم بینک سے سود لے کر صدقہ یا کسی رفاہی کام میں لگا دیں تو اچھا ہے یا سود ہی نہ لیں؟

جواب:- اوّل تو بینک میں روپیہ کرنٹ اکاؤنٹ میں رکھوانا چاہئے، جس پر عموماً سود نہیں لگایا جاتا، اور اگر بینک کی طرف سے اس پر سود لگا دیا جائے تو بہتر یہ ہے کہ وہاں سے سود لیا ہی نہ جائے، لے کر صدقہ کرنے کا مطلب یہ ہوگا کہ گناہ کر کے کفارہ کیا جائے، اور نہ لینے کا مطلب یہ ہے کہ سرے سے گناہ کیا ہی نہ جائے۔ ظاہر ہے کہ دوسری صورت افضل ہے۔ موجودہ بینک عام طور سے ایسی رقموں کو رفاہی کاموں میں خرچ کرتے ہیں، اس لئے اسے چھوڑنے میں کوئی قومی نقصان بھی نہیں ہے۔^(۴)

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

ھ ۱۳۸۸/۹/۶

(فتویٰ نمبر ۶۷۸/۱۹ الف)

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع

(۱) دیکھئے ص: ۲۶۸ پر حضرت والا دامت برکاتہم کی اہم وضاحت نیز ص: ۲۸۴ کا حاشیہ نمبر ۴ ملاحظہ فرمائیں۔

(۲) دیکھئے ص: ۱۲۰ و ص: ۱۲۱ کے حواشی اور تملیک کی شرط کے بارے میں دوسری تحقیق کے لئے ص: ۱۲۹ کا فتویٰ۔

(۳) دیکھئے ص: ۲۶۸ پر اہم وضاحت نیز ص: ۲۸۴ کا حاشیہ نمبر ۴۔

ایک اکاؤنٹ سے سود لے کر دوسرے اکاؤنٹ میں سود ادا کرنے کا حکم

سوال:- گزارش یہ ہے کہ ایک بینک اکاؤنٹ میں سود ملتا ہے اور دوسرے بینک اکاؤنٹ میں سود دینا پڑتا ہے، یعنی سود لینا دینا دونوں بینک ہی میں ہے، کوئی اور اس میں Involve نہیں ہے، تو کیا ایسی صورت میں سود سے سود ادا کر سکتے ہیں؟

جواب:- بینک میں سودی اکاؤنٹ کھولنا بھی جائز نہیں^(۱)، رقم رکھنا ضروری ہو تو کرنٹ اکاؤنٹ میں رکھوائی جائے، اور بینک سے سودی قرض لینا بھی جائز نہیں^(۲)۔ لہذا مذکورہ طریقے پر بینک کے سود کو بینک ہی کے سود میں محسوب کرنے کی غرض سے سودی اکاؤنٹ کھولنا یا سودی قرض لینا جائز نہیں ہے۔ البتہ اگر ماضی میں غلطی سے سودی اکاؤنٹ میں پیسے رکھوا دیئے گئے ہیں اور سودی قرض لے لیا گیا تو اس طرح تصفیہ کر سکتے ہیں کہ ایک اکاؤنٹ سے لے کر دوسرے میں دے دیں، بشرطیکہ لیا ہوا سود دیئے ہوئے سود سے زائد نہ ہو، برابر ہو جائے، لیکن آئندہ کے لئے یہ سلسلہ بالکل بند کر دیں۔

واللہ اعلم

۱۴۰۹/۹/۵ھ

(فتویٰ نمبر ۱۵۵۶/۴۰ د)

بینک سے وصول شدہ سود کا حکم

سوال:- اگر زید بینک میں رقم رکھتا ہے اور اُسے سود بھی دیا جاتا ہے، سود لینا حرام ہے اور چھوڑ دینا گویا متعلقہ افراد کو حرام کھانے کا موقع دینا ہے، اب لینا بہتر ہے یا چھوڑ دینا؟ کیا کسی عمومی فائدے میں یہ رقم خرچ کی جاسکتی ہے؟

جواب:- بینک میں رقم رکھوانی ہو تو کرنٹ اکاؤنٹ میں رکھوانی چاہئے جس پر سود نہیں لگتا، اگر غلطی سے دوسرے اکاؤنٹ میں رکھوا دی ہو اور اس پر سود لگ گیا ہو تب بھی سود وصول کرنا درست نہیں، اور اگر غلطی سے وصول کر لیا تو اُسے کسی غیر صاحبِ نصاب کو بغیر نیتِ ثواب صدقہ کر دیا جائے۔^(۳)

واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم

۱۳۹۷/۲/۲۸ھ

(فتویٰ نمبر ۱۷۴/۲۸ الف)

(۱) حوالہ کے لئے ص: ۲۸۴ کا حاشیہ نمبر ۴ اور ص: ۲۶۷ کا حاشیہ نمبر ۱ ملاحظہ فرمائیں۔

(۲) دیکھئے ص: ۲۶۸ پر حضرت والا دامت برکاتہم کی اہم وضاحت نیز دیکھئے ص: ۲۶۷ کا حاشیہ نمبر ۱، ص: ۱۴۰ و ص: ۱۴۱ کے حواشی اور مزید اہم تفصیل کے لئے ص: ۱۴۹ کا فتویٰ۔

ڈاک خانے کے ڈپازٹ سرٹیفکیٹ پر ملنے والے منافع کا حکم

سوال ۱:- میرے پاس ڈاک خانے کے خاص ڈپازٹ سرٹیفکیٹ ہیں، اُن پر ہر سال ساڑھے گیارہ فیصد منافع ملتا ہے، کیا یہ حلال ہے؟

۲:- اگر منافع جائز ہے اور سود حرام ہے تو پھر فرق کیسے ہوا؟ کیا یہ رقم سود کے زمرے میں آتی ہے؟

جواب:- ڈاک خانے کے ڈپازٹ سرٹیفکیٹ پر جو رقم زیادہ دی جاتی ہے وہ خواہ منافع کہہ کر دی جائے یا سود کہہ کر دے دی جائے، شرعی طور پر وہ سود ہی ہے، اور اس کا وصول کرنا جائز نہیں^(۱)، اور اگر غلطی سے وصول کر لی گئی تو اسے نیتِ ثواب کے بغیر صدقہ کر دینا ضروری ہے۔^(۲)

واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم

ھ ۱۳۹۶/۱۰/۲۳

(فتویٰ نمبر ۲۳۳۲/۵۲۷)

بینک کا سود وصول کر کے صدقہ کیا جائے یا وصول ہی نہ کیا جائے؟

سوال:- بینک میں بغرضِ حفاظت روپیہ رکھا جاتا ہے، بینک باقاعدہ حساب کر کے رقم سود والے حساب میں جمع کر دیتا ہے، میرے حساب میں جو رقم سود کی جمع ہوتی ہے بغیر نیتِ اجر فوراً غریبوں کو دے دیتا ہوں، بڑی رقم سود کی، دینی مدارس کے یتیم نادار بچوں کے خرچے کے لئے بھیج دیتا ہوں، مفتی اعظم صاحب کو بھی ایک مرتبہ زکوٰۃ اور سود کی رقم بھیجی تھی، رسید آگئی، اس معاملے میں جناب کی رہبری کی ضرورت ہے۔

جواب:- اصل مسئلہ یہی ہے کہ بینک سے سود وصول ہی نہ کرنا چاہئے^(۱) بلکہ ایسے اکاؤنٹ میں رقم رکھوانی چاہئے جس پر سود لگایا ہی نہ جاتا ہو، کیونکہ سود کا معاملہ کرنا اور اسے وصول کرنا بذاتِ خود گناہ ہے، غریبوں کو بغیر ثواب کی نیت کے دے دینا اس گناہ کا کفارہ ہے، اور گناہ کر کے کفارہ کرنے سے بہتر یہ ہے کہ گناہ کیا ہی نہ جائے۔ لہذا آئندہ آپ سود وصول ہی نہ کیا کریں۔ حضرت مفتی اعظم رحمۃ اللہ علیہ کا فتویٰ یہی تھا۔

واللہ سبحانہ اعلم

ھ ۱۳۹۷/۱/۲۱

(فتویٰ نمبر ۱۵۱/۲۸ الف)

(۱) ۲۱ و ۳ دیکھئے ص ۲۶۸ پر حضرت والا دامت برکاتہم کی اہم وضاحت نیز دیکھئے ص ۲۶۷ کا حاشیہ نمبر ۱، ص ۱۲۰ و ص ۱۲۱ کے حواشی اور مزید اہم تفصیل کے لئے ص ۱۲۹ کا فتویٰ۔

بینک میں رقم رکھوانے اور کرنٹ اور سیونگ اکاؤنٹ کا حکم

سوال ۱:- بینک میں پیسہ رکھا جاسکتا ہے یا نہیں؟

۲:- اس کے علاوہ سیونگ کھاتہ میں سود ملتا ہے، وہ سود لیا جائے یا بینک والوں کے پاس ہی

چھوڑ دیا جائے یا لے کر خیرات کر دیا جائے؟

جواب:- بہتر تو یہ ہے کہ روپیہ کی حفاظت کا خود کوئی انتظام کیا جائے یا بینک میں لا کر کرایہ

پر لے کر اس میں روپیہ رکھوایا جائے، لیکن اگر ان دونوں صورتوں میں شدید دشواری ہو تو بینک کی اس مد میں روپیہ رکھوایا جائے جس میں سود نہیں لگتا، مثلاً کرنٹ اکاؤنٹ۔

۲:- سیونگ اکاؤنٹ میں چونکہ سود لگتا ہے، اس لئے اس میں روپیہ رکھوانا درست نہیں،^(۱)

اگر غلطی سے رکھوایا تو سود کی رقم وصول نہ کی جائے،^(۲) اور اگر غلطی سے وصول بھی کر لی تو صدقہ کر دی جائے۔^(۳)

واللہ اعلم

ھ ۱۳۹۷/۵/۸

(فتویٰ نمبر ۲۸/۴۵۶ ب)

مسلم ممالک کے لئے غیر مسلم ممالک کے بینکوں میں رقم جمع کرا کر سود وصول کرنے کا حکم

سوال:- اکثر سننے میں آیا ہے کہ امیر مسلمان ممالک اپنا فالتو سرمایہ امریکا یا یورپ کے

بینکوں یا سودی کاروبار میں لگاتے ہیں، کیونکہ فی الحال ان کے اپنے وسائل اتنے نہیں کہ اپنے ملک کے اندر تمام سرمایہ لگا سکیں، عام معلومات یہ ہیں کہ یہ امیر مسلمان ممالک حاصل شدہ سودی رقم غریب برادر ممالک کو اسلحہ اور اس قسم کی دیگر ضروریات کے لئے صرف کرتے ہیں۔

جواب:- اگر آپ کا سوال یہ ہے کہ غیر مسلم ممالک کے بینکوں میں روپیہ جمع کرا کر اس پر

سود وصول کرنا جائز ہے یا نہیں؟ سو اس کا جواب یہ ہے کہ بعض فقہاء نے دار الحرب کے کفار سے سودی معاملے کی گنجائش دی ہے،^(۴) مسلمان ممالک ضرورت کے مواقع پر غریبوں کی امداد کے لئے اس گنجائش پر عمل کر سکتے ہیں اور بلا ضرورت اس سے احتراز واجب ہے۔^(۵)

واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم

ھ ۱۳۹۷/۷/۱

(فتویٰ نمبر ۲۸/۶۸۳ ب)

(۳ تا ۱) دیکھئے ص: ۲۶۸ پر اہم وضاحت اور ص: ۱۴۰ و ص: ۱۴۱ کے حواشی اور ص: ۲۸۴ کا حاشیہ نمبر ۴، مزید اہم تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو ص: ۱۲۹ کا فتویٰ۔

(۵ و ۴) دیکھئے ص: ۲۶۷ پر حضرت والا دامت برکاتہم کا فتویٰ اور ص: ۲۶۷ و ص: ۲۶۸ کے حواشی۔

سیونگ اکاؤنٹ کے سودی منافع سے متعلق جامعہ ازہر کے شیخ طنطاوی کے فتویٰ کی حیثیت

سوال:- عرض ہے کہ میرے پاس کچھ نقد رقم ہے، میرا ذہن کاروباری نہیں کہ میں اس رقم سے کوئی کاروبار شروع کر لوں اور نہ ہی مجھے زمینوں کے جھگڑے نبھانے آتے ہیں کہ میں اس رقم سے فروخت کرنے کی غرض سے کچھ زمین خرید لوں۔ لہذا میں اپنی اس نقد رقم کو حکومت پاکستان کے قومی بچت (نیشنل سیونگ) میں رکھنا (انوسٹ کرنا) چاہتا ہوں، تاکہ اس رقم سے میں منافع (پرافٹ) حاصل کر سکوں۔ اس لئے کہ کچھ عرصہ پہلے ایک اردو اخبار میں جامعہ ازہر قاہرہ، مصر کا ایک فتویٰ شائع ہوا تھا جس میں روپے پیسے کو قومی بچت کے بینکوں میں رکھنا اور اس رقم پر منافع (پرافٹ) لینے کو جائز قرار دیا گیا ہے شریعت کی رو سے۔ آپ سے گزارش ہے کہ آپ اس سلسلے میں فتویٰ دیں، جوابی لفافہ موجود ہے، جواب/فتویٰ جلد از جلد ارسال کیجئے، شکریہ والسلام۔

جواب:- مذکورہ سیونگ اسکیم پر ملنے والا منافع شرعاً سود ہے، اس کا لینا اور اپنے استعمال میں لانا شرعاً حرام ہے۔^(۱) جامعہ ازہر کے شیخ طنطاوی کا جو فتویٰ شائع ہوا ہے، اس کو عالم اسلام کے تقریباً تمام علماء نے سخت تنقید کا نشانہ بنایا ہے، اور وہ فتویٰ قرآن و سنت کے دلائل کی رو سے صحیح نہیں ہے۔

واللہ سبحانہ اعلم

۱۴۱۸/۹/۷ھ

(فتویٰ نمبر ۲۹۶/۳)

سیونگ اکاؤنٹ پر ملنے والے سود کا حکم، نیز حکومت کا

بینک سے زکوٰۃ وصول کرنا

سوال:- زید بینک کا کیشئر ہے، اس نے ۲۷ جون کو مسٹی بکر کے سودی کھاتہ کی اصل رقم مبلغ ایک ہزار روپے کے ساتھ سالانہ سود مبلغ ۷۵ روپے بحساب ساڑھے سات روپے فی صد ملا دی، پھر ۵ جولائی کو کل رقم ایک ہزار پچھتر روپے سے زکوٰۃ کاٹی جو کہ ۲۵ روپے بنتی ہے، لیکن یہ وضاحت نہ کی گئی کہ اصل رقم سے زکوٰۃ کاٹی گئی ہے یا کل سے۔ مندرجہ بالا صورت حال کو سامنے رکھتے ہوئے زکوٰۃ ادا ہوئی یا نہیں؟ نیز اگر کل سے کٹوتی سرکاری طور پر ہوئی ہے بحیثیت ممبر مشاورتی کونسل جناب کے نوٹس میں یہ بات ہوگی کہ کل رقم سے کٹوتی کی صورت میں بندے کے ذہن کے مطابق سود کی

(۱) دیکھئے حوالہ ص: ۲۸۴ کا حاشیہ نمبر ۴۔

آمیزش ہوگئی جو کہ شرعی طور پر قابلِ مواخذہ ہے۔

جواب:- سیونگ اکاؤنٹ چونکہ سودی اکاؤنٹ ہے، اس لئے اس میں رقم رکھوانا جائز نہیں^(۱)، بلکہ اگر بینک میں رقم رکھوانی ہو تو کرنٹ اکاؤنٹ میں رکھوانی چاہئے جس پر سود نہیں لگتا، تاہم آپ نے سیونگ اکاؤنٹ میں جو رقم رکھوائی تھی اُس پر حکومت کی طرف سے جو زکوٰۃ کاٹی گئی شرعاً وہ ادا ہوگئی،^(۲) اصل میں زکوٰۃ تو آپ کی رکھوائی ہوئی رقم پر واجب تھی اور اسی سے زکوٰۃ وضع کی جاتی ہے، اور کچھ تر روپے جو بطور سود آپ کی رقم پر اضافہ ہوا تھا آپ کے ذمے واجب تھا کہ وہ بینک سے نہ لیں، یا اگر لیں تو اس کا صدقہ کر دیں، اس میں سے کچھ رقم اگر زکوٰۃ فنڈ میں چلی گئی تو اس سے آپ کی زکوٰۃ کی ادائیگی پر کچھ فرق نہیں پڑا، بہر صورت آپ کی مندرجہ رقم کی زکوٰۃ ادا ہو چکی ہے، آئندہ اپنی رقم کرنٹ اکاؤنٹ میں رکھوائیں تاکہ سود نہ لگے، یا پھر سیونگ اکاؤنٹ ہی میں یہ لکھ دیں کہ ہماری اس رقم پر سود نہ لگایا جائے۔

واللہ اعلم بالصواب

۱۵/۱۱/۱۴۰۱ھ

(فتویٰ نمبر ۱۷۰۶/۳۲ ج)

سیونگ اور ڈپازٹ سرٹیفکیٹ پر اصل رقم سے زائد ملنے والی رقم ”سود“ ہے

سوال:- حکومت پاکستان کی جانب سے سرمایہ لگانے کی بہت ساری اسکیمیں ہیں،
۱- ڈیفنس سیونگ سرٹیفکیٹس، ۲- نیشنل سیونگ سرٹیفکیٹ، ۳- خاص ڈپازٹ سرٹیفکیٹس وغیرہ، کیا ان کو خریدنے کے بعد حکومت سے مقررہ نفع وصول کرنا جائز ہے؟

جواب:- سیونگ سرٹیفکیٹ اور ڈپازٹ سرٹیفکیٹ پر جو رقم اصل رقم سے زائد ”انٹرسٹ“ کے نام سے دی جاتی ہے، وہ شرعاً سود ہے،^(۳) اور اُس کا وصول کرنا حلال نہیں، اگر غلطی سے وصول کر لی

(۱) دیکھئے اسی صفحہ کا حاشیہ نمبر ۴۔

(۲ و ۳) بینکوں سے زکوٰۃ کی کنوتی سے متعلق تفصیل کے لئے حضرت والا دامت برکاتہم کا مقالہ ”بینکوں اور مالیاتی اداروں سے متعلق“ اور اُس پر حضرت والا دامت برکاتہم کا تازہ اہم نوٹ فتاویٰ عثمانی ج: ۲ ص: ۸۰ تا ص: ۱۴۵ ملاحظہ فرمائیں۔

(۳) کیونکہ وہ قرض پر اضافہ ہے جو ”سود“ ہے۔

وفی کنز العمال رقم الحدیث: ۱۵۵۱۶ ج: ۶ ص: ۲۳۸ کل قرض جر منفعة فهو ربا. وكذا في الجامع الصغير ج: ۶ ص: ۹۴.

وفی اعلاء السنن ج: ۱۳ ص: ۴۹۸ (باب كل قرض جر منفعة) عن علي أمير المؤمنين رضي الله عنه مرفوعاً: كل قرض جر منفعة فهو ربا. وأخرجه البيهقي ج: ۵ ص: ۳۵۰ وكذا في المرقاة ج: ۶ ص: ۶۷ و ۶۸ وأرواء الغلیل ج: ۵ ص: ۲۳۴ و در منشور للسيوطی ج: ۵ ص: ۳۵۰ والمطالب العالیة لابن حجر ص: ۱۳۷۳.

وفی الدر المختار ج: ۵ ص: ۱۶۶ وفی الأشباه كل قرض جر نفعاً فهو حرام..... (باقی اگلے صفحے پر)

جائے تو کسی غریب کو صدقہ کر دی جائے۔

واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۷/۶/۸ھ

(فتویٰ نمبر ۵۶۱/۲۸ ب)

ضرورت کی بناء پر بینک سے سودی قرض لینے کا حکم

سوال:- کیا بینک سے سودی قرض بضرورت لینا جائز ہے؟

جواب:- بینک سے سود پر قرض لینا جائز نہیں ہے۔

واللہ سبحانہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۸/۶/۵ھ

(فتویٰ نمبر ۶۷۷/۱۹ الف)

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع عفی عنہ

بینک میں رقم رکھوانے کا حکم

سوال:- بینک میں رقم جمع کرانا جائز ہے یا نہیں؟

جواب:- بینک میں رقم رکھوانا ضروری ہو تو کرنٹ اکاؤنٹ میں رکھوائے جس پر سود

واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۸/۲/۸ھ

(فتویٰ نمبر ۱۲۳/۲۹ الف)

نہیں دیا جاتا۔

مستحق کے لئے سود کی رقم کسی بھی ضرورت میں استعمال کرنا جائز ہے

سوال:- ایک شخص نے سود کی رقم ایک فقیر کو دی، اور وہ اس موصوفہ رقم کو سود کی معلوم ہونے

پر کھانے پینے کے علاوہ کرایہ وغیرہ میں استعمال کرے تو کیا یہ جائز ہے یا نہیں؟ کھانے میں اس لئے

استعمال نہیں کرتا کہ وہ خود اگرچہ فقیر یا ضرورت مند ہے لیکن صاحب تقویٰ ہے، مجبوری کی وجہ سے ان

دیگر مدت رقم استعمال کر لیتا ہے، کیا یہ جائز ہے یا نہیں؟ نیز اگر ایک شخص کے اکاؤنٹ میں سود کی رقم

لگ جائے، وہ اس کو رفاہی کاموں میں استعمال کرے، کیسا ہے؟ یا مسجد یا مدرسے کے غسل خانے اور

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)

وفی بدائع الصنائع ج: ۷ ص: ۳۹۵ وأما الذي يرجع الى نفس القرض فهو أن لا يكون فيه جرّ منفعة فان كان لم يجز
كان أقرضه وشرط شرطاً له فيه منفعة.

وفی المبسوط للسرخسی ج: ۱۴ ص: ۳۵ أن المنفعة اذا كانت مشروطة فی الاقراض فهو قرض منفعة.

وفی البحر الرائق ج: ۶ ص: ۱۲۱ ولا يجوز قرض جرّ نفعاً. وكذا فی فی الهندیة ج: ۳ ص: ۲۰۲ وشرح المجلة

ج: ۲ ص: ۳۵۴ اشارة الى هذا وقال شمس الأنمة الحلواني انه حرام لانه قرض جرّ منفعة - نیز بینکوں کے سود سے متعلق

تفصیل کے لئے امداد الفتاویٰ ج: ۳ ص: ۱۵۵ میں حضرت حکیم الامت رحمہ اللہ کا رسالہ ”رافع الضنک عن منافع البنک“ اور

امداد المفتین میں ص: ۸۴۹ تا ۸۵۱، اور حضرت والا دامت برکاتہم کا رسالہ پی ایل ایس اکاؤنٹ ملاحظہ فرمائیں۔ (محمد زبیر حق نواز)

بیت الخلاء بنوادے تو کیسا ہے؟ کیا سودی کاروبار کرنے والے کا ہدیہ کسی فقیر صاحب تقویٰ عالم کے لئے کرایہ وغیرہ میں لگانا جائز ہے؟

جواب:- سود کی رقم اگر اصل مالک کو واپس پہنچانا ممکن نہ ہو تو بغیر نیتِ ثواب کے اس کا صدقہ کرنا واجب ہے۔^(۱) ایسی صورت میں جس فقیر کو وہ رقم دی جائے، اس کے لئے اُسے اپنے ہر استعمال میں لانا جائز ہے، خواہ کھانا پینا ہو، یا کرائے میں دینا ہو، تاہم اگر کوئی فقیر تقویٰ کے لحاظ سے اُسے کھانے پینے میں استعمال کرنے سے پرہیز کرے تو اس میں بھی کچھ حرج نہیں۔ اور اس مسئلے میں عالم غیر عالم کا کوئی فرق نہیں ہے، ہاں اگر کسی عالم کے سود کی رقم لینے سے اندیشہ ہو کہ لوگوں کے دل سے سود کی حرمت کی سنگینی میں کمی آئے گی تو ایسی صورت میں عالم کے لئے بہتر یہ ہے کہ وہ سود کی رقم معلوم ہونے کے بعد نہ لے۔

واللہ سبحانہ اعلم بالصواب

۱۴۱۲/۱/۱۶ھ

قرض پر منافع حاصل کرنے کی دو صورتوں کا حکم

سوال ۱:- برادرانِ اسلام، السلام علیکم، کے بعد عرض یہ ہے کہ کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلے میں کہ محمد حسین نامی شخص کو پیسوں کی سخت ضرورت پڑی، اس نے تمام شہر سے سوال کیا کہ مجھے پندرہ سو روپے دے دیں، مگر کسی نے نہ دیا، لیکن ایک شخص بنام سردار نے کہا کہ میں تجھے پندرہ سو روپے دیتا ہوں مگر اس شرط پر کہ تیرا فلاں رقبہ جو پانچ ایکڑ ہے اس کا نصف فصل جو تجھے ملے وہ بھی مجھے دے دیں اور یہ پندرہ سو روپیہ بھی واپس کر دیں یا روپے مذکورہ اور پانچ ایکڑ۔ رقبہ مذکورہ محمد حسین نے پہلے کسی دوسرے شخص کو بٹائی پر دیا ہوا تھا اس کا نصف فصل مذکورہ محمد حسین نے لیا تھا اس وقت محمد حسین نے یہ شرط قبول کر لی۔ اور پندرہ سو روپے لے لیا، اب یہ رقم شرعاً حلال ہے یا نہیں؟ اگر حرام ہے تو سود بنتا ہے یا نہیں؟ کتاب و سنت کی روشنی میں جواب سے مطلع فرمادیں۔ شکریہ۔

۲:- ایک شخص پندرہ ایکڑ رقبہ اس شرط پر دیتا ہے کہ رقبہ پندرہ ایکڑ کے بدلہ دو ہزار روپے مجھے دیدے اور رقبہ تو کاشت کر لے، اس سے حاصل فصل جتنا بھی ہو نصف تیرا، نصف میرا، جب تک میں دو ہزار روپیہ واپس نہ دوں یہ رقبہ تم کاشت کرتے رہو، جب رقم ادا کر دوں گا رقبہ واپس لے لوں گا، یہ جائز ہے یا نہیں؟ ہمارے علاقے میں یہ بیماری بڑی ہو گئی ہے برائے مہربانی جلدی جواب دے کر ممنون فرمائیں۔

(۱) دیکھئے ص: ۱۲۰ و ص: ۱۲۱ کے حواشی اور ص: ۱۲۹ کا فتویٰ۔

جواب ا:- مذکورہ معاملہ بلاشبہ سود ہے،^(۱) اور اس طرح کا معاملہ فریقین کے لئے حرام ہے، اس معاملے کو فوراً ختم کرنا واجب ہے۔^(۲)

۲:- یہ معاملہ بھی ناجائز ہے، کیونکہ دو ہزار روپے جب واپس کرنے کی غرض سے لئے گئے تو وہ شرعاً قرض ہوئے، اور اس کے ساتھ زمین بٹائی پر لینے کی شرط لگانا ”کل قرض جر منفعة“^(۳) میں داخل ہے، اور دوسری طرف اگر اس معاملے کی توجیہ یوں کی جائے کہ زمین بٹائی پر دینے کے لئے دو ہزار روپے قرض دینے کی شرط لگائی گئی ہے تو بٹائی میں اس طرح کی شرط فاسد لگانا بھی جائز نہیں، لہذا یہ معاملہ شرعاً ناجائز ہے۔^(۴)

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۱۳۹۹/۱۰/۵ھ

(فتویٰ نمبر ۱۷۳۷/۳۰ د)

مسجد کا چندہ سودی اکاؤنٹ میں جمع کرا کر سود وصول کرنے کا حکم

سوال:- مسجد کمیٹی ضیاء المساجد نواب شاہ سکھر نے مسجد کی اعانت کے سلسلے میں وصول ہونے والی عطیات کی رقم ایک بینک میں جمع کر کے حساب و کتاب کھلوا یا ہے، بینک والوں نے اب اس رقم پر کچھ سود کی رقم جمع کی ہے، مسجد کمیٹی اس سلسلے میں شرعی حکم معلوم کرنے کی خواہش مند ہے۔

جواب:- مذکورہ سود کی رقم بینک سے وصول نہ کی جائے،^(۵) اور اگر غلطی سے وصول کر لی جائے تو غریبوں میں صدقہ کر دی جائے،^(۶) مسجد پر خرچ نہ کی جائے، اور آئندہ اگر مسجد کا روپیہ بینک میں رکھوانا ضروری ہو تو کرنٹ اکاؤنٹ میں رکھوایا جائے جس پر سود نہیں لگتا۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۱۳۹۷/۱۱/۱۳ھ

(فتویٰ نمبر ۱۷۷۹/۲۸ ج)

ایل سی کھولتے وقت پوری رقم جمع نہ کرانے کی صورت میں

دو خرابیوں کی وجہ سے معاملہ ناجائز ہے

سوال:- اپورٹ ایکسپورٹ کا کاروبار جو اور لحاظ سے جائز ہو مگر L/C کی وجہ سے ان

(۱ و ۲) حوالہ کے لئے دیکھئے ص: ۲۸۴ کا حاشیہ نمبر ۴۔

(۳) دیکھئے ہدایۃ، کتاب المزارعة ج: ۴ ص: ۴۲۶ (طبع شرکت علمیہ ملتان)

الدر المختار ج: ۶ ص: ۲۷۶ (طبع سعید)

البحر الرائق ج: ۸ ص: ۲۹۳ (طبع رشیدیہ کوئٹہ)

وشرح المجلة رقم المادۃ: ۱۳۳۵ ج: ۲ ص: ۷۶۱ (طبع دار الکتب العلمیۃ بیروت)

(۵ و ۶) دیکھئے ص: ۲۶۸ پر حضرت والا دامت برکاتہم کی اہم وضاحت نیز ص: ۱۲۰ و ص: ۱۲۱ کے حواشی اور اہم تفصیل کے لئے ص: ۱۲۹ کا

فتویٰ ملاحظہ فرمائیں۔

کے اخراجات آمدنی میں ایک قلیل عنصر سود کا شامل ہو جاتا ہے، مثال کے طور پر جس دن بینک Retire Documents کرنے کے لئے Advice دیتا ہے، اس دن بھی کاغذات Retire کرنے پر ایک دن کا Interest ادا کرنا پڑتا ہے، کیا یہ مجبوری اضطراری شمار ہوگی؟ اور اس طرح یہ آمدنی جائز قرار دی جائے گی؟

جواب:- اگر ایل سی کھولتے وقت پوری رقم جمع نہ کرائی جائے تو اس میں صرف یہی خرابی نہیں ہے جو آپ نے ذکر کی، بلکہ اس میں ایک اور خرابی بھی ہے، اور وہ یہ کہ بینک گارنٹی کی فیس دینی پڑتی ہے، شرعاً وہ بھی ناجائز ہے، لہذا شرعی اعتبار سے جائز طریقہ یہ ہے کہ ایل سی کھولتے وقت پوری رقم جمع کرادی جائے،^(۲) یا کسی ایسے بینک سے معاملہ کیا جائے جو اسلامی اصولوں کے مطابق کام کرتا ہو۔

واللہ اعلم

۱۳۰۹/۱۲/۲۹ھ

(فتویٰ نمبر ۲۳۷۵/۴۰ و)

بینک کا کسی کمپنی کو ڈالر کے ڈسکاؤنٹ پر ایل سی کھول کر

بعد میں ادا شدہ ڈالر کی قیمت سے زیادہ وصول کرنا

سوال:- مسئلہ یہ ہے کہ اگر ہم ایک پارٹی کو پاکستان سے باہر مال بیچتے ہیں تو اس کے لئے بینک میں ایل سی کھولتے ہیں، فرض کریں کہ ہم نے ایک ڈالر کے حساب سے کوئی چیز تین ماہ کی ادائیگی پر بیچی ہے، تو بینک یہ سہولت دیتا ہے کہ ہم بینک سے فوراً ادائیگی لے لیں، اور بینک ہماری پارٹی سے تین ماہ کے بعد ہمارے بجائے خود ادائیگی وصول کرے گا۔ اس میں ایک مسئلہ یہ ہے کہ جب بینک ہمیں ادا کرے گا تو وہ ادائیگی کے وقت ڈالر کا جو ریٹ ہوگا اس سے کرے گا، اور پارٹی سے جب تین ماہ بعد ادائیگی وصول کرے گا تو وہ اس ادائیگی کے وقت کا ریٹ لگائے گا، اور اس میں زیادہ گمان ڈالر کے ریٹ بڑھنے کا ہوتا ہے، اس طرح ایل سی کھول کر کام سود کے زمرے میں تو نہیں آتا؟

مزید وضاحت اس سلسلے میں یہ ہے کہ جب خریدار DA90 دونوں کی ایل سی کھولتا ہے تو بینک ہمیں ڈسکاؤنٹ نرخ کے اوپر فوراً ادا کر دیتا ہے، بشرطیکہ ہماری ساکھ اچھی ہو، اس کا طریقہ یہ ہے کہ بینک ہمیں ڈالر ڈسکاؤنٹ ریٹ کے اوپر ادا کرتا ہے، اگر حاضر میں 19.75 ڈالر کا نرخ ہے تو بینک ہم سے ڈسکاؤنٹ خرید لیتی ہے، اور اس نے ہم کو 19.25 روپے کے حساب سے ادا کیا، جب مقررہ

(۲۱) تفصیل کے لئے حضرت والا دامت برکاتہم العالیہ کی کتاب ”اسلام اور جدید معیشت و تجارت“ ص: ۱۱۹ تا ۱۲۲ ملاحظہ فرمائیں۔ (محمد زبیر)

وقت پر بینک کو ادائیگی وصول ہوتی ہے تو اس وقت کے حالات کے مطابق جو بھی بینک ریٹ ہوتا ہے وہ ملتا ہے، چاہے وہ 20.50 روپے ہو جائے، اس سے ہمارا کوئی واسطہ نہیں۔ اس کے بارے میں آگاہ فرمائیں۔

جواب:- محترمی و مکرمی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کا خط ملا، آپ نے جو صورت حال لکھی ہے وہ ایک طرح جائز ہو سکتی ہے اور وہ یہ کہ خریدار کے ذمے آپ کی جو قیمت واجب ہوئی خریدار اس کا حوالہ بینک کو ڈالروں کی شکل میں دے، اور بینک اس حوالے کو قبول کرے، پھر اگر بینک آپ کو قانونی مجبوری کی وجہ سے ڈالر دینے کے بجائے ڈالر کی اس روز کی قیمت کے لحاظ سے پاکستانی روپیہ دے اور بعد میں اصل خریدار سے ڈالر وصول کرے یا ڈالر کی اس روز کی قیمت کی کوئی اور کرنسی وصول کرے تو جائز ہے، لیکن واضح رہے کہ حوالے کے معاملے میں ڈالر کی ادائیگی کا طے ہونا معاملے کی صحت کے لئے انتہائی ضروری ہے۔^(۱)

مزید یہ واضح رہے کہ جتنے ڈالر کا حوالہ کیا گیا، بینک کو اتنے ہی ڈالر آپ کو دینے ضروری ہوں گے، ان میں کمی بیشی جائز نہیں ہوگی، لہذا بلوں کو ڈسکاؤنٹ کرنے کا جو طریقہ رائج ہے،^(۲) وہ سود ہے۔^(۳) نیز آپ کو جو پاکستانی روپیہ ادا کیا جا رہا ہے وہ ڈالر کے مارکیٹ ریٹ پر یا بینک ریٹ پر ہونا ضروری ہے (لقلولہ علیہ السلام لا بأس أن تأخذها بسعر يومها، رواہ أبو داؤد)،^(۴) مارکیٹ اور بینک ریٹ سے اتنی کمی بیشی جس میں بینک اپنے سود کی مقدار پوری کر لے جائز نہیں۔ ہاں! ڈالر کی بازاری قیمت میں تین ماہ کے اندر جو فرق آئے گا وہ فرق بینک کا منافع ہو سکتا ہے۔ واللہ اعلم

۱۴۰۹/۹/۵ھ

(فتویٰ نمبر ۱۵۵/۴۰ د)

پراویڈنٹ فنڈ پر ملنے والے نفع کا حکم

سوال:- ایک ملازم کی تنخواہ سے ماہوار ایک خاص رقم بطور ”جی. پی فنڈ“ کاٹ دی جاتی ہے اور جس وقت ملازم کی میعادِ ملازمت ختم ہو جاتی ہے تو ریٹائر ہونے کے بعد جتنی رقم اس ملازم کی جمع ہوئی ہے اس کی دُگنی رقم امداد کی شکل میں مل جاتی ہے، کیا اس رقم کا لینا جائز ہوگا؟

(۱) فی الہدایۃ کتاب الحوالۃ ج: ۳ ص: ۱۳۶ (طبع رحمانیہ) وتصح الحوالۃ برضاء المحیل والمحتال والمحتال علیہ.
(۲ و ۳) تفصیل کے لئے حضرت والا دامت برکاتہم کی کتاب بحوث فی قضایا فقہیۃ معاصرۃ ج: ۲ ص: ۹۸ تا ص: ۱۲۶ ملاحظہ فرمائیں۔

(۴) ج: ۲ ص: ۱۲۰ (طبع مکتبہ امدادیہ ملتان)۔

جواب:- جبری پراویڈنٹ فنڈ پر جو زیادتی محکمہ دیتا ہے وہ بحکم سود نہیں ہے، اس لئے اس کا لینا جائز ہے۔^(۱)
واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۸۸/۲/۲۹ھ
(فتویٰ نمبر ۳۳۱/۱۹ الف)

بینک کے سود کا حکم، بینک میں کونسا اکاؤنٹ کھلوانا درست ہے؟

سوال ۱:- بینک کے سود کا کیا حکم ہے؟ وہ لینا چاہئے یا نہیں؟ اگر لے لیا تو کیا حکم ہے؟
۲:- دارالعلوم یا دیگر رفاہی ادارے جو بینک میں پیسے رکھتے ہیں وہ کونسے اکاؤنٹ میں رکھواتے ہیں؟ اور سودی رقم کا کیا مصرف لیتے ہیں؟

جواب ۱:- بینک کا سود لینا نہ چاہئے، غلطی سے لے لیا تو بغیر نیتِ ثواب صدقہ کر دے،^(۲)
اور ملازموں وغیرہ کو بھی دیا جاسکتا ہے بشرطیکہ اجرت میں نہ لگائیں۔

۲:- روپیہ کرنٹ اکاؤنٹ میں رکھواتے ہیں، جس پر سود نہیں لگتا، اور ایسا ہی سب کو کرنا چاہئے۔
واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم

۱۳۹۷/۱۰/۵ھ

پراویڈنٹ فنڈ پر سود کے نام سے ملنے والی رقم کا حکم

سوال:- میں ایک کمپنی میں ملازم ہوں، جہاں ہر ماہ میری تنخواہ سے کچھ پیسے کٹتے ہیں، ان پیسوں کے برابر کمپنی اپنی طرف سے اتنا ہی پیسہ ہمارے نام جمع کرتی ہے، اس کے علاوہ ان پیسوں پر سود بھی دیا جاتا ہے، کیا یہ سود شمار ہوگا یا نہیں؟

جواب:- یہ صورت پراویڈنٹ فنڈ کی ہے، اس کا لینا جائز ہے، اور سود کے نام سے اس میں جو رقم دی جاتی ہے، شرعاً وہ سود نہیں ہے، اس کو وصول کرنا اور استعمال میں لانا درست ہے، اس مسئلے کی مفصل تحقیق مع دلائل مطلوب ہو تو حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب کا رسالہ پراویڈنٹ فنڈ ملاحظہ فرمائیں۔^(۳)
واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم

۱۳۹۷/۲/۶ھ

(فتویٰ نمبر ۳۷۶/۲۸ ب)

(۱) تفصیل کے لئے رسالہ ”پراویڈنٹ فنڈ پر زکوٰۃ اور سود کا مسئلہ“ ملاحظہ ہو۔

(۲ و ۳) فی الشامیۃ ج: ۵ ص: ۹۹ (طبع سعید) لا یحل اذا علم عین الغاصب مثلاً وان لم یعلم مالکھ لما فی البزازیۃ اخذ مورث رشوة أو ظلماً، ان علم ذلك بعینه لا یحل له اخذه والا فله اخذه حکماً أما فی الدیانۃ فیتصدق به بنية ارضاء الخدماء۔ اھ نیز دیکھئے ص: ۲۶۸ پر حضرت والا دامت برکاتہم کی اہم وضاحت اور مزید تفصیل اور حوالہ جات کے لئے ص: ۱۲۰ کے حواشی اور ص: ۱۲۹ کا فتویٰ ملاحظہ فرمائیے۔

(۳) مزید دیکھئے امداد الفتاویٰ ج: ۳ ص: ۱۵۲ (مکتبہ دارالعلوم کراچی)۔

ہاؤسنگ سوسائٹی سے مکان خریدنے کا حکم

سوال:- ایک شخص کے پاس مکان بنوانے کے لئے رقم نہیں ہے، کرایہ کے مکان میں رہتا ہے، کیا وہ شخص ہاؤسنگ سوسائٹی سے قرض لے سکتا ہے یا نہیں؟

جواب:- سود پر قرض لینا تو حرام ہے،^(۱) البتہ جو سوسائٹی مکان فروخت کر رہی ہے اُس سے جس قیمت پر بھی معاملہ ہو جائے وہ کیا جاسکتا ہے، بالاقساط رقم ادا کرنے کی صورت میں اگر وہ مکان کی قیمت، نقد قیمت کے مقابلے میں بڑھا کر وصول کرے تو اس طرح خریدنے کی بھی گنجائش ہے۔^(۲)

واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم

ھ ۱۳۹۷/۱۰/۱۱

”این.آئی.ٹی“ یونٹ کی جدید صورتِ حال اور اس کا شرعی جائزہ

سوال:- N.I.T یونٹ جس کا شمار سرکاری تمسکات میں ہوتا ہے، اس کا شرعی حکم جاننا چاہتا ہوں، مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے بعد کساد بازاری پیدا ہوئی تو حکومت پاکستان نے مذکورہ یونٹ کی تجارتی ساکھ کو برقرار رکھنے کے لئے قیمت اور نفع مقرر کر دیا ہے، ایسی صورت میں نفع سود کی تعریف میں آئے گا یا نہیں؟ اور اس کو رشتہ داروں، حاجت مندوں پر خرچ کیا جاسکتا ہے یا نہیں؟

جواب:- اس نئی صورتِ حال کی بناء پر ”این.آئی.ٹی“ یونٹ کا مسئلہ مشتبہ اور قابلِ غور ہو گیا ہے، اس کے لئے ہمیں ”این.آئی.ٹی“ یونٹ کی پوری اسکیم کے مطالعے کی ضرورت ہے، لہذا اسمبلی کے جس ایکٹ یا حکومت کے جس گزٹ کے ذریعے یہ اسکیم جاری ہوئی ہے، براہ کرم اس کی ایک کاپی کہیں سے فراہم کر کے ہمیں بھجوا دیجئے، کیونکہ اس پر غور کر کے ہی کوئی جواب دیا جاسکتا ہے، واضح رہے کہ ”این.آئی.ٹی“ یونٹ کے پراسپیکٹس جو مطبوعہ ملتے ہیں وہ ہمارے پاس موجود ہیں، مگر ان سے بات واضح نہیں ہوتی، لہذا اصل اسکیم جس ایکٹ یا گزٹ کی بنیاد پر جاری ہوئی، وہ کہیں سے فراہم کر کے بھیج دیجئے۔

واللہ اعلم

ھ ۱۳۹۶/۱۱/۲۸

(فتویٰ نمبر ۲۷۳۰/۲۷ د)

(۱) دیکھئے ص: ۲۸۳ کا حاشیہ نمبر ۲۔

(۲) حوالہ جات کے لئے دیکھئے ص: ۱۱۵ اور ص: ۳۱۰ کا حاشیہ۔

”این آئی ٹی“ کے کاروبار اور اس کے یونٹ خریدنے کا تفصیلی حکم

سوال :- آپ کا خط مؤرخہ ۱۳۹۸/۳/۱۷ء آج موصول ہوا، آپ کا خط پڑھ کر مجھے بڑی حیرت ہوئی، غالباً پچھلے خط میں اپنا مافی الضمیر میں آپ کو واضح طور پر بتلا نہیں سکا۔
آپ کی مایہ ناز تصنیف میں مجھے یہ بات محل نظر معلوم ہوئی کہ آپ نے N.I.T کاروبار کو جائز کہا ہے، اس ضمن میں میں نے عرض کیا تھا کہ یہ بھی گورنمنٹ کنٹرول میں ایک ادارہ ہے، جس کا کاروبار یہ ہے کہ سرمایہ کمپنیوں کے حصص کی خریداری میں لگاتے ہیں اور گورنمنٹ کے سودی کاروبار میں اس طرح جو منافع اور سود حاصل ہوتا ہے اس کو ایک خاص طریقے سے تقسیم کر دیتے ہیں، اصل سرمایہ محفوظ اور سرمایہ پر منافع کی گارنٹی ہوتی ہے۔
آپ کی طرف سے وضاحت یہ ہوتی کہ بہر حال یہ سود نہیں ہے اور جائز ہے، تو میں مان لیتا یا آپ یہ کہتے کہ یہ ناجائز ہے۔

آپ نے جو خط لکھا اس سے جو صورت حال بنتی ہے وہ یہ ہے :-
بقول آپ کے اُس وقت N.I.T میں نفع کی کوئی ضمانت نہ تھی، بلکہ یہ اصول تھا کہ یونٹ لینے والا کاروبار کے نفع و نقصان دونوں میں شریک ہوگا، اُس وقت یہ کاروبار بلاشبہ جائز تھا۔ نفع و نقصان میں شرکت محض بہکانے کے لئے تھی، اُس وقت بھی ۱- حکومت کا اس میں حصہ تھا، ۲- اس رقم سے جو اس ادارے میں جمع ہوتی تھی سود وغیرہ کا غیر شرعی کاروبار کیا جاتا تھا۔
ان دونوں شقوں کے ہوتے ہوئے اب اس کاروبار کو ”بلاشبہ جائز“ قرار دے رہے ہیں، دوبارہ غور فرمائیں۔

جب گورنمنٹ پبلک کو یہ اطمینان دلانے کے لئے کہ ان کو ڈھائی فیصد سود کم سے کم ضرور ملے گا تا کہ لوگ اس میں روپیہ لگائیں، آپ کو یہ معلوم ہوگا کہ یونٹ خریدنے پر انکم ٹیکس میں چھوٹ مل جاتی ہے۔

اُس وقت کا ذکر کر کے آپ لکھتے ہیں :-

”اس کے شرعی جواز میں تردد پیدا ہو گیا، لیکن بعد میں علماء کی ایک مجلس میں یہ مسئلہ زیر غور آیا تو اس ادارے کے ذمہ داروں سے رابطہ قائم کیا گیا، معلوم ہوا کہ یہ ادارہ خالص نجی شعبے سے تعلق رکھتا ہے، حکومت نے اس کے کچھ حصے ضرور لئے ہیں مگر ان کا تناسب مجموعے کے مقابلے میں بہت کم ہے، اس لئے علماء اور اہل فتویٰ نے یہ فیصلہ فرمایا کہ یہ کاروبار چند شرائط کے ساتھ جائز ہو سکتا ہے: ۱- حکومت

کا اس میں حصہ نہ ہو، ۲- اس رقم سے جو ادارے میں جمع ہوتی ہے سود وغیرہ کا کوئی غیر شرعی کاروبار نہ کیا جائے، بلکہ تجارت کی جائے۔ ان دو شرطوں کی موجودگی میں اگر حکومت فریق ثالث کی حیثیت سے ڈھائی فیصد منافع کی ضمانت دیدے تو یہ سود نہیں ہوگا۔“

آپ کی خدمت میں عرض ہے کہ کیا حکومت نے یہ دو شرائط مان لی ہیں، اور یہ کاروبار شرعی ہو گیا یا حکومت نے یہ شرائط نہیں مانیں اور یہ کاروبار غیر شرعی ہے۔ ظاہر ہے کہ نہیں مانیں تو پھر اس کو غیر شرعی ماننے میں آپ کو کیا تکلف ہے؟

یہ بھی عجوبہ ہے کہ ایک طرف تو آپ حکومت کو اس میں حصہ نہ لینے کو کہتے ہیں اور دوسری طرف اس کو فریق ثالث بناتے ہیں۔

اس کو بجائے "Private Sector" کے گورنمنٹ کنٹرول میں کہنے کی کیا آپ کوئی مثال دے سکیں گے "Private Sector" میں کاروبار کرنے والے ادارے کا سربراہ گورنمنٹ مقرر کرتی ہے، آپ کو یاد ہوگا کہ چند سال پیشتر اس کے سربراہ قری C.SP آفیسر تھے۔

زید اور عمر کے مشترکہ کاروبار کی جو مثال آپ نے دی وہ N.I.T پر منطبق نہیں ہوتی، کیونکہ اس میں شراکت کا سوال ہی نہیں ہے، N.I.T اپنے یونٹ بیچتی ہے، اس کی قیمت خرید اور فروخت مقرر کرتی ہے، اس میں شراکت کا کوئی مفہوم ہے ہی نہیں، قرض لیتا اور سود ادا کرتا ہے۔

آپ عالم ہیں، میں آپ کی بات مانے لیتا ہوں، کہ ایک آدمی دوسرے کا روپیہ لے کر اپنی تجارت میں لگائے اور اس کو یقین دلائے کہ تمہارا سرمایہ محفوظ رہے گا، نقصان میں تم شریک نہیں ہو، منافع میں البتہ شریک ہو۔ میں نے سود کے متعلق جو پڑھا ہے وہ تو یہی ہے کہ اگر نفع و نقصان میں شریک ہے تو یہ جائز ہے، اور اگر صرف نفع میں شریک ہے، اس کی شکل کچھ بھی ہو تو سود ہے۔

اگر زحمت نہ ہو تو میرے سوال کا جواب دیں، جو یہ ہے کہ کیا N.I.T کاروبار میں روپیہ لگانا جائز ہے؟ میرے خیال میں یہ سود ہے اور ناجائز ہے۔

جواب:-

این.آئی.ٹی یونٹ میں جب تک حکومت نے ڈھائی فیصد نفع کی ضمانت نہیں دی تھی، اس وقت تک تو اس کاروبار کی اصل نوعیت شریعت کے مطابق تھی، لیکن جب سے حکومت نے ڈھائی فیصد نفع کی ضمانت دی ہے، اُس وقت سے یہ شبہ پیدا ہو گیا ہے کہ اول تو شرکت و مضاربہت میں ہونے والا نفع حاصل نہ ہو جائے وہ کوئی حق واجب نہیں ہوتا، اور ضمانت یا کفالت کی صحت کے لئے شرط یہ ہے کہ حق مضمون حق واجب ہو، لما فی العالمگیریہ: ”ولا تجوز الکفالة بالأمانات کالودائع وأموال

المضاربات والشركات لأن هذه الأشياء غير مضمونة لا عينها ولا تسليمها. (ہندیہ ج: ۳ ص: ۲۵۴)۔^(۱)

وفی الفتاویٰ الانقروية: ”وفيما كان أمانة فان كان غير واجب التسليم كالوديعة ومال المضاربة والشركة لا تجوز الكفالة بتسليمه“ (الفتاویٰ الانقروية ج: ۱ ص: ۳۱۸)۔^(۲)

وفی فتح القدير: ”وضمن الخسران باطل، لأن الضمان لا يكون إلا بمضمون، والخسران غير مضمون على أحد، حتى لو قال: بايع في السوق على أن كل خسران يلحقك فعلى، أو قال لمشتري العبد أن أبق عبدك هذا فعلى، لا يصح“ (فتح القدير ج: ۵ ص: ۴۲۴)۔^(۳)
وهذا الأصل مسلم عند الفقهاء الأربعة راجع المجموع شرح المذهب ج: ۱۳ ص: ۴۵۹،^(۴)
والمقنع لابن قدامة ج: ۲ ص: ۱۱۵،^(۵) والشرح الصغير على أقرب المسالك ج: ۳ ص: ۴۳۲۔^(۶)

لیکن غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس قسم کی کفالت اگر فریق ثالث کی طرف سے ہو تو اُس کے صحیح نہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ قضاء نافذ نہیں ہوگی، لیکن اگر دو آدمی عقد کر رہے ہوں اور تیسرا شخص ان میں سے کسی سے یہ وعدہ کر لے کہ اگر تمہیں کوئی نقصان ہوا یا نفع نہ ہوا تو میں اس کی تلافی کروں گا، تو ایک وعدے کی حیثیت سے اس میں کوئی حرج نہیں، اور اخلاقاً و دیناً اس پر اس وعدے کا ایفاء لازم ہوگا، الا یہ کہ کوئی عذر شرعی پیش آجائے، چنانچہ جب وہ اپنے اس وعدے کا ایفاء کرے تو لینے والے کے لئے اس کا لینا جائز ہوگا۔

لہذا حکومت اگر فریق ثالث کی حیثیت میں ڈھائی فیصد نفع کی ضمانت دے رہی ہے تو یہ قانون ضمانت کے طور پر تو درست نہیں ہے، لیکن وعدے کے طور پر درست ہے، جس کے ایفاء پر

(۱) (طبع رشیدیہ کوئٹہ)، وفی فتح القدير ج: ۶ ص: ۳۱۲ (طبع رشیدیہ) ولا بما كان أمانة كالوديعة والمستعار والمستأجر ومال المضاربة والشركة ... الخ.
وفیه تحتہ: الكفالة بأمانة غير واجب التسليم كالوديعة ومال المضاربة والشركة لا تصح أصلاً الخ.
(۲) طبع قديم.

(۳) فتح القدير كتاب الكفالة ج: ۶ ص: ۳۲۳ (طبع رشیدیہ کوئٹہ).
(۴) وفی كتاب المجموع شرح المذهب للشيرازي كتاب الضمان ج: ۱۳ ص: ۱۲۲ (طبع دار احیاء التراث العربی، بیروت، لبنان) ويشترط في المال المكفول به أن يكون ديناً فلا تصح الكفالة في الأمانات كالعنى المستعارة والعين المودعة وكذا مال المضاربة والشركة فاذا استعار أحد سلعة من آخر واتي له بضامن يضمنه في رد تلك السلعة فإنه لا تصح، وكذا اذا أودع عند آخر وديعة أو مالا يعمل به مضاربة الخ.
وفیه أيضاً ج: ۱۳ ص: ۱۲۲ (طبع مذکور) القسم الرابع يرجع الى المضمون به سواء كان ديناً أو عيناً أو نفساً فيشترط في الدين أن يكون لازماً في الحال أو المال ومثال الدين اللازم في الحال القرض، وضمن السلعة المباعة ونحو ذلك الخ.

(۵) طبع المطبعة السلفية.

(۶) طبع دار المعارف مصر.

حکومت کو قضاءً مجبور تو نہ کیا جاسکے گا لیکن اگر وہ ایفاء کرے تو یونٹ ہولڈر کو اس کا لینا جائز ہونا چاہئے۔
 البتہ اس پر یہ اشکال ہو سکتا ہے کہ صورتِ مسئلہ میں حکومت فریقِ ثالث نہیں ہوتی بلکہ کاروبار میں شریک ہے، کیونکہ این۔آئی۔ٹی کے کاروبار میں حکومت کا بھی حصہ ہے، لہذا وہ مضمون لہم سے خود ہی عقدِ مضاربہ کر رہی ہے اور خود ہی نفع کی ضمانت دے رہی ہے، تو یہ عقدِ ربا ہو جائے گا۔
 لیکن غور کرنے سے اس شبہ کا بھی جواب مل جاتا ہے، اور وہ یہ کہ این۔آئی۔ٹی کا پورا ادارہ یونٹ ہولڈروں کے لئے مضارب ہوتا ہے اور اس ادارے میں بہت سے ارکان شریک ہیں، جن میں سے ایک رکن حکومت بھی ہے، لہذا مضارب کوئی ایک رکن نہیں بلکہ ارکانِ ادارہ کی پوری جماعت ہے، اور ضمانت دینے والی صرف حکومت ہے جو اس ادارے کی محض ایک رکن ہے، لہذا اس کو یوں نہیں کہا جاسکتا کہ مضارب نے نفع کی ضمانت دی ہے، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ مضاربین کی جماعت میں سے صرف ایک رکن نے اپنی شخصی حیثیت میں ضمانت دی ہے، اس کا حکم فریقِ ثالث ہی کی ضمانت کا ہوگا۔

اس پر یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ مضاربین کی اس جماعت کے تمام ارکان اس کاروبار میں ایک دوسرے کے لئے شریک کی حیثیت رکھتے ہیں اور ہر شریک دوسرے کا وکیل ہوتا ہے، اس لئے ایک شریک کا فعل تمام شرکاء کی طرف منسوب ہوگا، اس کا جواب یہ ہے کہ شریک کا وہ فعل تمام شرکاء کی طرف منسوب ہوتا ہے جو وہ بحیثیت شریک کرے، اور یہاں حکومت بحیثیت شریک ضمانت نہیں دے رہی ہے بلکہ وہ اپنی شخصی حیثیت میں یہ ضمانت دے رہی ہے، اس لئے اس کا یہ فعل تمام شرکاء کی طرف منسوب نہ ہوگا، اور اس کو یہ نہ کہیں گے کہ یہ ضمانت مضارب نے دی ہے، کیونکہ مضارب تنہا حکومت نہیں، بلکہ ارکانِ ادارہ کی جماعت من حیث المجموع ہے۔

مذکورہ بالا تفصیل سے یہ بات واضح ہوگئی کہ حکومت نے ڈھائی فیصد کی ضمانت دی ہے، وہ شرعاً کفالت کی شرائط پر پوری نہیں اُترتی، لہذا قضاءً اس کا ایفاء حکومت پر لازم نہیں، البتہ یہ ایک وعدہ ہے، اور اگر حکومت اس کا ایفاء کرے تو یونٹ ہولڈروں کے لئے اس کا لینا جائز ہوگا۔

البتہ چونکہ مذکورہ مسئلے کی کوئی صراحت فقہاء کے کلام میں نہیں ہے، بلکہ مذکورہ بالا حکم قواعد کی بنیاد پر لکھا گیا ہے، اور اس میں صورۃً سود کی مشابہت پائی جاتی ہے، اس لئے احتیاط اس میں ہے کہ جب این۔آئی۔ٹی کے کاروبار میں نفع نہ ہوا ہو اور حکومت نے اپنے پاس سے اس کی تلافی کی ہو تو یہ تلافی کی رقم یا تو وصول نہ کی جائے یا اس کا صدقہ کر دیا جائے، کیونکہ اگر بالفرض حکومت کی یہ ضمانت بحیثیت وعدہ بھی فاسد ہو اور اس کا لینا حلال نہ ہو تو زیادہ سے زیادہ یہ ضمانت ہی فاسد ہوگی، اس سے

این آئی. ٹی کے ساتھ کیا ہوا اصل عقد باطل نہ ہوگا۔ لما فی البدائع: ”و كذلك لو شرط علیه أن الوضیعة علیّ وعلیک فهذه مضاربة والربح بينهما والوضیعة علی رب المال لأن شرط الوضیعة علی المضارب شرط فاسد، فیبطل الشرط وتبقى المضاربة.“ (بدائع الصنائع ج: ۶ ص: ۸۰)۔^(۱)

البتہ یہ تمام تفصیل اس صورت میں ہے جبکہ این آئی. ٹی کا ادارہ رقمیں وصول کر کے انہیں کسی جائز کاروبار میں لگاتا ہو، لیکن معلوم ہوا ہے کہ اس ادارے کی بعض رقوم سودی قرض دینے پر بھی لگائی جاتی ہیں، اور سودی کاروبار کا تناسب مجموعی کاروبار میں مختلف سالوں میں گھٹتا بڑھتا رہتا ہے، لہذا مذکورہ جواز اس صورت میں ہوگا جبکہ ادارے کا اکثر سرمایہ جائز کاروبار میں لگایا جاتا ہو، اور اگر کسی سال یہ معلوم ہو جائے کہ اکثر سرمایہ سودی قرضوں یا کسی اور حرام کاروبار میں لگا ہوا تھا تو اس صورت میں یونٹ کا نفع حاصل کرنا جائز نہ ہوگا، اور جس صورت میں اکثر سرمایہ جائز کاروبار میں لگا ہوا اور کچھ حصہ ناجائز کاروبار میں لگا ہو تو اس وقت بھی یونٹ ہولڈر کو چاہئے کہ یونٹ خریدتے وقت ادارے کو یہ لکھ دے کہ اس کی رقم سودی کاروبار میں نہ لگائی جائے، پھر اگر ادارہ لگائے گا تو اس لگانے کا وہ خود ذمہ دار ہوگا، یونٹ خریدنے والے پر کوئی گناہ نہیں ہوگا۔ چنانچہ امداد الفتاویٰ میں کمپنیوں کے شیئرز کے بارے میں یہی طریقہ لکھا ہے (امداد الفتاویٰ ج: ۳ ص: ۴۹۱)۔

خلاصہ:- یہ کہ یونٹ خریدنا اس شرط سے جائز ہے کہ کاروبار کی رقم کا اکثر حصہ حرام کاروبار میں نہ لگا ہوا ہو، اس شرط کی موجودگی میں اگر کاروبار میں واقعہ ڈھائی فیصد سے زیادہ نفع ہوا ہو تو وہ نفع وصول کرنا بلاشبہ جائز ہے، البتہ جس صورت میں کاروبار کو ڈھائی فیصد سے کم نفع ہوا ہو، اور حکومت نے تلافی کے طور پر اپنے پاس سے رقم ادا کر کے ڈھائی فیصد نفع پورا کیا ہو، تو جتنی رقم حکومت نے ادا کی ہے احتیاط کا تقاضا یہ ہے کہ وہ وصول نہ کی جائے، تاہم اس صورت میں بھی پورا نفع لینے کی گنجائش ہے۔

واللہ سبحانہ اعلم

محمد تقی عثمانی

۱۳۹۸/۴/۱۲ھ

(فتویٰ نمبر ۵۳۹/۲۹ ب)

رشید احمد عفا اللہ عنہ

۱۳۹۸/۴/۱۲ھ

عبدالرزاق اسکندر

۱۳۹۸/۴/۱۲ھ

ولی حسن

دارالافتاء مدرسہ عربیہ اسلامیہ کراچی

”این آئی ٹی“ کا جدید حکم (تفصیلی فتویٰ)

سوال:- کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین اس مسئلے کے بارے میں کہ ایک شخص نے ”این آئی ٹی“ یونٹ خرید کر کسی دینی ادارے کو دیئے ہیں اور اس کا منافع بھی اسی دینی ادارے کو دیتا ہے، اب پوچھنا یہ ہے کہ کیا یہ منافع جائز ہے یا ناجائز؟ براہ کرم قرآن و حدیث کی روشنی میں جواز یا عدم جواز ثابت کر کے وضاحت فرمائیں۔

جواب:- الحمد للہ وکفی وسلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ، اما بعد!

نیشنل انوسٹمنٹ ٹرسٹ (این آئی ٹی) کے نام سے سرمایہ کاری کا ایک ادارہ عرصہ دراز سے ملک میں قائم ہے، ابتداء میں اس کا طریق کار سودی قسم کا تھا، لیکن ۱۹۷۹ء میں اسلامی نظریاتی کونسل کی سفارش کے مطابق حکومت کی طرف سے ہدایت کی گئی کہ اس ادارے سے سود کا عنصر ختم کر کے اُسے اسلامی احکام کے مطابق چلایا جائے، اسلامی نظریاتی کونسل نے اس کے لئے متبادل طریق کار بھی تجویز کر دیا تھا۔

چنانچہ ۱۹۷۹ء کے بعد اس ادارے کے طریق کار میں تبدیلی لائی گئی، حکومت نے اس میں سے اپنے حصے واپس لے لئے، اور اس ادارے نے جن غیر شرعی کمپنیوں کے حصص خرید رکھے تھے، رفتہ رفتہ وہاں سے رقمیں نکال کر ایسی کمپنیوں کے حصص خریدے جن کا کاروبار بنیادی طور پر جائز ہے، یہاں تک کہ ایک مرحلہ ایسا آیا کہ ادارے کے ذمہ دار حضرات سے ممکنہ تحقیق کے بعد یہ بات واضح ہو گئی کہ اس ادارے کا بنیادی کام ایسی کمپنیوں کے حصص خریدنا اور ان سے منافع حاصل کرنا ہے، جن کا کاروبار بنیادی طور پر جائز ہے۔ چنانچہ اس تحقیق کے بعد ہم نے یہ فتویٰ دیا کہ اس ادارے کے یونٹ خریدنا بھی جائز ہے، اور ان یونٹوں پر ملنے والا نفع بھی حلال ہے، البتہ ساتھ ہی مستفتی حضرات سے یہ بھی کہہ دیا جاتا تھا کہ وہ ہر سال کی بیلنس شیٹ کے ذریعے اس بات کا اطمینان بھی کر لیا کریں کہ کسی غیر شرعی کاروبار کے حصص تو اس میں شامل نہیں ہوئے۔

لیکن کچھ عرصہ پہلے احقر کو معلوم ہوا کہ ”این آئی ٹی“ نے کمپنیوں کے حصص خریدنے کے علاوہ ”مارک آپ“، ”پی ٹی سی“ اور ”ٹی ایف سی“ کی بنیاد پر براہ راست بھی کاروباری افراد کو سرمایہ فراہم کرنا شروع کر دیا ہے، چونکہ ”مارک آپ“، ”پی ٹی سی“ اور ”ٹی ایف سی“ کے تحت سرمائے کی

فراہمی کا شرعی حکم ان کا تفصیلی طریق کار معلوم ہونے پر موقوف تھا، اور ہمارے ملک میں ان ناموں سے سراسر غیر شرعی کاروبار بھی ہوتا رہا ہے، اس لئے احقر نے اس اطلاع کے بعد ”این آئی ٹی“ کے بارے میں آئے ہوئے تمام سوالات روک لئے، اور مستفتی حضرات کو لکھ دیا گیا کہ اب اس ادارے کے طریق کار میں بعض تبدیلیوں کا علم ہوا ہے، جن کی تحقیق کی جا رہی ہے، لہذا تحقیق ہونے تک ہم جواز اور عدم جواز کے بارے میں کوئی حتمی بات نہیں کہہ سکتے، تحقیق کے بعد جو صورت حال واضح ہوگی، اس کے بعد ان شاء اللہ جواب دیا جائے گا۔

اس دوران احقر نے ”این آئی ٹی“ کے سربراہ سے مل کر مذکورہ طریقہ ہائے تمویل کی پوری حقیقت اور تفصیل معلوم کرنے کی کوشش کی، لیکن کئی بار وقت طے ہونے کے باوجود کبھی احقر کے کسی سفر یا مصروفیت کی بناء پر اور کبھی ان کے کسی عذر کی بناء پر یہ ملاقات نہ ہو سکی۔

اب کچھ عرصہ پہلے احقر کو ”این آئی ٹی“ کے دفتر میں جا کر ان کا طریق کار دیکھنے اور ان کے معاملات کی حقیقت جاننے کا موقع ملا، اس تحقیق کے نتیجے میں یہ بات واضح ہوئی کہ ”مارک آپ“، ”پی ٹی سی“ اور ”ٹی ایف سی“ کے ناموں سے جو سرمایہ فراہم کیا جا رہا ہے، وہ شرعی اعتبار سے یقینی طور پر ناجائز ہے اور اس کو کسی تاویل سے بھی حلال نہیں کہا جاسکتا۔ ”مارک آپ“ کا اصل تصور یہ تھا (اور اسٹیٹ بینک کے ہدایت نامے میں بھی اسی کا ذکر ہے) کہ ادارہ کوئی سامان خرید کر اُسے نفع پر فروخت کرے گا، لیکن عملاً دوسرے بینکوں کی طرح ”این آئی ٹی“ بھی کوئی سامان خرید کر بیچنے کے بجائے براہ راست کاروباری افراد کو قرضیں مہیا کرتا ہے، اور وہ اس رقم سے جو چیزیں چاہیں خریدتے ہیں، اور محض کاغذی طور پر یہ فرض کر لیا جاتا ہے کہ وہ چیزیں ”این آئی ٹی“ نے ان کو نفع پر فروخت کی ہیں، حالانکہ ”این آئی ٹی“ کو ان خرید کردہ اشیاء کی مقدار وغیرہ کا علم تک نہیں ہوتا، چہ جائیکہ وہ اشیاء ان کی ملک یا قبضے میں آئیں۔ لہذا یہ طریق کار شرعاً بلاشبہ سود ہے، اور سود کا نام ”مارک آپ“ رکھ لینے یا اس کاغذی کارروائی سے معاملے کی حقیقت پر کوئی فرق نہیں پڑتا، تقریباً یہی صورت ”ٹی ایف سی“ میں ہے۔

جہاں تک ”پی ٹی سی“ (پارٹی اسپیشن ٹرم سرٹیفکیٹ) کا تعلق ہے، اصلاً یہ معاملہ شرکت یا مضاربہ کی بنیاد پر ہونا چاہئے تھا، اور اس کا اصل تصور یہی تھا، لیکن موجودہ طریق کار کے تحت ان میں بہت سی شرائط خلاف شریعت ہیں، جن کی وجہ سے یہ معاملہ بھی شریعت کے مطابق نہیں رہا، اور اب ادارے نے رفتہ رفتہ ”پی ٹی سی“ کو بھی ”ٹی ایف سی“ میں تبدیل کرنا شروع کر دیا ہے۔ لہذا خلاصہ یہ

ہے کہ ”مارک آپ“، ”پی ٹی سی“ اور ”ٹی ایف سی“ کے نام سے جو کاروبار یہ ادارہ کر رہا ہے وہ شریعت کے بالکل خلاف ہے اور اس سے حاصل ہونے والا نفع حرام ہے۔

اس کے بعد ادارے کی بیلنس شیٹ دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ادارے کی سرمایہ کاری کا بہت بڑا حصہ انہی تین مدت میں صرف کیا جا رہا ہے، جس کی تفصیل جون ۱۹۸۶ء کی پوزیشن کے مطابق یہ ہے:-

مارک آپ:- ۱۶،۲۲

پی ٹی سی:- ۲،۵۴ فیصد

ٹی ایف سی:- ۹۵

اس کے علاوہ بینکوں اور سودی مالیاتی اداروں کے حصص میں بھی ادارے کی ۶۷ فی صد رقم جمع ہے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ”این۔آئی۔ٹی“ اپنی رقموں کا ۳۸،۲۱ فیصد حصہ ان ناجائز کاموں میں لگا رہا ہے۔ مزید ۲۸،۲۱ فیصد سرمایہ کاری ”آئی سی پی“ کے میوچول فنڈ میں ہو رہی ہے، جس کی بیلنس شیٹ سے پتہ چلتا ہے کہ اس میں بینکوں کے حصص میں بھی سرمایہ کاری کی گئی ہے، اس طرح سرمایہ کاری کی ۶۱،۲۲ فیصد مدت ناجائز یا مشکوک ہیں۔ بعد میں معلوم ہوا کہ جون ۱۹۸۷ء تک ”مارک آپ“ پر دیئے گئے سرمائے کی شرح اور بھی بڑھ کر تقریباً اڑتیس فیصد ہو گئی۔ اور اس طرح جون ۱۹۸۷ء پر ختم ہونے والے سال میں ناجائز مدت میں لگے ہوئے سرمائے کا تناسب تقریباً ۴۶ فیصد تک پہنچ گیا۔

لہذا یہ معلوم ہونے کے بعد شرعی حکم یہ ہے کہ ”این۔آئی۔ٹی“ کے یونٹ خریدنا شرعاً جائز نہیں ہے۔

اب سوال یہ رہ جاتا ہے کہ جن لوگوں نے سابق فتوے یا ادارے کے اعلانات کے مطابق ”این۔آئی۔ٹی“ یونٹ جائز سمجھ کر خرید رکھے ہیں، اور ان پر انہیں سالانہ منافع (Divident) بھی تقسیم کیا گیا ہے، ان کے لئے اس منافع کا کیا حکم ہے؟

سو اس کا جواب یہ ہے کہ احتیاط کا تقاضا تو یہ ہے کہ ادارے سے یہ بات معلوم کر لی جائے کہ اس کے سالانہ کل منافع میں سے کتنے فیصد منافع ان تین مدت میں سے حاصل ہوا ہے، پھر اپنے منافع (Divident) کا اتنا ہی فیصد حصہ کسی مستحق زکوٰۃ کو صدقہ کر دیا جائے۔

واضح رہے کہ یہ رقم باپ، بیٹے، یا شوہر یا بیوی کو دی جاسکتی ہے، بشرطیکہ یہ سب مستحقِ زکوٰۃ ہوں۔ مثلاً ادارے سے یہ معلوم ہوا کہ کل منافع کا ۳۰ فیصد حصہ ان ناجائز مدات سے حاصل ہوا تھا، اب یونٹ ہولڈر اپنے منافع میں سے ۳۰ فیصد رقم صدقہ کر دے۔ جون ۱۹۸۷ء میں ختم ہونے والے مالی سال میں احقر کا محتاط اندازہ یہ ہے کہ ادارے کے منافع کا ۳۰ فیصد حصہ شرعی اعتبار سے ناجائز ذرائع سے حاصل ہوا ہے، لہذا ہر یونٹ ہولڈر اپنے منافع کا ۳۰ فیصد حصہ صدقہ کر دے۔

لیکن چونکہ ابھی تک ”این۔آئی۔ٹی“ کے منافع کا اکثر حصہ جائز حصص کے ذریعے حاصل ہو رہا ہے اور جائز منافع کی مقدار ناجائز منافع کے مقابلے میں زیادہ ہے، اس لئے جن لوگوں نے ”این۔آئی۔ٹی“ کے اعلانات پر اعتماد کرتے ہوئے ”این۔آئی۔ٹی“ کو جائز کاروبار سمجھ کر اس میں روپیہ لگا دیا تھا، ان کی طرف سے ادارے کو ناجائز کاروبار میں سرمایہ کاری کی اجازت نہیں تھی، ان کے لئے اب تک جو منافع ملا ہے وہ پورا اپنے استعمال میں لانے کی بھی گنجائش ہے، کیونکہ مذکورہ صورت میں ناجائز کاروبار کے ذمہ دار ”این۔آئی۔ٹی“ کے منتظمین ہیں، البتہ آئندہ ان کو چاہئے کہ وہ اپنی لگائی ہوئی رقمیں واپس لے لیں۔

فتاویٰ عالمگیریہ میں ہے:-

اذا دفع المسلم الى النصراني مالا مضاربة بالنصف فهو جائز (أى فى القضاء كما صرح به فى امداد الفتاوى عن المبسوط ج: ۳ ص: ۴۲۱).
 ألا انه مكروه فان اتجر فى الخمر والخنزير فربح جاز على المضاربة فى قول أبى حنيفة وينبغى للمسلم أن يتصدق بحصته من الربح وعندهما لا يجوز على المضاربة وان أربى فاشترى درهمين بدرهم كان البيع فاسداً. ولكن لا يصير ضامناً لمال المضاربة والربح بينهما على الشرط.
 (عالمگیریہ ج: ۴ ص: ۳۳۳ کتاب المضاربة باب: ۲۲)^(۱)

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ اس عبارت کے تحت فرماتے ہیں:-

قلنا: قوله ينبغى للمسلم أن يتصدق بحصته محمول على الورع كما هو الظاهر وان حمل على الوجوب فهو اذا كان قد اتجر فى الخمر والخنزير ولم يتجر فى غيرهما وألا فحمله ما سيجى فى المخلوط.

اس کے بعد حضرت تھانوی قدس سرہ نے مالِ مخلوط کے احکام فتاویٰ قاضی خان سے نقل کئے ہیں، جس میں یہ جزئیہ بھی ہے کہ:-

لو أن فقيراً يأخذ جائزة السلطان مع علمه أن السلطان يأخذها غصباً أيحل له ذلك؟ قال: إن كان السلطان خلط الدراهم ببعضها ببعض فإنه لا بأس به، وإن وضع عين الغصب من غير خلط لم يجز أخذه، قال الفقيه أبو الليث: هذا الجواب يستقيم على قول أبي حنيفة لأن عنده إذا غصب الدراهم من قوم وخلط بعضها ببعض يملكها الغاصب أمّا على أبي يوسف ومحمد رحمهما الله أنه لا يملكها الغاصب ويكون على ملك صاحبها.

(۱)
(قاضی خان ج: ۳ ص: ۳۶۳ و ۳۶۴)

اس عبارت کو نقل کرنے کے بعد حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہ تحریر فرماتے ہیں:-

فاذا خلط الوكيل دراهم الربا ببعض الدراهم التي أخذها من حلال يجوز أخذ الربح منهما لكون الخلط مستهلکاً عند الامام لا سيما إذا كان الوكيل كافراً، لا سيما والتقسيم مطهر عندنا كما إذا بال البقر في الحنطة وقت الدياسة فاقسمها الملاك حل لكل واحد أكلها مع التيقن بكون الحنطة مختلطة بالطاهر والنجس، ولكن القسمة أورثت احتمالاً في حصة كل واحد من الشركاء فحكمنا بطهارة نصيب كل واحد منهم فكذا ههنا إذا أربى الوكيل بالتجارة وخلط الدراهم بعضها ببعض ثم قسمها على الشركاء يحكم بحل نصيب كل واحد منهم والله تعالى أعلم.

(۲)
(امداد الفتاویٰ ج: ۳ ص: ۴۲۳، رسالہ ”القصص السنی“)

ان عبارات سے مذکورہ بالا حکم واضح ہو جاتا ہے۔

یہاں یہ واضح رہے کہ یہ حکم ”این آئی ٹی“ کے موجودہ طریق کار پر مبنی ہے، ”این آئی ٹی“ کے ذمہ دار حضرات کے ساتھ مل کر یہ کوشش کی جا رہی ہے کہ ادارے سے ناجائز سرمایہ کاری کا حصہ بالکل ختم کر دیا جائے، اگر یہ کوشش کامیاب ہوئی اور حالات تبدیل ہو گئے تو حکم بھی بدل سکتا ہے، ایسی

(۱) المطبع العالی الواقع فی لکنو.

(۲) ج: ۳ ص: ۴۸۶ (طبع جدید جمادی الاولیٰ ۱۴۲۳ھ طبع مکتبہ دارالعلوم کراچی).

صورت میں ان شاء اللہ پھر اعلان کر دیا جائے گا۔ واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم بالصواب

والیہ المرجع والمآب

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۴۰۸/۶/۱۱ھ

(فتویٰ نمبر ۱۱۲۶/۲۹ د)

الجواب صحیح

رشید احمد، دارالافتاء والارشاد، ناظم آباد کراچی

الجواب صحیح

بندہ محمد عبداللہ عفی عنہ

الجواب صحیح

سحبان محمود

الجواب صحیح

محمد رفیع عثمانی عفا اللہ عنہ

الجواب صحیح

بندہ عبدالرؤف سکھروی

”این آئی ٹی“ کی نئی صورت حال

(وضاحت از مرتب)

حضرت والا دامت برکاتہم العالیہ کے مذکورہ فتویٰ میں این آئی ٹی میں سرمایہ کاری کے عدم جواز کے ساتھ ساتھ ان کے ذمہ داروں سے بات چیت کرنے کا بھی ذکر کیا گیا تھا، چنانچہ مذکورہ فتویٰ کے بعد اکابر علماء کی طرف سے مسلسل بات چیت جاری رہنے کے بعد صورت حال میں تبدیلی واقع ہوئی تو حضرت والا دامت برکاتہم العالیہ نے پھر نئی صورت حال کے مطابق حکم تحریر فرمایا جو ”البلاغ“ کے ادارہ میں شائع ہوا، این آئی ٹی میں چونکہ مسلسل تبدیلیاں آتی رہیں اس لئے ترتیب زمانی کے اعتبار سے اس کے احکام اور پورے تسلسل کو سمجھنے کے لئے ذیل میں ”البلاغ“ کا وہ ادارہ پیش کیا جا رہا ہے جو حضرت والا دامت برکاتہم نے مذکورہ فتویٰ کے بعد تحریر فرمایا اور ”البلاغ“ کے شمارہ رمضان المبارک ۱۴۰۹ھ میں شائع ہوا۔

”البلاغ“ کے رجب المرجب ۱۴۰۸ھ - مارچ ۱۹۸۸ء کے شمارے میں نیشنل انوسٹمنٹ ٹرسٹ (این آئی ٹی) کے کاروبار کے سلسلے میں ایک تحریر شائع ہوئی تھی جس کا خلاصہ یہ تھا کہ اس ادارے میں سرمائے کا ایک بڑا حصہ ایسی مدات میں لگا ہوا ہے جن کی آمدنی شرعی اعتبار سے درست نہیں ہے، لہذا اس کا شرعی حکم یہ بتایا گیا تھا کہ بحالات موجودہ این آئی ٹی یونٹ خریدنا جائز نہیں ہے۔ اور جن لوگوں نے پہلے یونٹ خرید رکھے تھے، ان کے بارے میں یہ کہا گیا تھا کہ وہ ان پر حاصل ہونے والے منافع کا تیس فی صد بغیر نیت ثواب کے صدقہ کر دیں۔

اس فتوے کی اشاعت کے ساتھ ساتھ آخر میں یہ بھی عرض کر دیا گیا تھا کہ این آئی ٹی کے ذمہ دار حضرات سے گفت و شنید کر کے کاروبار کی اصلاح کی کوشش جاری ہے، اور اگر صورت حال میں کوئی تبدیلی ہوئی تو ان شاء اللہ دوبارہ اعلان کر دیا جائے گا۔

چنانچہ اس کے بعد این آئی ٹی کے ذمہ دار حضرات سے گفتگو اور باہمی مشورے کا سلسلہ جاری

رہا، بفضلہ تعالیٰ ان حضرات نے ادارے کو غیر شرعی سرمایہ کاری سے پاک کرنے کے لئے ہماری تجاویز کا نہ صرف خیر مقدم کیا، بلکہ اس سلسلے میں عملی تعاون کا ثبوت دیا، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ تقریباً دس ماہ کی کوشش کے بعد بحمد اللہ ادارے کے طریق کار میں مناسب تبدیلیاں کی گئی ہیں، ادارے کی طرف سے کئے جانے والے تمام معاہدات پر نظر ثانی کر کے علماء کے مشورے سے ان کو شریعت کے مطابق بنایا گیا ہے، اور اس طرح ایک مرتبہ پھر این آئی ٹی کی نئی صورت حال کا شرعی حکم بیان کرنے کی ضرورت پیش آگئی ہے۔

جیسا کہ ہم نے اپنی سابقہ تحریر میں عرض کیا تھا، این آئی ٹی کی سرمایہ کاری جن ناجائز مدت میں ہو رہی تھی، ان کا بیشتر حصہ مارک آپ، پی ٹی سی (Participation Term Certificate) اور ٹی ایف سی (Term Finance Certificate) پر مشتمل تھا۔

ان تین مدت میں سے اب این آئی ٹی نے پی ٹی سی کا طریق کار تو بالکل ختم ہی کر دیا ہے اور مارک آپ اور ٹی ایف سی کے طریق کار کو ختم کر کے ان دونوں کو ”مراجہ مؤجلہ“ میں تبدیل کر دیا ہے۔ سابق طریق کار اور نئے طریق کار میں فرق یہ ہے کہ پہلے جس کسی شخص یا ادارے کو پیداواری قرض دیا جاتا تھا، اس کو این آئی ٹی کی طرف سے مارک آپ پر روپیہ فراہم کیا جاتا تھا، لیکن صرف تعبیر کی حد تک یہ کہا جاتا تھا کہ این آئی ٹی کی طرف سے وہ سامان نفع پر فروخت کیا جا رہا ہے جو قرض لینے والے کو اس رقم سے خریدنا ہے۔ حالانکہ وہ سامان نہ این آئی ٹی کی ملکیت میں آتا تھا، نہ قبضے میں، لہذا یہ محض ایک فرضی کارروائی تھی، اور حقیقت یہی تھی کہ روپیہ دے کر اس پر نفع وصول کیا جاتا تھا جو درحقیقت سود ہے۔ یہ وہی طریق کار ہے جو اس وقت ملک کے بیشتر رواجی بینکوں میں جاری ہے۔

لیکن اب ”مارک آپ“ کی جگہ ”مراجہ مؤجلہ“ کا عقد کیا جاتا ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ جس شخص کو کوئی مال خریدنے کے لئے قرض درکار ہوتا ہے، این آئی ٹی اس کو روپیہ دینے کے بجائے وہ مال خرید کر اسے نفع پر فروخت کر دیتا ہے، اور قیمت بعد میں وصول کرتا ہے۔ اس نئی صورت کے مطابق وہ مال پہلے این آئی ٹی کی ملکیت اور ضمان میں اس طرح داخل ہو جاتا ہے کہ اگر اسی حالت میں وہ مال ہلاک ہو تو اس کا نقصان این آئی ٹی پر ہوگا۔ اس کے بعد وہ اس کو اپنے گاہک کے ہاتھ نفع پر فروخت کرتا ہے۔ اس میں اس بات کی بھی گنجائش رکھی گئی ہے کہ وہ مال کی خریداری کے لئے گاہک ہی کو اپنا وکیل بنادے، لیکن جس وقت تک گاہک بحیثیت وکیل کام کرتا ہے، اس وقت تک سامان کی تمام تر ذمہ داری این آئی ٹی پر ہی ہوتی ہے، وکیل کی حیثیت سے خریداری مکمل کرنے کے بعد پھر وہ این آئی ٹی سے اس مال کی خریداری کا مستقل عقد کرتا ہے۔

”مارک آپ“ اور ”ٹی ایف سی“ کے جملہ معاہدات کو مذکورہ بالا طریق کار کے مطابق تبدیل کر دیا گیا ہے، اور اس طرح یہ معاملات جواز شرعی کی حدود میں آگئے ہیں۔

”مراجہ مؤجلہ“ کے علاوہ این آئی ٹی نے ”اجارہ“ کے معاملات بھی شروع کئے ہیں، یعنی وہ مشینری وغیرہ خرید کر اپنے گاہکوں کو طے شدہ کرایہ پر فراہم کرتا ہے، اور اس کا کرایہ وصول کرتا ہے۔ ”عقد اجارہ“ کے لئے بھی مستقل معاہدات شرعی شرائط کے مطابق تیار کر لئے گئے ہیں، اور گاہکوں سے اسی کے مطابق معاہدات کئے جا رہے ہیں۔

اس طرح اب این آئی ٹی کا بیشتر سرمایہ جائز تجارتی کمپنیوں کے حصص خریدنے، مراجہ مؤجلہ اور عقد اجارہ میں لگا ہوا ہے، اور چونکہ یہ تینوں صورتیں فقہی طور پر جواز کی حدود میں آتی ہیں، اس لئے اب بیشتر سرمایہ کاری جائز طریقے سے ہونے لگی ہے۔

البتہ ایک مدایسی ہے جسے تبدیل کرنے پر ادارہ قادر نہیں ہوا، اور وہ یہ کہ وہ بعض اوقات اپنی رقمیں عام تجارتی بینکوں کے پی ایل ایس اکاؤنٹ میں رکھواتا ہے، اور یہ بات ”البلاغ“ کے صفحات میں بار بار لکھی جا چکی ہے کہ پی ایل ایس (یا نفع و نقصان کی شراکت) کے نام سے جو کاروبار مروجہ بینکوں میں ہو رہا ہے، وہ شرعاً درست نہیں ہے، لہذا اس کی آمدنی شرعاً حلال نہیں ہے، این آئی ٹی اس مد سے رقمیں نکالنے پر قادر نہیں ہو سکا، لہذا یہ مد ابھی تک شرعاً درست نہیں ہے، اور اس مد سے حاصل ہونے والا منافع بھی حلال نہیں۔

لیکن اب این آئی ٹی نے اپنے یونٹ ہولڈروں کے لئے جوئے فارم طبع کرائے ہیں اس میں ایک خانے کا اضافہ کر دیا گیا ہے جس میں یونٹ ہولڈر کو یہ کہنے کا اختیار دیا گیا ہے کہ میں این آئی ٹی کی سرمایہ کاری کی مدات میں سے فلاں فلاں مد کی آمدنی وصول نہیں کرنا چاہتا۔ اس خانے میں اگر یہ لکھ دیا جائے کہ میں پی ایل ایس کی آمدنی وصول نہیں کرنا چاہتا تو اس صورت میں یونٹ ہولڈر کو پی ایل ایس کی آمدنی نفع میں نہیں دی جائے گی، اور صرف مذکورہ بالا تین مدات سے حاصل ہونے والی آمدنی میں سے نفع دیا جائے گا۔

این آئی ٹی کے ذمہ دار حضرات نے اس بات کا اہتمام کرنے کا وعدہ کیا ہے کہ اگرچہ ہر شخص کی رقم کو علیحدہ رکھ کر اس کی الگ سرمایہ کاری عملاً ممکن نہیں ہے، لیکن جتنے لوگ فارم میں پی ایل ایس کی آمدنی نہ لینے کا اعلان کریں گے ان کی مجموعی رقوم کے برابر رقم ضرور دوسرے مدات ہی میں لگائی جائے گی، لیکن کسی بھی وقت ایسا نہیں کیا جائے گا کہ جائز مدات میں لگی ہوئی رقوم اس مجموعی رقم کی مقدار سے کم رہ جائیں جس کے یونٹ ہولڈروں نے پی ایل ایس کی آمدنی نہ لینے کا اظہار و اقرار کیا ہو۔ چونکہ پی ایل ایس سے حاصل ہونے والی آمدنی کا تناسب ادارے کی مجموعی آمدنی کے مقابلے میں بہت کم ہے، اور مذکورہ فارم کے ذریعے اس آمدنی سے بچنے کا ایک راستہ بھی ادارے کی

طرف سے فراہم کر دیا گیا ہے، اس لئے اب این آئی ٹی یونٹ کی خریداری کا شرعی حکم یہ ہے کہ:-
این آئی ٹی یونٹ میں رقم لگانا اس شرط کے ساتھ جائز ہے کہ ادارے کی طرف سے شائع شدہ فارم میں یہ لکھ دیا جائے کہ میں پی ایل ایس سے حاصل ہونے والی آمدنی لینا نہیں چاہتا۔ اس تحریر کے بعد جو منافع ادارے کی طرف سے ملے، اُس کو ذاتی استعمال میں لانا بھی جائز ہے۔

لیکن یہ وضاحت ایک مرتبہ پھر کی جاتی ہے کہ یہ حکم این آئی ٹی کے موجودہ طریق کار کا ہے، چونکہ اس ادارے کا طریق سرمایہ کاری مختلف اوقات میں بدلتا رہا ہے، اور انتظامیہ اور اس کی پالیسی میں بھی تبدیلی ہوتی رہتی ہے، اس لئے آئندہ پھر طریق کار میں تبدیلی کا امکان موجود ہے۔ لہذا یونٹ ہولڈروں کو چاہئے کہ وہ ہر سال ادارے کی سرمایہ کاری کی مدت کا یا تو خود جائزہ لیں، یا پھر ادارے کی سالانہ بیلنس شیٹ بھیج کر ہر سال تازہ ترین صورت حال کے بارے میں استفتاء کر لیا کریں۔

احقر

محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۴۰۹/۸/۲۷ھ

”این آئی ٹی“ کے کاروبار اور اس کے یونٹ خریدنے کا حکم

سوال:- ایسے ادارے میں سرمایہ لگانا جو نفع کا یقین تو نہ کرتے ہوں، مگر ایک Minimum کی گارنٹی دیتے ہیں، بیشک مفروضہ یہ ہے کہ ادارے کا کاروبار جائز ہے اور Financing اور کاروبار سود کی لعنت سے بھی بچا ہوا ہے۔ میرے ذہن میں این آئی ٹی کا ادارہ ہے، گو کہ اب تو آپ کے فتوے کے مطابق این آئی ٹی کے کاروبار کا کچھ حصہ سودی لین دین پر مشتمل ہے، بہر حال اگر یہ صورت نہ ہوتی تو کیا N.I.T یونٹس خریدنا جائز ہوتا؟

جواب:- جو ادارے خود کم سے کم نفع کی گارنٹی دیتے ہوں ان میں سرمایہ لگانا جائز نہیں، لیکن اگر کوئی ادارہ ایسا ہو جس میں حکومت شریک نہ ہو، اور پھر حکومت نقصان کی تلافی یا کم سے کم شرح منافع اپنے پاس سے بطور امداد دینے کا وعدہ کر لے تو اس کی گنجائش ہے۔ این آئی ٹی میں یہی صورت ہے، اور اس کو جو سابق فتویٰ میں ناجائز کہا گیا تھا اس کی وجہ اس کے سودی کاروبار میں ملوث ہونا تھا، لیکن اب پھر اس نے اپنے طریق کار میں علماء کے مشورے سے ترمیمات کی ہیں، جس کے بعد حکم بھی بدل گیا ہے، جس کی تفصیل ماہنامہ ”البلاغ“ (رمضان المبارک ۱۴۰۹ھ - مئی ۱۹۸۹ء) میں شائع ہو چکی ہے، اس کو ملاحظہ فرمایا جائے۔

واللہ اعلم

۱۴۰۹/۱۲/۲۹ھ

(فتویٰ نمبر ۵۷۳۷/۲۰ و)

”این آئی ٹی“ میں سرمایہ کاری کا حکم

سوال:- محترم جناب تقی عثمانی صاحب، السلام علیکم۔ N.I.T کے سرٹیفکیٹ میں Investment جائز ہے یا نہیں؟ میں نے سنا ہے کہ Mudarba، N.I.T کمپنی ہے، جو صرف Equity میں Investment کرتی ہے، اور Debt میں نہیں کرتی۔ اس کے علاوہ اور کون کون سی صورتیں ہیں کہ جس میں Investment شرعاً جائز ہے؟

جواب:- محترمی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

”این آئی ٹی“ نے بہت سے شیئرز بینکوں اور انشورنس کمپنیوں کے لئے رکھے ہیں، اس لئے اس میں سرمایہ کاری درست نہیں ہے۔^(۱)

والسلام

۱۴۲۱/۱۱/۱۰ھ

(فتویٰ نمبر ۴۶۰/۴۲)

بینک کے کرنٹ اکاؤنٹ اور انعامی بانڈز کا حکم

سوال:- میری زمین ہے جسے فروخت کر کے میں روپیہ بینک میں جمع کروانا چاہتی ہوں، چونکہ مجھے کچھ عرصے کے لئے باہر جانا ہے، واپسی تک اُس رقم پر یقیناً سود ملے گا، کیا وہ سود کی رقم کسی یتیم خانے کو دے سکتی ہوں؟ کیونکہ میں سود لینا نہیں چاہتی بلکہ گناہ سمجھتی ہوں۔ یا پھر میں نے مکان کے لئے لون لیا ہے، اُس کا سود ادا کر رہی ہوں، تو وہ سود جو میری اپنی رقم پر بینک مجھے دے گا، لے کر ادھر لون والا سود ادا کر سکتی ہوں؟ ایسا کرنے سے مجھے سود لینے کا گناہ تو نہیں ہوگا؟ انعامی بانڈز خریدنا اور انعام لینا کیسا ہے؟

جواب:- آپ اپنا روپیہ کرنٹ اکاؤنٹ میں رکھوائیں، اس پر سود نہیں لگے گا، اور اگر غلطی سے کسی دوسرے اکاؤنٹ میں رکھوا دیا اور اُس پر سود لگ گیا تو وہ کسی مستحق زکوٰۃ کو صدقہ کر دیں۔^(۲) اور بینک سے سودی قرض لینا جائز نہیں ہے،^(۳) ایسے قرض سے جلد از جلد سبکدوش ہونے کی فکر کریں۔ اور

(۱) این آئی ٹی کی صورت حال بدلتی رہی ہے، اس لئے مختلف زمانوں میں اس کے بارے میں مختلف فتوے جاری ہوئے ہیں جن میں سے بعض پیچھے گزر چکے ہیں، آخری فتویٰ یہی ہے کہ چونکہ اس میں ناجائز سرمایہ کاری کا تناسب بہت زیادہ ہو چکا ہے، اس لئے اب اس میں سرمایہ کاری جائز نہیں ہے۔ کبھی صورت حال بدلے تو حکم بھی بدل سکتا ہے۔ (تقی)

(۲) دیکھئے ص: ۱۲۰ و ۱۲۱ کے حواشی اور مزید اہم تفصیل کے لئے دیکھئے ص: ۱۲۹ کا فتویٰ۔

(۳) دیکھئے ص: ۲۸۴ کا حاشیہ نمبر ۴۔

انعامی بانڈز پر جو رقم بطور انعام ملتی ہے وہ سود اور قمار پر مشتمل ہونے کی بناء پر ناجائز ہے اور اس کا وصول کرنا حرام ہے، اگر بانڈ خرید لیا ہو تو صرف اپنی دی ہوئی اصل رقم وصول کر سکتے ہیں۔

واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم

ھ ۱۳۹۷/۸/۲۹

(فتویٰ نمبر ۸۹۵/۲۸ ج)

جبری پراویڈنٹ فنڈ پر ملنے والی اصل رقم پر زیادتی ”سود“ نہیں

سوال:- پراویڈنٹ فنڈ کی رقم جو کہ ملازمین کی ہر ماہ تنخواہ میں سے کاٹ کر بینک میں جمع کی جاتی ہے، اس رقم پر بینک والے سود بھی باقاعدہ لگاتے ہیں، اب بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ پراویڈنٹ فنڈ تو بہر حال جمع کروانا ہے، اور اگر بینک والے سود لگاتے ہیں تو یہ ہمارے لئے مجبوری کا باعث ہے، بینک والے سود لگاتے رہیں، ہم جب کل رقم بمع سود واپس لیں گے تو اس رقم میں سے اپنی اصلی رقم اپنے پاس رکھ لیں گے اور باقی سود کی رقم کسی کزگال اور بھوکے شخص کو دے دیں گے، کیا ایسا کرنا شرعاً جائز ہے؟

جواب:- جبری پراویڈنٹ فنڈ کی اصل رقم پر جو زیادتی محکموں کی طرف سے دی جاتی ہے، وہ شرعاً سود نہیں ہے، اس لئے اس کا وصول کرنا جائز ہے۔^(۱)

واللہ اعلم و علمہ اتم و احکم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

ھ ۱۳۸۷/۱۰/۲۸

(فتویٰ نمبر ۱۳۳۶/۱۸ الف)

ھ ۱۳۸۷/۱۰/۲۹

جبری اور اختیاری پراویڈنٹ فنڈ پر اصل رقم پر زیادتی کا حکم

سوال:- سرکاری ملازمین کی تنخواہ کا کچھ حصہ ماہانہ کاٹا جاتا ہے، جس کو جی پی فنڈ (جنرل پراویڈنٹ فنڈ) کہا جاتا ہے، اس رقم پر حکومت اپنے ملازم کو منافع بھی دیتی ہے، کیا یہ منافع بھی سود کہلائے گا؟ اس کی دو صورتیں ہیں، حکومت ہر ملازم سے تنخواہ کا کچھ حصہ جبراً کاٹتی ہے، دوسری صورت یہ ہے کہ ملازم اپنی مرضی سے حکومت کی مقرر کردہ رقم سے زیادہ کٹواتا ہے، ان دونوں کا حکم تحریر فرمائیں۔

(۱) تفصیل کے لئے حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ کا رسالہ ”پراویڈنٹ فنڈ پر زکوٰۃ اور سود کا مسئلہ“ ملاحظہ فرمائیں۔

جواب:- پراویڈنٹ فنڈ پر جو زیادہ رقم محکمے کی طرف سے دی جاتی ہے وہ شرعاً سود نہیں ہے، لہذا اس کا لینا اور استعمال میں لانا جائز ہے۔ جبری اور اختیاری فنڈ دونوں کا حکم یہی ہے۔ البتہ جو رقم اپنے اختیار سے کٹوائی گئی ہو اس پر ملنے والی زیادتی کو احتیاطاً صدقہ کر دیں تو بہتر ہے۔^(۲)

واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم

۱۳۹۷/۱/۱ھ

(فتویٰ نمبر ۱۰/۲۸ الف)

پراویڈنٹ فنڈ سے قرض لینے کے بعد واپسی کے وقت اصل رقم سے زیادہ واپس کرنے کا حکم

سوال:- اگر کوئی ملازم دفتر میں نوکری کرتا ہے تو اس کی تنخواہ سے کچھ حصہ پراویڈنٹ فنڈ کے طور پر کاٹ لیا جاتا ہے، جس کو جمع کر کے ریٹائرمنٹ یا اس سے قبل نوکری چھوڑتے ہوئے دُگنا ملازم کو دیا جاتا ہے، کیا یہ ساری زیادتی شرعاً سود نہیں ہے؟ لیکن جب یہ ملازم اس سے قرض لے کر قسطوں میں ادا کرتا ہے تو اس سے سود لیا جاتا ہے، تو کیا یہ سود نہیں ہے؟ اور یہ مسئلہ حضرت مفتی صاحب کے رسالے میں یا کہیں ہے؟

جواب:- پراویڈنٹ فنڈ کی رقم سے قرض لینے پر واپسی کے وقت جو زائد رقم سود کے نام سے فنڈ میں دی جاتی ہے شرعاً وہ سود نہیں۔ یہ مسئلہ بھی حضرت مفتی اعظم قدس سرہ کے رسالہ ”پراویڈنٹ فنڈ“ ہی میں موجود ہے۔^(۳)

واللہ سبحانہ اعلم

۱۴۰۱/۱۱/۲۴ھ

(فتویٰ نمبر ۱۷۴۹/۳۲ ج)

مغربی ممالک میں سودی قرضوں کے ذریعے گھر خریدنے کا طریقہ اور اس کا حکم

سوال:- آر لینڈ وغیرہ ملکوں میں گھر خریدنا مشکل نہیں، محض 5% قیمت کا حصہ دے کر باقی قرضہ حاصل کیا جاسکتا ہے، جس کو اگر انٹرسٹ کے ساتھ ماہانہ ادا کیا جائے تو وہ عموماً اس گھر کے کرایہ وغیرہ سے کم ہوتا ہے، اور جب پانچ چھ سال بعد لوگ یہاں سے جاتے ہیں تو گھر بیچ دیتے ہیں، اس

(۲ و ۱) تفصیل کے لئے حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ کا رسالہ ”پراویڈنٹ فنڈ پر زکوٰۃ اور سود کا مسئلہ“ ملاحظہ فرمائیں۔

(۳) مزید تفصیل کے لئے دیکھئے امداد الفتاویٰ ج: ۳ ص: ۱۵۲ (مکتبہ دارالعلوم کراچی)۔

طرح جو ماہانہ کرایہ ضائع ہوتا تھا وہ اُن کی اپنی پراپرٹی بنانے کے کام آتا ہے اور جو قیمت میں اضافہ ہوا وہ الگ فائدہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ لوگ اس کی طرف بکثرت مائل ہوتے جا رہے ہیں، مگر سب سے اہم مسئلہ سود کا ہے، اس سلسلے میں مجھے درج ذیل سوالات کے جوابات عنایت فرمائیں۔

کیا اوپر تحریر کیا گیا لین دین جائز ہے؟

کیا یہ لین دین کچھ خاص حالات میں جائز ہے مثلاً ایسا ملک جہاں خرید و فروخت ہوتی ہی

اس طرح ہو؟

آپ کی کتاب پڑھنے کے بعد اور دیگر معلومات کرنے کے بعد معلوم ہوا کہ ان کے موجودہ عمل میں کچھ ترامیم کے بعد اس کو جائز بنایا جاسکتا ہے، مثلاً گھر کی اصل قیمت خرید ایک لاکھ مگر پچیس سال میں Interest کے ساتھ ڈیڑھ لاکھ ادا کرنے ہوں تو Deal اس طرح کی جائے کہ گھر کی اصل قیمت ڈیڑھ لاکھ تصور کی جائے اور اس کو پچیس سال میں برابر قسطوں میں تقسیم کر لیا جائے۔ کیا اس طرح سے Deal کرنا صحیح ہے؟ میری ناقص معلومات کے مطابق اس طرح کی Deal شکوک سے خالی ہے اور یہاں پر چند سوالات جنم لیتے ہیں جن کا اب تک کوئی حل سامنے نہیں آیا، اس لئے آپ کی جانب سے ان کے جوابات کا خاص کر انتظار رہے گا۔ اس طرح کی پچیس سال کی Deal کے بعد اگر گھر پانچ سال کے بعد بیچنا ہو تو کیا ہمیں بینک یا قرض دینے والے ادارے کو پورے ڈیڑھ لاکھ ہی ادا کرنے ہوں گے گو کہ حقیقتاً ہم نے قرض ایک لاکھ کا لیا تھا؟ فرض کیجئے آپ سوال نمبر ۴ کے جواب میں لکھتے ہیں کہ ڈیڑھ لاکھ ادا کرنے ضروری ہیں، چاہے گھر کتنے ہی عرصے کے بعد فروخت کیا جائے تو پھر آخری سوال یہ ہے کہ اگر بینک اپنی خوشی سے Deal کرے تو صحیح ہے، مثلاً گھر کی اصل قیمت ایک لاکھ، پچیس سال کی Deal کے مطابق ڈیڑھ لاکھ، یعنی ہر بیس ہزار کے عوض تیس ہزار، اس حساب سے ہر پانچ سال پر ادا کرنے ہیں تیس ہزار۔ اب اس موقع پر گھر بیچنے کی صورت میں اگر بینک اپنی خوشی سے یہ کہے کہ میں اپنی خوشی سے اس گھر کی قیمت مثال کے طور پر ڈیڑھ سے کم کر کے ایک لاکھ دس ہزار کرتا ہوں، جو کہ حقیقتاً اس نے Interest کر کے کیا ہے، مگر جب تک آپ نے اس چھوٹ کی Deal نہ کر رکھی ہو تو کیا یہ خرید و فروخت صحیح ہوگی؟

جواب:- محترمی و مکرمی جناب عدیل صدیقی صاحب، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کا خط ملا، مغربی ملکوں میں سودی قرض کے ذریعے گھر خریدنے کا جو طریقہ رائج ہے، وہ

سود پر مشتمل ہونے کی وجہ سے حرام ہے، البتہ اگر گھر کے مالک سے معاملہ اس طرح طے ہو جائے کہ گھر کی پوری قیمت بازاری قیمت سے زیادہ مقرر کر لی جائے، اور پھر اس کی ادائیگی قسطوں میں ہو تو یہ صورت جائز ہے۔^(۱) اگر یہ معاملہ کسی بینک یا مالیاتی ادارے کے ذریعے ہو تو یہ ضروری ہے کہ وہ بینک یا مالیاتی ادارہ پہلے وہ گھر خود اپنے لئے خرید لے، اور بنا ہوا گھر ہو تو اس پر قبضہ بھی کر لے،^(۲) پھر آپ کو ادھار فروخت کرے، اس ادھار قیمت کا تعین کرتے وقت وہ بازاری قیمت سے جتنا اضافہ مناسب سمجھے، اتنا اضافہ کر کے قیمت مقرر کرے،^(۳) لیکن معاملے کے وقت یہ طے ہونا ضروری ہے کہ کل قیمت کیا ہوگی؟ اور یہ بھی کہ کتنی قسطوں میں ادائیگی کی جائے گی، جب قیمت اس طرح متعین ہو گئی تو اب کوئی ایک فریق دوسرے کو اس قیمت میں کمی بیشی کرنے پر مجبور نہیں کر سکتا، لہذا اگر خریدار آخری ادائیگی کی تاریخ آنے سے پہلے گھر کسی اور کو فروخت کرنا چاہے اور رقم کی پیشگی ادائیگی کرنے پر قادر ہو جائے

(۳۱۱) مذکورہ معاملے سے متعلق حوالہ جات و عبارات درج ذیل ہیں:

وفی اعلاء السنن ج: ۱۴ ص: ۱۷۳ (طبع ادارة القرآن کراچی) عن ابي هريرة رضي الله عنه قال: نهى النبي صلى الله عليه وسلم عن بيعتين في بيعة.

وفيه أيضًا ج: ۴ ص: ۱۷۵ و ۱۷۶ (طبع مذكور) عن عبد الله بن عمرو رضي الله عنهما قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: لا يحل سلف وبيع ولا شرطان في بيع اهـ.

وفی الشرح الكبير لابن قدامة ج: ۴ ص: ۵۳ قال ابن مسعود رضي الله عنه: صفقتان في صفقة ربا وهذا قول ابي حنيفة والشافعي وجمهور العلماء الخ.

وفی المبسوط ج: ۱۳ ص: ۸ ومن اشترى شيئا فلا يجوز له أن يبيعه قبل أن يقبضه لما روى أن النبي صلى الله عليه وسلم نهى عن بيع الطعام قبل أن يقبض وكذلك ما سوى الطعام من المنقولات لا يجوز بيعه قبل القبض.

وفی الدر المختار ج: ۵ ص: ۱۷۷ صحّ بيع عقار فلا يصح بيع منقول قبل قبضه ولو من بانه الخ. وفي الهداية ج: ۳ ص: ۷۸ (طبع مكتبه رحمانيه) ومن اشترى شيئا مما ينقل ويحول لم يجز له بيعه حتى يقبضه لأنه عليه السلام نهى عن بيع مالم يقبض ولأن فيه غرر انفساخ العقد على اعتبار الهلاك الخ.

وكذا في تكملة فتح الملهم ج: ۱ ص: ۳۵۰ والمجلة للأناسي ج: ۲ ص: ۱۷۳ وفتح القدير ج: ۵ ص: ۲۶۶. وفي المبسوط للسرخسي ج: ۱۳ ص: ۷ و ۸ وإذا عقد العقد على أنه إلى أجل كذا بكذا وبالنقد بكذا فهو فاسد وهذا إذا ائتمرا على هذا، فإن كان يتراضيان بينهما ولم يفرقا حتى قاطعه على ثمن معلوم وأتما العقد عليه فهو جائز.

وفی الهداية ج: ۳ ص: ۲۱ (طبع رحمانيه) ويجوز البيع بضمن حال ومؤجل إذا كان الأجل معلوما لا إطلاق قوله تعالى: "وَأَحَلَّ اللَّهُ الْبَيْعَ" الآية.

وفی الشامية ويزاد في الثمن لأجله إذا ذكر الأجل بمقابلة زيادة الثمن قصداً. (طبع بيروت ج: ۷ ص: ۳۶۲).

وفی البحوث ص: ۱۴ العزم بأحد الثمنين شرط للجواز الخ.

وكذا في البرازية ج: ۳ ص: ۳۳۱ والهندية ج: ۳ ص: ۱۳۶ والشامية ج: ۵ ص: ۱۴۲ والهداية ج: ۳ ص: ۷۴.

وفی المجلة رقم المادة: ۲۳۵ البيع مع تأجيل الثمن وتقسيطه صحيح الخ.

وفی الهداية ج: ۳ ص: ۷۸ (طبع مكتبه رحمانيه) لأن للأجل شبهة بالمبيع، ألا يرى أنه يزداد في الثمن لأجل الأجل اهـ وكذا في الشامية ج: ۵ ص: ۱۴۲ و ۳۲۶.

وفی بحوث في قضايا فقهية معاصرة ص: ۷ أما الأئمة الأربعة وجمهور الفقهاء والمحدثين فقد أجازوا البيع المؤجل بأكثر من سعر النقص بشرط أن يثبت العاقدان بأنه بيع مؤجل بأجل معلوم بضمن متفق عليه عند العقد الخ.

تب بھی وہ اپنے بیچنے والے ادارے سے یہ مطالبہ نہیں کر سکتا کہ وہ قیمت میں کمی کر دے، ہاں اگر وہ ادارہ اپنی خوشی سے قیمت میں کمی کر دے جبکہ اس پر کوئی جبر نہ ہو، نہ ایسا کوئی پیشگی معاہدہ ہو تو اپنی خوشی سے کمی کر سکتا ہے۔

والسلام

(حضرت مولانا) محمد تقی عثمانی (مدظلہم)

بقلم محمد عبداللہ میمن

۱۴۲۰/۱۲/۲۸ھ

بینک یا ہاؤس بلڈنگ فنانس کے ذریعے گھر خریدنے کا حکم

سوال:- امارات میں یا پاکستان میں یا دنیا کے کسی بھی ملک میں میرا کوئی گھر نہیں ہے، میں ایک چھوٹے سے گاؤں کا رہنے والا ہوں، جہاں پر میرے والدین کا بنایا ہوا ڈھائی کمروں کا مکان ہے، اور یہ بھی میرے چھوٹی بھائی اور میری بہن کی ملکیت ہے۔ میرے اپنے چار بچے ہیں، جن کی عمریں تین سال سے نو سال تک ہیں، ہر شخص کی طرح ایک گھر کا ہونا میری بھی بنیادی ضرورت ہے، آج اگر میری نوکری یہاں سے اچانک ختم ہو جائے تو مجھے لازماً واپس پاکستان ہی آنا پڑے گا، اور وہاں اپنی ضرورتوں کی وجہ سے گاؤں میں بس نہیں سکتا، لازماً کسی شہر ہی میں ڈیرا لگانا پڑے گا، کسی بھی مناسب جگہ پر اپنا گھر کا ہونا ایک ہی بہت بڑا سہارا ہوتا ہے، موجودہ حالات میں میں اپنی تنخواہ سے اتنے پیسے جمع نہیں کر سکتا کہ مکان بنوانے کا سوچوں، اس کام کے لئے مجھے کہیں نہ کہیں سے قرض ہی لینا پڑے گا، چاہے وہ کوئی فرد ہو (جو کہ ناممکن ہے) یا کوئی ادارہ جیسے بینک یا ہاؤس بلڈنگ فنانس کارپوریشن۔ اگر میں ان اداروں سے قرض لے لوں اور گھر بنالوں تو میں یہ قرضہ آہستہ آہستہ دوسرے لوگوں کی طرح اُتار سکتا ہوں، جیسے جیسے دیر ہو رہی ہے زمین اور مکان بنوانے کی قیمتیں بہت تیزی سے بڑھ رہی ہیں اور میں دن بدن اور زیادہ مصیبت میں گھرتا جا رہا ہوں، کیا میں اپنے حالات کے مدِ نظر بینک یا ایسے ہی کسی ادارے سے قرض لے کر گھر بنوا سکتا ہوں؟ جیسا کہ آپ کو علم ہوگا کہ ایسے قرضوں پر واپسی کے وقت مجھے کچھ رقم بطور سود دینی ہی پڑے گی۔ اگر شریعت اس کی اجازت نہیں دیتی تو برائے مہربانی میرے اس مسئلے کا حل ضرور لکھئے گا تاکہ میں گھر بنوا سکوں۔

جواب:- پاکستان میں ہاؤس بلڈنگ فنانس کارپوریشن نے جو طریقہ کار پچھلے چند سالوں سے اختیار کیا ہوا ہے، اس میں اگرچہ صراحتہً سود کا نام تو نہیں رہا، لیکن اب بھی اس کا طریق کار متعدد غیر شرعی اُمور پر مشتمل ہے۔ اس لئے مکان بنوانے کے لئے اس سے رقم لینے کا مشورہ نہیں دیا جاسکتا۔^(۱)

(۱) تفصیل کے لئے ص: ۲۶۳ کا فتویٰ اور اس کے حواشی ملاحظہ فرمائیں۔

کوئی شخص ایسا بے گھر ہو کہ اگر اس سے معاملہ نہ کرے اسے سرچھپانے کی جگہ میسر نہ آئے تو اس کے لئے گنجائش ہو سکتی ہے، لیکن جس شخص کے پاس رہنے کی کوئی جگہ - خواہ کرایہ کی ہو - یا اسے لینے کی استطاعت ہو، اس کے لئے اس طریق کار کے تحت رقم لینا درست نہیں۔ البتہ اس بات کی کوشش کی جا رہی ہے کہ اس کا طریق کار درست ہو جائے، بعض دوسرے ادارے بھی ایسی اسکیمیں نکالنا چاہتے ہیں لیکن اس بارے میں کوئی حتمی بات نہیں کہی جاسکتی، فی الحال ایسا کوئی ادارہ موجود نہیں جس سے اس سلسلے میں رجوع کیا جاسکے۔

والسلام

(حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی (صاحب مدظلہم)

بقلم محمد عبداللہ مبین

۱۴۱۲/۱۱/۲۲ھ

”بینک آف خیبر“ کی طرف سے فوڈ ڈپارٹمنٹ سے مرابحہ کی منسوخی کی صورت میں بینک کو گفٹ کے طور پر ملنے والی رقم کا حکم

سوال:- جناب حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب

السلام علیکم! اُمید ہے مزاج گرامی بخیر ہوں گے!

درج ذیل مسئلے میں آپ سے رہنمائی کی درخواست ہے:-

بینک آف خیبر نے دسمبر ۲۰۰۶ء میں فوڈ ڈپارٹمنٹ صوبہ سرحد کے ساتھ گندم کی خریداری کے سلسلے میں مرابحہ کیا تھا، جس کے تحت بینک آف خیبر نے ان کے لئے گندم پاسکو سے خریدنی تھی، اس سلسلے میں بینک نے ان کو گندم کی خریداری کے لئے اپنا ایجنٹ مقرر کر کے رقم ان کو دے دی تھی، لیکن بعد میں یہ بات ظاہر ہوئی کہ فوڈ ڈپارٹمنٹ، پاسکو سے اس معاملے میں پہلے بات چیت کر کے معاملہ طے کر چکا تھا، (اس سلسلے میں ہونے والے معاہدے لف ہیں)۔

اس وجہ سے شریعہ ایڈوائزر نے اس معاملے میں مرابحہ ناممکن قرار دیا، اس لئے بینک آف

خیبر نے خط کے ذریعے فوڈ ڈپارٹمنٹ سے اصل رقم کی واپسی کا مطالبہ کیا (خط کی کاپی منسلک ہے)۔

فوڈ ڈپارٹمنٹ نے وہ رقم تین ماہ بعد واپس کر دی، اور اب مزید کچھ رقم بھی دے دی ہے، جو

بینک نے اپنے ریزرو میں رکھی ہوئی ہے اور ابھی تک اس کو استعمال نہیں کیا۔ فوڈ ڈپارٹمنٹ کے افسران

سے بات ہوئی ہے، انہوں نے عندیہ دیا ہے کہ وہ یہ رقم بطور گفٹ ہمیں دے رہے ہیں، اور انہوں نے

یہ بھی کہا ہے کہ اس سلسلے میں مل کر ایک ایسے خط کا مضمون لکھا جائے جو بینک کے لئے قابل قبول ہو۔

اس معاملے میں External Auditor نے بھی اعتراض کیا ہے کہ ہم نے دسمبر میں انکم Accure کی ہے، جبکہ مرابحہ نہیں ہوا تھا، (اعتراض منسلک ہے) اگرچہ اس اعتراض میں کوئی وزن نہیں ہے کیونکہ FAS.1 Murabaha میں اس بات کی گنجائش ہے اور وعدہ مرابحہ کی بنیاد پر انکم ریکارڈ کی گئی، لیکن اس کو ڈپازٹرز میں بالکل تقسیم نہیں کیا گیا ہے، اور وہ Reserve میں رکھا ہوا ہے۔ اس سلسلے میں درج ذیل تجاویز پیش خدمت ہیں:-

الف:- بینک یہ رقم ڈپارٹمنٹ کو چیف منسٹر کے ذریعے واپس کر دے۔

ب:- بینک اس رقم کو گفٹ کے طور پر فوڈ ڈپارٹمنٹ کی رضامندی سے قبول کر کے اپنے منافع میں شامل کرے اور ڈپازٹرز کو دیدے۔

امید ہے کہ آپ درج بالا مسئلے کے بارے میں رہنمائی فرما کر مشکور فرمائیں گے۔ نیز اس سلسلے میں بھی رہنمائی فرمائیں کہ مستقبل میں یہ کام کیسے سرانجام دے سکتے ہیں؟ (محمد اسد)

جواب:- مکرئی جناب محمد اسد صاحب ہیڈ اسلامک بینکنگ ڈویژن، بینک آف خیبر

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

فوڈ ڈپارٹمنٹ سے منسوخ شدہ مرابحہ کے بعد جو ۵ ملین کی رقم بطور گفٹ موصول ہوئی ہے، اس کے بارے میں آپ کا سوال موصول ہوا۔ اس سلسلے میں عرض یہ ہے کہ اگر بینک کی طرف سے اس زائد رقم کا کوئی صراحۃً، اشارۃً یا کنایۃً مطالبہ ہوا تھا، خواہ گفٹ کے نام سے ہو، تب تو اس رقم کا رکھنا بالکل جائز نہیں، یہ سود کے حکم میں ہے، اور اس کو واپس کرنا ضروری ہے۔

اور اگر بینک کی طرف سے کوئی مطالبہ نہیں تھا، تب بھی اگر یہ گفٹ کسی فرد کی طرف سے ہوتا تو بات اور تھی، لیکن فوڈ ڈپارٹمنٹ ایک سرکاری محکمہ ہے جسے عام طور سے یہ اختیار نہیں ہوتا کہ وہ کسی فرد یا ادارے کو ۵ ملین روپے گفٹ کے طور پر دیدے، لہذا ظاہر یہی ہے کہ وہ 200 ملین قرض سے نفع اٹھانے کی بنا پر دی گئی ہے، اور غالباً فوڈ ڈپارٹمنٹ کے حسابات میں اسی طرح درج کی جائے گی۔ اس لئے بھی اس کو بینک کی آمدنی میں شامل کرنا درست نہیں ہوگا۔

واللہ سبحانہ اعلم

۱۴۲۸/۴/۲۵ھ



﴿فصل فی القمار والتأمين﴾

(جوا اور انشورنس کا بیان)

زندگی، گھر اور مال وغیرہ کے انشورنس کا حکم

سوال:- کیا انشورنس جائز ہے؟ مثلاً زندگی، گھر، مال وغیرہ کا۔

جواب:- انشورنس سود اور قمار پر مشتمل ہونے کی بناء پر بالکل حرام ہے، البتہ جوا انشورنس

حکومت کی طرف سے لازمی ہو، مثلاً موٹر وغیرہ کا بیمہ، اس کو مجبوراً کرا سکتے ہیں، مگر جب رقم ملے تو صرف اتنی رقم خود استعمال کر سکتے ہیں جتنی خود داخل کی تھی، اس سے زائد نہیں۔ واللہ اعلم

۱۳۹۸/۶/۱۳ھ

(فتویٰ نمبر ۶۰۷/۲۹ ب)

مروجہ انشورنس کا متبادل ”تکافل“

(وضاحت از مرتب)

۱۴۲۳ھ میں مجلس تحقیق مسائل حاضرہ کا ایک اہم اجلاس جامعہ دارالعلوم کراچی میں مروجہ انشورنس کے

متبادل پر غور و فکر کے لئے منعقد ہوا تھا، جس میں پاکستان کے اکابر مفتیان کرام کے علاوہ بنگلہ دیش اور شام کے علماء بھی شریک ہوئے تھے۔ اجلاس سے قبل حضرت والا دامت برکاتہم نے ”شرکات التكافل پر چند اشکالات“ کے عنوان سے ایک تحریر شرکاء اجلاس کو ارسال فرمائی تھی، بعد میں دو دن تک جاری رہنے والے اس اجلاس میں تبرع یا وقف کی بنیاد پر انشورنس کے متبادل پر طویل غور و فکر کیا گیا اور تبرع کے بجائے مجلس تحقیق مسائل حاضرہ کے ابتدائی اکابر مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب، حضرت مولانا محمد یوسف بنوری صاحب، حضرت مولانا مفتی ولی حسن ٹونکی صاحب رحمہم اللہ تعالیٰ کے پہلے سے تجویز کئے گئے متبادل پر تفصیلی غور و فکر کیا گیا جو وقف اور مضاربہ کی بنیاد پر قائم کیا گیا تھا، چنانچہ انہی اکابر رحمہم اللہ کے اس متبادل کو آگے بڑھاتے ہوئے ایک متفقہ قرارداد منظور کی گئی۔ ذیل میں پہلے حضرت والا دامت برکاتہم العالیہ کے اشکالات پر مشتمل وہ تحریر اور اس کے بعد مجلس کی طرف سے ان اشکالات کے جوابات کے ساتھ اکابر علماء کی قرارداد پیش کی جا رہی ہے۔ (محمد زبیر)

شرکات التكافل پر چند اشکالات

(از حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم العالیہ)

بسم الله الرحمن الرحيم

الحمد لله رب العالمين، والصلاة والسلام على سيدنا ومولانا محمد النبي

الأمين، وعلى آله وأصحابه أجمعين، وعلى كل من تبعهم بإحسان إلى يوم

الدين، أما بعد:

آج کل مختلف اشیاء کے بیمے کا کاروبار دُنیا کے ہر خطے میں انشورنس کمپنیاں انجام دے رہی ہیں، معاصر علمائے اسلام کی اکثریت نے اس کاروبار کو ”غرر“ یا ”قمار“ پر مشتمل ہونے کی بناء پر ناجائز قرار دیا ہے، اس لئے شرقِ اوسط کے مسلمانوں نے اپنے علاقے کے علمائے کرام کے مشورے سے ایسی کمپنیاں ”شرکات التكافل“ کے نام سے قائم کی ہیں، جو بیمہ کے مقاصد شرعی اصولوں کے ماتحت حاصل کرنے کی مدعی ہیں۔

دونوں قسم کی کمپنیوں کے طریقہ کار میں فرق یہ ہے کہ وہ انشورنس کمپنیاں جو شرعی قواعد کی پابند نہیں (جنہیں آئندہ مروجہ انشورنس کمپنیاں کہا جائے گا) لوگوں سے باقاعدہ تجارتی معاہدہ کرتی ہیں جس کی بنیاد پر وہ بیمہ دار سے ماہانہ یا سالانہ ایک رقم ”پریمیم“ کے نام سے وصول کرتی ہیں اور اس کے مقابلے میں یہ التزام کرتی ہیں کہ جس چیز کا بیمہ کرایا گیا ہے اگر وہ ہلاک ہو جائے یا اس کو نقصان پہنچ جائے تو انشورنس کمپنی اس نقصان کی تلافی کرے گی۔ یہ کمپنیاں پریمیم کا تعین ایک خاص حساب کے ذریعے کرتی ہیں، جس کے لئے ایک مستقل فن ”ایکچوری“ کے نام سے مشہور ہے، اس حساب کے ذریعے وہ یہ اندازہ لگاتی ہیں کہ انہیں سال بھر میں اوسطاً کتنے لوگوں کے نقصانات کی تلافی کرنی پڑے گی، اور اس پر کتنا خرچ آنے کی توقع ہے جتنا خرچ آنے کی توقع ہوتی ہے اس پر وہ اپنے منافع کی ایک مقدار کا اضافہ کر کے مختلف اشیاء کے پریمیم کا تعین کرتی ہے، اگر سال بھر میں ان کے اخراجات توقع کے مطابق ہوں تو باقی ماندہ رقم ان کے منافع کا حصہ ہوتی ہے، لیکن اگر اخراجات توقع سے زیادہ بڑھ گئے تو چونکہ انہیں نقصان کا اندیشہ ہوتا ہے، اس لئے وہ کسی اور انشورنس کمپنی سے معاملہ کرتی ہیں کہ ایسے نقصان کی صورت میں وہ کمپنیاں ان کے نقصان کی تلافی کریں، اس عمل کو انگریزی میں ری انشورنس ”Re-insurance“ اور عربی میں ”اعادة التأمين“ کہا جاتا ہے۔ مروجہ انشورنس کمپنیاں ”اعادة التأمين“ کے لئے ”ری انشورنس“ کمپنیوں کو پریمیم ادا کرتی ہیں۔

دوسری طرف ”شرکات التكافل“ جو شرقِ اوسط میں قائم کی گئی ہیں، وہ کسی تجارتی معاہدے کے بجائے ”تبرّع“ کے اصول پر قائم ہوتی ہیں، ان کمپنیوں میں مختلف افراد جو رقمیں دیتے ہیں، ان کے بارے میں یہ طے ہوتا ہے کہ یہ دینے والوں کی طرف سے ”تبرّع“ ہے، اس طرح رقمیں دینے والوں کو ”حملة الوثائق“ کہا جاتا ہے، اور ان رقموں کو کاروبار میں بھی لگایا جاتا ہے اور اس طرح جو رقمیں جمع ہوتی ہیں وہ تمام چندہ دہندگان کے نقصانات کی تلافی میں خرچ کی جاتی ہیں، اگر سال میں

جن نقصانات کی تلافی کی گئی، اس کے بعد کچھ رقم بچ رہی تو وہ کمپنی کا منافع نہیں ہوتا بلکہ انہیں ان حملہ الوثائق میں تقسیم کر دیا جاتا ہے جنہوں نے ابتداء میں تلافی نقصانات کے لئے رقمیں دی تھیں۔

شرکات التكافل کا بنیادی تصور تو یہی ہے جو اوپر ذکر کیا گیا لیکن عملاً اس تصور میں مندرجہ ذیل مسائل پیدا ہوتے ہیں:

۱- چونکہ تکافل کی کارروائی دُنیا کے کسی بھی ملک کے قانون میں ایک کمپنی کے قائم کئے بغیر ممکن نہیں، اس لئے کچھ لوگوں کو اپنا ابتدائی سرمایہ لگا کر ایک کمپنی قائم کرنی پڑتی ہے، ان لوگوں کو ”شیر“ ہولڈر“ یا ”حامل حصص“ کہا جاتا ہے، چونکہ مروجہ انشورنس کمپنیوں کی طرح یہ لوگ نقصانات کی تلافی سے بچی ہوئی رقم کے حق دار نہیں ہوتے، اس لئے ان کی آمدنی صرف ان کے لگائے ہوئے سرمایہ پر تجارتی نفع کی حد تک محدود ہے، اور تکافل فنڈ سے انہیں کچھ نہیں ملتا، البتہ بعض ”شرکات التكافل“ ان کو تکافل فنڈ سے فنڈ کے انتظام و انصرام کی اجرت ادا کرتی ہیں، اور ملیشیا کی تکافل کمپنیاں ان کو تکافل فنڈ کی بچی ہوئی رقم سے رقم کا ایک مخصوص فیصد حصہ ادا کرتی ہیں، غور طلب سوال یہ ہے کہ آیا کمپنی کے مؤسسین کو یہ ادائیگی جائز ہے یا نہیں؟ اگر ہے تو کس بنیاد پر؟

۲- اگرچہ تکافل فنڈ تبرع کی بنیاد پر قائم کیا جاتا ہے، لیکن اس فنڈ سے خود متبرع بھی نقصان کی صورت میں مستفید ہوتا ہے، بلکہ تکافل فنڈ میں لوگوں کے نقصانات کی تلافی ان کے دیئے ہوئے ”تبرع“ کی مقدار کی بنیاد پر ہوتی ہے، یعنی جس کا جتنا زیادہ تبرع ہوگا، وہ اتنے ہی بڑے نقصان کی تلافی اس فنڈ سے کرا سکے گا، دوسرے الفاظ میں تبرع کی رقم کا تعین اس چیز کی قیمت کے لحاظ سے ہوتا ہے جس کے نقصان کی وہ تلافی چاہتا ہو۔

چنانچہ اگر کوئی شخص سوز و کی کار کے نقصان کی تلافی کا خواہش مند ہو تو اسے کم تبرع کرنا پڑے گا، اور اگر مرسڈیز کار کے نقصان کی تلافی کا خواہش مند ہو تو اسے زیادہ تبرع کرنا پڑے گا، سوال یہ ہے کہ کیا اس صورت میں جبکہ متبرع اس نقطہ نظر سے اور اس بنیاد پر رقم کی مقدار کا تعین کر رہا ہے کہ اس کو کس نقصان کی تلافی مقصود ہے تو کیا واقعہ تبرع رہے گا؟ یا یہ بھی عقد معاوضہ میں داخل ہو جائے گا؟ شرق اوسط کے جن حضرات نے اس کو تبرع قرار دے کر اس کی اجازت دی ہے، ان کا کہنا یہ ہے کہ جو کچھ رقمیں جو کوئی شخص دیتا ہے وہ تکافل فنڈ کا حصہ بن جاتی ہیں، اس تکافل فنڈ کے قواعد و ضوابط خود اس فنڈ کے قائم کرنے والوں نے جن میں ہر متبرع داخل ہے، یہ مقرر کئے ہیں کہ جس شخص نے جتنا چندہ دیا ہوگا، اسی حساب سے وہ اس فنڈ سے اپنے نقصانات کی تلافی کرا سکے گا، اور جو فنڈ باہمی تعاون اور تبرع کی بنیاد پر قائم کیا گیا ہو اس کے قواعد و ضوابط فنڈ کے تمام شرکاء باہمی رضامندی سے مقرر کر سکتے

ہیں، لہذا اگر یہ قاعدہ مقرر کر لیا گیا ہے کہ لوگوں کے نقصانات کی تلافی ان کے تبرعات کی مقدار کے حساب سے کی جائے گی تو اس سے فنڈ کے تبرع پر مبنی ہونے پر کوئی فرق واقع نہیں ہوگا، سوال یہ ہے کہ کیا شرعاً یہ نقطہ نظر درست ہے؟

۳- جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا مروجہ انشورنس کمپنیاں نقصان کے خطرے کے پیش نظر ”ری انشورنس“ کمپنیوں سے ”اعادة التأمين“ کراتی ہیں، ”شرکات التكافل“ کو بھی یہ خطرہ درپیش رہتا ہے کہ تکافل فنڈ کی رقم نقصانات کی تلافی کے لئے ناکافی ہو جائے۔

اگرچہ ایک دو مقامات پر مسلمانوں نے ”اعادة التكافل“ کی کمپنیاں بھی قائم کی ہیں، مگر ان کی صلاحیت بہت محدود ہے، اس لئے عرب کے علماء نے ان کو اس بات کی اجازت دی ہے کہ جب تک شرعی بنیادوں پر ”اعادة التكافل“ کا نظام مستحکم نہ ہو، اس وقت تک وہ بدرجہ مجبوری مروجہ ”ری انشورنس“ کمپنیوں سے ”اعادة التأمين“ کرا سکتی ہیں، ان حضرات کا موقف یہ ہے کہ تامين کی حرمت ربا اور قمار کی وجہ سے نہیں، بلکہ اس وجہ سے ہے کہ یہ ”عقد غرر“ ہے چونکہ انشورنس کمپنی نقصان کی صورت میں نقصانات کی تلافی محض پیسے دینے کی شکل میں نہیں کرتی جس سے ”مبادلة النقود بالنقود“ لازم آئے بلکہ وہ نقصان کی تلافی کی ذمہ داری لیتی ہے، مثلاً کار تباہ ہوئی تو اس کی جگہ دوسری کار فراہم کرنا، مکان تباہ ہوا تو اس کی جگہ دوسرا مکان تیار کرنا وغیرہ، لہذا یہ عقد ربا یا قمار نہیں بلکہ عقد غرر ہے، اور ”غرر“ کو حاجت عامہ کی بنا پر گوارا کیا جاسکتا ہے، سوال یہ ہے کہ کیا یہ موقف درست ہے؟ اور اگر نہیں تو اس صورت حال سے نمٹنے کے لئے کوئی دوسرا طریقہ کیا ہو سکتا ہے؟

مجلس کی طرف سے مذکورہ اشکالات کا جواب اور

”تکافل“ سے متعلق اکابر علمائے کرام کی قرارداد

نَحْمَدُهُ وَنُصَلِّي عَلَى رَسُولِهِ الْكَرِيمِ سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَآلِهِ وَصَحْبِهِ أَجْمَعِينَ

أَمَّا بَعْدُ!

جامعہ دارالعلوم کراچی کے شعبہ مرکز الاقتصاد الاسلامی کی دعوت پر پاکستان، بنگلہ دیش اور شام کے اہل علم اور اہل فتویٰ حضرات کا اہم اجتماع بتاریخ ۲۱-۲۲ شوال ۱۴۲۳ھ بروز جمعرات، جمعہ مطابق ۲۶-۲۷ دسمبر ۲۰۰۲ء جامعہ دارالعلوم کراچی کے دارالافتاء کے ہال میں بیمہ کے متبادل نظام ”تکافل“ پر غور کرنے کے لئے منعقد ہوا۔

مجلس کے علمائے کرام نے مروجہ انشورنس کے متبادل نظام ”شرکتہ التکافل“ پر غور کیا، جس کی عملی صورت بنگلہ دیش، شرقِ اوسط اور ملائیشیا کی بعض کمپنیوں نے اختیار کی ہے۔ اس متبادل طریقہ کار پر حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم نے ”شرکات التکافل پر چند اشکالات“ کے نام سے جو تحریر اہل علم کے مطالعے کے لئے ارسال کی تھی، اسے مجلس میں پڑھا گیا اور ان اشکالات کا جائزہ لیا گیا۔

مجلس کے آغاز میں مہمان عرب عالم دین اور متعدد مالیاتی اداروں کے شرعی امور کے نگران جناب شیخ عبدالستار ابوغدہ نے مغربی بیمہ کمپنیوں کی تاریخ کا اجمالی جائزہ پیش کیا اور اب اسلامی ممالک میں جو تکافل کمپنیاں کام کر رہی ہیں ان کے طریق کار پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔ بعد میں شرکاء مجلس کے بعض سوالات و شبہات کے جوابات دیئے۔

اس کے بعد متعدد اہل مجلس نے اپنی آراء بیان فرمائیں اور طویل بحث کے بعد مجلس نے یہ طے کیا کہ اس وقت اسلامی ممالک میں جو تکافل کمپنیاں اسلامی اصولوں کے مطابق کام کر رہی ہیں یا کام کرنا چاہتی ہیں ان سب کی بنیاد ”حملۃ الوثائق“ (پالیسی ہولڈرز یا بالفاظِ دیگر پر بیمہ قسط ادا کنندگان) کی طرف سے ”تبرّع“ پر رکھی گئی ہے، اور اس تبرّع کی بنیاد پر وہ اپنے متوقع مالی خطرات کا ازالہ کرتے ہیں، مجلس نے محسوس کیا کہ وقف کے بغیر تبرّع کی بنیاد پر تکافل کمپنیوں کے قیام میں متعدد اشکالات ہیں۔ شیخ عبدالستار ابوغدہ اور دوسرے عرب علماء نے اگرچہ ان اشکالات کے اپنے اپنے طور پر جوابات دیئے ہیں لیکن مجلس کو خیال ہوا کہ اس مسئلے میں مزید تحقیق کی ضرورت ہوگی، اگر فی الحال ترجیحاً ان کمپنیوں کی بنیاد تبرّع کے بجائے وقف پر رکھی جائے تو اس قسم کے اشکالات سے حفاظت ہو سکتی ہے۔

اس سے بڑھ کر بات یہ ہے کہ ۱۳۸۴ھ میں مجلس تحقیق مسائل حاضرہ نے حضرت مولانا مفتی محمد شفیع، حضرت مولانا محمد یوسف بنوری، حضرت مولانا ولی حسن رحمہم اللہ اور دیگر اکابر کی سرپرستی میں بیمہ زندگی کے متبادل کے طور پر جو نظام تجویز کیا تھا، اس کی بنیاد بھی وقف اور مضاربیت پر رکھی تھی (دیکھئے ”بیمہ زندگی“ مؤلفہ حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب قدس سرہ ص: ۲۵)۔

ان جلیل القدر اکابر کی تجویز کردہ بنیاد ”وقف“ پر اگر تکافل کمپنی قائم کی جائے تو نسبت اشکالات کم پیش آئیں گے، لہذا مجلس نے تبرّع کے مقابلے میں وقف کی بنیادوں پر قائم شرکتہ التکافل کے قیام کی صورت کو ترجیح دی جس میں اولاً مسابہین (شیئر ہولڈرز یعنی تکافل کمپنی حصہ داران) اپنے طور پر اصول ثابتہ (اموال غیر منقولہ) یا نقد یا دونوں کو شرعی اصول و ضوابط کے مطابق وقف کریں گے جنہیں محفوظ رکھا جائے گا اور ان کے لئے آخری جہت ”قربت“ یعنی فقراء اور مساکین پر تصدق ہوگی، پھر حملۃ الوثائق (پالیسی ہولڈرز) اس وقف میں جو رقوم دیں گے یا وقف کے جتنے منافع یا زوائد ہوں

گے وہ سب وقف کے مملوک ہوں گے اور وقف کو وقف کے طے شدہ اصول و ضوابط کے مطابق ان مملوکات و منافع میں تصرف کا مکمل اختیار ہوگا۔

اس اصول کے طے ہونے کے بعد حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم کے تین اشکالات پر غور کیا گیا۔ نمبر وار اشکالات کے جوابات یہ طے کئے گئے:

(۱)

(الف) مساهمین تکافل فنڈ سے فنڈ کے انتظام و انصرام کی اجرت درج ذیل شرائط کے ساتھ وصول کر سکتے ہیں:

- ۱- یہ اجرت فنڈ سے ادا کی جائے کیونکہ یہ لوگ فنڈ کے اجیر ہیں نہ کہ حملۃ الوثائق کے۔
- ۲- اس اجرت کا متعین ہونا ضروری ہے خواہ وہ تعین رقم کی صورت میں ہو یا حصہ متناسبہ کی صورت میں۔

۳- یہ بھی ضروری ہے کہ یہ اجرت اعمال مضاربت سے خارج کسی اور عمل پر ہو۔

(ب) اگر وقف کے متولین (یعنی شرکۃ التکافیل) شرعی حدود میں وقف کے لئے مضاربت کی خدمات انجام دیں تو وہ مضاربت کے طور پر ہونے والے نفع کے متناسب متعین حصے کے بھی حق دار ہو سکتے ہیں، مگر اس کے لئے دو شرائط ہیں:

- ۱- مضاربت اور اجارہ کی حدود علیحدہ علیحدہ واضح طور پر متعین ہوں تاکہ اجارہ کے طور پر وہ صرف متعین اجرت کے حق دار ہوں، اور مضاربت کے طور پر ہونے والے نفع میں سے حصہ متناسبہ کا حق رکھیں۔

۲- هیئۃ الرقابة الشرعیۃ سے مضاربت کی باقاعدہ اجازت لے لی جائے۔

(۲)

حملۃ الوثائق جو کچھ تبرع کی بنیاد پر وقف کو دیں اس میں کمی یا زیادتی کی بنیاد پر کم یا زیادہ نقصان کی تلافی کا اگر حملۃ الوثائق کو قانونی حق نہ ہو، بلکہ وقف کی طرف سے محض وعدہ کی حیثیت ہو تو اس میں بظاہر شبہ کی کوئی بات نہیں ہے۔ اگر تبرع کی کمی اور زیادتی کی بنیاد پر تلافی نقصان کی کمی اور زیادتی حملۃ الوثائق کا قانونی حق ہو تو اس میں مجلس کے بعض شرکاء کی رائے یہ تھی کہ یہ صورت جائز نہیں کیونکہ یہ صورت عقد معاوضہ میں داخل ہوگی اور یہ بیہنہ وہی صورت ہے جو بیمہ کمپنیوں میں فی الحال رائج ہے، لیکن مجلس کے اکثر شرکاء کی رائے یہ تھی کہ حملۃ الوثائق کے قانونی حق بننے کی دو صورتیں ہیں۔ پہلی صورت یہ ہے کہ حامل وثیقہ اس بنیاد پر اپنے قانونی حق کا دعویٰ کرے کہ اس نے فلاں

وقت میں وقف فنڈ کو اتنی رقم دے کر اس سے نقصان کی تلافی کا معاہدہ کیا تھا، لہذا اب اس کے اتنے نقصان کی تلافی کرنا وقف کے ذمہ لازم ہے، یہ صورت تو یقیناً ناجائز ہے کیونکہ یہ بات اسے عقود معاوضہ میں داخل کر کے اس میں ربا اور غرر کی خرابیاں پیدا کر دے گی۔

دوسری صورت یہ ہے کہ حامل وثیقہ اپنے سابقہ تبرع کی بنیاد پر اپنے نقصان کی تلافی کا دعویٰ نہ کرے بلکہ وقف کے اپنے طے شدہ قواعد و ضوابط کو بنیاد بنا کر اس بات کا دعویٰ کرے کہ میں ان قواعد و ضوابط کی بنیاد پر وقف کی طرف سے تلافی نقصان کا حق دار ہوں۔ مجلس کے اکثر شرکاء کی رائے یہ ہے کہ حامل وثیقہ شرعاً اپنا یہ حق استعمال کر سکتا ہے اور اس کا یہ قانونی حق اس صورت کو عقد معاوضہ میں داخل نہیں کرتا۔ حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب قدس سرہ کی کتاب ”اسلام کا نظام اراضی“ (ص: ۱۳۶، ۱۳۷) کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ عطاء مستقل کے لئے سابقہ ضرر کو بنیاد بنایا جاسکتا ہے۔ اس پر بعض حضرات کو ایک اشکال ہے، یہ اشکال اور اس کا جواب جو حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم نے تحریر فرمایا ہے، آگے آرہا ہے۔

(۳)

راج الوقت إعادة التأمين میں جہاں پورے پریمیم کے ڈوبنے کا خطرہ ہو، وہاں غرر کے علاوہ قمار کی خرابی بھی پائی جاتی ہے، اور جہاں پریمیم ڈوبنے کا ڈر نہ ہو وہاں غرر ہونا تو بہر حال طے ہے، اور غرر بھی فاحش ہے، لہذا محض إعادة التأمين کی خاطر اس کو جائز قرار نہیں دیا جاسکتا۔ البتہ درج ذیل متبادل صورتوں کو اختیار کیا جاسکتا ہے:

- ۱- إعادة التكافل کی کمپنیاں بھی شرعی بنیادوں پر قائم ہوں۔
- ۲- تبرع کرنے والوں سے مزید تبرع کی درخواست کی جائے۔
- ۳- تبرع کرنے والوں سے قرض لے کر فی الحال اس سے ادائیگیاں کی جائیں یا ان سے بطور مضاربہ رقم لے کر سرمایہ کاری کی جائے، اور حاصل ہونے والے نفع سے نقصانات کی تلافی کی جائے۔
- ۴- احتیاطیات میں رقم زیادہ رکھی جائے۔
- ۵- وقف پر تلافی نقصان کی ذمہ داری نسبتاً کم رکھی جائے۔
- ۶- اسلامی تکافل کمپنیاں آپس میں إعادة التكافل کی خدمات انجام دیں۔

ملحوظہ:

۱- مجلس میں شریک علمائے کرام نے یہ بھی طے کیا کہ ہر تکافل کمپنی کے اندر مستند علمائے کرام اور اہل فتویٰ حضرات پر مشتمل ایک ہیئۃ الرقابة الشریعة (شریعہ بورڈ) لازمی ہے جو کمپنی کے تمام

معاهدات اور جملہ قابل ذکر امور کے شریعت کے مطابق ہونے کی نگرانی کرے گا۔
۲۔ مجلس نے یہ سفارش پیش کی کہ چونکہ مجلس کا طے شدہ تکافل کا نظام ”تبرّع“ کے بجائے ”وقف“ پر قائم ہوا ہے، اس لئے بیمہ کمپنیوں کی قدیم اصطلاحات میں تبدیلی کر کے انہیں بھی فقہ اسلامی کے مطابق کرنا مناسب ہے۔

ایک اشکال اور اس کا جواب

جب کوئی شخص پریمیم جمع کراتا ہے تو اس نیت سے کراتا ہے کہ بوقت نقصان زیادہ ملے گا۔ اور اس زیادت کے لئے وہ کمپنی کو مجبور بھی کر سکتا ہے۔ اس کی توجیہ حضرت نے یہ فرمائی کہ دینا محض تبرّع ہے اور لینا صندوق کے قوانین کے تحت ہے۔

حضرت کی توجیہ سے یہ عقد صریح قمار سے تو نکل گیا لیکن اس میں شبہ ربا ہے۔ وہ اس طرح کہ دیتے وقت نیت یہ ہے کہ زیادہ ملے چاہے کسی قانون سے ہو، اور ارشاد ہے کہ: ”وَلَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ وَقَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ لَا تَعْطِ عَطِيَّةَ تَلْتَمِسُ بِهَا أَفْضَلَ مِنْهَا“^(۱) اسی وجہ سے نبوتہ کو ناجائز کہا گیا ہے، حالانکہ اس میں بھی یہ کہا جاسکتا ہے کہ دینا ایک مستقل عطیہ ہے اور دوسرا جب دیتا ہے تو وہ ایک مستقل عطیہ ہے، لیکن چونکہ نیت لینے کی ہے اس لئے علامہ ابن عابدین نے اس کو قرض میں داخل فرمایا ہے۔

فی التارخانیة: وفي الفتاوى الخيرية سئل فيما يرسله الشخص الى غيره في الأعراس ونحوها هل يكون حكمه حكم القرض فيلزمه الوفاء به أم لا؟
أجاب: ان كان العرف بأنهم يدفعونه على وجه البدل يلزم الوفاء به مثليا فبمثله وان قيميا فبقيمته وان كان العرف خلاف ذلك بأن كانوا يدفعونه على وجه الهبة ولا ينظرون في ذلك الى اعطاء البدل فحكمه حكم الهبة والأصل فيه ان المعروف عرفا كالمشروط شرطا. اهـ

قلت: والعرف في بلادنا مشترك نعم في بعض القرى يعدونه قرضا حتى انهم في كل وليمة يحضرون الخطيب يكتب لهم ما يهدى فاذا جعل المهدى وليمة يراجع المهدى الدفتر فيهدى الأول الى الثاني مثل ما أهدى اليه.
(ج: ۵ ص: ۲۹۶)^(۲)

لہذا یہاں بھی جب دینا اس غرض سے ہے کہ واپس ملے گا اور وہ بھی زیادہ ملے گا، تو ایک تو

(۱) تفسیر قرطبی ج: ۱۹ ص: ۶۷ (طبع دار احیاء التراث العربی بیروت) و ج: ۱۹ ص: ۶۳ (طبع مکتبہ حقانیہ پشاور)

(۲) رد المحتار ج: ۵ ص: ۲۹۶ (طبع سعید).

یہ اس آیت کی وعید میں داخل ہے اور کم از کم مکروہ ضرور ہوگا۔ اور دوسرا علامہ ابن عابدینؒ کی توجیہ کے مطابق قرض میں داخل ہو جائے گا۔ اور زیادت سود سے مشابہ ہوگی۔ اور سود کے بارے میں یہ حکم ہے: ”فدعوا الربا والریبۃ“ تو یہ کہیں ریبہ میں تو داخل نہیں؟

عن الحسن قال: سمعت أبا معاذ يقول: أخبرنا عبید قال: سمعت الضحاک يقول فی قوله: وَمَا آتَيْتُمْ مِّنْ رَبًّا لَّيْرَبُوْا فِيْ أَمْوَالِ النَّاسِ فَهُوَ مَا يَتَعَاطَى النَّاسُ بَيْنَهُمْ وَيَتَهَاوُونَ يَعْطَى الرَّجُلُ الْعَطِيَّةَ لِيَصِيبَ مِنْهُ أَفْضَلُ مِنْهَا وَهَذَا لِلنَّاسِ عَامَةٌ وَأَمَّا قَوْلُهُ: وَلَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ فَهَذَا لِلنَّبِيِّ خَاصَّةٌ لَمْ يَكُنْ لَهُ أَنْ يَعْطَى إِلَّا لِلَّهِ وَلَمْ يَكُنْ يَعْطَى لِيَعْطَى أَكْثَرَ مِنْهُ. (قرطبی ج: ۲۱ ص: ۴۶) (۱)

لیکن حاضرین کی اکثریت نے اس اشکال کا جواب یہ دیا کہ اس بات پر تمام فقہائے کرام کا اتفاق ہے کہ واقف کوئی چیز وقف کرتے وقت اس سے خود نفع اٹھانے کی نیت کرے بلکہ وقف نامے میں اپنے انتفاع کی باقاعدہ شرط لگائے، تو اس کی اجازت ہے، جس کی دلیل حدیث معروف ہے: ”يَكُونُ دَلُوهُ فِيهَا كَدَلَاءِ الْمُسْلِمِينَ“ (۲)

اس سے معلوم ہوا کہ وقف کے احکام انفرادی ہدایا سے مختلف ہیں، اور اس کی وجہ واضح ہے کہ وقف کا موضوع لہٰذا ہی موقوف علیہم کو فائدہ پہنچانا ہے، لہٰذا اگر واقف وقف سے فائدہ اٹھاتا ہے تو وہ وقف کے موضوع لہٰذا میں داخل ہونے کی بناء پر اس سے فائدہ اٹھاتا ہے۔ چنانچہ وقف کی صورت میں چندہ دینے والا اگر وقف سے فائدہ اٹھائے تو وقف کے قواعد و ضوابط کے مطابق فائدہ اٹھائے گا۔ اگر وقف کے قواعد و ضوابط کے مطابق وہ مستحق قرار نہ پائے تو وہ فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔

نیوتہ میں کوئی وقف نہیں ہوتا اس میں ”مہدی لہٰذا“ کا موضوع لہٰذا بھی یہ نہیں ہے کہ وہ دوسروں کو ہدیہ دے، وہ دو افراد کا باہمی معاملہ ہے جس میں ہدیہ کا لوٹنا مشروط یا معروف ہو تو اس میں عقد معاوضہ ہونے کے سوا کوئی دوسرا احتمال نہیں ہے۔ جبکہ دوسری طرف وقف کو چندہ دینا ایک مستقل معاملہ ہے اور وقف کے قواعد کے مطابق چندہ دینے والے کا استحقاق انتفاع بالکل دوسرا معاملہ۔ اس لئے وقف کے معاملے کو نیوتہ پر قیاس نہیں کیا جاسکتا۔

(۱) تفسیر طبری باب: ۳۷ ج: ۲۰ ص: ۱۰۵ (طبع مجمع الملک فہد).

(۲) صحیح البخاری، کتاب المساقات، باب فی الشرب ج: ۱ ص: ۳۱۶ (طبع قدیمی کتب خانہ).

ایضاً فیہ کتاب الوصایا، باب اذا وقف أرضاً أو بنیاً واشترط لنفسه مثل دلاء المسلمین.

وفی جامع الترمذی، أبواب المناقب، باب مناقب عثمان بن عفان ”فیجعل دلوہ مع دلاء المسلمین“.

کذا فی النسائی، کتاب الاحباس، باب وقف المساجد.

وفی مسند أحمد بن حنبل (ج: ۱ ص: ۷۵) ”فیكون دلوہ فیہا کدلیء المسلمین“.

شرکاء مجلس کے اسماء اور مذکورہ قرارداد پر ان کے دستخط

- ۱- حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب مدظلہم جامعہ دارالعلوم کراچی دستخط
- ۲- الشیخ عبدالستار ابو غده حفظہ اللہ شام
- ۳- حضرت مولانا مفتی عبیدالحق صاحب مدظلہم بنگلہ دیش دستخط
- ۴- حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم جامعہ دارالعلوم کراچی دستخط
- ۵- حضرت مولانا مفتی اظہار الاسلام صاحب مدظلہم بنگلہ دیش دستخط
- ۶- حضرت مولانا مفتی عبدالرحمن صاحب مدظلہم بنگلہ دیش دستخط
- ۷- حضرت مولانا مفتی نظام الدین شامزئی صاحب مدظلہم علامہ بنوری ٹاؤن کراچی دستخط
- ۸- حضرت مولانا مفتی عبدالستار صاحب مدظلہم جامعہ خیر المدارس ملتان
- ۹- حضرت مولانا مفتی محمود اشرف عثمانی صاحب مدظلہم جامعہ دارالعلوم کراچی دستخط
- ۱۰- حضرت مولانا مفتی عبدالرؤف سکھروی صاحب مدظلہم جامعہ دارالعلوم کراچی دستخط
- ۱۱- حضرت مولانا مفتی عبدالرحیم صاحب مدظلہم دارالافتاء والارشاد کراچی
- ۱۲- حضرت مولانا مفتی عبداللہ صاحب مدظلہم جامعہ دارالعلوم کراچی دستخط
- ۱۳- حضرت مولانا مفتی ابولبابہ صاحب مدظلہم ضرب مؤمن کراچی دستخط
- ۱۴- حضرت مولانا مفتی اصغر علی ربانی صاحب مدظلہم جامعہ دارالعلوم کراچی دستخط
- ۱۵- حضرت مولانا مفتی عبدالقدوس ترمذی صاحب مدظلہم جامعہ حقانیہ ساہیوال (سرگودھا) دستخط
- ۱۶- حضرت مولانا مفتی عبدالحمید صاحب مدظلہم جامعہ اشرف المدارس کراچی دستخط
- ۱۷- حضرت مولانا مفتی عبدالباری صاحب مدظلہم جامعہ فاروقیہ کراچی دستخط
- ۱۸- حضرت مولانا مفتی رضوان احمد صاحب مدظلہم ادارہ غفران اسلام آباد
- ۱۹- حضرت مولانا مفتی عبدالمنان صاحب مدظلہم جامعہ دارالعلوم کراچی دستخط
- ۲۰- حضرت مولانا مفتی محمد صاحب مدظلہم دارالافتاء والارشاد کراچی

سودی بیمہ کے شرعی متبادل کے لئے یہ تحریر ابتدائی خاکہ کا درجہ رکھتی ہے دیگر شرائط

وتفصیل اور عملی نفاذ میں ممکنہ فقہی مشکلات پر کام ہونا باقی ہے۔ دستخط

- ۲۱- حضرت مولانا مفتی مخلص الرحمن صاحب مدظلہم بنگلہ دیش دستخط
- ۲۲- حضرت مولانا مفتی میزان الرحمن صاحب مدظلہم بنگلہ دیش دستخط
- ۲۳- حضرت مولانا مفتی کمال الدین ظفری صاحب مدظلہم بنگلہ دیش دستخط
- ۲۴- حضرت مولانا عزیز الرحمن صاحب مدظلہم جامعہ دارالعلوم کراچی دستخط
- ۲۵- حضرت مولانا مفتی زبیر اشرف عثمانی صاحب مدظلہم جامعہ دارالعلوم کراچی دستخط
- ۲۶- حضرت مولانا ڈاکٹر عمران اشرف عثمانی صاحب مدظلہم جامعہ دارالعلوم کراچی دستخط

مروّجہ انشورنس کے متبادل ”تکافل“ کے طریقہ کار کا جائزہ

اور اس کی بعض شقوں کی وضاحت

سوال:- گرامی قدر حضرت جناب مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، مزاج بخیر! جناب عالی!

یہاں ساؤتھ افریقہ میں مروّجہ انشورنس کے مقابلے میں تکافل کے نام سے ایک ادارہ قائم ہوا ہے، اس کا مقصد جائز طریقے سے انشورنس کے مقصد کو حاصل کرنا ہے، بندے نے اس کی ماہیت و وضع سے متعلق پوری تفصیل لکھی ہے جو کہ مرسل ہے۔ آنجناب سے گزارش ہے کہ اس کا مطالعہ فرما کر اپنی عالی رائے سے سرفراز فرمائیں اور غلطی کی اصلاح فرمائیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر عطا فرمائے، آمین۔

”تکافل ساؤتھ افریقہ“

دُنیا میں رائج انشورنس کے مقابلے میں یہاں ساؤتھ افریقہ میں چند مسلمانوں نے ایک ایسا ادارہ قائم کیا ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ شرعی و جائز طریقے سے رائج انشورنس کے فوائد و مقاصد حاصل کئے جائیں، اس ادارے کو ”تکافل“ کا نام دیا ہے، یہ لفظ بمعنی ضمانت نہیں ہے بلکہ اس سے مراد تعاون و تناصر ہے، دُنیا کے مختلف ممالک میں بھی اسی غرض سے اس نام سے ادارے قائم ہیں۔ تکافل ساؤتھ افریقہ کا ڈھانچہ و ماڈل اس طرح ہے کہ:-

۱- چند محدود افراد نے اس نیت سے محدود رقم وقف کر کے ایک فنڈ قائم کیا ہے کہ جو لوگ اس وقف فنڈ کے ممبر ہوں گے، ان پر اگر کوئی حادثہ یا نقصان عارض ہوا تو طے شدہ قواعد و شرائط کے تحت اس ممبر کی اس وقف فنڈ کے منافع سے مدد کی جائے گی، اور اس میں سے محدود نسبت کے ساتھ کچھ رقم فقراء میں بھی تقسیم کی جائے گی۔

۲- اس وقف فنڈ کو جائز اسلامی سرمایہ کاری کے ذریعے بڑھایا جائے گا، نیز جو اس وقف فنڈ کا ممبر بنے گا اس سے اس فنڈ کے لئے چندہ وصول کیا جائے گا، یہ چندہ وقف فنڈ کے منافع کے حکم میں ہوگا، یہ چندہ وقف کے حکم میں نہیں ہوگا، جیسا کہ مسجد کی عمارت وقف ہوتی ہے اور اس کے لئے جو چندہ حاصل ہوتا ہے وہ اس کے منافع ہوتے ہیں اور یہ منافع مسجد کے مصالحوں پر خرچ کئے جاتے ہیں

(والتفصیل فی امداد الأحکام ج: ۳ ص: ۲۲۰)۔

۳- جو شخص وقف فنڈ کو چندہ دے گا تو وہ وقف فنڈ کے مقاصد کو پورا کرنے کی نیت سے

چندہ دے گا، اور وہ اس چندے کا مالک نہیں رہے گا، بلکہ یہ چندہ وقف فنڈ کی ملکیت ہو جائے گا۔

۴- اس وقف فنڈ کا ممبر حادثہ پیش آنے کی صورت میں اس بنیاد پر تلافی کا دعویٰ کرے گا کہ وہ اس وقف فنڈ کے مقاصد کے مطابق مستحق ہے، اگر وقف فنڈ کے متولی اس کے نقصان کی تلافی کرنے سے انکار کریں تو وہ عدالت سے اس بنیاد پر رجوع کر سکتا ہے کہ وقف فنڈ کا اصل مالک اللہ تعالیٰ ہے اور اس کے متولی اس وقف فنڈ کو اس کے مقاصد کے مطابق چلانے کے ذمہ دار ہیں، لیکن وہ اس میں کوتاہی کر رہے ہیں، لہذا عدالت ان سے باز پرس کرے۔ گویا یہ حقوق اللہ میں سے ہو گیا، جیسا کہ مالِ غنیمت تقسیم سے پہلے کسی ایک مجاہد کی ذاتی ملکیت نہیں ہوتا اور ہر مجاہد کی ذمہ داری ہے کہ جو کچھ بھی مال کافروں سے حاصل ہو وہ لا کر امام کے پاس جمع کرے، نہ خود چھپائے اور نہ ہی کسی دوسرے کو چھپانے دے، اگر کسی مجاہد نے دوسرے کے غلول کو چھپایا تو وہ بھی گناہگار ہے۔ حدیث شریف میں ہے کہ: ”ومن یکتُم غلًّا فانہ مثلہ“ رواہ ابو داؤد (مشکوٰۃ ص: ۳۵۱)۔

نیز جس طرح جہاد میں ہر مجاہد کی نیت ابتداء میں مال حاصل کرنے کی نہیں ہوتی، حتیٰ کہ بعض دفعہ امیر یہ بھی اعلان کر دیتا ہے کہ: ”من قتل قتیلًا فلہ سلبہ“ تاکہ قتال پر ابھارا جائے اور سستی پیدا نہ ہو، اس کے بعد جب مالِ غنیمت تقسیم ہوتا ہے تو ہر مجاہد اپنے حصے کی غنیمت و انعام خصوصی کا جس کا اعلان کیا گیا ہو دعویٰ کر سکتا ہے، غزوہ حنین میں فتح ہونے کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلان فرمایا کہ: ”من قتل قتیلًا لہ علیہ بینۃ فلہ سلبہ“ (مشکوٰۃ ص: ۳۲۸) تو ایک صحابی حضرت ابوقنادہ انصاری رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے اور فرمایا: ”من یشہد لی“ لیکن کوئی گواہی دینے کے لئے کھڑا نہیں ہوا تو آپ بیٹھ گئے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دوبارہ پھر اعلان کیا، یہ صحابی دوبارہ کھڑے ہوئے لیکن انہیں کوئی گواہ نہیں ملا تو بیٹھ گئے، تیسری دفعہ بھی اسی طرح ہوا، اس کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوقنادہ سے پوچھا کہ: کیا بات ہے؟ انہوں نے اپنا واقعہ بیان کیا کہ میں نے ایک کافر کو قتل کیا ہے، اس کے بعد ایک دوسرے صحابی نے (جن کے پاس اس مقتول کا سامان تھا) حضرت ابو قنادہ کی تصدیق کی اور یہ خواہش ظاہر کی کہ اُس مقتول کا سامان مجھے دے دیا جائے اور ابوقنادہ کو راضی کر دیا جائے، لیکن حضرت ابوقنادہ اس پر راضی نہیں ہوئے لہذا انہیں مقتول کا سامان دیا گیا، متفق علیہ۔

اس حدیث شریف سے ثابت ہوا کہ تبرع کی نیت سے کچھ کرنے کے بعد (جہاد میں جانا اور اپنی جان و مال خرچ کرنا بھی تبرع ہے)، اگر کسی چیز کا استحقاق ثابت ہو جائے تو اس کے لئے دعویٰ کرنا جائز ہے، نیز یہ موقوف علیہ بھی ہے، لہذا مستحق ہونے کی وجہ سے دعویٰ کر سکتا ہے (در مختار

۵۔ یہ بھی طے ہوا ہے (متولیوں کی طرف سے) کہ اس وقف فنڈ کو شریعت کے مطابق چلانے اور اس کی نگرانی کرنے کے لئے ایک شریعہ بورڈ قائم ہوگا اور ان کی ہدایات کی روشنی میں اس فنڈ کو چلایا جائے گا، اگر یہ ثابت ہو جائے کہ اس فنڈ کو جاری رکھنا شریعت کے مطابق نہیں ہے اور ائمہ اربعہ میں سے کسی کے بھی نزدیک صحیح نہیں ہے یا یہ فنڈ اپنے مقاصد کے مطابق چل نہ سکے تو اس فنڈ کی جتنی بھی رقم و جائیداد وغیرہ ہوگی وہ سب فقراء وغیرہ میں تقسیم کر کے اس فنڈ کو ختم کر دیا جائے گا۔

۶۔ وقف فنڈ کے منافع کا سالانہ حساب کیا جائے گا اور اصل وقف رقم سے زائد جو رقم ہوگی وہ ممبران میں تقسیم کی جائے گی۔

۷۔ جو رقم وقف کی گئی ہے اس میں کمی نہیں کی جائے گی، تقسیم منافع وقف کی ہوگی اگر کسی وقت دعوے زیادہ ہوں اور منافع وقف سے اس کی تکمیل نہ ہو سکے تو وقف فنڈ کو بلا سودی قرض دیا جائے گا اور بعد میں اس کے منافع سے اس قرض کی ادائیگی کی جائے گی۔

۸۔ چونکہ تکافل ساؤتھ افریقہ ایک نئی کمپنی یا ادارہ ہے اور ان کے پاس کافی رقم نہیں ہے جبکہ حکومتی قانون کے مطابق ایسی کمپنی کو جاری کرنے کے لئے لائسنس کی ضرورت ہے اور تکافل کمپنی کے پاس اس لائسنس کو حاصل کرنے کے لئے رقم نہیں ہے، نیز اس میدان کی انہیں تکنیکی اور پیشہ ورانہ مہارت بھی حاصل نہیں ہے، اس ضرورت کو پورا کرنے کے لئے تکافل ساؤتھ افریقہ نے ایک مروجہ انشورنس کمپنی سے معاہدہ کیا کہ تکافل کمپنی ان کے لائسنس کو استعمال کرے گی اور ان سے پیشہ ورانہ مدد حاصل کرے گی، اس کے عوض تکافل کمپنی اس انشورنس کمپنی کو طے شدہ اجرت ادا کرے گی۔

۹۔ جن حضرات نے اس فنڈ کے لئے رقم وقف کی ہے، وہ اس کے متولی ہیں، وہ اس فنڈ کو چلانے اور اس کا انتظام کرنے کے لئے بحیثیت وکیل کام کریں گے اور اس کے لئے انہیں متعین اجرت دی جائے گی، اس اجرت میں تمام ملازمین کی تنخواہ اور انتظامی اخراجات شامل ہوں گے۔

۱۰۔ تکافل ساؤتھ افریقہ نے ری انشورنس کا معاملہ نہیں کیا۔

تکافل ساؤتھ افریقہ کے ماڈل کے لئے مندرجہ بالا بنیادی امور ہیں، ان امور کی بنیاد پر اس تکافل کو چلایا جائے گا، اس سلسلے میں اگر کوئی مزید سوال ہو تو بلا جھجک پوچھ سکتے ہیں۔ برائے کرام اس کی شرعی حیثیت سے آگاہ فرمائیں۔

فقط والسلام

محمد اشرف اسپرنگز ساؤتھ افریقہ

۲۵ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۵ھ

۱۴ جولائی ۲۰۰۴ء

جواب:- گرامی قدر مکرم مولانا محمد اشرف خان صاحب، زید مجدکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کا گرامی نامہ اور تکافل کے بارے میں آپ کی تحریر ملی، اس میں نمبر ۱ سے نمبر ۷ تک کی تجاویز تقریباً وہی ہیں جو دارالعلوم میں منعقدہ علماء کے اجتماع میں طے کی گئی تھیں، لہذا وہ شریعت کے مطابق ہیں۔ صرف نمبر ۶ کے بارے میں عرض یہ ہے کہ زائد رقم کا ممبران پر تقسیم ہونا ضروری نہیں، چونکہ یہ رقم وقف کی ملکیت ہو چکی ہے اس لئے وقف کے قواعد کے تحت اس کو وقف ہی میں محفوظ بھی رکھا جاسکتا ہے تاکہ سال آئندہ لوگوں کے نقصانات کی تلافی میں کام آئے، اور یہ صورت بندے کو زیادہ بہتر معلوم ہوتی ہے۔

البتہ نمبر ۸ میں جو تجویز دی گئی ہے کہ: ”تکافل کمپنی کسی مروّجہ انشورنس کمپنی کا لائسنس استعمال کرے گی اور ان سے پیشہ ورانہ مدد حاصل کرے گی“ اس کے بارے میں اس وقت کچھ کہنا مشکل ہے، جب تک مروّجہ انشورنس کمپنی کے ساتھ تکافل کمپنی کا معاہدہ سامنے نہ ہو۔

والسلام

بندہ محمد تقی عثمانی

۱۴۲۵ھ/۸/۲

(فتویٰ نمبر ۵/۷۳۶)

مروّجہ انشورنس کی مختلف اقسام کا حکم اور انشورنس کے جواز کے

قائل علماء کی آراء کی شرعی حیثیت

سوال:- میرا مسئلہ Life Insurance کے متعلق ہے۔ Pakistan State Life کے

منیجر میرے دوست ہیں، وہ مجھے پچھلے کئی سالوں سے Insurance کے بارے میں بتاتے رہتے ہیں، لیکن آج دن تک میں نے اس ڈر سے Insurance نہیں کروائی کہ یہ غیر اسلامی ہے۔ میرے دوست نے پورا ایک بنڈل پڑھنے کے لئے دیا جس میں دُنیا کے مختلف علماء کی Insurance کے بارے میں رائے تھی، اور ان کے مطابق Insurance غیر اسلامی نہیں ہے۔ ان علماء میں مصر، ابوظہبی اور سعودی عرب کے علماء تھے۔ اور تقریباً تین ہفتے پہلے ابوظہبی کے صدر کے مذہبی مشیر نے بیان دیا ہے کہ جو یہاں کے اخباروں میں شائع ہوا ہے، انہوں نے بھی موجودہ Life Insurance کو اسلام کے منافی قرار نہیں دیا، کیا میں ان کے فیصلے کو معتبر سمجھتے ہوئے اپنی Insurance کروا سکتا ہوں یا نہیں؟ آپ سے ایک درخواست ضرور ہے کہ جواب تفصیل سے دیجئے گا۔

جواب:- انشورنس کے جو طریقے اس وقت تک مروج ہیں وہ سب سود اور قمار پر مشتمل ہیں، اور حرام ہیں۔ مختلف انشورنس کمپنیاں جن علماء کے بیانات شائع کرتی رہتی ہیں، ان میں دو قسم کے بیانات ہوتے ہیں، بعض مرتبہ ان کمپنیوں نے بعض علماء کی طرف غلط بیانات منسوب کئے ہیں، اور بعض مرتبہ علماء کی طرف بیانات کی نسبت غلط نہیں ہوتی، لیکن جن علماء نے موجودہ انشورنس کو جائز کہا ہے، ان کی بات بحیثیت مجموعی عالم اسلام کے علماء نے قبول نہیں کی، لہذا وہ شاذ اقوال کی حیثیت رکھتے ہیں، اور ان کے دلائل بھی نہایت کمزور ہیں۔ ”مجمع الفقہ الاسلامی جلد۱“ میں ساری دُنیا کے علماء نے جمع ہو کر اس مسئلے پر مفصل بحث کی، اور بالآخر انشورنس کے مروجہ طریقوں کی حرمت کا فتویٰ دیا، اور بعض علماء کے شاذ اقوال کو باطل قرار دیا۔ اس اجتماع میں ۴۵ اسلامی ملکوں کے تقریباً ۱۵۰ علماء شریک تھے، یہ تنظیم سارے اسلامی ملکوں کے علماء کی تنظیم ہے۔ خاص طور پر بیمہ زندگی کی حرمت کے دلائل میرے والد حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے رسالے ”بیمہ زندگی“ میں تفصیل کے ساتھ بیان کئے ہیں۔

والسلام

۱۴۱۳/۱۱/۲۲ھ

۱:- انشورنس اور اس کی تمام اقسام کا حکم

۲:- بغیر سود والے انشورنس کے ناجائز ہونے کی وجہ

۳:- انشورنس کی حرمت کے دلائل اور اس کے جواز سے متعلق مولانا

ابوالکلام آزاد مرحوم اور بعض دیگر علماء کی رائے کی حقیقت

سوال ۱:- انشورنس جائز ہے یا نہیں؟

جواب ۱:- انشورنس کی جتنی صورتیں فی زمانہ رائج ہیں، سب ناجائز ہیں، کیونکہ وہ سب سود

اور قمار پر مشتمل ہیں۔^(۱)

سوال ۲:- بغیر سود کے انشورنس کا فتویٰ کیا ہے؟

جواب ۲:- بغیر سود کا انشورنس بھی قمار کی وجہ سے ناجائز ہے۔^(۲)

سوال ۳:- اپنے فتویٰ میں قرآنی آیات یا احادیث جس سے استنباط کیا گیا ہو؟

(۱ و ۲) تفصیل کے لئے امداد الفتاویٰ ج: ۳ ص: ۱۶۰، امداد المفتین ص: ۸۵۲ اور حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ کا رسالہ ”بیمہ زندگی“ اور حضرت والد دامت برکاتہم کی کتاب ”اسلام اور جدید معیشت و تجارت“ ص: ۱۵۹ تا ۱۶۳ ملاحظہ فرمائیں۔

جواب ۳:- ربا اور قمار کی حرمت کی تمام آیات و احادیث، انشورنس کے حرام ہونے کی دلیل ہیں۔^(۱)

سوال ۴:- مولانا ابوالکلام آزاد یا دوسرے علمائے کرام نے جو اس کے حق میں فیصلہ دیا ہے، اس کے بارے میں اظہارِ خیال؟

جواب ۴:- مستند علماء میں سے کسی نے انشورنس کے جواز کا فتویٰ نہیں دیا، بعض علماء کی طرف فتاویٰ غلط منسوب کئے گئے ہیں۔ مولانا آزاد کے بارے میں تحقیق نہیں ہے کہ انہوں نے کیا فتویٰ دیا تھا، اور وہ اہل فتویٰ علماء میں بھی نہیں ہیں۔

واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی

۱۳۸۸/۵/۲۳ھ

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع

(فتویٰ نمبر ۵۹۶/۱۹ الف)

شدید مجبوری میں انشورنس کی رقم بطور قرض استعمال کرنے کا حکم

سوال:- محترم مرشدی حضرت مولانا محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، اُمید ہے بخیر و عافیت ہوں گے۔

بعد گزارش! انشورنس کی رقم کے بارے میں مسئلہ معلوم ہوا۔ مزید ایک بات دریافت کرنی ہے، وہ یہ کہ مجھے انشورنس کمپنی سے ساٹھ ہزار یا ستر ہزار کی رقم بمع پرافٹ وغیرہ کے مل جاتی ہے، اگرچہ میں اپنی اصل رقم ہی کا مالک ہوں، اب میری ضرورت مجبوری ہے، آیا میں وقتی طور پر بطور قرض کے یہ تمام رقم اپنے استعمال میں لاسکتا ہوں؟ جب میرے پاس اپنی رقم ہو جائے گی تو اپنی اصل رقم اپنے پاس رکھ کر بقایا رقم آپ کی ہدایات کی روشنی میں تقسیم کر دی جائے گی، ان شاء اللہ تعالیٰ۔ آیا میں ایسا کر سکتا ہوں؟ اُمید ہے جواب سے نوازیں گے۔

آپ کی دُعاؤں کا محتاج

طلعت محمود روالپنڈی

جواب:- محترمی و مکرمی، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

انشورنس کمپنی سے جو اصل رقم مل رہی ہے اس کو تو استعمال میں لانا جائز ہے، البتہ اس پر سود کی جو رقم مل رہی ہے، اس کا صدقہ کرنا ضروری ہے، البتہ شدید اور انتہائی مجبوری میں اس کو اس نیت سے ذاتی استعمال میں لاسکتے ہیں کہ بعد میں اتنی ہی رقم صدقہ کریں گے، لیکن اس صورت میں اپنے پاس اس

(۱) ربا کی حرمت سے متعلق ص: ۲۶۷ کا حاشیہ نمبر ۱، اور قمار کی حرمت سے متعلق تفصیلی دلائل کے لئے ”جواہر الفقہ“ ج: ۲ ص: ۳۳۹ میں رسالہ ”احکام القمار“ ملاحظہ فرمائیں۔

کا حساب رکھیں، جب ضرورت رفع ہو جائے اس وقت اس رقم کو صدقہ کر دیں۔ الاختیار میں ہے:
والملك الخبيث سبيله التصديق به، ولو صرفه في حاجة نفسه جاز، ثم ان
كان غنيا تصدق بمثله، وان كان فقيراً لا يتصدق.

(الاختیار لتعلیل المختار ج: ۳ ص: ۶۱ أوائل کتاب الغصب)

والسلام

محمد عبداللہ میمن

بحکم حضرت مولانا محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہ

۱۲/۱۱/۱۹۹۹ء

”بیمہ زندگی“ کا حکم

سوال:- بیمہ بونس جو کہ ہر سال مختلف ہوتا ہے، کیا اسے سود کہا جاتا ہے؟ اور زندگی ختم ہونے پر جو مقرر رقم ملتی ہے کیا وہ ناجائز ہے؟ کیا درمیان میں یعنی پالیسی کی میعاد ختم ہونے سے قبل اموات کی حالت میں جو رقم ورثاء کو کمپنی ادا کرتی ہے ناجائز ہے؟ اس سلسلے میں دلائل بھی تفصیل سے بیان فرمادیں۔

جواب:- بیمہ زندگی کی جو صورت آج کل رائج ہے اس میں اصل رقم سے زائد جتنی بھی رقم ملتی ہے، اس سب کو لینا حرام ہے، اگر ناواقفیت کی بناء پر پالیسی خرید لی گئی ہو تو اصل رقم واپس لے لی جائے، اور زائد رقم وصول نہ کی جائے، دلائل کی تفصیل یہاں درج نہیں کی جاسکتی^(۱)، مختصر یہ کہ بیمے کی موجودہ صورت سود اور قمار سے مرکب ہے اور یہ دونوں چیزیں قطعی طور پر حرام ہیں۔

واللہ سبحانہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۷/۱۲/۲۴ھ

الجواب صحیح

محمد عاشق الہی بلند شہری

(فتویٰ نمبر ۱۴۶۲/۱۸ الف)

مروجہ بیمے کی تمام اقسام کا حکم اور ”امدادِ باہمی“ کے اصول پر
جائز بیمے کا تصور

سوال:- ایک پارٹی کو انشورنس کی پالیسی بیچتے وقت اسے عرض کیا کہ یہ رقم گورنمنٹ منصوبہ

(۱) دلائل کی تفصیل اور تحقیق کے لئے دیکھئے حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ کا رسالہ ”بیمہ زندگی“۔

جات جیسے کھاد فیکٹری، بجلی کے کارخانے، بند و دیگر بڑے بڑے منصوبہ جات پر استعمال ہو کر قوم کے کام آتی ہے، اور انسان کی رقم بھی جو کہ جمع ہو کر مثلاً اس کی بیٹی کا جہیز بنتی ہے، بچے کی تعلیم بن کر سامنے آتی ہے، چونکہ اس دور میں یک مشنت رقم گھر سے نکالنا بہت مشکل ہے، یہ امداد باہمی بھی ہے، گورنمنٹ جو قرضہ جات لیتی ہے اسی بناء پر کہ اُسے کسی منصوبے کے لئے رقم درکار ہے، انسان بھی اسی بناء پر اُدھار تک پہنچتا ہے اگر لائف انشورنس خود کشی کے لئے کی جائے تو بُرا ہے، لیکن مندرجہ بالا کو مد نظر رکھ کر تو شاید بُرا نہیں۔ لیکن یہ فرماتے ہیں کہ کسی عالم دین سے اجازت لازمی ہے تو کیا انشورنس پالیسی خریدنا جائز ہے؟

جواب:- بہ حالت موجودہ جتنی انشورنس کمپنیاں قائم ہیں وہ سب سود اور قمار کے اُصولوں پر مبنی ہیں، لہذا ان کے ذریعہ زندگی وغیرہ کا بیمہ کرنا شرعاً ناجائز ہے،^(۱) ہاں اگر کوئی کمپنی علماء کی ہدایات کے مطابق صرف امداد باہمی کے اُصول پر چلائی جائے اور اس کو سود اور قمار سے پاک رکھا جائے تو درست ہے، لیکن ابھی تک ایسی کوئی کمپنی قائم نہیں ہے، لہذا اس وقت کسی بھی کمپنی کی پالیسی لینا جائز نہیں۔

واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

۱۳۹۱/۵/۱۲ھ
(فتویٰ نمبر ۶۲۲/۲۲ ب)

”بیمہ زندگی“ کی مختلف صورتوں کا حکم

سوال:- بیمہ یا انشورنس کرنا جائز ہے یا نہیں؟ جبکہ کمپنی والے یہ کہتے ہیں کہ ہم سال بھر کے منافع بیمہ کرنے والے کے حصص کے اعتبار سے انہیں بطور منافع دیتے ہیں۔

جواب:- زندگی کے بیمے کی جتنی صورتیں اس وقت رائج ہیں، وہ سب ناجائز ہیں۔^(۲)

فقط واللہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

الجواب صحیح
محمد عاشق الہی عفی عنہ

۱۳۸۸/۲/۶ھ
(فتویٰ نمبر ۱۹۸/۱۹ الف)

(۲۱) تفصیل کے لئے حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا رسالہ ”بیمہ زندگی“ ملاحظہ فرمائیں۔

تجارتی مال بردار جہاز کے ڈوبنے کی صورت میں انشورنس کمپنی سے نقصان کی تلافی کرانے کا حکم

سوال ۱:- قانون کے بموجب جب ہم مال باہر سے منگواتے ہیں تو لازمی طور پر ہم کو انشورنس کرانا پڑتا ہے، ہم قانون کو پورا کرنے کے لئے سب سے آخری درجے کی انشورنس کراتے ہیں، اس انشورنس کے تحت یہ بات ہوتی ہے کہ اگر سارا کا سارا مال ختم اور ضائع ہو گیا تو انشورنس والے ذمہ دار ہیں، ورنہ نہیں، اس صورت میں (یعنی پورے کے پورے نقصان کی صورت میں) انشورنس واپسی مال کی پوری کی پوری رقم ادا کرتی ہے، بلکہ اصل سے بھی کچھ زیادہ۔ لہذا انشورنس والوں نے ہم کو پورے کے پورے مال کا پیسہ ادا کر دیا ہے، اس رقم کو ہم کیا کریں؟ آیا یہ رقم لینا جائز ہے یا ناجائز؟

سوال ۲:- بھائی حمید صاحب جو اس کام میں آدھا شریک تھے، جب ان سے آدھے نقصان کا مطالبہ کیا گیا تو وہ ادا کرنے سے انکار کرتے ہیں، اور اُن کا فرمانا یہ ہے کہ آپ کو انشورنس کمپنی سے پورے نقصان کی رقم مل گئی ہے۔ اگر حمید صاحب اپنے حصے کا آدھا نقصان ادا نہ کریں تو ہم ان کے حصے کی آدھی رقم انشورنس کے پیسے میں سے (جو ہم کو وصول ہو چکا ہے) لے سکتے ہیں؟

سوال ۳:- حمید صاحب کا مطالبہ ہے کہ انشورنس والوں سے رقم اصل سے بھی زیادہ وصول ہو گئی ہے، لہذا آدھے حصے سے جو زیادہ ہے اُس میں سے حصہ دو، کیا یہ ادا کر دیں؟

جواب ۱:- انشورنس کے مروجہ طریقے میں سود بھی ہے اور قمار بھی، لہذا انشورنس کمپنی سے صرف اتنی رقم وصول کرنا جائز ہے جتنی رقم آپ نے اقساط کے طور پر اب تک جمع کی تھی، اس سے زائد لینا جائز نہیں تھا، اب جو رقم زائد ہے اُسے صدقہ کر دینا ضروری ہے، اور اس کا صدقہ قریبی غیر صاحبِ نصاب رشتہ داروں کو بھی کیا جاسکتا ہے۔

جواب ۲:- جواب نمبر ۱ کے مطابق انشورنس سے لی ہوئی زائد رقم سے نقصان کی تلافی نہیں ہوئی، لہذا آپ کے شریک پر اپنے حصے کا نقصان برداشت کرنا واجب ہے، اگر وہ نہ دیں تو گنہگار ہوں گے، انشورنس کی زائد رقم پھر بھی آپ کے لئے جائز نہیں۔

جواب ۳:- جب انشورنس کی اکثر رقم ہی ناجائز ٹھہری تو جو نقصان سے زائد رقم ہے وہ تو

واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم

بطریقِ اولیٰ ناجائز ہے۔

۱۳۹۶/۱۱/۱۱ھ

(فتویٰ نمبر ۲۵۲۸/۵۲۷)

مشترک مال تجارت کا جہاز ڈوبنے کی صورت میں انشورنس کمپنی

یا شریک سے نقصان کی تلافی کرانے کا حکم

سوال:- ہم نے ایک مال چائنا سے منگوا یا، اس مال میں ایک دوست الف سے ہماری شراکت تھی (لکھت نہیں زبانی، زبانی) کہ نفع نقصان آدھا آدھا۔ مال منگوانے میں پورا پورا پیسہ ہم نے لگایا کیونکہ ہمارا اور اُن کا اس طرح کی شراکت کا مال آتا رہتا تھا، کبھی ہم نے منگوا یا اور کبھی انہوں نے منگوا یا، کبھی پیسہ بعد میں ہم نے دے دیا اور کبھی پیسہ بعد میں انہوں نے دے دیا، ہمارے دس بارہ سال سے بھائیوں جیسے تعلقات ہیں، ایک دوسرے کو ہر ایک پر پورا بھروسہ ہے۔ قانون کے بموجب ہم مال باہر سے منگواتے ہیں تو لازمی طور پر انشورنس کرانا پڑتا ہے، انشورنس میں یہ ہوتا ہے کہ اگر سارا مال ختم یا ضائع ہو جائے تو انشورنس والے اس کے ذمہ دار ہوتے ہیں، ورنہ نہیں۔ پورے نقصان کی صورت میں انشورنس والے مال کی پوری پوری رقم بلکہ اُس سے بھی کچھ زائد ادا کرتے ہیں۔ یہ مال جس جہاز پر آ رہا تھا خداوند کریم کی مرضی سے پورا کا پورا ڈوب گیا، انشورنس والوں نے ہم کو رقم ادا کر دی، جو اصل لاگت سے زیادہ ہے، اب سوال یہ ہے کہ:-

- ۱- انشورنس والوں سے جو پیسہ ملا ہے وہ لینا جائز ہے یا نہیں؟
- ۲- اگر جائز نہیں تو کیا اصل لاگت سے جو زیادہ پیسے وصول ہوئے وہ بھی جائز ہیں یا نہیں؟
- ۳- اگر ساری کی ساری رقم یا زیادہ رقم ناجائز ہے تو ہم اس رقم کو کیا کریں؟ صدقہ کر دیں؟
- ۴- اگر ساری رقم معہ زیادہ اگر ناجائز ہے تو کیا اپنی لاگت کی رقم جو پوری کی پوری ہم نے لگائی ہے اُس کا نصف اپنے دوست سے لے سکتے ہیں یا نہیں؟
- ۵- اگر ہم یہ رقم (یعنی اپنی لاگت کا آدھا حصہ) اگر اپنے دوست الف سے لے سکتے ہیں تو کیا ہم اپنا کر لیں؟ کہ جو رقم انشورنس والوں کے پاس سے آئی ہے اُس کا آدھا حصہ تو اپنے دوست (الف) روانہ کر دیں کہ وہ اپنے ہاتھ سے صدقہ کر دیں اور باقی آدھا حصہ ہم اپنے پاس رکھ لیں اور اپنے ہاتھ سے صدقہ کر دیں (آپ نے فرمایا کہ انشورنس کی رقم ناجائز ہے)۔ اور جو مال کی اصل لاگت تھی تو اُس کا آدھا حصہ اُن سے منگائیں۔

جواب ۱:- انشورنس کے مروجہ طریقے میں شرعاً سود بھی ہے اور قمار بھی، لہذا انشورنس کمپنی سے صرف اتنی رقم وصول کرنا جائز ہے جتنی رقم آپ نے کمپنی کے پاس اقساط کے طور پر جمع کی تھی، اس

سے زائد لینا جائز نہیں، اور جب یہ رقم ہی جائز نہیں تو جو رقم لاگت سے زیادہ ملی ہے وہ تو بطریقِ اولیٰ ناجائز ہے۔

۲:- اصل حکم تو یہ ہے کہ انشورنس کی یہ زائد رقم وصول ہی نہ کی جائے، لیکن اگر غلطی سے وصول کر لی ہے تو اس کو ثواب کی نیت کے بغیر صدقہ کر دینا واجب ہے۔

۳:- اگر دوست سے یہ معاہدہ زبانی یا تحریری ہو چکا تھا کہ جو مال آپ اب منگوا رہے ہیں وہ مشترک طور پر منگوایا جائے گا، رقم بھی دونوں لگائیں گے اور نفع و نقصان بھی دونوں پر آدھا آدھا ہوگا، تو آپ اپنے دوست سے لاگت کی آدھی رقم وصول کر سکتے ہیں، اور اُن پر اس کی ادائیگی واجب ہے۔

كما يفهم من رد المحتار في قوله: "دفع الى رجل ألفاً وقال اشتر بها بيني وبينك نصفين والربح لنا والوضيعة علينا، فهلك المال قبل الشراء ويضمن وبعده ضمن المشتري النصف بحر عن الذخيرة، قلت: ووجهه أنه لما أمره بالشراء نصفين صار مشترياً للنصف وكالة عن الأمر وللنصف اصاله عن نفسه وقد اوفى الثمن من مال الأمر فيضمن حصة نفسه." (رد المحتار ج: ۳ ص: ۳۴۰) (۱)

قلت:- والصورة المسئلة عكسه ولا فرق في العلة۔

لیکن یہ اس صورت میں ہے جبکہ یہ معاہدہ زبانی یا تحریری ہو چکا ہو، اور اگر آپ کے دوست کو اس مال کے منگوانے کا علم نہیں تھا یا انہوں نے اس مال کے بارے میں آپ کو کوئی ہدایت نہیں دی تھی اور آپ نے محض ماضی کے تعلقات کے اعتماد پر منگوایا تھا تو پھر پورے نقصان کے ذمہ دار آپ ہیں، دوست پر نقصان کی ذمہ داری نہیں۔

۴:- جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا اصل حکم تو یہ ہے کہ یہ رقم لی ہی نہ جائے، لیکن اگر غلطی سے لے لی تو اسے صدقہ کرنا واجب ہے، خواہ پوری رقم آپ صدقہ کریں، اور خواہ آدھی خود صدقہ کریں اور آدھی دوست صدقہ کرے۔

واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم

۵:- اس کا مفصل جواب نمبر ۳ میں آچکا۔

۱۳۹۷/۱/۱۴ھ

(فتویٰ نمبر ۹۲/۲۸ الف)

غیر ملکی سفر کے لئے ”بیمہ زندگی“ کی قانونی پابندی اور اس سے چھٹکارا حاصل کرنے کی صورت

سوال :- جن لوگوں کا سعودی عرب، متحدہ عرب امارات یا کویت میں کام کرنے کا ویزا لگ جاتا ہے اور وہ پہلی مرتبہ جاتے ہیں تو حکومت پاکستان اُس کا بیمہ کراتی ہے، جو ایک لاکھ کا ہوتا ہے، یہ بینکوں میں ۶۵۰۰ روپے جمع کرتا ہے، اگر یہ ایک سال کے اندر وہاں مرجائے تو بیمہ والے اس کو ایک لاکھ روپے یا کم زیادہ دے دیتے ہیں۔ بعض ایسے جانے والے جو غریب ہوتے ہیں یا ایسے ہی نہیں دیتے تو ٹریول ایجنسی والے ایئر پورٹ میں بات کر کے اُس سے روپے لے لیتے ہیں اور اپنے لئے بھی اس میں روپے رکھ لیتے ہیں، کیا ایسی کمائی ٹریول ایجنسی کے لئے شریعت کی رو سے حلال ہے یا حرام ہے؟

جواب :- بیمہ شرعاً جائز نہیں، اگر کسی کو سفر میں جانا ضروری ہو اور قانوناً سفر میں اس کے بغیر نہ جاسکتا ہو تو مجبوراً بیمہ کرا سکتا ہے، مگر ہلاک ہونے کی صورت میں صرف اتنی رقم بیمہ کمپنی سے وصول کر سکتا ہے جتنی پریمیم میں جمع کرائی تھی، لہذا اگر کسی سرکاری افسر سے بات کر کے کسی کو بغیر بیمہ کے روانہ کیا جاتا ہے تو اس کی گنجائش ہے بشرطیکہ اس کے لئے رشوت نہ دینی پڑے، اس کی اجرت لینے کی بھی گنجائش ہے۔

واللہ اعلم

۱۴۲۱/۱/۲ھ

گروپ انشورنس اور پراویڈنٹ فنڈ کا شرعی حکم

سوال ۱:- تمام سرکاری دفاتر میں ایک اسکیم Provident Fund and Group Insurance Scheme (گروپ انشورنس) کے نام سے گورنمنٹ نے لازمی طور پر شروع کی ہے، جس کے تحت گورنمنٹ ہر ملازم کے لازمی طور پر (اس کی مرضی کے مطابق یا خلاف) ایک فیصد یعنی سو روپے میں سے ایک روپیہ ماہانہ کے حساب سے اصل تنخواہ میں سے کاٹ لیتی ہے، اس کے بعد اگر ایک ملازم دوران نوکری میں بھی مرجائے تو اگر اس مرنے والے ملازم کی اصل تنخواہ ایک سو پچاس روپے ماہوار تک تھی تو اس کے نامزد کردہ وارث کو گورنمنٹ دو ہزار روپیہ دے گی، اس طریقے سے اگر تنخواہ پانچ سو تھی تو پانچ ہزار اور اگر سات سو تھی تو دس ہزار دے گی۔ اگر ملازم نوکری کے دوران نہیں مرا بلکہ ریٹائر ہونے سے پہلے مرا یعنی ساٹھ سال تک نہیں پہنچا تو اس کے لئے مندرجہ ذیل شرح سے اس کے (مرنے والے ملازم کے) نامزد کردہ وارث کو ماہوار رقم ملے گی، اگر اس مرنے والے کی اصل تنخواہ ماہوار ایک سو تھی تو اس کے نامزد وارث کو گورنمنٹ ۵۰ روپیہ ماہوار ادا کرے گی، اگر دو سو ہو تو پچھتر،

تین سو ہو تو ایک سو، چار سو ہو تو ایک سو پچھتر۔ بصورت دیگر یعنی اگر وہ ملازم نہ نوکری کے دوران مرا ہے اور نہ ہی ساٹھ سال کی عمر تک پہنچنے سے پہلے مرتا ہے اس کو گورنمنٹ کچھ نہیں دیتی اور نہ ہی اس کی ماہوار ایک فیصد کے حساب سے لازمی طور پر کاٹی ہوئی رقم جو اس کی پوری نوکری کے دوران ہر ماہ کٹتی رہی (لازمی طور پر) واپس کی جاتی ہے، یعنی اس کی اپنی کاٹی ہوئی رقم بھی واپس نہیں کی جاتی، کیا یہ جائز ہے یا ناجائز؟

سوال ۲:- گورنمنٹ ہر ملازم سے جی پی فنڈ کے نام سے کم از کم ۱۰ روپے ماہوار یا مزید جس قدر ملازم کٹوانا چاہے لازمی طور پر کٹتی ہے، اور نوکری کے ختم پر اس ملازم کو تمام نوکری کے دوران کاٹی ہوئی رقم بمع سواچھ فیصد سالانہ کے حساب سے سود دیتی ہے۔ اب یہ سود ہوگا یا نفع یا انعام؟ اور جائز ہوگا یا نہیں؟

جواب ۱:- گروپ انشورنس کی جو صورت آپ نے تحریر کی ہے، نیز اس کے جو قواعد و ضوابط معلوم ہو سکے ہیں ان کی رو سے مندرجہ ذیل باتیں معلوم ہوئیں:-
۱:- ہر ملازم کی تنخواہ سے کچھ رقم جبری طور پر کاٹی جاتی ہے۔

۲:- اس طرح ملازموں کی تنخواہوں سے کٹوتی کر کے حکومت نے ایک فنڈ قائم کیا ہے جس کی رقم نفع بخش کاموں میں صرف کی جائیں گی۔

۳:- ملازم کی وفات کے بعد ہر ملازم کے مقرر کردہ وصی کو ایک معین رقم دی جائے گی جو کٹوتی کی مقدار سے زیادہ ہوگی۔ اس معاملے پر غور کرنے سے اس کی صورت شرعاً جبری پراویڈنٹ فنڈ سے مختلف معلوم نہیں ہوتی ہے اور پراویڈنٹ فنڈ کے بارے میں یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ اس پر جو زیادہ رقم حکومت کی طرف سے دی جاتی ہے وہ سود نہیں ہے، اس کا لینا ملازم کے لئے جائز ہے، اسی طرح گروپ انشورنس کے لئے جو جبری کٹوتی کی جائے گی وہ دین ضعیف ہونے کے سبب ملازم کی مملوک تام نہیں ہے، لہذا حکومت یا محکمے نے جو تصرف کر کے اس کو بڑھایا تو یہ تصرف ملازم کی ملکیت میں نہیں ہوا، اور نہ ملازم کے ساتھ اس کا کوئی معاملہ ہوا، اب اگر حکومت ان حاصل شدہ منافع کا کچھ حصہ اپنے ملازم کو دیتی ہے تو وہ شرعاً ایک انعام اور تبرع ہے، سود کی تعریف میں داخل نہیں ہے، اور ملازم کے لئے اس کا لینا جائز ہے۔ البتہ چونکہ یہ حاصل شدہ منافع بعض ایسے معاملات کے ذریعے بھی ہوتے ہیں جو شرعاً ناجائز ہیں اس لئے احتیاط اس میں ہے کہ تنخواہ میں سے جتنی رقم کاٹی گئی ہے وہ تو ملازم خود رکھ لے، اور باقی رقم غریبوں کو صدقہ کر دے، اور یہ ایسا صدقہ ہے کہ اپنے غریب رشتہ داروں اور بیوی بچوں پر بھی صرف کیا جاسکتا ہے، یہ جواب شرعی قواعد کی رو سے لکھا گیا ہے۔ لیکن چونکہ کتب

فقہ میں اس کی کوئی صراحت نہیں ہے، اس لئے بہتر ہے کہ اس معاملے میں دوسرے علماء سے بھی استصواب کر لیا جائے۔

جواب ۲:- پراویڈنٹ فنڈ کا حکم سوال نمبر ۱ کے جواب میں آگیا ہے کہ اس پر جو زیادتی حکومت دیتی ہے وہ سود نہیں ہے، اسے لینا جائز ہے، اور کوئی شخص احتیاط کرے تو بہتر ہے۔

واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی

۱۳۹۱/۵/۲۵ھ

(فتویٰ نمبر ۶۸۶/۲۲ ب)

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع

”گروپ انشورنس“ کا حکم

سوال:- سرکاری ملازمین کی جو ”گروپ انشورنس“ (اجتماعی بیمہ) ہوتی ہے اس کے لئے رقم کا ادا کرنا اور اس پر بصورتِ حادثہ رقم کا حاصل کرنا کیسا ہے؟ مثلاً زید نے ساڑھے سترہ سو روپے مالی سال کے شروع میں ادا کئے، اگر اس کو اس سال میں حادثہ پیش آگیا تو اس کے وارثین کو سات ہزار روپیہ مل جائے گا، اگر حادثہ پیش نہ آیا تو مالی سال کے اختتام پر یہ ساڑھے سترہ سو روپے کی رقم ختم ہو جاتی ہے اور اگلے سال سے نیا معاہدہ کرنا ہوگا۔

جواب:- ”گروپ انشورنس“ کے قواعد و ضوابط دیکھنے سے معلوم ہوا کہ اس اسکیم میں ہر ملازم کی تنخواہ سے جبری طور پر کٹوتی وصول کی جاتی ہے، اگرچہ محکمہ والوں کے لئے ایسا کرنا درست نہیں، لیکن جن ملازمین کی تنخواہ سے جبراً یہ رقم وصول کی گئی اگر انہیں یہ رقم واپس نہ ملی تو یہ محکمہ والوں کی طرف سے شرعاً ”غصب“ ہوگا، اور اگر کسی حادثے کی صورت میں کوئی بڑی رقم اصل رقم سے زائد دی گئی تو یہ پراویڈنٹ فنڈ کی زیادتی کی طرح سود شمار نہ ہوگی^(۱)، کیونکہ دینِ ضعیف پر زیادتی ہے، مرحوم کے وارثان کے لئے اسے وصول کرنے کی گنجائش ہے، لیکن احتیاط اس میں ہے کہ جو رقم اصل کٹوتی سے زائد وصول ہوئی ہے اسے صرف غریبوں پر خرچ کیا جائے خواہ رشتہ دار ہوں یا غیر رشتہ دار۔

واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۹۱/۷/۶ھ

(فتویٰ نمبر ۸۵۴/۲۲ ب)

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

(۱) تفصیل کے لئے حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ کا رسالہ ”پراویڈنٹ فنڈ پر زکوٰۃ اور سود کا مسئلہ“ ملاحظہ فرمائیں۔

گروپ انشورنس کی تحقیق اور اس کا شرعی حکم

سوال :- گروپ انشورنس کے بارے میں آپ کا فتویٰ مؤرخہ ۱۳۹۱/۵/۲۱ھ قاری سعید الرحمن صاحب جامعہ اسلامیہ راولپنڈی کی مہربانی سے مجھے بھی دیکھنے کا فخر حاصل ہوا۔ میرا اندازہ یہ ہے کہ سوال پوچھنے والے نے اس بارے میں صحیح حالات آپ کو نہیں بتائے، چونکہ مسئلہ بہت اہم ہے اس لئے میں ضروری سمجھتا ہوں کہ اس اسکیم کے متعلق کچھ مزید حالات آپ کی خدمت میں پیش کروں، ممکن ہے کہ اس کے بعد اس اسکیم کے جواز کے متعلق آپ اپنی قیمتی رائے یا فتویٰ دینا چاہیں۔

حکومت نے ایک انشورنس کمپنی کا بندوبست کیا ہے کہ فوجیوں کی زندگی کا ایک خاص طریقے سے بیمہ کیا جائے، اس کو ”گروپ انشورنس“ کہا جاتا ہے، اس کے مطابق فوجیوں سے ان کے عہدے کے مطابق ایک مقررہ رقم سال میں ایک دفعہ وصول کر کے بیمہ کمپنی کو دے دی جاتی ہے، اس سال کے دوران اگر ان فوجیوں میں کوئی آدمی فوت ہو جائے تو بیمہ کمپنی مرحوم کے وصی کو ایک مقرر شدہ رقم ادا کرتی ہے۔ جو اصل وصول شدہ رقم سے کئی گنا زیادہ ہوتی ہے۔ اکثر فوجی جو اس سال کے دوران زندہ رہتے ہیں ان کو اور ان کے وصی کو کچھ بھی نہیں ملتا۔ اگر بیمہ کمپنی کو اس کاروبار میں کافی نفع ہو تو بعض حالات میں بیمہ کمپنی اس نفع میں سے کچھ رقم حکومت کے فنڈ میں بھی دے دیتی ہے، لیکن جن فوجیوں سے رقم وصول کی گئی تھی ان کو بالواسطہ کچھ نہیں دیا جاتا۔ اس اسکیم کے چند اہم نکات یہ ہیں :-

۱- اس اسکیم کے ماتحت ملازم کی تنخواہ میں سے رقم کاٹی نہیں جاتی بلکہ وقت مقررہ پر طلب کی جاتی ہے، اور فوجی تنخواہ وصول کر لینے کے بعد اس میں سے یا اپنی جیب سے مقررہ رقم حکومت کے ایک نمائندے کو ادا کر دیتا ہے۔ اسی طرح مختلف افراد سے جمع کی ہوئی رقم انشورنس کمپنی کو پہنچادی جاتی ہے۔

۲- اس کو جبری کٹوتی کہنا ٹھیک نہیں، بعض فوجی یہ عذر پیش کرتے ہیں کہ وہ مذہبی عقیدے کی بناء پر اس اسکیم میں شامل نہیں ہونا چاہتے، تو ان کو ادائیگی پر مجبور نہیں کیا جاتا۔ میں خود اس اسکیم میں شامل نہیں ہوں، اور نہ مجھ سے کوئی کٹوتی ہوتی ہے، اور نہ میں کسی اور طریقے سے رقم ادا کرتا ہوں۔

۳- فوجیوں سے جمع کی ہوئی رقم حکومت کے پاس نہیں رہتی اور نہ ہی حکومت اس کے صرف سے کچھ تعلق رکھتی ہے، بلکہ حکومت کے نمائندے رقم جمع کر کے انشورنس کمپنی کو دے دیتے ہیں، اور وہ کمپنی ہی اس کا صرف کرتی ہے۔

۴- بظاہر یہ صورت پراویڈنٹ فنڈ سے بہت مختلف ہے، بلکہ چند قسم کے بیموں کی طرح ہے۔ مثلاً ہوائی سفر کا بیمہ۔ بعض مسافر بیمہ کمپنی سے بندوبست کرتے ہیں اور کچھ رقم ادا کر کے یہ فیصلہ ہوتا

ہے کہ اگر مسافر ہوائی حادثے میں فوت ہو جائے تو کمپنی اس کے وصی کو ایک مقررہ رقم ادا کرے گی جو اصل رقم سے کئی گنا زیادہ ہوگی، اور اگر جیسا کہ اکثر ہوتا ہے کہ حادثہ کوئی نہ ہو تو مسافر کو یا اس کے وصی کو کوئی رقم نہیں ملتی، کیا یہ شرعاً جائز ہے؟

جواب:- گروپ انشورنس کے بارے میں چونکہ سوالات مختلف اطراف سے آرہے تھے اس لئے ہم نے اس کے وہ مطبوعہ قواعد منگا کر دیکھے جو حکومت کی طرف سے طے کئے گئے تھے، ان سے ہمیں مندرجہ ذیل امور ثابت ہوئے:-

۱:- یہ کٹوتی جبری ہے، اگر کوئی شخص اپنا وصی نامزد نہ کرے تب بھی رقم کٹے گی اور اس کی موت کے بعد کسی مناسب رشتہ دار کو دی جائے گی۔

۲:- یہ رقم تنخواہ میں سے تنخواہ کی ادائیگی سے قبل کاٹی جائے گی، تنخواہ دینے کے بعد ملازم از خود نہیں دے گا۔

۳:- کاٹی ہوئی رقمیں کسی بیمہ کمپنی کو دینے کے بجائے ان سے ایک فنڈ قائم کیا جائے گا، جس سے تجارت کی جائے گی، اور اس سے حاصل ہونے والا منافع متوفی ملازمین کے رشتہ داروں میں تقسیم کیا جائے گا۔

گروپ انشورنس کے بارے میں ہمارا پہلا جواب انہی تین بنیادوں پر مبنی تھا، لیکن آپ نے جو صورت لکھی ہے اس میں یہ تینوں باتیں مفقود ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ سول ملازمین اور فوجی ملازمین کے قواعد میں حکومت نے کوئی فرق رکھا ہو۔ بہر حال جو صورت آپ نے لکھی ہے اگر واقعہ ایسا ہی ہے تو اس اسکیم میں حصہ دار بننا بلا شک و شبہ ناجائز ہے۔ اور اگر کوئی شخص غلطی سے حصہ دار بن گیا ہو تو وہ یا اس کا وصی صرف اپنی اصل رقم وصول کر سکے گا، جو زیادتی دی جائے گی، اس کا لینا ناجائز ہوگا۔ کیونکہ اس صورت میں اور بیمہ زندگی میں شرعی احکام کے لحاظ سے کوئی فرق نہیں اور اس میں سود و قمار پایا جاتا ہے۔

رہی یہ بات کہ اس اسکیم کے فوائد کو جائز طور پر کس طرح حاصل کیا جاسکتا ہے؟ سو اس کا طریقہ یہ ہے کہ تمام ملازمین اپنی مرضی سے بلا جبر و اکراہ ایک رضا کارانہ امداد باہمی فنڈ قائم کریں، اور اس میں اپنی خوشی سے تنخواہ کا کوئی حصہ ہر ماہ دیا کریں، جو شخص اس میں شریک نہ ہونا چاہے اسے مجبور نہ کیا جائے۔ پھر فنڈ کی جمع شدہ رقم کو کسی جائز تجارت میں لگائیں، اس طرح فنڈ کی رقم میں اضافہ ہوتا رہے، اس کے بعد اس فنڈ سے مرنے والے ملازمین کے پسماندگان کی امداد کی جائے۔ اس میں یہ شرط

رکھی جاسکتی ہے کہ یہ امداد صرف اُن لوگوں کے ورثاء کو دی جائے گی جو فنڈ کے ممبر ہوں گے۔^(۱) اگر مسلمان ملازمین کوشش کر کے اسکیم کو بدلو کر شریعت کے مطابق بنائیں تو اجرِ عظیم ہوگا۔ لیکن بہتر یہ ہوگا کہ اسکیم بناتے وقت مستند مفتیوں سے روبرو مشورہ کر لیا جائے تاکہ پھر کوئی شرعی قباحت پیدا نہ ہو۔

واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفا اللہ عنہ

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع

۱۳۹۱/۸/۶ھ

(فتویٰ نمبر ۲۲/۹۷۳ ب)

انشورنس کی رقم وصول کرنے کا مشورہ دینا

اور اسے استعمال کرنے کا حکم

سوال:- آپ کا جواب ملا، عرض یہ تھی کہ فریقِ ثانی (یعنی جس سے ہماری شراکت تھی) کچھ اس قسم کے آدمی ہیں کہ انشورنس کے کام کو غلط نہیں سمجھتے، لہذا اس بات کا امکان ہے کہ اگر ان سے فتویٰ کی بات کی جائے تو شاید وہ مذاق اڑائیں، لہذا ہم ایسا کر لیں کہ جو رقم انشورنس والوں کے پاس سے آئے اس کا آدھا حصہ تو ان کو روانہ کر دیں اور بقیہ آدھا حصہ صدقہ کر دیں؟

۲:- جو مال کی اصل لاگت تھی اس کا آدھا حصہ اُن سے منگالیں؟

جواب:- انشورنس کی رقم لینے کا کسی بھی مسلمان کو مشورہ نہیں دیا جاسکتا، آپ زیادہ سے زیادہ یہ کر سکتے ہیں کہ انشورنس کی آدھی رقم ان کو بھیج کر انہیں اپنی طرف سے اس بات پر مامور کریں کہ وہ یہ رقم صدقہ کر دیں، کیونکہ اس کا رکھنا جائز نہیں ہے، اس کے ساتھ ہی آپ کو اُن سے اپنی رقم کا مطالبہ کرنا بھی جائز ہے، اب وہ آپ کی رقم آپ کو جہاں سے چاہیں دیں، اپنے فعل کے وہ خود ذمہ دار ہوں گے اور انہیں انشورنس کا مسئلہ ضرور بتلا دینا چاہئے، وہ اس پر عمل کریں یا نہ کریں۔

واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۶/۱۱/۲۸ھ

(فتویٰ نمبر ۲۷/۲۷۷ و)

(۱) تفصیل کے لئے حضرت والا دامت برکاتہم کی کتاب ”اسلام اور جدید معیشت و تجارت“ ص: ۱۶۰ تا ۱۶۳ ملاحظہ فرمائیں۔ نیز تجارتی بیمہ کا متبادل ”کافل“ کے نام سے بھی منظر پر آچکا ہے جس کی قدرے تفصیل کے لئے ص: ۳۱۴ تا ۳۲۷ ملاحظہ فرمائیں۔

۱:- مختلف معمولوں کے ذریعے حاصل کئے گئے انعام کا حکم

۲:- لائف انشورنس کی مختلف مروجہ صورتوں کا حکم

سوال:- کیا معمولوں کے ذریعے انعام حاصل کیا ہوا روپیہ حرام ہے؟ اگر ہے تو کیوں؟
جواب:- معے کے حل بھیجنے کے لئے اگر کوئی فیس مقرر کی گئی ہو تو وہ قمار میں داخل ہونے کی وجہ سے حرام ہے۔^(۱)

سوال:- اپنے آپ کو انشورڈ کرانا جائز ہے؟ اگر ہے تو کیوں؟
جواب:- زندگی کے انشورنس کی جو صورتیں رائج ہیں وہ بھی اسی مذکورہ بالا وجہ سے ناجائز ہیں۔

واللہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

الجواب صحیح
محمد عاشق الہی

۱۳۸۸/۲/۶ھ

(فتویٰ نمبر ۱۹۳/۱۹ الف)

انشورنس کی مروجہ صورتوں اور مسجد کا انشورنس کرانے کا حکم

سوال:- حضرت مولانا مفتی تقی عثمانی صاحب مدظلہ العالی، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ
آکلینڈ (نیوزی لینڈ) سے خلیل احمد کا سلام عرض خدمت ہے

ایک سوال عرض خدمت ہے، لیکن اس سے پہلے یہاں کے حالات عرض کرنا چاہتا ہوں۔
یہاں نیوزی لینڈ میں تقریباً بیس ہزار مسلمان آباد ہیں جو مختلف ممالک سے آئے ہوئے ہیں اور زیادہ تر مسلمان پچھلے دس سالوں میں آئے ہیں جو اکثر دکان اور فیکٹری وغیرہ میں کام کرتے ہیں، اور کچھ ریٹوجی آئے ہوئے ہیں جو صومالیہ اور عرب ممالک کے ہیں جو مالی اعتبار سے غرباء ہیں۔ یہاں پورے ملک میں پانچ مساجد اور آٹھ عبادت گاہ ہیں، جو ملک کے مختلف شہر میں پائے جاتے ہیں، اور فی الحال آکلینڈ شہر میں دو مسجد اور ایک مسلم اسکول کا کام چل رہا ہے، اور زیادہ تر چند مقامی مسلمانوں نے جمع کیا ہے، یہاں کی کرنسی ڈالر ہے، ایک ڈالر کے پاکستانی بانکس روپے ملتے ہیں، اور یہاں کی حکومت کے قوانین برطانیہ کے قوانین جیسے ہیں۔ اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ یہاں دو ایک مسجد والوں نے مسجد کا انشورنس کروایا ہے، اور ایک مسجد جو آٹھ ماہ پہلے بن کر تیار ہوئی ہے اس میں کسی نے جمعرات ۶ اگست ۱۹۹۸ء کو صبح چار بجے آگ لگادی اور آگ لگانے سے پہلے قیمتی سامان کی چوری کی، ابھی تک کوئی مجرم نہیں پکڑا گیا ہے، اب ایسے حالات میں کیا کرنا چاہئے؟ کیا مسجد کا انشورنس لے سکتے ہیں یا

نہیں؟ اگر انشورنس درست نہ ہو تو ان صورتوں کا کیا حکم ہے؟ برائے کرم جواب مرحمت فرما کر مشکور فرمائیں اور عند اللہ ماجور ہوں۔

فقط والسلام محتاج دُعا

بندہ خلیل احمد آکلینڈ، نیوزی لینڈ

بروز پیر ۱۰ اگست ۱۹۹۸ء

جواب:- مکرمی و محترمی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کا فیکس ملا، انشورنس کی مروجہ تمام صورتیں سود یا قمار پر مشتمل ہونے کی بناء پر ناجائز ہیں، لہذا مسجدوں کا انشورنس نہیں کرانا چاہئے تھا، لیکن اب جبکہ کرا لیا تو حادثے کی صورت میں کمپنی سے رقم وصول کر لیں، پھر جتنی رقم اب تک مسجد کی طرف سے پریمیم کے طور پر ادا کی گئی ہے، اتنی رقم تو مسجد ہی کی مرمت وغیرہ میں براہ راست استعمال کر سکتے ہیں، باقی رقم کسی مستحق زکوٰۃ کو صدقہ کر دی جائے، پھر اگر وہ شخص اپنی خوشی سے وہ رقم یا اس کا کچھ حصہ مسجد کو بطور چندہ دیدے تو اس کو بھی مسجد میں استعمال کر سکتے ہیں۔

واللہ سبحانہ اعلم

۱۴۱۹/۴/۲۳ھ

(فتویٰ نمبر ۸۷/۳۴۳)

تقسیم انعامات کے لئے قرعہ اندازی کرنے کا حکم

سوال:- عالمگیر ویلفیئر ٹرسٹ نے کھالیں جمع کرنے والے بچوں کو ان کی حوصلہ افزائی کے لئے انعامات تقسیم کئے، ہمارے پاس کچھ انعام اضافی ہو گئے تھے، ہم نے یہ اعلان کیا کہ قرعہ اندازی کے ذریعے یہ انعام انہی بچوں میں تقسیم کر دیئے جائیں گے، لیکن ایک صاحب نے توجہ دلائی کہ یہ عمل ناجائز ہے اور جوئے کے زمرے میں آتا ہے، ہماری رہنمائی فرمائیں۔

جواب:- اگر بچوں سے انعام یا قرعہ اندازی میں شرکت کے لئے کوئی فیس وصول نہیں کی گئی تو یہ قمار نہیں ہے^(۱) اور قرعہ اندازی تقسیم انعامات کے لئے جائز ہے^(۲) واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم بالصواب

۱۴۱۸/۱/۵ھ

(فتویٰ نمبر ۲۲/۲۶۳)

(۱ و ۲) وفي رد المحتار كتاب الحظر والاباحه ج: ۶ ص: ۴۰۳ لأن القمار من القمار الذي يزداد تارة وينقص أخرى وسمى القمار قماراً لأن كل واحد من المقامرين ممن يجوز أن يذهب ماله إلى صاحبه ويجوز أن يستفيد مال صاحبه وهو حرام بالنص.... الخ.

وفي المبسوط للامام السرخسي ج: ۱۵ ص: ۷ استعمال القرعة في مثل هذا الموضع جائز عند العلماء أجمع رحمهم الله بهذا الحديث قلنا إذا تزوج أربع نسوة فله أن يقرع بينهما لابتدائه بالقسم لأن له أن يبدأ بهن من شاء منهن فيقرع بينهما تطيلاً لقلوبهن اهـ. هكذا في فتح القدير ج: ۴ ص: ۳۸۵ معارف القرآن ج: ۷ ص: ۴۷۸.

نیز تفصیل کے لئے حضرت والا دامت برکاتہم العالیہ کا فیصلہ لائبریری حرام ہے ”ابلاغ“ ماہ ربیع الثانی ۱۴۱۳ھ میں ملاحظہ فرمائیں۔

﴿فصل فی احکام البنوک﴾ (مختلف بینکوں کے احکام)

حبیب بینک اور دوسرے بینکوں کے نفع، نقصان کے کھاتے
میں سرمایہ کاری کا حکم

سوال :- حبیب بینک نے P.L.S کھاتے میں سود سے پاک نفع و نقصان کی بنیاد پر شراکت شروع کی تھی، اس میں میرے والد صاحب نے اکاؤنٹ کھولا ہے، آپ کی معلومات کے مطابق کیا بینک کی یہ شراکت شرعی اصولوں کے موافق ہے؟

جواب :- حبیب بینک یا دوسرے پاکستانی بینکوں کے ”نفع و نقصان کے کھاتے“ میں سرمایہ کاری اس لئے درست نہیں کہ یہ سارے بینک آگے اس روپے کو جو استعمال کرتے ہیں وہ سودی کاموں میں استعمال کرتے ہیں، اگرچہ نام بدلا ہوا ہے، لہذا اس کھاتے میں رقم رکھوانا اور اس کے نفع کو استعمال کرنا جائز نہیں ہے،^(۱) جواب تک نفع ہوا ہے، اسے بغیر نیتِ ثواب کے صدقہ کر دیا جائے۔

والسلام

۱۴۱۹/۱۱/۴ھ

(فتویٰ نمبر ۷/۳۵۲)

”فیصل اسلامک بینک“ کا طریقہ کار اور اس کی مختلف شاخوں کا حکم

سوال ۱ :- عرض یہ ہے کہ حضرت والا سے معلوم ہوا کہ ”فیصل اسلامک بینک آف بحرین“ کا P.L.S اکاؤنٹ جواز کے درجے میں ہے، جبکہ عام بینکوں کے P.L.S اکاؤنٹ میں رقم رکھ کر منافع حاصل کرنا جائز نہیں۔ براہ کرم مطلع فرمائیں کہ فیصل اسلامک بینک کے اکاؤنٹ P.L.S میں رقم رکھ کر منافع حاصل کرنا جائز ہے یا نہیں؟

(۱) وفي المشکوٰۃ ج: ۱ ص: ۲۴۴ (طبع قدیمی کتب خانہ) عن جابر رضی اللہ عنہ قال: لعن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اکل الربا وموكله وکاتبه وشاهديه وقال هم سواء. (رواه مسلم). نیز دیکھئے ص: ۲۸۴ کا حاشیہ نمبر ۴۔

۲:- ہمارے دفتر میں ملازمین نے ایک نجی ادارہ رضا کارانہ طور پر قائم کیا ہے، جس کا نام KEBF ہے، یہ ادارہ شرعی وقف ہے، اس کا مقصد ملازمین میں سے (جو کہ ادارے کے ممبر ہوں) کسی کے انتقال پر ان کے لواحقین کو فوری مالی امداد پہنچانا ہے، جب کوئی انتقال کرتا ہے تو اس کی مالی حالت کا لحاظ کئے بغیر اس کے لواحقین کو ایک مقررہ رقم پہنچادی جاتی ہے، اس فنڈ کی کثیر رقم این آئی ٹی میں رکھی تھی، مگر اب چونکہ این آئی ٹی جائز نہ ہونے کا فتویٰ شائع ہو چکا ہے اس لئے وہاں سے رقم نکالی جا رہی ہے، دریافت طلب بات یہ ہے کہ پچھلے دو سال میں ہم جو این آئی ٹی کا منافع لے چکے ہیں، اس کا تیس فیصد تقریباً ۱۵ ہزار روپے بنتا ہے، جبکہ فنڈ کے پاس کل جمع شدہ رقم دو لاکھ ہے، مندرجہ بالا تمام حقائق کو سامنے رکھتے ہوئے (فنڈ کا وقف ہونا فنڈ کا استعمال ناجائز منافع ۱۵ ہزار جبکہ کل رقم دو لاکھ ہے) کیا ہم پر لازم ہے کہ پچھلے دو سال کے منافع کا ۳۰ فیصد صدقہ کر دیں، یا اس خاص صورت میں (جبکہ منافع لیتے وقت اس کے ناجائز ہونے کا علم بھی نہ تھا) یہ رقم فنڈ میں ہی رہنے دی جاسکتی ہے؟

جواب ا:- فیصل اسلامک بینک کی جو شاخ کراچی میں قائم ہوئی ہے، اُس کے طریق کار اور معاملات کی جس قدر تحقیق احقر کر سکا ہے اس کی رُو سے اس کے معاملات جواز شرعی کی حدود میں ہیں، لیکن دو وضاحتیں ضروری ہیں، ایک تو یہ کہ یہ حکم صرف کراچی شاخ کا ہے، بحرین اور سعودی عرب میں یہ بینک جس طریق کار کے تحت کام کر رہا ہے اس میں بعض امور خلاف شرع بھی ہیں، جن کی اصلاح کی کوشش کی جا رہی ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ یہ حکم بینک کے موجودہ طریق کار کا ہے، اگر بینک اپنے اس طریق کار میں کوئی تبدیلی کر لے تو اس تبدیلی کے مطابق حکم ہوگا، لہذا وقتاً فوقتاً اس کے بارے میں مستند معلومات حاصل کرتے رہنا چاہئے۔

۲:- این آئی ٹی کے منافع میں سے جو ۳۰ فیصد منافع ناجائز ذرائع سے حاصل ہوا اس کا اصل حکم تو یہ ہے کہ وہ ان لوگوں یا اداروں کو لوٹایا جائے جہاں سے حاصل ہوا تھا، لیکن اگر ان کا معلوم ہونا مشکل ہو جیسا کہ ظاہر یہی ہے، تو پھر یہ رقم صدقہ کرنی ضروری ہے، اس کو فنڈ کا حصہ بنانا تو درست نہیں ہوگا، البتہ اس رقم کو علیحدہ کر کے اُسے صرف ایسے افراد پر صرف کیا جاسکتا ہے جو مستحق زکوٰۃ ہوں، خواہ وہ اس ادارے کے ملازمین یا فنڈ کے ممبران ہی کیوں نہ ہوں۔

واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم

۱۸/۱۰/۱۴۰۸ھ

(فتویٰ نمبر ۳۹/۲۱۳۷ ز)

(۱) چنانچہ بعد میں اس بینک کے حالات تبدیل ہو گئے، اور اس کے ساتھ معاملہ کرنا جائز نہ رہا۔ (حاشیہ از حضرت والا دامت برکاتہم العالیہ)

امارت اسلامی کے قیام کے بعد افغانستان کے اسلامی بینکوں کے لئے لوگوں سے پچھلے قرضوں پر سود وصول کرنا جائز ہے یا نہیں؟

سوال:- ماذا رأى علماء الأمة في المسئلة التالية؟ وهي أن البنوك الإسلامية

الأفغانية بعد قيام الامارة الإسلامية في أفغانستان واجهت مشكلة كبيرة، وهي أن البنوك الأفغانية قبل الامارة الإسلامية في النظام الربوي لها ديون على الآخرين وكذا عليها ديون للآخرين، ولكن قروض البنوك الأفغانية على الآخرين كثيرة ووفيرة جدًا يمكن بها تجهيز المملكة بأسرها التي سقط اقتصادها كل السقوط، فهل يمكن حصول تلك القروض الربوية لاستحكام الامارة الإسلامية في ضوء القرآن والسنة أم لا؟ وهل يجوز إعطاء تلك الديون الربوية على البنوك للدائنين أم لا؟

جواب:- لا يجوز للبنوك الأفغانية أخذ الفوائد على قروضها، ولها الحق في

استرداد أصل القرض، وكذلك يجوز لها أن تصالح مديونيها على أساس المضاربة الشرعية فتشاركهم في أرباحهم التي حصلوا عليها من استخدام مبالغ هذه القروض، وذلك اقتداء بفعل سيدنا عمر بن الخطاب رضي الله عنه، حيث جعل قرض ابنه الذي اقترضه من بيت المال قراضاً، كما رواه مالك في الموطأ،^(۱) أما قروضها التي اقترضتها من غيرها، فلا يجوز دفع الفائدة عليها، إلا إذا اضطررت إليه لسبب من الأسباب.

والله سبحانه وتعالى أعلم وعلمه أتم وأحكم

محمد تقی عثمانی عفا الله عنه

۲۸ شعبان ۱۴۱۸ھ

(فتویٰ نمبر ۲۷/۲۹۳)

(۱) وفي الموطأ للإمام مالك رحمه الله كتاب القراض ص: ۱۶۹ (طبع نشر جمعية احياء التراث الأسدي) وفي طبع مكتبه قديمي كتب خانة ص: ۶۱۶ و ۶۱۷.

عن زيد بن أسلم عن أبيه أنه قال: خرج عبدالله وعبيدالله ابنا عمر بن الخطاب في جيش الى العراق، فلما قفلا مرّا على أبي موسى الأشعري وهو أمير البصرة فرحب بهما وسهل ثم قال: لو أقدر لكما على أمر أنفعكما به لفعلت، ثم قال: بلى ههنا مال من مال الله أريد أن أبعث به الى أمير المؤمنين فأسلفكما فبتاعان به متاعاً من متاع العراق ثم تبيعانه بالمدينة فتؤديان رأس المال الى أمير المؤمنين فيكون لكما الربح، فقالا: ودّنا ففعل وكتب الى عمر بن الخطاب أن يأخذ منهما المال، فلما قدما باعاً فاربحاً فلما دفعاً ذلك الى عمر بن الخطاب قال: أكل الجيش أسلفه مثل ما أسلفكما قال: لا، فقال عمر بن الخطاب: ابنا أمير المؤمنين فأسلفكما أديا المال وربحه فأما عبدالله فسكت وأما عبيدالله فقال: ما ينبغي لك يا أمير المؤمنين هذا لو نقص المال أو هلك لضمنناه. فقال: أدياه فسكت عبدالله وراجع عبيدالله، فقال رجل من جلساء عمر: يا أمير المؤمنين! لو جعلته قراضاً، فقال عمر: جعلته قراضاً، فأخذ عمر رأس المال ونصف ربحه وأخذ عبدالله وعبيدالله نصف ربح المال.

”البنک الأهلئ التجاری“ میں سرمایہ کاری کا حکم

سوال:- سعودی عرب کے ایک بینک ”البنک الأهلئ التجاری“ میں والد صاحب نے اکاؤنٹ کھولا ہے، جس میں شیئرز کا کاروبار ڈالروں کی شکل میں ہے، اس کی پراسپیکٹس ہمراہ ہے، جس میں اصول و قواعد درج ہیں، والد صاحب نے بھی اس کے شیئرز خریدے ہیں، کیا اس بینک کا شیئرز کا کاروبار جائز ہے؟

جواب:- ”البنک الأهلئ التجاری“ کے فنڈ کے پراسپیکٹس میں جو طریقہ بیان کیا گیا ہے، وہ مراہجہ پر مبنی ہے، اور شرعی اعتبار سے اصولاً جائز اور درست ہے، لیکن عملاً ہوتا یہ ہے کہ بہت سے بینک اس معاملے کی شرعاً (ساری) شرائط پوری نہیں کرتے، اور بعض اس کا پورا لحاظ رکھتے ہیں۔ اس بات کا اندازہ کرنے کے لئے معاملات کی براہ راست چیکنگ کرنی پڑتی ہے، چونکہ ان کا دعویٰ شرعی اصولوں کے مطابق بیع و شراء کا ہے، اس لئے ایک عام آدمی کے لئے اس میں سرمایہ کاری کی گنجائش تو ہے کیونکہ پراسپیکٹس میں صحیح اصولوں کا اعلان کرنے کے بعد اگر ادارے کے منتظمین کوئی غلطی کریں تو یہ ان کی ذمہ داری ہے، لیکن احتیاط کا تقاضا یہ ہے کہ جب تک کوئی عالم ان کے بیع و شراء کے ایگریمنٹس کا تنقیدی جائزہ لے کر انہیں درست قرار نہ دے، اس وقت تک احتراز کیا جائے۔ والسلام

۱۴۱۹/۱۱/۴ھ

(فتویٰ نمبر ۷/۳۵۲)

سعودی عرب کے دو مالیاتی اداروں ”دار المال الاسلامی“

اور ”الشركة الإسلامية للاستثمار الخلیجی“ کا حکم

سوال:- آپ کا مضمون غیر سودی کاؤنٹر، ماہنامہ ”بینات“ کے جمادی الاولیٰ ۱۴۰۱ھ کے شمارے میں پڑھا، میں آپ کو ”دار المال الاسلامی“ اور ”الشركة الإسلامية للاستثمار الخلیجی“ کے داعیانہ کاغذات بھیج رہا ہوں، ان دونوں کے حلال یا مشکوک ہونے کے بارے میں آپ اپنی مخلص رائے ارسال فرمائیں، میں آپ کے جواب کا شدید منتظر ہوں۔

جواب:- احقر نے آپ کے بھیجے ہوئے کتابچوں کا مطالعہ کیا، ان میں دو باتیں واضح نہیں ہیں، ایک یہ کہ اگر کاروبار میں نقصان ہوا تو وہ کس پر کس تناسب سے پڑے گا؟ دوسرے یہ کہ مضارب

کمپنی اس رقم کو کس قسم کے کاروبار میں لگائے گی اور اس کو سود سے پاک رکھنے کا کیا انتظام کرے گی؟ جب تک ان دو بنیادی سوالات کا جواب معلوم نہ ہو، اس مسئلے کا جواب ممکن نہیں، لہذا آپ معلومات کر کے ان سوالوں کا جواب ارسال فرمائیں، اس کے بعد اس مسئلے کا جواب دیا جاسکے گا۔

واللہ تعالیٰ اعلم

۱۱/۱۲/۱۴۰۱ھ

(فتویٰ نمبر ۹۱/۳۲ ج)

”دینی اسلامی بینک“ اور ”فیصل اسلامک بینک“

میں سرمایہ کاری کا حکم

سوال:- محترم مفتی صاحب، السلام علیکم۔ میں یہ خط ابو ظہبی میں مقیم مولانا خلیل احمد صاحب کی وساطت سے لکھ رہا ہوں، مجھے چند ایسے مسائل کا سامنا ہے جن کا تعلق موجودہ دور کی Economics سے ہے، بد قسمتی سے مجھے یہاں کوئی ایسا عالم دین نہیں مل سکا جسے Modern Economics پر دسترس ہو۔ مولانا خلیل صاحب میرے دوست ہیں اور جب ان سے ان چیزوں کے بارے میں بات کی تو انہوں نے مجھے آپ سے رابطہ کرنے کو کہا۔ میں یہاں پر پچھلے پندرہ سال سے حکومت کے ایک ادارے میں کام کرتا ہوں، میرا ذریعہ آمدنی صرف اور صرف میری تنخواہ ہے، اس کے علاوہ نہ امارات میں اور نہ ہی پاکستان میں کوئی اور ذریعہ آمدنی ہے، یہ میں اس لئے لکھ رہا ہوں تاکہ آپ میرے مسائل کا حل میرے حالات کو مد نظر رکھتے ہوئے دے سکیں۔

U.A.E میں ایک بینک ہے جو کہ ”دینی اسلامی بینک“ کے نام سے مشہور ہے، مولانا خلیل صاحب کے مطابق U.A.E کی شرعی عدالت کی نظر میں اس بینک میں سرمایہ رکھنا یا تجارت میں لگانا جائز ہے۔ حال ہی میں پاکستان سے ایک ممتاز عالم دین تشریف لائے، میری اُن سے اس معاملے پر بات ہوئی تو انہوں نے دو ٹوک فیصلہ سنایا کہ دینی اسلامی بینک یا فیصل اسلامک بینک یا پاکستان میں قائم شدہ اسلامی بینک (جس کا میں نام بھول گیا) سب غلط ہیں اور ان کا منافع مکمل طور پر سود ہے۔ آپ سے یہ درخواست ہے کہ اگر آپ ان بینکوں کی کارکردگی سے واقف ہیں تو مجھے ان کی اصلیت سے ضرور آگاہ کریں۔

دوسری بات یہ ہے کہ اگر یہاں کی عدالت شرعیہ نے اس بینک میں سرمایہ کاری کو جائز قرار دیا ہے، تو کیا ان کے فیصلے کا احترام کافی ہے اور غلط ہونے کی صورت میں بھی کیا میں بری الذمہ ہوں یا

مجھے اس سلسلے میں دوسرے علماء سے بھی پوچھنا ضروری ہے؟ اگر دو عالم دین یا مفتی ایک ہی مسئلے پر مختلف رائے دیں تو کس کی بات زیادہ معتبر سمجھی جائے؟

میں نے کچھ پیسے دینی اسلامک بینک میں رکھے ہوئے ہیں بلکہ اس بینک میں Invest کئے ہوئے ہیں، کیا اس کا منافع میرے لئے استعمال میں لانا جائز ہے یا نہیں؟

جواب:- محترمی و مکرمی جناب ڈاکٹر ظہور احمد صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کے سوالات کے جواب درج ذیل ہیں:-

احقر کو ”دینی اسلامک بینک“ کے مفصل طریق کار کا علم نہیں ہے، اس لئے احقر اس کے بارے میں کوئی حتمی بات نہیں کہہ سکتا، اس بینک میں ایک شرعی مشاورتی بورڈ ہے، آپ اس بورڈ کے رکن علماء سے رجوع کریں، بشرطیکہ وہ علماء آپ کے خیال میں قابل اعتماد ہوں، پھر اگر وہ اس بینک کے نفع بخش کھاتوں میں رقم رکھوانے کو جائز قرار دیں تو آپ کے لئے بظاہر گنجائش ہوگی، اور جو شخص بینک کے تفصیلی طریقہ کار سے باخبر نہ ہو، اس کے جائز کہنے یا ناجائز کہنے پر مدار نہ رکھنا چاہئے۔

جہاں تک ”فیصل اسلامک بینک“ کا تعلق ہے، میں اس کے شریعہ بورڈ کا رکن ہوں، اس کے معاملات ملے جلے قسم کے ہیں، اور کیونکہ ابھی تک اس کو غیر شرعی معاملات سے بالکل پاک نہیں کیا جاسکا، اس لئے میں دوستوں کو اس کے نفع بخش کھاتوں میں رقم رکھوانے اور نفع وصول کرنے کا مشورہ نہیں دیتا۔

رہا یہ سوال کہ ایک مسئلے پر دو مفتی مختلف رائے دیں تو کس کی رائے معتبر سمجھی جائے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ جس مفتی کے علم اور تقویٰ پر آپ کو زیادہ اعتماد ہو، اس پر عمل کرنا چاہئے۔

واللہ سبحانہ اعلم

۱۴۱۴/۱۱/۲۲ھ

ٹیکس اتھارٹیز کا تعامل اسلامی بینک کی تمویل سے

ٹیکس کے استثناء کے لئے کافی ہے

سوال:- بخدمت جناب مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم

مکرمی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ

امید ہے کہ آپ اور تمام متعلقین مع خیر و عافیت ہوں گے۔ آپ کی شدید مصروفیت کا علم

ہونے کے باوجود آپ کو زحمت دے رہا ہوں، جس کے لئے پیشگی معذرت خواہ ہوں۔

ایک مسئلہ جو تقریباً چھ سال سے راقم الحروف اور اکثر اسلامی بینکوں کے ارباب حل و عقد، خصوصاً میزان بینک کے سرکردہ اصحاب کے درمیان وجہ نزاع بنا ہوا ہے، وہ مرابحہ کے معاملے پر محصولات کے لاگو ہونے، ان کی ادائیگی یا حکومت کی اجازت سے ان کے عدم اطلاق کا ہے۔

”اصلاحی خطبات“ جلد نمبر ۱۱ میں آپ نے ان تمام حکومتی قوانین، جو شریعت کے کسی قانون سے متصادم نہ ہوں، کی پاسداری کے متعلق اظہار خیال کیا ہے، ان کی روشنی میں راقم الحروف کی سوچ یہ ہے کہ خرید و فروخت کے معاملات پر واجب الادا تمام محصولات کا اطلاق بحسنہ مرابحہ کے ان معاملات پر بھی ہوتا ہے جو اسلامی بینکوں میں رائج ہیں تا وقتیکہ حکومت یا اس کا مجاز ادارہ، بورڈ، اسلامی بینکوں میں رائج مرابحہ کو ان سے مستثنیٰ قرار دے دیں، میری یہ رائے اس بنیاد پر ہے کہ:-

۱- مرابحہ فی الواقع خرید و فروخت کا معاملہ ہے اور قیمت کی ادائیگی کو مؤخر کر کے بینکوں نے

اسے تاجر حضرات کو ادھار مہیا کرنے کا ذریعہ بنایا ہے۔

۲- خرید و فروخت کے تمام معاملات، چاہے وہ بینکوں ہی کی طرف سے روبعمل لائے

جائیں، محصولات کے ان قوانین کے مطابق ہونا چاہئیں جو حکومت پاکستان نے بنائے ہیں اور جو شریعت سے متصادم بھی نہیں ہیں۔

۳- ان قوانین میں سے بعض کو ۱۹۷۹ء اور بعض کو ۱۹۹۰ء میں رائج کیا گیا جب پاکستان میں

کوئی بھی بینک (ماسوائے فیصل بینک جو مرابحہ کا Documentation تو استعمال کر رہا تھا، لیکن اس کے شرعی تقاضوں کو نہیں پورا کر رہا تھا) اسلامی بینکاری نہیں کر رہا تھا۔ ۱۹۷۹ء میں بنائے گئے انکم ٹیکس قانون کو ۲۰۰۱ء میں نئی شکل دی گئی اور اب ۲۰۰۱ء کا آرڈیننس مع تبدیلیوں کے مروجہ قانون ہے۔ ۲۰۰۱ء میں بھی شریعت میں مطلوب معیار کی کوئی پاکستانی بینک پاسداری نہیں کر رہا تھا۔

۴- ان قوانین کے زمانہ اطلاق کے پیش نظر اور ان کے الفاظ اور غایت کی روشنی میں یہ

بات بلا خوف تردید کہی جاسکتی ہے کہ ان میں سے کسی بھی قانون کا مقصد اسلامی بینکوں کے لئے کوئی مشکلات یا پیچیدگیاں پیدا کرنا نہیں ہے، یا دیدہ و دانستہ یہ قوانین اسلامی بینکاری کو رائج ہونے سے روکنے کے لئے بنائے گئے ہیں۔

۵- ۲۰۰۰ء کے آخر سے اب تک بعض افراد، بینک دولت پاکستان اور ICAP (Institute

(of Chartered Accountants Pakistan) نے جو کوششیں کی ہیں، ان کے باعث اسلامی بینکوں میں رائج مرابحہ کے معاملات کو بعض محصولات سے چھوٹ دے دی گئی ہے، اگر تمام اسلامی بینک، خصوصاً وہ بینک جو اس وقت اس شعبے میں زیادہ مشہور اور آگے ہیں، مل کر کوشش کریں تو کوئی وجہ نہیں کہ بقیہ قوانین میں بھی تبدیلیوں کی ضرورت حکومت سے منوائی نہ جاسکے، جبکہ اس کے سبب حکومت کو کوئی مالی نقصان بھی نہیں ہے۔

۶- ICAP نے جو Accounting Standard (معروف بہ IFAS-1) وضع کیا ہے اس کی رو سے مرابحہ کرنے والے بینکوں کے لئے لازمی ہے کہ سامان کی خرید اور فروخت کا اندراج کتابوں میں کریں اور Invoice وصول اور جاری کریں تاکہ بعد میں آڈٹ کرنے والوں کو یہ اطمینان ہو سکے کہ مرابحہ کا ہر معاملہ سامان کی واقعی (تیسرے فریق سے) خرید اور پھر بینک کی جانب سے فروخت پر مبنی ہے۔ اگر IFAS-1 پر کماحقہ عمل کر لیا جائے تو ان شاء اللہ مرابحہ کے معاملات میں تمام خرابیوں کا سد باب ہو سکتا ہے، خصوصاً Rollover کو جڑ و بنیاد سے اکھاڑ پھینکا جاسکتا ہے۔

۷۔ بحیثیت بینکر کے احقر کو خوب اندازہ ہے کہ ٹیکس قوانین میں تبدیلیوں کے بغیر IFAS-1 پر عمل کرنا نہ صرف دشوار ہے بلکہ محصولات کی ادائیگی کے سبب یا تو اسلامی بینکوں کی شرح منافع ناقابل برداشت حد تک متاثر ہوگی یا پھر Customers کو سودی بینکوں کے مقابلے میں زیادہ اخراجات دینا ہوں گے جو مسابقت کے موجودہ ماحول میں بعید از قیاس معلوم ہوتا ہے۔

۸۔ اگر آپ کی رائے میں مرابحہ کے معاملے پر ٹیکس قوانین کا اطلاق نہیں ہوتا، چونکہ سودی بینکوں کے بیع عینہ (Buy-Back) کے معاملے بھی یوں ہی ہو رہے ہیں، یا حکومت پاکستان کے ٹیکس قوانین کی خلاف ورزی خلاف شرع نہیں ہے تو براہ کرم اپنی تحریری رائے سے مطلع فرمائیں تاکہ ہم لوگوں کو یہ اطمینان ہو جائے کہ ان قوانین کی بظاہر خلاف ورزی کے باوجود ہم کسی گناہ کا ارتکاب نہیں کر رہے ہیں اور عند اللہ مأخوذ نہ ہوں گے۔

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ

طالب دُعاے خیر

انوار احمد مینائی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

جواب :- مکرم بندہ

کسی ٹیکس سے استثناء صریح عبارت سے بھی ہو سکتا ہے، اور متواتر عمل سے بھی۔ حکومت اور

ٹیکس اتھارٹیز سے یہ بات مخفی نہیں ہے کہ مرابحہ ایک بیع ہے، ساتھ ہی وہ جانتے ہیں کہ یہ بیع ایک آلہ تمویل کے طور پر استعمال ہو رہی ہے۔ اور کوئی وجہ نہیں ہے کہ سودی تمویل پر ٹیکس نہ ہو، اور شرعی تمویل پر ٹیکس عائد کیا جائے، اس لئے ان کا متواتر تعامل یہ ہے کہ کسی اسلامی بینک سے سیلز ٹیکس کا مطالبہ نہیں کیا گیا۔ لہذا اسے ٹیکس سے مستثنیٰ سمجھنے میں کم از کم بندہ کو کوئی دشواری نہیں ہے۔

والسلام

بندہ محمد تقی عثمانی

۱۴۲۷/۱۲/۱۸ھ



﴿فصل فی البطاقات وأحكامها﴾ (کریڈٹ کارڈ اور اس کی مختلف قسموں کے احکام)

کریڈٹ کارڈ کا حکم

(بنوری ٹاؤن، ”جنگ“ اخبار اور حضرت والا دامت برکاتہم کا فتویٰ)

سوال:- کریڈٹ کارڈ (Credit Card) کے بارے میں معلوم کرنا تھا، اس کو استعمال کر سکتے ہیں یا نہیں؟ میری معلومات یہ ہیں کہ Credit Card کی سالانہ فیس دو ہزار روپے ہے، کریڈٹ کارڈ کو ملک کے اندر یا بیرون ملک استعمال کریں تو ایک ماہ کے اندر وہ رقم واپس کر دیں تو کوئی سود نہیں دینا پڑتا، اور ایک ماہ بعد اگر رقم دیں تو اس پر سود دینا پڑتا ہے، یہ بیرون ملک کام آتا ہے، رقم لے کر جانے کی ضرورت نہیں ہوتی۔

نوٹ:- اس کے ساتھ دو جوابوں کی فوٹوکاپی آپ کو روانہ کر رہا ہوں، دونوں کے جواب مختلف ہیں جناب مفتی جمیل صاحب (”جنگ“ اقرأوالے) نے آپ کا حوالہ دیا ہے، مہربانی فرما کر تفصیل کے ساتھ جواب تحریر فرما کر شکریہ کا موقع دیں۔

”جنگ“ اخبار کا جواب

جواب:- ایک مہینے کے اندر اگر رقم ادا کر دی گئی تو جائز ہے، بعد میں ادا کرنے پر سود دینا پڑتا ہے، یہ جائز نہیں۔

جامعۃ العلوم الاسلامیہ، بنوری ٹاؤن کا جواب

صورتِ مسئلہ میں دو ہزار روپے سے جو کریڈٹ کارڈ خریدا جاتا ہے، وہ ایک رسید کی حیثیت رکھتا ہے، فی نفسہ اس کی کوئی قیمت نہیں بلکہ قرضہ حاصل کرنے کے اجازت نامے کی حیثیت رکھتا ہے، جس کی رو سے قرضہ لینے والا ایک ماہ تک بغیر مزید سود ادا کئے قرضے کی رقم سے استفادہ کر سکتا ہے، اور یہ سہولت صرف ایک سال تک رہتی ہے، جس کا مطلب یہ ہوا کہ مذکورہ کریڈٹ کارڈ حاصل کرنے والا ایک ماہ کی مدت پر سال بھر جو قرضہ اس ادارے سے حاصل کرے گا اس کا پیشگی سود مبلغ دو ہزار روپے ادارے نے کریڈٹ کارڈ کی فیس کی شکل میں وصول کر لیا، یہ سودی قرضے کی ایک ترقی یافتہ شکل ہے،

جس طرح لوگ نت نئی چیزیں ایجاد کرتے ہیں، اسی طرح یہ شکل سود کی جدید شکل ہے، اس لئے اس سے اجتناب کرنا ضروری ہے، لوگوں کو دھوکے میں نہیں آنا چاہئے۔

واللہ اعلم

کتبہ

محمد عبدالقادر

۱۴۱۷/۵/۵ھ

الجواب صحیح

محمد عبدالسلام عفا اللہ عنہ

الجواب صحیح

سعید احمد جلال پوری

(دارالافتاء) ختم نبوت کراچی

حضرت والا دامت برکاتہم کا جواب

جواب:- احقر کی نظر میں ”جنگ“ والا جواب درست ہے، سالانہ فیس کا قرض سے کوئی تعلق نہیں، دراصل کارڈ جاری کرنے والا اور بھی بہت سی خدمات فراہم کرتا ہے، جن میں کارڈ کا اجراء، اس کے حامل کو مختلف سفری سہولیات فراہم کرنا، دُنیا کے ہر خطے میں کارڈ کی گمشدگی کی صورت میں متبادل کارڈ کی فراہمی، کارڈ کے حامل کا پورا حساب رکھنا وغیرہ۔ ان تمام خدمات کی اُجرت سالانہ فیس کے ذریعے وصول کی جاتی ہے، چاہے کوئی شخص اس کارڈ کے ذریعے خریداری کرے یا نہ کرے، یعنی قرض وجود میں آئے یا نہ آئے، لہذا اس فیس کی وجہ سے کارڈ کا ممبر بننا ناجائز نہیں، البتہ جب کارڈ کو استعمال کیا جائے تو مقررہ مدت کے اندر اندر بل کی ادائیگی کا اہتمام ضروری ہے، تاکہ سود نہ لگے،^(۱) اور اس کے لئے بہتر طریقہ یہ ہے کہ Direct Debit کا طریقہ اختیار کیا جائے، یعنی کارڈ والے براہ راست آپ کے بینک سے بل کی رقم وصول کر لیں، تاکہ غیر ارادی طور پر بھی تاخیر کی وجہ سے سود عائد نہ ہو۔^(۲)

واللہ سبحانہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۴۱۸/۳/۹ھ

(فتویٰ نمبر ۲/۲۷۳)

(۱ و ۲) دراصل آج کل رائج کارڈوں کی تین قسمیں ہیں، ڈیبٹ کارڈ، چارج کارڈ اور کریڈٹ کارڈ، ان میں سے ڈیبٹ کارڈ اور چارج کارڈ کا مذکورہ بالا حکم بیان کیا گیا ہے، اور ان دونوں کارڈوں پر بھی ”کریڈٹ کارڈ“ کا اطلاق کر دیا جاتا ہے، تاہم جہاں تک اصلاً ”کریڈٹ کارڈ“ کا تعلق ہے تو اس کا استعمال ان دونوں کارڈوں کے میسر نہ ہونے کی صورت میں انہی کی شرائط کو ملحوظ رکھتے ہوئے جائز ہے، ورنہ نہیں۔ ان تینوں کارڈوں کا تعارف اور ان کا تفصیلی حکم حضرت والا دامت برکاتہم العالیہ کی ہدایت اور نگرانی میں لکھے گئے اُن کے مصدقہ درج ذیل فتویٰ میں ملاحظہ فرمائیں۔ (محمد زبیر)

سوال:- محترم جناب حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم العالی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

(جاری ہے)

جناب سے گزارش یہ ہے کہ کریڈٹ کارڈ کے بارے میں تفصیل سے حکم بیان فرمادیں کہ آیا اس کو استعمال کرنا جائز ہے یا نہیں؟ نیز کریڈٹ کارڈ کی اور اقسام جو رائج ہیں ان کا حکم بھی بیان فرمادیں۔
جواب:- آج کل رائج کارڈ کی تین اقسام پائی جاتی ہیں:-

1-	ڈیبٹ کارڈ	Debit Card
2-	چارج کارڈ	Charge Card
3-	کریڈٹ کارڈ	Credit Card

1- ڈیبٹ کارڈ

اس کارڈ کے حامل کا پہلے سے اکاؤنٹ اس ادارے میں موجود ہوتا ہے جس ادارے کا اس نے کارڈ حاصل کیا ہے، حاملِ بطاقہ یعنی کارڈ ہولڈر اس کارڈ کو جب بھی استعمال کرتا ہے، ادارہ اس کے اکاؤنٹ میں موجود رقم سے اس کی ادائیگی کر دیتا ہے۔ اس میں حاملِ بطاقہ کو ادھار کی سہولت حاصل نہیں ہوتی ہے بلکہ وہ صرف اس وقت تک کارڈ کو استعمال کر سکتا ہے جب تک اس کے اکاؤنٹ میں رقم موجود ہے۔

ادارہ اس کارڈ کو جاری کرنے کی فیس وصول کرتا ہے۔

اس کارڈ کو استعمال کرنا بلاشبہ جائز ہے اور اس کے ذریعے خرید و فروخت کرنا درست ہے، کیونکہ اس میں نہ قرض کی صورت ہے، نہ سود کی۔ البتہ حاملِ بطاقہ کی یہ ذمہ داری ہوگی کہ وہ اس کارڈ کو غیر شرعی امور میں استعمال نہ کرے۔

2- چارج کارڈ

اس کارڈ کے حامل کا ادارے میں پہلے سے اکاؤنٹ نہیں ہوتا بلکہ ادارہ حاملِ بطاقہ کو ادھار کی سہولت فراہم کرتا ہے، حاملِ بطاقہ کو ایک متعین ایام کی ادھار کی سہولت میسر ہوتی ہے، جس میں اس کو ادارے کو ادائیگی کرنا ضروری ہوتا ہے، اگر اس مدت میں ادائیگی ہو جائے تو سود نہیں لگتا، البتہ اگر حاملِ بطاقہ نے وقت پر ادائیگی نہ کی تو پھر اس کو سود کے ساتھ ادائیگی کرنی پڑتی ہے۔

ادارہ اس کارڈ کو جاری کرنے کی فیس وصول کرتا ہے۔

اس کارڈ کو مندرجہ ذیل شرائط کے ساتھ استعمال کرنا جائز ہے:-

1- حاملِ بطاقہ اس بات کا پورا انتظام کرے کہ وہ معین وقت سے پہلے پہلے ادائیگی کر دے اور کسی بھی وقت سود عائد ہونے کا کوئی امکان باقی نہ رہے۔

2- حاملِ بطاقہ کی یہ ذمہ داری ہو کہ وہ اس کارڈ کو غیر شرعی امور میں استعمال نہ کرے۔

3- اگر ضرورت ڈیبٹ کارڈ سے پوری ہو رہی ہو تو بہتر ہے کہ اس کارڈ کو استعمال نہ کرے۔

3- کریڈٹ کارڈ

اس کارڈ کے حامل کا بھی کوئی اکاؤنٹ ادارے میں نہیں ہوتا بلکہ وہ معاہدہ ہی ادھار پر سود کا کرتا ہے، اس معاہدے میں اگرچہ ادارہ ایک متعین مدت فراہم کرتا ہے کہ جس میں اگر حاملِ بطاقہ ادائیگی کر دے تو اس کو سود ادا نہیں کرنا پڑتا، لیکن اصلاً معاہدہ سود کی بنیاد پر ہوتا ہے اور اس کی ادائیگی کا وعدہ ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ اس میں تجدید مدت (Rescheduling) کی سہولت بھی موجود ہوتی ہے، جس سے ادائیگی کی مدت بڑھ جاتی ہے، البتہ اس کے ساتھ ساتھ شرح سود میں اضافہ ہو جاتا ہے، اور بعض صورتوں میں اضافی رقم لی جاتی ہے۔

اس کا حکم یہ ہے کہ اس کارڈ کا استعمال جائز نہیں ہے، الا یہ کہ ڈیبٹ کارڈ یا چارج کارڈ الگ سے مہیا نہ ہو اور اس کو

ڈیبٹ کارڈ یا چارج کارڈ کی طرح مذکورہ بالا شرائط کے ساتھ استعمال کیا جائے۔ (جاری ہے)

ان تمام کارڈ کو ”کریڈٹ کارڈ“ کہا جاتا ہے، لیکن جو اصلاً کریڈٹ کارڈ ہے اس کا استعمال جائز نہیں، البتہ کریڈٹ کارڈ کا اطلاق مذکورہ بالا پہلی دو قسموں پر کیا جائے تو ان کا استعمال جائز ہے۔

ان کے علاوہ کارڈ کی ایک قسم ہے جس کو ATM (Automated Transfer Machine) کارڈ کہتے ہیں، یہ رقم نکالنے کا کارڈ ہوتا ہے، بعض دفعہ اس کا وجود اوپر ذکر کردہ کارڈ کے ضمن میں بھی ہوتا ہے، مثلاً یہ ممکن ہے کہ ڈیبٹ کارڈ میں رقم نکالنے کی سہولت بھی موجود ہو۔

اس کارڈ کا حکم یہ ہے کہ اس کو استعمال کرنے پر اگر متعین رقم مشین کے استعمال کی اجرت کے طور پر ادارہ وصول کرے جو مقدار رقم سے قطع نظر ہو تو جائز ہے، لیکن اگر ادارہ رقم کو بنیاد بنا کر اس پر کچھ وصول کرے تو یہ جائز نہیں بلکہ سود ہوگا، البتہ ادارہ کارڈ جاری کرنے کی فیس وصول کر سکتا ہے۔

فی المعاییر الشرعیة:

خصائص بطاقة الحسم الفوری

- ۱- تصدر هذه البطاقة من المؤسسة لمن له رصيد في حسابه.
- ۲- تخول هذه البطاقة لحاملها السحب، أو تسديد ائتمان السلع والخدمات بقدر رصيد المتاح، ويتم الحسم منه فوراً، ولا تخوله الحصول على ائتمان.
- ۳- لا يتحمل العميل رسوماً مقابل استخدامه هذه البطاقة غالباً إلا في حال سحب العميل نقداً، أو شرائه عملته أخرى عن طريق مؤسسة أخرى غير المؤسسة المصدرة للبطاقة.
- ۴- تصدر هذه البطاقة برسم أو بدونه.

خصائص بطاقة الائتمان والحسم الآجل

- ۱- هذه بطاقة أداء ائتمان في حدود سقف معين لفترة محددة، وهي أداء وفاء أيضاً.
- ۲- تستعمل هذه البطاقة في تسديد ائتمان السلع والخدمات، وفي الحصول على النقد.
- ۳- لا يتيح نظام هذه البطاقة تسهيلات ائتمانية متجددة لحاملها، حيث يتعين عليه المادرة بسداد ثمن مشترياته خلال الفترة المحددة عند تسلمه الكشوف المرسلة اليه من المؤسسة.
- ۴- إذا تأخر حامل البطاقة في تسديد ما عليه بعد الفترة المسموح بها يترتب عليه فوائد ربوية، أما المؤسسات فلا تترتب فوائد ربوية.

خصائص بطاقة الائتمان المتجدد

- ۱- هذه البطاقة أداء ائتمان في حدود سقف متجدد على فترات يحددها مصدر البطاقة، وهي أداء وفاء أيضاً.
- ۲- يستطيع حاملها تسديد ائتمان السلع والخدمات، والسحب نقداً، في حدود سقف الائتمان الممنوح.
- ۳- في حالة الشراء للسلع أو الحصول على الخدمات يمنح حاملها فترة سماح يسدد خلالها المستحق عليه بدون فوائد كما تسمح له بتأجيل السداد خلال فترة محددة مع ترتب فوائد عليه. أما في حالة السحب النقدي فلا يمنح حاملها فترة سماح.

الحكم الشرعي لأنواع البطاقات

بطاقة الحسم الفوری

يجوز للمؤسسات اصدار بطاقة الحسم الفوری ما دام حاملها يسحب من رصيده ولا يترتب على التعامل بها فائدة ربوية.

بطاقة الائتمان والحسم الآجل

يجوز اصدار بطاقة الائتمان والحسم الآجل بالشروط الآتية: -

- ۱- الا يشترط على حامل البطاقة فوائد ربوية في حال تأخيره عن سداد المبالغ المستحقة عليه.
 - ۲- ان تشترط المؤسسة على حامل البطاقة عدم التعامل بها فيما حرمه الشريعة وانه يحق للمؤسسة سحب البطاقة في تلك الحالة.
- (جاری ہے)

کریڈٹ کارڈ اور اس کی مختلف قسموں کا حکم

سوال :- الیٰ حضرت الشیخ العلامة مولانا محمد تقی عثمانی، حفظہ اللہ تعالیٰ السلام علیکم ورحمة اللہ وبرکاتہ.

أَسْئَلُ اللَّهَ أَنْ تَصْلَحَ لَكُمْ رِسَالَتِي هَذِهِ وَأَنْتُمْ فِي خَيْرِ حَالٍ وَعَافِيَةٍ، الْحَمْدُ لِلَّهِ أَنْ وَفَّقَنِي لِقِرَاءَةِ بَعْضِ كُتُبِكِ بِالْعَرَبِيَّةِ (قَضَايَا فَهْمِيَّةٍ مُعَاَصِرَةٍ) ثُمَّ أَطْلَعْتُ عَلَى بَعْضِ كُتُبِكِ مُتَرَجِمَةً بِالْأَنْجَلِيزِيَّةِ فَأَرَدْتُ التَّنْبِيْهَ إِلَى أَنَّ التَّرْجُمَةَ فِيهَا شَيْءٌ مِنَ الضَّعْفِ فَهِيَ أَقْرَبُ لِللُّغَةِ الْعَوَامِ مِنْهَا إِلَى اللُّغَةِ الْكَادِمِيَّةِ.

ومما قرأته كذلك ان صح فهمي هو فتواك بجواز التعامل ببطاقات الائتمان (Credit Card) اذا كان المشتري بها يثق أنه سيسدد الدين قبل حلول موعد اضافة الفائدة للدين، والسؤال هل يجوز الاقدام على عقد يتضمن شرطاً محرماً كالربا هنا ولو كان المتعاقد يعلم أنه لن يقع تحت طائلة الشرط؟ ومعلوم أن عقد الحصول على Credit Card يتضمن شرطاً ربوياً، وليس الحكم على عقد بأنه حرام وباطل مانعاً من الاقدام عليه الا لضرورة أو لحاجة تنزل منزلتها ولو ترك باب العقود المحرمة مفتوحاً اعتماداً على ثقة المتعاملين فيها بعدم الوقوع في الشرط أو البند المحرم أو الباطل لا نفتح باب شر وفتنة على الناس، والله هو المحافظ. ولى سؤال هل تمت ترجمة كتابكم قضايا فقهية معاصرة الى الانجليزية أو بحث بيع الحقوق المجردة، فاني أحتاج اليه فهل لكم أن تدلوني على ذلك.

وختاماً أرجو المسامحة في التطويل عليكم واسئل الله دوام العافية وتمام النعمة وثبوت البركة والأجر

محجكم وتلميذكم

محمد على احداش

طالب علم على الفقه المالكي، لندن

٩ ربيع الأول ١٤٢٤ هـ

١٠ مايو ٢٠٠٣ م

(بقية حاشية صفحہ گزشتہ)

بطاقة الائتمان المتجدد

لا يجوز للمؤسسات اصدار بطاقات الائتمان ذات الدين المتجدد الذي يسدده حامل البطاقة على أقساط آجلة بفوائد ربوية.

والله اعلم وعلمه أتم

عبدالله صديق غفر الله له

٥١٣٢٤/١/٢٨

(فتوى نمبر ٥١/٨٦١)

الجواب صحیح

بندہ محمود اشرف غفر الله له

الجواب صحیح

محمد تقی عثمانی

الجواب صحیح

محمد عبدالمنان عفی عنہ

الجواب صحیح

محمد عبداللہ عفی عنہ

الجواب صحیح

بندہ عبدالرؤف سکھروی

جواب:- الی سیادة الأخ الکریم محمد علی احداش، حفظه الله تعالى
السلام علیکم ورحمة الله وبرکاته، وبعد:

فشکراً لک علی رسالتک والتنبيه علی أن بعض کتبی المترجمة بالانجليزية
یوجد فیها بعض الضعف، ولعلّ تفصیل مواضع الضعف یصعب علیک، ولكن لو أخبرتنی ما
هی الکتب التي وجدت فیها ذلك، فأنی أخبر به نشرة هذا الکتب، فان كثيراً منهم تناولوا
ترجمة ما شاءوا من مؤلفاتی وفوضوا ذلك الی مترجمین مختلفین، ثم لم تقع منی مراجعة
ذلك لآزدحام أشغالی.

أما بالنسبة لما ذكرت من جواز استخدام بطاقة الائتمان، فالذی أفتی به أن الطريق
الأفضل أن تستخدم هذه البطاقة علی أساس التسديد المباشر (Direct Debit) بأن تستخدم
البطاقة فی حدود الغطاء الموجود عند البنك مصدر البطاقة، حتی لا یكون هناك احتمال
وجوب دفع الفائدة، أما اذا لم یتيسر ذلك، فیجوز استخدام بطاقة الائتمان، ان كان حاملها
علی یقین أنه سیسدد الفاتورة قبل أن توضع علیها فائدة.^(۱)

أما كون العقد مشتملاً علی شرط لزوم الفائدة عند التأخیر فی السداد، فان مثل هذه
الشروط موجودة الیوم فی کثیر من التعاقدات، مثل عقود استخدام الكهرباء والتلفون،
والجوال والضرائب الحكومية وما الی ذلك فلا یمکن الیوم استخدام الكهرباء آلاً بالتوقيع
علی العقد الذی یشرط فوائد التأخیر، ولكن بما أن هذه شروط غیر معتبرة فی الشرع، فما
دام الانسان مطمئناً بأنها لا تطبق عملياً، وذلك بالتزام السداد فی حینه، فانه یمکن أن
یتسامح فیها لعموم البلوی، وقد یتأنس فی ذلك (ولا أقول: یتدل) بحديث شراء عائشة
أم المؤمنین لبريرة رضی الله عنهما بعقد فیہ شرط لأن یكون الولاء للبائع، وأجاز رسول الله
صلی الله علیه وسلم اشتراط ذلك،^(۲) مع كونه شرطاً ممنوعاً فی الشرع، لكونه علی یقین بأنه
لا یطبق، والله سبحانه تعالی أعلم.

وأرجو أن لا تنسونی فی أدعیتکم الصالحة.

والسلام علیکم ورحمة الله وبرکاته

أخوکم

محمد تقی العثماني

کراتشي، ۲۹/۳/۱۴۲۴ھ



(۱) تفصیلی حکم کے لئے سابقہ فتویٰ اور اس کا حاشیہ ملاحظہ فرمائیں۔

(۲) جامع الترمذی ابواب الولاء والہمة ج: ۲ ص: ۳۳ (طبع سعید).

کتاب الإجارة

(کرایہ داری سے متعلق مسائل کا بیان)

﴿فصل فی نفس الإجارة﴾ (اجارہ ”کرایہ داری“ سے متعلق مسائل کا بیان)

پٹواری کے پیشہ اور نظام کی شرعی حیثیت

سوال:- ہمارے علاقے میں قوم بزدار بلوچ کئی ہزار کی تعداد میں رہتے ہیں، جہاں برطانیہ کے دور حکومت سے اب تک کوئی پٹواری کا کوئی انتظام نہیں، اور بارانی علاقہ ہے آمدنی زیادہ نہیں ہوتی، اور ہتھیاروں کی ہر قسم کی آزادی ہے، اور زمینوں کی حدود کے اندر تنازعات واقع ہونے کی وجہ سے لوگوں کے درمیان کشت و خون بھی ہوتا رہتا ہے، اس لئے اب حکومت پاکستان نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ وہاں پٹواریوں کا انتظام کیا جائے، لیکن اس کے مقابلے میں قوم نے اجتماعی مشورے کے بعد یہ طے کیا ہے اور بعض جگہ درمیان میں قرآن مجید رکھ کر یہ طے کیا ہے کہ اس فیصلے کو نافذ ہونے نہیں دیں گے، اور بعض علماء نے یہ فتویٰ دیا ہے کہ یہ مدافعت جہاد ہے اور مقتول شہید ہے، اس قوم کے بعض مطالبے اور بھی ہیں، اور حکومت کے ذمہ دار مثلاً کمسنر صاحب یقین دلاتے ہیں کہ ہم تمہارے مطالبے حکومت سے منظور کرائیں گے، لیکن قوم باور نہیں کرتی، ازیں بنا پر قوم مسلح ہو کر جنگ اور مقابلے کے لئے تیار ہے، اور بعض دفعہ انہوں نے گولیاں بھی ماری اور حکومت بھی اپنی طاقت استعمال کرنے کے لئے تیار ہے، اب قابل دریافت سوالات درج ذیل ہیں: ۱- پٹواری نظام دین میں جائز ہے یا ناجائز؟ ۲- اس تصادم میں جو لوگ مارے جائیں گے ان دونوں فریقین میں سے کون سے فریق کے لوگ شہید ہوں گے اور کون سا فریق ناحق؟ ۳- قرآن مجید کے ذریعے جو عہد کیا ہے اس کی کیا حیثیت ہے؟ باقی رکھنا چاہئے یا توڑنا جائز ہے؟ ۴- عوام کا یہ خدشہ کہ پٹواری رشوت وغیرہ ناجائز کارروائیاں جاری کریں گے لہذا ہم ان کو آنے نہ دیں گے کیا حیثیت رکھتا ہے؟ ۵- حکومت اس قوم کو باغی سمجھ کر قتل کر سکتی ہے یا نہیں؟

جواب:- پٹواری کا کام فی نفسہ جائز ہے، البتہ رشوت وغیرہ کے ناجائز ذرائع استعمال کرنا حرام ہے، لہذا اس علاقے میں پٹواری کا نظام نافذ کرنے میں کوئی حرج نہیں، اور جب حکومت اسے نافذ کرنا چاہتی ہے تو اس جائز اقدام میں اس کی اطاعت ضروری ہے، اور اس کے خلاف جنگ کرنا ہرگز جائز نہیں ہے، جو لوگ حکومت کی مخالفت کرتے ہوئے مریں گے وہ شہید نہیں ہوں گے، لہذا ضروری ہے کہ لوگوں نے اس نظام کے خلاف جو معاہدہ کیا ہے اس کی پابندی نہ کریں، پھر اگر انہوں نے مخالفت کرنے پر اللہ کی قسم بھی کھائی ہو تو اس قسم کا کفارہ ادا کریں، اور اس فعل سے باز آجائیں۔ اگر پٹواری کو قتل کر دیا تو قتل نفس کا گناہ کبیرہ ہوگا، جس کی سزا حسب تصریح قرآن مجید دخول جہنم ہے۔^(۱)

فقط واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۷/۱۲/۲۰ھ

(فتویٰ نمبر ۱۴۶۶/۱۸ الف)

الجواب صحیح

محمد عاشق الہی

کیا سودی معاملات کرنے کی بناء پر حکومت کی ہر ملازمت ناجائز ہے؟

سوال:- میرا ایک دوست کہتا ہے کہ آج کل کی حکومت غیر شرعی ہے، حکومت خود سودی کاروبار کرتی ہے اور سود کی رقم سے ہم کو تنخواہ ملتی ہے، لہذا ہماری تنخواہ بھی حرام ہوئی، شرعاً کیا یہ خیال درست ہے؟

جواب:- آپ کے دوست کا خیال علی الاطلاق درست نہیں، حکومت کی ہر ملازمت ناجائز

(۱) وفی سنن الترمذی ج: ۳ ص: ۶۲۳ (طبع دار احیاء التراث العربی، بیروت وفی طبع مکتبہ رحمانیہ ج: ۱ ص: ۳۸۰) لعن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الراشی والمرتشی. و أبی داؤد ج: ۳ ص: ۳۰۰ (طبع دار الفکر وفی طبع مکتبہ رحمانیہ ج: ۲ ص: ۶۰) وسنن ابن ماجہ ج: ۲ ص: ۷۷۵ (طبع دار الفکر، بیروت وفی طبع مکتبہ قدیمی ج: ۱ ص: ۱۶۷) وفی مجمع الزوائد ج: ۴ ص: ۱۹۹ (طبع دار الریان للتراث قاہرہ، دار الکتاب العربی، بیروت وفی طبع مکتبہ دار الفکر ص: ۳۵۹) الراشی والمرتشی فی النار.

(۲) وفی الدر المختار ج: ۲ ص: ۱۷۲ تجب طاعة الامام فیما لیس بمعصیة. وراجع للذلائل والتفصیل الی الدر المختار مطلب فی وجوب طاعة الامام ج: ۳ ص: ۲۶۳ (طبع سعید). نیز دیکھئے: امداد الفتاویٰ سوال نمبر ۳۹۳ ج: ۳ ص: ۴۰۲ (طبع مکتبہ دارالعلوم کراچی)۔

(۳) وفی تنویر الأبصار ج: ۳ ص: ۷۲۸ (طبع سعید) ومن حلف علی معصیة کعدم الکلام مع أبویہ أو قتل فلان الیوم وجب الحنث والتکفیر الخ.

وفی سنن النسائی باب من حلف علی یمین قرأی غیرہا خیراً ج: ۲ ص: ۱۳۳ (طبع مکتبہ الحسن) عن أبی موسیٰ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: ما علی الأرض یمین أحلف علیہا فأری غیرہا خیراً منه ألا آتیہ.

وفی کتاب الأصل (المبسوط للشیبانی) کتاب الأیمان ج: ۳ ص: ۱۹۰ قد بلغنا عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم أنه قال: من حلف علی یمین فأری غیرہا خیراً منه فلیأت الذی هو خیر ولیکفر عنه یمینہ.

(۴) "وَمَنْ يُقْتَلْ مُؤْمِنًا مُتَعَمِّدًا فِجْرًا وَهُوَ جَهَنَّمُ خِلْدًا فِيْهَا وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَلَعْنَهُ وَاعْدَلْ لَهُ عَذَابًا عَظِيْمًا" (سورة النساء آیت: ۹۳)۔

نہیں ہے، اور نہ ہر ملازمت کی تنخواہ حرام ہے، جس ملازمت میں کوئی غیر شرعی کام نہ کرنا پڑتا ہو یا براہ راست حرام آمدنی سے تنخواہ نہ دی جاتی ہو، وہ جائز ہے اور اس کی تنخواہ حلال ہے۔ واللہ اعلم

۱۳۹۷/۱/۶ھ

(فتویٰ نمبر ۵۸/۲۸ الف)

آغا خانوں کے عقائد اور ان کی سرگرمیوں کے پیش نظر

آغا خان فاؤنڈیشن کو دکان کرایہ پر دینے کا حکم

سوال:- کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین مندرجہ ذیل مسئلے میں: ایک شخص نے (جو کہ علم دین کی طرف منسوب بھی ہے) گلگت میں ایک عمارت برائے کرایہ تعمیر کرائی ہے، جو کہ ہوٹل کے قابل بھی ہے (یعنی کوئی ہوٹل بنانے کے لئے کرایہ پر لینا چاہے تو لے سکتا ہے)۔ آغا خان فاؤنڈیشن کا ادارہ اس عمارت کو اپنے دفاتر بنانے کے لئے کرایہ پر لینا چاہتا ہے، اس ادارے کو کرایہ پر دینا شرعی لحاظ سے جائز ہے یا نہیں؟ بینوا تو جروا۔

نوٹ:- آغا خان فاؤنڈیشن والا ادارہ (ARSP) تقریباً بارہ پندرہ سال سے قائم ہے، یہ ادارہ رفاہی کاموں کا ادارہ ہے، اس کے تحت اسکول، اسپتال اور گاڑیاں، ہیلی کوپٹر کام کرتے ہیں، پہاڑی علاقوں میں سنگین مریضوں کو عندالضرورت ہیلی کوپٹر کے ذریعے گلگت اسپتال لایا جاتا ہے، ورنہ عام مریضوں کو لانے کے لئے گاڑیوں کا انتظام ہے۔

اس کے علاوہ دوسرے رفاہی کام بھی یہ ادارہ اپنے خرچے پر کراتا ہے، مثلاً کہیں راستے کی ضرورت ہے یا نہر کی یا ٹینکی کی، تو یہ ادارہ اپنے اصول و شرائط کے مطابق وہ کام کراتا ہے، اس ادارے میں ملازمین کا تعلق کسی خاص مذہب سے نہیں بلکہ قابلیت کی بناء پر وہ ملازمتیں دیتے ہیں، نیز اس ادارے کے تحت ادارے کے فائدے کے لئے اقتصادی پروگرام بھی ہوتے ہیں، مثلاً شہد (عسل) کا انتاج، گلگت کے فروٹ کو جدید ترین انداز میں پیکنگ کر کے برآمد کرنا یا پاکستان کے بڑے شہروں میں فروخت کرنا وغیرہ وغیرہ۔ ادارے کا کہنا یہ ہے کہ یہ ایک عالمی فنڈ ہے جو کہ غریب علاقوں کے لئے ہے، اس میں اسلامی ممالک کا بھی چندہ ہے، آغا خان کی حیثیت چیئرمین کی ہے، باوثوق ذرائع بلکہ متواتر طریقے سے ثابت ہے کہ نواز شریف نے اپنی سابقہ وزارت عظمیٰ کے زمانے میں گلگت کے علاقے کے لئے پانچ کروڑ کی امداد دی تھی جو کہ اس ادارے کے ذریعے وہ گلگت کے ترقیاتی کاموں

میں خرچ کی گئی ہے، وہ یہ رقم گلگت کے حکومت (یعنی کمشنر) کے ذریعے خرچ کر سکتا تھا، مگر ان کو اس ادارے پر اعتماد کی وجہ سے اس ادارے کے ذریعے اپنی اس امداد کو گلگت میں استعمال کرایا۔

مزید معلومات کے لئے عرض ہے کہ داریل (داریل خالص سنیوں کا علاقہ ہے، اس میں شیعہ اور آغا خانوں کا نام و نشان نہیں ہے) کے علماء اس ادارے کے مخالفت میں شروع میں سختی کرتے تھے جب ان کو یہ معلوم ہوا کہ یہ عالمی فنڈ ہے، آغا خان اپنی جیب سے نہیں دیتا ہے، اور داریل والے اپنے علاقے کے لئے مخصوص کی ہوئی رقم نہیں لیتے ہیں تو یہ رقم آغا خانوں کے علاقے میں خرچ ہوتی ہے، جب سے ان کو یہ معلوم ہوا ہے اس وقت سے انہوں نے ایک کمیٹی مقرر کی ہے، جو کہ سال کے شروع ہی میں داریل کے ترقیاتی کاموں کی رقم (جو کہ فاؤنڈیشن کی طرف سے مخصوص ہے) پیسہ پیسہ کر کے وصول کر کے اپنی زیر نگرانی اپنے علاقے میں خرچ کرتے ہیں، اور پھر آغا خان فاؤنڈیشن کے ادارے کو حساب دیتے ہیں کہ ہم نے جو رقم لی تھی اس کو مندرجہ ذیل طریقے سے خرچ کیا۔

دس پندرہ سالوں میں ادارے نے جو عمارتیں کرایہ پر لی ہیں، انتہائی صاف ستھری رکھی ہیں، اس خوبی کی بناء پر اکثر لوگ ان کو کرایہ پر دینے کی تمنا کرتے ہیں، مذکورہ عمارت کا مالک اسی ادارے کو دینے کی تمنا میں تو نہیں، البتہ اس کے بعض رشتہ دار کافی حد تک مصر ہیں، اور وہاں کے بعض علماء سے جواز کا اشارہ ملنے پر مصر ہیں، اس وجہ سے مالک عمارت شرعی لحاظ سے جواز یا عدم جواز کے فتویٰ کا منتظر ہے، تاکہ دینے نہ دینے کے بارے میں فیصلہ کیا جاسکے۔

وصلی اللہ وسلم علی سیدنا محمد وآلہ وصحبہ وسلم

از طرف عبدالقیوم حال مکہ مکرمہ

جواب:- اگرچہ کسی غیر مسلم کو کوئی عمارت کسی جائز مقصد کے لئے کرایہ پر دینا فی نفسہ جائز ہے،^(۱) بالخصوص جبکہ وہ رفاہی کاموں کے لئے ہو، لیکن مندرجہ ذیل باتیں ذہن میں رکھنی ضروری ہیں:-

(۱) وفي الهندية كتاب الاجارة ج: ۴ ص: ۴۵۰ (طبع ماجدية) واذا استأجر الذمی من المسلم داراً يسكنها فلا بأس بذلك، وان شرب فيها الخمر أو عبد فيها الصنم، أو أدخل فيها الخنازير ولم يلحق المسلم في ذلك بأس لأن المسلم لا يؤجرها لذلك إنما أجرها للسكنى، كذا في المحيط.

قال العلامة سراج الدين رحمه الله: أجرة بيتاً ليتخذ فيه بيت نار أو بيعه أو كنيسة أو يباع فيه الخمر لا بأس به عند أبي حنيفة خلافاً لهما (فتاوى سراجية على هامش قاضی خان، كتاب الاجارة ج: ۴ ص: ۲۴۱).

ومثله في خلاصة الفتاوى كتاب الاجارات ج: ۳ ص: ۱۴۹.

وفي الهندية ج: ۴ ص: ۴۴۹ (طبع ماجدية) اذا استأجر الذمی من المسلم بيتاً لبيع فيه الخمر جاز عند أبي حنيفة خلافاً لهما.

وفيها أيضاً ج: ۴ ص: ۴۵۰ لو استأجر الذمی مسلماً ليبنى له بيعة أو كنيسة جاز.

۱:- وہ غیر مسلم جو اپنے غیر مسلم ہونے کا اعتراف کئے بغیر اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کرے، اُس کا معاملہ دوسرے غیر مسلموں سے زیادہ شدید ہے، اس کے ساتھ مستقل نوعیت کے تعلقات قائم کرنا درست نہیں۔

۲:- اگر غیر مسلم عمارت کو رفاہی کام کے لئے استعمال کرے، لیکن اس رفاہی کام کے پیچھے اپنے عقائد کی نشر و اشاعت مقصود ہو، تاکہ ضرورت مند مسلمان اپنی ضروریات پوری ہوتے دیکھ کر اس غیر مسلم کے مذہب کی طرف مائل ہوں، تو ایسے غیر مسلم کو کرایہ پر دینا جائز نہیں۔ بالخصوص جبکہ وہ اپنے کو مسلمان ظاہر کر کے یہ کام کر رہا ہو تو اس کا خطرہ اور زیادہ بڑھ جاتا ہے کہ اس کے عقائد کو ناواقف مسلمان اسلام کا حصہ سمجھنے لگیں گے۔

۳:- آغا خانی فرقہ باتفاقِ مسلمین دائرۃ اسلام سے خارج ہے^(۱)، مگر وہ اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کرتا ہے، لہذا اس کا معاملہ اُن غیر مسلموں سے زیادہ سخت ہے جو کھلے طور پر اپنے آپ کو غیر مسلم ظاہر کرتے ہیں۔

ان تین امور کو مد نظر رکھتے ہوئے ”آغا خان فاؤنڈیشن“ اگر آغا خانیوں کی قائم کی ہوئی ہے، اور وہی اس کو چلا رہے ہیں، خواہ ملازم کے طور پر مسلمان بھی کام کرتے ہوں، اور وہ اس فاؤنڈیشن کے ذریعے مسلمانوں میں گمراہی پھیلانے کا ذریعہ بھی بن رہے ہیں، جیسا کہ وہاں کے متعدد علماء سے معلوم ہوا ہے، تو ان کو عمارت کرایہ پر دینا جائز نہیں۔

واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

محمد تقی عثمانی

۱۴۱۸/۱/۲۴ھ

(فتویٰ نمبر ۳۶/۲۶۵)

الجواب صحیح

سبحان محمود

الجواب صحیح

محمد رفیع عثمانی عفی عنہ

۱۴۱۸/۱/۲۵ھ

محکمہ پولیس اور شراب کی کمپنی میں ملازمت کا حکم

سوال:- ایک شخص جو کہ پہلے پولیس میں ملازم تھا، اور اب ایک شراب کی کمپنی میں ملازم

ہے، کیا اُس کی روزی حلال ہے؟ اور اس کے اہل و عیال پر کیا واجب ہوتا ہے؟

جواب:- اگر رشوت اور دوسرے ناجائز ذرائع آمدنی سے اجتناب کیا جائے تو پولیس کی

(۱) تفصیل کے لئے امداد الفتاویٰ ج: ۶ ص: ۱۰۴ تا ۱۰۶ ملاحظہ فرمائیں۔

ملازمت تو جائز ہے، البتہ شراب تیار کرنے، یا بیچنے والی فرم کی ملازمت حرام ہے،^(۱) اور آمدنی بھی حرام ہے،^(۲) ایسے شخص کے اہل و عیال کو چاہئے کہ وہ اُسے جائز آمدنی کے ذرائع اختیار کرنے پر مجبور کریں۔

واللہ اعلم

۱۳۹۷/۶/۱۹ھ

(فتویٰ نمبر ۶۲۵/۲۸ ب)

۱:- مدرسینِ ایامِ تعطیلات کی تنخواہ کے حق دار ہیں یا نہیں؟

۲:- مدرسین کو خارجی اوقات میں کسی دوسرے کام سے روکنا

۳:- پیشگی اطلاع نہ دینے کی صورت میں مدرس سے

ایک ماہ کی تنخواہ کاٹنے کا حکم

(وضاحت از مرتب)

مذکورہ تین مسائل سے متعلق حضرت مولانا مفتی عبدالشکور ترمذی صاحب رحمہ اللہ نے ایک استفتاء اپنی رائے کے ساتھ حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم کی رائے معلوم کرنے کے لئے ارسال فرمایا، جن کے جواب میں اولاً حضرت مولانا مفتی محمود اشرف عثمانی صاحب مدظلہم نے مفصل فتویٰ تحریر فرمایا، اور دارالافتاء دارالعلوم کراچی کے حضرت مولانا مفتی عبدالرؤف سکھری صاحب مدظلہم اور حضرت مولانا مفتی عبدالمنان صاحب مدظلہم نے اپنی رائے تحریر فرمائی۔ جس کے بعد یہ تمام تحریرات اُستازِ محترم شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم کی خدمت میں پیش کی گئیں، جس پر آخر میں حضرت والا دامت برکاتہم نے اپنا فتویٰ تحریر فرمایا۔ یہ تمام تحریرات اور آخر میں حضرت والا دامت برکاتہم کا فتویٰ ذیل میں پیش کیا جا رہا ہے۔ (محمد زبیر حق نواز)

استفتاء ورائے گرامی از

حضرت مولانا مفتی عبدالشکور ترمذی رحمہ اللہ

سوال:- عزیز محترم مولانا محمد تقی عثمانی سلمہم وعافاہم، السلام علیکم ورحمۃ اللہ

(۱) قال العلامة طاهر بن عبدالرشيد البخاري: ولا يجوز الاستيجار على شيء من الغناء والنوح والمزامير. (خلاصة الفتاوى ج: ۳ ص: ۱۱۶ کتاب الاجارات).

قال العلامة المرغيناني: ولا يجوز الاستيجار على الغناء والنوح وكذا سائر الملاهي لأنه استيجار على المعصية، والمعصية لا تستحق بالعقد. (الهداية ج: ۳ ص: ۳۰۶ طبع مكتبة رحمانية) باب الاجارة الفاسدة. ومثله في رد المحتار (ج: ۶ ص: ۵۵ باب الاجارة الفاسدة).

وفي الهندية ج: ۴ ص: ۴۱۱ ومنها أي من شرائط صحة الاجارة أن يكون مقدور الاستيفاء حقيقة أو شرعاً فلا يجوز استيجار الآبق ولا الاستيجار على المعاصي لأنه استيجار على منفعة غير مقدور الاستيفاء شرعاً.

وفيها أيضاً ج: ۴ ص: ۴۳۹ لا تجوز الاجارة على شيء من الغناء والنوح والمزامير والطبل.... الخ. وكذا في البدائع ج: ۴ ص: ۱۸۹.

امید ہے کہ آپ مع متعلقین بخیریت ہوں گے۔

جامعہ خیر المدارس کے جلسہ شوریٰ میں ماہ رمضان المبارک کی تنخواہ کے مدرس کے لئے استحقاق کا ذکر آیا تھا، فتاویٰ خلیہ میں کئی اکابر کے جوابات اس سلسلے میں موجود ہیں، ان سب پر حضرت اقدس مولانا خلیل احمد صاحب قدس سرہ کا محکمہ بھی درج ہے کہ:-

”میری رائے یہ ہے کہ مدرسین کا معاملہ مدرسے کے ساتھ عقدِ اجارہ ہے، اور مدرسین اجیر خاص ہیں، کیونکہ وقت کے پابند ہیں، تعطیل کا زمانہ ملازمت کا زمانہ ہے کہ اس میں عقدِ اجارہ باقی ہے، عقد قطع نہیں ہوا، مگر تنخواہ کے متعلق ایک شرط لگی ہوئی ہے کہ رمضان المبارک کی تنخواہ کا استحقاق اس وقت ہوگا جبکہ ابتدائے شوال میں حاضر ہوں، شرعاً شرط کے خلاف مقتضائے عقدِ اجارہ کے لئے مفسد ہوتی ہے، لہذا عقدِ اجارہ فاسد ہوا، اور فسادِ عقد کی صورت میں اجیر مستحقِ اجرِ مسمی نہیں ہوتا بلکہ اجرِ مثل کا مستحق ہوتا ہے، لہذا صورتِ موجودہ میں وہ مدرس تنخواہ کا مستحق نہ ہوگا، بلکہ اجرِ مثل کا مستحق ہوگا، اور اگر اس کو شرط فی العقد نہ قرار دیا جائے بلکہ خارج عقد کہا جائے یا شرطِ معروف قرار دی جائے تو ان سب صورتوں میں مدرس واقعہ متنازع فیہ میں پوری تنخواہ کا مستحق ہوگا۔ اور احتمالات اور اختلاف حکم صرف رمضان المبارک (میں) ہے اور ایامِ شوال میں جب مدرس اپنے کارِ منصبی پر مامور ہے تو اپنی تنخواہ کا ضرور مستحق ہوگا، فقط خلیل احمد عفی عنہ ۱۰/رج ۱، ۱۳۳۸ھ۔“ (فتاویٰ خلیہ ج ۱: ص ۲۳۸)۔

اس پر آپ غور کر لیں پھر جو رائے قائم ہو، مطلع کریں۔

فہم ناقص میں تو یہ آتا ہے کہ ابتدائے شوال میں آنے کی شرط کو ہی حذف کر دیا جائے اور بہر صورت مدرس کو رمضان المبارک کی تنخواہ کا مستحق قرار دیا جائے، کیونکہ عقدِ اجارہ قائم ہے، یہ شرط لگا کر عقدِ اجارہ کو کیوں فاسد کیا جائے؟

۲:- ”مدرسین اجیر خاص ہیں، کیونکہ وقت کے پابند ہیں“ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وقتِ اجارہ کے بعد وہ اجیر نہیں ہے، اس کو دوسرے کسی کام سے نہیں روکا جاسکتا، اجیر خاص کے یہ معنی نہیں ہیں کہ وہ چوبیس گھنٹے کا ملازم ہے اور کارِ منصبی کے علاوہ تمام امور سے ممنوع ہے۔

اس لئے کسی مدرس کو دوسرے کام کرنے سے روکنا عقدِ اجارہ کے خلاف ہوگا۔ رہا یہ کہ دوسری جگہ کام کرنے سے کارِ منصبی میں فرق آتا ہے، تو اس کا تدارک نہ ہو سکے عقدِ اجارہ کو فسخ کرنے کا اختیار مہتمم مدرسہ کو حاصل ہے، فقط واللہ اعلم۔

آپ کو وقت نہیں ملتا اس لئے محکمہ کی مختصر نقل کر کے بھیج رہا ہوں، ورنہ یہ ساری بحث قابلِ

ملاحظہ ہے۔

باقی دُعاؤں کا محتاج ہوں، امراضِ قلب کی وجہ سے کام نہیں ہوتا، آپ کے لئے اور سب اہل خانہ کے لئے دُعا گو ہوں، والسلام۔
سیّد عبدالشکور ترمذی عفی عنہ

اضافہ:- ایک ماہ پہلے اطلاع نہ دینے کی صورت میں مدرّس سے ایک ماہ کی تنخواہ واپس لینے کی بات بھی سمجھ میں نہیں آتی، جب مدرّس نے کام کیا ہے اُجرت کا مستحق ہو گیا، اب اس کی واپسی اس کے ذمے کیوں ہو؟ اسی طرح مدرّس سے والے ایک ماہ کی مزید تنخواہ دینے کے کیوں مکلف ہیں؟ جب اس نے اس ماہ میں کام ہی نہیں کیا تو اُجرت کس چیز کی؟ اجارہ کے اصول پر غور مطلوب ہے۔

سیّد عبدالشکور ترمذی عفی عنہ

۱۹۹۷/۵/۵ء

(جواب از حضرت مولانا مفتی محمود اشرف صاحب مدظلہم العالی)

بعد الحمد والصلوة

احقر نے حضرت مفتی عبدالشکور ترمذی صاحب مدظلہم و دام مجدہم کی تحریر پڑھی، اکابر کے سامنے نااہل اصاغر کی رائے کیا وقعت رکھتی ہے، مگر امتثالاً للامر عرض ہے کہ احقر ناچیز کی رائے میں ابتدائے شوال میں آنے کی شرط پر ماہِ رمضان (ایامِ بطالت و استراحت) کی تنخواہ کو مشروط کرنا اب مفسدِ عقد نہیں، کیونکہ اب یہ شرط معروف ہو چکی ہے، اور خود شیخ الحدیث حضرت سہارن پوری قدس سرہ نے ”فتاویٰ خلیلیہ“ میں اپنے محاکمے میں اس امر کی تصریح فرمائی ہے کہ:

شرط معروف قرار دی جائے تو ان سب صورتوں میں مدرّس واقعہ متنازعہ فیہ میں

پوری تنخواہ کا مستحق ہوگا۔
(فتاویٰ خلیلیہ ج: ۱ ص: ۲۳۸)^(۱)

اس شرط کا معروف ہونا کئی وجوہات سے واضح ہے، جو درج ذیل ہیں:-

الف:- مدارسِ دینیہ میں اس شرط کا معروف ہو جانا محتاجِ بیان نہیں کہ تقریباً سب مدارس اس

پر عمل پیرا ہیں۔

ب:- یہ شرط معروف عند الفقہاء بھی ہے کیونکہ ایامِ بطالت کی تنخواہ کا استحقاق اسی لئے ہے کہ

استراحت کے بعد دوبارہ زیادہ نشاط کے ساتھ کام کر سکے، اگر ایامِ بطالت کے بعد کام کرنے کا ارادہ

ہی نہیں تو ایامِ بطالت کی تنخواہ کا استحقاق کیسے ہوگا؟

ج:- یہ شرط مالِ وقف کی حفاظت اور اسے صحیح تر مصرف پر خرچ کرنے کے بھی عین مطابق

ہے، اس لئے کہ مدارس میں زکوٰۃ و عطیات کی رقم معطین یا طلباء کی امانت ہے، اس امانت میں احتیاط کا

تقاضا یہ ہے کہ یہ رقم کسی کو بلا عمل یا بلا عوض نہ دی جائے، لہذا یا عمل موجود ہونا چاہئے (جیسا کہ ایام عمل میں) یا مظنون ہونا چاہئے (جیسا کہ ایام استراحت میں جبکہ آئندہ کام کرنے کا ارادہ ہو) ورنہ اجرت کا جواز محل نظر ہوگا۔

اگر یہ کہا جائے کہ ایام بطلت کی تنخواہ ماضی کے عمل کی وجہ سے ہے تو اس پر یہ شبہ ہے کہ ماضی کی خدمت کی بنیاد پر ایام بطلت کی اجرت جبکہ مستقبل میں کام کرنے کا بھی ارادہ نہ ہو، عطیہ اور ہبہ سے زیادہ شبہ ہے، اور مہتمم یا صدر کو اس طرح کے عطیہ کی اجازت محل شبہ ضرور ہے۔

د:- یہاں یہ بات بھی قابل توجہ معلوم ہوتی ہے کہ اگر شوال میں آنے کی شرط کو مفسد عقد قرار دے کر مہتمم کے لئے یہ شرط لگانا ناجائز قرار دیا جائے تو کیا مدرس کے لئے ایام بطلت میں عدم عمل کی شرط لگانا مفسد نہ ہوگا؟ جبکہ اجرت کے استحقاق کے لئے اجیر خاص میں عمل ورنہ تسلیم نفس ضرور ہے، ادھر مدارس میں یہ عرف ہے کہ مدرس ایام بطلت میں نہ عمل کرتا ہے اور نہ تسلیم نفس پر راضی ہوتا ہے، بلکہ بعض مدارس میں اگر اسے مجبور کر کے ایام بطلت میں کام پر مامور کیا جائے تو اضافی تنخواہ دی جاتی ہے ورنہ انعام کے نام سے اس کی دلجوئی کی جاتی ہے۔ گویا معاہدہ ملازمت میں اب یہ بات - تحریراً ورنہ عرفاً و عملاً - مشروط ہے کہ ملازم ایام بطلت میں (جو دو ماہ طویل ہوتی ہیں) نہ عمل کرے گا اور نہ تسلیم نفس کرے گا، اور اس کے باوجود عقد فاسد قرار نہیں دیا جاتا۔

لہذا اگر مدرسین کی طرف سے ایام بطلت میں عدم عمل اور عدم تسلیم نفس کی شرط مفسد عقد نہیں (حالانکہ اجرت بطلت کی وصولی مال وقف سے ہوگی) کیونکہ اب یہ شرط معروف ہو چکی ہے تو مہتمم کی طرف سے آئندہ سال کام کرنے کی بنیاد پر رمضان کی تنخواہ کے استحقاق کی شرط بھی مفسد عقد نہیں ہونی چاہئے، واللہ سبحانہ اعلم۔

۲:- اس سلسلے میں احقر (عفا اللہ عنہ وعافاہ) کی بھی رائے یہ ہے کہ مدرس کو اوقات کار (اوقات اجارہ) کے بعد اپنا پابند بنانا شرط فاسد ہے، اسی طرح اوقات کار چھ یا آٹھ گھنٹوں کے بجائے چوبیس گھنٹے متعین کر کے ملازم کو مسلسل دن رات کا پابند بنانا شرط فاسد ہے، اور اس میں کئی طرح کی قباحتیں ہیں۔

الف:- ملازم اور غلام میں کام اور وقت کے متعین ہونے اور نہ ہونے ہی کا فرق ہے، اور پابندی کی یہ شرط شبہ بالاجارہ نہیں، البتہ اگر یہ اجارہ نہ ہوتا بلکہ نفقہ ہوتا تو شاید اس کی گنجائش ہوتی کیونکہ زوجہ کسی وقت اطاعت بعل سے انکار نہیں کر سکتی (إلا لعذر شرعی) اور امیر المؤمنین بھی کسی

وقت مصالح المؤمنین سے انماض نہیں کر سکتا، مگر فی الوقت مدارس میں اجارہ بلکہ اجارہ محضہ کی صورت رائج ہے۔

ب:- یہ وہ شرط ہے جس پر عمل کرنا مشکل بلکہ تقریباً ناممکن ہو جاتا ہے، لہذا اس شرط کو تسلیم کرنا اور کرانا گناہ میں مبتلا ہونا اور گناہ میں مبتلا کرنا ہے۔

ج:- یہ سلف صالحین کے تعامل کے خلاف ہے، دارالعلوم دیوبند، مظاہر العلوم سہارن پور اور تھانہ بھون میں اس کے خلاف ہی تعامل رہا ہے، اور مدرّسین فارغ اوقات کو اپنے جملہ مشاغل حتیٰ کہ کاروباری مصروفیات میں صرف کرتے رہے ہیں، اکابر کے واقعات اس پر شاہد ہیں، بلکہ یہ مصروفیات اسلامی معاشرے میں علماء کی شمولیت اور برکت کی حامل رہی ہیں۔

د:- یہ شرط بظاہر مفسد اجارہ بھی ہے کیونکہ متقضائے عقد اجارہ کے خلاف بھی ہے اور غیر معروف بھی بلکہ غیر معمول بھی، البتہ چونکہ اس شرط پر عمل کرنا چونکہ ناممکن ورنہ مشکل ضرور ہے اس لئے اگر اس شرط کو فاسد قرار دے کر اجارہ کو صحیح قرار دیا جائے تو بھی کچھ بعید نہیں۔

ه:- علامہ شامی کی عبارت سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ مدرّس اجارہ کو اوقات کار کے بعد طلب معاش کی اجازت ہونی چاہئے کیونکہ انہوں نے ساکنین مدرسہ کو جن کا وظیفہ اور نفقہ وقف کی طرف سے متعین ہو طلب معاش کے لئے سفر کی اجازت دی ہے، اور اسے عذر شرعی قرار دیا ہے، اور اس سفر کی بناء پر اس کا وظیفہ متعینہ ساقط نہ ہونے کا حکم ذکر کیا ہے، علامہ شامی کی عبارت درج ذیل ہے:-

(قوله ونظم ابن شحنه الغيبة) أقول حاصل ما فی شرحه تبعاً للبزازیة انه اذا غاب عن المدرسة فاما أن يخرج من المصر أو لا فان خرج مسيرة سفر ثم رجع ليس له طلب ما مضى من معلومه بل يسقط وكذا لو سافر لحج ونحوه وان لم يخرج لسفر بأن خرج الى الرستاق فان أقام خمسة عشر يوماً فأكثر فان بلا عذر كالخروج للتنزه فكذلك وان لعذر كطلب المعاش فهو عفو إلا أن تزيد غيبته على ثلاثة أشهر فلغيره أخذ حجرته ووظيفته أي معلومه، وان لم يخرج من المصر فان اشتغل بكتابة علم شرعی فهو عفو وآلا جاز عزله أيضاً واختلف فيما اذا خرج للرستاق وأقام دون خمسة عشر يوماً لغير عذر فقيل يسقط وقيل لا، هذا حاصل ما ذكره ابن الشحنة فی شرحه.

وملخصه أنه لا يسقط معلومه الماضي ولا يعزل في الآتي: اذا كان في

المصر مشغلاً بعلم شرعی أو خرج لغير سفر وأقام دون خمسة عشر يوماً

بلا عذر علی أحد القولین، أو خمسة عشر فأكثر لكن لعذر شرعی كطلب

المعاش ولم یزد علی ثلاثة أشهر. (رد المحتار ج: ۴ ص: ۴۱۸) ^(۱)

شامی کی اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ سال میں تین ماہ یعنی ربع سے کم کم طلبِ معاش کی اجازت ہے، اگرچہ اس کا وظیفہ بحیثیت ساکن مدرسہ طے شدہ اور جاری ہو، اور اس طلبِ معاش کی وجہ سے نہ اس کا وظیفہ ساقط ہوگا اور نہ وہ مستحقِ عزل ہوگا۔

اگرچہ علامہ شامی کی بیان کردہ یہ تفصیل ایک خاص صورت کے بارے میں ہے جس کی وضاحت خود علامہ شامی نے درج ذیل عبارت سے کی ہے:-

وهذا التفصیل المذكور فی الغیبة انما هو فیما اذا قال وقفت هذا علی

ساکنی مدرستی وأطلق، أما لو شرط شرطاً تبع كحضور الدرس أياما

معلومة فی کل جمعة فلا یستحق المعلوم الا من باشر خصوصاً اذا قال:

من غاب عن الدرس قطع معلومه فیجب اتباعه. ^(۲) (ج: ۴ ص: ۴۱۹) ^(۳)

لیکن علامہ شامی کی عبارت سے یہ امر ضرور واضح ہے کہ طلبِ معاش ایک عذرِ شرعی ہے اور مالِ وقف میں اس کی رعایت کا حکم ہے، تو مدارس میں اس عذرِ شرعی کی رعایت بطریقِ اولیٰ ہونی چاہئے۔ البتہ یہ امر بہر حال لازم ہے کہ مدرسِ اجارہ کے لئے طلبِ معاش کا یہ عمل محض ضمنی ہو، مقصودی نہ ہو، اور اس کی وجہ سے مدرس کے اوقاتِ اجارہ اور عملِ اجارہ میں کسی قسم کی اختیاری کوتاہی واقع نہ ہو۔

۳:- الف:- ایک ماہ پہلے اطلاع نہ دینے کی صورت میں مدرس سے ایک ماہ کی تنخواہ واپس لینے کی شرط کسی قاعدہ شرعیہ پر منطبق نظر نہیں آتی، کیونکہ مدرس اپنے عمل یا تسلیم نفس کی بناء پر اس اجرت کا مستحق ہو چکا تھا، اب اس اجرت کا استرداد ایک قسم کی تعزیرِ مالی ہے، اور معاہدہِ اجارہ میں اس تعزیرِ مالی کو لازم قرار دینا مفسدِ عقد ہونا چاہئے، اور حضرت گنگوہی قدس سرہ نے ”فتاویٰ رشیدیہ“ میں اس کے مفسد ہونے کی تصریح فرمائی ہے:-

سوال:- یہ شرط اگر چند روز پہلے نوکری کے اطلاع نہ دو گے تو اس قدر جرمانہ دینا

(۱) کتاب الوقف (طبع سعید) (ہامش رد المحتار علی الدر المختار کتاب الوقف ج: ۴ ص: ۴۱۸).

(۲) قلت یجب اتباع هذا الشرط لأن شرط الوقف کنص الشارع. ۱۲ (حاشیہ از حضرت مولانا محمود اشرف صاحب مدظلہم).

(۳) کتاب الوقف (طبع سعید).

ہوگا، متممات عقد سے ہے اور لازم؟

جواب:- اجارہ شرط فاسد سے فاسد ہو جاتا ہے، اور یہ شرط خلاف مقتضائے عقد کی ہے، لہذا عقد کو فاسد کر دیو گی، اس کا ذکر نہ کرنا چاہئے، تفسد الاجارۃ بالشروط المخالفة لمقتضى العقد، درمختار۔ اور یہ شرط ظاہر ہے کہ اجیر کو مفید اور مستاجر کو نافع اور عقد کے خلاف ہے۔ (تالیفات رشیدیہ ص: ۴۲۲) (۱)

البتہ مدرّس پر یہ شرط رکھی جاسکتی ہے کہ ملازمت ترک کرنے سے ایک ماہ پہلے اطلاع دینی ہوگی، ورنہ اطلاع کے بعد ایک ماہ تک اصلۃً یا نیابتاً کام کرنا لازم ہوگا۔

ب:- جہاں تک مدرسے کی طرف سے فی الفور اخراج پر ایک ماہ کی تنخواہ کی ادائیگی لازم ہونے کی شرط ہے، تو یہ شرط بھی بظاہر مفسدِ عقد ہے، البتہ مدرسے کی طرف سے تبرّع کی تاویل ہو سکتی ہے، لیکن یہ تبرّع بھی اسی وقت جائز ہوگا جبکہ معطین اور طلباء کی طرف سے اذن صراحۃً پایا جاتا ہو۔

البتہ اس مسئلے میں یہ پہلو قابلِ غور ہے کہ جس طرح مکان و دکان کے اجارہ غیر متعینہ میں یکم تاریخ کو اطلاع نہ دینے کی صورت میں آئندہ پورے ماہ کا اجارہ لازم ہو جاتا ہے، اسی طرح کیا یہاں بھی یکم تاریخ کو اطلاع نہ دینے کی صورت میں پورے ماہ کا اجارہ لازم نہ ہو جائے گا؟

فلیتأمل الأكابر والیہم المفاهیم ومنہم الأوامر

احقر محمود اشرف عثمانی غفر اللہ

۱۴۱۸/۳/۲۵ھ

(رائے مولانا مفتی عبدالمنان صاحب مدظلہم)

احقر نے حضرت مولانا مفتی محمود اشرف صاحب مدظلہم کی تحریر پر غور کیا، اس میں جو موقف اختیار کیا گیا ہے اصولی طور پر وہ درست ہے، اور اس سلسلے میں ”أحسن الفتاویٰ“ ج: ۷ ص: ۲۸۷ تا ۲۹۴ (۲) میں جو موقف اختیار کیا گیا ہے، وہ بھی قابلِ غور ہے، حضرات اکابر کو اس پر بھی غور کرنا چاہئے۔

اور احقر کی ایک تجویز یہ بھی ہے کہ مدارس کا عقدِ اجارہ عرف و رواج کے مطابق اگرچہ اجارہ مسانہہ ہے، تاہم اجارہ کے قواعد و ضوابط کے مطابق زیادہ بہتر صورت یہ ہے کہ عقدِ اجارہ کے وقت باضابطہ اس کی مدت طے کی جائے ایک سال کے لئے، اور پھر ہر سال اس کی تجدید کی جائے، اور مدرسے کو پورے سال کی تنخواہ دی جائے، یعنی ایامِ تعطیل کی تنخواہ بھی دی جائے۔ اس صورت میں اگر یہ

(۱) طبع ادارۃ اسلامیات۔

(۲) طبع ایچ ایم سعید۔

اشکال ہو کہ ایام تعطیل میں مدرس اپنے آپ کو تسلیم نہیں کرتا اور تدریس کے لئے حاضر نہیں ہوتا تو پھر تنخواہ کا استحقاق کیسے؟ تو اس کا جواب یہ ہو سکتا ہے کہ جیسے دورانِ تدریس جمعہ کے روز مدرس تدریس کے لئے حاضر نہیں ہوتا لیکن اس کا معاہدہ قائم ہونے کی وجہ سے یا راحت لینے اور تازہ دم ہونے کی وجہ سے اس کو تنخواہ دی جاتی ہے، اسی طرح ایامِ تعطیل یعنی اواخرِ شعبان اور رمضان کی تنخواہ اس کو ملنی چاہئے۔ البتہ اگر کسی مدرس کو رمضان کے بعد دوبارہ تدریس کے لئے حاضر ہونے کا ارادہ نہ ہو، اور اواخرِ شعبان ہی میں اس نے اس کا فیصلہ کر لیا ہو تو ایسی صورت میں دیانۃً اس کو اواخرِ شعبان اور رمضان کی تنخواہ نہیں لینی چاہئے کیونکہ یہاں یہ بات بالکل واضح ہے کہ اب راحت و آرام لینے کا فائدہ اس مدرس سے کو نہیں پہنچے گا۔

واللہ اعلم

محمد عبد المنان عفی عنہ

۱۴۱۸/۴/۲۲ھ

(رائے مفتی عبدالرؤف صاحب سکھروی مدظلہم)

احقر کو مذکورہ دونوں حضرات کی رائے درست معلوم ہوتی ہے، اور اس پر مزید اضافے کی ضرورت بھی محسوس نہیں ہوتی۔

بندہ عبدالرؤف سکھروی

۱۴۱۸/۶/۱۶ھ

(حضرت مولانا مفتی عبدالشکور ترمذی صاحب رحمہ اللہ کے مذکورہ استفتاء پر دارالافتاء جامعہ دارالعلوم کراچی کے حضرات مفتیان کرام نے اپنی مذکورہ آراء تحریر فرمائیں اور آخر میں اپنی آراء کے ساتھ حتمی فیصلے اور فتویٰ کے لئے یہ تحریر حضرت والا دامت برکاتہم کی خدمت میں بھیجی، جس پر حضرت والا دامت برکاتہم العالیہ نے فتویٰ تحریر فرمایا جو درج ذیل ہے)

(فتویٰ از حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم)

مخدوم مکرم حضرت مولانا مفتی عبدالشکور صاحب ترمذی مدظلہم العالی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

افسوس ہے کہ گرامی نامے کا جواب جلد نہیں دے سکا، مختلف اسفار و اشغال کے ازدحام نے اس قابل نہیں چھوڑا کہ اپنے اختیار اور انتخاب کے مطابق کسی مسئلے کی تحقیق کر سکوں۔ احقر نے یہ تحریر اپنے دارالافتاء میں بھجوا دی تھی، وہاں کے حضرات کی آراء منسلک ہیں، احقر کسی محاکمے کا اہل نہیں، لیکن تعمیلِ حکم میں جو بات سمجھ میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ شوال میں کام کرنے کو رمضان کی تعطیل کی تنخواہ کے لئے موقوف علیہ قرار دینا اور نہ قرار دینا دونوں امر جائز ہیں، موقوف علیہ قرار نہ دینے کا جواز واضح ہے، کیونکہ اس کا حاصل یہ ہے کہ عقدِ اجارہ میں ایک ماہ کی تنخواہ بلا عمل جو مقرر کی گئی، وہ گویا سارے سال کے

مجموعی عمل پر ایک اجرت اضافیہ ہے، جو معلوم ہے، اور فریقین کے اتفاق سے جائز ہے۔ اور موقوف علیہ قرار دینے کے جواز کی ایک وجہ تو وہی ہو سکتی ہے جس کی طرف حضرت مولانا خلیل احمد صاحب قدس سرہ کے جواب میں اشارہ موجود ہے کہ: ”یا شرط معروف قرار دی جائے... الخ“ اور جس پر مولانا محمود اشرف صاحب نے اپنی تحریر کی بنیاد رکھی ہے۔ اور دوسری وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ ایام بطلت کی تنخواہ تجدید عقد اجارہ کے لئے شرط قرار دی گئی ہے، یعنی اگر شوال میں آئندہ سال کے لئے عقد کی تجدید کی گئی تو ایام بطلت کی تنخواہ بھی دی جائے گی، ورنہ نہیں۔ گویا اس صورت میں عقد اجارہ شعبان پر ختم ہو گیا، شوال میں تجدید عقد کے وقت ایام بطلت کی تنخواہ اضافی طور پر شوال کے ساتھ دی گئی۔

بہر صورت! دونوں تخریجات کے مطابق یہ شرط درست ہے، اور حکیم الامت حضرت تھانوی قدس سرہ کا جواب بھی دو مرتبہ اسی کے مطابق فتاویٰ خلیلیہ (ج: ۱ ص: ۲۳۵ و ۲۳۷) میں موجود ہے۔^(۱)

البتہ ملازم پر یہ شرط عائد کرنا کہ وہ خارج اوقات میں کوئی معاشی کام نہ کرے، شرط فاسد ہے، ہاں مؤجر کو یہ حق ہے کہ وہ خارجی کام کی صورت میں ملازم کی تنخواہ کم مقرر کرے۔

نوٹس نہ دینے کی صورت میں ایک ماہ کی تنخواہ کا مطالبہ شاید اس بنیاد پر درست ہو کہ عقد اجارہ کی جو مدت طے ہوئی تھی اس کی پابندی فریقین پر لازم تھی، بلا عذر اسے توڑنے سے فریق ثانی کا جو نقصان ہوا، اگر اس کی تلافی کے لئے جانبین ایک ماہ کی تنخواہ کا مطالبہ طے کر لیں تو شاید ”لا ضرر ولا ضرار“^(۲) کے مطابق ہو، مگر یہ محض ایک احتمال کے درجے میں ہے جس پر مزید غور و تحقیق کی ضرورت معلوم ہوتی ہے۔

واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۱۸/۱۱/۵ھ

(فتویٰ نمبر ۳۰/۳۰)

کرایہ دار نے کرایہ کی دکان پر کمرہ اور غسل خانہ وغیرہ بنوایا ہو تو

اس کا خرچ کس پر ہے؟

سوال:- زید نے بکر سے ایک دکان مبلغ سات سو روپے ماہوار پانچ سال کے لئے کرایہ پر لی، اور پانچ سال کا کرایہ پیشگی ادا کر دیا، کچھ عرصہ بعد بکر کو تین ہزار روپے کی ضرورت پڑی، زید سے تین ہزار روپے قرض حسنہ لیا اور وعدہ کیا کہ ایک ماہ میں ادا کروں گا، مگر وعدے پر تین ہزار روپے نہیں

(۱) طبع مکتبۃ الشیخ کراچی۔

(۲) لا ضرر ولا ضرار. (سنن ابن ماجہ، باب من بنی فی حقہ ما یضرّ بجار. ص: ۲۹۶ طبع مکتبہ فاروقی).

دیئے اور کہا یہ روپے بھی کرایہ میں مجرہ کر لینا۔ دکان کی چھت تقریباً دو سال بعد دو تین جگہ سے ٹپکنے لگی، زید اپنے طور پر مرمت کراتا رہا، مگر جب زیادہ خراب ہو گئی تو بکر سے چھت بنوانے کے لئے کہا، بڑی مشکل سے بکر نے زید سے کہا کہ چھت بنوالو جو خرچہ ہوگا وہ تم اپنے پاس سے کرو، کرایہ میں مجرہ کرو۔ دکان پر ایک کمرہ بنا ہوا تھا جب چھت دوبارہ بنوائی تو اس کا توڑنا لازمی تھا، کمرہ توڑ دیا گیا، بکر کہنے لگا کہ: اگر کمرہ دکان کے اگلے حصے پر بنوالیں تو دکان کی شو ہو جائے گی، زید نے کہا کہ: مجھ کو اعتراض نہیں، جس حصے پر چاہو بنوادوں۔ کئی روز تک مختلف تجاویز ہوتی رہیں، آخر جواب بکر نے یہ دیا کہ: ہمیں کمرے کی ضرورت نہیں، تم اپنے خرچے سے بناؤ، میں خرچہ نہیں دوں گا۔ زید کو چونکہ بیوپاریوں کے لئے جگہ کی ضرورت تھی لہذا اس نے اپنے خرچے سے کمرہ اور پانچ خانہ اور غسل خانہ بنوالیا، اب جبکہ پانچ سال کرایہ کے اور کچھ مزید مدت خرچے کی پوری ہو گئی تو کیا زید کو یہ حق ہے کہ کمرہ اور غسل خانے اور پانچ خانے پر جو خرچ کیا ہے بکر سے وصول کرے یا نہیں؟

جواب:- صورتِ مسئلہ میں چونکہ زید نے کمرہ، غسل خانہ اور پانچ خانہ خود اپنی مرضی سے بنوایا ہے اور بکر نے اس سے صراحتاً یہ کہہ دیا تھا کہ: ”میں اس خرچ کا نہ خود ذمہ دار ہوں گا اور نہ اس خرچ کو کرایہ میں مجرا کیا جاسکے گا“ تو بکر کے ذمے اس کے اخراجات ادا کرنا نہیں ہے،^(۱) ہاں اگر بکر ادا کر دے تو اس کے لئے اچھا اور باعثِ اجر ہوگا۔

واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

۱۳۹۱/۵/۸ھ

(فتویٰ نمبر ۶۱۷/۲۲ ب)

معاہدے کی مدت ختم ہونے پر مکان خالی کرنا لازم ہے

سوال:- اردو اخبار ”جنگ“ جمعہ ایڈیشن مورخہ یکم مئی میں ”غصب کردہ مکان میں نماز“ کے عنوان سے ایک فتویٰ شائع ہوا ہے، جس کی ایک فوٹوکاپی مرسل ہے،^(۲) جناب کے دارالافتاء سے

(۱) وفي الدار المختار ج: ۶ ص: ۷۹ (طبع سعید) وعمارة الدار المستأجرة وتطيينها واصلاح الميزاب وما كان من البناء على رب الدار وكذا كل ما يخل بالسكنى.... واصلاح بئر الماء والبالوعة والمخرج على صاحب الدار لكن بلا جبر عليه لأنه لا يجبر على اصلاح ملكه فان فعله المستأجر فهو متبرع.

وفي الشامية تحته: (قوله فهو متبرع) أى ولا يحسب له من الأجرة. وفي شرح المجلة للأناسى رقم المادة: ۵۲۹ وان عمل هذه الأشياء المستأجر يكون متبرعاً فليس له أن يطالب الأجر بشيء مما أنفق على التعمير والترميم قال في رد المحتار: وليس له أن يحسبه من الأجرة.

(۲) ریکارڈ میں یہ فوٹوکاپی موجود نہیں ہے، تاہم حضرت والا دامت برکاتہم کے اس جواب سے اس تراشے میں موجود مسئلے کی وضاحت ہو جاتی ہے۔

ایک فتویٰ حاصل ہو جائے تو ارادہ ہے کہ اسے قانون سازی کے ذمہ دار حکومتی اداروں کو بھیجا جائے کہ وہ شرع کی روشنی میں قانونِ کرایہ داری میں ترمیم کر کے بہت سے جھگڑوں کو ختم کریں، اگر ضروری ہوا تو اس کی ایک نقل صدرِ محترم کو بھی بھیج دی جائے گی۔

جواب:- منسلک تراشے^(۱) میں جو مسئلہ بیان کیا گیا ہے وہ درست ہے، کرایہ دار کو صرف اُسی وقت تک قبضہ رکھنے کا حق ہے جب تک معاہدے کی مدت باقی ہو، اور مدت ختم ہونے پر جب مالک خالی کرنے کو کہے اس وقت خالی کرنا واجب ہے،^(۲) الا یہ کہ وہ معاہدے کی تجدید پر راضی ہو جائے۔^(۳)

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۱۳۰۱/۱۱/۲۳ھ

(فتویٰ نمبر ۶۷۷۶/۳۲ ج)



(۱) ریکارڈ میں یہ نوٹو کا پی موجود نہیں ہے، تاہم حضرت والا دامت برکاتہم کے اس جواب سے اس تراشے میں موجود مسئلے کی وضاحت ہو جاتی ہے۔

(۲) وفي الدر المختار كتاب الاجارة ج: ۶ ص: ۳۵ (طبع سعيد) آجر دارہ كل شهر بكذا فلكل الفسخ عند تمام الشهر. وفي تبیین الحقائق باب الاجارة الفاسدة ج: ۶ ص: ۱۱۲ (طبع دار الكتب العلمية، بيروت) ثم اذا تم الشهر كان لكل واحد منها نقض الاجارة لانتهاء العقد الصحيح الخ. وكذا في المبسوط للسرخسی ج: ۱۵ ص: ۱۳۶ (طبع مكتبة غفاريه كوئٹہ).

وفي الهندية ج: ۳ ص: ۴۲۸ كان الرد على المستأجر بعد انقضاء المدة ويضمن لو هلك قبل الرد لأنه غاصب اهـ. وفي المجلة لسليم رستم باز رقم المادة: ۵۹۶ ص: ۳۱۸ لو استعمل واحد ما لا بدون اذن صاحبه كان غاصباً فانما يلزمه ضمان المنفعة أي أجر المثل اذا لم يكن استعماله بتأويل ملك أو عقد الخ. وكذا في شرح المجلة للأناسی ص: ۲۹۷ (طبع مكتبة حبيبيه).

وفي البحوث في قضايا فقهية معاصرة ص: ۱۱۴ اذا كانت الاجارة لمدة معلومة استحق المستأجر البقاء عليها الى تلك المدة الخ.

(۳) وفي الهندية ج: ۳ ص: ۴۱۱ وأما شرائط الصحة (أي شرائط صحة الاجارة) فمنها رضا المتعاقدين الخ.

﴿فصل فی اجارۃ الأرض والأشجار والحيوان﴾

(زمین، حیوان اور درختوں کے اجارہ سے متعلق مسائل)

”احکار“ یعنی ہمیشہ کے لئے زمین کرایہ پر لینے کا حکم

اور تفصیلی شرائط

سوال:- ہمارے علاقے میں ایک قسم کا عقد مروّج ہے کہ ایک شخص دوسرے شخص کو زمین مکان بنانے کے لئے دیتا ہے، عقد ہی میں کرایہ مکان متعین کیا جاتا ہے، کرایہ غلے یا نقد کی صورت میں ہوتا ہے، اور سال کے ختم ہونے پر لیا جاتا ہے۔ لیکن عقد کے وقت مدت سکونت کا ذکر نہیں کیا جاتا ہے بلکہ یہ عرفاً قدیم زمانے سے متوارث چلی آرہی ہے کہ صاحب مکان ہمیشہ کے لئے اپنے گھر میں رہے گا، اس کی وفات کے بعد اس کے ورثاء پشت در پشت، الغرض مالک زمین اپنی حیات میں نہ تو مالک مکان کو گھر سے نکال سکتا ہے اور نہ ان کے ورثاء۔ اس طرح مالک زمین کی وفات کے بعد اس کے ورثاء بھی نہ تو مالک مکان کو نکال سکتے ہیں، اور نہ اس کے ورثاء۔ بس مالک زمین یا اس کے ورثاء صرف کرایہ لے سکتے ہیں، اور یہ عدم تعین مدت مفضی الی النزاع بھی نہیں ہے، کیونکہ عرف ایسا ہی ہے۔ پشتو میں اس عقد کو ”غولہ“ یعنی حریم کہا جاتا ہے، البتہ اگر خود مالک مکان، مکان کو چھوڑ دے تو اور بات ہے۔ ہمارے علماء حضرات اس عقد کو احکار میں داخل تصور کرتے ہیں اور اجارہ مؤبدہ کا نام بھی دیتے ہیں۔ اب امر مطلوب یہ ہے کہ ۱:- یہ عقد جائز ہے کہ نہیں؟ ۲:- یہ احکار ہے کہ نہیں؟ ۳:- صاحب زمین صاحب مکان کو یا اس کے ورثاء کو بلاوجہ مکان سے نکال سکتے ہیں کہ نہیں؟ ۴:- صاحب زمین کے ورثاء ایسا کر سکتے ہیں کہ نہیں؟ ۵:- اجارہ مؤبدہ کا نام کتب فقہ میں کہاں ذکر ہے؟

جواب:- اگر کرایہ داری کا عقد کرتے وقت مدت کا کوئی ذکر نہ کیا جائے تو اصل حکم یہ ہے

کہ اجارہ صحیح نہیں ہوتا،^(۱) یا اگر کوئی مجہول مدت مقرر کر لی جائے تو اس کا بھی یہی حکم ہے۔^(۲) لیکن اگر عقد ہی میں یہ بات طے کر لی جائے کہ کرایہ دار اس زمین پر ہمیشہ اپنا قبضہ برقرار رکھے گا اور مالک زمین کو کرایہ ادا کرتا رہے گا اور جب تک وہ زمین کی اجرت مثل ادا کرتا رہے اس وقت تک مالک کو زمین خالی کرانے کا حق نہیں ہوگا، تو اس کو بھی بعض فقہائے کرام نے جائز قرار دیا ہے، اور اسی کو اصطلاح میں ”احکاز“ (نہ کہ احتکار) کہا جاتا ہے۔ لیکن اس کے لئے ضروری ہے کہ ۱- مالک، عقد ہی کے وقت کرایہ دار کو پٹہ دوامی لکھ دے کہ یہ زمین ہمیشہ کے لئے کرایہ پر دی جا رہی ہے۔ ۲- کرایہ دار اس زمین میں کوئی تعمیر وغیرہ کر لے۔ ۳- معاہدے میں یہ بات بھی طے ہو کہ جب اُس جیسی زمینوں کا کرایہ بڑھے گا تو اس زمین کا بھی کرایہ اسی حساب سے بڑھ جائے گا۔ ۴- کرایہ دار پابندی سے کرایہ دیتا رہے گا۔ ۵- کرایہ دار تین سال تک زمین کو معطل نہ چھوڑے۔ یہ شرائط علامہ شامی نے رد المحتار میں ”مطلب مرصد ومشد مسکة“ کے عنوان کے تحت (ج: ۵ ص: ۲۱ و ۲۲)^(۳) نیز اپنے رسالے ”تحریر العبارة فیمن هو أحق بالاجارة“ میں بیان فرمائی ہیں (رسائل ابن عابدین ج: ۲ ص: ۱۵۴)۔ اور حضرت مفتی اعظم مولانا مفتی محمد شفیع صاحب نے ”جواہر الفقہ“ (ج: ۲ ص: ۳۰۳) میں اس مسئلے پر مفصل بحث فرمائی ہے، لہذا صورت مسئلہ میں اصل بات یہ ہے کہ یہ شرائط پائی جاتی ہیں یا نہیں؟ ہم چونکہ آپ کے علاقے کے عرف سے پوری طرح واقف نہیں ہیں، اس لئے کوئی حتمی بات کہنا مشکل ہے، لہذا آپ مقامی اہل افتاء علماء سے رجوع کر کے ان سے فیصلہ کرائیں کہ جو شرائط ”جواہر الفقہ“ میں تفصیل سے بیان کی گئی ہیں وہ یہاں موجود ہیں یا نہیں؟ اگر موجود ہوں تو یہ عقد جائز ہوگا، ورنہ نہیں۔

واللہ اعلم

۱۳۱۲/۱/۱۴ھ

(فتویٰ نمبر ۲۸۰/۵۹)

(۱ و ۲) وفي الدر المختار باب الاجارة الفاسدة ج: ۶ ص: ۲۶ و ۲۷ تفسد الاجارة بالشروط المخالفة لمقتضى العقد فكل ما أفسد البيع مما مرّ يفسدها كجهالة مأجور أو أجره أو مدة أو عمل الخ.

وفي خلاصة الفتاوى كتاب الاجارات ج: ۳ ص: ۱۰۳ (طبع رشيدية كوثه) عقد الاجارة لا يجوز الا أن يبين البدل من الجانبين جميعاً أما بيان المنفعة فباحدي معان ثلاثة بيان الوقت وهو الأجل الخ.

وفي الفتاوى الكاملية كتاب الاجارات مطلب تفسد الاجارة بجهالة الأجر ويفسد بها العقد سواء كانت الجهالة في الأجرة أو المدة أو العمل الخ. وكذا في البحر الرائق ج: ۸ ص: ۱۷.

وفي الهندية كتاب الاجارة ج: ۴ ص: ۴۱۱ (طبع رشيدية كوثه) وأما شرائط الصحة (صحة الاجارة) ومنها بيان المصلحة في الدور والمنازل والحوانيت الخ. وفيها أيضاً ج: ۴ ص: ۴۳۹ الفساد قد يكون لجهالة قدر العمل وقد يكون لجهالة قدر المنفعة بأن لا يبين المدة الخ.

وكذا في البرازية على الهندية ج: ۵ ص: ۱۱ كتاب الاجارات.

(۳) رد المحتار مطلب في المرصد والقيمة ومشد المسكة ج: ۶ ص: ۲۶ و ۲۷ (طبع سعيد).

”اجارۃ اشجار“ درختوں کے اجارہ کی شرعی حیثیت اور جواز کا حیلہ

سوال:- کیا درختوں کا اجارہ یعنی درختوں کو کرایہ پر دینا جائز ہے؟ سنا ہے کہ فتاویٰ رشیدیہ میں اسے جائز قرار دیا گیا ہے، اس کی حقیقت کیا ہے؟ نیز اگر ناجائز ہے تو متبادل طریقہ کار سے بھی آگاہ فرمائیں۔

جواب:- درختوں کے اجارہ کو تمام فقہاء نے ناجائز لکھا ہے، چنانچہ علامہ خیر الدین ربیع فرماتے ہیں: ”استأجر بقرة لی شرب لبنها لا ینعقد، وكذلك لو استأجر بستاناً لیأکل ثمره.“ (فتاویٰ خیریہ ج: ۲ ص: ۱۲۸) ^(۱) والمسئله مصرح بها فی منح الغفار و کثیر من الکتب و فی الاجارة المذكورة أمور أخر توجب فسادها خصوصاً عندنا کالشیوع و طول المدة فی الوقف۔

اس کے علاوہ اور بہت سی کتب فقہ میں یہ مسئلہ بتصریح موجود ہے، حتیٰ کہ ”فتاویٰ رشیدیہ“ جس کا حوالہ دے کر استفتاء میں یہ کہا گیا ہے کہ اجارۃ اشجار جائز ہے، خود اس میں بھی پوری تصریح کے ساتھ جواز کے بجائے عدم جواز کا فتویٰ موجود ہے، مولانا رحمہ اللہ فرماتے ہیں:-

درخت کا اجارہ درست نہیں کیونکہ اجارہ منافع کا ہوتا ہے اعیان و زوائد کی بیع ہوتی ہے..... الخ۔ (فتاویٰ رشیدیہ، کامل مبوب ص: ۴۴۷) ^(۲)

اور اسی پر حضرت مولانا تھانوی قدس سرہ نے فتویٰ دیا ہے (امداد ج: ۳ ص: ۱۲۸) ^(۳)۔

لیکن اس سلسلے میں فقہاء نے جواز کا ایک حیلہ بھی بیان فرمایا ہے کہ پہلے مالک درختوں کو مساقاۃ (بٹائی) پر اس شرح سے دیدے کہ ایک ہزار میں سے ایک حصہ مالک کا، اور باقی تمام حصے مساقی لے، اور اس کے بعد اسی شخص کو وہ زمین کرایہ پر دیدے، اور اس کی شرح میں مثلی اجرت پر اتنا اضافہ کر دے کہ جتنا عقد مساقاۃ میں کم کیا تھا۔ شرط یہ ہے کہ زمین قابل زراعت ہو، نیز یہ حیلہ اس وقت صحیح ہو سکتا ہے جبکہ یہ زمین اور درخت مال وقف یا مال یتیم میں سے نہ ہوں، چنانچہ اگر کسی نے مال وقف یا مال یتیم میں یہ حیلہ جاری کر دیا تو دونوں عقد باطل ہو جائیں گے، مساقاۃ تو اس لئے کہ اس میں یتیم و وقف کا ضرر ہے، اور اجارہ اس لئے کہ وہ مساقاۃ کے بطلان کے بعد کیا گیا تو گویا ارض مشغول پر اجارہ منعقد ہوا، اور وہ باطل ہوتا ہے، اور اسی لئے حیلے میں عقد مساقاۃ کو مقدم کرنے کی شرط لگائی گئی

(۱) الفتاویٰ الخیریة علی تنقیح الفتاویٰ الحامدیة ج: ۲ ص: ۲۰۳ (طبع مکتبہ حبیبیہ کوئٹہ)۔

(۲) ص: ۵۱۵ (طبع سعید)۔

(۳) ج: ۳ ص: ۳۸۷۔

ہے کہ اگر معاملہ بالعکس کر دیا تو اجارۃ زمین باطل ہو جائے گا، لکونہا فی الأرض المشغولة۔
ان تمام باتوں کے دلائل کتب فقہیہ سے حسب ذیل ہیں:-

۱- قال فی الدر المختار وأفاد فساد ما يقع كثيراً من أخذ كرم الوقف أو
الیتیم مساقاةً فیستأجر أرضه الخالية من الأشجار بمبلغ كثير ويساقى على
أشجارها بسهم من ألف سهم فالحظ ظاهر فی الإجارة لا فی المساقاة.
۲- وقال الشامی تحته: اعلم أنه حيث فسدت المساقاة بقيت الأرض
مشغولة فيلزم فساد الإجارة أيضاً كما قدّمناه وان كان الحظ والمصلحة
فيها ظاهرين فتنبه لهذه الدقیقة.

۳- وفي فتاویٰ الحانوتی التنصيص فی الإجارة على بياض الأرض لا يفيد
الصحة حيث تقدّم عقد الإجارة على عقد المساقاة اما اذا تقدم عقد
المساقاة بشروطه كانت الإجارة صحيحة كما صرح به فی البزازیة.

(۱)
(شامی ج: ۵ ص: ۶ و ۷)

۴- وفيه بعد أسطر: وهذا بالنسبة إلى الوقف وأما مساقاة المالك فلا
ينظر فيها إلى المصلحة (ای عدم الجواز) كما لو آجر بدون أجر المثل
اهـ.
(رد المحتار ج: ۵ ص: ۷)

واللہ سبحانہ اعلم
(۳) ۱۳۸۰/۵/۸ھ

زمین کی مال گزاری مؤجر پر ہے یا مستأجر پر؟

سوال:- یہاں بعض علاقوں میں رواج ہے کہ زمین اجارہ میں مال گزاری یعنی فی بوگہ ۸
روپیہ مؤجر ادا کرتا ہے، اور بعض جگہ میں مستأجر ادا کرتا ہے، اور میری کچھ کچھ زمین دونوں علاقوں میں
ہے جہاں مؤجر مال گزاری ادا کرتا ہے وہاں تو مجھ سے طلب کیا جاتا ہے اور جہاں مستأجر دیتا ہے کیا
اس پر مواخذہ عند اللہ ہوگا؟

جواب:- اگر زمین روپیہ کے عوض کرایہ پردی گئی ہے تو مال گزاری کی ادائیگی کی شرط مستأجر پر
لگائی جاسکتی ہے بشرطیکہ اس کی مقدار معلوم ہو اور حکماً یہ کرایہ کا جزء ہوگا، لیکن اگر بٹائی (مزارعت) پردی گئی
ہے تو اس میں یہ شرط مزارع پر عائد نہیں کی جاسکتی اور اگر یہ شرط لگادی گئی ہے تو مزارعت فاسد ہو جائے گی۔

(۱ و ۲) الدر المختار مع رد المحتار کتاب الاجارۃ ج: ۶ ص: ۸ (طبع سعید).

(۳) یہ فتویٰ حضرت والا دامت برکاتہم العالیہ کی ”تمرین افتاء“ کی کاپی سے لیا گیا ہے۔

لما فی الدر المختار: فبطل ان شرط لأحدهما قفزان مسماة أو ما يخرج من موضع معین أو رفع ربّ البذر بذره أو رفع الخراج الموظف (شامی ج: ۵ ص: ۲۴۱، استنبول)۔^(۱)

واللہ اعلم

۱۳۸۸/۱۲/۱۹ھ

(فتویٰ نمبر ۶۳۳/۱۹ الف)

گائے یا بھینس پر ورش کے لئے نصف حصے پر دینے کا حکم

اور جواز کی صورت

سوال:- زید اپنی بھینس بکر کو نصف حصے پر دیتا ہے پر ورش کے لئے، گائے یا بھینس کی بچیاں چھوٹی چھوٹی تقریباً ڈیڑھ سال کی ہوتی ہیں، زید بکر کو کہتا ہے کہ: یہ کٹی لے جاؤ اور اس کی پر ورش کرو۔ ہر قسم کا چارہ وغیرہ یا مکمل انتظام اس کی پر ورش کا بکر ہی کرتا ہے، زید کے متعلق کوئی خرچہ نہیں، بکر کی پر ورش کرتے کرتے کٹی بچہ دیتی ہے، پہلی دفعہ جب وہ نوزائیدہ بچہ ہوتا ہے اُس کو ہمارے علاقے کے عرف میں ”وہ تمام سوا“ یعنی جب تک وہ دودھ دیتی رہتی ہے وہ سارا سوا بکر خود کھاتا پیتا رہتا ہے، جبکہ پہلی دفعہ زید کی طرف سے بھی اس کی اجازت ہوتی ہے، دوسری مرتبہ جب وہ بھینس بیاتی ہے یا بچہ جنتی ہے تو اب فریقین اس بھینس کا حصہ ختم کرنا چاہتے ہیں، یعنی زید بکر کو کہتا ہے کہ یہ بھینس جو میں نے تمہیں پر ورش کے لئے دی ہوئی ہے اس کی قیمت لگا کر یا نصف قیمت لگا کر مجھے دیدے اور بھینس تو لے لے یا نصف قیمت تو لے کر مجھے دیدے، چنانچہ اس طرح کر لیتے ہیں۔ اب قابل دریافت امور یہ ہیں: ۱- بھینس کا بکر کو نصف حصے پر پر ورش کے لئے دینا جائز ہے یا نہیں؟ ۲- بھینس کی نصف ملکیت بکر کی پر ورش کی وجہ سے ہو جاتی ہے یا تمام بھینس کا مالک صرف زید ہی رہتا ہے؟ ۳- اس طرح قیمت لگا کر لینا دینا جائز ہے یا نہیں؟ ۴- عرفاً یا شرعاً اس طرح بھینس کو پر ورش کے لئے دینا جائز ہے یا نہیں؟ ۵- پر ورش کرنے والا بھینس کا حصہ تقسیم یا ختم کرنے کے وقت لگاتا ہے مالک بھینس کی قیمت نہیں لگاتا؟ بعدہ بھینس دینے والا مختار ہوتا ہے چاہے نصف قیمت پر ورش کرنے والے

(۱) الدر المختار کتاب المزارعة ج: ۶ ص: ۲۷۶ (طبع سعید).

وفی البحر الرائق کتاب المزارعة ج: ۸ ص: ۱۶۱ (طبع سعید) أو اشترطاً لأحدهما قفزاناً مسماة أو ما علی المادیات والسواقی أو أن یرفع ربّ البذر بذره أو یرفع من الخراج الخراج والباقی بینہما فسدت وفیہ بعد أسطر أو یرفع ربّ البذر بذره أو بدفع الخراج فلائہ یؤذی الی قطع الشریکة فی البعض أو الكل وشرط صحتها أن یكون الخراج مشترکاً بینہما والمراد بالخراج الخراج الموظف نصفاً أو ثلثاً أو نحو ذلک الخ.

وکذا فی الہندیة، کتاب المزارعة ج: ۵ ص: ۲۳۵ (طبع رشیدیہ) والہدیة، کتاب المزارعة ج: ۴ ص: ۲۲۶ (طبع شرکت علمیہ وفی طبع مکتبہ رحمانیہ ج: ۴ ص: ۴۲۴) وبدائع الصنائع، کتاب المزارعة ج: ۶ ص: ۱۸۰ (طبع سعید).

کو دے کر بھینس لے لے یا نصف قیمت اُس سے لے کر بھینس پر ویش کرنے والے کو دیدے۔ شرعی حکم سے آگاہ فرمائیں۔

جواب:- گائے یا بھینس کو پر ویش کے لئے نصف حصے پر دینا شرعاً جائز نہیں، اس سے اجارہ فاسد ہو جاتا ہے، لہذا صورتِ مسئلہ میں بھینس بدستور زید کی ملکیت ہے اور بکر نے اسے جتنا چارہ اپنی ملکیت میں سے کھلایا اس کی قیمت زید بکر کو ادا کرے، نیز بکر نے اس کی جتنے دن خدمت کی اس کی اجرت بھی زید پر واجب ہے،^(۱) اور اجرت اتنی ہوگی جتنی عام طور سے اس مقصد کے لئے کسی شخص کو مزدوری پر رکھ کر دی جاتی۔^(۲) دوسری طرف بکر نے اُس بھینس کا جتنا دودھ یا سوا استعمال کیا اتنا ہی دودھ اور سوا اُس پر واجب ہے کہ زید کو ادا کرے، بھینس بہر صورت پوری کی پوری زید کی ملکیت ہے، لہذا پہلے تو باہم معاملہ اس طرح درست کر لیں، اس کے بعد اگر زید بکر کو پوری بھینس یا اس کا نصف حصہ فروخت کرنا چاہے تو دونوں باہمی رضامندی سے ایسا کر سکتے ہیں، اور پر ویش کا مذکورہ معاملہ تو ناجائز ہے۔ لہذا جواز کی یہ صورت ہو سکتی ہے کہ زید بکر کو بھینس کا نصف حصہ فروخت کر دے، اس کے بعد اس کی قیمت معاف کر دے، اور بکر سے کہے کہ تم اس کی پر ویش کرو اور دودھ آدھا آدھا ہوگا، اور بکر اس پر راضی ہو جائے، تاہم اس صورت میں بکر کسی وقت چارے کا نصف خرچ وصول کرنا چاہے تو کر سکے گا۔ لما فی العالمگیریۃ دفع بقرة الی رجل علی أن یعلفها وما یکون من اللبن والسمن بینہما أنصافاً فالاجارة فاسدة، وعلی صاحب البقرة للرجل أجر قیامہ وقيمة علفہ إن علفها من علف هو ملکہ لا ما سرحها فی المرعی، ویرد کل اللبن إن کان قائماً و إن أتلف فالمثل إلی صاحبها والحيلة فی جوازه أن یبیع نصف البقرة منه بثمن ویبرئہ عنه ثم یأمر باتخاذ اللبن والمصل فیکون بینہما. (عالمگیریۃ ج: ۳ ص: ۴۳۵، ۴۳۶ الفصل الثالث فی قفیز الطحان وما معناه من الاجارة)۔^(۳)

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

ھ ۱۳۹۷/۱/۲۳

(فتویٰ نمبر ۱۵۴/۲۸ الف)

(۱ و ۲) وفي الهدایة ج: ۳ ص: ۳۰۳ (طبع مکتبہ رحمانیہ) والواجب فی الاجارة الفاسدة أجر المثل لا یجاوز به المسمی الخ.

(۳) طبع مکتبہ رشیدیہ. وفي خلاصة الفتاوی کتاب الاجارات وما یتصل بهذا ج: ۳ ص: ۱۱۴ (طبع مکتبہ رشیدیہ). وفي فتاوی النسفی رجل دفع بقرة الی رجل بالعلف مناصفة وهي التي بالفارسیة کاونیم سود بأن دفع علی أن ما یحصل من اللبن والسمن بینہما نصفان فهذا فاسد والحارث کلہ لصاحب البقرة والاجارة فاسدة.

وکذا فی الفتاوی البزازیة علی الہندیة کتاب الاجارة النوع الثالث فی الذواب ج: ۵ ص: ۳۷ (طبع رشیدیہ).

نیز دیکھئے: امداد الفتاوی ج: ۳ ص: ۳۲۲ و ۳۲۳ (طبع دار العلوم کراچی)۔

وکذا فی الہدایة ج: ۳ ص: ۳۰۵ کتاب الاجارات والذر المختار ج: ۶ ص: ۵۶ باب الاجارة الفاسدة والبحر الرائق ج: ۸ ص: ۲۳ کتاب الاجارة (طبع سعید).

جانور کو نصف پر دینے کا حکم

سوال:- ایک آدمی بغرض پرورش اپنی گائے دوسرے آدمی کو بالنصف دیتا ہے، یعنی جو اولاد پیدا ہوگی، نصف نصف ہوگی، اس صورت میں اگر گائے مالک کے پاس آجائے یا لینے والے کے حصے میں آجائے اور اس سے کوئی تیسرا شخص خریدے یا دونوں سے متفقہ طور پر خریدے تو کیا اس گائے کی قربانی درست ہوگی؟

جواب:- مذکورہ صورت میں معاملہ ناجائز ہے، لہذا پہلے یہ لکھئے کہ مالک یا پالنے والے کے پاس گائے کس طرح آئی آیا پورا جانور بیع سے آیا یا اس کے آدھے حصے کو فروخت کیا۔

واللہ اعلم

۱۳۸۷/۲/۱۴ھ



(۱) تفصیل کے لئے پچھلا فتویٰ ملاحظہ ہو۔

﴿فصل فی نفس الأجرة﴾

(”تنخواہ، اجرت“ اور مختلف الاؤنسز سے متعلق مسائل)

شرعاً ملازم کی تنخواہ مقرر کرنے کا معیار کیا ہے؟

ملازم کی ضرورت یا اس کی قابلیت؟

سوال:- بخدمت جناب مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ جناب عالی! میں نے ابھی حال میں ایک صاحب کو دوسرے صاحب سے مسئلہ دریافت کرتے ہوئے سنا، جواب سے تسکین نہیں ہوئی، چنانچہ اس لئے سوال اور اس کا جواب ذیل میں درج کر رہا ہوں، اس مسئلے میں آپ ہماری رہنمائی فرمائیں کہ صحیح جواب کیا ہے؟

”سوال- مسئلہ یہ ہے کہ ایک ملازم ایک انجینئر ہے اور اس کے دو بچے اور ایک بیوی ہے، اس کی تنخواہ پانچ ہزار روپے ماہوار ہے، دوسرا ملازم ایک مزدور ہے اور اس کے چھ بچے اور ایک بیوی ہے، اس کی تنخواہ صرف ایک ہزار روپے ہے، اسلام کے قوانین اور نظام کے مطابق تعین ملازم کی قابلیت پر ہوتا ہے یا ملازم کی ضروریات کی بنیاد پر۔

جواب- اسلامی نظام میں تنخواہ کا تعین قابلیت پر نہیں، مزدور کی ضروریات کی بنیاد پر ہوتا ہے۔“

برائے مہربانی جواب ارسال کرتے وقت مندرجہ ذیل امور پر بھی روشنی ضرور ڈالیں جو مذکورہ سوال سے بہت گہرا تعلق رکھتے ہیں:

۱- ایک ملازم کی ضروریات کا تعین کیسے کیا جائے گا؟

۲- ایک ملازم اکیلا ہوگا، دوسرے کے کئی بچے ہوں گے، اور اگر دونوں ایک ہی قابلیت رکھتے ہوں گے تو تنخواہ کا فیصلہ کیسے ہوگا؟

۳- حکومت کے ملازم اور نجی فرم کے ملازم کی تنخواہیں ایک طریقے سے مقرر ہوں گی یا طریقہ جدا جدا ہوگا؟ اور گھریلو ملازمین کی تنخواہ مقرر کرتے وقت طریقہ کار میں کوئی فرق ہوگا یا نہیں؟

۴- امریکا اور دوسرے ترقی یافتہ ممالک میں مزدوروں کی کم از کم تنخواہ مقرر ہے، جو حکومت

وہاں کی مہنگائی کو سامنے رکھ کر مقرر کرتی ہے، اور کچھ عرصہ بعد اس کم از کم تنخواہ کو مہنگائی کے مطابق بڑھاتی رہتی ہے، البتہ کم از کم تنخواہ کے بعد وہاں تنخواہیں قابلیت اور پیسے کی مانگ کی بنیاد پر مقرر ہوتی ہیں، یہ طریقہ کار کس حد تک اسلامی طریقے سے قریب ہے؟

جواب:- محترمی و مکرمی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

گرامی نامہ ملا، دراصل ملازمت شرعی نقطہ نظر سے ”عقدِ اجارہ“ ہے، جس میں جانبین کی باہمی رضامندی سے جو اجرت بھی طے کر لی جائے وہ جائز ہے، بشرطیکہ اس میں ایک فریق نے دوسرے فریق کی منظوری زبردستی حاصل نہ کی ہو، اس طرح جو اجرت بھی طے ہو جائے، شرعاً وہ درست ہے، خواہ وہ اہلیت کی بنیاد پر ہوئی ہو، یا کام کی بنیاد پر، یا ضرورت کی بنیاد پر۔

البتہ اسلامی حکومت اگر یہ دیکھے کہ محنت کرنے والوں کی اجرتیں مناسب مقرر نہیں کی جا رہی ہیں، تو وہ اجرتوں کا کوئی معیار بھی مقرر کر سکتی ہے^(۱)، جس کی پابندی فریقین پر لازم ہوگی۔^(۲) اس معیار کے تعین کے وقت حکومت کو اہلیت، کام اور ضرورت تینوں باتوں کو مد نظر رکھنا ہوگا، کسی ایک بنیاد پر مقرر کرنا درست نہیں ہوگا۔

اس تشریح سے واضح ہو گیا ہوگا کہ یہ کہنا درست نہیں ہے کہ: ”اسلامی نظام میں تنخواہ کا تعین قابلیت کی بنیاد پر نہیں، مزدور کی ضروریات کی بنیاد پر ہوتا ہے“ اس سے آپ کے تمام سوالات کا جواب ہو گیا ہوگا۔

واللہ اعلم

۱۴۰۸/۴/۷ھ

(فتویٰ نمبر ۷۶۱/ج)

مزدور کی اجرت کی تعیین کا شرعی معیار کیا ہے؟

سوال ۱:- معاوضے کی ادائیگی کا معیار کیا ہے؟ پیداوار، محنت یا کارکن کی ضرورت؟

۲:- پیداوار ہے جس کی کھپت کے منافع سے فیکٹری کے تمام شعبہ جات کی اجرتوں کی

ادائیگی ہوتی ہے، اور دیگر اخراجات پورے کئے جاتے ہیں، اس طرح بند سیزن میں رکھے گئے کارکنوں

(۱) وفي الدر المختار ج: ۶ ص: ۳۹۹ (طبع سعید) (الحظر والاباحۃ) ولا یسعر حاکم لقوله عليه الصلوة السلام: لا تسعروا فان الله هو المسعر القابض الباسط الرازق. الا اذا تعدى الأرباب عن القيمة تعدياً فاحشاً فيسعر بمشورة أهل الرأي. ونظيره كما في البحر الرائق كتاب القسمة ج: ۸ ص: ۱۴۸ (طبع سعید) والآ نصيب قاسماً يقسم بأجرة بعدد الرؤس یعنی ان لم ينصب قاسماً رزقه في بيت المال نصيبه وجعل رزقه على المتقاسمين لأن النفع لهم على الخصوص ويقدر له القاضي أجرة مثله كي لا يطمع في أموالهم ويتحكم بالزيادة.

وفي الأشباه والنظائر ص: ۱۵۷ (طبع ادارة القرآن کراچی) تصرف الامام على الرعية منوط بالمصلحة.

(۲) وفي الدر المختار ج: ۲ ص: ۱۷۲ تجب طاعة الامام فيما ليس بمعصية.

وراجع للدلائل والتفصيل الى الدر المختار مطلب في وجوب طاعة الامام ج: ۴ ص: ۲۶۳ (طبع سعید). نیز دیکھئے ص: ۹۰ کا حاشیہ نمبر ۳۔

کو تنخواہیں اور دیگر مراعات بھی اس منافع سے دی جاتی ہیں، جبکہ بیکار ہونے والے افراد کی تنخواہ اور دیگر مراعات یکسر بند کر دی جاتی ہیں، اور جن کارکنوں کو بارہ ماہ مستقل کام کرنے کے لئے رکھا جاتا ہے وہ بارہ ماہ تو کام نہیں کرتے چونکہ پیداوار ہی چند ماہ ہوتی ہے، مگر اس پیداوار کی کھپت کے منافع سے جس میں سیزنل کارکن بھرپور حصہ لیتے ہیں مذکورہ مستقل کارکن کو تنخواہیں اور دیگر مراعات تمام سال فراہم کی جاتی ہیں، جبکہ سیزنل کارکنوں کو صرف دوران سیزن، کیا یہ جائز ہے؟

۳:- نئی لیبر پالیسی میں مزدوروں کی اجرت کا تعین ”وَيَسْأَلُونَكَ مَاذَا يُنفِقُونَ، قُلِ

الْعَفْوُ“ (سورہ بقرہ آیت: ۲۱۸) کی بنیاد پر کیا جانا جائز ہے؟

جواب ۱:- شرعاً اجرت کے تعین کا معیار باہمی معاہدہ ہے، یعنی باہمی رضامندی سے جو اجرت مقرر کر دی جائے وہ شرعاً جائز ہے،^(۱) البتہ ہر فریق پر دیانۃً یہ واجب ہے کہ وہ دوسرے فریق کی مجبوری سے فائدہ اٹھا کر کوئی ایسی اجرت مقرر نہ کرے جو اتنی کارکردگی کے لحاظ سے عرفاً نا کافی یا بہت زائد ہو،^(۲) چنانچہ یہ آجر کی اخلاقی ذمہ داری ہے کہ وہ اجرت کے تعین کے وقت اس بات کا پورا لحاظ رکھے کہ آجیر کو اس کی کارکردگی کے مطابق مناسب اور کافی اجرت ملے۔^(۳) دوسرے الفاظ میں قانونی طور پر اجرت کے تعین کا معیار اگرچہ باہمی معاہدہ ہے، لیکن اخلاقی طور پر اور دیانۃً اس کا معیار کارکردگی کی نوعیت ہے، اور اگر کسی جگہ آجر اپنی اس اخلاقی ذمہ داری کو پورا کرنے کی بجائے مزدوروں کی مجبوری سے فائدہ اٹھا کر کم اجرت مقرر کرتے ہوں تو ایسی صورت میں حکومت کے لئے اس بات کی گنجائش ہے کہ وہ کم سے کم اجرت متعین کر دے، اس صورت میں آجروں پر اس کی پابندی قانوناً بھی لازمی ہوگی۔^(۴)

۲:- اصل مسئلہ یہ ہے کہ ہر کام کرنے والا اتنی مدت کی اجرت کا مستحق ہوتا ہے جتنی مدت اس نے کام کیا، لیکن اگر کوئی آجر کسی آجیر کو اس بات کا پابند کر دے کہ وہ سارے سال اس کا ملازم رہے گا خواہ اس کو کام کرنا پڑے یا نہ پڑے، چونکہ اس کو سارے سال کے لئے پابند کر لیا گیا ہے اس لئے آجر پر اس کے سارے سال کی تنخواہ واجب ہوگی، خواہ وہ اس سے کام لے یا نہ لے۔^(۵) اس کے برخلاف اگر کسی کو سارے سال کے لئے پابند نہیں کیا گیا تو اس کی صرف اتنی مدت کی تنخواہ آجر پر

(۱ تا ۳) وفي سنن الترمذی، باب ما جاء في التسعير رقم الحديث: ۱۲۳۵ ”عن أنس رضي الله عنه قال: غلا السعر على عهد رسول الله صلى الله عليه وسلم فقالوا: يا رسول الله اسعّر لنا. فقال: ان الله هو المسعر القابض الباسط الرزاق واني لأرجو ان ألقى ربي وليس أحد منكم يطلبني بمظلمة في دم ولا مال“ قال أبو عيسى: هذا حديث حسن صحيح. وفي حاشية السندی علی ابن ماجہ ج: ۴ ص: ۴۲۲.... وفيه إشارة الى أن التسعير تصرف في أموال الناس بغير اذن أهلها فيكون ظلماً فليس الامام أن يسعّر لكن يأمرهم بالانصاف والشفقة على الخلق والنصيحة.

(۴) دیکھئے پچھلے صفحے کے حواشی اور ص: ۹۰ کا حاشیہ نمبر ۳۔

(۵) حوالہ کے لئے دیکھئے ص: ۳۸۸ کا حاشیہ۔

واجب ہوگی جتنی مدت کا اسے پابند کیا گیا ہے، باقی مدت میں چونکہ وہ دوسرا کام کرنے کے لئے آزاد ہے اس لئے اس کی اجرت بھی آجر پر واجب نہیں۔

ہاں! اگر کام سے آزاد رہنے کی مدت ایسی ہو کہ اس میں مزدور کو کسی دوسری جگہ کام ملنے کی توقع نہ ہو تو وہ آجر سے یہ معاہدہ کر سکتا ہے کہ اس کی مدت کارکردگی کی اجرت اتنی زیادہ مقرر کی جائے جو اس کی بے کاری کے ایام کی بھی کفالت کر سکے۔

۳:- ”يَسْأَلُونَكَ مَاذَا يُنْفِقُونَ، قُلِ الْعَفْوَ“^(۱) کا اجرت کے تعین کے مسئلے سے کوئی تعلق نہیں، بلکہ اس کا حاصل یہ ہے کہ مسلمان اپنی زائد از ضرورت رقم کو ضرورت مند افراد میں خرچ کیا کریں^(۲)، یعنی ان کو کسی اجرت کے طور پر نہیں، بلکہ ہدیہ یا صدقہ کے طور پر دیا کریں، جہاں تک اجرت کا تعلق ہے اس کے تعین کا مسئلہ سوال نمبر ۱ کے جواب میں گزر چکا ہے۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۱۳۰۱/۱۱/۲ھ

(فتویٰ نمبر ۱۶۵۳/۳۲ ح)

مدرس کے لئے ایام غیر حاضری کی تنخواہ کا حکم

سوال:- واعظ مدرس کو صاحب مجلس کی طرف سے عطیہ یا وعظ کی اجرت لے لینے کے بعد مدرس سے غیر حاضری کے ایام کی تنخواہ لینا کیسا ہوگا؟

جواب:- اگر مدرس سے باضابطہ رخصت لی ہے، اور وعظ پر اجرت نہ لینے کا کوئی معاہدہ منتظمین مدرسہ سے نہیں ہوا تو جائز ہے۔^(۳)

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۸/۱/۱۹ھ

(فتویٰ نمبر ۱۷۱/۱۱۹ الف)

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع عفی عنہ

۱۳۸۸/۱/۲۱ھ

امامت میں ناغہ کرنے کی بناء پر تنخواہ کاٹنے کا حکم

سوال:- باتنخواہ امام اگر نمازوں میں ناغہ کرے اس کو پوری تنخواہ لینا جائز ہے یا نہیں؟ اگر

(۱) سورة البقرة آیت: ۲۱۹۔

(۲) دیکھئے تفسیر ”معارف القرآن“ ج: ۱ ص: ۵۳۸۔

(۳) فی الشامیة ج: ۴ ص: ۴۱۹ (طبع سعید) اما لو شرط شرطاً تبع كحضور الدرس آیاماً معلومة فی كل جمعة فلا يستحق المعلوم الا من باشر خصوصاً اذا قال من غاب عن الدرس قطع معلومه فيجب اتباعه. وتماه في البحر.

ناجائز ہے تو لینے پر اصرار کی صورت میں اکل حرام کا مرتکب ہوگا یا نہیں؟ ایسی صورت میں اس کی اقتداء درست ہوگی یا نہیں؟

جواب:- تنخواہ دار پیش امام کے لئے معاہدے کے خلاف ناغہ کرنا جائز نہیں، اور اگر معاہدے میں یہ بات طے ہو چکی ہے کہ جائز چھٹیوں کے علاوہ ناغہ کرنے پر تنخواہ کاٹی جائے گی تو انہیں پوری تنخواہ نہ لینا چاہئے^(۱)، اگر انہوں نے غفلت یا بے توجہی سے پوری تنخواہ لے لی ہے تو انہیں متنبہ کر دینا چاہئے، اور اگر اس پر بھی وہ تنخواہ کا واجب الرّد حصہ واپس نہ کریں اور اس کو عادت بنالیں تو جب تک توبہ نہ کریں ان کے پیچھے نماز مکروہ ہوگی، لیکن فاسد نہیں۔

واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

۱۳۸۸/۲/۱۲ھ

(فتویٰ نمبر ۲۵/۱۱ الف)

سودی معاملات کرنے کی وجہ سے حکومت کے ہر ملازم کی تنخواہ کو

ناجائز قرار دینے کا حکم

سوال:- ہمارے ایک دوست ہیں، وہ فرماتے ہیں کہ آج کل کی تنخواہ جو بھی ملازم لیتا ہے

(۱) کیونکہ امام اخیر خاص ہے جو تسلیم نفس اور وقت دینے پر ہی اجرت کا مستحق ہوتا ہے، اگر ناغہ کرے تو اجرت کا مستحق نہیں۔
وفی الذر المختار ج: ۶ ص: ۶۹ والثانی وهو الأجير الخاص ويسمى أجير وحد وهو من يعمل لواحد عملاً مؤقتاً بالتخصيص ويستحق الأجر بتسليم نفسه في المدة وان لم يعمل كمن استوجر شهراً للخدمة أو شهراً لرعى الغنم المسمى بأجر مسمى.

وفی الهندية ج: ۴ ص: ۵۰۰ والأجير الخاص من يستحق الأجر بتسليم نفسه وبمضى المدة ولا يشترط في العمل في حقه لاستحقاق الأجر.

اور ناغہ کرنے پر تنخواہ کے کٹنے کی صراحت مبسوط کے اس جزئیہ میں ہے:-

ولو كان يبطل من الشهر يوماً أو يومين لا يرعاها حوسب بذلك من أجره سواء كان من مرض أو بطلالة لأنه يستحق الأجر بتسليم منافعه وذلك ينعدم في مدة البطلالة سواء كان بعذر أو بغير عذر.

المبسوط للسرخسي ج: ۱۵ ص: ۱۶۲.

وفی الشامية ج: ۶ ص: ۴۵ (طبع سعيد) ووجه الفساد أن مقتضى العقد أن لا تلزم الأجرة مدة العطلة قلت أو كثرت. نیز دیکھئے: امداد المفتين ص: ۸۶۲۔ واضح رہے تنخواہ کے کٹنے کا مذکورہ حکم کبھی کبھار کی جائز چھٹیوں کے علاوہ ناغہ کرنے سے متعلق ہے، جیسا کہ حضرت والا دامت برکاتہم نے ”جائز چھٹیوں کے علاوہ“ کی صراحت فرمادی ہے، کیونکہ ضرورت و راحت کی غرض سے عرف و رواج کے مطابق کبھی کبھار چھٹی کی گنجائش ہے، چنانچہ شامی کتاب الوقف ج: ۴ ص: ۴۱۹ (طبع سعيد) میں ہے:-

امام يترك الامامة لزيارة أقربائه في الرساتيق أسبوعاً أو نحوه أو لمصيبة أو لاستراحة لا بأس به ومثله عفو في العادة والشرع.

تفصیل کے لئے فتاویٰ دارالعلوم دیوبند عزیز الفتاویٰ ص: ۶۶۵ ملاحظہ فرمائیں۔ (محمد بیرحق نواز)

حرام ہے، کیونکہ حکومت کا تمام کاروبار سودی ہے، اور سودی رقم سے ہمیں تنخواہ ملتی ہے، اس کے متعلق کیا رائے ہے؟

جواب:- آپ کے دوست کا خیال درست نہیں، حکومت کی ساری آمدنی سودی نہیں ہے بلکہ بہت سے ذرائع آمدنی جائز ہیں، اور ایسی صورت میں اس سے تنخواہ وصول کرنا شرعاً جائز اور درست ہے۔^(۱)

واللہ اعلم

۱۳۹۶/۱۱/۲۸ھ

(فتویٰ نمبر ۲۷۵۱/۲۷ و)

غلط بیانی کر کے سواری کا الاؤنس وصول کرنے کا حکم

سوال:- ہم اسکول کے ملازم ہیں، ہم کو سواری الاؤنس ملتا ہے، اس طرح کہ دفتر یا اسکول سے گھر کا فاصلہ ساڑھے تین میل سے زائد ہو تو مبلغ پچیس روپیہ ماہوار، اور ساڑھے سات میل ہو تو تیس روپیہ ماہوار بطور کرایہ حکومت دیتی ہے، اب اگر کوئی شخص اسکول کے ایک فرلانگ پر رہتا ہے، غلط بیانی کر کے کہتا ہے کہ میں آٹھ میل کے فاصلے پر رہتا ہوں، اور مطلوبہ رقم تیس روپے وصول کر لیتا ہے تو یہ جائز ہے؟

جواب:- غلط بیانی کر کے حکومت کے قانون کے خلاف یہ الاؤنس وصول کرنا بھی ناجائز ہے اور جو افسر جانتے بوجھتے اس کی اجازت دیتا ہے وہ بھی گناہگار ہے۔

واللہ اعلم

۱۳۹۷/۱/۶ھ

(فتویٰ نمبر ۵۸/۲۸ الف)

قربانی کی کھال اور فطرے سے امام کو تنخواہ دینے کا حکم

سوال:- کیا پیش امام کو فطرانہ یا قربانی کی کھال وغیرہ دینا درست ہے؟ جبکہ امام بالکل غریب آدمی ہے اور دس بارہ کھانے والے ہیں، تنخواہ بھی بہت کم ہے، یہ چیزیں اجرت میں نہیں دی جاتیں بلکہ صرف اللہ دی جاتی ہے، کیا یہ دینا درست ہے؟

جواب:- اگر پیش امام صاحب نصاب نہیں ہے تو اسے فطرہ اور قربانی کی کھال وصول کرنا

(۱) کیونکہ غالب حلال ہونے کی صورت میں اس سے تنخواہ لینا جائز ہے۔ حوالہ کے لئے دیکھئے ص: ۳۹۵ کا حاشیہ نمبر ۳۔

جائز ہے،^(۱) اور اگر وہ کسی بھی طرح صاحبِ نصاب ہو تو وصول کرنا جائز نہیں۔^(۲) واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۷/۱۲/۲۰ھ

(فتویٰ نمبر ۱۳۵۴/۱۸ الف)

اور یہ کہ اجرت میں دیتے ہیں یا بطور خدمت؟ اس کا فیصلہ امام اور مقتدی خدا کو حاضر و ناظر جان کر کر لیں، اگر کوئی شخص قربانی کی کھال اور فطرے کی رقم دوسرے کو دیدے اور امام یا امام کا ہمدرد ناراض ہو تو یہ سمجھ سکتے ہیں کہ یہ خدمت ہے اجرت نہیں، اگر امام کو نہ دیں تو امام شکایت کرتا پھرے یہ نشانی اجرت کی ہے، اللہ سے ڈر کر غور کریں۔^(۳)

کتبہ العبد الحقیر

محمد عاشق الہی بلند شہری

بغیر سواری کے آنے والے سرکاری ملازم کے لئے کرایہ سواری لینے کا حکم

سوال:- فیڈرل گورنمنٹ اپنے ملازمین کو سواری کا کرایہ دیتی ہے، اس کی حد بھی مقرر ہے کہ ساڑھے تین میل تک پچیس روپے اور ساڑھے سات میل سے اوپر کے لئے تیس روپے، ایک آدمی اسی شہر میں رہتا ہے جہاں وہ ڈیوٹی دیتا ہے یعنی اسکول میں ملازم ہے، اور اسکول سے چار سو گز کے فاصلے پر قیام پذیر ہے، بس یا کسی اور ذریعے سے اسکول نہیں آتا لیکن بل میں ہر ماہ تیس روپے درج کر دیتا ہے اور یہ عندہ کرتا ہے کہ میرا گھر بھی دوسو، چار سو میل دور ہے، ماہ میں ایک مرتبہ جانا پڑتا ہے۔ اس طرح سے یہ کرایہ اور الاؤنس لینا جائز ہے یا نہیں؟

جواب:- یہ کرایہ سواری اگر تنخواہ کا جزء ہوتا تب تو ہر حال میں اس کا لینا جائز تھا، لیکن حکومت نے تفصیل رکھی ہے کہ اتنے میل پر جس کی رہائش ہو اسے اتنا کرایہ دیا جائے گا، یہ اس بات کی کھلی دلیل ہے کہ یہ رقم تنخواہ کا جزء نہیں بلکہ کرایہ آمد و رفت ہے، لہذا اس نام سے اتنی ہی رقم وصول کرنا شرعاً جائز ہے جتنی رقم واقعۃً کرایہ میں لگتی ہو، چنانچہ آپ کے لئے اپنی رہائش کا فاصلہ زیادہ لکھوا کر

(۱) وفي الدر المختار ج: ۲ ص: ۳۳۹ (طبع سعید) مصرف الزکوة هو فقیر (وهو من له أدنى شيء) أي دون نصاب أو قدر نصاب غیر نام مستغرق فی الحاجة.

وفي الهندية كتاب الزکوة ج: ۱ ص: ۱۸۹ ولا يجوز دفع الزکوة الی من یملک نصاباً الخ.

(۲) ولا يجوز دفع الزکوة الی من یملک نصاباً الخ.

(۳) وفي الدر المختار ج: ۲ ص: ۳۳۳ (طبع سعید) ويشترط أن یكون الصرف تمليکاً لا اباحة الخ.

وفي الهندية كتاب الزکوة باب المصارف ج: ۱ ص: ۱۹۰ (طبع رشیدیہ کوئٹہ) ولو نوى الزکوة بما يدفع المعلم الی الخليفة ولم يستأجره ان كان الخليفة بحال لو لم يدفعه يعلم الصبيان أيضاً أجزاءه وآلا فلا الخ.

کرایہ سواری وصول کرنا جائز نہیں ہے۔ اور یہ تاویل بھی درست نہیں کہ اصلی گھر دوسویا چار سو میل دور ہے، کیونکہ حکومت نے اصلی گھر تک پہنچانے اور وہاں سے واپس لانے کے کرائے کی ذمہ داری نہیں لی ہے، اور جب اس طرح حاصل کی ہوئی رقم ناجائز ہوئی تو اسے حکومت ہی کو واپس کرنا ضروری ہے، اس سے صدقہ کرنا بھی درست نہیں، الا یہ کہ حکومت کو واپس کرنے کی کوئی صورت نہ ہو، تو اس صورت میں بغیر ثواب کی نیت کے صدقہ کر دی جائے۔^(۱)

واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم

۱۳۹۶/۱۱/۲۸ھ

(فتویٰ نمبر ۲۷۵۱/۲۷)

اُور ٹائم لگائے بغیر اس کی تنخواہ وصول کرنے کا حکم

سوال:- میں بحیثیت اسٹونو ٹائپسٹ کے ملازمت کرتا ہوں، میرے محکمے کا سب سے بڑا سربراہ چیف انجینئر ہوتا ہے، میرے محکمے میں ہر ملازم کو تقریباً تیس گھنٹے کا اُور ٹائم ملتا ہے، روز کے تقریباً گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ کے حساب سے، آفس کے اوقات کے بعد عموماً کبھی کبھی دو گھنٹہ اُور ٹائم کرنا پڑتا ہے۔ اکثر ہم لوگ دو بجے کے بعد اپنے اپنے گھر چلے جاتے ہیں کیونکہ کام ہی اتنا ہوتا ہے۔ اب دریافت یہ ہے کہ کیا بغیر اُور ٹائم کئے ہوئے اُور ٹائم کی رقم لی جاسکتی ہے یا نہیں؟ چیف انجینئر صاحب کو بھی اس کا پتہ ہے کہ کبھی کبھی اُور ٹائم کے لئے رکتا ہے، اکثر نہیں رکتا، اس کے باوجود وہ تیس گھنٹے کا اُور ٹائم لگا دیتے ہیں، جبکہ آفس کے کام کے بعد اُور ٹائم کا کام نہیں ہوتا۔

جواب:- اُور ٹائم کے نام سے کوئی رقم وصول کرنا اُسی وقت جائز ہوگا جبکہ واقعہ ملازم نے وقت مقررہ سے زائد کام کیا ہو، جس روز وقت مقررہ سے زائد کام نہیں کیا اُس روز کا اُور ٹائم لینا درست نہیں۔ اگر چیف انجینئر صاحب واقعہ ملازمین کی خیر خواہی کرنا چاہتے ہیں تو تنخواہ میں اضافہ کر دیں، لیکن اُور ٹائم کے نام سے غلط بیانی کی شرعاً اجازت نہیں ہو سکتی۔

واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم

۱۳۹۶/۱۱/۱۰ھ

(فتویٰ نمبر ۲۵۱۳/۲۷)

غلط بیانی کر کے تنخواہ میں اضافہ کرانے کا حکم

سوال:- غلط بیان دے کر اپنی تنخواہ بڑھانا جائز ہے یا نہیں؟ اور اس کی دلیل یہ ہو کہ چونکہ حکومت تنخواہ نہیں بڑھاتی اوپر سے گرانی بھی ہوتی چلی جا رہی ہے، اور وہ آدمی اگر پرائیویٹ پڑھاتا تو اتنی ہی (یعنی زیادہ) تنخواہ مل جاتی۔ اب اس کو مد نظر رکھ کر غلط بیان دے کر اپنی تنخواہ بڑھا سکتا ہے یا نہیں؟

(۱) وفي الشامية ج: ۵ ص: ۹۹ والحاصل أنه ان علم ارباب الأموال وجب رده عليهم وآلا فان علم عين الحرام لا يحل له ويتصدق به بنية صاحبه الخ.

جواب:- صورتِ مسئلہ میں چونکہ وہ شخص غلط بیان دیتا ہے، اس لئے یہ عمل جائز نہیں۔

واللہ اعلم بالصواب
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

الجواب صحیح
محمد عاشق الہی

ھ ۱۳۸۷/۱۲/۱۷

(فتویٰ نمبر ۱۳۳۲/۱۸ الف)

زکوٰۃ و صدقات کی رقوم سے مہتمم اور مدرّسین و ملازمین کی تنخواہیں ادا کرنے کا حکم

سوال:- زید ایک مسجد کا خطیب ہے، اس مسجد میں ایک چھوٹا سا دینی مدرسہ بھی قائم ہے، جس کا مہتمم زید ہی ہے، یہ مدرسہ اقامتی ہے، طلباء، اساتذہ، باورچی وغیرہ کے لئے تین ٹائم کھانے کا انتظام بھی مدرسے کے ذمے ہے، زید کے اعتماد، تعلق اور کوشش سے حاصل شدہ چندہ وغیرہ کی آمدنی سے مدرسے کا کام چل رہا ہے، مالی گنجائش نہ ہونے کی وجہ سے کوئی اکاؤنٹینٹ نہیں ہے، زید آمد و خرچ کا حساب کرتا ہے، کیا زید از روئے شرع مدرسہ ہذا کے فنڈ سے مشاہرہ لینے کا حق رکھتا ہے؟ جبکہ مدرسے کی کوئی کمیٹی نہیں خود اپنی تنخواہ مقرر کر سکتا ہے؟

جواب:- پہلی ضروری بات تو یہ ہے کہ مدرّسین، مہتمم یا دوسرے ملازمین کی تنخواہیں زکوٰۃ اور صدقات واجبہ کی رقوم سے شرعاً نہیں دی جاسکتیں،^(۱) لہذا اگر مذکورہ رقمیں زکوٰۃ کی ہیں تو ان سے نہ مدرّسین کی تنخواہ دی جاسکتی ہے، نہ آپ تنخواہ لے سکتے ہیں۔^(۲) ہاں جو رقوم زکوٰۃ کے علاوہ عام چندے کی ہوں ان سے مدرّسین و ملازمین کو تنخواہ دی جاسکتی ہے اور مہتمم بھی ان سے تنخواہ وصول کر سکتا ہے، البتہ تنخواہ کا تعین کرنے کے لئے بہتر یہ ہے کہ چندہ دہندگان کی رائے معلوم کی جائے اور تنخواہ مقرر کرنے میں اس بات کی رعایت رکھی جائے کہ وہ بالمعروف ہو، یعنی اُس جیسے مدرسے میں اُس جیسے کام کرنے والے مہتمم کی عموماً کیا تنخواہ مقرر ہوتی ہے؟ اُس سے زائد مقرر نہ کی جائے، اور موضعِ تہمت سے بچنے، نیز احتیاط کے پیش نظر چندہ دہندگان یا دوسرے مدرّسین و ملازمین سے مشورہ کر لینا چاہئے۔

واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم

ھ ۱۳۹۶/۱۰/۲۱

(فتویٰ نمبر ۲۳۲۵/۵۲۷)

﴿فصل فی الإجارة علی المعاصی﴾

(مختلف ناجائز اور معصیت کی ملازمتوں کے احکام)

سودی کاروبار کرنے والے مالیاتی ادارے کی ملازمت اور آمدنی کا حکم

سوال :- میں ایک مالیاتی ادارے میں کام کر رہا ہوں، جہاں سودی کاروبار ہے، یعنی بعض کمپنیوں کو سود پر اور بعض کو نفع و نقصان پر قرضے دیتی ہے، اور نفع بھی اس طرح ہے کہ فیصد فکسڈ ہے، یعنی پندرہ فیصد سال میں، اور اگر نقصان ہو جائے تو بھی پانچ فیصد، بلکہ نقصان کی صورت میں بھی اس کو منافع ہوتا ہے، کیونکہ پندرہ فیصد جو منافع کا حصہ ہے اس کے برابر کمپنی کے سٹیفکیٹس یعنی حصص لیتی ہیں۔ اس کے علاوہ سودی کاغذات بھی لکھنے پڑتے ہیں کہ آپ کے ذمے اتنا سود ہے، اسے ادا کرو۔ اور سود کی جانچ پڑتال کرنی پڑتی ہے، بعض اوقات جسے قرضے دیتے ہیں اس کے لئے کمپنی کا معائنہ بھی کیا جاتا ہے۔ اب آپ سے درخواست ہے کہ شرع کی رو سے جواب دیں کہ اس میں نوکری جائز ہے؟ یا بالکل ناجائز؟ یا اور کوئی صورت حال ہے؟ اور اس میں میرا شمار سودی کاتبین میں ہوگا یا نہیں؟ اور یہ میرے اوپر کتنا گناہ ہے؟ اور یہ جو سود کرتے ہیں یہ جو اسلام نے بیان کیا ہے وہ ہے یا نہیں؟

جواب :- ادارے کی جو تفصیلات آپ نے لکھی ہیں، اگر وہ درست ہیں اور ادارے کی اکثر آمدنی سود یا دوسرے ناجائز ذرائع پر مشتمل ہے، یا اس ادارے میں آپ کو سود کے معاملات کا حساب و کتاب وغیرہ کرنا پڑتا ہے، تو اس میں ملازمت شرعاً جائز نہیں^(۱) ایسی صورت میں آپ کو چاہئے کہ

(۱) وفي صحيح البخارى كتاب الطلاق رقم الحديث: ۵۵۰۵ عن ابن مسعود رضى الله عنه قال: لعن رسول الله صلى الله عليه وسلم اكل الربوا وموكله. وكذا في الصحيح لمسلم رقم الحديث: ۲۹۹۳ و ۲۹۹۵. ادارے کی اکثر آمدنی سود یا دوسرے ناجائز امور پر مشتمل ہو تو اس حرام آمدنی سے اجرت حاصل کرنا جائز نہیں، جیسا کہ درج ذیل فقہی عبارات سے واضح ہے:-

فی الدر المختار ج: ۶ ص: ۳۸۵ (طبع سعید) وفي الأشباه الحرمۃ تنتقل. وفي الشامیۃ تحتہ، قال الشیخ عبدالوہاب الشعرانی فی کتاب المنن وما نقل عن بعض الحنفیۃ من أن الحرام لا یتعدی الی ذمتین سألت عنہ الشہاب ابن السلبی فقال: هو محمول علی ما اذا لم یعلم بذلك اما من رای المكاس یاخذ من أحد شیئاً من المكس ثم یعطیه آخر ثم یاخذہ من ذلك الآخر فهو حرام.

(باقی اگلے صفحے پر)

دوسرے حلال روزگار کو تلاش کریں، اور اس کے ملنے پر یہاں سے علیحدہ ہو جائیں۔ جب تک دوسرا روزگار مہیا نہ ہو اس وقت تک موجودہ ملازمت کو ناجائز سمجھتے ہوئے اس پر استغفار کرتے رہیں، اور جلد از جلد حلال روزگار حاصل کرنے کی پوری کوشش کریں۔ واللہ اعلم

بینک کی ملازمت کا تفصیلی حکم

سوال:- بینک کی ملازمت کے بارے میں آپ سے پوچھنا تھا کہ بعض علماء سے سنا ہے کہ فتویٰ یہ ہے کہ بینک کی بعض ملازمتیں جائز ہیں، کیا یہ درست ہے؟ جبکہ میرے خیال میں بینک کی ہر ملازمت ناجائز ہے کیونکہ بینک کی جو بھی ملازمت ہو اُس میں چونکہ ناجائز کام میں اعانت اور تعاون کرنا پڑتا ہے لہذا وہ ناجائز ہونی چاہئے۔ اور تنخواہ بھی ظاہر ہے کہ بینک کی حرام آمدنی سے ہی دی جائے گی لہذا اس وجہ سے وہ بھی ناجائز ہونی چاہئے۔ کیا یہ بات درست ہے یا نہیں؟ اگر بینک کی کوئی ملازمت

(بقیہ حاشیہ گزشتہ)..... وفي الهندية ج: ۵ ص: ۳۴۲ (طبع رشیدیہ کوئٹہ) لو أن فقیراً یاخذ جائزة السلطان مع علمه أن السلطان یاخذها غصباً یحل له قال: ان خلط ذلك بدراهم أخرى فإنه لا بأس به وان دفع عين المغصوب من غیر خلط لم یجز..... وقال: لا یملک تلك الدراهم وهي علی ملک صاحبها فلا یحل له الأخذ.... الخ. وفيها أيضاً ج: ۵ ص: ۳۴۲ ولا یجوز قبول هدية أمراء الجور لأن الغالب فی مالهم الحرمة ألا اذا علم أن أكثر ماله حلال بأن كان صاحب تجارة أو زرع فلا بأس به لأن أموال الناس لا تخلوا عن قليل حرام فالمعتبر الغالب وكذا أكل طعامهم..... الخ.

وفيها أيضاً ج: ۵ ص: ۳۴۳ أكل الربوا وكاسب الحرام أهدى اليه أو أضافه وغالب ماله حرام لا یقبل ولا یأكل ما لم یخبره أن ذلك المال أصله حلال ورثه أو استقرضه وان كان غالب ماله حلالاً لا بأس بقبول هديته والأكل منها. اور ادارے کی اکثر آمدنی تو جائز ہو مگر اُس ادارے میں ناجائز کام کی ملازمت ہو، مثلاً سود کا حساب و کتاب کرنا پڑے تو ایسی ملازمت معصیت پر مشتمل ہونے کی وجہ سے ناجائز ہے، جیسا کہ درج ذیل عبارات سے واضح ہے:-

وفي الهداية باب الاجارة الفاسدة ج: ۳ ص: ۳۰۶ (طبع مکتبہ رحمانیہ) ولا یجوز الاستیجار علی الغناء والنوح وكذا سائر الملاهی لأنه استیجار علی المعصية والمعصية لا تستحق بالعقد.

وكذا فی خلاصة الفتاوى كتاب الاجارات جنس آخر فی المتفرقات ج: ۳ ص: ۱۱۶.

وفي الهندية ج: ۴ ص: ۴۴۹ (طبع رشیدیہ) ولا تجوز الاجارة علی شيء من الغناء والنوح والمزامير والطنبل وشيء من اللہو وعلی هذا الحداء وقرأة الشعر وغیره ولا أجر فی ذلك وهذا كله قول أبی حنیفة وأبی یوسف ومحمد رحمهم الله تعالى كذا فی غایة البیان لو استأجر لتعليم الغناء أو استأجر الذمی رجلاً لیخصی عبداً لا یجوز..... الخ.

وفي الدر المختار كتاب الاجارة مطلب فی الاستیجار علی المعاصی ج: ۶ ص: ۵۵ (طبع سعید) ولا تصح الاجارة لعسب التیس وهو نزوه علی الأنث ولا لأجل المعاصی مثل الغناء والنوح والملاهی ولو أخذ بلا شرط یباح.

وفي الشامیة تحته وفي المنتقى امرأة نائحة أو صاحبة طبل أو زمر اكتسبت مالاً ردته علی أربابه ان علموا وألا تصدق به وان من غیر شرط فهو لها. قال الامام الأستاذ: لا یطیب، والمعروف كالمشروط..... الخ.

وفي الهندية ج: ۴ ص: ۴۱۱ ومنها (أی من شرائط صحة الاجارة) أن یكون مقدور الاستیفاء حقيقة أو شرعاً فلا یجوز استیجار الآبق ولا الاستیجار علی المعاصی لأنه استیجار علی منفعة غیر مقدور الاستیفاء شرعاً.

وفي بدائع الصنائع ج: ۴ ص: ۱۸۹..... وكذا كل اجارة وقعت لمظلمة لأنه استیجار لفعل المعصية فلا یكون المعقود علیه مقدورة الاستیفاء شرعاً. نیز دیکھئے ص: ۴۱۰ کا حاشیہ نمبر ۱۔ (محمد بیرحق نواز)

جائز ہے تو کس قسم کی ملازمت اور کس وجہ سے جبکہ تنخواہ تو ظاہر ہے بینک سے ہی دی جائے گی؟

جواب:- محترمی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کا دوسرا سوال جو انگریزی میں تھا، اس کا جواب بھی اردو میں اس لئے دے رہا ہوں کہ آپ اردو جانتے ہیں۔

در اصل بینک کی ملازمت ناجائز ہونے کی دو وجہیں ہو سکتی ہیں، ایک وجہ یہ ہے کہ ملازمت میں سود وغیرہ کے ناجائز معاملات میں اعانت ہے، دوسرے یہ کہ تنخواہ حرام مال سے ملنے کا احتمال ہے، ان میں سے پہلی وجہ یعنی حرام کاموں میں مدد کا جہاں تک تعلق ہے، شریعت میں مدد کے مختلف درجے ہیں، ہر درجہ حرام نہیں^(۱)، بلکہ صرف وہ مدد ناجائز ہے جو براہ راست حرام کام میں ہو، مثلاً سودی معاملہ کرنا، سود کا معاہدہ لکھنا، سود کی رقم وصول کرنا وغیرہ۔^(۲) لیکن اگر براہ راست سودی معاملے میں انسان کو ملوث نہ ہونا پڑے، بلکہ اس کے کام کی نوعیت ایسی ہو جیسے ڈرائیور، چپراسی، یا جائز ریسرچ وغیرہ تو اس میں چونکہ براہ راست مدد نہیں ہے، اس لئے اس کی گنجائش ہے۔

جہاں تک حرام مال سے تنخواہ ملنے کا تعلق ہے، اس کے بارے میں شریعت کا اصول یہ ہے کہ اگر ایک مال حرام اور حلال سے مخلوط ہو اور حرام مال زیادہ ہو تو اس سے تنخواہ یا ہدیہ لینا جائز نہیں، لیکن اگر حرام مال کم ہو تو جائز ہے۔^(۳) بینک کی صورت حال یہ ہے کہ اس کا مجموعی مال کئی چیزوں سے مرکب ہوتا ہے، ۱- اصل سرمایہ، ۲- ڈپازٹرز کے پیسے، ۳- سود اور حرام کاموں کی آمدنی، ۴- جائز خدمات کی آمدنی، اس سارے مجموعے میں صرف نمبر ۳ حرام ہے، باقی کو حرام نہیں کہا جاسکتا، اور چونکہ ہر بینک میں نمبر ۲ کی اکثریت ہوتی ہے، اس لئے یہ نہیں کہہ سکتے کہ مجموعے میں حرام غالب ہے، لہذا کسی جائز کام کی تنخواہ اس سے وصول کی جاسکتی ہے۔

یہ بنیاد ہے جس کی بناء پر علماء نے یہ فتویٰ دیا ہے کہ بینک کی ایسی ملازمت جس میں خود

(۱) مدد اور اعانت کے مختلف درجات اور ان کے تفصیلی حکم کے لئے ”جواہر الفقہ“ ج: ۲، ص: ۳۵۷ تا ۳۵۹ ملاحظہ فرمائیں۔

(۲) وفي مشکوٰۃ المصابیح باب الربوا الفصل الاول ج: ۱ ص: ۲۳۴ (طبع قدیمی کتب خانہ) لعن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اکل الربوا وموكله وکاتبه وشاهديه وقال هم سواء، رواه مسلم۔ نیز تفصیلی عبارات اور حوالہ جات کے لئے سابقہ ص: ۳۹۳ و ص: ۳۹۴ کے حواشی ملاحظہ فرمائیں۔

(۳) وفي الهنديه ج: ۵ ص: ۳۴۲ ولا يجوز قبول هدية امراء الجور لأن الغالب في مالهم الحرمة ألا إذا علم أن أكثر ماله حلال بأن كان صاحب تجارة أو زرع فلا بأس به لأن أموال الناس لا تخلو عن قليل حرام فالمعتبر الغالب وكذا أكل طعامهم. وفيها أيضًا ج: ۵ ص: ۳۴۳ أكل الربوا وكاسب الحرام أهدى إليه أو أضافه وغالب ماله حرام لا يقبل ولا يأكل ماله لم يخبره أن ذلك المال أصله حلال ورثه أو استقرضه وإن كان غالب ماله حلالاً لا بأس بقبول هديته والأكل منها.... الخ.

کوئی حرام کام کرنا نہ پڑتا ہو، جائز ہے، البتہ احتیاط اس میں ہے کہ اس سے بھی اجتناب کیا جائے۔

والسلام

(۱) ۱۳۲۳/۴/۳ھ

بینک میں کلرک کی ملازمت

سوال :- محترم مفتی صاحب، السلام علیکم، سلام کے بعد آپ کی خیریت کا طالب ہوں۔ عرض یہ ہے کہ میں صوبہ سرحد پشاور شہر میں اکاؤنٹینٹ جنرل کے دفتر میں سینئر کلرک کے عہدے پر کام کر رہا ہوں، جس کی تنخواہ آج کل نئے الاؤنسوں اور مہنگائی الاؤنس کے ساتھ ۶۶۰ روپے بنتی ہے۔ لیکن میں نے حبیب بینک میں نوکری کے لئے درخواست دی تھی، جس کے ٹیسٹ اور انٹرویو وغیرہ میں میں پاس ہو چکا ہوں، اور اب کراچی سے میرے پیچھے ٹریننگ کے لئے بلانے کا خط آرہا ہے، یعنی میں منتخب ہو چکا ہوں۔ یہ عہدہ پروفیشنل آفیسر کا عہدہ ہے، اور اس کی تنخواہ آج کل تقریباً ۱۰۰۰ روپے کے لگ بھگ ہے، جس کے سودی کاروبار وغیرہ سے آپ خوب واقف ہیں، لہذا آپ صاحبان اگر مجھے فتویٰ بھیجنے کی تکلیف گوارا کریں تو میں از حد مشکور ہوں گا، فتویٰ میں یہ وضاحت ہونی چاہئے کہ میں یہ موجودہ نوکری چھوڑ کر بینک کی نوکری کروں یا نہیں؟

جواب :- بینک کی ملازمت شرعاً حرام اور ناجائز ہے،^(۲) اور حرام آمدنی خواہ زیادہ ہو، مگر ایک مسلمان کے لئے بے کار ہے، کم تنخواہ پر قناعت کرنا اور حلال کمانے کی خاطر زیادہ آمدنی کو چھوڑ دینا ان شاء اللہ دنیوی و اخروی برکات کا موجب ہوگا۔

واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۹/۹/۷ھ

(فتویٰ نمبر ۱۵۸۸/۳۰ ج)

بینک کی ملازمت کا حکم

سوال ۱:- بینک کی ملازمت کے لئے شرعی حکم کیا ہے؟

۲:- اگر ملازمت اختیار کر چکا ہے تو قائم رکھے یا نہیں؟

جواب :- بینک کا بیشتر کاروبار چونکہ سود پر مبنی ہے، اس لئے اس کی ملازمت جائز نہیں۔^(۳)

(۱) یہ فتویٰ حضرت والا دامت برکاتہم نے جوابی خط کی صورت میں تحریر فرمایا۔

(۲) بینک ملازمت کی دو قسموں کے تفصیلی حکم اور حوالہ کے لئے پچھلے ص: ۳۹۵ کا فتویٰ اور اس کا حاشیہ ملاحظہ فرمائیں۔

(۳) یہ بینک کی اس ملازمت کا حکم ہے جس میں سودی معاملات کرنے پڑتے ہوں۔ تفصیل کے لئے سابقہ دونوں فتاویٰ اور ان کے حواشی ملاحظہ فرمائیں۔ وفی تکملة فتح الملهم ج: ۱ ص: ۶۱۹ قوله: وکاتبه، لأن کتابة الربا أعانة علیه ومن هنا ظهر أن التوظيف فی البنوك الربویة لا يجوز فان كان عمل الموظف فی البنك ما یعین علی الربا کالكتابة أو الحساب فذلک حرام لوجهین، الأول أعانة علی المعصیة، والثانی أخذ الأجرة من مال الحرام..... الخ.

۲:- دوسری جائز ملازمت حاصل کرنے کے لئے پوری کوشش کرے اور جب تک نہ ملے دُعا و توبہ و استغفار کرتا رہے، اور ملتے ہی یہ ملازمت چھوڑ دے، پھر جب اللہ توفیق دے بینک سے کمائی ہوئی رقم رفتہ رفتہ صدقہ کر دے۔

واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم

۱۳۹۸/۲/۸ھ

(فتویٰ نمبر)

حلال روزگار ملنے تک بینک کی ملازمت جاری رکھنے

کے مشورے کی شرعی حیثیت

سوال:- محترم و مکرم جناب مفتی صاحب اَطال اللہ بقائه

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، اما بعد:

آپ کی توجہ ایک اہم مسئلے کی طرف مبذول کرنا چاہتا ہوں، وہ ہے بینک کی ملازمت کا۔ ہمارا معاشرہ ایک سودی معاشرہ ہے، ربا، قمار کی نت نئی شکلیں آئے دن سامنے آتی ہیں، اور انہیں ترقیاتی اسکیموں کے نام سے پیش کیا جاتا ہے۔ بینک کی ملازمت اشد حرام ہے، اس بناء پر بعض لوگ اس حرام سے چھٹکارے کی نیت سے اہل علم حضرات کا رخ کرتے ہیں، اور بڑی معصومیت سے اپنی خستہ حالی کی سرگزشت سناتے ہیں، ”اگر میں یہ ملازمت چھوڑ دوں گا، تو میری مسکین بیوی، چھوٹے چھوٹے ننھے منے پھول، کلیوں جیسے بچوں اور معمر ضعیف، معذور، مریض والدین اور جواں سال بے سہارا بے چاری بہنوں کے گزر کا سامان ہی کیا ہوگا، سوائے اس حرام تنخواہ کے۔“ اہل علم حضرات رحم دل و غم خوار تو ہوتے ہی ہیں، اُن کی طرف سے غالباً متفقہ طور پر ایک ہی نوعیت کا جواب ملتا ہے، اور وہ آپ حضرات کو بخوبی معلوم ہے، جس کا مختصر خلاصہ یہ ہے کہ ”بینک کی ملازمت حرام ہے، اور اس کی تنخواہ حرام ہے، لیکن دوسری ملازمت کی تلاش جاری رکھو اور جب تک کوئی متبادل صورت نہ بنے بینک کی یہ حرام ملازمت کرتے رہو، اور اس کی حرام تنخواہ سے اپنے بیوی بچوں والدین اور بہنوں کے حقوق ادا کرتے رہو۔“ ایمانی تنزل اور اس سر توڑ مہنگائی، بڑھتے ہوئے اخراجات اور ہوئی پرستی کے دور میں ایک بینک منیجر کے لئے اس قدر ہمدردی کافی تھی، جواز کا یہ پروانہ اُسے خدا اور رسول سے ڈٹ کر مقابلے پر آمادہ کرتا ہے، بندے سے بھی بارہا اس طرح استفتاء کیا گیا، دل کسی بھی صورت میں جواز کا فتویٰ دینے پر آمادہ نہ ہوا۔ آپ ہمارے بڑے ہیں، ایک خالی ہاتھ فقیر کی طرح آپ اہل علم حضرات کا دروازہ کھٹکھا کر بھیک مانگتا ہوں، ”فَسْئَلُوا أَهْلَ الذِّكْرِ إِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ“ قرآن و حدیث و اقوال

فقہائے کرام یا قواعد فقہیہ میں سے جن دلائل کا سہارا لے کر جواز کا فتویٰ دیا جاتا ہے مفصل و مدلل بیان فرمادیں تو بڑی مہربانی ہوگی۔ جزاکم اللہ خیراً۔

جواب :- مکرّم بندہ زید مجدّم السامی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ جو بات کہی جاتی ہے اس کا مطلب جواز کا فتویٰ دینا نہیں ہوتا، فتویٰ حرمت ہی کا ہے، آگے اسے مشورۃ یہ کہا جاتا ہے کہ اگر موجودہ ملازمت ترک کرنے سے ناقابل برداشت تنگی کا اندیشہ ہو تو اس ملازمت کو حرام سمجھتے ہوئے دوسری ملازمت اس طرح تلاش کرو جیسے ایک بے روزگار آدمی تلاش کرتا ہے، خواہ تنخواہ کچھ کم ہی کیوں نہ ہو، جب وہ مل جائے تو ترک کر دو۔ میں نے اپنے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب قدس سرہ سے سنا ہے کہ اس مشورے کا حاصل اہون البلیتین پر عمل کرنا ہے، کیونکہ بعض اوقات ترک ملازمت کے بعد فقر و فاقے میں مبتلا ہو کر لوگوں کے دین و ایمان ہی سے برگشتہ ہونے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ اور ایسا یاد پڑتا ہے کہ حضرت والد صاحب نے یہ بات حضرت حکیم الامت قدس سرہ سے بھی نقل فرمائی تھی، مگر احقر کو یہ بات جزم کے ساتھ یاد نہیں۔

والسلام
۱۳۲۱/۳/۳ (۲)

غیر مذبوح جانور کا گوشت فروخت کرنے والی کمپنی میں اکاؤنٹینٹ کی ملازمت کا حکم

سوال :- محترم مفتی صاحب! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

ایک صاحب جو کینیڈا میں حال ہی میں معاش کے لئے گئے ہیں، اُن کی طرف سے سوال کیا ہے کہ کیا فرماتی ہے شریعت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اس بارے میں کہ اُن کو ایک ایسی کمپنی میں

(۱) وفي الصحيح للإمام مسلم رقم الحديث: ۳۹۷۲ لعن رسول الله صلى الله عليه وسلم أكل الربوا وموكله وكتبه وشاهديه وقال هم سواء. مشکوة المصابيح ج: ۱ ص: ۲۴۴ (طبع قديمی کتب خانہ).

وفي تكملة فتح الملهم ج: ۱ ص: ۶۱۹ (قوله وكتبه) لأن كتابة الربا اعانة عليه ومن هنا ظهر أن التوظيف في البنوك الربوية لا يجوز فان كان عمل الموظف في البنك ما يعين على الربا كالكتابة والحساب فذلك حرام لوجهين الأول اعانة على المعصية، والثاني أخذ الأجرة من المال الحرام، فان معظم دخل البنوك حرام مستحلب بالربا وأما اذا كان العمل لا علاقة له بالربا فانه حرام للوجه الثاني فحسب فاذا وجد بنك معظم دخله حلال جاز فيه التوظيف للنوع الثاني من الأعمال والله أعلم.

نیز تفصیلی عبارات کے لئے دیکھئے ص: ۳۹۳ تا ص: ۳۹۶ کے فتاویٰ اور اُن کے حواشی۔

(۲) یہ فتویٰ حضرت والا دامت برکاتہم نے سائل کے مذکورہ خط کے جواب میں تحریر فرمایا۔

ملازمت کی پیشکش ہوئی ہے جو گوشت پیک کر کے سپلائی کرتی ہے، ظاہر ہے کہ کینیڈا میں یہ گوشت عام طور پر حلال نہیں ہوتا، اور اس کی تمام چیزیں جو وہ کمپنی بناتی ہے وہ حلال نہیں ہیں۔ اس کمپنی کا جس میں ان صاحب کو ملازمت کی پیشکش کی گئی ہے سوائے گوشت اور گوشت کی دیگر خوردنی مصنوعات کو بنانے کے علاوہ اور کوئی کام نہیں ہے۔ ان صاحب کو اس کمپنی کے اکاؤنٹ ڈپارٹمنٹ میں ملازمت کی پیشکش ہے، اُن کا پوچھنا یہ ہے کیا ایسی کمپنی میں ملازمت اُن کے لئے لینا جائز ہوگا یا نہیں؟ خاص طور پر ایسی صورت میں کہ ابھی اُنہوں نے ہجرت کی ہے اور وہ معاش کی تلاش میں کچھ دنوں سے پھر رہے ہیں اور اُنہیں کوئی خاطر خواہ ملازمت نہیں مل رہی، جواب ارشاد فرما کر مشکور فرمائیں۔

جواب:- صورتِ مسئلہ میں مذکورہ کمپنی کے اکاؤنٹ ڈپارٹمنٹ میں ملازمت کی گنجائش معلوم ہوتی ہے، وجہ یہ ہے کہ غیر مذبح گوشت اگرچہ ہمارے نزدیک حلال نہیں اور اس کی خرید و فروخت بھی جائز نہیں، لیکن غیر مسلموں کے نزدیک چونکہ جائز ہے، اس لئے فقہائے کرام نے ان کے درمیان ہونے والی ایسی بیع کو نافذ قرار دیا ہے، اور اس کی مالیت کا اعتبار کیا ہے، لہذا اس خرید و فروخت سے انہیں جو رقم حاصل ہوئی ہے، وہ عقدِ باطل کے ذریعے نہیں ہوئی۔ البتہ کسی مسلمان کو بذاتِ خود اس خرید و فروخت میں ملوث ہونا جائز نہیں۔ لیکن اکاؤنٹ کی ملازمت میں اگر مسلمان کو خود یہ گوشت پہچانہ پڑے بلکہ صرف کمپنی کے حسابات رکھنے پڑیں تو یہ اعانت علی المعصیۃ میں داخل ہو کر حرام نہ ہوگا، کیونکہ یہ اعانتِ بعیدہ ہے، لہذا حاجت کے وقت اس ملازمت کی گنجائش معلوم ہوتی ہے۔ تاہم پرہیز کرنے میں احتیاط ہے۔ اور اس معاملے میں دوسرے اہلِ فتویٰ علماء سے بھی استصواب کر لینا چاہئے، اگر ان کا جواب اس سے مختلف ہو تو ہمیں بھی مطلع کر دیا جائے۔ متعلقہ فقہی عبارات منسلک ہیں۔

واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم

۱۴۲۲/۶/۲۸ھ

(فتویٰ نمبر ۷۵/۴۹۶)

(متعلقہ فقہی عبارات درج ذیل ہیں)

فی البحر (ج: ۶ ص: ۷۰ طبع سعید) قال تحت قوله (لم یجز بیع المیتة والدم) لانعدام المالیه التي هی رکن البیع فانهما لا یعدان ما لا عند أحد وهو من قسم الباطل وفي القاموس المیتة ما لم تلحقه ذکاة وبالکسر للنوع اه فان ارید بعدم الجواز عدمه فی حق المسلمین بقیت المیتة علی اطلاقها وان ارید الأعم للمسلم والکافر فیراد بها ما مات حتف انفه، اما المنخنقة والموقوذة فغیر داخله لما فی التجنیس، اهل الکفر اذا باعوا

المیة فیما بینهم لا يجوز لانها لیست بمال عندهم، ولو باعوا ذبیحتهم وذبحهم ان یخنقوا الشاة ویضربوها حتی تموت جاز لانها عندهم بمنزلة الذبیحة عندنا، وفی جامع الکرخی يجوز البیع عندهم عند أبی یوسف خلافاً لمحمد لأبی یوسف انهم یتمولونها کالخمر ولمحمد ان احکامهم كأحکامنا الا فی الخمر، وفی الذخیرة اراد بالمیة ما مات حتف انفه اما التی ماتت بالسبب کالخنق والجرح فی غیر موضع الذبح فالبیع فاسد لا باطل، وكذلك ذبائح المجوس مال متقوم عندهم بمنزلة الخمر، کذا فی المعراج، وحاصله ان فیما لم یمت حتف انفه بل بسبب غیر الذکاة رواتین بالنسبة الی الکافر وفی روایة الجواز، وفی روایة الفساد، واما البطلان فلا، واما فی حقنا فالکل سواء.

فی البناية (ج: ٤ ص: ١٨٨ طبع رشیدیة) تحت قوله (فالبيع فاسد کالبيع بالمیة) والمیة فی اللغة هو الذی مات حتف انفه وانما قید باللغة لتخرج المخنوقة وأمثالها فان ذلک عند من لیس له دین سماوی بمنزلة الذبیحة عندنا، ولهذا باعوا ذلک فیما بینهم جاز، وکره المصنف فی التجنیس وان کان میة عندنا بخلاف المیة حتف انفها فان بیعہ فیما بینهم لا يجوز ولانها لیست بمال عندهم.

فی تبیین الحقائق (ج: ٢ ص: ٣٦٢ طبع سعید) قال بعد قوله لم یجز بیع المیة لعدم رکن البیع وهو مبادلة المال بالمال، وبیع هذه الأشياء باطل لما ذکرنا.

وفیه أيضاً بعد أسطر: والأصل فیہ ان بیع ما لیس بمال عند أحد کالحر والدم والمیة التی ماتت حتف انفها والمدبر وام الولد والمکاتب باطل، وان کان مالا عند البعض کالخمر والخنزیر والمیة التی لم تمت حتف انفها، مثل الموقوذة فان هذه الأشياء مال عند أهل الذمة.

فی شرح الوقایة (ج: ٣ ص: ٣٩ طبع رحمانیة) اعلم ان المال عین یجرى فیہ التنافس والابتذال فیخرج التراب ونحوه، والدم والمیة التی ماتت حتف انفه اما التی خنقت أو جرحت فی غیر موضع الذبح کما هو عادة بعض الکفار وذبائح المجوس فمال الا انها غیر متقومة کالخمر والخنزیر.

فی الدر المختار (ج: ٥ ص: ٥٥، ٥٦ طبع سعید) قوله (کخمر وخنزیر

وميتة لم تمت حتف انفها) بل بلخنق ونحوه فانها مال عند الذمى كخمر وخنزير.

وقال الشامى تحت قوله (وميتة لم تمت حتف انفها) هذا فى حق المسلم، اما الذمى ففى رواية بيعها صحيح، وفى أخرى فاسد كما قدمناه عن البحر.

فى فتح المعين (ج: ۲ ص: ۶۶ طبع سعيد) تحت قوله (فبيع الميتة) يعنى التى ماتت حتف انفها اما غيرها مثل الموقوذة فمال عند أهل الذمة كالخمر زيلعى.

وفيه أيضاً بعد أسطر: ثم لا فرق فى حق المسلم بين التى ماتت حتف انفها أو كانت منخنقة أو موقوذة أو ماتت بالجرح فى غير الذبح اما فى حق الذمى فيراد بها الأول وأما الثانى فاختلف فيه فى التجنيس جعله من قسم الصحيح لأنهم يدينونه ولم يحك خلافاً وفى الايضاح هو قول ابى يوسف وعند محمد لا يجوز وجزم فى الذخيرة بفساده والموقوذة هى التى قتلت بالخشب.

فى الطحطاوى على الدر (ج: ۳ ص: ۶۳ طبع بولاق مصر) تحت قوله (الميتة) بفتح الميم وسكون الياء هى التى ماتت حتف انفها لا بسبب والميتة بفتح الميم وتشديد الياء المكسورة هى التى لم تمت حتف انفها بل ماتت بسبب غير الذكاة كالمنخنقة والموقوذة، والقسم الأول ليس بمال عند المسلمين وأهل الذمة اتفاقاً والقسم الثانى ليس بمال فى حق المسلمين اتفاقاً وفى حق أهل الذمة روايتان وقال الشيخ كمال الدين انها فى حق الميتة شرعاً وانما نحكم بجوازه اذا وقعت بينهم لأنها مال عندهم كالخمر كذا ذكره المصنف فى التجنيس من غير ذكر خلاف وفى جامع الكرخى يجوز بينهم عند ابى يوسف خلافاً لمحمد انتهى ملخصاً من حاشية المرحوم نوح وحاصله كما فى البحر.

فى مجمع الأنهر (ج: ۳ ص: ۷۷ طبع دار الكتب العلمية بيروت) تحت قوله (بيع ما ليس بمال الى قوله والميتة) التى ماتت حتف انفها لانه المنخنقة وامثالها مال عند أهل الذمة.

فى الدر المنتقى فى شرح الملتقى (ج: ۳ ص: ۷۸ طبع علمية) تحت قوله (بيع مال غير متقوم كالخمر والخنزير) وقال عبدالواحد وغيره البيع

فیهما فاسد لا باطل کما فی النظم و کذا بیع ما مات بخنق و جرح کما فی
الکشف لکن فی المحيط بیع منخنق المجوسی باطل خلافاً لمحمد
وهكذا فی القہستانی (ج: ۳ ص: ۴۵۶).

فی شرح المجلة (ج: ۲ ص: ۱۰۳ طبع مکتبہ حبیبیہ کوئٹہ) و قول
المجلة باع جيفة ای میتة ماتت حتف انفها، اما لو ماتت بسبب غیر
الذکاة کالمنخقة والموقوذة والمتردية، ففي حق المسلم لا فرق بينها
وبين الميتة حتف انفها من حيث بطلان البيع الى قوله واما فی غیر المسلم
ففي التجنيس جعله قسماً من الصحيح لأنهم يدينونه ولم يحك فيه خلافاً
وجزم فی الذخيرة بفساده وجعله فی البحر من اختلاف الروایتين وفي
البزازية علی هامش الهندية ج: ۲ ص: ۳۷۲ (طبع رشیدیہ) و بیع
المجوسی ذبیحة أو ما هو ذبح عنده كالخنق من کافر جاز عند الثانی.

سودی بینک کو مکان کرایہ پر دینے اور اس کے لئے بروکری کا حکم

سوال ۱:- سودی بینک کے لئے مکان کرایہ پر دینا جائز ہے یا نہیں؟ ملنے والا کرایہ حلال

ہے یا حرام؟

سوال ۲:- مذکورہ صورت میں بروکری جائز ہے یا نہیں؟ بروکری کی صورت میں ملنے والا

محمد عامر، جامعۃ الرشید کراچی

کمیشن حلال ہے یا حرام؟

جواب ۱:- ”جواهر الفقہ“ میں اعانة علی المعصية کے بارے میں مفصل تحقیق اسی

بارے میں ہے، وہ دیکھ لیں، خلاصہ یہ کہ اگر وہ مکان خاص بینک کے مقاصد کو مد نظر رکھ کر بنایا گیا ہے
تو ناجائز ہے، ورنہ مکروہ۔^(۱)

جواب ۲:- جہاں جواز ہے وہاں دلالی بھی جائز،^(۲) جہاں ناجائز ہے وہاں دلالی بھی ناجائز۔

واللہ اعلم

۱۴۲۵/۱۲/۲۹ھ

(۱) ”جواهر الفقہ“ میں ہے: ”اگر یہ دیکھا جائے کہ بنانے والے نے بینک کی مناسبت سے کمرے بنوائے ہیں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ
کراہت تحریم ہے، اور اگر یہ سمجھا جائے کہ ایسے کمرے صرف بینک ہی کے لئے نہیں دوسرے کاموں اور دفاتر کے لئے بھی بنتے ہیں، تو
کراہت تنزیہیہ کہا جاسکتا ہے۔“ تفصیلی دلائل اور حوالہ جات کے لئے ”جواهر الفقہ“ ج: ۲ ص: ۴۶۲ تا ۴۳۹ ملاحظہ فرمائیں۔

(۲) وفي الشامية ج: ۶ ص: ۶۳ (طبع سعید) مطلب فی اجرة الدلال قال فی التاترخانية وفي الدلال والسمسار
يجب أجر المثل وما تواضعوا عليه أن فی كل عشرة كذا فذاک حرام عليهم. وفي الحاوی سنل محمد بن سلمة عن
أجرة السمسار فقال: أرجوا أنه لا بأس به وان كان فی الأصل فاسداً لكثرة التعامل وكثير من هذا غير جائز فجوزوه
لحاجة الناس.

وكذا فی البحوث فی قضايا فقهية معاصرة ص: ۲۰۷ و ۲۰۸.

﴿فصل فی الإجارة الجديدة والمتفرقة﴾

(اجارہ کے جدید اور متفرق مسائل کا بیان)

انٹرنیٹ سروس مہیا کرنا اور اس پر فیس وصول کرنا

سوال:- حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ کے بعد عرض ہے کہ میں ح.ب.س. بٹ میرا تعلق مکہ مکرمہ سے ہے اور حضرت مولانا عبدالحفیظ مکی (دامت برکاتہم) میرے ماموں ہیں، اور میں نے ان سے سوال کیا کہ میں ایک کام کرنا چاہ رہا ہوں اور اس میں سوال یہ ہے کہ آیا اس کام میں شریعت کی مخالفت تو نہیں؟ تو انہوں نے فرمایا کہ آپ سے عرض کر کے جواب مفصل حاصل کروں۔ لہذا آپ سے درخواست ہے کہ اپنی رائے سے مستفید فرمائیں۔ میں ایک انٹرنیٹ کیفے (جہاں پر لوگ انٹرنیٹ استعمال کرنے کے لئے آتے ہیں) کھولنا چاہ رہا ہوں، تھوڑی سی وضاحت کرنا چاہتا ہوں کہ یہاں سعودی عرب میں انٹرنیٹ مکمل طور پر صاف ہے (یعنی جو بھی غیر اخلاقی مواد ہے وہ حکومت کی طرف سے بند کیا گیا ہے)۔ اور انٹرنیٹ کو لوگ اپنے اپنے طریقے سے استعمال کرتے ہیں، مثال کے طور پر کچھ لوگ اسے ٹیلیفون کے لئے استعمال کرتے ہیں (اس میں ٹیلیفون کافی سستا ہوتا ہے)، کچھ لوگ اسے تعلیمی مصالح کے لئے استعمال کرتے ہیں، کچھ لوگ اس سے تجارتی استفادہ کرتے ہیں، اور بھی بہت کچھ۔ مگر احتیاط کے طور پر یہ سوال کر رہا ہوں کہ آیا اس کام میں شریعت کی مخالفت تو نہیں؟ اُمید ہے کہ آپ متوجہ ہو کر مستفید فرمائیں گے، اور اگر لکھنے میں کوئی کوتاہی ہو گئی ہو تو معافی چاہتا ہوں۔

آپ سے دُعاؤں کا اُمیدوار اور جواب کا منتظر

ح.ب.س. بٹ، مکہ مکرمہ سعودی عرب

جواب:- اگر حکومت کی طرف سے غیر اخلاقی مواد بند کر دیا گیا ہے تو اس قسم کی انٹرنیٹ

سروس مہیا کرنا اور اس پر فیس وصول کرنا جائز ہے۔

واللہ سبحانہ اعلم

۱۴۲۰/۱۲/۲۴ھ

(فتویٰ نمبر ۸۱/۴۰۳)

کمپنی کی گاڑی خراب ہونے کی صورت میں گاڑی کی دُرستی و مرمت اور متبادل انتظام فراہم کرنے کا ایک جدید عقد اور اس کی شرعی حیثیت (عربی فتویٰ)

سوال:- وما يقول الشيخ أدام الله عزه في عقد خدمات يدفع فيه صاحب السيارة مبلغًا محددًا لشركة تقوم باصلاح السيارة أو نقله من طرق المدينة أو الطريق السريع الى أى مكان يختاره اذا تعطلت سيارته، وانخطورة هي في الطريق السريع لأنها بين المدن وليست آمنة تمامًا، واذا تعطلت السيارة في ذلك الطريق ألزمت الشرطة صاحب السيارة بنقلها على الفور الأمر الذى يكلفه ضعف ذلك المبلغ المحدد، فهل يجوز التعاقد على ذلك حيث لا يعرف هل تتعطل السيارة أم لا.

سائلًا المولى عزّ وجلّ لكم التوفيق والسداد ودوام العافية، وأرجوا منكم الدعاء
فنحن في بلد غير مسلم والله المستعان، والسلام عليكم ورحمة الله وبركاته

راجى رحمة ربّه

محمد علي محمد احداش

جواب:- وسؤالك الثانى: يتعلق بعقد صيانة السيارة ونقلها، وإن مثل هذه العقود قد انتشرت في عصرنا، مثل عقود صيانة السيارات، والحاسب الآلى والمعدات الكهربائية وغيرها، والواقع أن هذا العقد لا ينطبق تمامًا على أحد من العقود المعروفة في الفقه الاسلامى، فإن اعتبرناه عقد الإجارة فإنه لا يصح على كونه متضمنًا للغرر^(۱) فإنه لا يعرف هل تحتاج السيارة إلى صيانة أو نقل أم لا؟ وقد كيّفه بعض المعاصرين على أساس الجعالة، ولكننى غير مقتنع تمامًا على هذا التكييف، فإن عقود الجعالة تعتمد على عمل نشأ سببه عند العقد، إلا أن نقول: إن وجود السيارة يلزمه أن تحتاج الى صيانة فى وقت أو آخر.

وبالجملة، فلم ينشرح صدرى حتى الآن على تكييف مقبول لهذا العقد، ويبدو أنه أشبه بالتأمين منه بالجعالة أو الإجارة، وقد طرح الموضوع على مجمع الفقه الاسلامى، ولم يتمكن من إصدار قرار فيه حتى الآن، ولكن الحاجة داعية الى مثل هذه العقود فى عصرنا، فينبغى أن ينظر فيه الفقهاء ويلتمسوا له تكييفًا مقبولًا أو بديلاً مناسباً، والله سبحانه أعلم

والسلام عليكم ورحمة الله

أخوكم: محمد تقى العثمانى

٢٠٠٣/٢/٢٩

(۱) فى كتاب المبسوط: فى كتاب الشرب: قال أبو يوسف سألت أبا حنيفة عن الرجل استأجر النهر يصيد فيه السمك أو استأجر جهة يصيد فيها السمك، قال: لا يجوز. وذلك كله من باب الغرر.

پگڑی کی شرعی حیثیت

سوال:- پگڑی پر مکان لے کر کسی دوسرے کو وہی مکان کرایہ پر دینا اور اس طرح کاروبار کرنا جائز ہے یا نہیں؟ کرایہ کی صورت میں جو آمدنی ہوگی وہ میرے لئے جائز ہوگی یا نہیں؟

جواب:- پگڑی کا لین دین شرعاً جائز نہیں^(۱)، البتہ کرایہ جتنا زیادہ مقرر کرنا چاہے مالک مقرر کر سکتا ہے، اور یہ بھی ممکن ہے کہ پہلے مہینے کا کرایہ زیادہ مقرر کر دے اور بعد کے مہینوں کا کم۔

واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم

۱۳۹۷/۱۰/۵ھ

(فتویٰ نمبر ۱۰۲۰/۲۸ ج)

”پگڑی“ کا حکم

سوال:- ایک دکان مثلاً ۲۵ ہزار پگڑی لے کر کرایہ پر دے دی جائے تو جائز ہے یا نہیں؟ یہ دکان مالک کے قبضے میں ہے اور مالک کرایہ پر دے رہا ہے۔

جواب:- مروجہ پگڑی کا لین دین شرعاً جائز نہیں ہے۔^(۲)

واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۷/۲/۱۳ھ

(فتویٰ نمبر ۲۲۸/۲۸ الف)

پگڑی کی مخصوص صورت

(ایک شریک کی طرف سے شرکت ختم کرنے کی صورت میں دوسرے شریک

سے کرایہ کی دکان کی مد میں کچھ رقم لینے کا حکم)

سوال:- زید اور عمر بہت عرصے سے مال میں شریک تھے، دونوں نے شراکت کے زمانے

میں ایک دکان کرایہ پر لی تھی، دکان کے اوپر ایک کمرہ ہے جس کا اوپر کوئی دروازہ نہیں ہے، البتہ نیچے دکان کے اندر سے ایک آدمی کا آنے جانے کا راستہ ہے، وہ راستہ بھی عارضی ہے، وہ اس طریقے سے

(۲۱) فی البحوث فی قضایا فقہیہ معاصرۃ ص: ۱۱۴ تحقیق مما ذکرنا انّ البدل الخلو المتعارف الذی يأخذہ المؤجر من مستأجره لا يجوز ولا یتطبق هذا المبلغ المأخوذ علی قاعدة من القواعد الشرعیة و لیس ذلک الارشوة حراماً.

کہ دکان کے اندر عارضی سیڑھی لگا کر آدمی اوپر کمرے کو چلا جاتا ہے، پھر آدمی کو اترتے وقت پھر سیڑھی لگا کر اترنا پڑتا ہے، یہ بات واضح رہے کہ دکان کے اوپر جو کمرہ ہے اس کا اوپر کوئی دروازہ نہیں ہے، مذکورہ دکان کو یعنی اس کرائے کی دکان کو دو حصے کر کے ایک حصے کو کرایہ پر دے دیا اور ایک حصے میں اپنی شرکت کا کاروبار کر رہے ہیں، اب زید و عمر شراکت کو ختم کر کے زید عمر سے کہتا ہے کہ کرایہ کی دکان کو تو لے لینا مجھ کو اس کی قیمت دے دینا، عمر اس پر راضی ہوا، عمر نے اس کرایہ کی دکان کی قیمت قسطوں میں کچھ عرصے میں ادا کی، زید نے ایک سال کے عرصے کے بعد عمر پر دعویٰ کیا کہ تو نے جو قیمت دی ہے وہ نیچے دکان کی دی ہے، دکان کے اوپر کمرے کا حصہ لے سکتا ہے یا نہیں؟

جواب:- صورتِ مسئلہ میں عمر کے ذمے دکان کے مال کے آدھے حصے کی قیمت ادا کرنا واجب تھا، جو وہ ادا کر چکا ہے، جہاں تک دکان کا تعلق ہے چونکہ وہ ان شریکوں کی ملکیت نہیں تھی بلکہ دونوں نے کسی سے کرائے پر لی ہوئی تھی، اور عمر آئندہ بھی اس دکان میں کاروبار کرے گا تو اس کا کرایہ مالک دکان کو ادا کرتا رہے گا، لہذا دکان کے سلسلے میں عمر کے ذمے کوئی رقم زید کی نہیں تھی، جتنی رقم اُس نے دی وہ بھی زیادہ دی، اس اوپر کے حصے میں زید کا مطالبہ شرعاً بالکل ناجائز ہے، عمر کے ذمے کچھ واجب نہیں ہے، شریعت کی رو سے پگڑی کا لین دین بھی جائز نہیں ہے۔^(۱)

واللہ سبحانہ اعلم

۱۴۰۱/۱۰/۲۶ھ

(فتویٰ نمبر ۱۶۱۵/۳۲ ج)

پگڑی کی صورت

سوال:- یہاں پر کمرے وغیرہ عمدہ عمدہ قیمت میں نیلام ہوتے ہیں، اور ماہانہ کرائے کی ایک خاص مقدار مقرر ہے، اس کے باوجود مالکان مالک بڑی بڑی رقوم طلب کرتے ہیں، مسجد کا وقف شدہ مکان و کمرہ نیلام کرنا جائز ہے یا نہیں؟

جواب:- یہ پگڑی کی صورت ہے اور حقِ استیجار کی بیع ہے، جو حقِ مجرّد ہے، اور حقوقِ مجرّدہ کی بیع شرعاً ناجائز ہے، اس لئے ایسا نیلام کرنا درست نہیں۔^(۲)

واللہ اعلم

۱۳۹۷/۱/۲۹ھ

(فتویٰ نمبر ۱۹۲/۲۸ الف)

۱:- ویزا لگانے کی اجرت کا حکم

۲:- کسی کو مختلف غیر قانونی طریقوں سے باہر ملک بھجوانے کی اجرت کا حکم

۳:- صرف ٹکٹیں بیچنے کے لائسنس پر ٹکٹوں کے علاوہ

ویزے لگوانے کا کام کرنا

سوال:- محترم مفتی صاحب! مندرجہ ذیل چند مسئلے قرآن کی روشنی میں تحقیق کر کے بتائیں

کہ شریعت میں اس کی کیا حیثیت ہے؟

۱:- ایک عام آدمی بیرون ملک مثلاً امریکا، یورپ یا روس وغیرہ کا ویزا یا کسی اور اسلامی ملک

کا ویزا لگانا چاہتا ہے، ہم سے وہ رجوع کرتا ہے، ہم اس ملک کی ایمبسی کے کنسلر سے مل کر اسے پیسے

دیتے ہیں تاکہ وہ اس آدمی کو ویزا ضرور دے دیں، اس میں اگر ہم اپنے لئے اس آدمی سے زیادہ

روپے لے لیں تو وہ ہمارے لئے حلال ہیں یا حرام؟

۲:- ایک آدمی ہمارے پاس آتا ہے کہ مجھے باہر کے کسی ملک میں پہنچا دو، ہم ٹریول ایجنسی

والے اس کے ساتھ خاص ریٹ پر متفق ہوتے ہیں، اس کے بعد اس کی تصویر ایسے دوسرے شخص کے

پاسپورٹ پر لگا دیتے ہیں جس کا ویزا لگا ہوتا ہے، اور وہ نہیں جانا چاہتا یا اس کے پاس دو پاسپورٹ ہیں

جس میں دونوں پر ویزا ہے، تو اس کی تصویر تبدیل کر کے اور ایئرپورٹ میں روپے دے دیتے ہیں تاکہ

اس کو نہ روکیں، اس طریقے سے کمائی حلال ہے یا حرام؟

۳:- بہت سے افغانیوں نے پاکستانی پاسپورٹ بنائے ہیں اور سعودی عرب یا امارات وغیرہ

کے ویزے لگائے ہوئے ہیں، لہذا جب وہ جاتے ہیں تو ان کے پکڑنے کا اندیشہ ہوتا ہے، اس لئے وہ

ٹریول ایجنسی سے رابطہ کرتے ہیں، ٹریول ایجنسی والے ایئرپورٹ میں F.I.A والوں سے بات کر کے

پیسے دیتے ہیں تاکہ اس کو جانے دیا جائے، اس میں ٹریول ایجنسی والے بھی اپنے لئے روپے رکھ لیتے

ہیں، اس صورت میں ٹریول ایجنسی کی کمائی حلال ہے یا حرام؟

۴:- ٹریول ایجنسی کا حکومتی لائسنس دو طرح کا ہوتا ہے، ایک میں صرف ٹکٹیں بیچنے کی

اجازت ہوتی ہے، اور دوسرے لائسنس میں صرف ویزے لگانے کی اجازت ہوتی ہے، لیکن دونوں

طرح کی ایجنسیاں دونوں کام کرتی ہیں، یعنی ٹکٹیں بیچنا اور ویزے لگانا، حکومت یہ جانتے ہوئے خاموش

ہے، کیا اس طرح اجازت کے بغیر دونوں کاموں سے کمانا جائز ہے یا ناجائز ہے؟ برائے مہربانی تحقیق کر کے قرآن و حدیث کی روشنی میں فتویٰ لکھ کر عنایت فرمائیں۔

۵:- ایک آدمی نے ہم کو کسی کام کے لئے روپے دے دیئے یا کوئی چیز ضمانت کے طور پر رکھ دی اور اُس کا کام ابھی ہوا نہیں ہے کہ وہ پشیمان ہو گیا اور اُس کے کام پر ہمارے روپے خرچ نہیں ہوئے یا کم خرچ ہوئے ہیں، اور چونکہ معاہدہ توڑا ہے تو ہم اُس سے زیادہ لیں تو کیا یہ زیادہ رقم لینا حلال ہے یا حرام؟

جناب مفتی صاحب! مندرجہ بالا مسئلوں کو قرآن و حدیث کی روشنی میں حل کر کے لکھیں اور برائے مہربانی مندرجہ ذیل پتے پر ارسال کریں، مجھے شدید انتظار رہے گا۔

ارشاد احمد

ایئر انٹرنیشنل ٹریڈرز، پشاور

(مذکورہ بالا استفتاء کے ساتھ سائل نے حضرت والا دامت برکاتہم کے نام درج ذیل خط بھی لکھا)

(خط از سائل)

بخدمت جناب حضرت اقدس حضرت والا دامت برکاتہم
بعد از سلام عرض ہے کہ میں خیریت سے ہوں اور آپ کی خیریت اللہ رب العزت سے نیک
مطلوب ہوں۔

میں ایک ادنیٰ سا طالب علم ہوں، ایک دفعہ ایک لائبریری میں آپ کا کتابی سفرنامہ ”جہان دیدہ“ ہاتھ لگا، اُس کو جب پڑھا تو میں نے سمجھا کہ مجھے اسلامی تاریخ کا ایک خزانہ مل گیا، اس کے بعد پشاور میں میں نے شیخ الحدیث مولانا حسن جان صاحب سے آپ کے متعلق پوچھا تو انہوں نے اس طریقے سے آپ کی تعریف کی کہ میری آپ سے دلی محبت اور بڑھ گئی، اور اب میرے پاس آپ کی بہت سی تصانیف کا ایک چھوٹا سا مجموعہ موجود ہے، اور مزید یہ کہ جس طرح آپ کی تصانیف پڑھتے پڑھتے اور پڑھنے کا شوق بڑھ رہا ہے، اُسی طرح آپ کے ساتھ ملاقات کا بھی شوق بڑھ رہا ہے، لیکن مالی حالات اور مصروفیات کی وجہ سے کراچی آنے اور زیارت کا شرف حاصل نہیں ہو رہا ہے۔ بہر حال اگر یہ خط آپ کو ملے تو آپ اپنے قیمتی اوقات میں سے وقت فارغ کر کے مجھے چند لفظ اپنے ہاتھ سے لکھ کر بھیجیں تو مجھے تسلی سی ہو جائے گی کہ آپ کی زیارت ہو گئی۔ باقی خط زیادہ لمبا کر کے آپ کا وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا، لیکن آپ سے دُعاؤں کی درخواست ہے کہ اپنی دُعاؤں میں اس ناچیز کو بھی مت بھولیے۔

ارشاد احمد

جواب:- مکرری و محترمی! السلام علیکم ورحمة اللہ وبرکاتہ

آپ کا خط ملا، آپ نے جو اظہارِ محبت فرمایا ہے، اس کے لئے شکر گزار ہوں، اور دُعا کی درخواست کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ اپنی رضائے کاملہ عطا فرمادیں، آمین۔ آپ کے لئے بھی دُعا گو ہوں کہ اللہ تعالیٰ آپ کو تمام مقاصدِ حسنہ میں کامیابی عطا فرمائیں، آمین۔ آپ کے سوالات کا جواب نمبر وار درج ذیل ہے:-

۱:- ویزا حاصل کرنے کی جائز محنت پر آپ اُجرت وصول کر سکتے ہیں^(۱)، لیکن اس کے لئے کسی کو رشوت دینا جائز نہیں^(۲)، اور اس رشوت کی وجہ سے اُجرت بڑھانا بھی جائز نہیں، ہاں ویزے کی جو فیس قانونی ہوتی ہے، وہ آپ اپنی اُجرت کے علاوہ وصول کر سکتے ہیں۔

۲:- یہ کام بالکل حرام ہے، دھوکا دہی ہے، اس کی اُجرت بھی حرام ہے۔^(۳)

۳:- یہ کام بھی بالکل حرام ہے، اور اس کی آمدنی بھی حرام۔^(۴)

۴:- اگر حکومت کی طرف سے قانوناً یا عملاً اس کی اجازت مل جائے تو جائز ہے۔

آپ کا آخری سوال واضح نہیں، اس لئے جواب سے معذور ہوں۔ والسلام

۱۴۲۱/۱/۲ھ

(فتویٰ نمبر ۴۰۸/۷۴)

انشورنس کمپنی میں ملازمت کا حکم

سوال:- انشورنس کے محکمے میں ایجنٹ بننے یا اس محکمے کے دوسرے اہل کاروں کی ملازمت کے بارے میں کیا حکم ہے؟

(۱) لائنہ عمل مباح يجوز أخذ الأجرة عليه، ويستأنس في هذه المسئلة من العبارات الآتية:-
في الهندية الباب الثاني والثلاثون في المتفرقات ج: ۳ ص: ۵۲۶ (طبع رشيدية كونه) في الكبرى أهل بلدة ثقلت عليهم مؤنات العمل فاستأجروا رجلاً بأجرة معلومة ليذهب ويرفع أمرهم الى السلطان الأعظم ليخفف عنهم بعض الحيف وأخذ الأجرة من عامتهم غنيهم وفقيرهم ذكر ههنا أنه ان كان بحال لو ذهب الى بلد السلطان تهيأ له اصلاح الأمر يوماً أو يومين جازت الاجارة وان كان بحال لا يحصل ذلك إلا بمدة فان وقتوا للاجارة وقتاً معلوماً فالاجارة جائزة والأجر كله له وان لم يوقتوا فهي فاسدة وله أجر مثله.

وفي فتاوى قاضى خان باب الاجارة الفاسدة ج: ۳ ص: ۱۸ أهل بلدة ثقلت عليهم المؤنات فاستأجروا رجلاً بأجر معلوم ليذهب الى السلطان ويرفع القصة ليخفف عنهم السلطان نوع تخفيف وأخذ الأجر من عامة أهل البلدة من الأغنياء والفقراء قالوا: ان كان بحال لو ذهب الى بلدة السلطان تهيأ له اصلاح الأمر في يوم أو يومين جازت الاجارة وان كان بحال لا يحصل المقصود في يوم أو يومين وإنما يحصل في مدة فان وقتوا للاجارة وقتاً جازت الاجارة وله كل المسمى وان لم يوقتوا فسدت الاجارة وكان له أجر المثل على أهل البلدة على قدر مؤنتهم ومنافعهم الخ.

(۲) وفي المشكوة، كتاب الامارة والقضاء ج: ۱ ص: ۳۳۷ (طبع رحمانيه) عن عبد الله بن عمرو قال: لعن رسول الله صلى الله عليه وسلم الراشى والمرتشى.

(۳ و ۴) کیونکہ یہ ”اجارہ علی المعاصی“ ہے، جو ناجائز ہے، تفصیلی حوالہ جات کے لئے ص: ۳۹۴ کا حاشیہ ملاحظہ فرمائیں۔

جواب:- اس محکمے میں ملازمت کرنا جائز نہیں۔^(۱)

واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

۱۳۸۸/۵/۲۳ھ

(فتویٰ نمبر ۵۹۶/۱۹ الف)

وکالت کے پیشے اور اس کے ذریعے حاصل کی گئی رقم کا حکم

سوال:- کیا وکیل کا وکالت کے ذریعے کمایا ہوا روپیہ حلال ہے؟ جبکہ وکیل کو سچے مقدمے کی پیروی کرنے میں بھی کبھی کبھی حقائق کو رد و بدل کے ساتھ پیش کرنا پڑتا ہے۔

جواب:- وکالت میں اگر جھوٹ بولنا یا ناحق کو حق ثابت کرنا نہ پڑے تو جائز ہے،^(۲) لیکن جس مقدمے میں یہ کام کرنے پڑیں اس میں وکالت جائز نہیں اور ایسی وکالت کی آمدنی بھی حرام ہے۔

واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

الجواب صحیح

محمد عاشق الہی

۱۳۸۸/۲/۶ھ

(فتویٰ نمبر ۱۵۳/۱۹ الف)

۱:- ملازمت سے برطرفی کے زمانے کی تنخواہ کا حکم

۲:- رشوت دے کر ملازمت پر بحال ہونے والے ملازم کے لئے

برطرفی کے زمانے کی تنخواہ کا حکم

سوال:- محترم و مکرم جناب مفتی صاحب دامت برکاتہم، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

(۱) وفي الهداية باب الاجارة الفاسدة ج: ۳ ص: ۳۰۶ (طبع مكتبة رحمانية) ولا يجوز الاستيجار على الغناء والنوح وكذا سائر الملاهي لأنه استيجار على المعصية والمعصية لا تستحق بالعقد.

وفي بدائع الصنائع ج: ۳ ص: ۱۸۹ (طبع سعيد) وكذا كل اجارة وقعت لمظلمة لأنه استيجار لفعل المعصية فلا يكون المعقود عليه مقدورة الاستيفاء شرعاً.

وكذا في الهندية ج: ۳ ص: ۴۱۱.

وفي تكملة فتح الملهم ج: ۱ ص: ۶۱۹ فان كان عمل الموظف في البنك ما يعين على الربا كالكتابة أو الحساب فذلك حرام بوجهين، الأول اعانة على المعصية، والثاني أخذ الأجرة من المال الحرام الخ. نيز دیکھئے ص: ۳۸۰ کا حاشیہ۔

(۲) وفي نور الأنوار ص: ۱۰۷ ان وكل أحد رجلاً أن يخاصم المدعى عند القاضي يحمل على مطلق الجواب لأن الخصومة هو الانكار فقط محققاً كان المدعى أو مبطلاً وهو حرام شرعاً لقوله تعالى: "ولا تنازعوا" فلا بد أن يصرف الى الجواب مطلقاً بالرد والاقرار مجازاً من قبيل اطلاق الخاص الى العام فلو أقر الوكيل على مؤكله جاز عنده الخ.

وفي الهداية كتاب الوكالة ج: ۳ ص: ۱۷۶ ويجوز الوكالة بالخصومة في سائر الحقوق لما قدمنا من الحاجة اذ ليس كل أحد يهتدى الى وجوه الخصومات وقد صرح أن علياً وكل فيها عقيلاً وبعد ما أسن وكل عبدالله بن جعفر.

نيز دیکھئے امداد الفتاویٰ ج: ۳ ص: ۳۲۰ و امداد الاحکام ج: ۳ ص: ۵۸۰ و ۵۸۱ و عزیز الفتاویٰ ص: ۶۶۷ (طبع دار الاشاعت)۔

عرض ہے کہ درج ذیل مسئلے کا حل قرآن و سنت کی روشنی میں مطلوب ہے۔

زید پاکستان ایئر فورس کی ایک شاخ (جو بین الاقوامی جہازوں پر کام کرتی ہے) کے شعبہ ”الجرینگ“ کے ایک اہم عہدے پر مستقل ملازم تھا، ادارے نے اس کو چار سال قبل ملازمت سے برطرف کر دیا کہ تمہاری وجہ سے دو جہازوں پر کام پندرہ بیس منٹ تاخیر سے ہوا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس غلطی کے ذمہ دار کچھ اور لوگ تھے، زید اس ادارہ کا ایک مستند، دیانت دار اور محنتی و مستقل ملازم تھا۔ خیر! مقدمہ عدالتوں میں چلا، اور تین سال بعد ایک عدالت کے پُرانے جج نے فیصلہ دیا کہ اس کو کیوں نکالا گیا یہ ایک الگ بات ہے، (یہ زیر غور نہیں، نہ اس کی ضرورت محسوس کی گئی) اس کو نکالنے کا جو قانونی طریقہ تھا وہ اختیار نہیں کیا گیا، اس لئے اس کو فوراً ملازمت پر بحال کیا جائے اور اس کے پچھلے تمام واجبات ادا کئے جائیں۔ لیکن عدالت کے اس حکم کو نہ مانتے ہوئے ادارے نے ’مقدمہ‘ عدالت عالیہ میں داخل کر دیا، اور درخواست کی اگر اس میں کوئی قانونی سقم ہو تو فیصلہ کیا جائے۔ عدالت عالیہ کے سب سے بڑے جج نے حکم دیا کہ تمام واجبات ادا کرو، اور تنخواہ جاری کرو، جب فیصلہ ہوگا اُس وقت اگر زید ہار گیا تو سب رقم واپس کر دے گا، اور اگر مقدمہ جیت گیا تو ملازمت بحال، اور سب رقم اس کی۔

اب زید کے رقم وصول کرنے کا وقت ہے، یعنی ماہانہ تنخواہ اور پچھلے واجبات، لیکن وہ یہ کہتا ہے کہ میں نے چار سال تک تو نہ ان کا کام کیا اور نہ انہوں نے مجھے کچھ کہا، اور ہر ماہ کی بغیر کام کئے جو تنخواہ ملے گی آیا اس رقم کا وصول کرنا میرے لئے جائز ہے یا حرام؟ اور مقدمہ جیتنے کی صورت میں وہاں دوبارہ ملازمت کرنا جائز ہے یا نہیں؟

ادارہ حکومت ہے، ہر شخص اس کا ملازم ہے، یہ شاخ ایئر فورس کے چھوٹے، بڑے ملازمین کے پیسوں سے قائم ہوئی تھی، اس کا فائدہ خود انہیں اور ایئر فورس کو جاتا ہے، زید اس کا صرف ملازم تھا، یہ ادارہ کسی کا ذاتی نہیں، یہاں ملازم رکھنے اور نکالنے کا طریقہ شرعی نہیں، جو قوانین موجودہ ہمارے ملک کے اداروں، عدالتوں وغیرہ میں چل رہے ہیں، اسی کے مطابق یہ کارروائی ہوئی ہے اور ہوگی۔

زید کا کہنا ہے کہ اگر میرے لئے یہ رقم اور ملازمت پر دوبارہ جانا جائز نہیں بلکہ حرام ہے تو میں اس کو حاصل نہیں کروں گا۔

سوال ۲:- بالکل اسی طرح کا ایک اور مقدمہ ہے کہ اس شخص نے عدالت کے ایک اہم اہلکار کو قلیل سی رقم دے کر یعنی بطور رشوت دے کر اپنے حق میں فیصلہ کروالیا، اور اب تنخواہ بغیر کام کئے کے لے رہا ہے، اس میں شک نہیں کہ یہ شخص بھی حق پر تھا، اور اپنا جائز کام کرانے کے لئے رشوت دی تھی، بصورت دیگر اس کے خلاف بھی فیصلہ ہو سکتا تھا، اب اس کے لئے کیا حکم ہے؟

جواب ۱:- حکومت کے جس قانون کے تحت سرکاری ملازمین (فوجی ہوں یا سول) کا تقرر، تنزل، یا معزولی وغیرہ عمل میں آتے ہیں، اس قانون کے نافذ ہو جانے کے بعد وہ قانون فریقین کے معاہدہ ملازمت کا حصہ بن جاتا ہے، اور اس پر وہی احکام جاری ہوتے ہیں جو معاہدہ اجارہ کی شرائط پر ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ اس قانون کی خلاف ورزی شرائط معاہدہ کی خلاف ورزی سمجھی جائے گی۔ اب اگر کسی سرکاری ادارے نے ان شرائط یا قانون کی خلاف ورزی کرتے ہوئے کسی ملازم کو معزول کیا، جبکہ قانون میں یہ بھی ہو کہ ایسی معزولی قانوناً معتبر نہ ہوگی، تو یہ معزولی شرائط معاہدہ کے خلاف ہونے کی بناء پر شرعاً بھی درست نہ ہوئی اور زید بدستور ملازمت پر برقرار رہا۔ اور اس کا اس فیصلے کو عدالت میں چیلنج کرنا اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ اپنی خدمات ادارے کو پیش کرنے کے لئے پوری طرح آمادہ و تیار تھا، اس لئے اس کا کام نہ کرنا اس کی غلطی کی وجہ سے نہیں، بلکہ ادارے کی غلطی کی وجہ سے ہوا، جس نے اس سے کام نہیں لیا۔ لہذا اگر عدالت اُسے اس زمانے کی تنخواہ بھی محکمے سے دلواتی ہے تو مندرجہ بالا وجہ کی بناء پر اس کے لئے اس کا لینا جائز ہے۔ تاہم اگر وہ احتیاط پر عمل کرتے ہوئے اس زمانے کی تنخواہ نہ لے تو یہ تقویٰ کی بات ہے جو ان شاء اللہ موجب اجر ہوگی۔

جواب ۲:- اس ملازم کو رشوت دینا ہرگز جائز نہیں تھا،^(۱) اس نے رشوت دے کر سخت حرام کا ارتکاب کیا، اور اگر رشوت کے ذریعے ناحق فیصلہ کرایا تو گناہ بھی ڈگنا ہے، اور یہ رقم لینا بھی حلال نہیں، لیکن اگر فیصلہ جواب نمبر ۱ کی تفصیل کے مطابق شرعاً درست ہو تو رشوت کے گناہ کے باوجود کام نہ کرنے کے زمانے کی تنخواہ لینے اور اسے استعمال میں لانے کی گنجائش ہے، جس کی وجہ جواب نمبر ۱ میں لکھی جا چکی ہے۔

واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم

۱۰/۱۱/۱۴۰۹ھ

(فتویٰ نمبر ۱۹۳۱/۵۴۰)

حکومت کی طرف سے ”قابض“ کو الاٹمنٹ کا حق دینے کی صورت میں پلاٹ کا مالک مؤجر ہوگا یا کرایہ دار؟

سوال:- ہمارے پاس ایک اُن اتھرائز جگہ جو بغیر الاٹ شدہ ہے، جس پر تھوڑی تھوڑی دیوار اور چھت بنی ہوئی تھی ہمارے پاس کرایہ پر ہے، اور محمد اسلم سے کرایہ پر لیا ہے، اس جگہ کا کرایہ ۴۲۵ روپے مہینہ ہے، یہ جگہ جیکب لائن میں ہے، محمد اسلم سے ہمارا 1979-4-2 کو ایک ایگریمنٹ ہوا

(۱) وفی سنن الترمذی ج: ۱ ص: ۲۴۸ (طبع قدیمی کتب خانہ) عن ابی ہریرۃ قال: لعن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الراشی والمرشی فی الحکم. نیز دیکھئے ص: ۴۰۹ کا حاشیہ نمبر ۲۔

جو پانچ سال کے لئے تھا، اگر یمینٹ پر جو ایڈوانس چار ہزار روپے دیئے تھے اور جو جگہ ہم نے تعمیر کرائی، بجلی ہم نے لگوائی اور بجلی کا بل بھی ہمارے نام ہے، ان تمام اخراجات کی ہمارے پاس تحریر اور رسیدیں موجود ہیں، اب گورنمنٹ اس جگہ کو الاٹ کر رہی ہے، گورنمنٹ کا قانون ہے کہ جو جگہ پر قابض ہوگا وہ سروے کرا سکتا ہے، لہذا ہم نے اپنے نام کے سروے کرایا ہے، اور ابھی ہمارے پانچ سال بھی نہیں ہوئے، ہم نے اس جگہ کو دو حصے میں کر دیا تھا جس ایک حصے کو ہم نے ڈیڑھ سو روپیہ کرایہ پر دے دیا تھا، یہ ساری تعمیر ایڈوانس کے علاوہ ہمارا خرچ ہے، ہماری کرایہ پردی ہوئی جگہ کا بھی اُس کرایہ دار نے گورنمنٹ سے سروے کر لیا، جگہ کے مالک نے ہم دونوں کو دھونس دے کر سروے سلیپ لے لی، پھر ہم سے کہا کہ جو جگہ کرایہ پردی ہے اس کو خالی کرادو، تو ایک سروے سلیپ تم کو دے دوں گا۔ لہذا ہم نے چار سو روپے دے کر وہ جگہ خالی کرائی اس دوران ہم نے اس سے کہا کہ ہم آپ کی جگہ خالی کرتے ہیں لہذا ہم کو ایڈوانس اور ہمارا جو خرچہ ہوا ہے وہ دے دو، اس نے کہا کہ: ہم ایک سروے سلیپ دیں گے، اب وہ سروے سلیپ دینے کو تیار نہیں بلکہ خرچہ دینے کو تیار ہے، حالانکہ سروے سلیپ ہمارے نام ہے اور گورنمنٹ کا قانون ہے کہ جگہ الاٹمنٹ اسی کے نام ہوگا جس کے نام سروے سلیپ ہے، اور وہ شخص بھی کسی طرح اس جگہ کو نہیں لے سکتا جب تک ہم اس کو لکھ کر نہ دیں۔ اسلم سے جو ایگریمنٹ ہم نے کیا تھا اس کی انگریزی کا پی منسلک ہے اور گورنمنٹ کا قانون ہے کہ جو کرایہ دار ہے جگہ اسی کے نام الاٹ ہوگی۔ نیز بجلی کے مصارف اور دیوار، چھت وغیرہ میں جو کچھ خرچ ہوا ہے اس کے کاغذات موجود ہیں۔

الجواب:- صورتِ مسئلہ میں اس جگہ کا اصل قابض محمد اسلم ہے، کیونکہ اس نے اس پر عمارت تعمیر کر رکھی ہے اور شرعاً یہ کرایہ عمارت کا ہوا، لہذا بشیر احمد کی حیثیت عمارت کے کرایہ دار کی ہے، جس نے کرایہ کے معاہدے میں یہ صراحت کی ہے کہ وہ پانچ سال کے بعد اس عمارت کو خالی کر دے گا، لہذا اگر حکومت نے الاٹمنٹ کا حق صرف قابض کو دیا تھا تو اس کا اصل حق دار محمد اسلم ہے۔

واللہ اعلم

۱۴۰۲/۷/۲۳ھ

(فتویٰ نمبر ۱۱۸۲/۳۳ ج)

لیز پر گاڑی خریدنے کا حکم

سوال:- شیخ الحدیث مفتی صاحب دامت برکاتہم، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

لیز پر جو بینک سے گاڑی ملتی ہے اُس کا شرعی حکم کیا ہے؟

جواب:- محترمی! سلام مسنون

لیز پر جو معاہدات ہوتے ہیں وہ جائز و ناجائز ہر طرح کے ہوتے ہیں، آج کل اکثر لیز کے معاملات ناجائز ہیں، البتہ میزان بینک کا طریقہ بہتر ہے، اس سے فائدہ اٹھانے کی گنجائش ہے۔

والسلام

۱۴۲۵/۳/۸ھ

(فتویٰ نمبر ۱۸/۶۹۶)

سودی قرضہ لے کر خریدے گئے مکان کے کرائے کا حکم

سوال:- حضرت علامہ مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مد فیوضہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

بعد سلام مسنون آکلینڈ (نیوزی لینڈ) سے خلیل احمد کا سلام قبول ہو، اور دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو صحت و عافیت سے رکھے اور ہم کو آپ سے مستفید ہونے کا موقع عنایت فرمائے، آمین۔ دیگر عرض ہے کہ آپ سے فون پر جو بات ہوئی تھی، اسی حوالے سے سوال عرض ہے کہ یہاں ایک کمیٹی ہے جس کے ماتحت ایک اور کمیٹی ہے جو کاروبار کرتی ہے اور جو منافع ہوتا ہے وہ مختلف مساجد کو دیتے ہیں گویا یہ کمیٹی نیوزی لینڈ کے تمام مسلمانوں کی ہے۔

انہوں نے چند مہینوں پہلے ایک مکان خریدا کرایہ کے لئے، جس کی قیمت ۸ لاکھ ۶۰ ہزار ڈالر ہے، جس میں ۴ لاکھ ۵۰ ہزار بینک سے قرضہ لے کر ادا کیا، باقی قرض حسنہ کے طور پر جمع کر کے ادا کیا گیا۔ اس عمارت کو اجرت پر دیا گیا ہے سالانہ ۷۰ ہزار ڈالر آمدنی ہے، جو مساجد اور کار خیر میں استعمال کیا جائے گا۔ اور ظاہر ہے کہ اس میں سودی قرضہ لگایا گیا ہے، لہذا گناہ ہے اور اس معاملے کو ختم کر دیا جائے، اور اس مکان کو بیچ کر بینک کا قرضہ ختم کر دیا جائے۔ لیکن ایک دوسری رائے ہے کہ اس کو باقی رکھ کر اس سے فائدہ اٹھایا جائے اور سودی قرضہ جلد از جلد ادا کر دیا جائے، کیونکہ اس مکان کو بیچ کر جو قرضہ ادا کیا جائے گا تو تقریباً ایک لاکھ ڈالر کا نقصان ہونے کا اندیشہ ہے، تو اس صورت میں کیا کیا جائے؟ اور شریعت اسلامیہ ہمیں کیا رہنمائی فرماتی ہے؟ برائے کرام دلائل کی روشنی میں ہماری رہنمائی فرمائیں اور جلد از جلد جواب ارسال فرمائیں۔

احقر خلیل احمد نادات

۲۰۰۲/۸/۱۳ء

جواب:- مکرمی و محترمی جناب مولانا خلیل احمد صاحب زید مجدکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کا فیکس ملا، سوال کا جواب یہ ہے کہ بینک سے سود پر قرض لینا بہت سخت گناہ ہے،^(۱) اور اگر غلطی سے ایسا سودی قرض لے لیا گیا ہو تو اُس سے جلد از جلد چھٹکارا حاصل کرنے کی جو بھی صورت ہو، اختیار کرنا شرعاً واجب ہے۔^(۲) لیکن اس قرض کی رقم سے جو مکان خریدا گیا اُس سے فائدہ اٹھانا حرام نہیں۔^(۳) اور اگر اسے کرایہ پر دیا گیا ہے تو وہ کرایہ بھی حرام نہیں۔^(۴) لہذا اگر مکان کو فروخت کئے بغیر اس سودی قرض سے جلد از جلد چھٹکارا حاصل کرنے کی کوئی صورت ممکن ہو تو مکان کو فروخت کرنا ضروری نہیں ہے۔ اس کے کرائے سے فائدہ اٹھانا جائز ہے۔ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہ نے اسی کے مطابق فتویٰ دیا ہے (دیکھئے امداد الفتاویٰ ص: ۱۶۹ و ۱۷۰ ج: ۳ سوال نمبر ۲۲۴)۔ لیکن یہ اسی صورت میں جائز ہے جب سودی قرض سے جلد از جلد چھٹکارا پانا ممکن ہو۔ اگر مکان کو فروخت کئے بغیر سودی قرض سے چھٹکارا پانا ممکن نہ ہو، یا اس میں بہت دیر لگنے کا اندیشہ ہو جس سے سود کی رقم میں اضافہ ہوتا رہے، اور مسلسل سود کی ادائیگی کا گناہ جاری رہے تو پھر مکان کو فروخت کر کے سودی قرض سے چھٹکارا حاصل کرنا ضروری ہوگا۔

واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم

۱۸ جمادی الثانیہ ۱۴۲۳ھ

(فتویٰ نمبر ۷۷/۵۶۱۲)



(۱) حوالہ کے لئے دیکھئے ص: ۱۴۵ کا حاشیہ نمبر ۳ اور ص: ۲۶۷ کا حاشیہ نمبر ۱ اور ص: ۲۸۴ کا حاشیہ نمبر ۴۔

(۲) دیکھئے ص: ۱۴۰ و ص: ۱۴۱ کے حواشی، اور مزید تفصیل کے لئے ص: ۱۴۹ کا فتویٰ۔

(۳ و ۴) حوالہ کے لئے دیکھئے ص: ۱۴۸ اور ص: ۲۰۱ کا حاشیہ نمبر ۱۔

﴿کتاب الرهن﴾

(رهن یعنی گروی رکھنے اور اُس سے متعلق مختلف مسائل کا بیان)

ڈپازٹ کے طور پر رکھوائی جانے والی رقم رہن ہے یا قرض؟

(چند فقہی عبارات کی وضاحت)

سوال:- بخدمت شیخی و مرشدی و استاذی مدظلکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

بندہ نے ذوالحجہ ۱۴۲۲ھ میں ایک علمی خط لکھا تھا، جس میں بطور ڈپازٹ رقم رکھوانے کے جواز کی فقہی تخریج پر ایک شبہ عرض کیا تھا، حضرت والا نے جواب میں تحریر فرمایا کہ: ”اس فتویٰ کی کاپی دارالعلوم سے منگوالی جائے، اس میں جہاں تک یاد ہے، مفصل تخریج بیان کی گئی ہے۔“ بندہ نے اس کے بعد فتویٰ کی فوٹو کاپی حاصل کی، فتویٰ حضرت مولانا مفتی عبدالرؤف سکھروی مدظلہ کا لکھا ہوا تھا، اور اس پر حضرت مولانا سبحان محمود صاحب قدس سرہ کے دستخط تھے، لیکن اس فتویٰ کو دیکھ کر بھی بندہ کا شبہ دور نہ ہوا، تو بندہ نے دوبارہ حضرت والا کی خدمت میں اپنے شبہ کا اعادہ کیا، تو حضرت والا نے فرمایا کہ ایک طالب علم کے ذمہ اس کی تحقیق لگائی ہوئی ہے، جب وہ تیار ہو جائے تو لے لیں۔“ چنانچہ اس کے بعد بندہ نے متعدد مرتبہ دارالافتاء سے رجوع کیا لیکن اس بارے میں کچھ معلومات نہیں ہو پا رہی تھیں، بالآخر کچھ عرصے کے بعد معلوم ہوا کہ فتویٰ تیار ہو گیا ہے، بندہ نے وہ فتویٰ مولانا افتخار بیگ کے توسط سے حاصل کیا، اس فتویٰ پر حضرت والا کی تصدیق ہے۔

پہلے تو بندہ کا خیال یہ تھا کہ شاید حضرت والا کے ذہن میں فقہی تخریج کوئی اور ہوگی یا اس فتویٰ میں بندہ کے شبہ سے تعرض کر کے اس کا جواب دیا گیا ہوگا، لیکن اس فتویٰ کو دیکھ کر معلوم ہوا کہ دونوں باتوں میں سے کوئی بات نہیں، اس فتویٰ میں وہی تخریج ہے جو مفتی عبدالرؤف صاحب نے لکھی ہے، اور اس فتویٰ کے بارے میں بندہ کو وہی شبہ ہے جو سابق فتویٰ میں تھا۔

اس لئے بندہ دوبارہ اپنے شبہ کا اعادہ کرنے کی جرأت کر رہا ہے، اُمید ہے کہ اس مرتبہ حضرت والا شفقت فرماتے ہوئے اس شبہ کا ازالہ فرمائیں گے۔

بطور ڈپازٹ رقم رکھوانے کی فقہی تخریج کا حاصل یہ ہے کہ یہ معاملہ اجارہ بشرط القرض ہے، اور چونکہ اس شرط کا عرف عام ہے اس لئے جائز ہے۔

اس سلسلے میں عرض یہ ہے کہ جس غرض اور مقصد کے تحت یہ رقم دی جاتی ہے اس کے پیش نظر اس رقم پر رہن کی تعریف صادق آتی ہے، رہن کی تعریف تنویر الابصار میں ان الفاظ میں نقل کی گئی ہے:

”حبس شيء مالي بحق يمكن استيفاؤه منه“ (رد المحتار ج: ۶ ص: ۲۷۷) اور عقود میں اعتبار معانی کا ہوتا ہے، نیز عرف عام میں بھی بندہ کے علم میں کوئی بھی اس رقم بوقرض نہیں سمجھتا ہے بلکہ رہن ہی سمجھا جاتا ہے۔

اور دوسری طرف رہن کے بارے میں رائج قول یہ ہے کہ رہن سے انتفاع جائز نہیں ہے (رد المحتار ج: ۶ ص: ۳۸۲) اور ڈپازٹ کی رقم سے انتفاع کیا جاتا ہے۔

دوسرا شبہ یہ ہے کہ رد المحتار ج: ۶ ص: ۵۰۸ میں اس کی تصریح ہے کہ ثمن کو ابتداءً رہن بنانا صحیح نہیں ہے، حیث قال: ”والثمن وان كان دينا لا يصح رهنه ابتداءً لكنه يصح رهنه بقاء“ اس کا تقاضا یہ معلوم ہوتا ہے کہ بطور ڈپازٹ رقم رکھوانا سرے سے جائز ہی نہ ہو۔

اس لئے حضرت والا سے دوبارہ عرض ہے کہ شفقت فرماتے ہوئے ان شبہات کا ازالہ فرمادیں۔ حضرت والا سے علم و عمل میں ترقی کی دعاؤں کی درخواست ہے۔

بندہ محمد عامر
خادم جامعة الرشيد، احسن آباد
۲۲ ربیع الثانی ۱۴۲۵ھ

جواب:- عزیز مکرّم سلمہ اللہ تعالیٰ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

رہن اگرچہ دراہم و دنانیر کا ہو سکتا ہے (اور ثمن کے دین کے بارے میں آپ نے جو عبارت لکھی ہے، اس میں غالباً ”وان كان“ کی واؤ غلط ہے، اور مطلب یہ ہے کہ جب ثمن دین ہو تو وہ ابتداءً رہن نہیں کی جاسکتی) جیسا کہ تمام متون میں تصریح ہے، مثلاً ہدایہ میں ”ویجوز رهن الدراهم والدنانیر“ (ج: ۴ ص: ۵۳۱)۔^(۱) لیکن ڈپازٹ کی رقم کو رہن اس لئے نہیں کہہ سکتے کہ رہن بالدرك صحیح نہیں ہوتا، کما فی الہدایۃ وغیرہا والرهن بالدرك باطل، والكفالة بالدرك جائزة، والفرق ان الرهن للاستيفاء ولا استيفاء قبل الوجوب، وازضافة التملیک الى زمان فی المستقبل لا تجوز۔ (ایضاً ج: ۴ ص: ۵۲۷)۔^(۲) ڈپازٹ کی رقم اس غرض کے لئے ہوتی ہے کہ جب کرایہ دار مکان خالی

(۱) ج: ۴ ص: ۵۲۹ (طبع مکتبہ رحمانیہ)۔

(۲) ج: ۴ ص: ۵۲۵ (طبع مذکور)۔

وفی الدر المختار، کتاب الرهن، باب ما یجوز ارتھانه وما لا یجوز ج: ۶ ص: ۴۹۲ (طبع سعید) ثم لما ذکر ما لا یجوز رهنه ذکر ما لا یجوز الرهن به فقال ولا بالأمانات کودیعة وأمانة ولا بالدرك خوف استحقاق المبيع فالرهن به باطل بخلاف الكفالة کما مر۔

وفی الشامیۃ تحته (قوله بخلاف الكفالة) ای بالدرك فانها جائزة والفرق أن الرهن للاستيفاء ولا استيفاء قبل الوجوب لأن ضمان الدرك هو الضمان عند استحقاق المبيع فلا یصح مضافاً الى حال وجوب الدین لأن الاستيفاء معاوضة وازضافة التملیک الى المستقبل لا تجوز أما الكفالة فهي للالتزام المطالبة لا للالتزام اصل الدین ولذا لو كفل بما یذوب له علی فلان یجوز ولو رهن به لا یجوز کفاية ملخصاً.... الخ. وكذا فی البحر الرائق ج: ۸ ص: ۲۴۴ (طبع سعید)۔ (محمد زبیر حق نواز)

کرے تو اگر اس نے مکان میں کوئی نقصان کر دیا ہو تو اس کا ضمان اس سے لیا جاسکے، یہ ضمان فی الحال واجب نہیں ہوتا محض محتمل ہوتا ہے، لہذا اس ڈپازٹ کو رہن نہیں کہہ سکتے، یہ قرض ہی ہے، اور مشروط بحکم العرف ہے۔

واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم

۱۳۲۵/۵/۲۶ھ

(فتویٰ نمبر ۳۶/۷۱۸)

رہن کے طور پر حاصل کی ہوئی دکان کو کرایہ پر دینے کا حکم

سوال:- زید نے اپنی دکان بکر کے پاس گیارہ سو روپے میں رہن بالقبض رکھ دی، اور یہ طے پایا کہ دکان مذکور کو مرتہن جس کرایہ پر اٹھادے، تین سال کے اندر راہن خود یہ روپے ادا کرے تو مرتہن دکان چھوڑ دے گا، مرتہن نے پچاس روپے ماہانہ پر دکان کرایہ پر اٹھادی، یہ کرایہ جو تین سال میں اٹھارہ سو روپے ہے مرتہن کے لئے جائز ہے یا نہیں؟ یا سود ہے؟ یہ بھی تحریر کیا گیا ہے کہ اگر راہن نے تین سال کے اندر روپیہ ادا نہ کیا تو رہن بالقبض کی رجسٹری مرتہن کو کرادے گا۔

جواب:- صورت مسئلہ میں دکان کو کرایہ پر اٹھانے سے رہن باطل ہو گیا، اور کرایہ کی جتنی رقم بکر نے وصول کی ہے وہ ساری کی ساری زید کا حق ہے، بکر کے لئے اس رقم کا اپنے پاس رکھنا سود خوری کے گناہ عظیم میں مبتلا ہونا ہے۔ ہاں! وہ یہ کر سکتا ہے کہ اپنے قرض کی رقم جو گیارہ سو روپے ہے اپنے پاس رکھ لے اور باقی سات سو روپے مع دکان کے زید کو واپس کر دے۔

فی رد المحتار: وأما الإجارة فالمستأجر إن كان هو الراهن فهي باطلة وكانت بمنزلة ما إذا أعار منه أو أودعه وإن كان هو المرتهن وجدد القبض للإجارة أو اجنبياً بمباشرة أحدهما العقد باذن الآخر بطل الرهن والأجرة للراهن وولاية القبض للعاقدة ولا يعود رهنا إلا بالاستئناف اهـ. (شامی ج: ۵ ص: ۴۵۲)۔^(۱)

واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۸/۱/۱۵ھ

(فتویٰ نمبر ۸۴/۱۹ الف)

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

۱۳۸۸/۱/۱۶ھ

(۱) رد المحتار، کتاب الرهن، باب التصرف فی الرهن والجناية علیه وجنایته... الخ ج: ۶ ص: ۵۱۱ (طبع سعید وفي طبع دار الفكر بیروت ج: ۶ ص: ۵۱۱)۔

وفی الہندیۃ، کتاب الرهن، الباب الثامن فی تصرف الراهن أو المرتهن فی المرهون ج: ۵ ص: ۴۶۴ (طبع بلوچستان بک ڈپو) وان آجر المرتهن من اجنبی بأمر الراهن ینخرج من الرهن وتكون الأجرة للراهن.... الخ۔

وکذا فی فتح القدیر ج: ۹ ص: ۱۱۷، کتاب الرهن، وبدائع الصنائع، کتاب الرهن ج: ۶ ص: ۱۴۶ (طبع سعید)، والبحر الرائق، کتاب الرهن ج: ۸ ص: ۲۶۲ (طبع سعید) والعناية شرح الهدایة ج: ۹ ص: ۱۱۷۔

مرہون زمین پر کاشتکاری اور اس کی آمدنی سے اپنا قرض وصول کرنے کا حکم

سوال:- ایک آدمی نے اپنی زمین کسی کے ہاں رہن رکھ دی، مرتہن اس سے نفع حاصل کرتا رہا، اب ایک نیا ایکٹ جو حکومت نے جاری کیا ہے کہ جس آدمی کے ہاں رہن زمین بیس سال تک رہے اس کے بعد بغیر کسی عوض کے زمین راہن کو واپس کر دی جاتی ہے، کیا یہ معاملہ درست ہے؟

جواب:- مرتہن کے لئے رہن زمین سے نفع اٹھانا جائز نہیں تھا،^(۱) اس نے کاشت کے لئے دے کر جتنی آمدنی کمائی وہ راہن کی امانت ہے، اب اگر یہ آمدنی قرض کو پورا کر دیتی ہے تو اب راہن کے ذمے قرض باقی نہیں رہا، اور اگر پورا نہیں کرتی تو جتنا قرض زائد ہے اتنی کا واپس کرنا مرتہن کے ذمے لازم ہے۔^(۲)

واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۷/۱۲/۱۴ھ

(فتویٰ نمبر ۱۸/۱۳۵۵ الف)

الجواب صحیح

محمد عاشق الہی بلند شہری

رہن سے نفع اٹھانے اور بیس سال بعد زمین واپس راہن کو ملنے کے حکومتی قانون کا حکم

سوال:- (خلاصہ سوال) یہاں رواج ہے کہ لوگ زمین رہن پر فروخت کر دیتے ہیں اور مرتہن مال مرہون سے فائدہ بھی اٹھاتا ہے، اس وقت تک کہ راہن پوری رقم لے کر واپس نہ کر دے،

(۱) وفي الذر المختار، كتاب الرهن ج: ۶ ص: ۳۸۲ (طبع سعيد) لا انتفاع به مطلقاً لا باستخدام ولا سكنى ولا لبس ولا اجارة ولا اعارة سواء كان من مرتهن أو راهن (آلا باذن) كل للآخر وقيل لا يحل للمرتهن لأنه ربا. وفي الشامية تحته لا يحل له أن يستفيع بشيء منه بوجه من الوجوه وان اذن له الراهن لأنه اذن له في الربا لأنه يستوفى دينه كاملاً فبقى له المنفعة فضلاً فيكون ربا الخ.

وكذا في حاشية الطحاوي ج: ۴ ص: ۲۳۴ كتاب الرهن، والبحر الرائق ج: ۸ ص: ۲۳۸ كتاب الرهن، والهداية ج: ۴ ص: ۵۲۲ كتاب الرهن (طبع شركة علمية).

کفایت المفتی ج: ۸ ص: ۱۳۳ (طبع جدید دارالاشاعت) میں ہے: زمین پر مرتہن کو صرف قبضہ کرنا جائز ہے، اس کو کاشت کرنا یا کاشت کے لئے کسی کو دینا جائز نہیں، اور اگر خود کاشت کرے تو اس کا پورا کرایہ راہن کو ادا کرے، یا اس کی رقم میں سے وضع کرے، اور اگر کسی دوسرے کو کاشت کے لئے دی ہے تو اس کا پورا معاوضہ راہن کو دے یا رقم رہن میں سے وضع کرے۔

اب حکومت نے قانون نافذ کیا ہے کہ ایسی رہن زمین اگر بیس سال مرتہن کے پاس رہے تو اس کے بعد رہن زمین بلا معاوضہ راہن کو واپس مل جاتی ہے۔

جواب:- رہن زمین سے نفع اٹھانا بالکل ناجائز، حرام اور بجکم سود ہے، جس کے پاس رہن رکھا گیا ہے اس کے لئے اس رواج کو جس حد تک ممکن ہو روکنا واجب ہے، لا یحل ان ینتفع بشیء منه بوجه من الوجوه وان اذن له الراهن لأنه اذن له فی الربا لانه یتوفی دینہ کاملاً فتبقى له المنفعة فضلاً فیکون رباً وهذا امر عظیم، (شامی جلد خامس)۔^(۱)

پھر اگر حکومت کے قانون کی رو سے بیس سال بعد قرض دار کو بلا معاوضہ زمین واپس مل جائے اور اس عرصے میں زمین کے منافع قرض خواہ اس قدر اٹھا چکا ہو جو اس کے قرضے کے برابر یا زیادہ ہو تو قرض دار کے لئے اپنی زمین سے فائدہ اٹھانا بلاشبہ حلال ہے۔ اور مرتہن پر واجب ہے کہ قرض سے زائد انتفاع کا کرایہ راہن کو دے۔^(۲)

واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفا اللہ عنہ

۱۳۸۷/۱۲/۱۴ھ

(فتویٰ نمبر ۱۴۲۳/۱۸ الف)

الجواب صحیح

محمد عاشق الہی بلند شہری

گروی موٹر سائیکل استعمال کر کے اس کا کرایہ

قرض میں محسوب کرنے کا حکم

سوال:- ایک شخص نے ہمارے پاس مبلغ بیس ہزار روپے کے عوض ایک اسکوٹر گروی رکھوائی ہے، اور ہمیں اجازت دی ہے کہ جب تک وہ میری رقم ادا نہ کرے ہم اس کی اسکوٹر استعمال کر سکتے ہیں، کیا یہ ہمارے لئے جائز ہے؟

جواب:- جو موٹر سائیکل گروی رکھی گئی ہے، قرض خواہ کے لئے اس کا استعمال جائز نہیں ہے،^(۳) البتہ اگر استعمال کا کرایہ بازاری نرخ کے مطابق مقرر کر کے اسے قرض میں محسوب کیا جائے تو جائز ہے۔^(۴)

واللہ سبحانہ اعلم

۱۴۱۸/۱/۵ھ

(فتویٰ نمبر ۲۶۳/۲۳)

(۱) شامیہ، کتاب الرهن ج: ۶ ص: ۴۸۲ (طبع سعید) نیز دیکھئے ص: ۴۲۲ کا حاشیہ۔

(۲) دیکھئے سابقہ فتویٰ اور اس کا حاشیہ۔

(۳) حوالہ جات کے لئے دیکھئے سابقہ ص: ۴۲۲ کا حاشیہ۔

- ۱- قرض کے عوض دکانیں رہن پر رکھوانے کی مخصوص صورت کا حکم
- ۲- مرہن کی اجازت کے بغیر راہن کا گروی دکانیں فروخت کرنے کا حکم
- ۳- گروی دکانوں میں سامان رکھنے سے رہن کا معاملہ ختم نہیں ہوگا

سوال ۱:- گزارش یہ ہے کہ ایک مسئلے کے متعلق فتویٰ تحریر فرمائیں، وہ مسئلہ اس طرح ہے کہ ایک شخص محمد اسلم خان ولد محمد عباس خان نے شبیر احمد ولد عبدالمجید کے مبلغ ۱۱۰۲۰۸۹ روپے دینے ہیں، جس کی تصدیق وہ اپنی تحریر میں کرتا ہے، محمد اسلم خان ولد عباس خان اپنی ملکیتی جائیداد میں سے تین دکانوں کا قبضہ شبیر احمد ولد عبدالمجید کو دے دیتا ہے، اور بطور ثبوت قبضہ کرایہ کی تین رسیدیں اپنی طرف سے دے دیتا ہے، (یہ واضح رہے کہ کرائے کی ادائیگی نہیں کی گئی) اور کہتا ہے کہ میں فلاں تاریخ تک تمہیں رقم ادا کر کے اپنی دکانیں واپس لے لوں گا۔ اور اگر میں اس تاریخ تک رقم ادا نہ کروں تو آپ دکانیں فروخت کر کے اپنی رقم وصول کر لیں۔ براہ کرم فتویٰ تحریر فرمائیں کہ اس معاملے کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ اور شبیر احمد ولد عبدالمجید کو شرعی طور پر کیا حق حاصل ہے؟ عین نوازش ہوگی۔

جزاکم اللہ فی الدارین۔

سوال ۲:- مندرجہ معاملے کے بعد محمد اسلم خان ولد محمد عباس خان فرار ہو گئے، ایک حافظ عبد الرشید سورتی (بقول ان کے اس نے بھی محمد اسلم خان ولد محمد عباس خان سے پانچ لاکھ روپے لینے تھے) نے محمد اسلم خان ولد محمد عباس خان کی ملکیتی جائیداد (مارکیٹ) کے کاغذات حاصل کر کے اپنے ایک دوست کے نام مارکیٹ کی ملکیت منتقل کرادی۔

اسی مارکیٹ میں ایک دکان کسی دوسرے شخص کے قبضے میں ۱۴۰,۰۰۰ روپے کے عوض میں تھی، حافظ عبد الرشید سورتی نے یہ رقم ادا کر کے دکان آزاد کروا کر دکان اپنے قبضے میں کر لی، اس دکان کے علاوہ اسی مارکیٹ کی مزید چار دکانیں حافظ عبد الرشید سورتی کے قبضے میں ہیں، مارکیٹ کی نسبت منتقل کرانے سے قبل حافظ عبد الرشید سورتی کے علم میں یہ بات تھی کہ تین دکانیں اسی مارکیٹ میں شبیر احمد ولد عبدالمجید کے پاس بطور رہن ہیں، مارکیٹ کی ان دکانوں میں شبیر احمد ولد عبدالمجید نے کچھ سامان رکھ دیا تاکہ دکانیں خالی نہ رہیں اور قبضے کا ثبوت رہے، کسی قسم کا کاروباری معاملہ ہرگز نہیں کیا گیا، اور نہ تجارتی طور پر ان دکانوں کو استعمال کیا گیا، لیکن حافظ عبد الرشید سورتی نے صرف سامان رکھنے کی وجہ سے ان دکانوں کے رہن ہونے کا انکار کر دیا، بعد ازاں حافظ عبد الرشید سورتی، شبیر احمد ولد عبدالمجید کو مقدمہ بازی کی دھمکی دیتے ہوئے ایک معاہدہ کرا لیتا ہے جس میں وہ اس بات پر مجبور کرتا ہے کہ وہ

دکانوں کا کرایہ ادا کرے (اور کرایہ وصول کر رہا ہے) اور جس وقت دکانیں فروخت کی جائیں تو شبیر احمد ولد عبدالمجید، حافظ عبدالرشید سورتی کو دو لاکھ روپے بطور رسید بدلوائی کے ادا کرے، جبکہ یہ دکانیں شرعی نقطہ نگاہ سے شبیر احمد ولد عبدالمجید کے پاس رہن ہیں، اس میں چند مندرجہ ذیل باتوں کا شرعی نقطہ نظر سے فتویٰ تحریر فرمائیں:-

- ۱- حافظ عبدالرشید کا یہ فعل شرعی نقطہ نگاہ سے کیسا ہے؟
- ۲- حافظ عبدالرشید سورتی کے معاہدے کی شرعی حیثیت کیا ہے؟
- ۳- حافظ عبدالرشید سورتی پر شرعاً کیا ذمہ داری عائد ہوتی ہے؟
- ۴- اس معاملے میں شبیر احمد ولد عبدالمجید کو شرعاً کیا حق حاصل ہے؟ بینوا تو جروا۔

جواب:- مندرجہ بالا دونوں سوالوں میں جو واقعات تحریر کئے گئے ہیں، اگر وہ بالکل درست ہیں تو دونوں سوالوں کا مشترک جواب یہ ہے کہ محمد اسلم خان نے تقریباً گیارہ لاکھ روپے کے مديون ہونے کی حیثیت سے شبیر احمد کو اپنی تین دکانوں کا قبضہ جو یہ کہہ کر دیا کہ اگر میں اس تاریخ تک رقم ادا نہ کروں تو آپ دکانیں فروخت کر کے اپنی رقم وصول کر لیں، شرعاً اس سے یہ دکان شبیر احمد کے پاس رہن ہو گئیں (للعبارۃ الأولى) اور بطور ثبوت قبضہ کرائے کی جو تین رسیدیں دی گئیں ان سے اس معاملے کی حیثیت پر کوئی فرق نہیں پڑتا، اور یہ رہن ہی شمار ہوگا۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ شبیر احمد کی طرف سے نہ کرایہ ادا کیا گیا، نہ محمد اسلم خان کی طرف سے اس کا مطالبہ ہوا، اور نہ کرائے کو اصل قرض میں محسوب کرنے کا کوئی معاہدہ طے پایا۔ اب جبکہ یہ دکان رہن ہو گئیں تو مرہن یعنی شبیر احمد کی اجازت کے بغیر ان دکانوں کا بیچنا محمد اسلم خان کے لئے جائز نہیں تھا، اب اس نے حافظ عبدالرشید سورتی کو اپنی مارکیٹ کی جو بیج کی وہ ان دکانوں کی حد تک مرہن یعنی شبیر احمد کی اجازت پر موقوف رہی، (للعبارۃ الثانية)۔

اگر شبیر احمد نے اس بیج کی اجازت دے دی ہوتی، خواہ صریحاً یا ضمناً تو یہ بیج درست ہو جاتی، لیکن سوال سے معلوم ہوتا ہے کہ شبیر احمد نے اس بیج کی اجازت نہیں دی، اس کے بعد شبیر احمد نے حافظ عبدالرشید سورتی کے ساتھ کرایہ داری کا جو معاہدہ کیا، اگر وہ کسی زور زبردستی کے بغیر اور مکمل رضامندی کے ساتھ ہوتا تب بھی اس معاہدے کو بیج کی ضمنی اجازت قرار دیا جاسکتا تھا، اور اس کی وجہ سے یہ دکانیں رہن سے نکل جاتیں، اور ان میں کرایہ داری کا معاملہ درست ہو جاتا (للعبارۃ الثالثة)۔

لیکن سوال میں جو صورت حال بیان کی گئی ہے اور جس کی وضاحت سائل نے زبانی بھی کی وہ یہ ہے کہ کرایہ داری کا یہ معاہدہ برضا و رغبت نہیں ہوا، بلکہ شبیر احمد کی طرف سے یہ معاہدہ اس دباؤ

کے تحت کیا گیا کہ اگر یہ معاہدہ نہ کیا جاتا تو دکانیں جو اس کے پاس رہن تھیں اس کے قبضے سے نکل جاتیں اور قانونی طور پر اس کے لئے اپنا قبضہ برقرار رکھنا ممکن نہ تھا، کیونکہ اس کو مقدمہ بازی کی بھی دھمکی دی گئی تھی۔ لہذا اگر صورت حال یہی ہے جو سوال میں بیان کی گئی ہے، تو یہ کرایہ داری کا معاہدہ بھی شرعاً درست نہیں ہوا (للعبارۃ الرابعة)۔ اور جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ شبیر احمد نے قبضے کے ثبوت کے طور پر دکانوں میں کچھ سامان رکھ دیا، سو اس سے اس کے رہن ہونے کی حیثیت پر کوئی فرق نہیں پڑتا، کیونکہ اول تو یہ سامان سائل کی تصریح کے مطابق صرف قبضے کے ثبوت کے لئے رکھا گیا، دکانوں کے باقاعدہ استعمال کے لئے نہیں۔

دوسرے اگر مرہن شے مرہون سے کوئی فائدہ بھی اٹھائے تو یہ فائدہ اٹھانا اس کے لئے شرعاً ناجائز ضرور ہے لیکن شے مرہون کے رہن ہونے کی حیثیت پر اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا، اور اس سے رہن باطل نہیں ہوتا۔ لہذا بصورت صحت واقعات مندرجہ سوال یہ تینوں دکانیں اب بھی شبیر احمد کے پاس بطور رہن ہیں، اور اس کے ذمے حافظ عبدالرشید سورتی کو کرایہ دینا شرعاً واجب نہیں۔ ان احکام کی دلیل کے لئے عبارات فقہیہ مندرجہ ذیل ہیں:-

۱- العبارة الأولى:- وأما ركن عقد الرهن فهو الإيجاب والقبول وهو أن يقول الراهن رهنك هذا الشيء بمالك على من الدين أو يقول هذا الشيء رهن بدينك وما يجرى هذا المجرى ويقول المرتهن: ارتهنت أو قبلت أو رضيت وما يجرى مجراه فاما لفظة الرهن فليست بشرط حتى لو اشترى شيئاً بدراهم فدفع الى البائع ثوباً وقال له: أمسك هذا الثوب حتى أعطيك الثمن، فالثوب رهن لأنه أتى بمعنى العقد والعبرة في باب العقود للمعاني كذا في البدائع. (عالمگیری ج: ۵ ص: ۴۳۲)۔^(۱)

۲- العبارة الثانية:- توقف بيع الراهن رهنه على اجازة مرتهنه أو قضاء دينه فان وجد أحدهما نفذ وصار ثمنه رهنًا في صورة الاجازة... الخ. (الدر المختار ج: ۶ ص: ۵۰۶)۔^(۲)

۳- العبارة الثالثة:- وكذلك لو استأجره المرتهن صحت الاجارة وبطل الرهن اذا جدد القبض للاجارة. (شرح المجلة ج: ۳ ص: ۱۹۱)۔^(۳)

۴- وفي الدر:- أو حبس أو قيد مديدين بخلاف حبس يوم أو قيده أو ضرب غير

(۱) عالمگیری، کتاب الرهن ج: ۵ ص: ۴۳۱ (طبع رشیدیہ کوئٹہ)۔

(۲) الدر المختار ج: ۶ ص: ۵۰۸ (طبع سعید)

وفی شرح المجلة للأناسی رقم المادة: ۴۷ ص: ۱۸۹ (طبع مکتبہ حبیبیہ) لو باع الراهن الرهن بدون رضی المرتهن لا یفقد البیع... الخ۔

وکذا فی الہندیہ ج: ۵ ص: ۴۶۲ الباب الثامن، وکذا فی الہدایہ ج: ۴ ص: ۵۳۷ (طبع مکتبہ رحمانیہ) کتاب الرهن (طبع شركة علمیه)۔

(۳) طبع مکتبہ حبیبیہ کوئٹہ۔

شديد الا لذي جاه (درر) حتى باع أو اشترى أو أقر أو آجر فسخ ما عقد ولا يبطل حق الفسخ بموت أحدهما (الى) أو أمضى لأن الاكراه والملجئ وغير الملجئ يعدمان الرضاء والرضاء شرط لصحة هذه العقود وكذا لصحة الاقرار فلذا صار له حق الفسخ والامضاء. (ج: ۶ ص: ۱۳۰).^(۱)

وفى الدر: - وهل الاكراه بأخذ المال معتبر شرعاً ظاهر القنية نعم وفى الوهبانية إن يقل المديون انى مرافع، لتبرى فالاكراه معنى مصور (قوله ظاهر القنية نعم) وعبارتها ف ع متغلب قال لرجل: اما ان تبيعنى هذه الدار أو أدفعها الى خصمك، فباعها منه، فهو بيع مكره، ان غلب على ظنه تحقيق ما أوعدده. قال رضى الله عنه: فهذه اشارة الى أن الاكراه بأخذ المال اكراه شرعاً (شامى) قوله (انى مرافع) أى مرافعك للحاكم أى وكان ظالماً يؤذى بمجرّد الشكاية كما فى القنية. (شامى ج: ۶ ص: ۱۴۲، مطبوعه ايج ايم سعيد).

والله سبحانه اعلم

۱۴۱۰/۱۱/۱ھ

(فتوىٰ نمبر ۴۳/۴۱ و)

(وضاحت)

مذکورہ فتویٰ کے بعد تنازعہ کے ایک فریق کی طرف سے دوبارہ ایک سوال مرتب کیا گیا جس کا حضرت والادامت برکاتہم نے جواب تحریر فرمایا، وہ سوال اور جواب درج ذیل ہیں۔ (محمد زبیر)

حق کرایہ داری اور پگڑی کورہن کے طور پر رکھنے کی ایک مخصوص صورت اور اس کا حکم

سوال:- کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلے میں کہ محمد اسلم خان نے پانچ لاکھ روپے قرض لے کر اس کے بدلے میں چیک دیا اور یہ کہا کہ اگر یہ چیک کیش نہ ہوگا تو میں اپنی بیوی کو طلاق پر حلف اٹھاتا ہوں، اور وقت مقررہ پر چیک کو بینک میں نہیں ڈالنے دیا کہ میرا گھر برباد ہو جائے گا، اس طرح چار ماہ گزر گئے، آخر میں پتہ چلا کہ وہ بہت مقروض ہے اور کراچی چھوڑ کر جا چکا ہے، اس کے والد صاحب اور بھائیوں کی خوشامد کر کے ان کو واپس بلوالیا، محمد اسلم کے آنے پر پتہ چلا کہ ان کے ذمے ۹۰ لاکھ کا قرضہ ہے، ہم نے پیسے کا مطالبہ کیا تو اس نے کہا کہ میرے پاس ایک مارکیٹ ہے، اس میں متعدد دکانیں ہیں، اس میں سے چار عدد دکانیں میں اپنے قرض خواہوں کو ان کے روپے کے بدلے میں دے چکا ہوں حقوق کرایہ داری کے ساتھ، اب میرے پاس پوری مارکیٹ کی ملکیت اور پانچ دکانیں خالی ہیں، وہ آپ مجھ سے لے لیں، اور مجھ کو مزید تین لاکھ دے دیں تاکہ میں

ایک دکان خالی کراسکوں، جس پر ایک قرض خواہ قابض ہے، اور چار دکانیں میں نے مروجہ طور پر یعنی پگڑی پر قرض خواہوں کو دے دی ہیں، اور کرایہ داری کی رسید بھی بنادی ہے، مارکیٹ کے حقوق ملکیت آپ کی طرف منتقل کرنے میں یہ شرط ہوگی کہ آپ ان کے حقوق کرایہ داری تسلیم کریں، تاکہ میری عزت خراب نہ ہو، اور بعد میں باقاعدہ اس کی رسید جاری کریں، اس پر ان کے سالے فیروز صاحب نے یہ شرط رکھی۔ ہم نے ان کی یہ شرط منظور کر لی اور مزید پیسہ دے کر پوری مارکیٹ کے حقوق ملکیت اور پانچ خالی دکانیں اپنے نام پر منتقل کرائیں، اور باقاعدہ رجسٹری بھی کرائی، مارکیٹ کی ملکیت اسلم صاحب کی بیوی کے نام تھی، اسلم صاحب کی بیوی نے اپنے بھائی اور سر صاحب کے ساتھ کورٹ میں جا کر ہمارے نام منتقل کر دی اور ہمیں قبضہ دیا، اور ہم نے اپنے ایک ساتھی کے نام کروالی۔

کچھ عرصے کے بعد مولوی منیر صاحب تین دکانوں کی رسید اور ایک پرچہ اسلم صاحب کا لے کر آئے کہ یہ تین دکانیں ہمارے پاس رہن ہیں، ہم نے کہا کہ مارکیٹ رجسٹری کرانے سے پہلے اسلم صاحب نے ہم سے کہا تھا کہ یہ تین دکانیں منیر صاحب کو دے دی ہیں، تم ان کے نام تین پکی رسید جاری کر دینا، اور رسید جاری کرنے کے لئے مزید پیسے کا مطالبہ نہ کرنا، ورنہ میری عزت خراب ہوگی، تاہم اس کو تسلیم کرتے ہوئے مولوی منیر صاحب نے کہا کہ ہم آپ کی کرایہ کی رسید بنانے کے لئے تیار ہیں، ہم اس کو رہن تسلیم نہیں کرتے، اس لئے کہ اسلم صاحب نے آپ کی کرایہ داری تسلیم کر کے رسید بنانے کے لئے کہا ہے، ورنہ ہمارے نام محمد اسلم خان پوری مارکیٹ رجسٹری نہ کرتا، منیر صاحب نے جو پرچہ اسلم خان کے ہاتھ کا لکھا ہوا دیا ہے اسی طرز کا اسلم خان کے ہاتھ کا ایک اور پرچہ بنام محمد اقبال صاحب جس میں یہی مضمون ہے کہ اگر میں نے اس کے پیسے ادا نہ کئے تو یوسف مارکیٹ کی دو دکانیں نمبر ۶ اور نمبر ۷ کو فروخت کر کے اپنے پیسے وصول کر لیں، جبکہ وہ مارکیٹ اسلم خان کی ملکیت نہ تھی، بلکہ مروجہ پگڑی کا مالک تھا، اور اسلم خان کے نام کرایہ کی رسید تھی جو کہ بعد میں ان کی بیوی اور سالے نے افضل صاحب کے نام پر رسیدیں منتقل کروادیں۔

منیر صاحب سے ہم نے کہا کہ پرچہ دکھانے کی ضرورت نہیں، ہماری اطلاع میں پہلے ہی یہ بات ہے کہ اسلم خان نے یہ تین دکانیں آپ کو دی ہیں، اور ہم سے بھی یہ وعدہ کیا ہے کہ ہم آپ کے قبضے کو تسلیم کریں اور رسیدیں بنادیں، ہم رسید بنانے کو تیار ہیں، جس پر ان کا اصرار تھا کہ جب تک ہم کسی اور کو فروخت نہ کریں ہم سے کرایہ نہ لیا جائے، ہم نے کہا کہ یہ نہیں ہو سکتا، کرایہ تو دینا پڑے گا، آئندہ آپ کسی کو بیچیں گے تو ہم رسید کٹوائی لیں گے، جس پر یہ ناراض ہوئے کہ چلو کسی مفتی کے پاس، ہمارے ساتھی نے کہا کہ ہم کو کسی مفتی کے پاس جانے کی جلدی نہیں، انہوں نے کہا: اس طرح ہم ڈیفالٹر ہو جائیں گے، تو ہم نے کہا کہ آپ کورٹ میں پیسہ جمع کرادیں، اس طرح ڈیفالٹر نہ ہوں گے۔

ہم نے ان کو کوئی دھمکی نہیں دی، جس پر یہ بعد میں مفتی اکمل صاحب کے پاس ہمیں لے گئے اور ان کے سامنے مروجہ طور پر ایک فیصلہ طے پایا جو بعد میں لکھ لیا گیا۔

جہاں تک استفتاء میں یہ بات کہی گئی ہے کہ کرایہ کی رسید لی تھی اور محمد اسلم خان کو کرایہ نہیں دیا تھا، تو انہوں نے ہم سے بھی کرایہ کی رسید کے وقت یہ بات کہی تھی کہ ہم کرایہ نہیں دیں گے، جس کے ہاتھ پر ہم بیچیں گے آپ اس سے کرایہ لیجئے گا، تو ہم نے ان کی اس بات کو تسلیم نہیں کیا تھا اور کہا تھا کہ کرایہ دینا پڑے گا۔

اور ہم اس بات پر حلف اٹھا سکتے ہیں کہ کرایہ داری کی رسید کے لئے ہم نے ان پر کوئی زور زبردستی نہیں کی، بلکہ جب انہوں نے کہا کہ ہم ڈیفالٹر ہو جائیں گے، تو ہم نے کہا تھا کہ اس سے بچنے کے لئے آپ عدالت میں کرایہ جمع کرادیں تاکہ آپ کا حق قبضہ باقی رہے۔ فقط عبدالرشید عفا اللہ عنہ

تنقیحات

مندرجہ ذیل سوالات کا جواب اسی کاغذ کے ساتھ لکھ کر بھیجیں، ان شاء اللہ اس کے بعد جواب

دیا جائے گا:-

۱:- سوال کے پہلے صفحے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مذکورہ مارکیٹ اور اس کی تمام دکانیں محمد اسلم کی ملکیت تھیں، جن میں سے پوری مارکیٹ کی حقیقی ملکیت اس نے آپ کے نام منتقل کی، اور پانچ خالی دکانیں قبضہ سمیت دیں۔ لیکن دوسرے صفحے پر لکھا ہے کہ ”وہ مارکیٹ اسلم خان کی ملکیت نہ تھی، بلکہ مروجہ پگڑی کا مالک تھا“ ان دونوں باتوں میں تعارض معلوم ہوتا ہے، صحیح صورت کیا ہے؟ محمد اسلم مارکیٹ کا مالک تھا یا نہیں؟ اور اس نے آپ کو مارکیٹ مالکانہ طور پر فروخت کی؟ یا اس مارکیٹ میں صرف پگڑی لینے کا حق فروخت کیا؟ دوسری صورت میں اس کا اصل مالک کوئی اور ہے یا نہیں؟

۲:- جب آپ نے محمد اسلم سے مارکیٹ خریدی تو کیا آپ کو معلوم تھا کہ تین دکانیں مولوی

محمد منیر صاحب کے پاس رہن ہیں؟

۳:- مفتی محمد اکمل صاحب کی موجودگی میں جو فیصلہ طے پایا تھا، اس کی نقل ارسال فرمائیں۔

۴:- یہ فیصلہ جو ”مفتی محمد اکمل صاحب“ کی موجودگی میں ہوا، اس میں مولوی محمد منیر نے کیا

اپنے آپ کو بحیثیت کرایہ دار واقعہ تسلیم کیا تھا؟ یا یہ بات واضح تھی کہ وہ اپنے آپ کو کرایہ دار تسلیم نہیں کرتے، بلکہ بحیثیت مرہن دکانوں پر قبضہ برقرار رکھنے کے لئے قانونی مجبوری کے تحت کرایہ داری لکھ

رہے ہیں؟

۵:- کیا جب سے آپ نے محمد اسلم سے مارکیٹ خریدی اس وقت کے بعد کسی وقت مولوی محمد

منیر صاحب نے اس بیع کی اجازت دی؟ یا آپ کو پوری مارکیٹ کا مالک تسلیم کیا؟ یا کوئی ایسا کام کیا

جس سے آپ کے مالک ہونے کا اعتراف لازم آتا ہو؟

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۴۱۱/۶/۱۱ھ

جواب تنقیحات

۱:- یہ دو مختلف مارکیٹیں ہیں، جن میں سے پہلی مارکیٹ کی مالک محمد اسلم کی اہلیہ تھی اور اسی مارکیٹ کا معاملہ ہمارے ساتھ ہے، اور دوسری مارکیٹ یوسف مارکیٹ ہے جس میں دو دکانیں مروجہ پگڑی پر محمد اسلم نے خریدی ہوئی تھیں اور محمد اسلم نے ان دو دکانوں کے بارے میں بھی تقریباً وہی مضمون محمد اقبال کو لکھ کر دیا ہوا ہے، جو پہلی مارکیٹ میں مولوی منیر صاحب کو لکھ کر دیا تھا، یعنی اگر فلاں وقت تک رقم ادا نہ ہو تو دکانیں فروخت کر کے رقم وصول کر لیں۔ محمد اقبال اور محمد اسلم کے پاس معاہدے کی فوٹوکاپی ساتھ میں منسلک ہے، جس سے واضح ہوتا ہے کہ ان دونوں کو حق قبضہ (مروجہ پگڑی) اور کرایہ داری دیا جا رہا ہے، اسی لئے اس نے کرایہ داری کی رسید مولوی منیر صاحب کو جاری کی تاکہ کوئی ان کے کرایہ داری کے حق کو سلب نہ کر سکے اور قبضہ واپس نہ لے سکے۔

۲:- جب مارکیٹ ہمارے نام منتقل ہوئی اس وقت محمد اسلم نے ہم سے کہا تھا کہ تین دکانیں مولوی منیر صاحب کو دے کر کرایہ کی رسید جاری کر دی جائے، جب وہ کسی کو بیچیں تو کرایہ کی رسید بدل دینا، اس کا ذکر ہم استفتاء میں کر چکے ہیں۔

۳:- مفتی اکمل صاحب کی موجودگی میں جو فیصلہ ہوا اس کی نقل حاضر خدمت ہے۔

۴:- مولوی منیر صاحب نے ہمارے پاس آکر سب سے پہلے تین باتیں کی، اول یہ ہے کہ آپ کے علم میں ہے کہ تین دکانیں اسلم صاحب نے ہمیں کرایہ کی رسیدیں دے کر قبضہ دیا ہوا ہے، تاکہ ہم اس کو بیچیں اور اپنی رقم وصول کر لیں۔ (دوسری بات) اب آپ رسیدیں دیں اور کرایہ نہ لیں جس کو ہم بیچیں کرایہ آپ اسی سے لیں، اور ہم نے اسلم صاحب سے بھی رسیدیں لے کر کرایہ نہیں دیا تھا۔ (تیسری بات) جب ہم فروخت کریں تو رسید بدلوائی بھی نہیں دیں گے، وہ لینے والا آئندہ آپ اس سے رسید بدلوائی لے سکتے ہیں۔

ہم نے اس کو قبول نہیں کیا، اور تینوں دکانوں کے کرایہ کا مطالبہ کیا اور رسید بدلوائی کے ۵ لاکھ روپے کا مطالبہ کیا کہ جب آپ بیچیں گے تو ہم آپ سے پانچ لاکھ روپیہ لیں گے، اس پر وہ اور ہم جناب مفتی اکمل صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور وہاں ان کی موجودگی میں جو طے ہوا اس کی نقل موجود ہے کہ تینوں دکانوں کا کرایہ گیارہ سو روپے ماہانہ اور فروخت کر کے دو لاکھ روپیہ ہم کو دیں گے، یہ بات طے ہوئی اس فیصلے کی نقل منسلک ہے۔

۵:- مندرجہ بالا باتیں جو ہم سے مولوی منیر صاحب نے کی تھیں وہ ہم کو مالک تسلیم کر کے ہی کی تھیں، اور ہم نے سارے کاغذات ان کو دکھا دیئے تھے، اور یہ ہم کو کرایہ دیتے رہے مسلسل چھ ماہ تک اس درمیان ہم سے کوئی بات نہیں ہوئی، چھ ماہ بعد نیا استفتاء مرتب کر کے فتویٰ لیا اور نئی چیز کھڑی کر دی اس دوران ہم سے کوئی بات نہیں کی۔
فقط عبدالرشید عفا اللہ عنہ ۱۹۹۰-۱۲-۳۰

مزید تفصیل جواب نمبر ۱: محمد اسلم نے جو تحریر مولوی منیر صاحب کو دی ہے اس تحریر کی بنیاد پر ہم یہ عرض کرتے ہیں کہ یکم اکتوبر تک ادائیگی کہی تھی، ورنہ فروخت کا اختیار دیا تھا اور کرایہ داری کی رسید دے کر یہ بات ثابت کی کہ حق کرایہ داری فروخت کر سکتا ہے، گویا کہ حق کرایہ داری (مروجہ پگڑی) کو رہن رکھوایا، اگر ملکیت رہن رکھی ہوئی ہوتی تو قاعدے کے حساب سے جائیداد کے کاغذات رکھوائے جاتے ہیں اور بیچنے کا اختیار دیا جاتا ہے، یہاں کرایہ داری کی رسید جاری کی یعنی وہ پگڑی پر بیچ سکتا ہے، اس لئے کہ مولوی منیر اور محمد اقبال دونوں کو جو تحریر دی ہے وہ ایک جیسی ہے، اور دونوں کو فروخت کی اجازت دی ہے اور حق کرایہ داری۔
فقط عبدالرشید عفا اللہ عنہ

جواب:- اس قضیہ سے متعلق ہمارے پاس اس سے پہلے شبیر احمد صاحب کی طرف سے ایک استفتاء آچکا ہے، کیونکہ اس قسم کے معاملات میں فریقین کے بیانات عموماً متضاد ہوتے ہیں جن سے مسئلے کے شرعی حکم پر فرق پڑ جاتا ہے، اس لئے اُن کو یہ مشورہ دیا گیا تھا کہ وہ اپنے فریق مخالف یعنی حافظ عبدالرشید سورتی صاحب کے ساتھ مل کر ایک متفقہ استفتاء مرتب کریں تاکہ صورت مسئلہ دونوں کے اتفاق سے سامنے آنے کے بعد جواب دونوں کے لئے واجب التسلیم ہو، لیکن انہوں نے متفقہ سوال کے مرتب ہونے کے امکان کی نفی کرتے ہوئے اپنے سوال کا جواب طلب کیا۔ مفتی کا کام چونکہ واقعات کی تحقیق نہیں ہے، بلکہ وہ سوال کی صورت کے مطابق جواب دینے کا پابند ہے، چنانچہ سوال کی جو نوعیت اُس وقت تحریری طور پر بیان کی گئی اُس وقت اُس کے مطابق جواب دے دیا گیا، جو مورخہ ۱۴۱۰/۱۰/۲۸ھ کو ہمارے دارالافتاء سے جاری ہوا۔ اُس کے تقریباً آٹھ مہینے کے بعد حافظ عبدالرشید سورتی صاحب کی طرف سے یہ استفتاء موصول ہوا، اُن کو بھی یہی مشورہ دیا گیا کہ صورت سوال متفقہ طور پر فریقین کی طرف سے بطور استفتاء پیش کی جائے تو قضیہ کے حل میں سہولت ہوگی۔ لیکن انہوں نے بھی اس سے معذوری کا اظہار کرتے ہوئے اپنے سوال کا جواب طلب کیا۔ اور اس استفتاء کو جواب تنقیحات کے ساتھ غور سے پڑھنے کے بعد یہ بات واضح ہوئی کہ اس سوال میں صورت مسئلہ اُس صورت مسئلہ سے مختلف ہے جو شبیر احمد صاحب کے استفتاء میں بیان کی گئی تھی، دوسرے متعدد اختلافات کے علاوہ دونوں سوالات میں دو بنیادی فرق موجود ہیں، جن کی وجہ سے مسئلے کے شرعی حکم پر

بہت فرق پڑتا ہے۔

پہلی بات یہ ہے کہ شبیر احمد صاحب کے استفتاء میں یہ بات ظاہر تھی کہ محمد اسلم نے مولوی منیر احمد صاحب کو دکانیں رہن کے طور پر دی تھیں، صرف اُن کا حق کرایہ داری رہن نہیں رکھا تھا، جبکہ حافظ عبدالرشید سورتی صاحب کے حالیہ استفتاء میں یہ موقف اختیار کیا گیا ہے کہ محمد اسلم نے دکانیں نہیں بلکہ اُن کا صرف حق کرایہ داری مولوی منیر احمد صاحب کے پاس رہن رکھا تھا۔

اور دوسرا فرق یہ ہے کہ شبیر احمد صاحب کے استفتاء کے مطابق مفتی محمد اکمل صاحب کی موجودگی میں حافظ عبدالرشید سورتی صاحب کے لئے کرایہ داری کی جو تحریر لکھی گئی تھی وہ محض قانونی مجبوری اور دباؤ کے تحت لکھی گئی، برضا و رغبت نہیں، جبکہ حافظ عبدالرشید سورتی صاحب کے حالیہ استفتاء میں زور زبردستی یا کسی قسم کے دباؤ کی نفی کی گئی ہے۔

اب حافظ عبدالرشید سورتی صاحب کے حالیہ استفتاء میں یہ کہا گیا ہے کہ محمد اسلم نے مولوی منیر احمد صاحب کو دکانیں رہن نہیں رکھی تھیں بلکہ صرف اُن کا حق کرایہ داری رہن رکھا تھا، اور جب اُس نے یہ کہا تھا کہ اگر وہ یکم اکتوبر تک ادائیگی نہ کرے تو مولوی منیر احمد صاحب کو یہ دکانیں فروخت کرنے کا اختیار ہوگا، تو اس سے مراد دکانوں کی حق ملکیت کی فروختگی نہیں بلکہ حق کرایہ داری کی فروختگی مراد تھی (جس کو عرف عام میں پگڑی کہتے ہیں) اگرچہ جو الفاظ محمد اسلم کی تحریر میں موجود ہیں اُن سے اس صورت حال پر دلالت نہیں ہوتی (اور محض یہ بات کہ یہی الفاظ محمد اقبال کے لئے لکھی گئی تحریر میں بھی موجود ہیں، جن کا مقصد پگڑی کا رہن ہے، اس بات کے لئے کافی نہیں کہ مولوی منیر احمد صاحب کی تحریر میں بھی اُن کے وہی معنی لئے جائیں، کیونکہ اول الذکر دکانوں میں محمد اسلم صرف حق کرایہ داری کا مالک تھا، اور ثانی الذکر میں حق ملکیت اُس کا تھا) لیکن کاروباری عرف کے لحاظ سے اُن الفاظ میں پگڑی کے تصور کا احتمال ضرور موجود ہے، اور اگر مولوی منیر احمد صاحب اور محمد اسلم کے درمیان یہ بات باہم طے شدہ تھی کہ مولوی منیر احمد صاحب کو صرف حق کرایہ داری دیا جا رہا ہے، اور مولوی منیر احمد صاحب نے یہی سمجھ کر اُن دکانوں کا قبضہ لیا تھا تو بے شک یہی سمجھا جائے گا کہ محمد اسلم نے صرف حق کرایہ داری ان کی طرف منتقل کیا تھا، اور سوال سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ بات مولوی منیر احمد صاحب پر اچھی طرح واضح تھی، جس کی دلیل یہ ہے کہ جواب تنقیح نمبر ۴ کے مطابق مولوی منیر احمد صاحب نے حافظ عبدالرشید سورتی صاحب کے پاس آکر جو تین باتیں کہیں اُن میں سے دوسری بات یہ تھی کہ: ”جس کو ہم بیچیں، کرایہ آپ اُسی سے لیں“ ان الفاظ سے واضح ہے کہ خود اُن کے ذہن میں یہ بات تھی کہ وہ جو کچھ فروخت کریں گے وہ حق کرایہ داری ہوگا، کیونکہ حق ملکیت کہنے کی صورت میں

حافظ عبدالرشید سورتی صاحب کے خریدار سے کرایہ لینے کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔

لہذا اگر یہ بات درست ہے کہ محمد اسلم نے مولوی منیر صاحب کو محض حق کرایہ داری کا قبضہ دیا تھا اور یہ بات مولوی منیر صاحب پر بھی واضح تھی اور انہوں نے حافظ عبدالرشید سورتی صاحب سے وہ بات کہی تھی کہ: ”ہم جس کو بچیں، کرایہ آپ اُسی سے لیں“ تو شرعی حکم یہ ہے کہ یہ رہن درست نہیں ہوا، کیونکہ محض حق کرایہ داری یا پگڑی کا حق شرعاً نہ قابل فروخت ہے، نہ اس کو رہن رکھا جاسکتا ہے، اور پگڑی یا محض رسید بدلوانے کے اوپر کسی رقم کا لین دین بھی شرعاً جائز نہیں ہے، اور جب یہ رہن صحیح نہیں ہوا تو مولوی منیر صاحب کا دین بدستور محمد اسلم کے ذمے واجب ہے، اور دکانوں کی ملکیت چونکہ عقد بیع کے ذریعہ حافظ عبدالرشید صاحب سورتی کی طرف منتقل ہو چکی ہے، لہذا وہ دکانیں اُن کی ملکیت ہیں اور مولوی منیر صاحب کے ذمہ دکانوں کا کرایہ واجب ہوگا۔

اور مذکورہ بالا تفصیل کے بعد دوسری بات (یعنی کرایہ داری کی تحریر کے جبری یا رضامندی کے ساتھ ہونے کے مسئلے) پر بحث کی ضرورت نہیں رہتی، کیونکہ اس مسئلے کا تعلق اس صورت سے ہے جب دکانوں کا حق کرایہ داری نہیں بلکہ دکانیں رہن رکھی گئی ہوتیں، اور اس استفتاء کی بنیاد چونکہ پہلی صورت پر ہے اس لئے اب اس بحث میں پڑنا غیر ضروری ہے۔

اور یہ بات ہم پہلے کہہ چکے ہیں کہ مروجہ پگڑی اور رسید بدلوانے پر رقم وصول کرنا شرعاً ہرگز جائز نہیں ہے، اور فریقین کو اس قسم کے معاملات سے مکمل پرہیز کرنا ضروری ہے۔

فی الہندیۃ (ج: ۵ ص: ۴۳۵): ما يجوز بيعه يجوز رهنه وما لا يجوز بيعه لا يجوز رهنه.

وفی الدرّ عن الأشباه: لا يجوز الاعتياض عن الحقوق المجردة الخ. (جلد: ۴)

(۲)

ص: ۵۱۸.

وفی الشامیۃ ناقلاً عن البدائع: الحقوق المفردة لا تحتمل التملیک ولا يجوز

الصّٰلِح عنها. اهـ۔

۱۴۱۱/۷/۵ھ

(فتویٰ نمبر ۲/۴۸)

(۱) (طبع رشیدیہ کوئٹہ) وفی الدر المختار، کتاب الرهن ج: ۶ ص: ۴۹۰ (طبع سعید) وفی الأشباه ما قبل البیع قبل الرهن، وفی الشامیۃ تحته قوله ما قبل البیع قبل الرهن أى کل ما یصحّ بیعه صحّ رهنه.

وکذا فی شرح مجلّة الأحکام المادّة: ۲ ج: ۱ ص: ۱۲۱، وراجع أيضاً: ”فقہی مقالات“ ج: ۱ ص: ۱۵۹ بیع حقوق المجردة.

(۲) (طبع ایچ ایم سعید).

مراہجہ، اجارہ یا مشارکہ کی تمویل میں رہن طلب کرنے کا حکم

سوال:- محترمی و مکرمی السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

الحمد للہ مع الخیر ہیں، اُمید کہ آنجناب کے مزاج بخیر ہوں گے۔

یہاں چینیائی میں چند مخیر حضرات نے مل کر اپنے ایک دیرینہ خواب ”بلا سودی مالیات“ (Interest Free Financing) پر چند مہینوں سے کوشش شروع کی تھیں، ان شاء اللہ بہت جلد وہ خواب شرمندہ تعبیر ہونے والا ہے۔ اسی سلسلے میں مندرجہ ذیل ایک مسئلے پر علماء کی رائے مطلوب ہے۔ کیا کسی بزنس یا پروجیکٹ کے لئے مالیات کی فراہمی کے لئے کسی بھی قسم کا رہن کا طلب کرنا ممنوع ہے؟ اس سلسلے میں یہ بات یہاں واضح ہو کہ اسلامی بینک قائم کرنے کی کئی کوششیں ہندوستان میں کی گئیں، مگر اکثر ناکام رہیں، جس کی سب سے بڑی وجہ یہ رہی ہے کہ رقم لینے کے بعد کسی قسم کی پابندی / ذمہ داری کی غیر حاضری پر رقم لینے والے کو رقم لوٹانے کی فکر نہیں رہتی یا پروا نہیں رہتی۔ اگر یہ ممنوع ہے تو دی گئی پونجی کی حفاظت کی اور کیا صورت ہو سکتی ہے؟ اس معاملے پر تفصیلی روشنی ڈالیں تو بڑی نوازش ہوگی۔

جواب:- محترمی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

رہن طلب کرنے کا جائز یا ناجائز ہونا اس بات پر موقوف ہے کہ مالیات کی فراہمی کس بنیاد پر کی جا رہی ہے؟ اگر مراہجہ کی بنیاد پر ہے تو چونکہ وہ ایک بیع ہے جس کی قیمت مستقبل میں واجب الاداء ہونے کی وجہ سے خریدار کے ذمے دین بن چکی ہے،^(۱) اس لئے گاہک سے رہن طلب کرنا بالکل جائز ہے۔^(۲) اسی طرح اگر تمویل اجارہ کی بنیاد پر ہے تب بھی اجرت کی توثیق کے لئے رہن طلب کرنا جائز ہے۔ ”لما فی البحر: ”ولا يلزم علينا صحة الإبراء عن الأجرة والكفالة والرهن بها لأنا

(۱ و ۲) وفي الدر المختار، كتاب الرهن ج: ۶ ص: ۴۷۷، ۴۷۸ (طبع سعید) هو حبس شيء مالي بحق يمكن استيفاءه أي أخذه منه كلاً أو بعضاً كان قيمة المرهون أقل من الدين (كالدین) كاف الاستقصاء لأن العين لا يمكن استيفائها من الرهن إلا إذا صار ديناً حكماً كما سيحییء حقيقة وهو دين واجب ظاهراً وباطناً أو ظاهراً فقط كضمن عبد أو حكماً كالأعيان المضمونة بالمثل أو القيمة... الخ.

وفي الهداية، كتاب الرهن ج: ۳ ص: ۵۱۸ (طبع مكتبة رحمانیہ) ولا يصح الرهن إلا بدين مضمون لأن حكمه ثبوت يد الاستيفاء والاستيفاء يتلو الوجوب.

وفي الدر المختار ج: ۶ ص: ۴۹۷ (طبع سعید) باع عبداً على أن يرهن المشتري بالثمن شيئاً بعينه أو يعطى كفيلاً كذلك بعينه صح ولا يجبر المشتري على الوفاء لما مر أنه غير لازم وللبائع فسخة لفوات الوصف المرغوب إلا أن يدفع المشتري الثمن حالاً أو يدفع قيمة الرهن المشروط رهنًا لحصول المقصود.

وفي الشامية تحت (قوله لفوات الوصف المرغوب) لأن الثمن الذي به رهن أو ثقل مما لا رهن به فصار الرهن صفة للثمن وهو وصف مرغوب فله الخيار بفواته.

نقول: ذاک بناء علی وجود السبب فصار كالعفو عن القصاص بعد وجود الجرح“ (البحر الرائق ج: ۷ ص: ۵۱۱)۔^(۱) لیکن یاد رہے کہ رهن کا مقصد صرف ادائیگی کی توثیق (Security) ہے۔ لہذا مرتهن (یعنی صورتِ مسئلہ میں مالیات فراہم کرنے والے) کے لئے جائز نہیں ہے کہ وہ اس رهن سے کسی بھی صورت میں فائدہ اٹھائے۔^(۲) البتہ اگر مدیون ادائیگی نہ کرے تو اسے بیچ کر اپنا حق وصول کرنا جائز ہے۔

اور اگر تمویل مشارکہ کی بنیاد پر ہے تو اس صورت میں رهن طلب کرنا جائز نہیں،^(۳) کیونکہ شریک مدیون نہیں ہوتا۔^(۴) البتہ وہ اگر خیانت کرے یا اپنے فرائض صحیح طریقے سے بجا نہ لائے تو اس وقت وہ ذمہ دار ہوتا ہے۔

واللہ سبحانہ اعلم

۱۴۲۷/۶/۱۹ھ

(فتویٰ نمبر ۱۱/۸۹۶)



(۱) البحر الرائق، کتاب الاجارة ج: ۷ ص: ۳۰۰ (طبع سعید) نیز گزشتہ حاشیہ ملاحظہ فرمائیں۔

(۲) دیکھئے ص: ۳۲۲ تا ۳۲۳ کے فتاویٰ اور ان کے حواشی۔

(۳ و ۴) وفي الهدية ج: ۴ ص: ۵۲۳ و ۵۲۵ (طبع رحمانیہ) ولا يصح الرهن بالأمانات كالودائع والعواري والمضاربات ومال الشركة لأن القبض في باب الرهن قبض مضمون فلا بد من ضمان ثابت ليقع القبض مضموناً ويتحقق استيفاء الدين منه.

وفي حاشيته قوله قبض مضمون أي قبض يصير به المقبوض مضموناً على القابض بقدر الدين فلا بد من ضمان على الرهن حتى يصير المرهون مضموناً على المرتهن بقدر ذلك الضمان وليس في الأمانات ضمان فان حق صاحب الأمانة مقصود على العين.

وفي الدر المختار ج: ۶ ص: ۴۹۲ (طبع سعید) ولا بالأمانات كوديعة وأمانة.

وفي الشامية (قوله كوديعة وأمانة) الأصوب وعارية وكذا مال مضاربة وشركة كما في الهدية... الخ.

﴿کتاب الہیہ﴾

(ہیہ کے مسائل کا بیان)

۱:- مرض الوفات سے قبل ہبہ کیا جاسکتا ہے اور بیوی کو

کتنا مال ہبہ کرنا چاہئے؟

۲:- ہبہ زبانی بھی ہو سکتا ہے مگر قبضہ ضروری ہے

سوال ۱:- کیا انسان اپنا مال اور مملوکہ جائیداد اپنے کسی وارث کو اپنی زندگی میں دے سکتا ہے یا نہیں؟ میں عمر کے آخری حصے میں ہوں، میں چاہتا ہوں کہ بیوی کو اور دوسرے وارثوں کو جائیداد وغیرہ دے دوں، بیوی کو کتنا دینا چاہئے؟ کیا میں ایسا کر سکتا ہوں؟ اور اپنا مال کسی کو دینا چاہوں تو دے سکتا ہوں؟

سوال ۲:- کیا میں زبانی طور پر کسی کو ہبہ کر سکتا ہوں؟ اور زبانی ہبہ ہو سکتا ہے یا نہیں؟ اس سے دوسرا مالک بن جائے گا یا نہیں؟ ہبہ کا بہتر طریقہ کیا ہے اور ہبہ اپنی کیسی حالت تک کر سکتا ہوں؟

جواب ۱:- مرض وفات (یعنی وہ مرض جس میں انسان کی موت واقع ہو) سے پہلے پہلے انسان اپنی مملوکہ جائیداد میں ہر طرح کا جائز تصرف کر سکتا ہے^(۱)، جس میں ہبہ بھی داخل ہے، لیکن کوئی ایسا طریقہ اختیار کرنا مناسب نہیں ہے جس سے ایک وارث کے سوا تمام دوسرے ورثاء اس کی جائیداد سے محروم ہو جائیں، لہذا بہتر صورت آپ کے لئے یہ ہے کہ بیوی کے مہر معاف کر دینے کے باوجود

(۱) ا) وفی شرح المجلّة للامام ج: ۴ ص: ۱۳۲ رقم المادّة: ۱۱۹۲ (طبع مکتبہ حقانیہ پشاور) کل يتصرف فی ملکہ کیف شاء لأن کون الشیء ملکاً لرجل یقتضی أن یکون مطلقاً فی التصرف فیہ کیفما شاء.

وفی شرح المجلّة لسلم رستم باز ج: ۱ ص: ۶۵۴ رقم المادّة: ۱۱۹۲ (طبع حنفیہ کوئٹہ) کل يتصرف فی ملکہ کیف شاء. (۳) وفی صحیح البخاری ج: ۱ ص: ۳۵۲ (طبع قدیمی) عن حمید بن عبد الرحمن ومحمد بن النعمان بن بشیر أنهما حدثاه عن النعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ أن أباه أتى به الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فقال: انی نحلّ ابنی هذا غلاماً، فقال: أکلّ ولدک نحلّ مثله؟ قال: لا! قال: فارجعه.

وفی فتح الباری ج: ۵ ص: ۲۸۰ (طبع مکتبہ الرشد) وذهب الجمهور الی أن التسویة مستحبة فان فضل بعضاً صحّ وکره، واستحبت المبادرة الی التسویة أو الرجوع فحملوا الأمر علی النّدب والنهی علی التّنزیه.

وکذا فی عمدة القاری ج: ۱۳ ص: ۲۱۴ الی ۲۱۶ (طبع دار احیاء التراث العربی بیروت) وکذا فی اعلی السنن ج: ۱۶ ص: ۹۶، ۹۷ (طبع ادارة القرآن کراچی)

وفی شرح الطیبی علی مشکوٰۃ ج: ۶ ص: ۱۸۱ ولو وهب جمیع ماله من ابنه جاز وهو آثم، نص علیہ محمد.... الخ. وفی الدر المختار مع رد المحتار، کتاب الہبہ ج: ۵ ص: ۶۹۶ (طبع سعید) لا بأس بفضیل بعض الأولاد.... وکذا فی العطایا ان لم یقصد به الاضرار وان قصده یسوی بینهم.... ولو وهب فی صحته کل المال للولد جاز وآثم.

وفی الہندیہ ج: ۴ ص: ۳۹۱ (طبع رشیدیہ) ولو وهب شیئاً لأولاده فی الصحّة وأراد تفضیل البعض علی البعض عن أبی حنیفة لا بأس به، اذا کان التفضیل لزیادة فضل فی الدّین وان کاناً سواء یکره. وروی المعلى عن أبی یوسف أنّه لا بأس به اذا لم یقصد به الاضرار وان قصد به الاضرار سوا بینهم وهو المختار.... الخ.

وکذا فی البحر الرائق، کتاب الہبہ ج: ۷ ص: ۲۸۸ والبرازیة علی هامش الہندیہ ج: ۶ ص: ۲۳۷ وفتاویٰ قاضی خان ج: ۳ ص: ۲۷۹.

آپ اسے مہر کی رقم یا اس قیمت کی جائیداد دے دیں، یا اگر اس کو ناکافی سمجھیں تو جائیداد کا اتنا حصہ مزید بیوی کو ہبہ کر دیں جس کی آمدنی سے اس کی گزراوقات بہ آسانی ہو سکے، اور باقی جائیداد اپنی ملکیت میں رکھیں جو آپ کے بعد آپ کے تمام شرعی ورثاء میں تقسیم ہو سکے۔

جواب ۲:- ہبہ زبانی بھی ہو سکتا ہے^(۱)، لیکن ہبہ کی تکمیل اس وقت تک نہیں ہوتی جب تک موہوب لہ (یعنی وہ شخص جس کو ہبہ کیا جا رہا ہے) اس پر قبضہ نہ کر لے۔^(۲) اور بہتر طریقہ یہ ہے کہ ہبہ تحریری طور پر کیا جائے اور اس پر دو گواہ بھی بنائے جائیں تاکہ آئندہ کوئی تنازعہ نہ ہو سکے۔ واضح رہے کہ بیوی کے لئے کسی بھی قسم کا ہبہ صرف اس وقت شرعاً نافذ ہوگا جبکہ وہ مرض الموت سے پہلے پہلے کر لیا جائے، اگر بیماری کی حالت میں ہبہ کیا اور اسی بیماری میں انتقال ہو گیا تو یہ ہبہ کالعدم ہوگا۔^(۳)

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۱۳۹۷/۳/۲۶ھ

(۱) وفي الهداية ج: ۳ ص: ۲۸۵ (طبع مكتبة رحمانية، و ج: ۳ ص: ۲۸۳ في طبع مكتبة شركت علميه) وتصحح بالايحاب والقبول.... الخ.

وفي الدر المختار مع رد المحتار ج: ۵ ص: ۶۸۸ (طبع سعيد) و ركنها هو الايجاب والقبول.... الخ. وفي الدر المنتقى على مجمع الأنهر ج: ۳ ص: ۴۹۰ (طبع غفاريه كوئته) وتصحح بايحاب وقبول ولو بالفعل في حق الموهوب له.

وفي شرح المجلة للأناسي ج: ۳ ص: ۳۴۴ (طبع مكتبة حبيبيه) تنقعد الهبة بالايحاب والقبول.... الخ. (۲) وفي الدر المختار، كتاب الهبة ج: ۵ ص: ۶۸۸ (طبع سعيد) و شرائط صحتها في الموهوب أن يكون مقبوضاً. وفيه أيضاً ج: ۵ ص: ۶۹۰ وتتم الهبة بالقبض الكامل.

وفي مجمع الأنهر ج: ۳ ص: ۴۹۱ (طبع غفاريه كوئته) وتتم بالقبض الكامل لقوله عليه الصلوة والسلام لا تجوز الهبة إلا مقبوضة.

وفي الهداية ج: ۳ ص: ۲۸۵ و ۲۸۶ (طبع مكتبة رحمانية) وتصحح بالايحاب والقبول والقبض.... قوله عليه السلام لا يجوز الهبة إلا مقبوضة.

وفي ملتقى الأبحر ج: ۳ ص: ۴۸۹ وتتم (الهبة) بالقبض الكامل. وفي شرح المجلة لسليم رستم باز ص: ۴۶۲ وتتم بالقبض الكامل لأنها من التبرعات والتبرع لا يتم إلا بالقبض..... الخ. وفيها أيضاً ج: ۱ ص: ۴۷۳ رقم المادة: ۸۶۱ يملك الموهوب له الموهوب بالقبض شرط لثبوت الملك. وكذا في شرح المجلة للأناسي ج: ۳ ص: ۳۴۴ رقم المادة: ۸۳۷ و ج: ۳ ص: ۳۸۱ رقم المادة: ۸۶۱ (طبع مكتبة حبيبيه كوئته).

(۳) وفي الهندية، كتاب الهبة، الباب العاشر في هبة المريض ج: ۴ ص: ۴۰۰ (طبع رشيدية) لا تجوز هبة المريض ولا صدقته إلا مقبوضة فإذا قبضت فجازت من الثلث، وإذا مات الواهب قبل التسليم بطلت. وكذا في النزاهة على الهندية ج: ۶ ص: ۳۳۹ (طبع رشيدية).

وفي رد المحتار ج: ۵ ص: ۷۰۰ (طبع سعيد) وهب في مرضه ولم يسلم حتى مات بطلت الهبة.... الخ. وفي شرح المجلة للأناسي رقم المادة: ۸۷۹ ج: ۳ ص: ۴۰۳ (طبع مكتبة حبيبيه كوئته) وإذا وهب أحد في مرض موته شيئاً لأحد ورثته وبعد وفاته لم تجز الورثة الباقيون لا تصح تلك الهبة. وكذا في الهداية، كتاب الوصايا ج: ۴ ص: ۶۵۷ (طبع شركت علميه ملتان).

وكذا في شرح المجلة لسليم رستم باز رقم المادة: ۸۷۹ ج: ۱ ص: ۴۸۳ (طبع حنفية كوئته).

ہبہ کی گئی زمین موہوب لہ کی ملکیت ہے اور واہب کی

موت کے بعد اُس میں میراث جاری نہیں ہوگی

سوال :- بکر نامی شخص کی دو لڑکیاں تھیں، ان میں سے ایک کا نام فاطمہ اور دوسری کا نام زینت تھا، اور دو لڑکے تھے، ان میں سے ایک کا نام غلام رسول تھا اور دوسرے کا نام غلام نبی تھا، اور ایک بھانجا تھا جس کا نام خالد تھا۔

اور بکر کی دوسری لڑکی فاطمہ کے بطن سے ایک لڑکی اور ایک لڑکا پیدا ہوا، لڑکے کا نام محمد شریف خان تھا، اور لڑکی کا نام کلثوم تھا، اور کلثوم کے بطن سے دو لڑکے پیدا ہوئے، ان میں سے ایک کا نام غازی خان ہے اور دوسرے کا نام نبی خان ہے

اب بکر نے مرض الموت سے پہلے اپنی زمین کے کل تین حصے کر کے ایک حصہ اپنے بھانجے خالد کو دے دیا، اور دو حصے اپنے دونوں بیٹے غلام رسول اور غلام نبی کو دے دیا، اور اپنی دونوں لڑکیاں یعنی فاطمہ اور کلثوم کو کچھ نہیں دیا، گویا کہ اپنی زمین کے حصے سے ان دونوں کو محروم کر دیا۔

اب فاطمہ جو بکر کی لڑکی ہے، اس کی لڑکی جو کلثوم ہے اُس کا بیٹا غازی خان یہ دعویٰ کر رہا ہے کہ مجھے میری نانی یعنی فاطمہ کی میراث ملنی چاہئے اور ساتھ ساتھ یہ بھی کہتا ہے کہ میری والدہ یعنی کلثوم مجھے فوت ہونے کے وقت یہ کہہ گئی ہے کہ آپ اپنی نانی فاطمہ کی میراث طلب کریں، اور اس دعوے پر غازی کے پاس کوئی گواہ بھی نہیں ہے، اور غازی خان کے دوسرے بھائی نبی خان نہ اپنی نانی کی میراث کا دعویٰ کر رہا ہے اور نہ اپنی والدہ کلثوم کی وصیت کا ذکر کرتا ہے، آیا اس صورتِ مذکورہ میں غازی خان کا یہ دعویٰ درست ہے یا نہیں؟

جواب :- اگر یہ صحیح ہے کہ بکر نے اپنی زندگی میں مرض الموت سے پہلے ہی^(۱) اپنی زمین اپنے بھانجے اور دو بیٹوں کو مالک و قابض بنا کر ہبہ کر دی تھی، اور انہوں نے اُس پر قبضہ بھی کر لیا تھا، تو اب وہ زمین بکر کی ملکیت سے نکل کر بھانجے اور بیٹوں کی ملکیت میں آگئی^(۲)، اور اس سے بکر کے ورثاء کا کوئی تعلق نہیں رہا، چنانچہ یہ زمین بکر کے ترکے میں شامل نہیں ہوگی، اور دوسرے ورثاء کو اس پر دعوے کا حق نہیں پہنچتا۔ ہاں اگر بکر نے اس زمین کے علاوہ بھی کچھ مال یا جائیداد چھوڑی ہو تو وہ اس کے

(۱) دیکھئے حوالہ ص: ۴۴۰ کا حاشیہ نمبر ۳۔

(۲) وفي الدر المختار ج: ۵ ص: ۶۹۲ (طبع سعید) وتتم الهبة بالقبض الكامل الخ. وفيه أيضًا ج: ۵ ص: ۶۸۸ وحكمها ثبوت الملك للموہوب لہ غیر لازم الخ. وفيه أيضًا ج: ۵ ص: ۶۸۸ وشرط صحتها في الموہوب أن يكون مقبوضًا الخ. نیز دیکھئے ص: ۴۴۰ کا حاشیہ نمبر ۲۔

شرعی ورثاء میں تقسیم ہوگی، لہذا اُس زمین پر غازی خان کا دعویٰ شرعاً قابل قبول نہیں۔

واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم

۱۳۹۷/۳/۱۰ھ

(فتویٰ نمبر ۳۱۵/۲۸ ب)

**ہبہ درست ہونے کے لئے قبضہ ضروری ہے، محض کاغذات میں
نام کرنے سے ہبہ نہیں ہوتا**

سوال:- اگر کوئی شخص اپنی زندگی میں کوئی جائیداد اپنی اولاد کے نام خریدتا ہے اور یہ کہتا ہے کہ یہ جائیداد میں نے اولاد کو ہبہ کر دی، تو کیا اُس کے انتقال کے بعد ہبہ کی ہوئی جائیداد اُس کی وراثت میں شامل کرنی ہوگی؟

۲:- کیا شریعت میں صرف زبان سے کہہ دینے سے ہبہ ہو جاتا ہے یا اُس کے لئے لکھت ہونا ضروری ہے؟ کیا زبان سے کہہ دینے کے لئے کسی گواہ کا ہونا ضروری ہے؟

مثلاً زید نے اپنے بیٹے بکر کے نام ایک جائیداد خریدی، تمام کاغذات بکر کے نام ہیں، زید نے بکر سے اپنی زندگی میں کہہ دیا کہ یہ جائیداد تمہیں ہبہ کرتا ہوں، اس ہبہ کے گواہ موجود ہیں جو کہ بکر کی والدہ، دادی اور چاچا ہیں، کیا زید کے انتقال کے بعد اس ہبہ کی ہوئی جائیداد کو وراثت میں شامل کیا جائے گا یا نہیں؟

جواب ۱، ۲:- شرعاً ہبہ کے لئے تحریری ہبہ نامہ مرتب کرنا ضروری نہیں، یعنی زبانی بھی ہو سکتا ہے، البتہ یہ ضروری ہے کہ جس شخص کو ہبہ کیا گیا ہے وہ ہبہ شدہ چیز پر قبضہ کر لے، لہذا صورت مسئلہ میں اگر بکر نے اس جائیداد پر زید مرحوم کی زندگی ہی میں قبضہ بھی کر لیا تھا تو یہ جائیداد بکر کی ملکیت ہوگی، زید کے دوسرے ورثاء کا اس جائیداد سے کوئی تعلق نہیں ہے، اور اس کو زید کے ترکے میں شامل نہیں سمجھا جائے گا۔

واضح رہے کہ محض کاغذات کسی کے نام بنوا دینے سے ہبہ نہیں ہوتا، بلکہ زبانی یا تحریری طور پر ہبہ کی تصریح اور موہوب لہ کا اس پر قبضہ کرنا ضروری ہے، یہاں چونکہ زبانی تصریح موجود ہے اس لئے قبضے کی شرط کے ساتھ ہبہ درست ہو گیا۔^(۵)

واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۷/۹/۶ھ

(فتویٰ نمبر ۹۰۸/۲۸ ج)

(۱) حوالہ کے لئے دیکھئے ص: ۴۴۰ کا حاشیہ نمبر ۱۔

(۵۲۳) حوالہ کے لئے دیکھئے ص: ۴۴۰ کا حاشیہ نمبر ۲۔

(اس فتویٰ کی مزید وضاحت کے لئے سائل نے دوبارہ سوال بھیجا جو درج ذیل ہے)
”مکرر استفتاء“

ہبہ کئے گئے مکان کا کرایہ وغیرہ وصول کرنے کے معاملات
انجام دینا شرعاً اس پر ”قبضہ“ شمار ہوگا

سوال:- قبضہ موہوب لہ سے کیا مراد ہے؟ جبکہ خریداری زمین اور تمام سرکاری وغیرہ سرکاری اداروں میں موہوب لہ کا نام درج ہے، یہ اس لئے وضاحت طلب کی جا رہی ہے کہ اگر ہبہ شدہ عمارت میں ایک یا زیادہ کرایہ دار آباد ہوں تو قبضہ تو اُن کے پاس ہے، البتہ رسیدات وغیرہ دینے والا موہوب لہ ہے، اور وہی ٹیکس وغیرہ اپنے نام سے ادا کرتا ہے، لہذا قبضہ مالکانہ مراد ہے یا آباد ہونا شرط ہے؟
۲:- موہوب لہ (بکر) نے واہب زید کی زندگی میں ہی مالکانہ قبضہ حاصل کر لیا تھا، البتہ جس بلڈنگ میں کرایہ دار آباد ہیں وہ اُسی طرح سے آباد بطور کرایہ دار چلے آ رہے ہیں، تو کیا اس صورت میں موہوب لہ کا قبضہ شرعی درست مانا جائے گا؟

جواب:- قبضے کے لئے موہوبہ مکان میں بذات خود آباد ہونا ضروری نہیں، بلکہ صورتِ مسئلہ میں بہتر یہ ہے کہ واہب کرایہ داری کا معاملہ فسخ کر دے، اور موہوب لہ کرایہ داروں سے نیا کرایہ داری کا عقد کر لے اس طرح جب کرایہ داروں سے کرایہ وصول کرنے وغیرہ کے معاملات واہب کے بجائے موہوب لہ نے انجام دینے شروع کر دیئے تو قبضہ ہو گیا، اور ہبہ مکمل ہو گیا۔^(۱)

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۱۳۹۷/۹/۱۱ھ

(فتویٰ نمبر ۹۲۷/۲۸ ج)

بغیر قبضے کے دو بھائیوں کو مشترکہ طور پر جائیداد ہبہ کرنے کا حکم

سوال:- میرے تایا نے اپنی جائیداد اپنے دو بھائیوں یعنی میرے والد اور چچا کے نام کر دی ہے، میرے تایا کی کوئی اولاد، بیوی، بہن وغیرہ نہیں ہے، میرے والد کی مذکورہ جائیداد جو انہوں نے اپنے دو بھائیوں کے نام کی ہے، وہ جائیداد ابھی میرے تایا کے زیر استعمال ہی ہے، میرے تایا عمر کے

(۱) وفي الشامية كتاب الہبة ج: ۵ ص: ۶۸۸ یوخذ ویستأنس ذلک من العبارات الآتیة قلت فقد ان أفاد ان التلفظ بالایجاب والقبول لا یشرط بل تكفی القرائن الذالة علی التملیک كمن دفع لفقییر شیئاً وقبضه ولم یلفظ واحد منهما بشیء.... الخ.

وفي بدائع الصنائع كتاب الہبة ج: ۶ ص: ۱۲۴ والاذن نوعان صریح ودلالة.... واما الدلالة فہی أن یقبض الموهوب لہ العین فی المجلس ولا ینتہاہ الواہب فیجوز قبضه استحساناً.... الخ. وكذا فی شرح المجلة كتاب الہبة رقم المأذة: ۸۴۲ ص: ۳۵۳ (طبع مکتبہ حبیبیہ کوئٹہ). نیز دیکھئے: امداد الفتاویٰ ج: ۳ ص: ۴۶۶.

آخری حصے اور نہایت کمزوری اور ضعف میں ہیں، اس جائیداد کے بارے میں اب شرعی حکم کیا ہے؟ اور ان کی یہ جائیداد کس کی ہے؟ اور اس کا انتظام و دیکھ بھال کے بارے میں بھی آگاہ فرمائیں۔ ”جنگ“ اخبار میں آپ کے کالم نہایت ہی مفید اور پسند ہیں۔ کیا اسلام آباد اور راولپنڈی میں آپ کے والد صاحب کے کوئی خلیفہ ہیں؟

جواب :- برادر عزیز و مکرم!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کے تایا نے اگر اپنی ساری جائیداد اپنے دونوں بھائیوں کو دی ہے تو شرعاً یہ ہبہ اس لئے درست نہیں ہوا کہ دونوں بھائیوں کو الگ الگ کر کے دینا ضروری تھا، اور قبضہ بھی نہیں ہوا، لیکن چونکہ آپ کے تایا کی کوئی اولاد نہیں ہے، اور بیوی بھی نہیں ہے، اور بہن بھی نہیں ہے، تو آپ کے تایا کے شرعی وارث آپ کے والد اور چچا ہی ہیں، لیکن جب تک آپ کے تایا زندہ ہوں، اس وقت تک ان کی جائیداد کو انہی پر خرچ کرنا ضروری ہے، البتہ ان کی جائیداد کے انتظام کے معاوضے کے طور پر کچھ مناسب رقم دونوں بھائی لینا چاہیں تو اس کی گنجائش ہے۔

”جنگ“ کے کالم کی پسندیدگی کا شکریہ! دُعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ اسے مفید بنائے۔ راولپنڈی اسلام آباد میں حضرت والد صاحب کے کوئی خلیفہ تو نہیں ہیں، لیکن نواب قیصر صاحب اسلام آباد میں مقیم ہیں، جو حضرت مولانا فقیر محمد صاحب کے خلیفہ ہیں، ان کی ہفتہ وار مجلس بھی ہوتی ہے، مولانا عبداللہ صاحب جامعہ فریدیہ سے ان کا پتہ معلوم ہو سکتا ہے۔

والسلام
۲۸ شعبان ۱۴۱۴ھ (۳)

(۱) وفي الذر المختار ج: ۵ ص: ۲۸۸ (طبع سعید) وشرائط صحتها في الموهوب أن يكون مقبوضاً غير مشاع مميّزاً غير مشغول.... الخ. وفي هامش مجمع الأنهر ج: ۳ ص: ۴۹۰ (طبع غفاريه) وفي الموهوب أن يكون مقبوضاً غير مشاع مميّزاً غير مشغول وتتم بالقبض الكامل.... الخ.

وفي رد المحتار، كتاب الہبة ج: ۵ ص: ۲۹۲ (طبع سعید) وذكر قبله هبة المشاع فيما يقسم لا تفيد الملك عند أبي حنيفة وفي القهستاني لا تفيد الملك وهو المختار كما في المضمرة.

وفي خلاصة الفتاوى، كتاب الہبة، الفصل الثالث فيما يكون خطباً وفيما لا يكون.... الخ، ج: ۴ ص: ۳۹۰ (طبع مکتبه رشيديه) ومن شرائط الہبة الافراز حتى لا يجوز هبة المشاع فيما يحتمل القسمة كالبيت والدار والأرض ونحوها وان كان لا يحتمل القسمة يجوز كالبر والحمام والرحى.... الخ.

وفي البحر الرائق، كتاب الہبة ج: ۷ ص: ۲۸۶ (طبع رشيديه).... فأفاد أنه لو قبضه مشاعاً لا يملكه فلا ينفذ تصرفه فيه لأنها هبة فاسدة مآلاً وهي مضمونة بالقبض ولا تفيد الملك للموهوب له وهو المختار.

وكذا في مجمع الأنهر، كتاب الہبة ج: ۳ ص: ۴۹۴ (طبع غفاريه كوئٹہ) وشرح المجلة للاتاسي ج: ۳ ص: ۳۷۸ (طبع حقانيه پشاور).

(۲) حوالہ کے لئے دیکھئے ص: ۴۴۰ کا حاشیہ نمبر ۲۔

(۳) یہ جواب حضرت والا دامت برکاتہم نے سائل موصوف کے ایک خط کے جواب میں تحریر فرمایا۔ (محمد بیر حق نواز)

گھر کے استعمال کے لئے دی گئی رقم سے بچا کر زیور بنایا گیا ہو تو کس کی ملکیت ہے؟

سوال:- شوہر اگر اپنی بیوی کو گھر کا انتظام چلانے کے لئے روپے دیتا ہے اور بیوی ان پیسوں میں سے بچا کر زیور یا نقدی جمع کر لیتی ہے، بیوی کے انتقال کے بعد ایسا مال شوہر کا ہے یا نہیں؟ اس کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

جواب:- شوہر اپنی بیوی کو گھر کے انتظام کے لئے جو رقم دیتا ہے اگر وہ اس نیت کے ساتھ دی تھی کہ بیوی سے حساب نہیں لوں گا، بلکہ جو کچھ بچ جائے وہ بیوی کی ملکیت ہے، تب تو بچی ہوئی رقم سے خریدا ہوا زیور بیوی کی ملکیت تھا، اور اس کے انتقال کے بعد اس کے ترکے میں شامل ہو کر اس کے تمام شرعی ورثاء میں تقسیم ہوگا۔ اور اگر شوہر نے بیوی کو اس بات کا پابند کیا تھا کہ وہ حساب رکھے اور جو رقم بچے وہ واپس کرے تو پھر یہ زیور شوہر کی ملکیت تھا، اور اگر اس نے بیوی کو ہبہ نہیں کیا تو وہ اس کے انتقال کے بعد واپس لے سکتا ہے۔

واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۷/۳/۲۱ھ

(فتویٰ نمبر ۳۴۴/۲۸ ب)

محض کاغذی طور پر جائیداد کسی کے نام کرنے یا کسی کے نام سے خریدنے کی شرعی حیثیت

سوال:- ایک صاحب کا انتقال ہو گیا ہے، انہوں نے کچھ جائیداد اپنے لڑکوں کے نام سے لی تھی، جبکہ لڑکے چھوٹے تھے، اب لڑکے یہ کہتے ہیں کہ جب سے والد صاحب نے یہ چیزیں ہمارے نام خریدی تھیں اب ہم ان کے مالک ہیں، والد صاحب کی کوئی تحریر ان کے نام سے نہیں ہے، اب یہ جائیدادیں کس طرح تقسیم ہو سکتی ہیں؟

جواب:- محض کاغذی طور پر کوئی جائیداد کسی کے نام لکھ دینے یا کسی کے نام خریدنے سے تو ہبہ ثابت نہیں ہوتا، البتہ اگر یہ ثابت ہو جائے کہ والد مرحوم نے اپنی زندگی میں یہ جائیداد زبانی طور پر کسی خاص اولاد کو ہبہ کر دی تھی اور اس اولاد نے اس پر قبضہ بھی کر لیا تھا، تو اس جائیداد کو اسی مخصوص اولاد کی ملکیت سمجھا جائے گا، وہ والد مرحوم کے ترکے میں شامل نہیں ہوگی، تحریری ہبہ نامہ ہونا بھی

(۱ تا ۳) وفي الدر المختار، کتاب الہبة ج: ۵ ص: ۶۸۸ (طبع سعید) و شرط صحتها في الموهوب أن يكون مقبوضاً. وفيه أيضًا ج: ۵ ص: ۶۹۲ وتتم الہبة بالقبض الكامل. وفيه أيضًا ج: ۵ ص: ۶۸۸ وحكمها ثبوت الملك للموهوب له غير لازم. نیز دیکھئے ص: ۴۴۰ کا حاشیہ نمبر ۲۔

ضروری نہیں، زبانی ہبہ^(۱) کا ثبوت گواہوں سے ہو جائے تو وہ بھی کافی ہے، لیکن اگر زبانی ہبہ^(۲) کا بھی ثبوت نہ ہو تو پھر یہ جائیداد والد مرحوم کے ترکے میں شامل ہو کر تمام ورثاء میں حصہ رسی تقسیم ہوگی۔
واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم

۱۳۹۷/۹/۶ھ

(فتویٰ نمبر ۹۱۰/۲۸ ج)

خصوصی خدمت اور تیمارداری کی بناء پر دیگر ورثاء کی رضامندی سے

اپنا مکان صرف خدمت گزار بیٹے کو ہبہ کرنے کا حکم

سوال :- اب سے تقریباً چار سال قبل میں فالج میں مبتلا ہوا تھا، اس بے بسی اور بیماری کی حالت میں میرے ایک بیٹے حفیظ الرحمن خان نے سعادت مندی کا ثبوت دیا، پیشاب، پانچخانہ خود صاف کرتا تھا، (میری بیوی انتقال کر چکی تھی) اور اپنے روپے سے سینکڑوں روپے کا علاج کرایا، اس عمل سے خوش ہو کر میں نے اپنا رہائشی مکان جو میں نے دسمبر ۱۹۴۹ء میں پانچ ہزار روپے میں خریدا تھا، اُس کو انعام کے طور پر دے دیا، ایسا کرنے سے پہلے میں نے اپنی دیگر اولاد سے جو میری مزاج پُرسی کے لئے آیا کرتے تھے رائے لی تھی، انہوں نے رضامندی ظاہر کر دی، اور کہا کہ اس کا یہی لڑکا مستحق ہے، یہ فروری ۱۹۷۴ء میں ہوا، اور مزید یہ بھی کیا کہ روزانہ اخبار میں اعلان عام کر دیا کہ میں اپنا ذاتی مکان اپنے لڑکے حفیظ الرحمن خان کو انعام کے طور پر دے رہا ہوں، اگر کسی کو کوئی عذر ہو تو ۱۵ دن کے اندر عذر پیش کرے، ورنہ اس کے بعد کوئی عذر قابل قبول نہ ہوگا۔ کوئی اعتراض کسی کا وصول نہیں ہوا، لہذا قانون مروجہ کے مطابق اُس کی پختہ کارروائی کرائی اور مکان کا قبضہ بھی دے دیا، جس پر اوتھ کمشنر اور گواہوں وغیرہ کے دستخط گواہی ثبت ہو گئی۔ یہ فروری ۱۹۷۴ء میں مکمل ہو گیا، اور مکان کا لیز بھی اُسی کے نام اب ہو گیا ہے، میں اب بھی اُسی مکان میں رہتا ہوں اور اسی لڑکے کی زیر کفالت ہوں، ہر قسم کا ٹیکس وہی ادا کرتا ہے اور مکان کی بقدر ضرورت مرمت اُسی نے کرائی ہے۔

میرے چار لڑکے اور پانچ لڑکیاں ہیں، سب کی شادیاں ہو چکی ہیں سوائے ایک لڑکے کے، جس کی شادی بوجہ کمزوری دماغ اور بوجہ آمدنی نہ ہونے کے انکار کر دیا ہے، سب لڑکیوں کو رسم و رواج کے مطابق ہزاروں کا زیور و دیگر سامان اور کپڑے اپنے روپے سے کئے ہیں، میرے پاس اب سوائے

(۳۱) حوالہ کے لئے دیکھئے ص: ۴۴۰ کا حاشیہ نمبر ۱۔

(۲) فی الدر المختار، کتاب الدعوی ج: ۵ ص: ۵۵۳ (طبع سعید) وعدھا فی الأشباه سبعا بینة و اقرار و یمین و نکول عنہ و کذا ادعی دینا أو عینا علی وارث اذا علم القاضی کونہ میراثا أو اقر بہ المدعی أو برهن الخصم علیہ فیحلف علی العلم ولو ادعی ہما ای الدین والعین الوارث علی غیرہ یحلف المدعی علی البتات کموہوب و شراء درر الخ۔

کفن دفن کے اخراجات کے کچھ نہیں بچا، اب سوال یہ ہے کہ میرے انتقال کے وقت اس مکان پر کسی کا حق باقی رہتا ہے یا نہیں؟

جواب:- صورتِ مسئلہ میں جبکہ آپ نے دیگر ورثاء کی رضامندی بھی حاصل کر لی ہے تو آپ کے لئے اس مکان کا اپنے خدمت گزار بیٹے کو ہبہ کر دینا جائز بھی ہے،^(۱) اور جب بیٹے کو اس کا مالک و قابض بنادیا گیا تو یہ ہبہ شرعاً نافذ بھی ہو گیا۔^(۲) اب حفیظ الرحمن خان ہی اس مکان کا مالک ہے،^(۳) اور آپ کی وفات کے بعد آپ کے دوسرے ورثاء کا اس میں حق نہیں ہوگا، اور نہ یہ مکان آپ کے ترکے میں شامل ہو سکے گا، لما فی الدر المختار: ”لا بأس بتفضیل بعض الأولاد فی المحبة لأنها عمل القلب و کذا فی العطایا ان لم یقصد به الاضرار ولو وهب فی صحته کل المال للولد جاز وأثم. (قلت: یعنی اذا لم یرض به ورثته الآخرون). (شامی ج: ۴ ص: ۵۱۳ کتاب الہبہ).^(۴)

وفیه أيضاً: ”وہبة مقعد ومفلوج وأشل ومسلول من کل ماله ان طالت مدته“ وقال الشامی تحته: ”لأنه اذا تقادم العهد صار طبعاً من طباعه كالعمی والعرج، وهذا لأن المانع من التصرف مرض الموت وهو ما یكون سبباً للموت غالباً، وأنما یكون كذلك اذا کان بحیث یزداد حالاً فحالاً الى أن یكون آخره الموت، وأما اذا استحکم وصار بحیث لا یزداد ولا یخاف منه الموت لا یكون سبباً للموت كالعمی ونحوه. (شامی کتاب الوصایا ج: ۵ ص: ۴۲۳).^(۵)

واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۷/۷/۱۰ھ

(فتویٰ نمبر ۲۶/۷۲۸ ب)

(۱ و ۳) الدر المختار کتاب الہبہ ج: ۵ ص: ۶۹۶ (طبع سعید)، وفی شرح معانی الآثار للطحاوی کتاب الہبہ ج: ۲ ص: ۲۷۱ (طبع سعید) وقد فضل بعض أصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ورضی عنہم بعض أولادہم فی العطایا.... الخ. وراجع أيضاً أوجز المسالك کتاب الہبہ، باب مالا یجوز من النحل ص: ۲۲۰ (طبع مکتبہ مظاہر علوم) واعلاء السنن ج: ۱۶ ص: ۹۶ و ۹۷ (طبع ادارة القرآن کراچی)

وفی الہندیۃ کتاب الہبہ ج: ۴ ص: ۳۹۱ (طبع رشیدیہ) ولو وهب رجل شیئاً لأولاده فی الصّحة وأراد تفضیل البعض علی البعض عن أبی حنیفۃ أنه لا بأس به اذا کان التّفضیل لزیادۃ فضل له فی الدّین وعن أبی یوسف أنه لا بأس به اذا لم یقصد به الاضرار وان قصد به الاضرار سوى بینہم وان کان فی ولده فاسق لا ینبغی أن یعطیه أكثر من قوتہ کیلا یصیر معیناً له فی المعصیۃ.

وفی البزازیۃ علی هامش الہندیۃ الجنس الثالث فی ہبۃ الصّغیر ج: ۶ ص: ۲۳۷ ولو وهب جمیع ماله من ابنہ جاز وهو آثم نصّ علیہ محمّد ولو خصّ بعض اولاده لزیادۃ رشدہ لا بأس به.... الخ.

وفی فتاویٰ القاضی خان علی هامش الہندیۃ فصل فی ہبۃ الوالد لولده ج: ۳ ص: ۲۷۹ وروی المعلى عن أبی یوسف أنه لا بأس به اذا لم یقصد به الاضرار وان قصد به الاضرار سوى بینہم. وكذا فی البحر الرائق کتاب الہبہ ج: ۷ ص: ۲۸۸.

(۲ و ۳) وفی الدر المختار کتاب الہبہ ج: ۵ ص: ۶۹۲ وتتم الہبۃ بالقبض الکامل.

وفی بدائع الصنائع فصل وأما حکم الہبۃ... الخ ج: ۶ ص: ۱۲۷ (طبع سعید) وأما أصل الحکم فهو ثبوت الملك للموہوب له فی الموہوب من غیر عوض.... الخ. نیز دیکھئے ص: ۳۴۰ کا حاشیہ نمبر ۲۔

(۵) الدر المختار کتاب الوصایا ج: ۶ ص: ۶۶۰ (طبع سعید). (محمد زبیر حق نواز)

- ۱:- اولاد میں کسی کو زیادہ کسی کو کم دینے کا حکم اور مشترکہ کاروبار سے حاصل شدہ رقم سے کاروبار کے غیر شریک بیٹے کو محروم کرنے کا حکم
- ۲:- زندگی میں علیحدہ ہو جانے والے بیٹے کو بھی میراث سے حصہ ملے گا

سوال ۱:- ایک باپ جس کے تین بیٹے ہیں، وہ سب شادی شدہ ہیں، بڑا لڑکا سرکاری ملازم ہے، باقی دو لڑکے اور والد صاحب نے مل کر ایک دکان کی، سب اکٹھے ہیں، والد صاحب کی کوئی غیر منقولہ جائیداد نہیں ہے، صرف رقم کی صورت میں موجود ہے، اب والد صاحب نے ناراضگی کے بغیر بڑے لڑکے کو علیحدہ کر دیا، مگر علیحدگی کے وقت جمع شدہ رقم میں سے کچھ نہیں دیا، اور ساری رقم ان کے لئے مخصوص کر دی جو ان کے ساتھ کام کرتے ہیں، کیا یہ بات والد صاحب کے لئے جائز ہے کہ ایک بھائی کو بلاوجہ محروم کر دیں اور دو بھائیوں کو سب کچھ دے دیں؟

سوال ۲:- والد صاحب کے فوت ہونے کے بعد کیا صورت ہوگی جبکہ لڑکا بہت پہلے علیحدہ ہو چکا ہے، اور پھر اس کے بعد دونوں لڑکے اور والد اکٹھے کام کرتے رہے ہوں، کیا سب کو برابر تقسیم ہوگا یا دونوں بھائیوں کی ذاتی محنت شمار ہوگی؟

جواب:- صورت مسئلہ میں مناسب تو یہ تھا کہ باپ کاروبار کے اپنے حصے سے کچھ رقم تیسرے بیٹے کو بھی دیتا، لیکن باپ نے اگر اپنے بڑے لڑکے کو جمع شدہ رقم میں سے کچھ نہیں دیا تو اس میں اس پر کوئی گناہ نہیں، کیونکہ یہ رقم دوسرے لڑکوں کے ساتھ کئے ہوئے کاروبار سے حاصل شدہ تھی، اور زندگی میں اگر کسی اولاد کو کم، کسی کو زیادہ دیا جائے تو جب تک وہ بدینتی سے نقصان پہنچانے کا مقصد نہ ہو تو گنجائش ہے، وفي الخانیة: ”لا بأس بتفضیل بعض الأولاد فی المحبة لأنها عمل القلب، وكذا فی العطایا ان لم یقصد به الاضرار وان قصدہ یسوی بینہم۔“ (شامی ج: ۳ ص: ۵۱۳ کتاب الہیہ)۔^(۱)

جواب ۲:- والد صاحب کی وفات کے وقت جو رقم یا جائیداد ان کی ذاتی ملکیت ہوگی، وہ تمام ورثاء میں شرعی حصوں کے مطابق تقسیم ہوگی، اس میں بڑے لڑکے کو بھی حصہ ملے گا۔

واللہ سبحانہ اعلم

۱۳/۱۰/۱۳۹۷ھ

(فتویٰ نمبر ۱۰۶۳/۲۹ ج)

(۱) الذر المختار مع رد المحتار کتاب الہیہ ج: ۵ ص: ۶۹۶ (طبع سعید) نیز دیکھئے ص: ۴۴۷ کا حاشیہ نمبر ۴۔

مرض الوفات سے قبل ہبہ کی گئی رقم موہوب لہ کی ملکیت ہے

سوال :- (خلاصہ سوال) کمنا مرحوم نے اپنے مرتے وقت کوئی منقولہ یا غیر منقولہ جائیداد نہیں چھوڑی۔ نور محمد، کریم الدین دونوں بھائیوں نے بھی کل زندگی میں کوئی بھی جائیداد نہیں بنائی ہے، دونوں بھائی ہر وقت اور ہمیشہ لڑتے رہے، اور ایک دوسرے سے جدا رہے، کمائی بھی ہر ایک کی الگ ہے۔ اکتوبر ۱۹۶۷ء کو کریم الدین انتقال کر گیا، کریم الدین کی ایک لڑکی ہے، جس کو وہ بہت محبوب رکھتا تھا، زندگی بھر اس لڑکی کے ہاں رہا اور پوری زندگی میں یہی کہتا رہا کہ میرا تمام مال میری اس لڑکی کا ہے، مرحوم کے دو ہزار روپے نقد اس لڑکی کے پاس تھے، انتقال کے بعد کریم الدین کا بھائی لڑکی کے پاس آیا، تو لڑکی نے وہ دو ہزار روپے لا کر اس کو کہا کہ یہ روپے آپ لے لیں، اس پر نور محمد بھائی کریم نے کہا کہ: یہ تمہارا مال ہے، مجھے اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اور یہ بھی کہا کہ: اب تک تمہاری خدمت والد کر رہے تھے اور اب میں کروں گا۔ اس تمام ماجرا کے دس بارہ آدمی گھر کے شاہد ہیں۔

جواب :- صورت مسئلہ میں اگر کریم الدین نے اپنی زندگی میں واقعہ یہ دو ہزار روپے کا اپنی لڑکی کو ہبہ کر دیا تھا اور لڑکی نے اس پر قبضہ بھی کر لیا تھا، تو وہ شرعاً اس کی ملکیت ہو گیا، دوسرے وارثوں کا اس میں حق نہیں، بشرطیکہ یہ روپے کریم الدین نے مرض وفات سے پہلے ہبہ کئے ہوں۔^(۱)

واللہ اعلم بالصواب

۱۳۸۷/۱۲/۱۶ھ

(فتویٰ نمبر ۱۴۱۹/۱۸ الف)

مرحوم کے انتقال کے بعد ملنے والے ”ہبہ نامہ“ کی حیثیت

اور چند ورثاء میں تقسیم میراث کا طریقہ

سوال :- زید کی زندگی میں زید کی بیوی اور والدین کا انتقال ہو گیا تھا، زید نے دوسری شادی کی، اس سے کوئی اور اولاد نہیں ہوئی، کچھ عرصہ بعد زید کا انتقال ہو گیا، مرحوم نے ورثاء میں ایک

(۱) وفي الدر المختار كتاب الهبة ج: ۵ ص: ۲۸۸ و شرط صحتها في الموهوب أن يكون مقبوضاً.... الخ.

وفيه أيضاً ج: ۵ ص: ۲۹۲ وتتم الهبة بالقبض الكامل.... الخ.

وفيه أيضاً ج: ۵ ص: ۲۸۸ وحكمها ثبوت الملك للموهوب له غير لازم.

وفي بدائع الصنائع فصل وأما حكم الهبة... الخ ج: ۶ ص: ۱۲۷ (طبع سعيد) وأما أصل الحكم فهو ثبوت الملك للموهوب له في الموهوب من غير عوض. نیز دیکھئے ص: ۴۴۰ کا حاشیہ نمبر ۲۔

(۲) وفي رد المحتار ج: ۵ ص: ۷۰۰ وهب في مرضه ولم يسلم حتى مات بطلت الهبة. وفي شرح المجلة للأناسي وإذا وهب واحد في مرض موته شيئاً لأحد ورثته وبعد وفاته لم يجز سائر الورثة لا تصح تلك الهبة. وكذا في الهداية، كتاب الوصايا ج: ۴ ص: ۲۵۷. نیز دیکھئے ص: ۴۴۰ کا حاشیہ نمبر ۳۔

لا ولد بیوہ، پہلی بیوی سے ایک لڑکی شادی شدہ، ایک بھائی اور دو بہنیں چھوڑی ہیں، مرحوم کے انتقال کے بعد یہ ”ہبہ نامہ“ ملا جو کہ استفتاء ہذا کے ساتھ منسلک کیا جا رہا ہے، یہ ”ہبہ نامہ“ رجسٹری نہیں ہوا، جن گواہوں کے دستخط ہیں ان کا بیان ہے کہ ہمارے سامنے مرحوم نے کسی چیز کا بھی قبضہ نہیں دیا تھا اور جن کے نام ہبہ کیا تھا ان لوگوں نے بھی یہی بتایا ہے کہ اُن کو قبضہ نہیں دیا گیا تھا، ہبہ نامہ کے علاوہ بھی نقدی اور زیورات ہیں، مرحوم کی جائیداد کس طرح تقسیم کی جائے؟

جواب:- اگر مذکورہ جائیدادیں مرحوم نے اپنی بیٹی اور بیوی کو الگ الگ^(۱) کر کے قبضے میں نہیں دی تھیں، تو یہ ہبہ تام نہیں ہوا،^(۲) اور یہ تمام جائیدادیں بدستور مرحوم کی ملکیت میں رہنے کی بنا پر ان کے ترکے میں شامل اور دوسرے مال کی طرح تمام ورثاء میں شرعی حصوں کے مطابق تقسیم ہوں گی۔

لما فی الدر المختار: وتتم الہبۃ بالقبض الكامل. وفي رد المحتار تحته: فيشترط القبض قبل الموت ولو كانت فی مرض الموت للأجنبي كما سبق فی کتاب الوقف. (شامی ج: ۴ ص: ۵۱۰)۔^(۳)

اور صورتِ مسئلہ میں پہلے مرحوم کے ترکے سے ان کی تجہیز و تکفین کے درمیانہ درجے کے اخراجات نکالے جائیں، پھر اگر ان کے ذمے کوئی قرض ہو تو وہ ادا کیا جائے، اور بیوی کا مہر بھی اگر ابھی تک ادا نہ کیا ہو اور بیوی نے معاف بھی نہ کیا ہو تو وہ بھی قرض ہے، اسے ادا کیا جائے، اس کے بعد اگر مرحوم نے کوئی جائز وصیت کی ہو تو $\frac{1}{4}$ کی حد تک اس پر عمل کیا جائے، پھر جو مال بچے اس کا آٹھواں حصہ مرحوم کی بیوہ کو، اور آدھا حصہ لڑکی کو دیا جائے، اور اس کے بعد جو مال باقی بچے اُس کے چار حصے کر کے دو حصے بھائی کو اور ایک ایک حصہ دونوں بہنوں کو دے دیا جائے، سہولت کے لئے کل ترکے کے بتیس حصے کر لیں، جس میں سے بیوہ کو چار حصے، لڑکی کو سولہ حصے، بھائی کو چھ حصے اور ہر بہن کو تین تین حصے دے دیئے جائیں۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

ھ ۱۳۹۷/۹/۶

(فتویٰ نمبر ۹۱۲/۲۸ ج)

کسی شریک کا قابل تقسیم مشترکہ زمین کسی کو ہبہ کرنے کا حکم

سوال:- کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلے میں کہ مسمیان جمعہ و عبدالرحیم پسران عبدالرحمن دو حقیقی بھائی ہیں، مسٹی عبدالرحیم نے اپنی زمین جو ابھی تک تقسیم نہ ہوئی تھی، بلکہ مشترک تھی،

(۲) دیکھئے ص: ۴۴۰ کا حاشیہ نمبر ۲۔

(۱) دیکھئے ص: ۴۴۴ کا حاشیہ نمبر ۱۔

(۳) شامی کتاب الہبۃ ج: ۵ ص: ۶۹۰ (طبع سعید)۔

مستی محبوب ولد عبداللہ چچا زاد بھائی کو خفیہ ہبہ کر دیا، لیکن رقبہ موہوبہ کا قبضہ موہوب لہ کو نہیں دیا، ہبہ کے بعد واہب تین سال تک زندہ رہا لیکن اس عرصے میں واہب نے موہوب لہ کو قبضہ نہیں دیا، بلکہ زمین حقیقی بھائی جمعہ کے قبضے میں رہی۔ مذکور کے فوت ہونے کے بعد بھی مستی جمعہ نے محبوب موہوب لہ کو تقریباً تیرہ سال تک قبضہ نہیں دیا، اس سال موہوب لہ نے مستی جمعہ برادر عبدالرحیم واہب جو اکیلا واہب کا وراثت ہے، اس سے اس کے ضعیف العمر غریب اور بے کس ہونے کی وجہ سے جبراً قبضہ لے لیا، کیا یہ ہبہ شرعاً درست ہے یا نہیں؟ کیونکہ ہبہ ایسی مشترک زمین کا ہوا ہے جو قابل تقسیم ہے، لیکن ہوئی نہیں، اور واہب نے قبضہ بھی نہیں دیا۔ مفصل و مدلل جواب عنایت فرمادیں اس سال موہوب لہ نے مستی جمعہ سے اس کا ذاتی رقبہ بھی چھین لیا جبکہ ہبہ کا صرف ایک ہی گواہ زندہ ہے، بینوا بالصواب تو جروا بالثواب۔

جواب:- صورت مسئلہ میں ہبہ شرعاً درست نہیں ہوا،^(۱) زمین میں مستی عبدالرحیم مرحوم کا جو حصہ تھا، وہ مرتے وقت تک اس کی ملکیت میں رہا، اور مرنے کے بعد اس کے شرعی ورثاء کی ملکیت ہو گیا، موہوب لہ مستی محبوب نے عبدالرحیم کی وفات کے بعد زمین پر جو بردستی قبضہ کیا، وہ شرعاً بالکل ناجائز اور حرام ہے، اس پر شرعاً واجب ہے کہ یہ زمین عبدالرحیم کے ورثاء کو واپس کرے۔

واللہ سبحانہ اعلم

۱۴۱۲/۱/۸ھ

(فتویٰ نمبر ۵۶/۱۴۰)

اصل مالک کی طرف سے کوارٹر پر قبضہ دلائے بغیر محض الاٹمنٹ سے ملکیت نہیں آتی

سوال:- والد صاحب مرحوم نے بیرون ملک دو چلتی ہوئی کاروباری دکانیں چھوڑی ہیں، اس کاروبار کو والدہ صاحبہ کی سرپرستی حاصل ہے، کراچی میں دو دکانیں کرایہ کی چھوڑی ہیں، جو خالی پڑی ہیں، دو عدد کوارٹرز بھی چھوڑے ہیں جو گورنمنٹ سے الاٹ شدہ ہیں، ایک والدہ کے نام پر الاٹ ہوا ہے، دوسرا بھائی کے نام پر الاٹ ہوا ہے، ان مذکورہ بالا دونوں کوارٹروں میں ایک دوسرا بھائی (جس کے نام الاٹ نہیں ہے) مع اپنی بیوی بچوں کے رہ رہا ہے، ان رہائش پذیر کوارٹروں میں مقیم بھائی نے تعمیر پر کچھ رقم لگائی ہے، لہذا تر کے کا کیا حکم ہے؟ اور یہ دو کوارٹر جن کے نام پر الاٹ ہوئے ہیں وہ ان کے مالک ہیں یا والد مرحوم کی ملکیت تھے؟ شرعاً کیا حکم ہے؟

(۱) حوالہ کے لئے ص: ۴۴۳ کا حاشیہ نمبر ۱ اور ص: ۴۴۰ کا حاشیہ نمبر ۲ ملاحظہ فرمائیں۔

جواب:- مرحوم کی یہ تمام دکانیں اور دونوں کوارٹر مرحوم کے ترکے میں شامل ہوں گے، کوارٹروں کی قیمت مرحوم کے ذمے دین ہے، وہ ترکے میں سے پہلے نکال کر گورنمنٹ کو دی جائے گی، اور محض کوارٹروں کے کسی کے نام الاٹ ہونے سے وہ مالک نہیں ہوتا، بلکہ اصل مالک وہ ہے جس نے ان کوارٹروں کی خریداری کا معاملہ کیا، ہاں اگر مرحوم نے مذکورہ کوارٹروں پر قبضہ کرنے کے بعد اپنی تندرستی میں زبانی یا تحریری ہبہ کسی کے نام کر دیا ہو اور اُس نے اُس کوارٹر پر قبضہ بھی کر لیا ہو تو وہ مالک ہو جائے گا۔^(۱)

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۱۳۹۷/۹/۱۳ھ

(فتویٰ نمبر ۹۵۰/۲۸ ج)

۱:- بیوی کے نام سے خریدی گئی زمین اور اُس پر تعمیر کی جانے والی کوٹھی

بیوی کی ملکیت ہے

۲:- تحریری اسٹامپ کے ساتھ دی گئی رقم کا ہبہ درست ہے

۳:- کسی کے نام سے بینک میں رقم جمع کرائی یا جائیداد خریدنے

سے ہبہ درست ہو جاتا ہے

۴:- کسی کے نام سے جمع کرائی گئی رقم کی چیک بک پر قبضے سے

”ہبہ“ مکمل ہو گیا

۵:- بیوی اور لڑکیوں کی دستبرداری کے بعد کل جائیداد

بیٹوں کو ہبہ کرنے کا حکم

سوال ۱:- متوفی شوہر نے ایک قطعہ زمین اپنی بیوی کے نام سے کراچی میں خریدا، اس کے

بعد اس کو فروخت کر دیا، تو بیوی نے اعتراض کیا کہ آپ نے کیوں بیچ دیا؟ تو مرحوم شوہر نے فرمایا کہ:

”میں تمہارے لئے ایک پلاٹ حیدرآباد میں خرید دیتا ہوں“ اور مرحوم شوہر نے ایک پلاٹ زمین

”لطیف آباد“ (حیدرآباد) بیوی کے نام سے ہی خریدا اور بیوی کے نام ہی رجسٹری کرائی، اس کے بعد

مرحوم شوہر نے مذکورہ پلاٹ پر کوٹھی تعمیر کرائی، دورانِ تعمیر بیوی سے کہا کہ: ”میں نے تمہارے لئے کوٹھی

(۱) تفصیلی حوالہ جات کے لئے ص: ۴۴۰ کے تمام حواشی اور ص: ۴۴۴ کا حاشیہ نمبر ۱ اور ص: ۴۴۹ کا حاشیہ نمبر ۲ ملاحظہ فرمائیں۔

بنوادی ہے، تم عمر بھر اس میں رہنا، جب کوٹھی بالکل مکمل ہونے والی تھی تو شوہر کا انتقال ہو گیا، تو ایسی صورت میں کیا پلاٹ اور کوٹھی دونوں بیوی کی ملکیت ہوں گے یا صرف پلاٹ زمین؟ یا اگر دونوں بیوی کی ملکیت نہیں ہوئیں تو کیا دوسرے وارثوں میں تقسیم کر دی جائے۔ (نوٹ: ابھی اس کوٹھی میں کوئی نہیں گیا تھا)۔

سوال ۲:- بڑے لڑکے کو ۵۵ ہزار مرؤجہ قانون کے تحت گفٹ کیا، جس میں ایک اسٹامپ تحریر کرنا پڑتا ہے کہ میرا لڑکا میری بہت خدمت کرتا ہے اس کو میں خوش ہو کر اپنے سرمائے میں سے اتنی رقم دے رہا ہوں، اور یہ رقم متوفی نے مندرجہ بالا طریق پر دے دی تھی، کیا یہ ہبہ ہوگئی؟

سوال ۳:- چھوٹے لڑکے کو متوفی نے اس طرح رقم دی کہ اس کے نام سے بینک میں جمع کرادیئے، اور اس کے نام سے ایک تجارتی جائیداد خریدی تھی، یہ رقم اور جائیداد ہبہ ہوئی کہ نہیں؟ اگر ہبہ نہیں ہوئی تو شامل ترکہ کر کے تقسیم کر دیں؟

سوال ۴:- بیوی کے نام بھی انہوں نے یعنی مرحوم نے بیوی کے نام سے بینک میں رقم جمع کرادی تھی، یہ رقم ہبہ ہوئی کہ نہیں؟ اگر نہیں ہوئی تو شامل ترکہ کر کے تقسیم کر دیں؟

سوال ۵:- بہنوں نے اور والدہ نے زبانی یہ کہا کہ ہم اپنا حصہ اپنے دونوں بھائیوں اور والدہ اپنے دونوں لڑکوں کو ہبہ کرتی ہیں، تو کیا وہ ترکہ جو کہ اُن کو ملنے والا تھا، ہبہ ہو گیا؟ حساب کر کے لڑکیوں اور بیوی کو بتلادیا گیا تھا کہ تمہارا اتنا حصہ نکل رہا ہے، اگر ہبہ نہیں ہوا تو براہ مہربانی ہبہ کا صحیح طریقہ تحریر کریں۔

جواب ۱:- صورتِ مسئلہ میں زمین اور جس قدر کوٹھی متوفی کی وفات سے قبل تعمیر ہوئی تھی، بیوی کی ملکیت ہوگئی، بشرطیکہ زمین کا ہبہ مرضِ وفات سے پہلے ہوا ہو،^(۱) فقہی اصطلاح میں اس مسئلے کی صورت یہ ہے کہ شوہر نے زمین بیوی کو ہبہ کی تھی، اس پر بیوی کی اجازت سے کوٹھی کی تعمیر بیوی کی طرف سے قبضہ ہے، جس سے ہبہ تام ہو گیا، اور زمین بیوی کی ملکیت ہوگئی۔^(۲) اب بیوی کی طرف سے تعمیر کے تصرف کی اجازت اس شرط پر ہے کہ کوٹھی اس کی ہو، لہذا تعمیر کے لئے جتنا سامان خریدا گیا وہ بیوی کو نقد ہبہ کیا گیا اور اس کا زمین پر تعمیر میں لگنا بیوی کی طرف سے قبضہ ہوا، لہذا جس قدر کوٹھی تعمیر ہوئی اس پر قبضہ مکمل ہو کر بیوی کی ملکیت ہو گیا۔ اب قبضے کے لئے کوٹھی میں جا کر رہنا ضروری نہیں، شرط یہی ہے کہ کوٹھی بھی مرضِ وفات سے پہلے بنائی گئی ہو۔^(۳) واللہ اعلم

جواب ۲:- صورتِ مسئلہ میں ہبہ منعقد ہو گیا، بشرطیکہ ہبہ مرضِ وفات میں نہ ہوا ہو۔^(۵)

جواب ۳:- اگر چھوٹے لڑکے نے جائیداد پر اور بینک کی چیک بک پر قبضہ کر لیا ہو تو ہبہ صحیح ہو گیا، بشرطیکہ مرض وفات میں نہ ہو۔^(۷)

جواب ۴:- اگر بیوی نے چیک بک پر قبضہ کر لیا ہو، تو ہبہ منعقد ہو گیا، بشرط مذکور۔

جواب ۵:- اس ہبہ کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ جو وارث اپنا حصہ چھوڑنا چاہتے ہیں، وہ ترکے میں سے کوئی چیز مثلاً کپڑے لے کر اپنا باقی حصہ دوسرے ورثاء کے لئے چھوڑ دیں، جسے تخارج کہتے ہیں۔^(۸)

نوٹ:- اولاد کو ہبہ کرنے کے لئے ضروری ہے کہ سب کا حصہ برابر ہو، خواہ مذکر ہوں یا مؤنث، لہذا بعض کو دینا اور بعض کو نہ دینا جس سے انہیں ضرر پہنچے، شرعاً ناجائز ہے،^(۹) لیکن اگر ایسا کر کے ہبہ کرنے والا فوت ہو چکا ہے تو ہبہ نافذ ہو گیا، بشرطیکہ ہبہ مرض الوفات میں نہ ہوا ہو۔ واللہ سبحانہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

الجواب صحیح

۱۳۸۷/۱۲/۵ھ

(فتویٰ نمبر ۱۸/۴۱۷ الف)

محمد عاشق الہی عفی عنہ

سوتیلے بیٹے کی طرف سے والد کو قرض یا ہبہ کے طور پر بھیجی گئی رقم کا حکم

سوال:- ایک شخص نے پہلی شادی کی تھی، اس سے تین لڑکیاں ہیں، اور بیوی فوت ہو گئی، اُس کے بعد دوسری شادی کی جس سے ایک لڑکی ہوئی اور بیوی فوت ہو گئی، تیسری شادی ایک بچے کی ماں سے کی، یعنی اُس عورت کا شوہر سے ایک لڑکا تھا، وہ ساتھ لے کر آئی تھی، بعد میں وہ بچہ چلا گیا۔ اس لڑکے نے پندرہ بیس سال بعد رقم بھیجی تھی اور تحریر کیا تھا کہ مکان خریدو اور خرچ کرو اور اچھی زندگی بسر کرو، حج کو جاؤ، اپنی خواہش کے مطابق استعمال کرو۔ اب اس رقم سے سونا خرید لیا گیا، اس میں منافع ہوا، اور ایک رہائش کے لئے مکان خریدا گیا، اُس میں بھی منافع ملتا ہے، مکان میں مرحوم نے اپنی رقم بھی لگائی تھی، تیسری بیوی سے کوئی اولاد نہیں ہوئی، اور وہ فوت ہو گئی، بیوی کے مرنے کے بعد شوہر بھی فوت ہو گیا، اب سوال یہ ہے کہ سوتیلے لڑکے نے جو رقم بھیجی تھی اُس کا کیا کیا جائے؟

(۱۰ و ۵) حوالے کے لئے دیکھئے ص: ۴۴۰ کا حاشیہ نمبر ۳ اور ص: ۴۴۹ کا حاشیہ نمبر ۲۔

(۶ و ۳ و ۲) دیکھئے حوالہ ص: ۴۴۰ کا حاشیہ نمبر ۲۔

(۸) حوالہ کے لئے دیکھئے السراجی فی المیراث ص: ۶۲ (طبع مکتبہ سید احمد شہید لاہور)۔

(۹) دیکھئے حوالہ سابقہ ص: ۴۴۷ کا حاشیہ نمبر ۴۔

(۱۰) وفی الہندیہ کتاب الہبہ الباب السادس ج: ۴ ص: ۳۹۱ (طبع رشیدیہ) رجل وھب فی صحۃ کل المال للولد جاز فی القضاء ویكون آثماً فیما صنع.... الخ. نیز دیکھئے حوالہ سابقہ۔

سوتیلے لڑکے نے جو رقم بھیجی تھی اُس کی کوئی تحریر بھی نہیں ہے کہ یہ رقم امانت ہے۔ دونوں شخصوں کے مرنے کے بعد لڑکا تحریر کرتا ہے کہ امانت ہے، اب تقسیم کے وقت دو بیویوں کی چار لڑکیاں ہیں اور ایک یہی سوتیلہ لڑکا ہے، لہذا جو رقم آئی تھی اُس کا کیا جائے؟ اور مکان میں جو نفع ہوتا ہے اُس کا کیا کیا جائے؟ اور سونے میں جو منافع ہوتا ہے اُس کا کیا کیا جائے؟ اب لڑکیاں کہتی ہیں کہ یہ سب ہمارا ہے اور لڑکا کہتا ہے کہ یہ سب میرا ہے۔

تنقیح

نمبر ۵ کے ضمن میں لکھا ہے کہ: ”لڑکے نے پندرہ بیس سال بعد رقم بھیجی تھی اور تحریر کیا تھا کہ مکان خریدو اور خرچ کرو“ اس بات کی وضاحت کریں کہ یہ رقم کس کو بھیجی تھی؟ اپنی ماں کو یا سوتیلے باپ کو؟ اور بھیجنے کا کیا مطلب ہے؟ جس کو بھیجی تھی اس کو اس کا مالک و قابض بنادیا تھا یا محض مکان خریدنے کے لئے بھیجی تھی اور مالک خود ہے؟

نمبر ۶ میں یہ رقم جس سے سونا خریدا گیا کس کو بھیجی تھی؟ اور مالک و قابض بنایا تھا یا نہیں؟
نمبر ۸ مرحومہ کے انتقال کے وقت اس کے والدین زندہ تھے یا نہیں؟ اور ان کے علاوہ کون کون سے رشتہ دار زندہ تھے؟ اور کیا اس کی میراث تقسیم ہو چکی ہے یا نہیں؟

جوابِ تنقیح

نمبر ۵ رقم تو باپ کے نام آئی تھی، مگر ماں باپ دونوں کے خرچے کی تھی، اور لکھا تھا کہ آپ مکان خرید کر اُس میں آرام سے دونوں آباد ہو جائیں، اس کی ملکیت سے لڑکے کا کوئی تعلق نہیں تھا۔
نمبر ۶ سونا خریدنے کی علیحدہ رقم کوئی نہ تھی، مکان خریدنے کے لئے جو رقم تھی وہ ہی پڑی تھی، اُس سے سونا خرید لیا تا کہ منافع ہو کر رقم بڑھ جائے اور اچھا مکان لے لیں۔

نمبر ۸ والدین مرحومہ کی زندگی میں وفات پا گئے تھے، مرحومہ نے لا ولد وفات پائی، البتہ پہلے خاوند سے وہ لڑکا موجود ہے جو برما میں آباد ہے، اور جس نے اپنی حقیقی ماں اور سوتیلے باپ کے آرام کی خاطر رقم بھجوائی تھی، مگر اس سے مکان خریدا نہیں گیا، جبکہ وہ خرید مکان کی غرض سے تھی، مگر اس سے سونا خرید کر نفع کمایا جو بڑی رقم میں تبدیل ہو گئی۔ اب لڑکے کو جب سگی ماں اور سوتیلے باپ کی وفات کی خبر ملی اور پتہ چلا کہ میں نے جو رقم خرید مکان کے لئے بھجوائی تھی اُس کو سونا خرید کر منافع حاصل کیا ہے تو وہ اپنی رقم کا دیگر وارثان سے یہ کہہ کر مطالبہ کرتا ہے کہ یہ تو میں نے امانت کے طور پر جمع رکھنے کے لئے بھجوائی تھی، اب جھگڑا صرف یہ ہے کہ یہ رقم اُسے واپس کی جائے یا ترکے میں تقسیم کی جائے جس میں یہ بھی بقدر حصہ خود حق دار ہوگا۔

اس لڑکے کی حقیقی ماں پہلے فوت ہوئی اور سوتیلے باپ بعد میں فوت ہوا ہے، نیز واضح ہو کہ اب یہ رقم جس سے سونا خرید کر نفع کمایا تھا، ایک مکان کی خریداری میں لگ گئی ہے، جس میں سوتیلے باپ نے بھی کچھ رقم اپنی ڈال کر مکان خرید لیا تھا، جسے اپنی بیوی کے نام خریدا تھا وہ اس لڑکے کی حقیقی ماں ہے، اسی میں اُن کی سکونت تھی، اس لڑکے نے رقم بھجواتے وقت امانت کا لفظ نہیں لکھا تھا، اب امانت بتاتا ہے۔

تفصیل وارشان:- مرحومہ کی وفات کے وقت دوسرا خاوند زندہ تھا، ایک پہلے خاوند کا لڑکا تھا (جس کی رقم کا جھگڑا ہے)، اور دوسرے خاوند کی پہلی اور دوسری بیویوں کی چار لڑکیاں تھیں، بعد میں خاوند کا انتقال جب ہوا تو اُس کی پہلی دو بیویوں سے چار لڑکیاں خاوند کے صلب سے موجود تھیں، اور تیسری بیوی کا پہلے خاوند سے ایک لڑکا تھا جو برما میں تھا۔ اس لئے ترکے میں ایک مکان جو تیسری بیوی کے نام سے خریدا تھا چھوڑا اور کچھ نقد رقم چھوڑی ہے، سوال جواب طلب یہ ہے کہ اس کے ترکے کی تقسیم کیسے ہوگی؟ بیوی کے نام خریدا ہوا مکان مرحومہ بیوی کا لڑکا مانگتا ہے جسے مرحومہ کی لڑکیاں دینے پر رضا مند نہیں ہیں، وہ کہتی ہیں کہ یہ تو ہمارے باپ کا ہے، جبکہ وہ بیوی کے نام سے خریدا تھا اور اس میں بڑی رقم بیوی کے لڑکے کی ہے، تھوڑی رقم مرحومہ کی لگی ہے۔

جواب:- صورت مسئلہ میں اگر رقم بھیجنے والا لڑکا قسم کھا کر یہ کہے کہ میں نے جو رقم بھیجی تھی وہ قرض کے طور پر بھیجی تھی، ہبہ کے طور پر نہیں، تو اس کا قول معتبر ہوگا، اور یہ رقم اس لڑکے کو واپس کی جائے گی، مرحومہ یا مرحومہ کے ترکے میں شامل نہیں ہوگی، لما فی رد المحتار: "ولو دفع دراهم وقال: أنفقها عليك، يكون قرضاً" (ج: ۴ ص: ۵۰۹)۔^(۱) وفيه أيضاً: "دفع دراهم الى رجل وقال: أنفقها، ففعل فهو قرض....." (وفيه أيضاً): رجل اشترى حلياً ودفعه الى امرأته واستعملته ثم ماتت ثم اختلف الزوج وورثتها أنها هبة أو عارية فالقول قول الزوج مع اليمين أنه دفع ذلك اليها عارية لأنه منكر للهبة" (ج: ۴ ص: ۵۲۲)۔^(۲)

البتہ یہ حکم صرف اتنی رقم کا ہے جو لڑکے نے بھیجی تھی، اس رقم کو تجارت میں لگا کر جو نفع حاصل ہوا وہ لڑکے کا نہیں ہے، بلکہ جس کو اس نے قرض دیا تھا اُس کا ہے، اس سے معلوم کیا جائے کہ

(۱) رد المحتار، کتاب الہبہ ج: ۵ ص: ۶۸۹ (طبع سعید) وفي الهنديّة ج: ۴ ص: ۳۷۵ (طبع رشیدیہ) رجل عنده دراهم لغيره فقال له صاحب الدراهم: اصرفها في حوائجك، كان قرضاً.... الخ.

(۲) رد المحتار ج: ۵ ص: ۷۰۱ (طبع سعید).

(۳) کیونکہ قرض لینے کے بعد مستقر قرض کا مالک ہو جاتا ہے، اور قرض کی رقم اور اُس کا نفع اُسی کی ملکیت ہوتا ہے، حوالہ کے لئے دیکھئے ص: ۲۰۱ کا حاشیہ نمبر ۱۔

اس نے یہ قرض اپنی حقیقی ماں کو دیا تھا یا سوتیلے باپ کو؟ یا دونوں کو نصف نصف؟ پہلی صورت میں یہ نفع ماں کے تر کے میں شامل ہوگا، دوسری صورت میں باپ کے تر کے میں، اور تیسری صورت میں نصف ماں کے تر کے میں اور نصف باپ کے تر کے میں شامل ہوگا، اسی طرح مکان میں جو رقم باپ نے خود لگائی تھی وہ بھی اس کے تر کے میں شامل ہوگی۔

جب یہ سمجھ میں آگیا تو اب ماں کے انتقال کے وقت اگر اس کا کوئی اور رشتہ دار زندہ نہ تھا، تو اس کی کل متروکہ جائیداد و ساز و سامان میں سے پہلے اس کی تجہیز و تکفین کے اخراجات نکالے جائیں، پھر اگر اس کے ذمے کوئی قرضہ ہو تو اسے ادا کیا جائے، پھر کوئی جائز وصیت کی ہو تو اسے $\frac{1}{4}$ کی حد تک نافذ کیا جائے، اس کے بعد اس کے کل تر کے کو چار مساوی حصوں پر تقسیم کر لیں، ان میں سے ایک حصہ مرحومہ کے شوہر کا ہے، اور باقی تین حصے اس کے حقیقی لڑکے کے ہیں جو برما میں مقیم ہے، اور اس کی سوتیلی بیٹیاں اس کی وارث نہیں ہیں۔

اور باپ کے انتقال کے وقت اگر اس کا کوئی اور رشتہ دار زندہ نہیں تھا تو تجہیز و تکفین، قرضوں کی ادائیگی، اور وصیت کے نفاذ کے بعد جتنا بھی مال ہو (اور اس میں اپنی مرحومہ بیوی کے تر کے سے ملنے والا $\frac{1}{4}$ حصہ بھی شامل ہے) اسے مرحوم کی تمام لڑکیوں میں برابر تقسیم کر دیا جائے، مرحوم کا سوتیلا بیٹا جو برما میں ہے، مرحوم کا شرعی وارث نہیں ہے۔ یہ تفصیل اس وقت ہے جب مرحوم کا کوئی بھی رشتہ دار بیٹیوں کے سوا زندہ نہ ہو، اور اگر کوئی دوسرا رشتہ دار مثلاً چچا، بھتیجا، ماموں، بھانجا، پھوپھی وغیرہ موجود ہو تو یہ مسئلہ دوبارہ معلوم کر لیں۔

واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم

۱۳۹۷/۹/۹ھ

(فتویٰ نمبر ۹۲۰/۲۸ ج)

۱:- ورثاء کے امیر یا غریب ہونے کی صورت میں کل جائیداد

کسی کو ہبہ یا وقف کرنا

۲:- متبنیٰ (لے پالک) شرعاً وارث نہیں ہے

سوال:- میں لا ولد ہوں اور میری کوئی اولاد نہیں ہے، میری زوجہ کا انتقال ۱۹۶۵ء میں میری

زندگی میں ہو گیا، میرے کوئی بھائی یا بہن نہیں ہے اور نہ کبھی تھا، ایک مختصر شجرہ قلم بند کرتا ہوں:-

فالتفصیل انما هو فی الکبار اما الصغار فترک المال لهم أفضل ولو كانوا أغنیاء. (شامی ج: ۵ ص: ۳۷۳)۔^(۱)

اور جن صاحب کو آپ نے متبنیٰ بنایا وہ آپ کے وارث نہیں، البتہ آپ زندگی میں اُن کو اُن کی خدمت کی مکافات میں جو رقم یا جائیداد مناسب سمجھیں دے سکتے ہیں، اور ایک تہائی مال کی حد تک ان کے حق میں وصیت بھی کر سکتے ہیں۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۱۳۹۸/۵/۲۲ھ

(فتویٰ نمبر ۵۲۳/۲۹ ب)

قبضے کے ساتھ جائیداد کسی کو دینے سے ہبہ درست ہو گیا

اگرچہ کاغذات میں واہب کا نام ہو

سوال:- شیر محمد کے تین لڑکے اور دو لڑکیاں ہیں، شیر محمد نے اپنی مملوکہ و مقبوضہ زمین و مکانات اپنے تینوں بیٹوں میں تقسیم کر دیئے اپنی وفات سے تقریباً بارہ سال قبل، تقسیم کر کے اُن کو مالک و قابض بنادیا، سرکاری کاغذات میں زمین والد ہی کے نام تھی صرف موقع پر تقسیم کر کے قبضہ دے کر مالک بنادیا تھا، اس جائیداد میں بہنیں حصہ لے سکتی ہیں یا نہیں؟

جواب:- اگر یہ صحیح ہے کہ شیر محمد مرحوم نے اپنی زندگی میں بحالت تندرستی اپنی جائیداد اپنے بیٹوں میں تقسیم کر کے ان کو مالک و قابض بنادیا تھا تو یہ ہبہ صحیح ہو گیا،^(۲) مذکورہ بیٹے اس جائیداد کے مالک ہو گئے،^(۳) اور شیر محمد کی وفات کے بعد اس کے دیگر ورثاء کا اس جائیداد سے کوئی تعلق نہیں، محض کاغذی طور پر جائیداد کے شیر محمد کے نام ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۱۳۹۷/۹/۷ھ

(فتویٰ نمبر ۹۱۹/۲۸ ج)

محرم کو ہبہ کرنے کے بعد رُجوع نہیں ہو سکتا

سوال:- والد نے اپنی زندگی میں اپنی املاک بطور ہبہ اپنی اولاد لڑکے اور لڑکیوں میں تقسیم کر دی، اب یہ اولاد اس ملکیت پر فرداً فرداً قابض و متصرف ہیں، اس اولاد میں اسی ملکیت کے انتظامیہ کاروبار میں کچھ بالاشتراك کاروبار بھی ہیں، ان اشتراکی معاملات میں بعض صرف اپنے ذاتی مفاد کا خیال رکھتے ہیں، خواہ دُوسروں کا اس میں نقصان ہی ہو، ان معاملات میں ان کے والد نے بطور تحفظ حقوق

(۱) رد المحتار علی الدر المختار، کتاب الوصایا ج: ۶ ص: ۶۵۱، ۶۵۲۔

(۲) دیکھئے ص: ۳۴۰ کا حاشیہ نمبر ۳۰۲۔

مساوات تجویزیں پیش کیں کچھ نے قبول کیں، کچھ نے انکار کر دیا، یہاں تک کہ اولاد کے خلاف عملی کوشش بھی کی گئی، ایسی حالت میں والد صاحب کو اپنی موہوب ملکیت واپس لینے کا اختیار ہے یا نہیں؟

جواب:- جب والد نے اپنی املاک اپنی اولاد کو ہبہ کر دی اور انہوں نے اُس پر قبضہ بھی کر لیا تو ہبہ تام ہو گیا، اب باپ کو شئی موہوب کے واپس لینے کا اختیار نہیں، فلو وہب لذی رحم محرم منه لا یرجع، کذا فی التنویر مع الشامی ج: ۴ ص: ۵۱۸۔^(۱)

واللہ سبحانہ اعلم^(۲)

۱۳۹۷/۶/۱۲ھ

(فتویٰ نمبر ۵۸۱/۲۸ ب)

ہبہ سے رجوع درست نہیں

سوال:- میں یعنی حقیقی والد نے اپنا ایک ہی مکان اپنے پسر کے نام ہبہ کیا ہو، اور اپنی بزنس اور دکان بلا معاوضہ پسر مذکور کے نام کر دیا ہو تحریری، اور عرصہ آٹھ سال سے اُس کی انکم سے محروم رہا ہوں، میری سکنڈ وائف سے چار بچے ہیں، ان حالات کے پیش نظر اپنی منقولہ وغیر منقولہ جائیداد واپس لینا چاہتا ہوں، کیا شرعاً اُس کا واپس لینا میرے لئے جائز ہے؟

جواب:- جب آپ نے اپنا مکان، دکان اور کاروبار باقاعدہ اپنے بیٹے کو ہبہ کر دیا، اور بیٹے نے اس پر قبضہ بھی کر لیا ہے تو اب آپ کو واپس لینے کا اختیار نہیں رہا، فلو وہب لذی رحم محرم منه نسباً ولو ذمياً أو مستأمناً لا یرجع۔ (شامی ج: ۴ ص: ۵۱۸)۔^(۳) البتہ آپ کے بیٹے کا اخلاقی فرض ہے کہ وہ آپ کی ضروریات کا خیال رکھے، اور آپ سے صلہ رحمی کرے۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۱۳۹۷/۳/۱۸ھ

(فتویٰ نمبر ۳۳۲/۲۸ ب)

(۱) حوالہ کے لئے دیکھئے ص: ۴۴۰ کا حاشیہ نمبر ۲۔

(۲) الذر المختار مع رد المحتار، کتاب الہبہ، باب الرجوع فی الہبہ ج: ۵ ص: ۷۰۴ (طبع سعید)۔
وفی صحیح البخاری، کتاب الہبہ، باب الہبہ للمشرکین ج: ۱ ص: ۱۵۷ (طبع قدیمی) عن ابن عباس رضی اللہ عنہما قال: قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: لیس لنا مثل السوء الذی یعود فی ہبتہ کالکلب یرجع فی قینہ۔
وفی الہدایۃ، کتاب الہبہ، باب ما یصح رجوعہ وما لا یصح ج: ۳ ص: ۲۹۲ (طبع مکتبہ رحمانیہ، وفی طبع مکتبہ شرکت علمیہ ج: ۳ ص: ۲۹۰) وان وہب ہبہ لذی رحم محرم منه لم یرجع فیہا لقولہ علیہ السلام: "اذا كانت الہبہ لذی رحم محرم لم یرجع فیہا" (رواہ البیہقی) وکذا فی مجمع الأنہر، باب الرجوع ج: ۳ ص: ۵۰۳ (طبع غفراریہ کوئٹہ)۔
وفی الہندیۃ ج: ۴ ص: ۳۸۶ (طبع رشیدیہ) والبحر الرائق، کتاب الہبہ ج: ۷ ص: ۲۹۳ (طبع سعید) والبدائع ج: ۶ ص: ۱۳۲ (طبع سعید) وفی شرح المجلۃ لسلم رستم باز رقم المادۃ: ۸۶۶ کتاب الہبہ، باب ثالث ج: ۱ ص: ۴۷۶ (طبع حنفیہ کوئٹہ) من وہب لاصولہ وفروعہ أو لأخیہ أو اختہ أو لأولادہما أو لعمہ أو لعمتہ أو لخالہ أو لخالۃ شیناً فلیس لہ الرجوع۔

(۳) الذر المختار مع رد المحتار، کتاب الہبہ ج: ۵ ص: ۷۰۴ (طبع سعید)۔

نیز دیکھئے سابقہ حاشیہ۔

شرم و مروّت میں کئی دن تک کھانا کھلایا پھر اس کے بدلے رقم طلب کی تو کیا حکم ہے؟

سوال:- زید نے بکر کو کچھ رقم قرض کے طور پر دی، زید کے پاس بکر کے بچے بھی زیرِ تعلیم تھے، بکر زید کو کھانا دیتا رہا، کچھ عرصہ بعد بکر نہایت مفلس بن گیا اور ساتھ ہی ساتھ بیمار بھی ہو گیا، بکر پر ایسے حالات آئے کہ محلے کے ہر جاننے والے شخص سے قرض لیا حتیٰ کہ سود پر بھی قرض لیا، اسی دوران بکر نے زید کو بار بار کہا کہ وہ اپنا انتظام کر لے کیونکہ وہ کھانا دینے کی پوزیشن میں نہیں رہا، مگر زید آنکھیں بند کر کے بکر کے گھر کھانا کھاتا رہا، اگر کسی دن کھانا نہیں پہنچتا تھا تو بکر کے گھر جا کر مطالبہ کرتا تھا۔

بکر کا کہنا ہے کہ میرے بار بار کہنے کے باوجود جب زید میرے گھر کھانا کھاتا تھا تو میں صرف اہل محلہ اور اقارب میں شرمندگی کی وجہ سے گھر سے کھانا بھیجتا رہا، کچھ دنوں کے بعد زید نے اپنے قرض کا مطالبہ کیا، مطالبے پر بکر نے کچھ رقم دے دی اور کچھ رقم بعد میں دینے کا وعدہ کیا، مگر زید نے پوری رقم یا آدھی رقم کا دوبارہ مطالبہ کیا، اور بات شرمندہ کرنے تک پہنچ گئی، اس پر بکر نے یہ کہا کہ جب سے میں نے تمہیں کھانا کھانے کا اپنا انتظام کرنے کا نوٹس دیا تھا اس کے بعد کے دنوں کے کھانے کی رقم میرے حوالہ کر دو، کیونکہ اس میں مجھے نہ تو ثواب کی نیت تھی اور نہ میں نے اپنی خوشی سے کھلایا، صرف عزّت بچانے کی خاطر دیتا رہا۔

کیا بکر کا یہ مطالبہ شرعاً درست ہے کہ نوٹس کے بعد کے دنوں کے کھانے کی رقم دو؟

جواب:- صورتِ مسئلہ میں اگر بکر زید کے گھر اس لئے کھانا کھاتا تھا کہ زید اس کا متروک تھا، اور قرض کی وجہ سے زید اسے کھانا کھلاتا تھا تب تو یہ کھانا سود کے حکم میں ہو کر حرام ہوا،^(۱) اور اس کی قیمت قرض سے منہا کرنی ضروری ہے، لیکن اگر کھانا قرض کی وجہ سے نہیں، بلکہ پہلے سے باہمی تعلق کی بنا پر کھلاتا تھا تو جب بکر نے زید کو اپنے گھر کھانے سے منع کر دیا تھا تو زید کے لئے جائز نہیں تھا کہ اُس کے گھر کھانا کھاتا، لقولہ علیہ السلام: ”لا یحلّ مال امرئ مسلم الاّ بطیب نفس منہ“^(۲) اور بکر کی مرضی کے خلاف اس کے گھر کھانا کھا کر زید نے گناہ کا ارتکاب کیا، اس گناہ کی تلافی کے لئے دیانۃً زید پر واجب ہے کہ جتنے دن بکر کی مرضی کے خلاف اُس کا کھانا کھایا ہے اتنے دن کے کھانے کی قیمت اس کو ادا کرے، لیکن چونکہ بکر نے اس کو کھانا اپنے اختیار سے دیا ہے، خواہ لوگوں کی شرم کی بناء پر دیا ہو، اور اس پر کوئی اکراہ نہیں تھا اور اس نے کھانا دیتے وقت زید کو یہ بھی نہیں کہا کہ میں

(۱) حوالہ کے لئے دیکھئے ص: ۲۸۴ کا حاشیہ نمبر ۴۔

(۲) مشکوٰۃ المصابیح، باب الغصب والعاریۃ ص: ۲۵۵ (طبع قدیمی کتب خانہ)۔

اس کی قیمت لوں گا، اس لئے اس کی طرف سے یہ ہبہ ہو گیا۔^(۱) اور اب اس کے لئے اس کی قیمت کا مطالبہ کرنا درست نہیں، بالخصوص زید سے لئے ہوئے قرضے کو اس بناء پر روک لینا اس کے لئے جائز نہیں، بکر کو چاہئے کہ زید کی قرضے کی رقم واپس کر دے اور زید پر دینا لازم ہے کہ وہ کھانے کی قیمت بکر کو ادا کرے۔

واللہ سبحانہ اعلم

۱۴۰۱/۱۰/۲۹ھ

(فتویٰ نمبر ۱۶۳۸/۳۲ ج)

ایک بیوی کے نام سے خریدے گئے مکان میں واہب کی موت کے بعد دوسری بیوی کے ورثاء کا دعویٰ میراث کرنا

سوال:- کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلے میں، زید نے اپنے انتقال کے وقت چھ لڑکے اور ایک لڑکی اور ایک زوجہ چھوڑی۔ زید نے دو شادیاں کی تھیں، پہلی بیوی کے انتقال کے بعد دوسرا نکاح کیا تھا، پہلی بیوی سے دو لڑکے چھوڑے ہیں اور دوسری بیوی سے چار لڑکے ایک لڑکی اور زوجہ چھوڑی۔ زید نے ایک زمین خریدی اپنی دوسری بیوی کے نام سے جس کی رجسٹری بھی قانونی طریقے پر دوسری بیوی کے نام سے کرائی، سرمایہ بھی قانونی طریقے پر اپنے کاروبار سے نکالا، اس پر مکان بھی تعمیر کروایا دوسری بیوی کی اولاد کی زیر نگرانی مکان تعمیر ہونے کے بعد کتبہ بھی دوسری بیوی کے نام کا لگوا دیا یعنی دوسری بیوی کے نام پر اس مکان کا نام رکھا۔ سرمایہ، زمین اور مکان کی تعمیر یہ سب زید نے دیا، زید کے انتقال کے نو ماہ بعد دوسری بیوی کا بھی انتقال ہو گیا، اب زید کی دوسری بیوی کے لڑکے اور لڑکی کہتے ہیں کہ یہ مکان ہماری والدہ کا ہے اس لئے اس کے وارث ہم ہیں، کیونکہ یہ مکان زید نے اپنی زندگی میں ہماری والدہ کے نام سے تیار کرا کے قانونی طریقے سے ہبہ کر دیا تھا، اب پہلی بیوی کے دونوں لڑکے بھی اس میں وراثت کا دعویٰ کرتے ہیں، یہ فرمائیں کہ شرعی اعتبار سے پہلی بیوی کے دونوں لڑکوں کو اس مکان میں ورثہ ملنا چاہئے یا نہیں؟

تنقیح

کیا زید مرحوم نے کبھی زبانی اس بات کا اظہار کیا تھا کہ انہوں نے یہ مکان اپنی دوسری بیوی کی ملکیت کر کے خریدا ہے یا ان کو ہبہ کر دیا ہے؟ نیز کیا کبھی ایسا ہوا کہ زید مرحوم نے اس مکان کا قبضہ

(۱) وفي بدائع الصنائع، كتاب الہبة ج: ۶ ص: ۱۲۴ والاذن نوعان صریح ودلالة وأما الدلالة فہی أن یقبض الموهوب له العین فی المجلس ولا ینہاہ الواہب فیجوز قبضہ استحسنًا الخ. وفي الشامیة، كتاب الہبة ج: ۵ ص: ۶۸۸ قد أفاد أن التلفظ بالایجاب والقبول لا یشرط بل تكفی القرائن الدالة علی التملیک كمن دفع لفقییر شیئاً وقبضه ولم یتلفظ واحد منهما بشیء الخ.

اپنی دوسری بیوی کو بلا شرکتِ غیر دے دیا ہو اور خود کسی اور مکان میں مقیم رہتے ہوں؟ ان سوالات کا جواب اسی کاغذ کی پشت پر لکھ کر دے دیں تو ان شاء اللہ اصل مسئلے کا جواب دے دیا جائے گا۔

جوابِ تنقیح

زمین جب خریدی گئی اسی ارادے سے خریدی گئی کہ اس کی ملکیت موجودہ بیوی کی رہے گی، علاوہ اس کے زبانی بھی انتقال سے کچھ روز قبل انہوں نے موجودہ بیوی سے کہا کسی طرح کی بیوی کی بات پر کہ تیرے لئے تو میں اپنی ملکیت کا مکان چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ نیز مرحوم کی زندگی میں پیشگی ٹیکس فکس نہیں ہو رہا تھا، زید کے انتقال کے بعد یہ مسئلہ طے ہوا تب جملہ ٹیکس موجودہ بیوی کی اولاد دیتی رہی، کبھی ایسا ہوا نہیں کہ وہ خود کسی اور مکان میں رہے ہوں، بیوی موجودہ حال میں چونکہ ایک جھگڑے کی بات پر ہوتا دیگر کوئی دوسرا خیال بھی اس شہر میں زید کا تھا بھی نہیں۔

جواب:- صورتِ مسئلہ میں جبکہ زید اور اس کی بیوی دونوں کا انتقال ہو چکا ہے، معاملے کی صحیح نوعیت خود اصحابِ معاملہ سے تو معلوم نہیں ہو سکتی، البتہ ظاہر حال کا تقاضا یہ ہے کہ یہ مکان بیوی ہی کی ملکیت ہے، بیوی کے نام رجسٹری اور بیوی اور اس کی اولاد کا اس مکان پر قبضہ بیوی کے نام کا کتبہ اور مرحوم کی زبانی گفتگو سب ظاہری طور پر اس بات کے قرائن ہیں کہ مرحوم نے یہ مکان اپنی زندگی ہی میں بیوی کی ملکیت کر دیا تھا، اس صورت میں اگر پہلی بیوی کی اولاد قابلِ اعتماد گواہوں کے ذریعے یہ ثابت کر دے کہ اس مکان کو بیوی کے نام رجسٹری کرنا محض ایک بینامی کارروائی تھی اور حقیقت میں زید مرحوم نے یہ مکان بیوی کی ملکیت نہیں کیا تھا، تب تو یہ مکان ان کے ترکے میں شامل ہو کر ان کے تمام ورثاء میں تقسیم ہوگا، لیکن اگر پہلی بیوی کی اولاد قابلِ اعتماد گواہوں کے ذریعے یہ ثابت نہ کر سکے تو اس مکان کو زید مرحوم کی دوسری بیوی کی ملکیت سمجھا جائے گا،^(۲) اور اس میں پہلی بیوی کی اولاد کا کوئی حصہ نہیں ہوگا۔

واللہ اعلم

۱۴۰۰/۷/۲ھ

(فتویٰ نمبر ۸۵۹/۳۱ ج)

بیوی بچوں کی نافرمانی کی بناء پر اپنی ساری رقم صدقہ کرنے یا تبلیغ میں خرچ کرنے کا حکم

سوال:- میری بیوی اور بچوں کے درمیان کشیدگی روز بروز بڑھتی جا رہی ہے، جس کی وجہ یہ

(۱ و ۲) وفي الشامية، كتاب الہبة ج: ۵ ص: ۶۸۸ قلت فقد افاد أن التلفظ بالایجاب والقبول لا يشترط بل تكفي القرائن الدالة على التملیک كمن دفع لفقير شيئاً وقبضه ولم يتلفظ واحد منهما بشيء... الخ. نیز دیکھئے: امداد الفتاویٰ کتاب الہبة ج: ۳ ص: ۴۶۶۔

ہے کہ میں اپنے بڑے لڑکے کو غلط لڑکوں کی صحبت سے روکتا ہوں، نماز پڑھنے پر زور دیتا ہوں، لوگوں نے کہا کہ یہ بالغ ہے اپنی نماز روزے کا خود ذمہ دار ہے، لہذا اس سے کہنا اور بولنا چھوڑ دیا۔ میں نے بیوی کو کہا کہ وہ ٹی وی لانے کو کہتا ہے، منع کر دو، میں اس کے خلاف ہوں۔ لیکن بیوی نے کوئی اثر نہیں لیا، اور وہ ٹی وی لے آیا، اس قدر زور سے بجاتا ہے کہ پریشان ہو جاتا ہوں۔ ماں لڑکے کی حمایت کرتی ہے، تھوڑی دیر گھر میں رہنا بھی محال ہو گیا ہے، صاحبزادے مجھے گھر سے نکل جانے کو کہتے ہیں، ہر اتوار زور زور سے بجا کر بہت پریشان کیا جاتا ہے، ان حالات میں میرا تبلیغی جماعت میں نکل جانے کا ارادہ ہے، لڑکا روزانہ پچاس ساٹھ روپے کماتا ہے، مکان پر دعویٰ کرتا ہے کہ مکان میرا ہے، گھر سے چلے جاؤ۔ دس بارہ ہزار روپیہ میرے پاس ہے، جس میں سے مسجد میں نصف صدقہ جاریہ کے طور پر لگانا چاہتا ہوں، اور نصف اپنی ضرورت کے لئے رکھنا چاہتا ہوں، میرے لئے شرع کا کیا حکم ہے؟

جواب:- صورتِ مسئلہ میں آپ کو اپنی زندگی میں اپنے روپے کے بارے میں اختیار ہے کہ اُسے جس جائز کام میں چاہیں صرف کریں^(۱)۔ البتہ آپ کی بیوی کا نفقہ آپ پر ہر حال میں واجب ہے^(۲)، لہذا اپنا، اپنی بیوی کا (اور اگر کوئی نابالغ اولاد ہو تو اس کا بھی)^(۳) نفقہ نکال کر باقی تمام مال میں آپ تصرف کر سکتے ہیں^(۴)، اُسے صدقہ جاریہ میں بھی لگا سکتے ہیں اور تبلیغ کے کام میں بھی صرف کر سکتے ہیں۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۱۳۹۷/۳/۱۰ھ

(فتویٰ نمبر ۳۱۳/۲۸ ب)

ساری جائیداد بیٹی کو قبضے کے ساتھ ہبہ کر دی تو ہبہ درست ہو گیا

سوال:- میرے بچھلے تائے مرحوم منشی حسام الدین صاحب جو میرے خسر بھی تھے، اولاد میں صرف ایک اکلوتی لڑکی (میری بیوی حسن بانو عرف حسنہ) تھی، میرے والد صاحب مرحوم منشی جمیل

(۱ و ۲) وفي شرح المجلة للأتاسي ج: ۳ ص: ۱۳۲ رقم المادة: ۱۱۹۲ (طبع مكتبة حقانيه پشاور) كل يتصرف في ملكه كيف شاء لأن كون الشيء ملكاً لرجل يقتضي أن يكون مطلقاً في التصرف فيه كيفما شاء.

(۲) وفي شرح المجلة لسليم رستم باز ج: ۱ ص: ۶۵۴ رقم المادة: ۱۱۹۲ (طبع حنفية كونله) كل يتصرف في ملكه كيف شاء.... الخ.

وفي الدر المختار، كتاب الطلاق، باب النفقة ج: ۳ ص: ۵۷۲ (طبع سعيد) ونفقة الغير تجب على الغير بأسباب ثلاثة زوجية وقرابة وملك فتجب للزوجة بنكاح صحيح على زوجها.

(۳) وفي الدر المختار ج: ۳ ص: ۶۱۲ (طبع سعيد) وتجب النفقة بأنواعها على الحر (لطفله) يعم الأنثى والجمع الفقير. وفي الشامية تحته (قوله بأنواعها) من الطعام والكسوة والسكنى.... الخ.

وفي البحر الرائق باب النفقة ج: ۳ ص: ۲۰۱ (طبع سعيد) قوله ولطفله الفقير أى تجب النفقة والسكنى والكسوة لولده الصغير الفقير.... الخ.

وفي الهندية ج: ۱ ص: ۵۶۰ (طبع رشيديه) نفقة الأولاد الصغار على الأب لا يشاركه فيها أحد كذا في الجوهرة النيرة.... الخ.

الدین صاحب، اولاد میں بڑی بہن جن کا انتقال والد صاحب کی ہی زندگی میں ہو گیا تھا، ہم چار بھائی فرید الدین صاحب، بلخ الدین و وحید الدین صاحبان پاکستان ۱۹۴۷ء میں آ گئے تھے، چوتھے محمد احمد صاحب مرحوم جو انڈیا ہی میں رہے، اول الذکر تین بھائیوں نے متروکہ جائیداد کے عوض جو ہند میں چھوڑ آئے تھے کلیم کر کے زمین حاصل کر لی، جبکہ محمد احمد صاحب انڈیا ہی میں رہ کر وفات پا گئے۔

والد صاحب قبلہ کے انتقال کو ۳۶ سال گزر گئے، میرے خسر منشی حسام الدین صاحب کے انتقال کو تقریباً ۴۶ سال گزرے، گویا والد صاحب کی زندگی ہی میں میرے خسر کا انتقال ہو گیا تھا۔

ہند میں مشترکہ جائیداد کا انتظام بڑے تایا منشی محمد مہدی صاحب کیا کرتے تھے، جائیداد مشترکہ مقروض ہو گئی، اور حالانکہ میرے خسر کی اولاد میں صرف لڑکی تھی، ان پر بھی برابر کا قرضہ پڑا، حالانکہ لڑکی اکثر اپنے والد مرحوم کے ساتھ ان کی ملازمت پر رہی تھی، ضرورت محسوس ہوئی کہ بعد ادائیگی قرضہ جو زمین صحرائی اور سکنی جائیداد رہ گئی تھی وہ حصہ برابر میں تقسیم کر دی جائے، جس کی تکمیل بڑے تائے کی ہی زندگی میں ہو کر ہر ایک کے نام داخل خارج ہو گیا تھا۔

میرے خسر کو والد صاحب مرحوم اور دوسرے اعزہ نے مشورہ دیا کہ کل جائیداد زرعی و سکنی اپنی لڑکی کے نام ہبہ کر دیں، چنانچہ تمام جائیداد ہبہ کر دی۔ خود والد صاحب نے ہبہ نامہ کی تکمیل کرائی اور بطور گواہ دستخط کئے، اور دستخط رجسٹرار کے سامنے خود میرے خسر نے باہوش و حواس کیا۔ ہبہ نامہ مکمل ہو گیا، سب جائیداد متعلقہ جو بلا شرکت غیرے میرے خسر کے نام چلی آرہی تھی، میری مرحومہ حسن بانو کے قبضے اور ملکیت میں چلی گئی، میرے خسر کے انتقال کے بعد دس سال میرے والد زندہ رہے لیکن کبھی انہوں نے اپنا شرعی حق میری بیوی سے طلب نہیں کیا، اتنا زمانہ گزر جانے کے بعد اب میرے حقیقی بھائی وحید الدین کو وسوسہ پیدا ہوا ہے کہ مسماۃ حسن بانو کی پاکستان میں حاصل کردہ جائیداد پر شرعی حق جتا کر اپنا حصہ طلب کروں۔ میرے حقیقی بھائی اور ان کی اولاد، مرحومہ حسن بانو کے حقیقت میں شرعی وارث ہیں یا نہیں اور یہ حق دار ہیں یا نہیں؟

جواب :- صورت مسئلہ میں آپ کے خسر منشی حسام الدین صاحب مرحوم نے اپنی زندگی میں اپنی ساری جائیداد اپنی بیٹی حسن بانو کو ہبہ کر دی تھی، اور حسن بانو نے اس پر قبضہ بھی کر لیا تھا، تو اب یہ ساری جائیداد حسن بانو کی ملکیت ہو گئی،^(۱) یہ آپ کے خسر کے ترکے میں شامل ہو کر ان کے دوسرے ورثاء کو نہیں مل سکتی، اور نہ اس میں کسی اور کا حصہ ہو سکتا ہے۔ البتہ یہ حکم اس صورت کا ہے جبکہ مذکورہ ہبہ منشی حسام الدین صاحب نے اپنے مرض وفات سے پہلے ہی تکمیل کر دیا ہو،^(۲) اور اگر مرض وفات میں

(۱) حوالہ کے لئے دیکھئے ص: ۴۴۰ کا حاشیہ نمبر ۲۔

(۲) دیکھئے حوالہ ص: ۴۴۰ کا حاشیہ نمبر ۳ و ص: ۴۴۹ کا حاشیہ نمبر ۲۔

ہبہ کیا ہو تو اس کا حکم دوبارہ لکھ کر معلوم کر لیا جائے۔

واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۷/۱/۲۱ھ

(فتویٰ نمبر ۱۵۲/۲۸ الف)

صرف کاغذات میں نام کرانے سے شرعاً ملکیت نہیں آئی

سوال:- میں بمعہ والد، والدہ اور تینوں بہنوں کے ہندوستان سے پاکستان پہنچے تھے، یہاں آکر میں (نور الحسن) اور میرے چھوٹے بھائی محمد سلیم دونوں نے دفتر میں نوکری کرنی شروع کر دی، والد صاحب ضعیف العمر تھے، دونوں بڑی بہن حسن آرا بیگم، فردوس جہاں اپنے اپنے گھر رہنے لگیں، کیونکہ ہندوستان میں شادی ہو گئی تھی، تیسری بہن چھوٹی تھی وہ ساتھ رہتی تھی، پیسے جوڑ کر ناظم آباد میں ایک پلاٹ لیا، تھوڑا سا بنوا کر گورنمنٹ ہاؤس بلڈنگ فائننس سے قرضہ لیا اور جوں جوں روپیہ ملتا گیا مکمل کرتا گیا۔

عرض یہ ہے کہ یہ پلاٹ ہم دونوں بھائیوں نے والدہ (بسم اللہ بیگم) کے نام سے لیا تھا، محض اس لئے کہ ہندوستان سے رنجیدہ حالات میں آئی ہیں، اس کا کچھ حصہ کرایہ پر بھی دیا ہوا تھا، کرایہ گھر میں خرچ ہو گیا تھا، اب والدہ کا انتقال ہو گیا ہے، اس سے قبل چھوٹی بہن کی بھی شادی ہو گئی تھی، والدہ اور ہم دونوں بھائی اور کرایہ دار اس مکان میں رہتے ہیں، اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ اس مکان میں بہنوں کا بھی حق ہے یا نہیں؟ جبکہ صرف والدہ کے نام تھا محض ان کی بزرگی کی وجہ سے، اس کا علم بہنوں کو بھی ہے۔

جواب:- اگر یہ درست ہے کہ یہ مکان آپ نے اپنی والدہ کو باقاعدہ ہبہ نہیں کیا تھا بلکہ محض کاغذات میں ان کے نام کر رکھا تھا، مالک آپ دونوں ہی تھے، تو یہ مکان آپ دونوں کی ملکیت ہے، اور یہ والدہ کے ترکے میں شمار نہ ہوگا، لہذا بہنوں کا اس مکان میں کوئی حق نہیں ہے۔^(۱)

واللہ اعلم

۱۳۹۶/۱۱/۲۲ھ

(۱) فی الدر المختار ج: ۵ ص: ۶۹۰ (طبع سعید کراچی) وتم الہیة بالقبض الكامل.

وفیہ أيضًا ج: ۵ ص: ۶۹۶ اتخذ لولده أو لتلميذہ ثيابًا ثم أراد دفعها لغيرہ لیس له ذلک ما لم یبین وقت الاتخاذ انها عاریة.

وفی الشامیة قوله: لولده، ای الصغیر وأما الکبیر فلا بد من التسليم. نیز دیکھئے ص: ۴۴۰ کا حاشیہ نمبر ۲۔

زندگی میں تقسیم جائیداد کا حکم اور طریقہ کار

سوال ۱:- ایک شخص کی دو بیویاں ہیں، پہلی کو طلاق دے کر اُس کی اولاد کو اگر جائیداد میں سے کچھ نہ دے تو جواب دہ ہوگا یا نہیں؟

سوال ۲:- اگر اُس کے پاس ورثے میں جائیداد آئی ہے اُس میں سے اس کو حصہ نہ دے تو گناہگار ہوگا یا نہیں؟

جواب ۱:- زندگی میں کوئی شخص اپنی اولاد کو کچھ دینا چاہتا ہے تو ساری اولاد کو برابر دینا چاہئے، خواہ وہ اولاد موجودہ بیوی سے ہو یا مطلقہ بیوی سے، بعض کو دینا اور بعض کو نہ دینا درست نہیں۔^(۱)

جواب ۲:- اگر اُس شخص کو کسی اور شخص کی میراث سے کچھ حصہ ملا ہے تو اپنی زندگی میں اس میں سے کوئی حصہ کسی اور کو دینا واجب نہیں، وہ سارا حصہ خود رکھ سکتا ہے، لیکن اگر اولاد کو اس میں سے کچھ دینے کا ارادہ ہو تو برابر دے۔^(۲)

واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم

۱۳۹۶/۱۲/۲ھ

(فتویٰ نمبر ۲۷۶۱/۲۷)

مرض الموت میں ہبہ ”وصیت“ کے حکم میں ہوتا ہے

سوال:- ایک شخص مرض الموت کے بستر پر پڑا ہوا ہے، جس کی اپنی کوئی اولاد نہیں ہے، اس کا ایک بھائی اور ایک بہن ہے، اور کچھ بھتیجے ہیں، اس کے بعض بھتیجے جا کر وکیل کو اس کے گھر پر بلا لیتے ہیں اور اس شخص کے بھائی اور بہن کو معلوم ہوئے بغیر اسے بہلا کر اس کا ترکہ اپنے نام ہبہ لکھواتے ہیں، اور اس کے دستخط کراتے ہیں، اور اس سے پہلے اس کے مال پر اس کی موت سے پہلے بھتیجوں کا کسی قسم کا قبضہ نہ ہو تو اس صورت میں کیا حکم ہے؟ کیا یہ ہبہ صحیح ہو گیا جبکہ اس ہبہ مرحوم پر بھائی اور بہن ناراض ہیں۔

(۳۱) فی الہندیۃ ج: ۴ ص: ۳۹۱ الباب السادس فی الہبۃ للصغیر ولو وہب رجل شیئاً لأولادہ فی الصحۃ وأراد تفضیل البعض علی البعض روى عن أبی حنیفۃ رحمہ اللہ تعالیٰ انہ لا بأس بہ اذا كان التفضیل لزیادۃ فضل لہ فی الذین وان کانوا سواء یکرہ، وروی المعلى عن أبی یوسف رحمہ اللہ تعالیٰ انہ لا بأس بہ اذا لم یقصد بہ الاضرار وان قصد بہ الاضرار سوى بینہم یعطى الابنۃ مثل ما یعطى الابن وعلیہ الفتویٰ.

فی البحر ج: ۷ ص: ۹۰ (طبع بیروت وفی طبع سعید ج: ۷ ص: ۲۸۸) المختار الترویۃ بین الذکر والانثی فی الہبۃ. نیز دیکھئے ص: ۴۷۷ کا حاشیہ نمبر ۴۰۔

جواب:- چونکہ اس شخص نے بھتیجوں کو قبضہ نہیں دیا، اس لئے یہ ہبہ باطل ہو گیا، اور اگرچہ مرض موت میں ہبہ بحکم وصیت ہوتا ہے^(۱) لیکن اسی وقت جبکہ موہوب لہ کو قبضہ دے دیا گیا ہو، قبضے کے بعد ثلث مال سے وہ ہبہ نافذ ہوتا ہے،^(۲) لیکن جب قبضہ ہی نہ دیا تو پھر ہبہ باطل ہو گیا، اور کل جائیداد اس کا ترکہ سمجھی جائے گی۔ لما فی الہندیۃ: قال فی الأصل: ولا تجوز ہبۃ المریض ولا صدقۃ الا مقبوضۃ فاذا قبضت جازت من الثلث واذا مات الواهب قبل التسليم بطلت. (عالمگیریۃ، کتاب الہبۃ، باب ۱۰ فی ہبۃ المریض ج: ۴ ص: ۴۰۰)۔^(۳)

واللہ اعلم

۱۳۹۱/۳/۱ھ

(فتویٰ نمبر ۳۲۲/۲۲ الف)

والد کا کئی بیٹوں کو مکان ہبہ کرنا درست نہیں

سوال:- عبد الجبار نے ایک مکان تعمیر کرایا، اور اپنی دو لڑکیوں اور چار لڑکوں کے ساتھ اس میں آباد ہو گیا، عبد الجبار نے حالت صحت میں اس مکان کو اپنے چاروں بیٹوں کو زبانی ہبہ کر دیا اور چاروں سے کہا کہ تم اس کے برابر کے مالک ہو اور اس مکان پر تمہارا قبضہ ہے، عبد الجبار نے کہا کہ میرا اس مکان کی ملکیت سے کوئی تعلق نہیں سوائے اس کے کہ میں اس مکان میں تمہارے ساتھ رہتا ہوں۔ اس ہبہ کے گواہ موجود ہیں۔

انتقال کے وقت عبد الجبار اپنی اولاد کے ساتھ اس مکان میں رہائش اختیار کئے ہوئے تھا، کیا

(۱، ۲ و ۳) وفي رد المحتار، باب الرجوع فی الہبۃ ج: ۵ ص: ۷۰۰ (طبع سعید) وھب فی مرضہ ولم یسلم حتی مات بطلت الہبۃ لأنہ وان کان وصیۃ حتی اعتبر فیہ الثلث فھو ہبۃ حقیقۃ فیحتاج الی القبض.... الخ.

وفي تكملة حاشیہ رد المحتار ج: ۲ ص: ۳۰۲ لأن الوصیۃ تملیک بعد الموت.... کذا الہبۃ فی مرضہ لأن الہبۃ فی مرض الموت وصیۃ.

وفي المحيط البُرہانی، کتاب الدعوی، الفصل الرابع والعشرون فی دعوی الوصیۃ.... الخ ج: ۱۶ ص: ۳۴۴ (طبع ادارة القرآن کراچی)..... ان كانت الہبۃ فی حالۃ المرض فالجواب فیہا کالجواب فی الوصیۃ لأن الہبۃ فی مرض الموت وصیۃ.... الخ

وفي شرح المجلۃ لسلم رستم باز رقم المادۃ: ۸۷۹ کتاب الہبۃ الفصل الثانی (طبع حنفیہ کوئٹہ) اذا وھب واحد فی مرض موتہ شیئاً لأحد ورثتہ وبعد وفاتہ لم یجز سائر الورثۃ لا تصح تلک الہبۃ أصلاً لأن الہبۃ فی مرض الموت وصیۃ.... الخ. وفي شرح المجلۃ للأناسی کتاب الہبۃ الفصل الثانی فی ہبۃ المریض رقم المادۃ: ۸۷۹ ج: ۳ ص: ۴۰۳ (طبع مکتبہ حبیبیہ کوئٹہ) لأن ہبتہ (أی المریض) وان کان ہبۃ حقیقۃ لکن لہا حکم الوصیۃ.

وکذا فی الہندیۃ ج: ۴ ص: ۴۰۰ کتاب الہبۃ، الباب العاشر فی ہبۃ المریض (طبع رشیدیہ) والبزازیۃ علی هامش الہندیۃ، کتاب الہبۃ، نوع فی ہبۃ المریض ج: ۶ ص: ۲۳۹ (طبع رشیدیہ).

(۴) طبع رشیدیہ کوئٹہ.

ایسی صورت میں جبکہ وہ یعنی عبد الجبار مکان کے قبضے سے دستبردار ہو چکا تھا اور گواہوں کی موجودگی میں ہبہ کر چکا تھا، یہ مکان عبد الجبار کے تر کے میں شامل ہوگا؟ کیا عبد الجبار پر لازم تھا کہ وہ قبضہ دینے کے لئے وہ مکان خالی کر دیتا؟ قبضے سے مراد آباد ہونا ہے یا مالکانہ حقوق؟

جواب:- صورت مسئلہ میں عبد الجبار نے اپنے بیٹوں کو مکان کا جو ہبہ کیا وہ شرعاً درست نہیں ہوا، اور اب عبد الجبار کے تمام ورثاء اس مکان میں حق دار ہیں کیونکہ یہ ہبۃ المشاع ہے اور جب تک مکان کے الگ الگ حصے کر کے باقاعدہ تقسیم شدہ شکل میں ہبہ نہ کیا جائے ہبہ درست نہیں ہوتا، لما فی الكنز وسائر المتون: ولو وهب اثنان دار الواحد صح لا عكسه وهو أن يهب واحد من اثنين كبيرين ولم يبين نصيب كل واحد عند أبي حنيفة لأنه هبة النصف من كل واحد منهما الخ. (البحر الرائق ج: ۷ ص: ۳۱۵) (۱) وقال في الدر المختار: ولو سلمه شائعاً لا يملكه فلا ينفذ تصرفه فيه وقال الشامي تحته: وكما يكون للواهب الرجوع فيها يكون لوارثه بعد موته لكونها مستحقة الرد ومضمون بالهلاك فحيث علمت أنه ظاهر الرواية، وأنه نص عليه محمد ورووه عن أبي حنيفة ظهر أنه الذي عليه العمل وإن صرح بأن المفتي به خلافه ولا سيما أنه يكون ملكاً خبيثاً. (شامی ج: ۴ ص: ۵۱۱)۔ (۲)

لیکن ہبہ درست نہ ہونے کی یہ وجہ اس وقت ہے جبکہ عبد الجبار نے مکان کے باقاعدہ حصے بنا کر اور تقسیم کر کے ہبہ نہ کیا ہو، اگر باقاعدہ حصے بنا کر تقسیم کر دیئے تھے تو اس صورت میں مسئلہ دوبارہ پوچھ لیں، لیکن یہ تصریح کریں کہ عبد الجبار کونسے بیٹے کے حصے میں رہتا تھا؟ واللہ سبحانہ اعلم

ھ ۱۳۹۷/۱۲/۱

(فتویٰ نمبر ۱۲۵۱/۲۸ ج)

خدمت گار بیٹے کو چند اشیاء ہبہ کرنے کا حکم

سوال:- میں نے والدہ کی بہت زیادہ خدمت کی، والدہ کے چار بیٹے اور ایک بیٹی ہے، انہوں نے انتقال سے کافی پہلے اپنی تندرستی کے زمانے میں ایک ڈولی، ایک بڑی بیٹی، ایک چھوٹی بیٹی اور کچھ زیور مجھے دے کر کہا: ”سب کو دے چکی ہوں، تم نے میری بہت خدمت کی ہے، یہ چیزیں میں تمہیں دیتی ہوں“ کیا یہ سامان تمام بھائیوں میں تقسیم ہوگا یا یہ صرف میری ذاتی ملکیت ہے؟

(فیاض اعوان)

(۱) البحر الرائق ج: ۷ ص: ۳۸۹ کتاب الہبۃ (طبع سعید).

(۲) الدر المختار ج: ۵ ص: ۶۹۲ کتاب الہبۃ (// //).

جواب:- آپ کی والدہ صاحبہ نے اپنی صحت کی حالت میں (یعنی مرضِ وفات سے پہلے پہلے)^(۱) جو کچھ آپ کو دے دیا اور آپ نے اس پر قبضہ بھی کر لیا ہے،^(۲) وہ آپ کی ملکیت ہے، اس میں ان کے دوسرے ورثاء کا کوئی حصہ نہیں ہے۔

واللہ اعلم

ھ ۱۴۲۸/۱۲/۲۷



﴿کتاب الودیعة والعاریة﴾ (امانت اور عاریت کے مسائل کا بیان)

عاریت پر دیئے ہوئے زیورات کی بعینہ واپسی
یا پوری قیمت کا مطالبہ کرنا جائز ہے

سوال:- آج سے بیس پچیس سال پہلے اپنی بڑی بہن کو مالی مشکلات میں مبتلا دیکھ کر بطور ہمدردی کے سترہ تولے کے زیورات اُن کو اس شرط پر دیئے تھے کہ فی الحال ان کو بینک میں رہن رکھ کر اپنی مشکلات دُور کریں، اور جب اُن کے پاس روپیہ ہو تو زیور چھڑا کر مجھے واپس کر دیں۔ اس کا وعدہ بھی مجھ سے اُنہوں نے کیا تھا کہ ایسا ہی کیا جائے گا، مگر ایسا نہیں ہوا، جائیداد کا سولہ سترہ ہزار روپے بھی انہیں ملا جو مجھ سے پوشیدہ رکھا گیا، مگر کسی نہ کسی طرح مجھے اس کا علم ہو گیا، میں نے زیور کا مطالبہ کیا تو معلوم ہوا کہ روپے اُن کے لڑکے نے وصول کئے ہیں، اور اُس سے اُنہوں نے زیور کے چھڑانے کے لئے کہا بھی کیونکہ زیور اُسی کے نام سے رکھا گیا تھا اور روپیہ بھی اُس کے پاس ہی تھا، مگر اس نے ایسا نہیں کیا، اور زیور نیلام ہو گیا اور نہ چھڑا کر دیا اور نہ اُس وقت اُس کی قیمت ادا کی، اب کہتا ہے کہ جس زمانے میں زیور نیلام ہوا ہے اُس وقت کی قیمت ادا کرنے کو تیار ہوں، میں نے کہا میں نے تو صرف رہن کی اجازت دی تھی، نیلام کروانے کو تو نہیں کہا تھا، اُس کو نیلام نہ ہونے دینے کی ذمہ داری مجھ پر نہ تھی، میں نے سونا دیا تھا اتنا سونا لوں گی، یہ مطالبہ میرا جائز ہے یا نہیں؟

جواب:- صورتِ مسئلہ میں آپ کی بہن پر واجب ہے کہ جیسا زیور آپ نے ان کو دیا تھا یا تو ویسا ہی بنوا کر آپ کو واپس کریں، یا اُس کی جو قیمت واپسی کے دن ہو وہ قیمت ادا کریں، اور آپ کا مطالبہ شرعاً جائز ہے، لما فی الدر المختار: فان اجر المستعير أو رهن فهلك ضمنه المعير.^(۱) (شامی ج: ۴ ص: ۵۰۳)۔ وفيه: إلا اذا استعارها ليرهنها فتكون كالإجارة وقال الشامي تحته:

(۱) الدر المختار كتاب العارية ج: ۵ ص: ۶۷۹ (طبع سعيد).

وفي درر الحکام شرح غرر الأحکام كتاب العارية ج: ۷ ص: ۱۳۴ فان اجر أو رهن المستعير فهلك العارية ضمنه المعير أي ضمن المعير المستعير.

وكذا في الهندية الباب الخامس في تضييع العارية وما يضمنه المستعير وما لا يضمن ج: ۴ ص: ۳۶۷ (طبع رشیدیہ کوئٹہ).

لأن هذه اعادة فيها منفعة لصاحبها فانها تصير مضمونة في يد المرتهن وللمعير أن يرجع على المستعير بقيمته. (شامی ج: ۴ ص: ۵۰۵)۔^(۱)

واللہ سبحانہ اعلم

ھ ۱۳۹۷/۶/۵

(فتویٰ نمبر ۵۴۴/۲۸ ب)

گھڑی ساز کے پاس عرصہ دراز سے رکھی ہوئی گھڑیوں کا حکم

سوال:- زید گھڑی سازی کی دکان کرتا ہے، بعض صاحب گھڑیاں مرمت کے لئے دے کر واپس لینے نہیں آتے، اور نہ اُمید ہے کہ وہ کبھی واپس آکر لے جائیں گے، اور پڑے ہوئے تقریباً دو تین سال تک ہو چکے ہیں، باوجود حفاظت سے ہونے کے زنگ آلود ہو کر خراب ہونے کا اندیشہ ہے، ایسی صورت میں کیا کرنا چاہئے؟ کیا زید ان کے بدلے میں رقم خیرات کر کے اپنی ملک بنا سکتا ہے یا نہیں؟

جواب:- صورت مذکورہ میں زید کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ گھڑیوں کی قیمت خیرات کر کے اپنی ملک بنالے، بلکہ تمام عمر ممکن حد تک ان کی حفاظت کرنی چاہئے، تاوقتیکہ اصل مالک اُسے لے جائے یا اس کی طرف سے کوئی ہدایت موصول ہو، یا اس کی موت کا علم ہو جائے، تو اس کے ورثہ کے سپرد کر دیا جائے، کیونکہ یہ گھڑیاں زید کے پاس بطور امانت ہیں، اور امانت کو لفظ کی طرح صدقہ نہیں کیا جاسکتا۔

دلیل الصغریٰ فی قول الہندیۃ وحکم الأجیر المشترك أن ما ہلک فی یدہ من غیر صنعة فلا ضمان علیہ فی قول أبی حنیفۃ. (عالمگیریۃ ج: ۴ ص: ۵۱۸)۔^(۲) ودلیل الکبریٰ فی قوله غاب المودع ولا یدری حیاتیۃ ولا مماتہ یحفظہا أبداً حتی یعلم بموتہ وورثتہ کذا فی الوجیز للکردری ولا یتصدق بہا بخلاف اللقطة کذا فی الفتاویٰ العتابیۃ. (عالمگیریۃ ج: ۴ ص: ۳۵۶)۔^(۳)

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

ھ ۱۳۸۸/۲/۲۵

(فتویٰ نمبر ۳۲۵/۱۹ الف)

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع

ھ ۱۳۸۸/۲/۲۵

(۱) الذر المختار مع رد المحتار کتاب العاریۃ ج: ۵ ص: ۶۸۲ (طبع سعید).
(۲) الہندیۃ ج: ۴ ص: ۵۰۰ باب ۲۸ (طبع مکتبہ رشیدیہ) وفي المحيط البرہانی کتاب الاجارۃ الفصل الثامن والعشرون فی بیان حکم الأجیر الخاص والمشارك ج: ۱۲ ص: ۳۹ (طبع ادارة القرآن کراچی) ومن حکم الأجیر المشترك أن ما ہلک فی یدہ من غیر صنعة فلا ضمان علیہ فی قول أبی حنیفۃ وهو قول زفر والحسن رحمہما اللہ، وأنه قیاس.... الخ.

(۳) الہندیۃ باب ۷ ج: ۴ ص: ۳۵۴ (طبع مکتبہ رشیدیہ) وفي الشامیۃ کتاب الايداع ج: ۵ ص: ۶۷۶ (قبیل کتاب العاریۃ) (طبع سعید) غاب ربّ الودیعة ولا یدری أحوالی أم میت یمسکها حتی یعلم موتہ ولا یتصدق بہا بخلاف اللقطة.... الخ.

وفي المحيط البرہانی کتاب الودیعة الفصل العاشر فی المتفرقات ج: ۸ ص: ۳۱۷.
(۱۰۳۴) فی فتاویٰ أبی اللیث رجل استودع رجلاً ألف درهم ثم غاب ربّ الودیعة لا یدری أحوالی هو أم میت فعلیہ أن یمسکها حتی یعلم موتہ ولا یتصدق بہا بخلاف اللقطة.

﴿ کتاب اللقطة ﴾

(گری پڑی ہوئی چیزوں کا بیان)

سیلاب میں ملنے والی مختلف اشیاء کا حکم

سوال :- میں شرنگ کا کام کرتا ہوں، یعنی چھتوں کی ڈھلائی کے وقت تختے بچھا کر اس کو درست کر دیتا ہوں تاکہ ڈھلائی کرنے والے اُس پر ڈھلائی کر سکیں۔ تختہ میرا ذاتی ہوتا ہے، میں اُس کی اجرت وصول کرتا ہوں، اس سیلاب میں ہمارے یہ تختے بہہ گئے، بہت سے دوسرے لوگوں نے بھی اٹھائے، اور کچھ تختے کسی جگہ پر پڑے ہوئے ہیں، لیکن مجھے شبہ ہے کہ یہ تختے میرے ہیں یا نہیں؟ کیا ایسی حالت میں یہ تختے میں اٹھا سکتا ہوں؟

جواب :- اگر علامات و قرائن سے گمان غالب اس بات کا ہو جائے کہ یہ تختے آپ ہی کے ہیں، تو آپ ان کو اٹھا کر لے جاسکتے ہیں، بشرطیکہ کوئی دوسرا ان کا دعوے دار نہ ہو، اور اگر گمان غالب نہیں ہے یعنی دونوں احتمال برابر ہیں تو پھر اس پر لقطہ کا حکم جاری ہوگا۔ یعنی پہلے تو ان کے مالک کو تلاش کریں^(۱)، اگر مالک کے ملنے سے مایوسی ہو جائے، تو اگر خود مستحق زکوٰۃ ہوں تو اپنے استعمال میں لے آئیں، ورنہ کسی مستحق زکوٰۃ کو صدقہ کر دیں^(۲)، وغالب الظن عندهم ملحق بالیقین وهو الذی

(۱، ۲، ۳) وفي الهندية كتاب اللقطة ج: ۲ ص: ۲۸۹ و ص: ۲۹۰ (طبع رشيدية) اذا رفع اللقطة يعرفها وفي هذا الوجه له أن يأخذها ويحفظها ويعرفها حتى يوصلها الى صاحبها. وفيها أيضًا ج: ۲ ص: ۲۸۹ ويعرف الملتقط اللقطة في الأسواق والشوارع مدة يغلب على ظنه ان صاحبها لا يطلبها بعد ذلك هو الصحيح ثم بعد تعريف المدة المذكورة الملتقط مخير بين أن يحفظها حسبه وبين أن يتصدق بها الخ.....

وفي الدر المختار كتاب اللقطة ج: ۴ ص: ۲۷۸ (طبع سعيد) وعرف أي نادى عليها حيث وجدها وفي المجامع الى أن علم أن صاحبها لا يطلبها.

وفي الشامية تحته (قوله الى ان علم ان صاحبها لا يطلبها) لم يجعل للتعريف مدة اتباعا للسرخصي فانه بنى الحكم على غالب الرأي فيعرف القليل والكثير الى أن يغلب على رأيه ان صاحبها لا يطلبه وصححه في الهداية وفي المصمورات والجوهره وعليه الفتوى الخ.

وفي الفتاوى الساترخانية كتاب اللقطة ج: ۵ ص: ۵۸۵ (طبع ادارة القرآن) وفي هذا الوجه له أن يأخذها ويحفظها ويعرفها حتى يوصلها الى صاحبها.

وفي بدائع الصنائع، كتاب اللقطة، فصل في بيان ما يصنع باللقطة ج: ۸ ص: ۳۳۳ ثم اذا عرفها ولم يحضر صاحبها مدة التعريف فهو بالخيار ان شاء أمسكها الى أن يحضر صاحبها وان شاء تصدق بها على الفقراء.

وفي الشامية، كتاب اللقطة ج: ۴ ص: ۲۷۹ (طبع سعيد) أي فينتفع الرافع بها لو فقيرا وألا تصدق أي من رفعها من الأرض. وفي بدائع الصنائع، كتاب اللقطة، فصل في بيان ما يصنع باللقطة ج: ۸ ص: ۳۳۵ (طبع دار الكتب العلمية بيروت) وان كان فقيرا فان شاء تصدق بها على الفقراء وان شاء أنفقها على نفسه.

وفي البحر الرائق، كتاب اللقطة ج: ۵ ص: ۱۵۷ (طبع سعيد) قوله ويتفع بها لو فقيرا وألا تصدق على أجنبي ولا بويه وزوجه وولده لو فقيرا أي ينتفع الملتقط.

وكذا في الهداية كتاب اللقطة ج: ۲ ص: ۶۱۸ (طبع شركت علميه ملتان)

یبتنی علیہ الأحکام، یعرف ذلك من تصفیح کلامهم فی الأبواب، صرحوا فی نواقض
الوضوء بأن الغالب کالمتحقق. (الاشباه والنظائر ج: ۱ ص: ۹۴، قاعدة: ۳)۔^(۱)

واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم

۱۳۹۷/۸/۲۹ھ

(فتویٰ نمبر ۸۸۷/۲۸ ج)

مسافر سامان رکھ کر چلا گیا ہو تو اُس کے سامان کا حکم

سوال:- ایک آدمی ہمارے ساتھ سفر میں تھا، راستے میں وہ کہیں اتر گیا اور اُس کا سامان
ہمارے پاس رہ گیا، اور اس شخص کو ہم جانتے بھی نہیں ہیں، تقریباً سات سال ہونے والے ہیں، اب
اس سامان کو کیا کیا جائے؟

جواب:- اگر وہ شخص زندہ ہو اور اس کا پتہ معلوم ہو تو اس کو سامان پہنچائے،^(۲) اور اگر وہ زندہ
نہ ہو تو اس کے ورثاء کو پہنچادے،^(۳) اگر اس کا پتہ معلوم نہ ہو تو اُسے اس وقت تک تلاش کیجئے جب تک یہ
خیال ہو کہ وہ شخص سامان کی تلاش میں ہوگا، اور جب ملنے سے مایوسی ہو جائے تو اُسے صدقہ کر دیجئے۔^(۴)

واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۷/۹/۲ھ

(فتویٰ نمبر ۹۰۴/۲۸ ج)

(۱) الاشباه والنظائر ج: ۱ ص: ۳۷ فائدة: ۲ قاعدة: ۳ (طبع سعید).

(۲ و ۳) حوالہ جات اور تفصیلی عبارات کے لئے سابقہ فتویٰ اور اس کے حواشی ملاحظہ فرمائیں۔

(۳) کیونکہ زندہ نہ ہونے اور اُس کے ورثاء کا بھی پتہ معلوم نہ ہونے کی صورت میں ایک مخصوص مقدار کی حد تک یہ مال لقطہ شمار ہوگا۔
وفی الدر المختار، کتاب اللقطة ج: ۳ ص: ۲۸۴ (طبع سعید) وفي الحاوی: غریب مات فی بیت انسان ولم یعرف
وارثه فترکته کللقطة ما لم یکن کثیراً فلبیت المال بعد الفحص عن ورثته سنین فان لم یجدہم فله لو مصرفاً.
وفی المحيط البُرہانی، کتاب اللقطة، الفصل الثانی فی تعریف اللقطة وما یصنع بها بعد التعریف ج: ۸ ص: ۱۷۳
(طبع ادارة القرآن کراتشی) ۹۸۷۹ فی ودیعة اهل سمرقند غریب مات فی دار رجل و لیس له وارث معروف وخلف
من المال ما یساوی خسمۃ دراهم وصاحب الدار فقیر فأراد أن ینفقها علی نفسه فله ذلك لأنه فی معنی اللقطة.
وفی البحر الرائق، کتاب اللقطة ج: ۵ ص: ۱۵۸ قبیل کتاب الاباق (طبع سعید) وفي الولوالجیۃ هی لو مات غریب
فی دار رجل ومعه قدر خسمۃ دراهم فأراد صاحب البیت أن یتصدق علی نفسه ان كان فقیراً فله ذلك كاللقطة ولم
یصرحاً بما زاد علی الخمسة وفي الحاوی القدسی واذا مات الغریب فی بیت انسان و لیس له وارث معروف كان حکم
ترکته کحکم اللقطة إلا اذا كان مالاً کثیراً یكون لبیت المال بعد البحث والفحص عن ورثته سنین. وفي الخانیة رجل
غریب مات فی دار رجل و لیس له وارث معروف وخلف ما یساوی خسمۃ دراهم وصاحب الدار فقیر لیس له أن
یتصدق بهذا المال علی نفسه لأنه لیس بمنزلة اللقطة وهو مخالف لما ذکرنا والأول أثبت وصرح به فی المحيط.

وفی مجمع الأنهر فی شرح ملتقى الأبحر الانتفاع باللقطة.

وفی الاختیار رجل غریب مات فی دار رجل لیس له وارث معروف وخلف مالاً وصاحب المنزل فقیر فله الانتفاع به
بمنزلة اللقطة وفي الخانیة خلافه.

نیز دیکھئے: امداد الأحکام، کتاب الودیعة والعیاریة ج: ۳ ص: ۶۰۷ (طبع مکتبہ دارالعلوم کراچی)۔

﴿کتاب الغصب والضمنان﴾

(غصب اور ضمنان کے مسائل کا بیان)

مسجد کی دکان پر ناجائز قبضہ کرنے اور کرایہ ادا نہ کرنے کا حکم

سوال:- ایک تعمیر شدہ مسجد سے ملحقہ قطعہ زمین پر مسجد مذکور کے مجوزہ توسیعی نقشے کے مطابق ایک دینی مدرسہ، وضوء خانہ، اور مسجد و مدرسہ کے مستقل اخراجات کو پورا کرنے کے لئے پختہ دکانیں تعمیر کی گئیں، تعمیر سے قبل اس قطعہ زمین واقع شمالی کنارے پر تین کیبن رکھے ہوئے تھے، جن میں سے دو کیبن والے پابندی سے مسجد کو کرایہ ادا کر رہے تھے، مگر درمیان کے کیبن والا اپنے اثر و رسوخ کی بناء پر جبراً قابض تھا، اور کرایہ نہیں دیتا تھا۔ اس کے بعد اپنی علالت کے باعث اُس نے وہ کیبن کرایہ پر دیا، اور کرایہ دار سے کرایہ وہ خود وصول کرتا رہا، اس درمیان میں وہ شخص فوت ہوا اور اس کے بعد اس کی بیوی اس پر قابض تھی، جب وہاں پر پختہ دکانیں بنی شروع ہوئیں تو ان کو یہ نوٹس دیا گیا کہ تم اپنا کیبن اٹھالو، جب دکانیں پختہ تعمیر ہو گئیں تو متوفی کی بیوی نے پختہ دکان کا مطالبہ کیا، مسجد کمیٹی کے ایک ممبر نے جو متوفی کی بیوی کا رشتہ دار ہے، اس کو دلوانے کی کوشش کی اور اپنی ضمانت پر دکان دینے کی درخواست کی، ہر چند کہ متوفی نے مسجد کی زمین پر غاصبانہ قبضہ کیا تھا، بیوہ جان کر دکان کو ان کے قبضے میں اسی شرط پر دیا گیا کہ کرایہ سے دس روپیہ ماہوار مسجد میں داخل کرتی رہے، مگر اب وہ دکان پچاس روپے کرایہ وصول کرتی ہے مگر مسجد کا وہ دس روپیہ نہیں دیتی، اب صورت مذکورہ میں متوفی کا قبضہ تسلیم کیا جائے گا اور کیا از روئے شریعت بیوہ کے مالکانہ حقوق تسلیم کئے جائیں گے؟

جواب:- اگر سوال میں درج شدہ واقعات درست ہیں تو متوفی کی بیوہ کا کوئی مالکانہ حق

دکان پر نہیں ہے، ان پر واجب ہے کہ وہ مسجد کی دکان کا مقررہ کرایہ ادا کریں، اور اگر ادا نہیں کرتیں تو مسجد کی دکان خالی کر دیں، یوں تو کسی بھی مسلمان کے حق پر ناجائز قبضہ کرنا سخت حرام ہے،^(۱) اور ناجائز

(۱) وفي المشکوٰۃ، باب الغصب والعاریۃ ص: ۲۵۵ (طبع قدیمی کتب خانہ) قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: لا یحل مال امرئ مسلم الا بطیب نفس منه. نیز دیکھئے ص: ۴۸۰ کا حاشیہ نمبر ۳۔

ہے، لیکن خاص طور سے مسجد کے کسی حق کو دبا لینا اور زیادہ وبال کا موجب ہے۔ واللہ اعلم
الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

۱۳۸۸/۲/۲۱ھ

(فتویٰ نمبر ۲۸۳/۱۹ الف)

مال برآمد کرنے کی صورت میں اگر مال راستے میں ہلاک ہو جائے
تو جہاز کمپنی یا انشورنس کمپنی سے ضمان لینے کا حکم

سوال:- جہاز میں جو مال آتا ہے وہ راستے میں نقصان کا شکار یا ضائع ہو جاتا ہے، اس
نقصان کا بدلہ انشورنس والے ادا کرتے ہیں، شاید یہ جائز نہیں، دوسری صورت میں یہ جہاز راں کمپنی
والے اس نقصان کی رقم ادا کرتے ہیں جو نقصان کے مال کے برابر یا اس سے کچھ کم ہوتا ہے، کیا
جہاز راں کمپنی سے اس نقصان کا بدلہ لینا جائز ہے؟

تنقیح

- پہلے چند امور کی وضاحت کریں، وضاحت پر کچھ بتایا جاسکے گا۔
- ۱:- کیا جہاز راں کمپنی کو کرایہ کے علاوہ کچھ رقم پیشگی دینی پڑتی ہے یا نہیں؟
 - ۲:- اگر صرف انشورنس کرادیا جائے تو کیا تب بھی جہاز راں کمپنی سے نقصان وصول کیا
جاسکتا ہے؟ اگر وصول کیا جاسکتا ہے تو اس کی کیا وجہ ہے؟
 - ۳:- اگر دونوں سے علیحدہ علیحدہ معاملہ کیا جائے تو کیا جب بھی کسی ایک ہی سے وصول کرنا
ہوگا یا دونوں سے؟ اگر نہیں تو کیا وجہ؟
 - ۴:- اگر انشورنس نہ کرایا جائے اور جہاز راں کمپنی کو بھی پیشگی کچھ رقم نہ دی جائے تو کیا اس
کے باوجود جہاز راں کمپنی نقصان دیتی ہے؟

جواب تنقیح

- ۱:- نہیں، جہاز راں کمپنی صرف کرایہ وصول کرتی ہے، اور اس سے زیادہ مزید کچھ نہیں لیتی۔
- ۲:- جی ہاں، وصول کیا جاسکتا ہے، اس لئے کہ اصل بنیادی ذمہ داری جہاز کمپنی کی ہے کہ
مال معاہدے کے مطابق پورا پورا جگہ پر پہنچائے، اس کی مزید وضاحت کر دوں کہ اس کی مثال تقریباً

ایسی ہے کہ زید کے ذمہ آپ کوئی کام کرتے ہیں اور اس کا ضامن بکر بن جاتا ہے کہ اگر زید نے یہ کام پورا نہ کیا تو میں ذمہ دار ہوں، لہذا دراصل اصلی ذمہ داری تو زید کی ہے جو مثل جہاز کمپنی کے ہے، اور بکر مثل انشورنس کمپنی کے۔

دراصل لوگ عام طور پر اپنے نقصان ایسی صورت میں انشورنس کمپنی سے لیتے ہیں، کیونکہ اکثر لوگ انشورنس پالیسی اصل لاگت سے کچھ بڑھ کر کرواتے ہیں، اس کے برعکس جہاز راں کمپنی سے وصول یا بی میں دو چار ماہ لگ جاتے ہیں اور صرف نقصان وہی ملتا ہے جو مال کی اصل لاگت ہوتی ہے، اور کچھ زیادہ نہیں ملتا۔

بہر حال اس سلسلے میں ایک وضاحت ضروری سمجھتا ہوں کہ نقصان کی رقم صرف ایک ذریعے ہی سے وصول ہو سکتی ہے، یعنی یا تو جہاز کمپنی سے یا انشورنس کمپنی سے، اس کی مزید وضاحت کر دوں۔
الف:- انشورنس : یا نہ ہو، دونوں صورتوں میں جہاز کمپنی ذمہ دار ہے کہ نقصان کی اصل لاگت اداء کرے، کیونکہ جیسا اوپر عرض کیا کہ اصل ذمہ داری تو جہاز کمپنی کی ہے کہ وہ مال پورے کا پورا صحیح طور پر مقام پر جس سے کرایہ وصول کیا ہے اس کو پہنچائے، جہاز راں کمپنیاں پوری دنیا میں ہیں، اور سب کا قانون یکساں ہے، دنیا میں ایسے ملک بھی ہیں جہاں انشورنس کا نظام نہیں ہے، اگر ہے بھی تو حکومت کی طرف سے انشورنس کرانا لازمی نہیں ہے۔

ب:- اگر انشورنس ہے تو نقصان وصول کرنے کے لئے دو راستے ہیں، (اے) جہاز کمپنی، (بی) انشورنس کمپنی۔ اور دونوں راستوں کی وضاحت یہ ہے:-

الف:- جہاز کمپنی سے اس صورت میں کئی ماہ لگ جاتے ہیں، اور کئی قانونی پیچیدگیاں دُور کرنی پڑتی ہیں، اور رقم صرف اتنی ملتی ہے جتنی مال کی اصل لاگت ہے، اور بعض اوقات بعض جہاز کمپنی باہر ملکوں کی ہوتی ہیں لہذا ان کے پاس پیسہ باہر ملکوں سے آتا ہے جس کی وجہ سے مزید وقت لگتا ہے، بہر حال رقم وصول ہونے کے بعد جہاز راں کمپنی کو ایک رسید دینی پڑتی ہے کہ پیسہ پورے کا پورا وصول پایا، اب ہمارا کوئی مزید دعویٰ نہیں۔

ب:- انشورنس کمپنی:- اس صورت میں نقصان کی ادائیگی جلد ہو جاتی ہے، بعض اوقات اصل رقم سے کچھ زیادہ وصول ہوتا ہے، انشورنس کمپنی جب رقم ادا کرتی ہے اُس وقت آپ کو ایک خط انشورنس کمپنی کو دینا پڑتا ہے کہ فلاں فلاں جہاز سے جو ہمارا نقصان فلاں فلاں ہوا ہے اس کی رقم ہم نے ان سے وصول کر لی، انشورنس والے اگرچہ رقم ہم کو دے دیتے ہیں پھر یہ جہاز کمپنی سے وصول کرتے ہیں،

ان کو کب ملتا ہے یہ پتہ نہیں، بہر حال دیر ہو یا سویر انشورنس والوں کو جہاز کمپنی ادا ضرور کر دیتی ہے، انشورنس والوں کو نقصان یہ ہوتا ہے کہ اول ادائیگی کرنا پڑتی ہے جبکہ ان کو دیر سے ملتا ہے، دوسری بات یہ ہے کہ جہاز کمپنی بھی انشورنس والوں کو کم ہی ادا کرتی ہے جبکہ انشورنس والے زیادہ ادا کرتے ہیں، یہ ان لوگوں کا معمول ہے اور وہ اس کے عادی ہوتے ہیں۔

۳:- آپ کے اس سوال کا جواب شاید اوپر آگیا ہے، بہر حال رقم کی وصولی کا معاملہ جہاز راں کمپنی اور انشورنس کمپنی کسی سے بھی کیا جاسکتا ہے، وصول یا بی ظاہر ہے جس سے معاملہ کیا جائے گا اس سے ہی ہوگی، ہاں انشورنس کمپنی سے وصول یا بی کی صورت میں انشورنس کمپنی خود جہاز راں کمپنی سے مال کی قیمت وصول کرے گی، کیونکہ جیسا کہ اوپر عرض کیا جاسکتا ہے کہ مال برداری کی اصل ذمہ داری جہاز راں کمپنی پر ہے۔

۴:- جی ہاں، وہ ایسا کرنے کے پابند ہیں، اس کا تفصیلی جواب اوپر گزر چکا ہے، بہر حال آپ نے ایک لفظ لکھا ہے کہ ”پیشگی کچھ رقم“ اس سے شاید آپ کی مراد کرایہ ہے جو جہاز کمپنی مال برداری کے لئے لیتی ہے، تو کرایہ کی صورت یہ ہے کہ عموماً تو جہاز والے کرایہ پیشگی لیتے ہیں اور ہمارے معاملے میں ایسا ہی ہے، مگر بعض صورتوں میں اگر مال فروخت کرنے والا یا خریدنے والا چاہے تو کرایہ بعد میں بھی ادا کر سکتے ہیں، مثال کے طور پر ہم نے مال جدہ شریف روانہ کیا تو ہم یہ جہاز والوں کو کہہ سکتے ہیں کہ یہ کرایہ آپ کو جدہ میں خریدار ادا کرے گا۔

جواب:- صورتِ مسئلہ میں تفصیل یہ ہے کہ اگر مال کا نقصان کسی ایسی آفت کی وجہ سے ہوا ہو جس سے بچنا ممکن نہ تھا، مثلاً پورے جہاز میں آگ لگ گئی یا قزاقوں نے حملہ کر دیا، تب تو نقصان کی رقم وصول کرنا آپ کے لئے جہاز کمپنی سے بھی جائز نہیں، لیکن اگر اس قسم کی کوئی عمومی آفت نہیں تھی تو جہاز کمپنی سے نقصان وصول کرنے کی گنجائش ہے، وفي البدائع: لا یضمن (ای الأجير المشترك) عندہ ما ہلک بغير صنعہ قبل العمل أو بعدہ لأنه أمانة فی یدہ وهو القیاس، وقال لا یضمن إلا من حرق غالب أو لصوص مکابرین وهو استحسان اھ۔ قال فی الخیرۃ..... قول أبی حنیفۃ قول عطاء وطاؤس وھما من کبار التابعین وقولھما قول عمر وعلی، وبہ یفتی احتشاماً لعمر وعلی وصیانة لأموال الناس، واللہ اعلم اھ۔ لأنه اذا علم أنه لا یضمن ربما یدعی أنه سرق أو ضاع من یدہ وفي الخانیة والمحیط والتتمة الفتوی علی قوله، فقد اختلف الافتاء وقد سمعت

(۱)

ما فی الخیریة. (شامی ج: ۵ ص: ۴۰ و ۴۱)۔

قلت: وحيث اختلف الافتاء ورجحان الشامي الى قولهما ظاهر فالأولى في عصرنا الافتاء بقولهما صيانة لأموال الناس وتحرزاً عن الوقوع في فتنة التأمين الذي هو مركب من الربا والقمار۔

واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۷/۶/۱۳ھ

(فتویٰ نمبر ۶۱۷/۲۸ ب)

واقعے کی صحیح صورتِ حال چھپانے کی وجہ سے کسی کا حق

ضائع ہونے اور اس کے ضمان کا حکم

سوال:- میرے زندہ بھائی وحید الدین نے مجھے خود تقریباً پانچ سال ہوئے ذکر کیا کہ بھائی صاحب! پٹواری اللہ بخش نے ایک بات مجھ سے کہی تھی کہ: ”بلغ الدین کے یونٹوں (جس پر کہ زمین الاٹ اور قبضہ ملتا ہے) کا یہ سرٹیفکیٹ آگیا ہے، (جو پٹواری مذکورہ کے ہاتھ میں تھا اور میرے بھائی نے خود وہ سرٹیفکیٹ دیکھا ہے) تو اس پر جو زمین مل سکتی ہے نصف آپ یعنی وحید الدین لے لیں اور آدھی میں (پٹواری) لے لوں۔“ تو میں نے (وحید الدین نے) پٹواری سے کہا کہ: ”یہ تو معاملہ میرے بھائی کا ہے، ایسا تو میں نہیں کر سکتا، مگر ایسا کرو کہ اس سرٹیفکیٹ کو لاہور واپس بھیج دو۔“ اب پٹواری کو موقع مل گیا، سننے میں وثوق سے آیا ہے کہ پٹواری نے اُس سرٹیفکیٹ سے بالائی بالائی طریقے پر زرعی زمین حاصل کر کے فروخت کر دی جس کی مجھ کو خبر ایک زمین دار نے دی، جو خود یقینی شاہد ہے، مگر مدد کرنے سے قاصر ہے، اور یہ خبر زمین دار نے سوا سال بعد دی، اور اسی مدت کے بعد میرے بھائی وحید الدین نے یہ خبر مجھ کو سنائی، چونکہ محکمہ بحالیات ختم ہو گیا تو میں لاہور بھی تحقیقات نہیں کر سکا، اس میرے حقیقی بھائی کے اخفا کرنے سے مجھ کو دس ایکڑ زمین کا نقصان ہوا، اُن کو فوراً مجھے خبر کرنا چاہئے تھا تا کہ پٹواری

(۱) رد المحتار، کتاب الاجارة، باب ضمان الأجير ج: ۶ ص: ۲۵ (طبع سعید).

وفي مجمع الضمانات ج: ۱ ص: ۲۶۲ ان الأجير المشترك ضامنٌ عنده ما هلك بغير صنعه فاذا كان الثوب في ضمانه كان الضمان عليه ما لم يعلم أنه تخرق من ذق صاحب الثوب وروى بشر عن أبي يوسف أن القصار يضمن نصف النقصان ويعتبر فيه الأحوال وأما على قول أبي حنيفة ينبغي أن لا يجب الضمان في فعل القصار لأن عنده الثوب أمانة عند القصار وليس بمضمون.

وفي الهندية، كتاب الاجارة، الباب الثامن والعشرون في بيان حكم الأجير الخاص والمشارك... الخ ج: ۴ ص: ۵۰۰ (طبع رشيدية كوئٹہ) وحكم الأجير المشترك ان ما هلك في يده من غير صنعه فلا ضمان عليه في قول أبي حنيفة وهو قول زفر والحسن وأنه قياس.... الخ.

سے سرٹیفکیٹ لے لیتا، یا خود لاہور جا کر اس کی نقل نکالتا، اس پر بھائی نے کہا کہ ”میں نے غلطی کی آپ سے اس واقعے کا ذکر کیا“ اس پر میں نے جواب میں کہا کہ: ”یہ تمہاری اور حماقت ہے“ میں نے کلیم لاہور میں یونٹ بننے کے لئے کر دیا تھا، کچھ تو بن کر آگئے تھے، کچھ غلطی سے رہ گئے تھے، تو بعد میں بقایا یونٹ آئے تو پٹواری کے ہاتھ لگ گئے اور اس کا تذکرہ بھائی وحید الدین نے اُس سے کیا تھا کہ مل بانٹ کر یہ زمین حاصل کر لیں گے، اب میں نے بھائی وحید الدین کو لکھا ہے کہ اس کی پوری ذمہ داری تم پر ہوتی ہے لہذا آپ اپنی ملکیت والی زمین سے اتنا واپس دیں یا قیامت میں اللہ پاک کی عدالت میں یہ معاملہ پیش ہوگا، میرے حقیقی بھائی وحید الدین صاحب کہاں تک شرعاً ذمہ دار ہیں؟

جواب:- صورتِ مسئلہ میں آپ کے بھائی وحید الدین صاحب نے آپ کی بدخواہی کر کے گناہ کیا،^(۱) جس پر انہیں توبہ و استغفار کرنا چاہئے،^(۲) اور آپ سے معافی مانگنی چاہئے، لیکن ان پر اس زمین کا کوئی تاوان واجب نہیں ہے، کیونکہ انہوں نے پٹواری کو محض مشورہ دیا تھا، زمین کے ضائع کرنے میں اُن کا براہِ راست دخل نہیں۔^(۳)

واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم

ھ ۱۳۹۷/۱/۲۱

(فتویٰ نمبر ۱۵۳/۲۸ الف)

سرکاری گاڑی بغیر اجازت دوسرے کاموں میں استعمال کرنے کا حکم

سوال:- بعض سرکاری ملازم کو گاڑی، ویگن وغیرہ سرکاری کام کے لئے ملی ہوئی ہوتی ہے، وہ ملازم بعض مواقع پر اپنے رشتہ دار اور واقف کار سوار یوں کو بھی بٹھا لیتا ہے، رشتہ داروں کا سامان رکھ کر ادھر ادھر پہنچا دیتا ہے، بغیر اجازت ایسا کرنا جائز ہے؟

جواب:- آپ نے صحیح سمجھا، بغیر اجازت اس گاڑی کو ذاتی کاموں میں خود استعمال کرنا یا کسی اور سے کروانا جائز نہیں۔^(۴)

واللہ سبحانہ اعلم

ھ ۱۳۹۷/۹/۱۸



(۱) وفی مسند احمد رقم الحدیث: ۱۹۰۵۳ ج: ۱۴ ص: ۳۹۷ و ۳۹۸ (طبع دار الحدیث القاہرہ) عن جریر رضی اللہ عنہ قال: أتیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فقلت: ابایعک علی الإسلام! فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم واشترط علی النصح لکل مسلم فبايعته علی هذا ورب هذا المسجد انی لکم لناصح جمیعاً ثم استغفر ونزل.

(۲) فتح القدیر، کتاب الغصب ج: ۸ ص: ۲۴۳ و ۲۴۴ (طبع رشیدیہ) الغصب فی اللغة: أخذ الشيء من الغير علی سبیل التغلب للاستعمال فیہ. وفی الشریعة: أخذ مال متقوم محترم بغیر اذن المالك علی وجه یزیل یدہ.

(۳) فی الدر ج: ۶ ص: ۲۰۰ لا يجوز التصرف فی مال غیرہ بلا اذنه ولا ولايته... اھ.

کتاب الجہاد

(جہاد اور قتال کے مسائل کا بیان)

مسلم علاقے پر قبضہ کرنے والے کافر حکمران سے مسلمانوں کو طاقت ہونے کی صورت میں جہاد کرنا چاہئے، نیز ایسے حکمران کے ماتحت ملازمت اور حقوق حاصل کرنے کا حکم (فارسی فتویٰ)

سوال ۱:- حکمران کافر چند قریٰ و امصار را بتغلب و استیلا از دست مسلمانان سلب کرد و رعایای مسلمانان کہ مغلوب قوانین او هستند دران ادیاری باشند و ہماں حکمران بعد از سلب دیار با ایشان حیلے ترحم دارد، و نحشہا می کند، مگر اینکہ ہمیشہ در پئے آنست کہ قوانین اسلامی را از بین ببرد و کفر و زندقہ جاری گرداند مگر سیاست و تلطف، نہ بزور و زجر مثلاً تعلیم جدید خود و آزادی زنان و افشائے زنا و شراب و سینما و غیر ہا ترویج می دہد، و مدارس دینی و پردہ راضی نیست، آیا با این حکمران و دستگاہان او چون محاربین در ترک موالات و غیرہ زندگی باید کرد یا کہ نہ؟

سوال ۲:- واز ادا رہائے اوقافیہ شان مزدور شدہ و حقوق گرفتن و در ساز مانہائے جدید دادہ حقوق گرفتن بغرض آنکہ اصلاح بچگان مسلمان بکنند و دیگر مامور و مزدوری نزدشان کردن جائز است یا کہ نہ؟ و درین پول حقوق کدام قسم حرمت یا کراہت یا شب می آید یا نہ؟ و بالخصوص علماء و مقتدیاں یاں را این افعال چگونہ اند۔

سوال ۳:- و اگر اینہا بہ مسلمانی پول بدہند کہ برائے من حج کن آیا احرام باہنہا یا بہمان پول و احرام بخود بفریب بستن روا است یا نہ؟

سوال ۴:- تعلقات با کفار قائم کردن و تعظیم شعائر کفر روا است؟

سوال ۵:- و اعانت این حکمران را در مدرسہ اسلامیہ گرفته استعمال کردہ روا است یا نہ؟

سوال ۶:- و اگر مرتکب امور مذکورہ کدام اہل علمی یا شیخی باشد، بہ او چہ اعتقاد باید کرد و آیا ملامت او غیبت او و تردید ایں عمل را چہ حکم دارد۔ بینوا تو جروا۔

جواب ۱:- اگر مسلمانان را چندے قوت و استطاعت ہست کہ با او محاربہ کردہ حکومتش را زائل نمایند و حکومت اسلامی قائم کنند، بر مسلمانان حکومت اسلامی قائم کردن واجب است،^(۱) و اگر آنها چنین استطاعت و قوت نہ دارند، پس آنها را صبر باید کرد، تا آنکہ قوت حاصل شود،^(۲) و اندرین زمانہ مغلوبیت انتظامات مناسب برائے حفاظت دین واجب ہستند، چوں تعمیر مساجد و اقامت مدارس دینی و وعظ و تبلیغ، تاکہ مسلمانان بر ایمان سلامت باشند، و اگر آں حکمران بر ترک احکام دینی جبر و تشدد نماید، و استطاعت مقاومت او نہ باشد پس اندران وقت ہجرت بر مسلمین واجب شود۔^(۳)

(۱ تا ۳) وفي بدائع الصنائع، كتاب السير ج: ۷ ص: ۹۸ وأما بيان من يفترض عليه فنقول أنه لا يفترض إلا على القادر عليه فمن لا قدرة له لا جهاد عليه، لأن الجهاد بذل الجهد وهو الوسع والطاقة بالقتال أو المبالغة في عمل القتال ومن لا وسع له كيف يبذل الوسع.

وفي الهندية، كتاب السير، الباب الأول في تفسيره ج: ۲ ص: ۱۸۸ (طبع رشيدية) وأما شرائط اباحتها فشيان أحدهما امتناع العدو عن قبول ما دعى اليه من الدين الحق وعدم الامان والعهد بيننا وبينهم والثاني ان يرجوا الشوكة والقوة لأهل الاسلام باجتهاده لما فيه من القاء نفسه في التهلكة وكذا في البحر الرائق، كتاب السير ج: ۵ ص: ۷۲ (طبع سعید).

وفي الدر المختار، كتاب الجهاد ج: ۳ ص: ۱۲۷ (طبع سعید) ولا بد لفرضيته من قيد آخر هو الاستطاعة وشرط لوجوبه القدرة على السلاح لا أمن الطريق فان علم أنه اذا حارب قتل وان لم يحارب أسر لم يلزمه القتال الخ. وفي بدائع الصنائع ج: ۷ ص: ۹۸ فأما اذا عمّ النفي بان هجم العدو على بلد فهو فرض عين يفترض على كل واحد من آحاد المسلمين ممن هو قادر عليه الخ.

(۳) وفي تفسير المدارك ج: ۱ ص: ۳۳۲ (طبع قديمي) والآية (أَلَمْ تَكُنْ أَرْضُ اللَّهِ وَسِعَةً فَتُهَاجِرُوا فِيهَا) تدل على أن من لم يتمكن من اقامة دينه في بلد كما يجب وعلم أنه يتمكن من اقامته في غيره حقت عليه المهاجرة. وفي التفسيرات الأحمدية ص: ۳۰۵ (طبع كريمي كتب خانہ بمبئی) وفي هذا الزمان ان لم يتمكن من اقامة دينه بسبب أيدي الظلمة أو الكفرة يفرض عليه الهجرة وهو الحق.

وفي أحكام القرآن للقرطبي ج: ۵ ص: ۳۳۲ (طبع دار الكتاب العربي) الهجرة وهي الخروج من دار الحرب الى دار الاسلام وكانت فرضاً في أيام النبي صلى الله عليه وسلم وهذه الهجرة باقية مفروضة الى يوم القيامة. وكذا في التفسير المظهر ج: ۲ ص: ۲۰۷ (طبع حافظ كتب خانہ کوئٹہ).

وفي تكملة فتح الملهم، كتاب الامارة ج: ۳ ص: ۳۷۳ (طبع مكتبة دارالعلوم كراچی) الأول قادر على الهجرة منها لا يمكنه اظهار دينه ولا أداء واجباته فالهجرة منه واجبة الخ.

وفي عمدة القارى شرح صحيح البخارى، باب المداراة مع الناس ج: ۲۲ ص: ۲۶۲ (طبع دار احياء التراث العربى بيروت) المداينة محرمة والفرق بينهما أن المداينة هي أن يلقي الفاسق المعلن بفسقه فيؤالفه ولا ينكر عليه ولو بقلبه. وفيها أيضاً باب ما قيل في ذى الوجهين ج: ۲۲ ص: ۲۰۱ (طبع دار احياء التراث العربى بيروت) المداينة المحرمة وسمى ذو الوجهين مداينة لأنه يظهر لأهل المنكر فيخلطه لكلا الطائفتين واظهاره الرضى بفعلهم استحق اسم المداينة واستحق الوعيد الشديد أيضاً.

وفي فتح البارى، باب المداراة مع الناس ج: ۱ ص: ۳۱۷ المداينة محرمة والفرق أن المداينة من الذهان وهو الذى يظهر على الشئ ويستتر باطنه وفسرها العلماء بأنه معاشرة الفاسق واظهار الرضاء بما هو فيه من غير انكار عليه. (باقى الكلى صفحہ پر)

جواب ۲:- زیر حکومت آن حکمران کافر ملازمت کردن و پول حقوق گرفتن جائز است بشرطیکه آن خدمت فی نفسها حرام و ناجائز نه باشد و دران اعانت معصیت لازم نیاید اندرین پول هیچ کراهت نیست۔

جواب ۳:- سوال واضح نیست حکمران کافر چرا گوید که ”برائے من حج کن“۔

جواب ۴:- در صورت عدم استطاعت محاربه تعلقات با کفار قائم کردن رواست البتہ مداهنت و تشبه با کفار و تعظیم شعائر کفر بدون حالت اضطرار جائز نیست۔

جواب ۵:- رواست۔

(بقیه حاشیه صفر گزشتہ)..... وفی شرح ابن بطال، الباب رقم: ۸ ج: ۱۵ ص: ۲۷۰ قال المؤلف لا ينبغي لمؤمن أن يثني على سلطان أو غيره في وجهه وهو عنده مستحق للذم ولا يقول بحضرته بخلاف ما يقول إذا خرج من عنده لأن ذلك نفاق كما قال ابن عمر وقال فيه صلى الله عليه وسلم: ”شر الناس ذو الوجهين“ وقال: انه لا يكون عند الله وجهًا لأنه يظهر لأهل الباطل الرضا عنهم ويظهر لأهل الحق مثل ذلك ليرضى كل فريق منهم ويريه أنه منهم وهذه المداهنة محرمة على المؤمنين.

وفی مرقاة المفاتیح شرح مشکوٰۃ، باب الأمر بالمعروف ج: ۹ ص: ۳۳۱ (طبع مکتبه امدادیہ ملتان) المداهنة فی الشریعة أن یرى منکرًا و یقدر علی دفعه ولم یدفعه حفظًا لجانب مرتکبه أو جانب غیره لخوف أو طمع أو لاستحياء منه أو قلة مبالاة فی الدین... الخ.

وفی بدائع الصنائع، فصل فی بیان ما یعترض من.... الخ ج: ۱۵ ص: ۳۳۹ أن ذلك مباح فكان اظهار شعائر الکفر فی مکان معد لاظهار شعائر الاسلام وهو أمصار المسلمین فیمنعون من ذلك وكذا یمنعون من ادخالها فی أمصار المسلمین ظاهرًا..... ولا یمکنون من اظهار صلیبهم فی عیدهم لأنه اظهار شعائر الکفر فلا یمکنون من ذلك فی أمصار المسلمین..... والخنزیر والصلیب وضرب الناقوس فی قرية أو موضع لیس من أمصار المسلمین ولو کان فیہ عدد کثیر من أهل الاسلام وأنما یمکره ذلك فی أمصار المسلمین وهی التي یقام فیها الجمع والأعیاد والحدود لأن المنع من اظهار هذه الأشياء لکونه اظهار شعائر الکفر فی مکان اظهار شعائر الاسلام فیختص المنع بالمكان المعد لاظهار شعائر.... الخ. وفیه بعد صفحة..... الممنوع اظهار شعائر الکفر فی مکان اظهار شعائر الاسلام وهو أمصار المسلمین.

وفی البحر الرائق، بیع العصیر من خمار ج: ۸ ص: ۲۰۲ و ۲۰۳ (طبع سعید) لا یمکنون من ذلك فی الأمصار ولا یمکنون من اظهار بیع الخمر والخنزیر فی الأمصار لظهور شعائر الاسلام فلا یعارض بظهور شعائر الکفر قالوا فی هذا سواد الکوفة لأن غالب أهلها أهل ذمة.

وفی تبیین الحقائق شرح الكنز ج: ۴ ص: ۱۶۳ (طبع سعید) باب العشر والخراج والجزية: الأمصار هی التي تقام فیها شعائر الاسلام فلا یعارض باظهار ما یخالفها ولهذا یمنعون من بیع الخمر والخنزیر وضرب الناقوس خارج الكنيسة فی الأمصار لما قلنا ولا یمنعون من ذلك فی قرية لا تقام فیها الجمع والحدود وان کان فیها عدد کثیر لأن شعائر الاسلام فیها غیر ظاهرة وقیل یمنعون فی کل موضع لم تشع فیہ شعائرهم لأن فی القرى بعض الشعائر فلا تعارض باظهار ما یخالفها من شعائر الکفر.... الخ.

وفی الفتاوی الکبری (من یفعل من المسلمین مثل طعام.... الخ)..... قد ذهب طائفة من العلماء الی کفر من یفعل هذه الأمور لما فیها من تعظیم شعائر الکفر..... الخ.

جواب: ۶- جواب اس سوال از اجوبہ سابقہ واضح ہست۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۱۳۹۶/۱۱/۱۷ھ

(فتویٰ نمبر ۲۵۵۴/۲۷ و)

(ترجمہ) سوال:- کسی کافر حکمران نے زبردستی مسلمانوں سے چند بستیاں اور شہر چھین لئے، اور مسلمان رعایا جو اُس کے قوانین کے ماتحت ہیں وہ انہی شہروں میں رہتے ہیں اور وہ حکمران علاقے چھین لینے کے بعد ان کے ساتھ بہت نرمی برتا ہے اور بہت بخشش (یعنی عطایا، حسن سلوک) کرتا ہے۔

لیکن وہ ہمیشہ اس کے درپے رہتا ہے کہ اسلامی قوانین کو ختم کر دے، اور کفر و زندیقیت کو رواج دے، مگر یہ سب کچھ وہ سیاست اور نرمی سے کرے نہ کہ اپنی طاقت اور سختی کے بل بوتے پر، مثلاً اپنی بنائی ہوئی جدید تعلیم، عورتوں کی آزادی، کھلے عام زنا، شراب کا استعمال اور سینما وغیرہ کو ترویج دے اور دینی مدارس اور پردے پر راضی نہ ہو۔ تو کیا اس حکمران اور اس کے حواریوں کے ساتھ محاربین کی طرح زندگی گزار سکتے ہیں یا نہیں؟ مثلاً ترک موالات کیا جائے یا نہیں؟

۲:- ان کے محکمہ اوقاف کے اداروں میں مزدوری کرنا اور حقوق حاصل کرنا اور دیگر حقوق لینا اس غرض سے کہ مسلمان بچوں کی اصلاح کریں، دیگر معاملات اور نوکری کرنا ان کے ہاں جائز ہے یا نہیں؟ اور اس تنخواہ کے پیسوں میں کسی قسم کی حرمت، کراہت یا شبہ آتا ہے یا نہیں؟ بالخصوص علماء اور مقتدیوں کی شان میں یہ افعال کیسے ہیں؟

۳:- اگر ان میں سے کوئی کسی مسلمان کو پیسے دیں اور کہے کہ میری طرف سے حج کرو تو کیا ان کے حج کے احرام کو جو انہی کے پیسوں سے ہیں اپنے لئے دھو کے کے ساتھ احرام باندھ سکتے ہیں یا نہیں؟

۴:- کفار کے ساتھ تعلقات قائم رکھنا جائز ہے یا نہیں؟ اور شعائر کفر کی تعظیم کرنا جائز ہے یا نہیں؟

۵:- اس حکمران کے مالی تعاون کو لے کر اسلامی مدارس پر خرچ کیا جائے تو یہ جائز ہے یا نہیں؟

۶:- اگر ان مذکورہ امور کا مرتکب کوئی اہل علم ہو یا کوئی شیخ ہو تو اس کے بارے میں کیا اعتقاد رکھنا چاہئے؟ اسی طرح اس کو ملامت کرنا، اس کی غیبت کرنا اور اس کے اس عمل کی تردید کا کیا حکم ہے؟ بینوا تو جروا۔

(ترجمہ) جواب:- اگر مسلمانوں میں اتنی قوت و طاقت ہو کہ اس کے ساتھ جہاد کر کے اس کی حکومت کو ختم کر دیں اور اسلامی حکومت نافذ کریں، تو مسلمانوں پر اسلامی حکومت کا قیام واجب ہے۔

لیکن اگر اُن میں اتنی قوت و طاقت نہ ہو کہ اُس کی حکومت کو ختم کر سکیں تو ان کو صبر کرنا چاہئے، یہاں تک کہ ان کو اس کی قوت حاصل ہو جائے، اور اس مغلوبیت کے دور میں بھی اُن پر حفاظتِ دین کے لئے مناسب اقدامات کرنا واجب ہے، مثلاً مساجد کی تعمیر، دینی مدارس کا قیام اور وعظ و تبلیغ وغیرہ تاکہ مسلمان ایمانِ سالم پر رہی رہیں۔

اور اگر وہ کافر حکمران احکامِ دینیہ کے ترک پر جبر و تشدد کرے اور مسلمانوں میں اُس کے مقابلے کی سکت نہ ہو تو اُس وقت اُن پر ہجرت کرنا واجب ہو جائے گا۔

۲:- اُس کافر حکمران کی ماتحتی میں ملازمت کرنا، اور اپنے حق کی تنخواہ لینا جائز ہے، بشرطیکہ وہ خدمت و ملازمت بنفسہ حرام اور ناجائز نہ ہو، اور اُس ملازمت میں معصیت کی اعانت بھی لازم نہ آئے، اور اس پیسے میں کوئی کراہت نہیں ہے۔

۳:- یہ سوال واضح نہیں، یعنی وہ بادشاہ (کافر حکمران) یہ کیوں کہہ رہا ہے کہ میرے لئے حج کرو۔

۴:- اگر کفار کے ساتھ جہاد کرنے کی طاقت نہیں، تو اس صورت میں اُن کے ساتھ تعلقات قائم کرنا جائز ہے، البتہ یہ بات ہے کہ تہبہ بالکفار، مہانت اور شعائر کفر کی تعظیم کرنا حالتِ اضطرار کے بغیر جائز نہیں ہے۔

۵:- جائز ہے۔

۶:- اس سوال کا جواب سابقہ اجوبہ سے معلوم ہو چکا۔

عراق میں امریکی افواج کے تعاون کے لئے پاکستانی افواج بھیجنے کا حکم

سوال :- حکومت پاکستان، امریکا کی درخواست پر پاکستانی افواج عراق بھیجنے کا ارادہ کر رہی ہے، کیا حکومت پاکستان کے لئے جائز ہے کہ وہ اپنی افواج عراق بھیج کر امریکا کے ساتھ تعاون کرے؟
جواب :-

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ، وَالصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ عَلٰی رَسُوْلِهِ الْکَرِیْمِ، وَعَلٰی اٰلِهٖ
وَاصْحَابِهٖ اَجْمَعِیْنَ وَعَلٰی کُلِّ مَنْ تَبِعَهُمْ بِاِحْسَانٍ اِلٰی یَوْمِ الدِّیْنِ.

موجودہ حالات میں جبکہ عراق پر امریکا نے سراسر ظالمانہ قبضہ کیا ہوا ہے، حکومت پاکستان یا کسی بھی مسلمان حکومت کے لئے ہرگز جائز نہیں ہے کہ ان کے تعاون کے لئے وہاں اپنی فوجیں بھیجے، جس کی مندرجہ ذیل وجوہ بالکل واضح ہیں :-

۱:- امریکا نے عراق پر حملہ کر کے جس طرح ظلم و بربریت کا مظاہرہ کیا ہے، اور نہ صرف اسلام بلکہ دنیا بھر کے مسلم قانونی اور اخلاقی ضابطوں کو پامال کرنے کی متکبرانہ جسارت کی ہے، اس کے کہنے پر وہاں فوجیں بھیجنا، اس کے اس سراسر ظالمانہ حملے کی تائید ہے، جس کے حرام ہونے پر دلائل قائم کرنے کی ضرورت نہیں۔

۲:- امریکا عراق پر اپنا تسلط قائم کرنے کے بعد وہاں اپنے قبضے کو مستحکم کرنے اور اپنے مذموم مقاصد کے حصول کے لئے مختلف ملکوں سے اپنی فوجیں بھیجنے کی درخواست کر رہا ہے، شرعی نقطہ نظر سے صورت حال یہ ہے کہ اگر کسی مسلمان ملک پر کوئی غیر مسلم قوم حملہ کرے، تو ضرورت کے وقت تمام مسلمانوں پر اس کا دفاع واجب ہے، اور اگر کوئی غیر مسلم قوم مسلمان ملک پر قبضہ کر لے، تو تمام مسلمان حکومتوں پر واجب ہے کہ اس قبضے کو جلد از جلد ختم کرانے کے لئے تمام ممکنہ وسائل بروئے کار لائیں، ظاہر ہے ایسے حالات میں قبضہ ختم کرانے کے بجائے اس ظالمانہ قبضے کو مزید مستحکم کرانے کی کوشش سراسر حرام اور ناجائز ہے۔

۳:- امریکا کے عراق پر فوجی طاقت مسلط کرنے کے باوجود عراق کے مسلمان امریکی قبضے کی مسلسل مزاحمت اور مقاومت کر رہے ہیں، جس کا انہیں پورا حق حاصل ہے، ایسے حالات میں عالم اسلام کا فرض ہے کہ وہ ان عراقی مسلمانوں کی مدد اور حمایت کرے۔ اس صورت حال میں اپنی فوجوں کو امریکا کے زیرِ کمان دینے کا نتیجہ یقیناً یہ ہوگا کہ مسلمان فوجوں کو ان عراقی مسلمانوں کے مد مقابل لاکھڑا

کیا جائے۔ یہ دعویٰ کہ افواجِ پاکستان کو عراق میں قیام امن کے لئے دعوت دی جا رہی ہے، خود اس بات کا اعتراف ہے کہ انہیں عراق کے ان مسلمانوں سے ٹکرایا جائے گا، جو امریکی قبضے کے خلاف جدوجہد کر رہے ہیں۔ مسلمانوں کے مقابلے میں غیر مسلم غاصبوں کی امداد قرآن و سنت کی صریح نصوص کے بالکل خلاف ہے، جس کے حرام ہونے میں کسی مسلمان کو شبہ نہیں ہو سکتا، قرآن کریم کا واضح ارشاد ہے:-

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا عَدُوِّي وَعَدُوَّكُمْ أَوْلِيَاءَ تُلْقُونَ إِلَيْهِم بِالْمَوَدَّةِ وَقَدْ كَفَرُوا بِمَا جَاءَكُمْ مِنَ الْحَقِّ. (الممتحنة: ۱)

ترجمہ:- اے ایمان والو! میرے دشمن اور اپنے دشمن کو اپنا ولی نہ بناؤ کہ ان سے دوستی کے ڈول ڈالنے لگو جبکہ انہوں نے اس حق کا انکار کیا ہے جو تمہارے پاس آیا ہے۔

یہ آیت جس واقعے کے سلسلے میں نازل ہوئی ہے، اس میں حضرت حاطب بن ابی بلتعہ رضی اللہ عنہ نے صرف اتنا کیا تھا کہ ان کے جو اعرزہ اقرباء مکہ مکرمہ میں مقیم تھے ان کی مصلحت کے پیش نظر کفارِ مکہ کو یہ خبر بھیجی چاہی تھی کہ ان پر حملے کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ (صحیح بخاری^(۱))

اگرچہ اس واقعے سے مسلمانوں کو کوئی قابل ذکر نقصان نہیں پہنچا، لیکن قرآن کریم کی مذکورہ بالا آیات نے اس اقدام پر شدید گرفت فرمائی (تفسیر ابن کثیر ج: ۴ ص: ۳۳۵)^(۲) اور آئندہ کے لئے یہ مستقل قانون بنادیا کہ غیر مسلم طاقتوں سے بے گناہ مسلمانوں کے مفاد کے خلاف تعاون اور دوستی کسی صورت جائز نہیں۔ اسی سورت میں آگے اللہ تعالیٰ نے اس مسئلے کی مزید وضاحت اس طرح فرمائی ہے:-

لَا يَنْهَاكُمُ اللَّهُ عَنِ الَّذِينَ لَمْ يُقَاتِلُوكُمْ فِي الدِّينِ وَلَمْ يُخْرِجُوكُمْ مِنْ دِيَارِكُمْ أَنْ تَبَرُّوهُمْ وَتُقْسِطُوا إِلَيْهِمْ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِينَ. إِنَّمَا يَنْهَاكُمُ اللَّهُ عَنِ الَّذِينَ قَاتَلُوكُمْ فِي الدِّينِ وَأَخْرَجُوكُمْ مِنْ دِيَارِكُمْ وَظَهَرُوا عَلَىٰ إِخْرَاجِكُمْ أَنْ تَوَلَّوْهُمْ وَمَنْ يَتَوَلَّهُمْ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ. (الممتحنة: ۸، ۹)

ترجمہ:- اللہ تعالیٰ تمہیں اس بات سے نہیں روکتا کہ جن (کافر) لوگوں نے تم سے دین کے معاملے میں جنگ نہیں کی، اور تمہیں تمہارے گھروں سے نہیں نکالا، ان کے ساتھ تم حسن سلوک اور انصاف کا معاملہ کرو، بے شک اللہ تعالیٰ انصاف

(۱) الصحيح للبخاری باب غزوة الفتح وما بعث حاطب بن أبي بلتعہ الى أهل مكة يخبرهم بغزو النبي صلى الله عليه وسلم رقم الحديث: ۲۷۸۵ ج: ۲ ص: ۶۱۲ (طبع قديمی کتب خانہ)

(۲) (طبع قديمی کتب خانہ).

کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔ ہاں اللہ تعالیٰ تمہیں اس بات سے روکتا ہے کہ جن لوگوں نے تم سے دین کے معاملے میں لڑائیاں کیں اور تمہیں تمہارے گھروں سے نکالا اور تمہارے نکالے جانے کے لئے ایک دوسرے کی مدد کی، ایسے لوگوں کے تم معاون بنو، اور جو ان کی معاونت کرے تو ایسے ہی لوگ ظالم ہیں۔

ان آیات میں پوری صراحت کے ساتھ ایسے غیر مسلموں کی ہم نوائی اور اعانت کو حرام قرار دیا گیا ہے جو مسلمانوں سے جنگ کریں اور انہیں خانماں برباد کریں، یا اس کام میں ان کے ساتھ تعاون کریں۔ امریکا نے خود بھی ہزار ہا مسلمانوں کو وحشیانہ طریقے پر بربریت کا نشانہ بنایا ہے اور ہزار ہا مسلمانوں کو خود بھی بے گھر کیا ہے، اور اسرائیل کی بھرپور مدد بھی کی ہے جو سا لہا سال سے ان جرائم کا مرتکب ہے، لہذا وہ اس آیت کے مفہوم میں بلا شک و شبہ داخل ہے، اور اس کی اعانت پر یہ آیت مکمل طور سے صادق آتی ہے۔ مسلمانوں کے خلاف کافروں سے دوستانہ تعاون کی حرمت متعدد آیات میں مختلف عنوانات سے بیان فرمائی گئی ہے، خاص طور پر مندرجہ ذیل آیات کریمہ مسلمانوں کے لئے سرمہ بصیرت ہیں:-

الَّذِينَ يَتَّخِذُونَ الْكَافِرِينَ أَوْلِيَاءَ مِنْ دُونِ الْمُؤْمِنِينَ أَبِيتُوا عَنْهُمْ الْعِزَّةَ فَإِنَّ الْعِزَّةَ لِلَّهِ جَمِيعًا.
(النساء: ۱۳۹)

ترجمہ:- یہ وہ لوگ ہیں جو مومنوں کو چھوڑ کر کافروں کو دوست ہم نوا بناتے ہیں، کیا یہ ان کے پاس عزت تلاش کرتے ہیں؟ تو (یہ سمجھ لیں کہ) عزت تمام تر اللہ کے قبضے میں ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا الْكَافِرِينَ أَوْلِيَاءَ مِنْ دُونِ الْمُؤْمِنِينَ أَتُرِيدُونَ أَنْ تَجْعَلُوا لِلَّهِ عَلَيْكُمْ سُلْطَانًا مُبِينًا.
(النساء: ۱۴۴)

ترجمہ:- اے ایمان والو! مسلمانوں کو چھوڑ کر کافروں کو دوست نہ بناؤ، کیا تم چاہتے ہو کہ اللہ تعالیٰ کو اپنے خلاف ایک کھلی حجت دے دو؟

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُودَ وَالنَّصَارَى أَوْلِيَاءَ، بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ، وَمَنْ يَتَوَلَّهُمْ فإِنَّهُ مِنْهُمْ، إِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ.
(المائدة: ۵۱)

ترجمہ:- اے ایمان والو! یہود و نصاریٰ کو دوست نہ بناؤ، وہ ایک دوسرے کے دوست ہیں، اور تم میں سے جو کوئی انہیں دوست بنائے گا تو وہ انہیں میں شمار ہوگا، بے شک اللہ ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا الَّذِينَ اتَّخَذُوا دِينَكُمْ هُزُؤًا وَلَعِبًا مِّنَ الَّذِينَ
أُوتُوا الْكِتَابَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَالْكَفَّارَ أَوْلِيَاءَ وَاتَّقُوا اللَّهَ إِنَّ كُنتُمْ مُؤْمِنِينَ.

(المائدة: ۵۷)

ترجمہ:- اے ایمان والو! تم سے پہلے جن لوگوں کو کتاب دی گئی، ان میں سے
جنہوں نے تمہارے دین کو ہنسی کھیل بنایا ان کو اور کافروں کو دوست نہ بناؤ، اور
اللہ سے ڈرو اگر تم مؤمن ہو۔

۴:- مذکورہ بالا آیات اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بہت سے ارشادات کی روشنی میں
فقہائے امت نے یہ اصول بیان فرمایا ہے کہ کسی مشترک دشمن کے خلاف بھی غیر مسلموں سے مدد لینا یا
ان کی مدد کرنا صرف اس صورت میں جائز ہے جب وہ غیر مسلم مسلمانوں کے پرچم تلے جنگ کریں،
اور جنگ کے نتیجے میں مسلمانوں کا حکم غالب ہو۔ امام ابو بکر جصاص رحمہ اللہ سورہ نساء کی مذکورہ بالا
آیت کے تحت فرماتے ہیں:-

وهذا يدل على انه غير جائز للمؤمنين الاستنصار بالكفار على غيرهم من
الكفار اذ كانوا متي غلبوا كان حكم الكفر هو الغالب.

(۱) (احكام القرآن ج: ۲ ص: ۳۵۲)

ترجمہ:- اس آیت سے معلوم ہوا کہ مسلمانوں کے لئے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ کفار
کے مقابلے میں دوسرے کفار سے ایسی حالت میں مدد لیں جب فتح کی صورت
میں کفر کا حکم غالب ہو۔

نیز امام محمد رحمہ اللہ ”السير الكبير“ میں فرماتے ہیں:-

لا بأس بأن يستعين المسلمون بأهل الشرك على أهل الشرك اذا كان
حكم الاسلام هو الظاهر عليهم. (شرح السير الكبير ج: ۳ ص: ۱۸۶)

ترجمہ:- مسلمان اگر اہل شرک کے مقابلے میں دوسرے اہل شرک سے مدد لیں تو
اس میں اس وقت کچھ حرج نہیں ہے جب اسلام کا حکم ان پر غالب ہو۔

دوسری طرف اگر کوئی غیر مسلم قوم کسی دوسری غیر مسلم قوم سے لڑنے کے لئے مسلمانوں کو
دعوت دیں تب بھی اصل حکم یہی ہے کہ مسلمانوں کے لئے ان میں سے کسی بھی فریق کی مدد کرنا جائز

(۱) باب استنابة المرتد (تحت آية) بَشِّرِ الْمُنَافِقِينَ بِأَنَّ لَهُمْ عَذَابًا أَلِيمًا (الآية) ج: ۲ ص: ۳۶۱ (طبع دار الكتب
العلمية بيروت).

(۲) باب الاستعانة بأهل الشرك واستعانة المشركين بالمسلمين.

نہیں ہے۔ البتہ اگر اس بات کا اندیشہ ہو کہ اگر غیر مسلموں کی یہ دعوت قبول نہ کی گئی تو وہ خود مسلمانوں کو بھی قتل کر ڈالیں گے تب ان کی مدد کرنا جائز ہوگا۔ امام محمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں:-

لا ينبغي للمسلمين أن يقاتلوا أهل الشرك مع أهل الشرك ولو قال
أهل الحرب لا سراء فيهم قاتلوا معنا عدونا من المشركين وهم فاذا
كانوا يخافون أولئك الآخرين على أنفسهم فلا بأس بأن يقاتلوهم.^(۱)
ترجمہ:- مسلمانوں کے لئے جائز نہیں کہ وہ اہل شرک کی ایک جماعت کے ساتھ
مل کر دوسرے اہل شرک سے جنگ کریں اور اگر اہل حرب نے مسلمان قیدیوں
سے کہا کہ ہمارے مشرک دشمن سے ہمارے ساتھ لڑو اور وہ خود بھی مشرک ہے، تو
اگر ان قیدیوں کی ان مشرکوں کی طرف سے اپنی جان کا خوف ہو تو ان کے لئے
جائز ہوگا کہ وہ ان کے ساتھ مل کر ان کے دشمن مشرکوں سے لڑیں۔

(۲) (شرح السیر الکبیر ج: ۳ ص: ۲۴۱، ۲۴۲)

یہ سب کچھ اس وقت ہے جب غیر مسلموں کے ساتھ مل کر دوسرے غیر مسلموں سے جنگ کی
جاری ہو، لیکن اگر غیر مسلموں کے مقابلے میں مسلمان ہوں اور پھر غیر مسلم اپنے ساتھ مل کر اپنے
مد مقابل مسلمانوں سے لڑنے کی دعوت دیں، تو اس دعوت کا قبول کرنا حالتِ اضطرار میں بھی جائز نہیں
ہے، یعنی اگر مسلمانوں کو یہ اندیشہ ہو کہ اگر ہم نے غیر مسلموں کا یہ مطالبہ نہ مانا کہ ان کے ساتھ مل کر
دوسرے مسلمانوں سے لڑا جائے، تو یہ غیر مسلم خود ہمیں قتل کر ڈالیں گے، تب بھی ان کا یہ مطالبہ ماننا
مسلمان کے لئے جائز نہیں ہے، خواہ اسے خود اپنی جان دے دینی پڑے۔ امام محمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں:-

وان قالوا لهم قاتلوا معنا المسلمين ولا تقتلناكم، لم يسعهم القتال مع
المسلمين.

ترجمہ:- اور اگر وہ یہ کہیں کہ ہمارے ساتھ مل کر مسلمانوں سے لڑو ورنہ ہم تمہیں
قتل کر دیں گے، تب بھی ان کے لئے مسلمانوں سے جنگ کرنے کی اجازت
نہیں ہے۔

امام سرحسی رحمہ اللہ اس کی شرح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:-

لأن ذلك حرام على المسلمين بعينه فلا يجوز الاقدام عليه بسبب

التہدید بالقتل كما لو قال له: اقتل هذا المسلم ولا تقتلك.

(شرح السير ج: ۳ ص: ۲۴۲) (۱)

ترجمہ:- اس لئے کہ مسلمانوں کے لئے دوسرے مسلمانوں سے جنگ حرام لعینہ ہے، لہذا قتل کی دھمکی کی صورت میں بھی ایسا اقدام جائز نہیں، یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص کہے کہ اس شخص کو قتل کرو ورنہ میں تمہیں قتل کرتا ہوں (کہ اس دھمکی کی وجہ سے دوسرے کو قتل کرنا جائز نہیں)۔

خلاصہ یہ ہے کہ پاکستان کی افواج کو جن کے مقاصد وجود اور بنیادی اصولوں میں ”جہاد“ شامل ہے اور جن کے ملک کے دستور میں عالم اسلام کے مسلمانوں سے وفاداری کا عہد شامل ہے، عراق کے ان مسلمانوں کے خلاف صف آراء کر دینا جو امریکا کے جبر و استبداد اور اس کے ظالمانہ تسلط کے خلاف جان کی بازی لگائے ہوئے ہیں، قرآن و سنت کی صریح نصوص اور امت کے اجتماعی ضمیر کے خلاف تو ہے ہی، خود پاکستان کے دستور اور افواج پاکستان کے مقاصد کے بھی خلاف ہے۔ اور اگر خدا نخواستہ یہ سراسر ناجائز قدم اٹھایا گیا تو افواج پاکستان کی عزت و وقار اور ان کی نیک نامی پر ایک بدترین دھبہ لگانے کے مرادف ہوگا۔

واللہ سبحانہ اعلم

محمد تقی عثمانی

۱۴۲۳/۶/۱۲ھ

(فتویٰ نمبر ۸۶/۶۳۶)

الجواب صحیح

احقر محمود اشرف غفر اللہ لہ

۱۴۲۳/۶/۱۳ھ

الجواب صحیح

محمد رفیع عثمانی عفا اللہ عنہ

۱۴۲۳/۶/۱۲ھ

تحریک نظامِ مصطفیٰ کے جلوسوں میں مرنے والے

”شہید“ ہیں یا نہیں؟

سوال:- آج کل جو مسلمان نظامِ مصطفیٰ کی تحریکوں میں پولیس کی گولی سے مر رہے ہیں، یہ شہید ہیں یا نہیں؟ ایسے لوگوں کو غسل و کفن دیا جائے گا یا نہیں؟ یا انہی کپڑوں میں دفن کیا جائے گا جو وہ پہنے ہوئے ہیں؟

جواب:- جن لوگوں نے کسی عالم کے فتویٰ یا ترغیب کی بناء پر ان جلوسوں میں حصہ لیا اور نیک نیتی سے یہ سمجھ کر حصہ لیا کہ اسلام کے لئے جدوجہد کا یہی راستہ ہے، اور وہ ہلاک ہو گئے ان شاء اللہ اخروی احکام کے اعتبار سے وہ شہید ہوں گے، البتہ دنیوی احکام کے لحاظ سے شہید قرار پانے کے

لئے شرط یہ ہے کہ گولی لگنے یا زخمی ہونے کے فوراً بعد ان کی موت واقع ہوگئی ہو، اور زخمی ہونے کے بعد انہوں نے کچھ کھایا پیا نہ ہو، نہ کسی سے کوئی طویل بات چیت کی ہو، نہ ایک نماز کا پورا وقت پایا ہو، ایسے لوگوں کو غسل اور کفن کے بغیر نماز پڑھ کر دفن کیا جاسکتا ہے^(۱)، اور اگر یہ شرائط نہ پائی گئیں تو پھر غسل و کفن ضروری ہے^(۲)، وھذا لأن الخروج علی الحکومات الیوم أمر مجتہد فیہ، و حکمہ علی الاجتہاد، کما أن حجر بن عدی رحمہ اللہ خرج علی معاویۃ رضی اللہ عنہ بعد استقرار خلافتہ و کان ذلک اجتہاداً منہ وقد صرح السرخسی فی المبسوط أنه دفن فی ثیابہ۔^(۳)

واللہ سبحانہ اعلم

ھ ۱۳۹۷/۷/۲۴

(فتویٰ نمبر ۷۷۷/۲۸ ج)

خلیج کی لڑائی کی شرعی حیثیت اور اس میں کس فریق کی

جانب سے لڑنا ”جہاد“ تھا؟

سوال:- آپ صاحبان کو علم ہوگا کہ خلیج کے بحران کے بعد اب عراق اور امریکا اور اس کے اتحادیوں کی افواج کے درمیان جنگ جاری ہے، اور اس جنگ کے حقائق سے آپ صاحبان بخوبی

(۱ و ۲) وفي الدر المختار، باب الشهيد ج: ۲ ص: ۲۵۰ (طبع سعید) فينزع عنه ما لا يصلح للكفن ويزاد ان نقص ما عليه عن كفن السنة وينقص ان زاد لأجل ان يتم كفنه المسنون ويصلى عليه بلا غسل ويدفن بدمه و ثيابه لحديث زملوهم بكلوهم ... الخ.

وفيه أيضاً ص: ۲۵۰ الى ۲۵۱ ويغسل من وجد قتيلاً في مصر أو جرح وارث وذلك بأن أكل أو شرب أو نام أو تداوى ولو قليلاً أو أوى خيمة أو مضى عليه وقت صلوة وهو يعقل أو باع أو اشترى أو تكلم بكلام كثير وكل ذلك في الشهيد الكامل والأ فالمرث شهيد الآخرة.

وفي الشامية تحته ج: ۲ ص: ۲۵۲ (قوله في الشهيد الكامل) وهو شهيد الدنيا والآخرة وشهادة الدنيا بعدم الغسل إلا لنجاسة أصابته غير دمه كما في أبي السعود وشهادة الآخرة بنيل الثواب الموعود للشهيد الخ. وكذا في بدائع الصنائع ج: ۱ ص: ۳۲۳ (طبع سعید).

وفي المبسوط للسرخسي، باب الشهيد ج: ۲ ص: ۵۱ (طبع مطبع السعادة مصر) وقد ورد الأثر بغسل المرتث ومعناه والأصل فيه أن عمر رضي الله عنه لما طعن حمل إلى بيته فعاش يومين ثم غسل وكان شهيداً على لسان رسول الله صلى الله عليه وسلم وكذلك على رضي الله عنه حمل حياً بعد ما طعن ثم غسل وكان شهيداً وأما عثمان رضي الله عنه فاجهز عليه في مصرعه ولم يغسل فعرفنا بذلك ان الشهيد الذي لا يغسل من أجهز عليه في مصرعه دون من حمل حياً الخ. وكذا في البحر الرائق، باب الشهيد ج: ۲ ص: ۱۹۸ (طبع سعید).

(۳) وفي المبسوط للسرخسي، باب الشهيد ج: ۲ ص: ۵۰ (طبع مطبع السعادة مصر) قال ويكفن في ثيابه التي هي عليه لقول رسول الله صلى الله عليه وسلم زملوهم بدمائهم و كلوهم ولما استشهد عمار بن ياسر بصفين قال: لا تغسلوا عني دماً ولا تنزعوا عني ثوباً فأنى التقى ومعاوية بالجادة وهكذا نقل عن حجر بن عدی غیر آنہ ينزع عنه السلاح والجلد والفرو والحشو والخف والقلنسوة الخ.

واقف ہوں گے، ایک طرف عراق ہے جو کہ ایک اسلامی مملکت ہے، اور دوسری طرف مختلف ممالک ہیں جن میں امریکا سرفہرست ہے، اسی طرح برطانیہ اور فرانس بھی، لیکن ان کے علاوہ ان ممالک میں مسلم ملکیتیں بھی عراق کے سامنے صف بستہ ہیں، جن میں سعودی عرب، مصر، ترکی وغیرہ ممالک اسلامیہ شامل ہیں، کیا ایک پاکستانی مجاہد ان کی جنگ میں شرکت کر سکتا ہے یا نہیں؟ یعنی یہ جنگ اس مجاہد کے لئے جہاد فی سبیل اللہ ہے یا نہیں؟ اور اگر ہے تو کس طرف سے؟ یعنی سعودی عرب کی طرف سے یا عراق کی طرف سے؟ خیال رہے کہ جو ممالک عراق کا ساتھ دے رہے ہیں ان میں غیر مسلم مملکت کوئی نہیں ہے، براہ کرم شرعی حکم سے آگاہ فرمائیں۔

جواب:- خلیج کے علاقے میں جو جنگ جاری ہے وہ عالم اسلام کے لئے ایک بہت بڑا فتنہ ہے۔ اس میں شک نہیں ہے کہ ابتداءً عراق نے کویت پر قبضہ کر کے ایک سنگین غلطی کا ارتکاب کیا، جس کا شرعاً کوئی جواز نہ تھا، اور سعودی عرب کے لئے ایک مظلوم کی حیثیت سے کویت کی مدد کرنا اور اگر خود اس کے اپنے علاقے کو اسی قسم کے حملے کا خطرہ ہو تو اس کے دفاع کے لئے لڑنا بھی برحق تھا، بشرطیکہ جنگ کی قیادت خود اس کے یا کسی مسلمان ملک کے ہاتھ میں ہوتی، لیکن عملاً ہوا یہ کہ سعودی عرب نے جنگ کی مکمل کمان اور اس کی پالیسی کلی طور پر امریکا کے حوالے کر دی، اس لئے اب عراق کی حمایت میں لڑنا تو اس لئے درست نہیں کہ اصلاً ظلم کی ابتدا اس کی طرف سے ہوئی، اور اگر وہ اس ظلم کا ازالہ کرتے ہوئے کویت سے اپنا قبضہ اٹھالے تو جنگ بند کرنا اس کے اختیار میں ہے۔ اور دوسری طرف اس کے خلاف حملے میں شریک ہونا اس لئے درست نہیں کہ اس جنگ کی کمان اب امریکا کے ہاتھ میں ہے جس نے اپنا یہ مقصد واضح کیا ہے کہ صرف کویت کو خالی کرنا ^{مطمح} نظر نہیں بلکہ عراق کی طاقت کو مکمل طور پر تباہ کرنا پیش نظر ہے، جس سے پورے عالم اسلام کی کمزوری لازمی ہے۔ اور جس جنگ میں کسی بھی طرف شرکت کرنا محذورات شرعیہ سے خالی نہ ہو اسی کو اصطلاح میں ”فتنہ“ کہا جاتا ہے، اور ایسے ہی فتنے کے موقع پر دونوں فریقوں سے علیحدہ رہنے کا حکم ہے۔ البتہ اس موقع پر یہ دعا ہونی چاہئے کہ اللہ تعالیٰ مسلمانوں میں اتفاق و اتحاد پیدا فرمائے اور ان کی جان و مال اور عزت و آبرو اور ان کی تنصیبات کی حفاظت فرمائے، اور ان کے دشمنوں کو تباہ و برباد فرمائے، آمین۔

لِقَوْلِهِ تَعَالَى: وَإِنْ طَائِفَتَيْنِ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ اقْتَتَلُوا فَأَصْلَحُوا بَيْنَهُمَا،

فَإِنْ بَغَتْ إِحْدَاهُمَا عَلَى الْأُخْرَىٰ فَقَاتِلُوا الَّتِي تَبْغِي حَتَّىٰ تَفِيءَ إِلَىٰ أَمْرِ اللَّهِ،

فَإِنْ فَاءَتْ فَأَصْلَحُوا بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَأَقْسِطُوا، إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِينَ.

(الحجرات: ۹)

ولقوله تعالى: وَلَنْ يَجْعَلَ اللَّهُ لِلْكَافِرِينَ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ سَبِيلًا. (النساء: ۱۳۱)
وفى مشكوة المصابيح عن أبى سعيد قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم:
يوشك ان يكون خير مال المسلم غنم يتبع بها شعف الجبال ومواقع
القطر يفر بدينه من الفتن. (رواه البخارى ص: ۴۶۲)^(۱)

وعن المقداد بن الأسود قال: سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم
يقول: ان السعيد لمن جنب الفتن، ان السعيد لمن جنب الفتن، ان السعيد
لمن جنب الفتن، ولمن ابتلى فصبر فواهاً. (رواه ابو داود ص: ۴۶۳)^(۲)
وعن أبى موسى عن النبى صلى الله عليه وسلم انه قال: ان بين يدي الساعة
فتناً كقطع الليل المظلم (الى قوله) ثم قالوا: فما تأمرنا؟ قال: كونوا
احلاس بيوتكم. وفى رواية الترمذى ان رسول الله صلى الله عليه وسلم
قال: فى الفتنة كسروا فيها قسيكم وقطعوا فيها اوتاركم والزموا فيها
اجواف بيوتكم وكونوا كابن آدم. (ص: ۴۶۳)^(۳)

وعنه (حذيفة) قال: (الى قوله) قلت: يا رسول الله! صفهم لنا. قال: هم من
جلدتنا ويتكلمون بالسنتنا، قلت: فما تأمرنى ان أدركنى ذلك؟ قال:
تلتزم جماعة المسلمين وامامهم. قلت: فان لم يكن لهم جماعة ولا امام؟
قال: فاعتزل تلك الفرق كلها ولو ان تعض بأصل شجرة حتى يدركك
الموت وانت على ذلك. (متفق عليه ص: ۴۶۲)^(۴)

وفى شرح السير الكبير: باب الاستعانة بأهل الشرك واستعانة المشركين
بالمسلمين: - ما نصه: - ولا بأس بأن يستعين المسلمون بأهل الشرك
على أهل الشرك اذا كان حكم الاسلام هو الظاهر (الى ان قال) والذى
روى أن النبى صلى الله عليه وسلم يوم أحد رأى كتيباً حسناً قال: من
هؤلاء؟ ف قيل: يهود بنى فلان حلفاء بن ابى فقال: انا لا نستعين بمن ليس
على ديننا تأويله انهم كانوا أهل منعة وكانوا لا يقاتلون تحت راية رسول الله
صلى الله عليه وسلم وعندنا اذا كانوا بهذه الصفة فانه يكره الاستعانة بهم
(الى قوله) وانما كره ذلك لأنه كان معه سبعمائة من يهود بنى قينقاع من

(۱) صحيح البخارى، كتاب الايمان، باب من الدين الفرار من الفتن ج: ۱ ص: ۷ (طبع قديمى كتب خانه).

(۲) سنن ابى داود، كتاب الفتن، باب النهى عن السعى فى الفتنة ج: ۲ ص: ۲۳۰ (طبع سعيد).

(۳) سنن ابى داود، كتاب الفتن، باب النهى عن السعى فى الفتنة ج: ۲ ص: ۲۲۹ (طبع سعيد).

(۴) مشكوة المصابيح ص: ۴۶۱.

حلفائه فخشى ان يكونوا على المسلمين ان احسوا بهم زلة قدم فلهذا ردهم (وفيه بعد ذلك) حديث الزبير حين كان عند النجاشي فنزل به عدوه فأبلى يومئذ مع النجاشي بلاءً حسناً (الى قوله) ان النجاشي كان مسلماً (وبعد أسطر) قلنا ان ظهر على النجاشي لم يعرف من حقنا ما كان النجاشي يعرف فاخلصنا الدعاء الى ان يمكن الله النجاشي اهـ ملخصاً^(۱)

واللہ سبحانہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

الجواب صحیح

الجواب صحیح

۱۴۱۱/۷/۲۱ھ

بندہ عبدالرؤف سکھروی

محمد رفیع عثمانی عفا اللہ عنہ

(فتویٰ نمبر ۷۲/۴۸)

ضیاء الحق مرحوم کی موت شہادت ہے یا نہیں؟

سوال:- زید یہ کہتا ہے کہ ہمارے ملک کے مرحوم صدر جنرل محمد ضیاء الحق کا سانحہ مسلمانوں کے لئے باعثِ عبرت ہے، اس واقعے سے ہمیں سبق لینا چاہئے، کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کا عذاب ہے جو کہ ہمارے ملک کے شہید صدر اور ان کے رفقاء پر نازل ہوا، اس طرح صدر ضیاء الحق کی موت شہادت نہیں ہے، بلکہ ہلاکت کی موت کہلائے گی۔ کیا زید کا یہ خیال درست ہے؟

جواب:- صدر مرحوم ایک ہوائی جہاز کے حادثے میں جاں بحق ہوئے، اگر یہ حادثہ کسی شخص نے جان بوجھ کر نہیں قتل کرنے کے لئے کیا، تب تو وہ دنیا و آخرت دونوں کے لحاظ سے شہید ہیں۔^(۲) اور اگر یہ اتفاقی حادثہ تھا تو دنیا کے لحاظ سے تو نہیں، البتہ اخروی اجر کے لحاظ سے شہید ہیں،^(۳) کیونکہ اخروی اجر کے لحاظ سے جو شخص آگ سے جل کر یا کسی چیز کے گرنے سے ہلاک ہو وہ بھی شہید ہوتا ہے۔^(۴) اور

(۱) شرح السير الكبير، باب الاستعانة بأهل الشرك واستعانة المشركين بالمسلمين ج: ۳ ص: ۱۸۶ و ۱۸۷۔
(۲) وفي الهندية، فصل في الشهيد ج: ۱ ص: ۱۶۸ (طبع رشيدية) ولو كان المسلمون في سفينة فرماهم العدو بالنار فاحترقوا فهم كلهم شهداء كذا في الخلاصة.
(۳ و ۴) وفي الشامية، باب الشهيد ج: ۲ ص: ۲۴۸ (طبع سعيد) لو مات حتف أنفه أو بترد أو حرق أو غرق أو هدم لم يكن شهيداً في حكم الدنيا وإن كان شهيد الآخرة.
وفي الدر المختار، باب الشهيد ج: ۲ ص: ۲۵۲ وآلا فالمرتث شهيد الآخرة وكذا الجنب ونحوه الغريق والحريق والغريب والمهدوم عليه الخ.
وفي المبسوط للسرخسي، باب الشهيد ج: ۲ ص: ۵۲ (طبع مطبع السعادة مصر) ومن قتله السبع أو احترق بالنار أو تردى من جبل أو مات تحت هدم أو غرق غسل كغيره من الموتى الخ.
وفيه أيضاً ج: ۲ ص: ۵۱ فيغسل وإن كان له ثواب الشهداء كالغريق والحريق والمبطون والغريب يغسلون وهم شهداء على لسان رسول الله صلى الله عليه وسلم الخ.

کسی شخص کے بارے میں اپنی طرف سے یہ فیصلہ کرنا کہ اس پر عذاب نازل ہوا ہے،^(۱) بڑی جسارت کی بات ہے، جس سے ہر مسلمان کو پرہیز لازم ہے۔^(۲)

واللہ اعلم

۱۴۰۹/۱/۳۰ھ

(فتویٰ نمبر ۲۲۴/۴۰ الف)

وسائل نہ ہونے کی صورت میں دعوت و تبلیغ اور وسائل میسر ہونے کی صورت میں جہاد کیا جائے گا اور جہاد کے لئے امام مہدیؑ کے انتظار اور تبلیغی جماعت کے نظریے کا حکم

سوال:- مکرّمی جناب مفتی تقی عثمانی صاحب السلام علیکم!

امید ہے کہ آپ بخیر و عافیت ہوں گے، حضرت! میں نے سوچا تھا کہ خود آپ کی خدمت اقدس میں حاضری دوں گا، لیکن مقام کی دُوری اور مصروفیات کی وجہ سے ایسا ممکن نہ ہو سکا، اس لئے بذریعہ مکتوب آپ سے رجوع کیا ہے۔

پہلے اپنا تعارف اور مکتوب کا مقصد بیان کرنا مناسب سمجھتا ہوں۔ میرا تعلق کسی دینی تحریک یا جماعت سے باضابطہ طور پر نہیں ہے، لیکن آپ جیسے جید علمائے کرام اور بزرگانِ دین کی زیارت اور صحبت کی نسبت سے دین حاصل کرنے، اسے پھیلانے، اس کی حفاظت و بقاء اور نفاذ کا شوق دل میں موجزن ہے۔

حضرت! میں کچھ عرصے سے تذبذب کا شکار ہوں کہ دین کی کماحقہ اشاعت اور حفاظت کا دُرست اور مسنون راستہ کون سا ہے؟ اس بارے میں آپ کی رہنمائی چاہئے۔

پہلے چند باتیں جو ذہن میں ہیں آپ کی خدمت میں عرض کرتا ہوں، آپ جیسے جید علمائے کرام اور بزرگانِ دین کی صحبت، تصانیف اور قرآن و حدیث کے مطالعے کے بعد اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے مکہ میں دعوتِ دین کا جو راستہ اور طریقہ اللہ ربّ العزت کے حکم سے اختیار کیا، اس کے نتیجے کے طور پر تین سے چار سو کے لگ بھگ لوگ دین میں داخل ہوئے، لیکن ہجرتِ مدینہ کے بعد جب جہاد کا حکم نازل ہوا اور صحابہؓ نے اپنی استطاعت سے بڑھ کر اس حکم کو پورا کیا تو بارہ سال میں مختلف علاقوں کی فتوحات سے مسلمانوں کی تعداد ایک لاکھ تک جا پہنچی۔ اسی طرح خلفائے

(۱ و ۲) وفي مرقاة المفاتیح ج: ۱ ص: ۲۶۷ فلا يحكم لأحدٍ بانه من أهل الجنة ولا يجوز في حق أحدٍ بأنّه من أهل النار والعقوبات ولو صدر منه جميع السيئات والمظالم والتبعات فان العبر بخواتيم الحالات ولا يطلع عليها غير غالم الغب. وفيها أيضًا ج: ۱ ص: ۲۶۸ فربّ كافر متعنّد يسلم في آخر عمره ورّب مسلم متعبد يكفر في غاية أمره لا يجوز الشهادة لأحدٍ بالجنة والنار الخ.

راشدینؓ کے زمانے میں بڑے بڑے ممالک کی فتوحات سے اسلام کا دائرہ وسیع ہو گیا تھا، اور چودہ سو سالہ تاریخ اس بات کی شاہد نظر آتی ہے کہ اسلام کی حفاظت و بقاء کے لئے صرف جہاد یعنی قتال ہی کا رآمد ثابت ہوا۔

اسلام کی زیادہ سے زیادہ اور کماحقہ اشاعت بھی اسی سے ہوئی، جب کوئی علاقہ یا ملک فتح ہوا تو وہاں مبلغین اسلام کو آزادی سے اشاعتِ دین کا موقع ملا۔

اب موجودہ دور میں قتال فی سبیل اللہ کے پہلے کی طرح کماحقہ اثرات نظر نہیں آرہے، جبکہ علمائے دیوبند سے منسلک تحریک تبلیغی جماعت جو اسی (۸۰) سال سے اشاعتِ دین کی محنت کر رہی ہے اور جس کی محنت سے نہ صرف اندرون ملک بلکہ بیرونی ممالک میں بھی بہت زیادہ مثبت اثرات مرتب ہو رہے ہیں۔

اسی بات کے پیش نظر میں اشاعتِ دین اور حفاظتِ دین کے متعلق مذکورہ بالا اپنی رائے یا دوسرے الفاظ میں قرآن و حدیث کی چودہ سو سالہ تاریخ اور علمائے اُمت کی اکثریت کے موقف اور تبلیغی جماعت والوں کے موقف کے بارے میں تذبذب کا شکار ہوں کہ آیا اس دور میں اسلام اور مسلمانوں کی بقاء اور حفاظت نیز اشاعتِ اسلام کے لئے کونسا عمل مؤثر اور مفید ہے اور قرآن و سنت کے مطابق ہے؟

تبلیغی جماعت والوں کے موقف اور نظریات کو جو مجھ تک ”تبلیغی بزرگوں“ علماء اور کارکنوں کی زبانی پہنچے ہیں تفصیلاً سلسلہ وار بیان کرتا ہوں:-

۱:- بقول تبلیغیوں کے دین کی اصل رُوح اور حقیقت ”امر بالمعروف ونہی عن المنکر“ ہے، یہی تمام انبیاء کا کام تھا، اور اس میں اُمت کی نجات اور کامیابی ہے۔ (اس بات پر کماحقہ تبلیغی کتنا عمل کرتے ہیں؟ اس کے بارے میں کچھ کہا نہیں جاسکتا)۔

۲:- یہ دور جہاد و قتال کا دور نہیں ہے، بلکہ دعوت باللسان کا دور ہے۔

۳:- جب تک مہدی کا ظہور نہیں ہوتا، اس وقت تک جہاد اور اس سے منسلک تمام سرگرمیوں کو موقوف کر کے تبلیغی جماعت کے نظریے کے مطابق محنت کرنا تمام اُمت کے لئے ضروری ہے۔

۴:- اس دور میں جہادی سرگرمیوں میں حصہ لینا حکمت کے خلاف ہے، دین کو نقصان پہنچانے کے مترادف ہے۔

۵:- قرآن و حدیث میں جہاد اور قتال فی سبیل اللہ کی اصطلاحات دو الگ معنوں میں استعمال ہوئی ہیں۔

۶:- تبلیغِ دین اور اصلاحِ نفس کے مروجہ طریقے جو اُمت کی اکثریت میں رائج ہیں، مثلاً خانقاہی نظام، دینی رسائل و اخبارات، اصلاحی موعظ، تحریر و تصنیف اور مدارس کا قیام وغیرہ یہ طریق

نبوت سے مشابہت نہیں رکھتے، اور ”تبلیغی جماعت“ کا طریق دعوت نہ صرف درست اور منشاء خداوندی کے مطابق ہے بلکہ طریق نبی سے مماثلت اور مطابقت بھی رکھتا ہے۔

۷:- اگر اُمت میں بدری صحابہؓ کی تعداد کے بقدر لوگ انہی جیسے اعمال، ایمان، تقویٰ اور تعلق مع اللہ کے حامل ہو جائیں تو خود بخود دُنیا کی کا یہ ہی پلٹ جائے گی اور تبلیغی جماعت کا مقصد ہی ایسے لوگ پیدا کرنا ہے۔

۸:- دین کو نافذ کرنے کا اور ”امر بالمعروف ونہی عن المنکر“ کا طالبان والا طریقہ حکمت کے خلاف اور دین کی منشاء کے بھی خلاف ہے۔

۹:- دین کا کوئی کام اس وقت تک مؤثر ثابت نہیں ہوتا جب تک سنت رسول کے علاوہ بقول ”تبلیغیوں“ کے وہ عمل صفات نبوی کے ساتھ نہ کیا جائے۔

۱۰:- اس دور میں دین کی حفاظت، اسلام اور مسلمانوں کی بقاء اور اسلام کے نفاذ کے لئے جہادی اور دوسری تمام سرگرمیاں غیر مؤثر ثابت ہو چکی ہیں، لہذا مہدی کی آمد تک انہیں ترک کر کے ”تبلیغی جماعت“ والا کام شروع کیا جائے۔

۱۱:- اُمت ماسوائے ”تبلیغی جماعت“ کے کسی اور پلیٹ فارم پر متحد نہیں ہو سکتی۔

۱۲:- تبلیغی جماعت مہدی کا لشکر تیار کر رہی ہے۔

مندرجہ بالا بارہ عام پائے جانے والے ”تبلیغی نظریات“ میں نے گزشتہ چھ سال کے دوران رائے و مذاکرہ اور اپنے علاقے کے شب جمعہ کے بیانات اور بہت سے تبلیغی علماء اور کارکنوں سے نقل اور اخذ کئے ہیں۔

ایک اور خاص بات یہ ہے کہ ”تبلیغی“ مذکورہ بالا نظریات ”غیر تبلیغیوں“ کے سامنے عموماً بیان نہیں کرتے، اور اگر کرتے بھی ہیں تو اشارۃً یا کنایۃً بیان کرتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ ”غیر تبلیغی“ علماء تبلیغی جماعت کے نظریات کو جان نہیں سکتے۔

آپ حضرات (جو اس پر آشوب اور پُرفتن دور میں استقامت کے ساتھ اشاعتِ دین، تعلیمِ دین اور مسلمانوں کی اصلاح کے لئے کام کر رہے ہیں) سے گزارش ہے کہ اس مسئلے کی طرف بھرپور توجہ فرمائیے، اور اس کی اپنی تقاریر، رسائل اور اپنے حلقہ اثر میں وضاحت فرمائیے کہ اس دور میں دین کا کونسا عمل زیادہ مؤثر اور مفید نیز قرآن و سنت کے مطابق ہے جس کے ذریعے اشاعتِ دین، حفاظتِ دین اور نفاذِ دین کا عمل ہو سکے، اور آیا کہ تبلیغی جماعت کے مذکورہ نظریات اور موقف درست ہیں؟ دین کے مطابق ہیں یا نہیں؟

ایک جید عالمِ دین اور بزرگ ہونے کے ناطے آپ کا حلقہ اثر بھی زیادہ ہے اور آپ کے دلائل اور بات میں اللہ تعالیٰ نے قوت اور اثر رکھا ہے، اس لئے لوگ آپ کی بات کو آسانی سے سمجھتے

اور قبول کرتے ہیں، جبکہ میرے جیسے ناقص علم و عمل والوں کی بات کو ایک تو کوئی قبول نہیں کرتا، دوسرے فتنہ و فساد پھیلنے کا اندیشہ بھی ہے۔

ان تمام گزارشات کے علاوہ عرض ہے کہ اپنی مہر اور دستخط کے ساتھ مدلل اور مفصل جواب ارسال فرما کر میری رہنمائی فرمائیے کہ آیا میری رائے درست ہے یا کہ تبلیغی جماعت والوں کی؟ یا ان دونوں سے الگ قرآن و سنت میں کوئی دوسرا عمل اور طریقہ جس کے ذریعے امت کی اصلاح، مسلمانوں اور اسلام کی حفاظت اور اشاعت و نفاذ دین کا کام کماحقہ ہو سکے، موجود ہے؟ فقط

حافظ سمیع اللہ خان الیاس

جواب:- مختصر بات یہ ہے کہ جب جہاد کے ضروری وسائل مہیا نہ ہوں، دعوت و تبلیغ اور افراد سازی کے کام پر توجہ مرکوز کرنی چاہئے، اس کے ساتھ جہاد کے ضروری وسائل مہیا کرنے کی فکر بھی جاری رکھنی چاہئے^(۱)، جب وسائل مہیا ہو جائیں تو جہاد کرنا چاہئے۔ یہ کہنا درست نہیں ہے کہ امام مہدی کے آنے تک جہاد موقوف ہے، یہ غلط نظریہ ہے، اور اس کی تردید و اصلاح کے لئے اکابر تبلیغی جماعت سے بات بھی ہوئی ہے۔ جب بھی ضروری وسائل مہیا ہو جائیں، جہاد کرنا چاہئے، چاہے امام مہدی ابھی نہ آئے ہوں۔ البتہ ضروری وسائل مہیا کرنے میں آج کے حالات کے مطابق ایک طویل حکمت عملی کی ضرورت ہے، جو ایک مختصر خط میں بیان نہیں کی جاسکتی۔

والسلام

۱۴۲۳/۲/۱۷ھ

(۱ تا ۳) ”وَأَعِدُّوا لَهُمْ مَا اسْتَطَعْتُمْ مِنْ قُوَّةٍ وَمِنْ رِبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُونَ بِهِ عَدُوَّ اللَّهِ وَعَدُوَّكُمْ“ (الأنفال: ۶۰)۔
 وفي تفسير القرطبي ج: ۸ ص: ۳۵ (طبع دار احیاء التراث العربی بیروت) أمر الله سبحانه المؤمنين باعداد القوة للأعداء بعد أن أكد تقدمه التقوى قال ابن عباس: القوة هاهنا السلاح والقسي الخ.
 وفي تفسير ابن كثير ج: ۲ ص: ۳۲۸ (طبع قديمي كتب خانة) ثم أمر تعالى بإعداد آلات الحرب لمقاتلتهم حسب الطاقة والامكان والاستطاعة فقال (وَأَعِدُّوا لَهُمْ مَا اسْتَطَعْتُمْ) أي مهما أمكنكم الخ.
 وفي تفسير المدارك ج: ۱ ص: ۵۹۷ (طبع قديمي كتب خانة) (مَا اسْتَطَعْتُمْ مِنْ قُوَّةٍ) من كل ما يتقوى به في الحرب من عددها الخ.
 وفي تفسير أبي السعود ج: ۳ ص: ۱۰۹ (طبع دار الكتب العلمية بيروت) أعدوا القتال الذين نبذ اليهم العهد وهينوا لحربهم ما استطعتم من قوة من كل ما يتقوى به في الحرب كأننا ما كان الخ.
 وفي الدر المختار ج: ۳ ص: ۱۲۷ (طبع سعيد) وشرط لوجوبه القدرة على السلاح لا أمن الطريق.
 وفي الشامية تحته: أي وعلى القتال وملك الزاد والراحلة كما في قاضي خان وغيره قهستاني الخ.
 وفي تفسير روح المعاني ج: ۶ ص: ۲۳ (طبع مكتبة امداديه ملتان) (وَأَعِدُّوا لَهُمْ) خطاب لكافة المؤمنين لما أن السامور به من وظائف الكل أي أعدوا القتال الذين نبذ اليهم العهد وهينوا لحربهم (مَا اسْتَطَعْتُمْ مِنْ قُوَّةٍ) أي من كل ما يتقوى به في الحرب كأننا ما كان وأطلق عليه القوة مبالغة، وانما ذكر هذا لأنه لم يكن له في بدر استعداد تام فنبهوا على أن النصر من غير استعداد لا يتأتى في كل زمان. وعن ابن عباس رضي الله تعالى عنهما تفسير القوة بأنواع الأسلحة.
 وفي التفسير الكبير للامام الرازي ج: ۵ ص: ۴۹۹ (طبع دار الحديث ملتان) أمره في هذه الآية بالاعداد لهؤلاء الكفار وأن يعدوا للكفار ما يمكنهم من آلة وعدة وقوة والمراد بالقوة ههنا ما يكون سبباً لحصول القوة وذكرها فيه وجوهاً الأول المراد من القوة أنواع الأسلحة قال أصحاب المعاني الأولى أن يقال هذا عام في كل ما يتقوى به على حرب العدو وكل ما هو آلة للغزو والجهاد فهو من جملة القوة الخ.

﴿کتاب الامارة والسياسة﴾

(حکومت و امارت اور سیاست کے مسائل کا بیان)

دین میں سیاست و اقتدار کی حیثیت اور شرعی مقام اور دین کا اصل مقصد

سوال :- فضائل مآب حضرت اقدس مولانا مفتی محمد تقی عثمانی زید مجددہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

امید ہے کہ مزاج گرامی بخیر ہوں گے، ناچیز مادر علمی دارالعلوم دیوبند سے فاضلیت کے علاوہ شعبہ افتاء سے فراغت حاصل کر کے عرصے سے وادی کشمیر کی مشہور شخصیت علامہ کشمیریؒ کے ننھیال روڈھوان کپواڑہ میں ایک مدرسے میں تدریس و افتاء کا کام انجام دے رہا ہے۔

میں اور میرے دوسرے رفقاء جو الحمد للہ دارالعلوم دیوبند سے ہی فراغت حاصل کر چکے ہیں، تدریس و افتاء کے علاوہ مختلف مصنفین کی کتابوں کا مطالعہ کرتے رہتے ہیں، الحمد للہ آپ کی تمام وہ کتابیں شوق و محبت سے پڑھی ہیں جو ہندوستان میں شائع ہوئی ہیں، اور اس کی وجہ سے بر بناء محبت دست بوسی ہی نہیں بلکہ قدم بوسی کو دل چاہتا ہے۔ عرصے سے خط لکھنے کا ارادہ تھا لیکن ”عرفت ربی بفسخ العزائم“ کا بار بار تجربہ ہوا، پھر سال گزشتہ حضرت تھانویؒ پر سیمینار کے سلسلے میں جناب کی دیوبند تشریف آوری کا چرچا ہوا، لیکن عین وقت پر جناب کے پروگرام کے ملتوی ہونے کی اطلاع ملی، اس لئے ملاقات بھی نہ ہو سکی۔ دل تو بہت کچھ لکھنے کو چاہ رہا ہے، لیکن طول کلام کو بے ادبی پر محمول کرتے ہوئے مختصراً اپنا مدعا عرض کر رہا ہوں، امید ہے کہ حضرت والا اپنے بے حد قیمتی وقت کا خون کر کے جواب با صواب بلکہ وقت کے تقاضے کے مطابق پوری کتاب لکھ کر سرگرداں لوگوں کی تشویش اور پریشانی کو دور فرمائیں۔

واقعہ یہ ہے کہ اس وقت امت میں دو بڑے قلم کار صاحب طرز انشاء پرداز کی فکر عوام و خواص میں دو مستقل متضاد ذہن بنائے ہوئے ہے، ایک صاحب نے دین کی تعبیر میں مقصود کو تقاضا، اور تقاضے کو مقصود بنا کر دین کو اس انسان کی طرح جس کے پیر اوپر اور سر نیچا ہو، عوام الناس کے سامنے پیش کیا، اور ایک اچھی خاصی بھیڑ اس نظریے پر جم گئی ہے۔ پھر اسی فکر کے ایک فعال شخص نے اس کے رد میں ایک الگ اور مستقل فکر کی بنیاد ڈالی اور اپنے گمان کے مطابق وہ مقصود اور تقاضے کو اپنے مقام پر رکھنے میں کامیاب ہوئے ہیں، اور الحمد للہ دونوں حضرات کے لٹریچر کو کافی غور و خوض سے پڑھتے رہتے ہیں۔ جہاں تک اول الذکر فکر کا تعلق ہے، اس کے متعلق ہمارے اکابر مرحومین اور موجود حضرات نے

بہت کچھ لکھا ہے، لیکن اصل فکر کے تعلق سے صرف دو حضرات، مولانا منظور نعمانی اور مولانا سید ابوالحسن ندوی، نے لکھا ہے۔ اپنے اکابر کی، اس ردّ میں جتنی کتابیں زیر مطالعہ ہیں، اس سے اندازہ ہوا کہ وہ ثانی الذکر کی تعبیر سے متفق ہیں بلکہ ثانی الذکر کی ”تعبیر کی غلطی“ کا ذہن ہی ہمارے ناقص خیال کے مطابق ان میں کام کر رہا ہے، یہ بات الگ ہے کہ ثانی الذکر کے دیگر معاملات مسائل وغیرہ میں ہمارے اکابر کا ان سے اختلاف ہے، لیکن دین کی تعبیر کی حد تک ہمارے اکابر ان سے متفق نظر آ رہے جیسا کہ جناب کی تصنیف لطیف تکملة فتح الملہم کی یہ عبارت بھی اس پر دال ہے: ”ولکن بعض المسلمين الذين قاموا بالردّ على العلمانية في عصرنا قد أفرطوا في ذلك الخ“۔ (تکملة فتح الملہم ج: ۳ ص: ۲۷۰)

لیکن معاملہ حل طلب یہ ہے کہ ثانی الذکر نے اپنی فکر کو اپنی کتاب ”تعبیر کی غلطی“ یا ”الرسالہ“ وغیرہ میں جس مدلل انداز میں پیش کیا ہے، کیا اُسے مکمل صحیح اور درست فکر قرار دیا جاسکتا ہے یا افراط میں مبتلا شخص کو دیکھ کر خود یہ صاحب تقریط میں مبتلا ہو گئے ہیں؟ ہم اپنے مطالعے کی حد تک اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ ایک ان میں سے اگر افراط کا شکار ہے تو دوسرا یقیناً تقریط میں مبتلا ہے، لیکن پریشان کن معاملہ یہ ہے کہ ان دو فکروں کے درمیان راہِ اعتدال گم ہے جو تلاشِ بسیار کے باوجود نظر نہیں آ رہا ہے، کافی کتابوں کا مطالعہ کیا لیکن تشنہ لبی باقی ہے، اور آخر کار تسکینِ خاطر کے لئے جناب کی خدمت میں باہم مشورے سے یہ رقعہ ارسال کیا جا رہا ہے۔

حال ہی میں ایک کتاب ”دین کا متوازی تصوّر عبادت اور خلافت کی جامعیت“ مصنفہ ڈاکٹر محسن عثمانی ندوی زید مجدہ بہت آب و تاب خاص طور پر اپنے اکابر کی تقریط اور تاثرات کے ساتھ شائع ہوئی تھی، بہت شوق سے اس کو منگایا، بے تابی سے اس کو پڑھا، لیکن راہِ اعتدال تاہنوز گم ہے۔ بہت سے اہل علم سے گفتگو ہوئی، باہمی مذاکرہ بھی ہوتا رہتا ہے، لیکن الجھن اپنی جگہ باقی ہے۔

ممکن ہے کہ ہم اپنا مدعا واضح کرنے میں ان مختصر الفاظ میں اچھی طرح کامیاب نہ ہوئے ہوں، لیکن جناب جیسے صاحب علم سے اُمید قوی ہے کہ مدعا سمجھ گئے ہوں گے، مکرر عرض ہے کہ ثانی الذکر کے دوسرے دعاوی سے اگرچہ اختلاف ہے، لیکن دین کی ان کی بیان کردہ تعبیر سے ہمارا بلکہ اسلام کا کہاں تک اختلاف ہے؟ اور کہاں تک اتفاق؟ اور ان دونظریوں کے درمیان راہِ اعتدال کیا ہے؟ اس کی وضاحت ہم جناب کی ذاتِ اقدس سے جناب کے حکمت ریز قلم سے ہی چاہتے ہیں۔

اطلاعاً عرض ہے کہ یہ دو فکر اور ان کی ردّ و تصدیق میں جتنی کتابیں شائع ہو کر ہمارے علم میں آچکی ہیں، ان کا مطالعہ ہم کر چکے ہیں لیکن تشفی نہیں ہوئی۔ جناب کو معلوم ہی ہوگا کہ ان دو مختلف متضاد

فکروں کا اثر عوام میں کہاں تک پہنچ چکا ہے اور اعتدال کی راہ کی اگر آج نشاندہی ہو سکی تو آگے شاید کسی ایک کو غلبہ حاصل ہوگا جیسا کہ ثانی الذکر کے امکانات ہیں تو پھر یہ غالب نظریہ اپنی تمام خوبیوں اور خرابیوں کے ساتھ چھٹا جائے گا اور راہِ اعتدال پر پھر ایسے دبیز پردے پڑیں گے، ان کے ہٹانے والے کو (جو یقیناً خدا کی طرف سے آئے گا) کافی مشکلات کا سامنا ہوگا۔ فقط والسلام

منظر حسین القاسمی

خادم التدريس والافتاء

دارالعلوم روڈ دھوان، کپواڑہ کشمیر

جواب :- مکرّمی جناب مولانا منظر حسین قاسمی صاحب زید مجدہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کا گرامی نامہ ملا، سفروں کی وجہ سے جو تاخیر ہوئی اس پر معذرت خواہ ہوں۔ میں نے وحید الدین خان صاحب کی کتاب ”تعبیر کی غلطی“ پوری نہیں پڑھی، البتہ حضرت مولانا علی میاں مدظلہم کی کتاب پوری پڑھی ہے، اور احقر کی رائے میں صحیح صورتِ حال وہ ہے جو احقر نے اپنی کتاب ”حکیم الأمت کے سیاسی افکار“ میں بیان کی ہے، اور اس کا خلاصہ تکملہ فتح الملہم میں بھی آیا ہے۔ یعنی سیاست و اقتدار، دین کا اصل مقصد نہیں^(۱) بلکہ مقصد کے حصول کے ذرائع میں سے ایک ذریعہ ہے، اور دین کے اجتماعی احکام کی تنفیذ کے لئے اس کی اہمیت بھی ناقابلِ انکار ہے، مگر دین کے اصل مٹح نظر ہونے کی حیثیت سے نہیں، بلکہ ایک ذریعہ اور دین کا ایک اہم شعبہ ہونے کی حیثیت سے۔ یہی راہِ اعتدال ہے جو قرآن و سنت کے متعلقہ احکام سے واضح ہوتی ہے، اگر کوئی شخص اس کو مقصدِ دین سمجھے تو وہ غلو کا شکار ہے، اور اگر کوئی اس کی تردید میں اس کے دین کا حصہ ہونے ہی سے انکار کر دے تو یہ بھی غلط اور دوسری جانب کا غلو ہے۔

والسلام

۱۴۲۰/۱/۴ھ

(فتویٰ نمبر ۳۵۷/۴۸)

(۱) وفي سورة الذاریات : ”وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ“.

وفي تفسیر القرطبی ج: ۱ ص: ۵۰ (طبع مکتبہ حقانیہ) وقال علی رضی اللہ عنہ اٰی وما خلقت الجن والانس الا لامرهم بالعبادة واعتمد الزجاج علی هذا القول ویدلّ علیہ قوله تعالیٰ ”وَمَا أُمِرُوا إِلَّا لِيَعْبُدُوا اللَّهَ وَاحِدًا“ (التوبة: ۳۱) الا ليعرفوني الثعلبي، وهذا قول حسن لأنه لو لم يخلقهم لما عرف وجوده وتوحيده والعبادة الطاعة والتعبد التمسك فمعنى (لِيَعْبُدُونِ) ليدلوا ويخضعوا ويعبدوا.

وفي تفسیر الکشاف ج: ۴ ص: ۴۰۸ (طبع قديمی کتب خانہ) (وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ الآية) اٰی وما خلقت الجن والانس الا لأجل العبادة ولم أرد من جميعهم الا اياها.

وفي تفسیر ابن کثیر ج: ۴ ص: ۲۳۸ (طبع قديمی کتب خانہ) (وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ) اٰی انما خلقتهم لامرهم بعبادتي لا لاحتياجي اليهم الخ.

وفي التفسیر المنیر ج: ۱ ص: ۵۱ (طبع مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ) اٰی ما خلقت الثقلین الانس والجن الا للعبادة ولمعرفتي لا لاحتياجي اليهم الخ.

۱:- ”مغربی جمہوریت“ کی شرعی حیثیت

۲:- عہدہ از خود طلب کرنا جائز نہیں

۳:- اکثریت کو فیصلوں کی بنیاد بنانے کا حکم

سوال:- میری اور اس ملک کے سب مکینوں کی زندگی کا ایک مشترک مسئلہ ہے ”انتخاب یا جمہوریت“ جس کو اسلامی رسائل اور کتب بلکہ عام درس و وعظ میں بھی ”دور حاضر کا ایک عظیم بت“ قرار دیا جا چکا ہے۔ دریافت طلب اُمور یہ ہیں کہ:-

۱:- کیا واقعی یہ بات صحیح ہے کہ موجودہ طرز انتخاب (مغربی جمہوریت) دور حاضر کا عظیم

بت ہے؟

۲:- اگر یہ بات درست ہے تو جو لوگ یہاں سجدہ ریز ہیں ان کے لئے شرعی حکم کتاب و سنت

میں کیا ہے؟

۳:- جو شخص وقت کی مجبوری کی آڑ میں یہاں جہہ فرسائی اسلام کا اہم کام بلکہ عین اسلام

قرار دے تو اس کے لئے قرآن و سنت کی روشنی میں کیا حکم ہے؟

مسئلے کا دوسرا رخ:-

۱:- اگر فی الحقیقہ مغربی جمہوریت کو دور حاضر کا عظیم بت کہنا درست نہیں ہے، تو ایسا کہنے

والوں کے لئے اسلام میں کیا حکم ہے؟

۲:- جو لوگ انتخاب میں حصہ لینے کے لئے خود اُمیدواری کی درخواست دیں گے اور خود اپنی

تشہیر حصول اقتدار کی کریں گے، وہ اپنے قول و فعل سے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان کہ

”انا واللہ ما نولی علیٰ هذا العمل أحد اسأله ولا أحد أحرص علیہ“ اور آپ کا حکم: ”لا تسئل

الامارة“ کی خلاف ورزی کے مرتکب ہوں گے یا نہیں؟

۳:- جو لوگ قانونی طور پر حق اور ناحق کی پہچان کے لئے اکثریت کے فیصلے کو وقتی طور پر

معیار قبول کر لیں کیا وہ ”ان تَطْعُ أَكْثَرُ مَنْ فِي الْأَرْضِ يُضِلُّوكَ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ“ جیسی قرآن مجید کی

صاف اور صریح تعلیم کے خلاف کرنے کے مرتکب ہوں گے یا نہیں؟

قرآن و سنت کے مطابق مکمل اور مدلل جواب دے کر عند اللہ مآجور ہوں۔

السائل: عبدالکریم

جامع مسجد (العنایہ) جناح

اسٹریٹ گجرات

۱۴ مئی ۱۹۹۰ء

جواب:- درحقیقت آپ کے سوالات کا مدلل اور مفصل جواب ایک مستقل کتاب کی وسعت چاہتا ہے، جس کا ایک مختصر خط میں احاطہ مشکل ہے، تاہم مختصراً سوالات کے جوابات مندرجہ ذیل ہیں:-

۱:- مغربی جمہوریت جس کی بنیاد ”عوام کی حکمرانی“ کے تصور پر ہے، اسلام کے قطعی خلاف ہے، کیونکہ اسلام کی بنیاد ”اللہ کی حاکمیت اعلیٰ“ کے عقیدے پر ہے، جسے قرآن کریم نے: ”إِنَّ الْحُكْمَ لِلَّهِ“^(۱) کے مختصر جملے میں ارشاد فرمایا ہے۔ لہذا مغربی جمہوریت کو اپنے تمام تصورات کے ساتھ برحق سمجھنا عہد حاضر کی بدترین گمراہیوں میں سے ہے، اور ایسے لوگوں کو شرعی طور پر گمراہ کہا جائے گا۔ اور اگر کوئی شخص اس تفصیل کے ساتھ مغربی جمہوریت کو برحق سمجھے کہ پارلیمنٹ اگر کوئی قانون قرآن کریم کے کسی صریح حکم کے خلاف نافذ کر دے تو (معاذ اللہ) پارلیمنٹ کا قانون ہی برحق ہوگا، تو ایسا اعتقاد کفر ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص پارلیمنٹ کے فیصلوں کو قرآن و سنت کے تابع قرار دے تو اس کو کفر یا گمراہی نہیں کہہ سکتے، مگر اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ مغربی جمہوریت کو جوں کا توں قبول نہیں کرتا۔

۲:- عام اسلامی حکم یہی ہے کہ از خود کسی سرکاری عہدے یا منصب کو اپنے لئے طلب کرنا جائز نہیں^(۲)، اور ایسا شخص مطلوبہ منصب کا اہل نہیں ہوتا،^(۳) لیکن بعض استثنائی صورتوں میں جہاں یہ بات واضح ہو کہ اگر کوئی شخص خود اس منصب کو طلب نہیں کرے گا تو نا اہل اور ظالم لوگ اس پر قبضہ کر کے لوگوں پر ظلم کریں گے، تو ایسے وقت میں عہدے کو طلب کرنے کی شرعاً اجازت ہے۔ اور حضرت یوسف علیہ السلام کا: ”اجْعَلْنِي عَلَى خَزَائِنِ الْأَرْضِ“^(۴) کہنا اسی صورت پر محمول ہے۔ اس شرعی اصول کو مد نظر رکھتے ہوئے موجودہ انتخابات کا حکم معلوم کیا جاسکتا ہے کہ طلب اقتدار کی بنیاد پر پورا نظام حکومت قائم کرنا اصلاً جائز نہیں ہے، اور اگر منشاء صرف طلب اقتدار ہو، یا دوسرے اہل لوگ موجود ہوں، یا کسی اور طریقے سے غلط نظام کو بدلنا ممکن ہو تو ایسے نظام انتخابات میں اُمیدوار بننا جائز نہیں۔ لیکن اگر موجودہ غلط نظام کو بدلنے کا اس کے سوا کوئی راستہ نہ ہو، تو صالح اور اہل افراد اگر طلب اقتدار کے جذبے کے بجائے اصلاح حال کی غرض سے اس میں شامل ہوں تو اس کی گنجائش ہے، بشرطیکہ مفسد سب و شتم، غیبت اور دوسرے محرّمات و منکرات سے مکمل پرہیز کا اہتمام ہو، جو اس دور میں شاذ و نادر ہے۔

(۱) سورة يوسف آیت: ۴۵.

(۲ و ۳) وفی صحیح البخاری، کتاب الأحکام، باب من سأل الامارة وکل الیہا ج: ۲ ص: ۱۰۵۸ (طبع قدیمی) قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: ”لا تسئل الامارة فان اعطیتها عن مسئلة وکلت الیہا، وان اعطیتها من غیر مسئلة اعنت علیہا.“

و کذا فی صحیح مسلم، باب النهی عن طلب الامارة والحرص علیہا. ج: ۲ ص: ۱۲۰ (طبع قدیمی).

(۴) سورة يوسف آیت: ۵۵.

۳:- اکثریت کے فیصلے کو منصوص شرعی معاملات کے تصفیے کے لئے معیار بنانا گمراہی ہے، بلکہ جیسا کہ نمبر ۱ میں گزار، بعض حالات میں کفر ہے، لیکن اگر انتظامی معاملات میں مباحات کی حد تک، یا مجتہد فیہ امور میں کسی ایک جانب کی ترجیح کے لئے اگر اکثریت کو بنیاد بنایا جا رہا ہے تو اس کی گنجائش ہے، جیسا کہ^(۱) حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے جانشین کی نامزدگی مجلس شوریٰ کی اکثریت کی بنیاد پر کرنے کا حکم دیا۔

واللہ سبحانہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۴۱۲/۱/۱۲ھ

سیاست میں دین اور ملک و ملت کے مفاد کی حامل جماعت کی حمایت کی جائے

سوال:- موجودہ ملکی حالات میں بھٹو کا ساتھ دینا کفر کا ساتھ دینے اور اپوزیشن کا ساتھ دینا اسلام کا ساتھ دینے کے مترادف ہے، یہ آواز مسجدوں اور اکثر علماء کی طرف سے سنائی دے رہی ہے، اس کے بارے میں راہنمائی فرمائی جائے۔

جواب:- شریعت کا حکم تو اتنا ہے کہ نیکی و تقویٰ میں تعاون کیا جائے اور فسق و فجور اور اثم و عدوان میں تعاون نہ کیا جائے،^(۲) نیز سیاست میں اس شخص یا جماعت کی حمایت کی جائے جس کی حمایت میں دین اور ملک و ملت کا مفاد زیادہ ہو، اب یہ واقعات اور بصیرت و رائے کا مسئلہ ہے کہ کس کی جماعت میں ملک و ملت کا مفاد دینی اعتبار سے زیادہ ہے، یہ دارالافتاء سے پوچھنے کی بات نہیں، بلکہ اپنے ضمیر اور اپنی بصیرت کے مطابق ہر شخص کو اس کا فیصلہ خود کرنا چاہئے، مفتی کا منصب شخصیات سے بحث کرنا نہیں ہے۔

واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۷/۶/۱۶ھ

(فتویٰ نمبر ۶۰۲/۲۸ ج ۲)

برما میں تمام مسلمانوں یا مخصوص مسلم قبائل کے لئے جدوجہد کرنے والی دو جماعتوں میں سے کس کی حمایت کی جائے؟

سوال:- برما میں مظلوم مسلمانوں کی دادرسی اور حصول آزادی کے لئے برہمیز مسلم آرگنائزیشن (B.M.O) اور روہنگیا پیٹریوٹک فرنٹ (R.P.F) یعنی ”محبت روہنگیا محاذ“ نامی دو

(۱) سیرۃ عمر بن الخطاب ص: ۵۰۹ مصنفہ: علی محمد محمد الصلابی.

(۲) لقولہ تعالیٰ: ”وَتَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوَىٰ وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ“ الآیۃ، سورۃ المائدۃ: ۲.

جماعتیں کام کر رہی ہیں، اول الذکر برما کے تمام مسلمانوں کو شامل کر کے اسلام کے نام پر (جیسا کہ نام سے ظاہر ہے) جدوجہد کر رہی ہے، جبکہ مؤخر الذکر برما میں مسلمانوں کے متعدد قبیلوں میں سے ایک قبیلہ ”روہنگیا“ قبیلے یا قومیت کے نام پر (جیسا کہ نام سے ظاہر ہے) جدوجہد کر رہی ہے، ہمیں بتائیں کہ شرعی اعتبار سے ہم کس کی حمایت کریں؟

جواب:- جو جماعت اسلام کا نام ہی نہ لیتی ہو بلکہ واقعۃً اسلام اور مسلمانوں کی خدمت کرتی ہو، اس کے ساتھ تعاون علی التقویٰ کیا جائے، اور جو جماعت قبائلی عصبیت کی دعوت دیتی ہو اس کے ساتھ تعاون درست نہیں^(۱)، البتہ اگر قبائلی عصبیت کی داعی نہ ہو، لیکن اس نے اپنی جدوجہد کا دائرہ کسی خاص خطے یا قبیلے کے ساتھ محدود کر رکھا ہو تو اس میں کچھ حرج نہیں ہے، اور مسلمان اس کے ساتھ بھی تعاون علی التقویٰ کر سکتے ہیں۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۱۳۹۷/۹/۱۶ھ

(فتویٰ نمبر ۹۵۸/۲۸ ج)

انتخابات میں کسی اُمیدوار کے بارے میں ”فلاں کو ووٹ دے کر ہم

اللہ کے احتساب سے بچ سکتے ہیں“ کے الفاظ کا حکم

سوال:- بعض اشتہاروں میں جو انتخابات کے سلسلے میں جاری ہو چکے ہیں، یہ الفاظ لکھے ہوئے ہیں کہ: ”فلاں اُمیدوار کو ووٹ دے کر ہم روزِ محشر اللہ تعالیٰ کے احتساب سے بچ سکتے ہیں“ اور اس کا مقصد یہ ہے کہ نیک اور اچھے آدمی کو ووٹ دینے سے آخرت میں غلط ووٹ کی جواب دہی اور احتساب سے آدمی بچ سکتا ہے۔

اس پر بعض لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ اس میں نبوت کا دعویٰ ہے۔ آپ کا ان الفاظ کے بارے میں کیا خیال ہے؟

جواب:- مذکورہ مقصد کے تحت یہ الفاظ لکھنے سے نبوت کا دعویٰ لازم نہیں آتا، اور اگر مقصد وہی ہے جو سوال میں لکھا گیا ہے اور جس آدمی کے حق میں یہ جملہ لکھا گیا ہے، وہ لکھنے والے کے نزدیک واقعۃً حلقے کے دوسرے تمام اُمیدواروں سے زیادہ نیک اور اہل ہے، تو ان الفاظ کے لکھنے میں

(۱) لقولہ تعالیٰ: ”وَتَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوَىٰ وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ“ الآیۃ، سورۃ المائدہ: ۲.

(۲) فی سنن النسائی ج: ۲ ص: ۱۷۳ و ۱۷۵ (طبع مکتبہ الحسن لاہور) ”عن أبی ہریرۃ رضی اللہ عنہ قال: قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: من خرج من الطاعة وفارق الجماعة فمات ميتة جاهلیة.... ومن قاتل تحت راية عمیة يدعو الی عصبیة أو یغضب لعصبیة فقتل فقتلته جاهلیة.“ رقم الحدیث: ۴۰۴۵.

شرعاً کوئی حرج نہیں، البتہ کسی شخص کے بارے میں جزم اور وثوق کے ساتھ اتنا بڑا دعویٰ کرنے میں احتیاط سے کام لینا چاہئے۔

واللہ اعلم

۱۲/۱۹/۱۴۰۳ھ

(فتویٰ نمبر ۵۲۴/۲۲۰)

چہرے کے پردے کی شرعی حیثیت اور خاتون اُمیدوار کا انتخابی پوسٹروں میں فوٹو شائع کرنے کا حکم

سوال ۱:- قومی اتحاد کے جلسوں میں بیگم نسیم ولی خان اور بیگم صفیہ شکیل اسٹیج کی زینت بنتی ہیں، اخبارات میں اُن کا فوٹو چھپتا ہے، لوگ اخباروں میں ان کی تصویریں دیکھ لیتے ہیں اور تقریریں بھی پڑھتے ہیں، سنا ہے کہ غیر محرم عورت کی تصویر دیکھنا بھی اتنا ہی گناہ ہے جتنا اُس کو دیکھنا، غیر محرم عورت کی آواز بھی پردہ ہے، اگر ایسی اونچی آواز سے تلاوت قرآن پاک بھی کرے جس کو کوئی غیر محرم مرد سنے تو بھی گناہ ہے۔ اس کے متعلق کیا حکم ہے؟

۲:- یہ ٹھیک ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نابینا رشتہ دار سے پردہ کرایا ہے؟

۳:- حضرت خالد بن ولیدؓ کی اہلیہ محترمہ اُن کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ٹوپی مبارک میدان جہاد میں دے کر واپس ہونے لگیں تو انہوں نے فرمایا: اے سوار! تم نے مجھ پر بڑا احسان عظیم کیا، اپنا نام بتا، اُس وقت پتہ چلا کہ یہ میری بیوی ہے، گویا چہرے کے پردے کا بھی اتنا اہتمام تھا کہ خاوند کو پتہ نہ لگا کہ میری بیوی ہے؟

۴:- مفتی محمود، بھٹو صاحب کو اقتدار پر لائے تھے، اور جن لوگوں نے ان کی مخالفت کی تھی مفتی محمود صاحب نے اُن کی مخالفت کی تھی، اب جو مفتی محمود صاحب کے لگائے ہوئے پودے کو کاٹنا نہیں چاہتے اُن کی مفتی محمود صاحب مخالفت کرتے ہیں، اب بھٹو صاحب کی تائید کرنا جائز ہے یا نہیں؟

۵:- جو شخص جمہور اہل سنت والجماعت کے سلف صالحین پر تنقید کرے، اس شخص کے متعلق شرعاً کیا حکم ہے؟

جواب اتنا ۳:- عورت پر پردے کا وجوب ایک اجماعی اور غیر مختلف فیہ مسئلہ ہے، اور یہ پردہ چہرے کا بھی ہے،^(۱) اور اس کا فوٹو شائع کرنا بھی شرعاً جائز نہیں، ان مسائل میں کسی عالم دین کا کوئی اختلاف نہیں ہے، اور اس کے خلاف کسی کا عمل شریعت میں حجت نہیں۔

(۱) وفي الدر المختار، کتاب الصلوة ج: ۱ ص: ۴۰۶ (طبع سعید) وتمنع المرأة الشابة من كشف الوجه بين رجال لا لأنه عورة بل لخوف الفتنة.

۴:- اشخاص و ذوات سے متعلق سوالات فتویٰ سے متعلق نہیں۔

۵:- اس مسئلے پر حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا مفصل فتویٰ ”جواہر الفقہ“

میں شائع ہو چکا ہے، اسے ملاحظہ فرمائیں۔

واللہ سبحانہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

الجواب صحیح

محمد رفیع عثمانی عفا اللہ عنہ

۱۳۹۷/۳/۱۸ھ

۱۳۹۷/۳/۲۱ھ

(انتخابات میں قرآنی آیات و احادیث کو مخالف اُمیدواروں پر

چسپاں کرنے کی مختلف صورتوں کا حکم)

۱:- ”وَكَانَ فِي الْمَدِينَةِ تِسْعَةُ رَهْطٍ“ الآية میں ۹ مفسدوں کو

قومی اتحاد کے ۹ لیڈروں پر چسپاں کرنا

۲:- قرآن کریم کے لفظ ”هَلْ“ کو سیاسی جماعت کے

انتخابی نشان پر چسپاں کرنا

۳:- تلاعب بالقرآن کی مختلف صورتیں اور ایسی مجالس میں

شرکت کا حکم

سوال:- گزشتہ انتخابی مہم کے دوران جس طرح سے مخالف جماعتوں نے ایک دوسرے کے

خلاف جائز و ناجائز طوفان برپا کیا، جناب بھی پورے طور پر واقف ہوں گے، بلکہ غلط انداز سے قرآن کریم اور احادیث شریفہ کو بھی استعمال کرنے سے گریز نہیں کیا گیا۔ مثال کے طور پر ایک سیاسی پارٹی

کے مقررین صاحبان اور اخبار نے یہ کہا کہ: ”وَكَانَ فِي الْمَدِينَةِ تِسْعَةُ رَهْطٍ يُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ“

الخ، اس آیت کریمہ میں مفسد افراد کا ذکر ہے، لہذا قومی اتحاد کے چونکہ ۹ لیڈر ہیں اس کی طرف اشارہ

تھا۔ دوسری پارٹی کے ایک مقرر صاحب نے جلسہ عام میں نوستاروں کی قصیدہ خوانی کرتے ہوئے

قرآن کریم کی آیت: ”وَبِالنَّجْمِ هُمْ يَهْتَدُونَ“ اور ”رُجُومًا لِلشَّيْطَانِ“ وغیرہ سے استدلال کیا، نیز

”ہل“ کا نشان منتخب کرنے پر فرمایا کہ ”هَلْ“ کا ذکر قرآن میں چالیس مقام پر آیا ہے، پھر چند آیات

پڑھیں جن میں لفظ ”هَلْ“ کا استعمال ہوا ہے۔ جناب سے استدعا ہے کہ اس کا شرعی حکم بتائیں۔

۱:- کیا قومی اتحاد کے ۹ لیڈروں پر آیت: ”وَكَانَ فِي الْمَدِينَةِ تِسْعَةُ رَهْطٍ يُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ“ منطبق کی جاسکتی ہے؟

۲:- اسی طرح لفظ ”هَلْ“ کا استعمال؟

۳:- کیا اپنے مقصد کے لئے قرآنی آیات کا ذکر مناسب ہے؟

۴:- کیا تلاعب بالقرآن یا تحریف قرآن کے زمرے میں یہ نہیں آتا؟

۵:- ایسے مجمع میں شامل ہونے والے سامعین کا کیا حکم ہے؟

جواب ۱:- آیت قرآنی: ”وَكَانَ فِي الْمَدِينَةِ تِسْعَةُ رَهْطٍ.... الخ“ کا واقعہ بالکل دوسرا

ہے، اگر اس آیت کو موجودہ دور کی سیاسی پارٹیوں پر اس نیت سے چسپاں کیا جائے کہ یہ آیت انہی کے بارے میں ہے تو یہ صریح تحریف قرآن ہے، اور اگر یہ مقصد ہو کہ آیت تو دوسرے واقعے میں اُتری تھی لیکن یہاں بھی صادق آتی ہے تو یہ آیت کا غلط استعمال ہے اور سیاسی مخالفت کی بناء پر کسی شخص کو کفار کی صف میں شامل کرنا بدترین غلطی ہے۔^(۱)

۲:- ہرگز نہیں، قرآن کریم کے لفظ ”هَلْ“ کو انتخابی نشان پر چسپاں کرنا نری جہالت ہے، اور

اگر اس نیت سے ہو کہ قرآن میں لفظ ”هَلْ“ سے مراد ہی انتخابی نشان ہے تو صریح تحریف ہے۔^(۲)

۳:- ہرگز صحیح نہیں، قرآن کریم کی آیات کو اس طرح سیاسی یا انتخابی جنگ میں استعمال کرنا

جس سے عوام میں غلط تاثر ہو، انتہائی بے ادبی اور گستاخی کی بات ہے جس سے پرہیز لازم ہے۔^(۳)

۴:- ایسی باتوں کے بارے میں قوی خطرہ ہے کہ وہ تلاعب بالقرآن میں داخل ہوں، جو

لوگ ایسا کریں وہ سخت غلطی کے مرتکب ہیں، البتہ انہیں کسی بُرے لقب سے پکارنے کے بجائے انہیں سمجھانے کی کوشش کریں۔^(۴)

۵:- ایسی مجلسوں میں جہاں قرآنی آیات کو اس طرح غلط استعمال کیا جاتا ہو، شرکت نہ کرنا

(۱) فی الاشباہ والنظائر لابن نجيم ”وكذا قولهم بكفره اذا قرأ القرآن في معرض كلام الناس، كما اذا اجتمعوا فقروا فجمعناهم جمعاً، وكذا وكاساً دهاقاً، عند روية كاسٍ. رقم: ۱۲۸.

قال في شرحه: ذكر في القاموس أن معنى قول الزهري لا تناظروا بكتاب الله ولا بكلام رسوله لا تجعلوا شيئاً نظيراً لهما، معناه لا تجعلوهما مثلاً لشيء يعرضه به كقول القائل جئت على قدر يا موسى لمسمى بموسى جاء في وقت مطلوب.

(۲) حوالہ سابقہ۔

(۳) حوالہ سابقہ۔

(۴) قال الله تعالى في القرآن الكريم: ”أذْعُ إِلَى سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحُكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ.....“ (الآية: ۱۲۵) (سورة النحل) ”وَأَحْسِنْ كَمَا أَحْسَنَ اللَّهُ إِلَيْكَ.....“ (الآية: سورة القصص: ۷۷).

چاہئے، اور شرکت ہو جائے تو ایسا کرنے والوں کو اُن کی غلطی پر متنبہ کرنا چاہئے۔^(۱)

واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم

ھ ۱۳۹۸/۶/۲۷

مرد اُمیدوار کی موجودگی میں عورت کو ”ووٹ“ دینے کا حکم

سوال:- مرد اُمیدوار کی موجودگی میں جو بہتر نمائندگی کر سکتے ہوں، عورت کو سردار تسلیم کرنا اور اُسے ووٹ دینا اسلام کی روشنی میں جائز ہے یا نہیں؟

جواب:- مرد اُمیدواروں کی موجودگی میں جو بہتر نمائندگی کر سکتے ہوں، عورت کو سردار تسلیم کرنا اور اُسے ووٹ دینا شرعاً جائز نہیں۔^(۲)

واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم

ھ ۱۳۹۷/۱۰/۱۱

(فتویٰ نمبر ۱۰۴۷/۲۸ ج)

پاکستان سے الحاق کرنے والے ریاست کے ایک حکمران کو

معاهدے کے تحت دی گئی مراعات واپس لینے کا حکم

سوال:- کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین اس صورتِ حال کے بارے میں کہ ایک ریاست ”الف“ جو کہ اُزروئے قانون آزادی ہند مجریہ ۱۹۴۷ء ۱۴ اگست سلطنتِ برطانیہ کے تسلط سے آزاد ہو گئی اور اس کا حکمران بموجب قانون اس امر کا حق دار ہو گیا کہ وہ آزاد مملکت ہندوستان یا نوزائیدہ مملکت پاکستان میں سے کسی ایک میں شمولیت اختیار کر لے یا آزاد رہے۔ چنانچہ ریاست ”الف“ کے حکمران نے مطابق دستاویز شمولیت (جس کا اُردو ترجمہ منسلک ہے) پاکستان میں محض جذبہ اسلامی و جذباتِ دینی و ملی کی بناء پر شمولیت اختیار کر لی، جس کے نتیجے میں حکمران مذکور اور اس کے اہل خاندان کو ہندوستان کے حملے اور ظلم و ستم کا نشانہ بننا پڑا، اور اپنی ریاست اور جملہ املاک و جائیداد سے محروم ہونا پڑا، دستاویز شمولیت کے مطابق شق نمبر ۱ میں حکمران مذکور نے اپنی ریاست کا الحاق پاکستان میں کرنے کا عہد کیا ہے، اور اسے پاکستانی مقننہ اور سپریم کورٹ کا پابند کیا ہے، بشرطیکہ دستاویز

(۱) فی الشامیہ ج: ۶ ص: ۳۴۸ (طبع سعید) لو دعی الی دعوة فالواجب الاجابة ان لم یکن هناك معصية ولا بدعة والامتناع اسلم فی زماننا الا اذا علم یقیناً ان لا بدعة ولا معصية اھ۔

(۲) فی صحیح البخاری، کتاب المغازی، کتاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم الی کسری و قیصر، رقم: ۴۰۷۳ ج: ۲ ص: ۶۷۳ (طبع قدیمی کتب خانہ) ”..... لما بلغ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان اهل فارس قد ملکوا علیہم بنت کسری قال: لن یفلح قوم ولّوا امرہم امرأة۔“ نیز دیکھئے کفایت المفتی، کتاب سیاسیات ج: ۹ ص: ۳۴۹ (طبع جدید دارالاشاعت)۔

میں دی گئی شرائط کو ملحوظ رکھا جائے۔

شق نمبر ۶ و ۷ میں آئندہ بنائے جانے والے قوانین و آئین کے ذریعے کوئی تبدیلی کی طرف نوعیت کی جس کی منظوری حکمرانِ مذکور سے حاصل نہ کر لی جائے عمل میں نہ لائی جائے۔

اس شمولیت کے تحت حکومتِ پاکستان کی جانب سے تحفظات و مراعات خصوصی نوعیت کی حکمرانِ مذکور کو حاصل تھیں اور جو ۴۷-۹-۲۴ سے رائج تھیں، مگر سابقہ حکومت نے حکمرانِ مذکور کی منظوری کے بغیر ایک طرفہ طور پر ان تمام مراعات اور تحفظات کو سلب کر لیا اور حکمرانِ مذکور کو ان سے محروم کر دیا۔

۱:- اَز رُوئے شریعتِ محمدی اور قرآن و سنت اسلامی حکومتِ پاکستان کا یہ ایک طرفہ قدم جو کہ دستاویز شمولیت کی صریح خلاف ورزی ہے، کیا شرع اور دینی اعتبار سے اس کا کوئی جواز ہے؟ اور کیا اَز رُوئے فقہ اسلامی یہ ایک طرفہ تبدیلی معاہدہ جائز ہے یا ناجائز؟

۲:- اگر یہ فعل ناجائز ہے تو کیا ایسی کوئی حکومت جو کہ پاکستان میں اسلام کے نفاذ کی مدعی اور علی الاعلان دعوے دار ہو سابقہ حکومت کی اس پالیسی اور فیصلے کی پابند ہے جو کہ اس نے دینی اور اخلاقی حدود سے تجاوز کر کے کیا ہو؟

۳:- کیا شرعی اعتبار سے حکمرانِ مذکور اس ایک طرفہ انحرافِ معاہدہ کی بنا پر کسی ہرجانے اور تاوان کا مستحق ہے؟ اس نقصان اور اذیت کے بدلے میں جو اس بنا پر اسے اور اس کے اہل خاندان کو پہنچا ہو؟

چنانچہ گزارش ہے کہ مذکورہ بالا اُمور میں فتویٰ و فیصلہ قرآن و سنت اور احادیثِ نبوی کی روشنی میں صادر فرمایا جائے۔

از طرف

غلام معین الدین

تنقیح

استفتاء کے ساتھ معاہدے کی دستاویز منسلک نہیں ہے، جواب اس دستاویز کے مطالعے پر موقوف ہے، اس لئے اس استفتاء کے ساتھ معاہدے کی دستاویز ارسال کی جائے تو اصل سوال کا جواب دیا جاسکتا ہے۔

محمد تقی عثمانی

جوابِ تنقیح

سوال کے ساتھ دستاویز منسلک ہے۔

جواب:- حکومت پاکستان کے لئے شرعاً ضروری ہے کہ وہ اس معاہدے کی پابندی کرے،^(۱) جو کسی ریاست کے الحاق کے وقت والی ریاست سے کیا، لیکن منسلکہ دستاویز شمولیت میں والی ریاست کے لئے کسی قسم کی خصوصی مراعات و تحفظات کا ذکر نہیں، البتہ اگر گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء اور قانون آزادی ہند ۱۹۴۷ء میں جن کا ذکر دستاویز شمولیت کی دفعہ نمبر ۲ میں ہے، والی ریاست کو کچھ خصوصی مراعات و تحفظات دیئے گئے ہوں تو ان مراعات و تحفظات کی پابندی حکومت پاکستان پر اس وقت تک لازم ہے جب تک ریاست کا الحاق پاکستان کے ساتھ باقی ہے، اور اگر مذکورہ دو قوانین میں بھی کوئی مراعات و تحفظات موجود نہیں ہیں یا معاہدے کے بعد کسی اور دستاویز کے ذریعے طے پائے ہیں تو ان کی تبدیلی سے معاہدہ شمولیت کی خلاف ورزی لازم نہیں آتی، اس صورت میں اس دوسری دستاویز کو دیکھ کر ہی اس کا شرعی حکم بتایا جاسکتا ہے۔

واللہ اعلم

۱۴۰۰/۴/۲۰ھ

(فتویٰ نمبر ۵۶۴/۳۱ ب)

سرکاری ملازمتوں اور املاک و اراضی میں ترجیح کی بنیاد

علاقائی و جغرافیائی عصبیت ہے یا اہلیت؟

سوال:- مکرمی و محترمی جناب مولانا محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم
السلام علیکم ورحمۃ اللہ، واضح ہو کہ مندرجہ ذیل مسئلے پر اپنی علمی رائے اور دلائل سے مطلع
فرماویں، ممنون ہوں گا، مطلوبہ جواب فتویٰ تصور نہ ہوگا۔

۱:- قرآن مجید، سنت نبوی و خلفائے راشدین یا فقہائے عظام کے ارشادات کی روشنی میں
ایک اسلامی مملکت کے مختلف علاقوں (صوبوں) کے باشندوں کو، دوسرے علاقوں کے باشندوں کے حق
برائے حصول صوبہ جاتی سرکاری ملازمت، املاک و اراضی میں برابر کا شریک قرار دیا گیا ہے یا مختلف
علاقوں کے باشندوں کے ان حقوق کو اس خاص علاقے کے باشندوں تک محدود رکھا گیا ہے؟

۲:- کیا اگر ایک اسلامی مملکت میں ایک علاقے کے باشندوں کو دوسرے علاقوں میں معاشی
حق انتفاع کے سلسلے میں ایسا یکساں استحقاق نہ دیا جائے تو یہ شرعاً درست ہوگا؟

۳:- کیا اسلامی نظریہ عدل کی رو سے ایسے یکساں معاشی استحقاق کی پالیسی بنانا اسلامی
حکومت کے لئے شرعاً ضروری اور لازمی ہے؟

(۱) قال اللہ تعالیٰ: "وَأَوْفُوا بِالْعَهْدِ إِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُولًا" وفي سورة المائدة: "يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَوْفُوا بِالْعُقُودِ" الآية.

۴:- جب ایک اسلامی مملکت میں حقوق کے تحفظ کے نام پر علاقائی قومی عصبیت پیدا کی جا رہی ہو تو اس وقت اس عصبیت کو روکنے کے لئے مختلف علاقوں (صوبوں) کے درمیان معاشی تحفظ کی وہ کوئی منصفانہ حکمت عملی بنانی چاہئے جو اسلامی نظریہ عدل کے بھی مطابق ہو اور اسلامی مملکت کی وحدت اور استحکام کے لئے بھی مفید ہو؟

اُمید ہے کہ آنجناب اس اہم مسئلے پر ہماری راہنمائی فرمائیں گے، شکریہ۔ آپ کی ذاتی رائے مطلوب ہے نہ کہ دارالافتاء کا فتویٰ۔

والسلام

خاکسار عبدالحق سہریانی بلوچ
ایم اے ایل ایل بی

جواب:- محترمی و مکرمی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

گرامی نامہ ملا، آپ نے سرکاری ملازمتوں اور املاک و اراضی میں جغرافیائی اور علاقائی مساوات کے بارے میں جو سوال کیا ہے، اس کا جواب احقر کی رائے میں یہ ہے کہ اسلام نے کسی بھی منصب یا ملازمت کے سلسلے میں بنیادی طور پر یہ اصول پیش نظر رکھا ہے کہ جس شخص کا تقرر مقصود ہو اس میں اس منصب کی پوری اہلیت پائی جانی ضروری ہے، اور جو شخص جس منصب کی زیادہ اہلیت رکھتا ہو، وہ اس منصب کا زیادہ اہل ہے، خواہ جغرافیائی اعتبار سے اس کا تعلق کسی خطے سے ہو، لہذا اس معاملے میں ترجیح کی بنیاد اہلیت ہے، نہ کہ جغرافیائی تعصبات^(۲)، یہی وجہ ہے کہ اسلامی حکومتوں میں ایک خطے کے باشندوں کو بلا تکلف دوسرے خطوں میں متعین کیا جاتا رہا ہے۔

لہذا یہ بات تو شریعت میں کسی طرح جائز نہیں ہو سکتی کہ جس شخص میں کسی منصب کی اہلیت نہ ہو، اس کو محض اس لئے کسی منصب پر فائز کر دیا جائے کہ وہ کسی خاص علاقے کا باشندہ ہے، البتہ اگر مختلف خطوں کے لوگ اہلیت کے اعتبار سے مساوی ہوں تو اس صورت میں انتظامی سہولت کی خاطر یہ اصول مقرر کرنا جائز ہے کہ ہر علاقے میں اسی علاقے کے اہل افراد کو ترجیح دی جائے، کیونکہ وہ اس علاقے کے مسائل اور لوگوں کی نفسیات سے بھی زیادہ واقف ہوگا، اور اس علاقے کے لوگ اس سے مانوس بھی زیادہ ہوں گے۔

اسی طرح اگر اس بات کا اندیشہ ہو کہ کسی علاقے کے لوگ باہر کے کسی عہدہ دار کو دل سے قبول نہیں کریں گے اور اس سے ملک و ملت میں انتشار پیدا ہونے کا خطرہ پیدا ہو جائے تو اس صورت

میں اس بات کی بھی نجائش ہو سکتی ہے کہ ملت کو انتشار سے بچانے کے لئے کسی ایسے شخص کا تقرر کر دیا جائے جو فی نفسہ اہل تو ہو، لیکن دوسرے علاقے کے لوگوں میں اس سے زیادہ اہلیت رکھنے والے موجود ہوں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو فرمایا تھا کہ حکمران قریش ہی میں سے ہوں گے،^(۱) اس کی حکمت علامہ ابن خلدون نے یہی بیان فرمائی ہے کہ اہل عرب کا قریش کے سوا کسی اور پر جمع ہونا مشکل تھا۔^(۲) لیکن اس بات کی شرعاً ہرگز گنجائش نہیں کہ لوگوں کے متعصبانہ خیالات کی وجہ سے نااہل افراد کو ذمہ دارانہ منصب حوالے کر دیئے جائیں،^(۳) ایسی صورت میں لوگوں کی خواہشات کے اتباع کے بجائے ان کے خیالات کی اصلاح ضروری ہے۔^(۴)

امید ہے کہ اس تفصیل سے آپ کے تمام سوالات کا جواب ہو گیا ہوگا، اگر پھر بھی کوئی الجھن باقی ہو تو دوبارہ ارشاد فرماویں، ان شاء اللہ اپنی بساط کے مطابق جواب عرض کرنے کی کوشش کروں گا۔

والسلام

۱۴۰۵ھ/۷/۱

(۱) وفي صحيح البخارى كتاب الأحكام ج: ۲ ص: ۱۰۵۷ (طبع قديمى كتب خانة) باب الأمراء من قریش سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول أن هذا الأمر في قریش لا يعاديهم أحد إلا كبه الله على وجهه ما أقاموا الدين. وفيه أيضًا عن ابن عمر رضي الله عنهما قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: لا يزال الأمر في قریش ما بقى منهم اثنان الخ. وكذا في صحيح مسلم ج: ۲ ص: ۱۱۹ (طبع سعيد).

وفي مصنف ابن أبي شيبة رقم الحديث: ۳۳۰۵۵ ج: ۱ ص: ۲۸۵، ۲۸۶ (طبع إدارة القرآن كراتشي) عن أنس رضي الله عنه قال: أتانا رسول الله صلى الله عليه وسلم ونحن في بيت رجل من الأنصار فأخذ بعضادتي الباب ثم قال: "الأئمة من قریش."

(۲) وفي تاريخ ابن خلدون، الفصل السادس والعشرون في اختلاف الأمة في حكم هذا المنصب وشروطه ج: ۱ ص: ۲۰۶ (طبع دار الكتب العلمية بيروت) ولنتكلم الآن في حكمة اشتراط النسب ليتحقق به الصواب في هذه المذاهب فنقول ان الأحكام الشرعية كلها لا بد لها من مقاصد وحكم تشتمل عليها وذلك ان قریشًا كانوا عصبية مضر وأصلهم وأهل الغلب منهم وكان لهم على سائر مضر العزة بالكثرة والعصبية والشرف فكان سائر العرب يعترف لهم بذلك ويستكينون لغلبهم فلو جعل الأمر في سواهم لتوقع افتراق الكلمة بمخالفتهم وعدم انقيادهم ولا يقدر غيرهم من قبائل مضر أن يردّهم عن الخلاف ولا يحملهم على الكثرة فتفرق الجماعة وتختلف الكلمة والشارع محذّر من ذلك حريص على اتفاقهم ورفع التنازع والشتات بينهم لتحصل اللحمة والعصبية وتحسن الحماية بخلاف ما اذا كان الأمر في قریش لأنهم قادرون على سوق الناس بعصا الغلب الى ما يراود منهم فلا يخشى من أحد خلاف عليهم ولا فرقة لأنهم كفيلون حينئذ بدفعها ومنع الناس منها فاشترط نسبهم القرشي في هذا المنصب وهم أهل العصبية القوية ليكون أبلغ في انتظام الملة واتفاق الكلمة الخ.

(۳) وفي صحيح البخارى كتاب العلم ج: ۱ ص: ۱۴ (طبع قديمى كتب خانة) اذا وسد الأمر الى غير أهله فانتظر الساعة. وفيه أيضًا كتاب الرقاق ج: ۲ ص: ۹۶۱ (طبع قديمى) اذا أسند الأمر الى غير أهله فانتظر الساعة.

وراجع للتفصيل الى شرحه في فتح الباري ج: ۱ ص: ۱۹۰ (طبع قديمى كتب خانة) وعمدة القارى ج: ۲ ص: ۳ (طبع مكتبه رشيدية).

(۴) وفي التفسير الكبير تحت آية رقم: ۵۸ من سورة النساء: ويدخل فيه عدل الأمراء مع رعيّتهم وعدل العلماء مع العوام بأن لا يحملوهم على التعصبات الباطلة بل يرشدونهم الى اعتقادات وأعمال تنفعهم في دنياهم وأخراهم.

کسی سیاست دان کا انتخابات کے موقع پر سیاسی جماعت سے کئے ہوئے وعدے کو توڑنے کا حکم

سوال :- حالیہ انتخابات کے نتیجے میں رحیم یار خان میں چند کونسلروں نے اپنا ایک گروپ تشکیل دیا، جس میں فلاں فلاں کونسلر شریک اجلاس ہوئے، اور تمام گروپ کے کونسلروں نے بالاتفاق حلفاً خدا کو حاضر و ناظر جان کر یہ عہد کیا کہ ہم آئندہ انتخاب میں بلدیہ رحیم یار خان کا چیئرمین چودھری عبدالحمید گاندھی کو اور وائس چیئرمین ہارون باجوہ کو بنائیں گے، لیکن چند روز کے بعد دوسرا حلف قرآن پاک پر ہاتھ رکھ کر کر لیا کہ ہم سب میاں عبدالخالق گروپ میں ہیں اور جس کو میاں عبدالخالق جہاں چاہیں استعمال کریں، لیکن پھر اس کے علاوہ اخبارات اور دوسرے ذریعے سے یہی اعلان کیا جاتا رہا کہ ہمارا نامزد چیئرمین عبدالحمید گاندھی ہے، لیکن آخری دن جبکہ چیئرمین کا انتخاب تھا تو دانستہ ان ممبران نے عبدالخالق کو چیئرمین کا ووٹ دیا، اور عبدالحمید گاندھی کو نظر انداز کیا گیا، جبکہ عبدالحمید گاندھی نے ان ممبران سے کہا کہ تم نے میری چیئر مینی کے لئے حلف دیا ہے، تو اب مجھ کو چیئرمین بناؤ تو اس پر ممبران نے کہا کہ یہ سیاسی حلف تھا اور ہم نے تمہارا ووٹ صرف اس لئے استعمال کیا کہ ہمیں مزدور اور خاتون کی نشست مل جائے، اب وہ نشستیں ہم نے حاصل کر لیں، اب تمہاری ہمیں کوئی ضرورت نہیں۔ انتخابات کے ایام ہی میں ان میں سے بعض ممبران نے عوام سے مسجدوں میں بیٹھ کر یہ وعدہ کیا تھا کہ ہم کامیابی کے بعد اپنا ووٹ عبدالخالق کو نہ دیں گے، لیکن ان لوگوں کے اس واضح متضاد عمل اور حلف شکنی اور جان بوجھ کر قرآن پاک پر ہاتھ رکھ کر وعدہ خلافی سے جو دینی اقدار پامال ہوئے اور لوگ اب قرآن پر حلف اٹھانے کو مزاح سمجھنے لگ گئے ہیں، اس کے لئے علمائے دین و مفتیان کرام فتویٰ صادر فرمادیں کہ اگر ان کا یہ عمل دانستہ اور جان بوجھ کر تھا تو شریعت مطہرہ کی رو سے ایسے لوگوں کا کیا مقام ہے؟ ایک اسلامی معاشرے میں یہ لوگ عوام کے نمائندہ بن سکتے ہیں؟ (مرزا محمد رفیق)

جواب :- پہلا معاہدہ تحریری صورت میں ہوا تھا، اس تحریر کو دیکھنے سے معلوم ہوا کہ اس میں حلف یا قسم نہیں تھی، البتہ ایک عہد تھا، شرعاً اس کا حکم یہ ہے کہ اس عہد میں شامل افراد کے لئے اس عہد کی خلاف ورزی بلا عذر جائز نہیں تھی^(۱)، البتہ اگر اس عہد کے بعد ان کو دیانت سے معلوم ہوا کہ جس شخص کو منتخب کرنے کا عہد کیا گیا ہے، دوسرا اس کے مقابلے میں بہتر ہے، تو اس عذر کی وجہ سے ان کے لئے جائز تھا کہ اس عہد کو منسوخ کر کے اس شخص کو منتخب کرتے جو ان کے نزدیک زیادہ بہتر تھا۔ صورت

(۱) فی القرآن الکریم: "وَأَوْفُوا بِالْعَهْدِ إِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُولًا" سورة الاسراء آية: ۳۴.

مسئولہ میں اگر ان لوگوں نے اس قسم کے صحیح عذر کے بغیر عہد شکنی کی تو سخت گناہگار ہوئے اور ایسے لوگ نمائندگی کے اہل نہیں، اور اگر فیصلے کی تبدیلی کسی عذر کی بناء پر تھی تب بھی آخر وقت تک اپنے دلی ارادے کے خلاف اعلان کرتے رہنا جھوٹ ہے، اور وہ بھی سخت گناہ ہے، لہذا جو لوگ اس جھوٹ کے مرتکب ہوئے وہ بھی سخت گناہگار ہوئے^(۱) اور ایسے لوگ بھی نمائندگی کے اہل نہیں تا وقتیکہ وہ اپنے ان گناہوں سے صدقِ دل کے ساتھ توبہ نہ کریں۔^(۲) واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

جماعتِ اسلامی، جمہوریت اور جمعیت علمائے اسلام

کے بارے میں ایک سوال کا جواب

سوال:- ”تحریکِ جمہوریت“ کے نام سے جو جماعت معرضِ وجود میں آئی ہے، جماعتِ اسلامی بھی جس کی حامی ہے، آپ کی اس کے بارے میں کیا رائے ہے؟ کیا جماعتِ اسلامی اور اس کے امیر مودودی صاحب اسلامی نظام کی آڑ لے کر اس ملک کو امریکا کی گود میں ڈالنا چاہتے ہیں، کیا یہ صحیح ہے؟ جماعتِ اسلامی کا یہ موقف کیا درست ہے کہ جمہوریت کی بحالی دراصل اسلامی نظام لانے کی کوشش کا ذریعہ ہے، جس طرح پاکستان حاصل کرنے کا ذریعہ جداگانہ انتخاب ہی تھا۔

۲:- دوسرا مسئلہ جو آج کل ملک میں بڑی شد و مد کے ساتھ پھیلایا جا رہا ہے اور شد و مد کے ساتھ مخالفت بھی کی جا رہی ہے، وہ ہے ”سوشلزم“ اس نظام کی داعی نیشنل عوامی پارٹی ہے، لیکن تائید میں جمعیت علمائے اسلام کے بعض ذمے دار حضرات بھی بیان دے رہے ہیں، جماعتِ اسلامی اس کی مخالفت میں پیش پیش ہے، جمعیت علمائے اسلام کی طرف سے سوشلزم کا نعرہ کیونکر درست اور مطابق عین اسلام ہوگا؟ جمعیت علمائے اسلام اس سلسلے میں جو کچھ کر رہی ہے اس میں آنجناب اور دیگر علماء کس حیثیت سے شامل ہیں؟

جواب:- جہاں تک جماعتِ اسلامی میں شمولیت و عدم شمولیت کا تعلق ہے، اس کا جواب اس مطبوعہ ورق میں موجود ہے، جو آپ کو پہلے ارسال کیا جا چکا ہے۔

رہی تحریکِ جمہوریت کی بات! سو جب متحدہ حزبِ اختلاف نے یہ مہم شروع کی تھی تو حسین شہید سہروردی مرحوم نے حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مدظلہم کو اس تحریک میں شامل ہونے کی

(۱ و ۲) قال اللہ تعالیٰ: ”إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تُؤَدُّوا الْأَمَانَاتِ إِلَىٰ أَهْلِهَا“ الآية: ۵۸ سورة النساء.

فی صحیح مسلم ج: ۲ ص: ۳۲۶ (طبع قدیمی کتب خانہ) قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: ”علیکم بالصدق! فان الصدق یهدی الی البر وان البر یرہد الی الجنة..... وایاکم والکذب! فان الکذب یرہد الی الفجور وان الفجور یرہد الی النار.....“ الحدیث: ۴۷۲۱.

دعوت دی تھی، اس کے جواب میں آپ نے فرمایا تھا کہ: ”ہمارا اصل مطالبہ اسلامی نظام کا قیام ہونا چاہئے، پھر اگر اسلام میں کسی درجے کے اندر جمہوریت ہے تو وہ خود بخود اس مطالبے کے اندر آجائے گی، لیکن نری جمہوریت کی تحریک میں شمولیت سے معذور ہوں۔“ اس جملے سے آپ تحریک جمہوریت کے بارے میں ان کے موقف کا اندازہ کر سکتے ہیں۔

اب سوشلزم کی بات رہ جاتی ہے، تو اس میں کوئی ایسا مسلمان جو اسلام اور اشتراکیت سے واقف ہو، شک نہیں کر سکتا کہ سوشلزم اسلام کے یکسر منافی نظام ہے، اسلام اپنا الگ معاشی نظام رکھتا ہے جو سرمایہ داری اور اشتراکیت دونوں سے مختلف ہے، جو شخص اسلام کے بارے میں تھوڑی سی بھی واقفیت رکھتا ہو وہ سوشلزم کو اسلام کے مطابق نہیں کہہ سکتا۔ موجودہ جمعیت علمائے اسلام کا بھی کوئی ایسا پٹا ہمارے علم میں نہیں ہے جس میں اُس نے سوشلزم کی حمایت کی ہو۔ بلکہ اس الزام کی بعض تردیدیں نظر سے گزری ہیں۔

آخر میں یہ عرض کرنا ہے کہ موجودہ جمعیت علمائے اسلام وہ جمعیت نہیں ہے جس نے قیام پاکستان کی جدوجہد کی تھی اور جس کی بنیاد علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے رکھی تھی، اس جمعیت کا مارشل لاء کے بعد احیاء نہیں کیا گیا، موجودہ جمعیت علمائے اسلام ایک دوسری جماعت ہے جو قیام پاکستان کے بہت بعد قائم ہوئی ہے۔

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مدظلہم اس جماعت کے کبھی رکن نہیں رہے، اور نہ اس کی پالیسی میں حضرت مدظلہم کے مشوروں کا کوئی دخل ہے، لہذا اس کے کسی قول و فعل کی ذمہ داری اُن پر عائد نہیں ہوتی۔

واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفا اللہ عنہ

ھ۱۳۸۸/۲/۲۱

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع

ھ۱۳۸۸/۲/۲۱



﴿کتاب الدعویٰ﴾

﴿والشهادات والقضاء﴾

(دعویٰ، گواہی اور فیصلوں کے مسائل کا بیان)

قانون ”میعادِ سماعت“ کی شرعی حیثیت

(قانون ”میعادِ سماعت“ کی حقیقت، تاریخ، شرعی تصور، دلائل، پچھلے زمانوں میں اس کی موجودگی، اور اس قانون کی حکمت پر مفصل فتویٰ)

سوال:- بعض جدید ترقی یافتہ ممالک میں "Limitation Act" کے نام سے جو اصول و قوانین رائج و نافذ ہیں، ان کی تاریخ کیا ہے؟ اور کیا وہ سراسر غیر اسلامی اصول ہیں؟ اگر یہ اصول و قوانین غیر اسلامی ہیں تو دیوانی و فوجداری مسائل و امور میں چارہ جوئی کی میعاد کا عدم تعین جو عملی خرابیاں پیدا کرتا ہے اس کا تدارک کیونکر کیا جاسکتا ہے خصوصاً اگر اس عدم تعین کو کاٹ کے "Categorical Imperative" کی حیثیت دی جائے تو جائیداد غیر منقولہ کے برسوں پرانے معاملات متاثر ہوتے ہیں، اگر یہ اصول و قوانین غیر اسلامی نہیں تو ان کے اسلامی ہونے کا کیا جواز ہے جبکہ کہا جاتا ہے کہ اسلام کی تاریخ میں شفعہ چھوڑ کر اس نوعیت کے قوانین کبھی نافذ نہیں رہے؟

اگر عنقریب قومی اتحاد برسرِ اقتدار آجائے تو پورا کا پورا اسلام کیونکر نافذ ہوگا اور "Limitation Act" کو کس طرح مشرف بہ اسلام کیا جائے گا؟ یا پھر اُسے کس بناء پر ایک کلمہ گو قانون کی حیثیت حاصل ہوگی؟

جواب:- محترمی و مکرمی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

خدا کرے کہ مزاج گرامی بخیر ہوں، آمین۔

گرامی نامہ باعثِ مسرت و افتخار ہوا، آپ کے سوال کے بارے میں عرض یہ ہے کہ قانونِ میعادِ سماعت (Limitation Act) سراسر غیر اسلامی قانون نہیں ہے، اور یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ ”اسلام کی تاریخ میں شفعہ کو چھوڑ کر اس نوعیت کے قوانین کبھی نافذ نہیں رہے۔“ واقعہ یہ ہے کہ اسلامی عدالتیں بھی میعادِ سماعت کا لحاظ کرتی رہی ہیں، خاص طور سے ترکی خلافت کے دور میں عالمِ اسلام کے تمام قاضی خلیفہ وقت کی مقرر کردہ میعادِ سماعت پر عمل کرتے رہے ہیں۔ اور فقہائے اسلام نے اُن کے اس عمل کی نہ صرف توثیق و تائید کی ہے بلکہ خلیفہ وقت کے منشور کے جاری ہونے کے بعد اس کو واجب العمل قرار دیا ہے۔ ”الاشباہ والنظائر“ کے مشہور شارح علامہ حمویؒ نے اپنے دور کے بارے میں لکھا ہے کہ ہمارے زمانے کے سلاطین نے تمام قاضیوں کو یہ حکم دیا ہوا ہے کہ وہ وقف اور وراثت کے سوا کوئی

دعویٰ بناءً دعویٰ قائم ہونے کے پندرہ سال بعد قابل سماعت نہ سمجھیں، اور فتاویٰ حامد یہ میں (جس کی تنقیح علامہ ابن عابدین شامی نے کی ہے) اس مسئلے پر چاروں مذاہب (حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی) کے فقہاء کے فتاویٰ نقل کئے ہیں جو اس بات پر یک زبان ہیں کہ سلطان کی طرف سے اس ممانعت کے اجراء کے بعد پندرہ سال بعد کوئی مقدمہ داخل نہ کیا جائے۔^(۱) البتہ علامہ خیر الدین رملی نے فتاویٰ خیر یہ میں یہ تصریح فرمائی ہے کہ اس بارے میں ہر خلیفہ کی طرف سے از سر نو حکم جاری ہونا میعاد سماعت کی پابندی کے لئے ضروری ہے۔

البتہ مختلف زمانوں میں مختلف میعادیں مقرر کی گئی ہیں، فقہ حنفی کی کتابوں میں بعض مقدمات کے پندرہ سال، بعض کے لئے تینتیس سال اور بعض کے لئے چھتیس سال کی مدتیں مقرر کی گئی ہیں، مثلاً درمختار میں ہے: ”القضاء مظهر لا مثبت ويتخصص بزمان ومكان وخصومة حتى لو أمر السلطان بعدم سماع الدعوى بعد خمسة عشر سنة فسمعها لم ينفذ، قلت: فلا تسمع الآن بعدها إلا بأمر.“

اس کے تحت علامہ شامی نے اس مسئلے پر کافی مفصل بحث کی ہے، اور اسی میں یہ بھی لکھا ہے کہ: ”قال المتأخرون من أهل الفتوى: لا تسمع الدعوى بعد ست وثلاثين سنة إلا أن يكون المدعى غائباً أو صبيّاً.... الخ.“^(۲)

بلکہ علامہ شامی نے شمس الائمہ سرخسی کی مبسوط سے نقل کیا ہے کہ: ”إذا ترك الدعوى ثلاثاً وثلاثين سنة ولم يكن مانع من الدعوى ثم ادعى لا تسمع دعواه.“ (رد المحتار، کتاب القضاء مطلب فی عدم سماع الدعوى بعد خمس عشرة سنة ج: ۲ ص: ۳۴۴، مطبوعہ دیوبند)۔^(۳)

(۲) ج: ۵ ص: ۴۱۹ (طبع سعید) نیز دیکھئے حاشیہ نمبر ۴۔

(۳) رد المحتار ج: ۵ ص: ۴۲۲ (طبع سعید)۔

(۴) کتاب القضاء ج: ۵ ص: ۴۲۲ (طبع سعید)۔

وفی الفتاویٰ تنقیح الحامدیة، کتاب الدعوى ج: ۲ ص: ۳ (طبع مکتبہ حبیبیہ کوئٹہ) وقال المتأخرون من أهل الفتوى لا تسمع الدعوى بعد ست وثلاثين سنة إلا أن يكون المدعى غائباً أو صبيّاً أو مجنوناً أو المدعى عليه أميراً جائراً يخاف منه كذا في الفتاوى العتابة.

وقال في البحر عن المبسوط ترك الدعوى ثلاثاً وثلاثين سنة ولم يكن مانع من الدعوى ثم ادعى لا تسمع دعواه لأن ترك الدعوى مع التمكن يدل على عدم الحق ظاهراً..... والحاصل من هذه النقول أن الدعوى بعد مضي ثلاثين سنة أو بعد ثلاثة وثلاثين لا تسمع إذا كان الترك بلا عذر من الأعذار المارة لأن تركها هذه المدة مع التمكن يدل على عدم الحق ظاهراً.... الخ.

وفی الفتاویٰ الکاملیة کتاب الدعوى ص: ۱۱۳.

وفی مجمع الأنهر شرح ملتقى الأبحر فصل قضاء المرأة فی غیر حد وقود ج: ۶ ص: ۸۸ لو أمر السلطان بعدم سماع الدعوى بعد خمس عشرة سنة يجب عليه عدم سماعها ولو سمعها وقضى لا ينفذ لأنه لا يصير قاضياً بالنسبة إلى تلك الحادثة كما في المنع.

(باقی اگلے صفحے پر)

شمس الائمہ سرحدی خلافت عباسیہ کے دور کے ہیں، جس سے واضح ہوا کہ میعادِ سماعت کا یہ تصور خلافت عباسیہ میں بھی موجود تھا، افسوس ہے کہ میں اس وقت پاؤں کے ایک زخم کی وجہ سے صاحبِ فراش اور چلنے سے معذور ہوں، اس لئے دوسری کتابوں کی مراجعت اس وقت ممکن نہیں، ورنہ اس پر شاید اور بھی قدیم حوالے دستیاب ہو جاتے، تاہم صرف علامہ شامیؒ کی مذکورہ تصریحات سے بھی اتنا واضح ہو جاتا ہے کہ میعادِ سماعت کا تصور نہ صرف غیر اسلامی نہیں، بلکہ اسلامی عدالتیں ہر دور میں اس پر کسی نہ کسی شکل میں عمل پیرا رہی ہیں۔

البتہ یہاں یہ شبہ ہو سکتا ہے، اور شاید آپ کو بھی یہی شبہ ہوا ہو کہ محض تاخیر کی بنا پر ایک صاحبِ حق کو حق سے محروم کرنے کا کیا جواز ہے؟

موجودہ قوانین میں اس سوال کا جواب نصف (Equity) کے ان مقولوں کے ذریعے دیا گیا

ہے کہ:-

"The Law aids the diligent and not the indolent."

قانون چوکس لوگوں کی مدد کرتا ہے، غافلوں کی نہیں۔

"There Should be an end to Litigation"

عدالتی محاصمتوں کی کوئی انتہا ہونی چاہئے۔

لیکن یہ مقولے موجود قوانین کے حق میں اس لئے پورے اطمینان بخش نہیں ہوتے کہ وہاں دیانت اور قضاء کی کوئی تعریف کم از کم عملاً نہیں ہے، بلکہ جو حق عدالت سے مسترد ہو گیا، عملاً وہ حق ہی نہیں رہا۔ اس کے بجائے اسلامی فقہ میں دیانت اور قضاء کے احکام ساتھ ساتھ چلتے ہیں لہذا اگر عدالت نے کسی حق کا تصفیہ کرنے سے انکار کر دیا ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ حق نہیں رہا، بلکہ وہ حق موجود ہے اور جس کے ذمے حق ہے اُس پر دیانت فرض ہے کہ وہ اُسے صاحبِ حق تک پہنچائے، خواہ کتنا

(بقیہ حاشیہ گزشتہ) وفي الفتاوى الأنقروية ج: ۲ ص: ۵۸ وفي المبسوط رجل ترك الدعوى ثلاثاً وثلاثين سنة ولم يكن له مانع من الدعوى ثم ادعى له لا تسمع دعواه لأن ترك الدعوى مع التمكن عليه يدل على عدم الحق ظاهراً. وفي درر الحکام المادّة: ۱۶۶۰ ج: ۳ ص: ۲۶۱ (طبع مكتبة علميه) اذا ادعى أحد بأن العقار كالدار والكرم الذي في تصرف شخص آخر مدة خمس عشرة سنة بلا نزاع بأنه ملكه أو أن له حصة فيه فلا تسمع دعواه اهـ. (وكذا في الشامية ج: ۵ ص: ۴۲۲ طبع سعيد).

وفي شرح المجلة للأتاسي رقم المادّة: ۱۶۶۳ ج: ۵ ص: ۱۷۷ قال المتأخرون من أهل الفتوى لا تسمع الدعوى بعد ست وثلاثين سنة إلا أن يكون المدعى غائباً أو صبيّاً أو مجنوناً وليس لهما ولي أو المدعى عليه أميراً جابراً. وفيها أيضاً رقم المادّة: ۱۶۷۰ ج: ۵ ص: ۱۸۷ اذا ترك المورث الدعوى مدة يتركها الوارث أيضاً مدة وبلغ مجموع المدتين حدّ مرور الزمان فلا تسمع.

زمانہ بیت چکا ہو، اگر وہ ایسا نہ کرے گا تو عدالت خواہ اُسے کچھ نہ کہے، لیکن وہ گنہگار ہوگا، اسی لئے فقہاء کا یہ مقولہ ”الاشباہ والنظائر“ وغیرہ میں درج ہے کہ: ”الحق لا يسقط بتقادم الزمان“ یعنی ”حق“^(۱) زمانہ گزر جانے کی بناء پر ساقط نہیں ہوتا“ اس سے مراد یہی ہے کہ میعادِ سماعت گزر جانے کے باوجود وہ حق موجود ہے جس کا ایک اثر تو اخروی ہے کہ اس حق کو تلف کرنے والا گنہگار ہے، دوسرا اثر دنیوی ہے کہ جس شخص کو بھی اس حق تلفی کا یقینی علم ہوگا وہ اس پر فاسق کے احکام جاری کرے گا، جس سے اس کے ساتھ اس کے سارے معاملات متاثر ہوں گے، تیسرا اثر یہ ہے کہ اگرچہ عدالت اس مسئلے کو سننے سے انکار کر چکی، لیکن اگر خلیفہ کے پاس اپیل پہنچے اور وہ محسوس کرے کہ مقدمہ جان دار ہے اور اس میں چال بازی بظاہر نہیں ہے تو فقہاء نے لکھا ہے کہ وہ اسے کسی قاضی کے پاس بھیج سکتا ہے، اس صورت میں قاضی اس کی سماعت کرے گا (شامی ج: ۴ ص: ۳۴۳)۔^(۲)

نیز ایسی صورت میں صاحب حق قاضی کو ثالث بنا کر بھی فیصلہ کرا سکتا ہے۔

اس سے صاف واضح ہے کہ صرف زبانی طور پر نہیں بلکہ عملاً بھی میعادِ سماعت سے حق ساقط

(۱) وفي رد المحتار ج: ۵ ص: ۴۲۰ (طبع سعيد) قد استفيد من كلام الشارح أن عدم سماع الدعوى بعد هذه المدة إنما هو للنهي عنه من السلطان فيكون القاضي معزولاً عن سماعها لما علمت من أن القضاء يتخصص فلذا قال ألا بأمر أي فإذا أمر بسماعها بعد هذه المدة تسمع وسبب النهي قطع الحيل والتزوير فلا ينافي ما في الاشباہ وغيرها من أن الحق لا يسقط بتقادم الزمان ولذا قال في الاشباہ أيضاً ويجب عليه سماعها أي يجب على السلطان الذي نهى قضاته عن سماع الدعوى بعد هذه المدة أن يسمعها بنفسه أو يأمر بسماعها كي لا يضيع حق المدعى والظاهر أن هذا حيث لم يظهر من المدعى امارة التزوير.... الخ.

وفي شرح المجلة رقم المادة: ۱۶۷ ص: ۹۹۶ لا يسقط الحق بتقادم الزمان فإذا أقر المدعى عليه واعترف صراحة في حضور الحاكم بأن حق المدعى عنده في الحال على الوجه الذي يدعيه وكان قد مر الزمان على الدعوى فلا يعتبر مرور الزمان ويحكم بموجب اقرار المدعى عليه.

وفي تكملة حاشية رد المحتار ج: ۱ ص: ۳۳۲ ثم اعلم ان عدم سماعها ليس مبنياً على بطلان الحق حتى يرد أن هذا قول مهجور لأنه ليس ذلك حكماً بطلان الحق، وإنما هو امتناع عن القضاة عن سماعها خوفاً من التزوير ولدلالة الحال كما دل عليه التعليل وآلا فقد قالوا ان الحق لا يسقط بالتقادم كما في قضاء الاشباہ فلا تسمع الدعوى في هذه المسائل مع بقاء حق للأخرة ولذا لو أقر به يلزمه كما في مسألة عدم سماع الدعوى بعد مضي خمس عشرة سنة اذا نهى السلطان عن سماعها كما تقدم قبيل باب التحكيم فاعنتم.... الخ.

وفي تكملة حاشية رد المحتار ج: ۷ ص: ۴۸۷ (طبع سعيد) ثم اعلم أن عدم سماع الدعوى بعد مضي ثلاثين سنة أو بعد الاطلاع على التصرف ليس مبنياً على بطلان الحق ذلك وإنما هو مجرد منع للقضاة عن سماع الدعوى مع بقاء الحق لصاحبه حتى لو أقر به الخصم يلزمه ولو كان ذلك حكماً ببطلانه لم يلزمه ويدل على ما قلناه تعليلهم للمنع بقطع التزوير والحيل كما مر فلا يرد ما في قضاء الاشباہ من أن الحق لا يسقط بتقادم الزمان ثم رأيت التصريح بما نقلناه في البحر قبيل فصل دفع الدعوى..... الخ.

(۲) وفي رد المحتار ج: ۵ ص: ۴۲۰ يجب على السلطان الذي نهى قضاته عن سماع الدعوى بعد هذه المدة ان يسمعها بنفسه أو يأمر بسماعها كي لا يضيع حق المدعى والظاهر ان هذا حيث لم يظهر من المدعى امارة التزوير.... الخ.

نہیں ہوتا، میعادِ سماعت مقرر کرنے کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ مدتِ دراز گزرنے کے بعد بھی اگر حق سماعت باقی رکھا جائے تو اس سے ایک طرف تو مقدمات میں مکر و فریب اور جھوٹی گواہیوں کا امکان بڑھ جائے گا، کیونکہ مدتِ دراز گزرنے کے بعد واقعے کے عینی گواہ ملنے مشکل ہوتے ہیں، اور مل بھی جائیں تو واقعے کی پوری تفصیلات ذہن میں نہیں رہتیں، اس لئے اس قسم کے مقدمات عدالتوں میں داخل کرنے کا مطلب یہ ہوگا کہ مقدمات میں غیر ضروری تعویق ہو اور لائیکل مسائل کھڑے ہو جائیں، میعادِ سماعت کی یہی حکمت ہمارے فقہاء نے بھی بیان فرمائی ہے۔

خلاصہ یہ کہ اسلامی فقہ میں اس کی بنیاد موجود ہے، اور جب کبھی شریعت کی بنیاد پر موجودہ قوانین کی تدوین نو کی جائے گی تو اس قانون کو بالکل مسترد یا منسوخ نہیں کیا جائے گا، بلکہ اس پر مذکورہ فقہی بنیادوں پر نظر ثانی کی جائے گی، اور میں سمجھتا ہوں کہ اس قانون میں اتنی ترمیم کی ضرورت نہیں ہوگی جتنی دوسرے بہت سے قوانین میں ضرورت پیش آئے گی۔^(۱) والسلام

۲۳ رمضان المبارک ۱۳۹۷ھ

(فتویٰ نمبر ۹۸۷/۲۸ ج)

مسجد کو منہدم ہونے سے بچانے کے لئے بھی دعوے میں جھوٹ اور خلافِ واقعہ بات کہنا جائز نہیں

سوال :- جناب محترم!

دوسرا استفتاء مذکورہ مسجد کے متعلق کچھ اس طرح مطلوب ہے، چونکہ علاقے کے کچھ لوگ اس کو مسجد ہی تسلیم نہیں کرتے، ان کا موقف یہ ہے کہ اس علاقے میں مسجد کی ضرورت نہیں ہے، بلکہ اس پلاٹ پر لائبریری یا اسی قسم کا کوئی سینٹر وغیرہ علاوہ مسجد کے قائم ہونا چاہئے اور اس سلسلے میں حضرات نے اپنا اثر و رسوخ استعمال کر کے مسجد ہذا منہدم کرانے کا حکم جاری کرادیا، اس صورتِ حال کے پیش

(۱) ”قانون میعادِ سماعت“ سے متعلق مزید اہم تفصیلات کے لئے حضرت والا دامت برکاتہم العالیہ کی کتاب ”عدالتی فیصلے“ ج ۲: ص ۲۱۹ تا ص ۲۳۶ میں حضرت والا دامت برکاتہم العالیہ کا ایک اہم فیصلہ بعنوان ”عاصبانہ قبضہ اور حق ملکیت“ ملاحظہ فرمائیں۔

نظر اس کے سوا اور کوئی چارہ کار نہ تھا کہ اس معاملے کو عدالت میں پیش کیا جائے، اور فوری طور سے مسجد کو منہدم نہ کرنے کا حکم امتناعی عدالت سے لے لیا جائے، چنانچہ مسجد کمیٹی کے ایک عہدے دار نے ایک وکیل صاحب سے مل کر تمام حالات بتائے اور انہیں متعلقہ تمام کاغذات دکھائے، وکیل صاحب نے اطمینان دلایا کہ ان شاء اللہ مسجد منہدم نہیں ہوگی۔ عدالت سے میں کوشش کر کے مسجد کو منہدم نہ کرنے کا حکم جاری کراؤں گا۔ پھر انہوں نے کئی صفحات پر مشتمل ایک دعویٰ نامہ تیار کر کے اسے ٹائپ کروایا، اس تحریری دعوے کو عدالت میں داخل کرنے سے قبل مسجد کمیٹی کے ایک عہدے دار سے دستخط کروائے اور خود وکیل صاحب نے بھی اس پر دستخط کئے۔

مذکورہ عہدے دار کے دستخط کرنے کے بعد وکیل صاحب نے بتایا کہ میں نے اس تحریر میں ایک پوائنٹ یہ بھی دکھایا ہے کہ اس پلاٹ پر جس پر اب مسجد قائم ہے اس پر علاقے کے لوگ گزشتہ کئی سالوں سے نمازیں ادا کر رہے ہیں، جبکہ حقیقتاً ایسا نہیں، لیکن استفسار پر وکیل صاحب نے کہا کہ مسجد کو منہدم ہونے سے بچانے کے لئے میں نے ایک قانونی اور عدالتی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے یہ پوائنٹ رکھا ہے۔ الحمد للہ وکیل صاحب بھی مسلمان اور پابندِ صوم و صلوٰۃ ہیں، اور پھر وکیل صاحب نے مزید وضاحت کی کہ ہمارے اس بیان سے قائم شدہ مسجد ان شاء اللہ اُمید قوی ہے کہ عدالت کی جانب سے مسجد کو منہدم نہ کرنے کا حکم امتناعی جاری کر دیا جائے گا۔ انہوں نے مزید تقویتِ دلائل کی کہ ہمارے اس بیان سے کسی کو ذاتی نقصان پہنچانا یا کسی کا حق مارنا مقصود نہیں، بلکہ صرف اور صرف اللہ کے گھر کو شہید ہونے سے بچانا مقصود ہے، اللہ تعالیٰ ہماری نیت کو جانتا ہے۔

چونکہ حکامِ بالا کی جانب سے مسجد کو منہدم کرنے کا حکم جاری ہو چکا تھا، ان کا عملہ کسی بھی وقت آکر اسے منہدم کر سکتا تھا، اب صرف یہی صورت تھی کہ عدالت کا حکم ہی انہیں اس کو منہدم کرنے سے روک سکتا تھا، لہذا اللہ تعالیٰ سے معافی کے خواستگار ہوتے ہوئے مسجد کمیٹی کے یہ عہدے دار خاموش رہے اور وکیل صاحب نے عدالت میں کاغذات داخل کر دیئے، عدالت نے حکم امتناعی جاری کرنے سے انکار کر دیا اور ہمارا پیش کردہ مقدمہ خارج کر دیا۔ اس کے بعد مسجد کو منہدم کرنے کے لئے سرکاری عملہ موقع پر پہنچ گیا، لیکن ان پر کیا ہیبت طاری ہوئی کہ وہ مسجد کو منہدم کئے بغیر واپس چلے گئے، اور ابھی تک اللہ کے فضل سے مسجد قائم و دائم ہے، لوگ باجماعت پنج وقتہ نمازیں ادا کر رہے ہیں۔

جواب:- دعوے میں جھوٹ اور خلاف واقعہ بات کہنا ہرگز جائز نہیں تھا۔ اس ناجائز کام پر

صدقِ دل سے توبہ ضروری ہے، مسجد کی ہر قیمت پر تعمیر فرض نہیں، جھوٹ سے بچنا فرض ہے۔^(۱)

واللہ اعلم

۱۴۰۸/۹/۲ھ

(فتویٰ نمبر ۱۷۹۶/۳۹ و)

حضرت ولید بن عقبہؓ کے واقعہ حد میں خلیفہ راشد حضرت عثمانؓ

پر ایک اشکال کا جواب

سوال:- بخدمت اقدس مخدومی المعظم استاذی المحترم زید مجدہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

امید ہے کہ جناب والا بخیر و عافیت ہوں گے، دُعا ہے اللہ تعالیٰ جناب کے سایہ کو دائم قائم

(۱) وفي الآية: "ثُمَّ نَبْتَهِلُ فَنَجْعَلُ لَعْنَةَ اللَّهِ عَلَى الْكَاذِبِينَ" (آل عمران: ۶۱).

وفي مشكوة المصابيح ج: ۱ ص: ۱۷ كتاب الايمان، باب الكبائر وعلامات النفاق الفصل الأول (طبع قديمي كتب خانہ) عن أبي هريرة رضي الله عنه: آية المنافق ثلاث، زاد مسلم: وان صام وصلى وزعم انه مسلم ثم اتفقا: اذا حدث كذب واذا وعد أخلف واذا أوتمن خان. (متفق عليه).

وفي مشكوة المصابيح ج: ۲ ص: ۴۱۲ (طبع قديمي) اياكم والكذب وان الكذب يهدي الى الفجور وان الفجور يهدي الى النار، وما يزال الرجل يكذب ويتحرى الكذب حتى يكتب عند الله كذابا. (متفق عليه).

وفي مشكوة المصابيح كتاب الامارة والقضاء باب الأقضية والشهادات، الفصل الأول (طبع قديمي) عن أم سلمة رضي الله عنها أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: إنما أنا بشر وانكم تختصمون الي ولعل بعضكم ان يكون ألحن بحجته من بعض فاقضى له على نحو ما أسمع منه فمن قضيت له بشيء من حق أخيه لا يأخذه فانما أقطع له قطعة من النار. (متفق عليه).

وفي الدر المختار ج: ۶ ص: ۴۲۷ (طبع سعيد) الكذب مباح لاحياء حقه ودفع الظلم عن نفسه والمراد التعريض لأن عين الكذب حرام قال وهو الحق قال تعالى: "قُتِلَ الْخَرَّاصُونَ"

وفي الشامية والضابط فيه كما في تبين المحارم وغيره عن الأحياء ان كل مقصود محمود يمكن التوصل اليه بالصدق والكذب جميعا فالكذب فيه حرام. وفيها أيضا بعد أسطر قال عليه الصلاة والسلام: كل كذب مكتوب لا محالة الا ثلاثة الرجل مع امرأته أو ولده والرجل يصلح بين اثنين والحرب فإن الحرب خدعة. قال الطحاوي وغيره وهو محمول على المعاريض لأن عين الكذب حرام قلت وهو الحق قال تعالى: "قُتِلَ الْخَرَّاصُونَ" وقال عليه الصلاة والسلام: الكذب مع الفجور وهما في النار، ولم يتعين عين الكذب للنجاة وتحصيل المرام.... الخ.

وفي الدر المختار أيضا بعده ج: ۶ ص: ۴۲۸ (طبع سعيد) وللصلح جاز الكذب أو دفع ظالم.... الخ. وفي خلاصة الفتاوى ج: ۴ ص: ۳۴۶ (طبع رشيدية كوئته) يجوز الكذب في ثلاثة مواضع في الصلح بين الناس وفي الحرب، ومع امرأته.... الخ.

وفي سكب الأنهر كتاب الكراهية فصل في المتفرقات ج: ۲ ص: ۵۵۲ (طبع دار احياء التراث العربي بيروت) والكذب حرام الا في الحرب للخدعة وفي الصلح بين اثنين وارضاء الأهل، وفي دفع الظالم عن الظلم والمراد التعريض لأن عين الكذب حرام، قال في المجتبى وهو الحق قال تعالى: "قُتِلَ الْخَرَّاصُونَ".

فرمائے آمین۔ آپ سے اس دور کے اندر اللہ تعالیٰ نے دین کی حفاظت کا جو کام لیا ہے اور لے رہے ہیں، اس کی مثال ملنا مشکل ہے، یہ پوری اُمت پر آپ کا احسان ہے، مشکل سے مشکل مسئلے کا حل آپ کی کتب میں ملتا ہے، بہت دل خوش ہوتا ہے، اللہم زد فزد، آمین۔

اس وقت حدِ شربِ خمر کی بحث میرے زیرِ مطالعہ ہے، جناب والا کی عظیم تالیف ”تکملہ“ سے بہت رہنمائی ملی ہے، اس وقت ایک ذہنی الجھن پیدا ہو گئی ہے، جس کو حل کرانے کے لئے خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔ ساتھ نادم بھی ہوں کہ آپ کا وقت ضائع کر رہا ہوں، اللہ تعالیٰ جناب والا کو اجر عظیم عطا فرمائے، آمین۔

میری پریشانی یہ ہے کہ ولید بن عقبہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی پرورش میں رہ چکے ہیں، ان کے کردار سے واقف ہیں، جب کوفہ کے حاکم بنائے گئے تو ان کے خلاف سازش تیار کی گئی کہ انہوں نے شراب پی ہے، اور وہی سازشی لوگ شراب پینے کی شہادت حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے پاس ولید بن عقبہ کے خلاف دیتے ہیں، اس پر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ولید کو طلب کر کے اس شہادت کے حوالے سے ان سے جواب طلبی کرتے ہیں، اور وہ جواب دیتے ہیں کہ ”فواللہ انہما لخصمان موتوران“ لیکن اس جواب کو پذیرائی نہیں بخشی گئی اور ان پر حد جاری کی گئی۔

اس پر میرا شبہ ہے جو یقیناً غلط ہوگا، لیکن اپنی غلطی مجھ پر واضح نہیں ہے، اس لئے جناب کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔

شبہ یہ ہے کہ جب مدعا علیہ گواہان کو مجروح اور جرح بھی خصوصاً مجرد نہ ہو بلکہ وجہ بھی بیان کرے کہ گواہان ان کے سخت دشمن ہیں، تو پھر انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ صفائی کا موقع دیا جائے تاکہ وہ ان کی دشمنی کو ثابت کرے، خصوصاً حدود کے اندر احتیاط بہت ضروری ہے جو شبہات سے ٹل جاتی ہے۔

فقہاء نے بھی عدالتی طریقہ کار میں ملزم کو صفائی کا موقع دینے کا ذکر کیا ہے۔

حضرت والا نے تکملہ فتح الملہم ج: ۲ ص: ۴۹۸ تا ۵۰۲ میں اس واقعے پر تفصیل سے بحث کی

ہے، جناب والا کا یہی رُحمان ہے کہ محض شہادت کی بناء پر ان پر حد جاری ہوئی ہے، ورنہ وہ اس کردار کے آدمی نہیں تھے، اور آپ نے یہ بھی لکھا ہے کہ ابتداء کے اندر خود حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو بھی حد جاری کرنے میں تردد تھا، بلکہ تکملہ کے پیرا نمبر ۷ ص: ۵۰۱ پر لکھا ہے کہ ”أَنَّ سَيِّدَنَا عَثْمَانَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ لَمْ يَزَلْ يَشْكُ فِي صَحَّةِ شَهَادَةِ الشُّهُودِ عَلَى الْوَلِيدِ“ اس وضاحت سے میرا شبہ مزید مضبوط ہو جاتا ہے کہ ان کو صفائی کا موقع ملنا چاہئے تھا کہ گواہان کی دشمنی کو ثابت کرتے اور حد سے بچ جاتے،

مگر ایسا نہ ہوا۔

مجھے اس شبہ کے اظہار پر بھی تردد لگتا ہے کہ چونکہ یہ عظیم ہستی کا فعل ہے جو یقیناً صحیح ہوگا، اور میرا شبہ کرنا غلط ہوگا، اس پر توبہ کرتا ہوں، چونکہ ایک عرصہ تک عدالتی کام سے واسطہ رہا ہے، وہاں ضابطہ فوجداری کی دفعہ ۳۴۲ کے تحت ملزم کو صفائی کا موقع دیا جاتا ہے، اس عادت کی وجہ سے یہ شبہ پیدا ہوا ہے، جس کا ذکر کر دیا ہے، آخر میں دعا کی درخواست ہے۔

والسلام
جناب کا شاگرد

(قاضی) بشیر احمد عفا اللہ عنہ
باغ، آزاد کشمیر
۲۰۰۵/۳/۱۴ء

جواب:- گرامی قدر مکرم جناب مولانا قاضی بشیر احمد صاحب زید مجدکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

گرامی نامہ موصول ہوا۔ بات دراصل یہ ہے کہ تاریخی روایات سے اس دور کے کسی مقدمے کی مکمل کارروائی اور اس کی تفصیلات کا پورا علم نہیں ہوتا۔ راوی اپنی ترجیحات کے مطابق جو حصہ روایت کرنا مناسب سمجھتے ہیں، روایت کرتے ہیں، باقی چھوڑ دیتے ہیں۔ یہ بات ممکن نہیں ہے کہ ولید بن عقبہ رضی اللہ عنہ کو صفائی کا موقع نہ دیا گیا ہو، قاعدے سے اگر انہوں نے گواہوں پر جرح کی تو اس جرح کا بار ثبوت بھی اُن پر ہونا تھا، اور شاید وہ اسے مکمل طور پر ثابت نہ کر سکے ہوں، اتنا عرصہ گزر جانے کے بعد ہمارے لئے ایک خلیفہ راشد کے فیصلے کے بارے میں مطمئن ہونے کے لئے یہ احتمال بھی کافی ہے۔^(۱)

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

بندہ محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۴۲۶/۲/۲۱ھ

مدعا علیہ کی غیر موجودگی میں مدعی سے رقم لے کر

اس کے حق میں فیصلہ نافذ نہیں ہوگا

سوال:- تحصیل مولوی صاحب کے پاس کسی قسم کا تنازعہ آگیا، جناب کے پاس فیصلہ

شریعت کی درخواست کی گئی، مولوی صاحب نے مدعی اور مدعا علیہ کو بلا کر بیان لئے، بیان لے کر ہر دو فریقین کو تاریخ دے دی، تاریخ سے قبل مدعی نے جا کر مولوی صاحب کو تھوڑی رقم روپیہ دیا، اور مدعا علیہ

(۱) تفصیل کے لئے تکملة فتح الملہم ج: ۲ ص: ۵۰۲ تا ۵۰۸ ملاحظہ فرمائیں۔

کے کوئی آدمی مخاصم تھے، یعنی دشمن مخاصمان سے شہادت لے کر عدم موجودگی مدعا علیہ کے مولوی صاحب نے مدعی کے حق میں فیصلہ لکھ دیا، مدعی نے تاریخ سے قبل مدعا علیہ کو پڑھ کر سنایا، مدعا علیہ نے وہ فیصلہ نہ مانا، لہذا علماء الدین نے آگے دوبارہ درخواست کی کہ اس مسئلے پر غور فرمائیں چونکہ یہ مسئلہ غور کے قابل ہے، عند شریعت محمدی و مذہب حنفیہ کے مولوی صاحب کا حکم یک طرفہ نافذ ہوگا یا نہیں؟

(مقامی دارالافتاء کی طرف سے جواب)

الجواب: ”وَمَنْ يَعْصِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ“ الآية، ”وَمَنْ يَعْصِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَيَتَعَدَّ حُدُودَهُ يُدْخِلْهُ نَارًا خَالِدًا فِيهَا وَلَهُ عَذَابٌ مُهِينٌ“^(۱) دوسری جگہ ہے: ولا تصح ولاية القاضي حتى يجتمع في المولى شرائط الشهادة ويكون من أهل الاجتهاد^(۲) دوسری جگہ ہے: ولو كان القاضي عدلاً ففسق بأخذ الرشوة أو غيره كالزنا وشرب الخمر^(۳) تیسری جگہ ہے: وينبغي للمقلد أن يختار من هو الأقدر والاولى لقوله عليه السلام: من قلد انساناً عملاً وفي رعيته من هو اولى منه فقد خان الله ورسوله وجماعة المسلمين، وفي حد الاجتهاد كلام عرف في اصول الفقه حاصله أن يكون صاحب حديث له معرفة بالفقه ليعرف معاني الآثار او صاحب فقه له معرفة بالحديث لنلا يشتغل بالقياس في المنصوص عليه. (الهداية مع الدراية ص: ۱۳۲، كتاب ادب القاضي)^(۴)

چوتھی جگہ: قال ولا يقضى القاضي على غائب الا ان يحضر من يقوم مقامه وقال الشافعي يجوز لوجود الحجة وهي البينة فظهر الحق ولنا ان العمل بالشهادة لقطع المنازعة ولا منازعة بدون الانكار ولم يوجد، ولأنه يحتمل الاقرار والانكار من الخصم فيشتبه وجه القضاء لأن أحكامهما مختلفة. (الهداية مع الدراية ص: ۱۳۲، كتاب ادب القاضي)^(۵)

والعدو لا تقبل شهادته على عدوه اذا كانت دنيوية ولو قضى القاضي بها لا ينفذ ذكره يعقوب باشا فلا يصح قضاؤه عليه^(۶) دوسری جگہ: اخذ القضاء برشوة للسلطان أو لقومه وهو عالم بها أو بشفاعته، جامع الفصولين وفتاوى ابن نجيم أو ارتشى وهو أو أعوانه بعلمه شربلالية وحكم لا ينفذ حكمه. (الدر المختار كتاب القضاء ص: ۳۰۶)^(۷)

(۱) سورة النساء آية: ۱۴.

(۲) الهداية ج: ۳ ص: ۱۳۹ كتاب ادب القاضي (طبع رحمانیہ).

(۳) حوالہ سابقہ۔

(۴) الهداية ج: ۳ ص: ۱۴۰ كتاب ادب القاضي (طبع رحمانیہ).

(۵) الهداية ج: ۳ ص: ۱۵۰ (طبع رحمانیہ).

(۶) الدر المختار ج: ۵ ص: ۳۵۶، ۳۵۷ (طبع سعید).

(۷) الدر المختار ج: ۵ ص: ۳۶۲، ۳۶۳ (طبع سعید).

ہذا مشتمل علی ثلاثہ صور: ۱- رشوت ستانی، ۲- شہادت دُشمن بر دُشمن، ۳- عدم موجودگی مدعا علیہ، جبکہ بیان کیا جاتا ہے کہ اگر تین صورتوں میں سے ایک صورت قاضی کے لئے ہو تو قضاء قاضی منعدم کی جاتی ہے، لہذا تین صورتوں کا اجراء من القاضی ہو جائے تو اس کی قضاء بطریقِ اولیٰ نافذ نہیں ہوگی، بحوالہ ہدایہ، درمختار اور تمام کتب الفقہاء اور مع نص کے قضاء رد کی جاتی ہے۔

المحبیب مصیب

احقر العباد مظفر الدین عفی عنہ

(جواب از حضرت والا دامت برکاتہم)

جواب:- جواب بالا درست ہے، صورتِ مسئلہ میں اگر سائل کا بیان درست ہے تو تین وجوہ سے مولوی صاحب کا فیصلہ شرعاً نافذ نہیں ہے، ایک یہ کہ انہوں نے مدعا علیہ کی عدم موجودگی میں فیصلہ کیا، وفی الدر المختار: ولا یقضی علی غائب ولا لہ ای لا یصح بل لا ینفذ علی المفتی بہ بحر (الشامی ج: ۴ ص: ۵۲)۔ دوسرے یہ کہ مدعا علیہ کے دُشمن سے اس کے خلاف گواہی قبول کی گئی، والعدو لا تقبل شہادته علی عدوہ اذا کانت دنیویۃ ولو قضی القاضی بہا لا ینفذ ذکرہ یعقوب باشا۔ (درمختار مع الشامی ص: ۴۶۵)۔ تیسرے یہ کہ رشوت لی گئی، اور اگرچہ قاضی مرتشی کے فیصلوں کے نفاذ کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے، لیکن جس مقدمے میں رشوت لی گئی ہو اس کے بارے میں اکثر فقہاء کا مسلک یہی ہے کہ اس میں فیصلہ نافذ نہیں ہوتا، خلافاً للبعض ومال الشامی الی ترجیح قول البعض لضرورة الزمان۔ (شامی ج: ۴ ص: ۴۷۱) ولا ضرورة هنا۔^(۳)

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم بالصواب

۱۳۹۱/۳/۱ھ

(فتویٰ نمبر ۳۳۷/۲۲ الف)



(۱) الدر المختار ج: ۵ ص: ۴۰۹ (طبع سعید).

(۲) در مختار ج: ۵ ص: ۳۵۶ // //

(۳) در مختار ج: ۵ ص: ۳۵۸ // //

﴿کتاب الحدود﴾

(حدود کا بیان)

اقرار کے ذریعے زنا کی شرعی سزا نافذ ہونے کی شرائط

سوال:- کیا ایک مرد اور عورت کا یہ اقرار کہ نکاح کے تین ماہ بعد پیدا شدہ بچہ اُن کا ہے، زنا

کا اقرار سمجھا جائے گا۔

۲:- کیا اس مرد اور عورت پر اس جرم میں زنا کی حد نافذ ہوگی؟

جواب ۱، ۲:- صرف اتنے اقرار سے حد زنا جاری نہیں ہو سکتی، حد زنا کے لئے ضروری ہے

کہ عدالت میں غیر مبہم الفاظ کے ساتھ زنا کا اقرار کرے، اور امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک ایک مرتبہ اقرار

کرنا بھی کافی نہیں، چار مرتبہ اسی طرح اقرار کرنا ضروری ہے، لہذا مذکورہ اقرار پر حد جاری نہ ہوگی،

واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم

البتہ تعزیر ہو سکتی ہے۔

۱۴۰۱/۱۱/۱۷ھ

(فتویٰ نمبر ۱۷۱۳/۳۲ ج)

اقرار اور گواہی میں سے کچھ نہ ہونے کی صورت میں

”زنا“ کا جرم ثابت نہ ہوگا

سوال:- زید نے عمر کو بمعہ اہلیہ کے اپنے گھر پر مدعو کیا، عمر بمعہ اہلیہ کے جب زید کے گھر

پہنچا تو زید کے اہل و عیال دوسرے مہمانوں کے ساتھ کہیں گئے ہوئے تھے، اس کے بعد زید اور عمر

دونوں نماز عصر کے لئے مسجد میں چلے گئے، نماز کے بعد زید نے عمر کو مٹھائی لانے کے لئے پیسے دیئے،

عمر مٹھائی لینے کے لئے بازار گیا، مٹھائی لائے بغیر عمر، زید کے گھر پر واپس آ گیا، اور عمر نے زید کو گھر پر

نہیں پایا، اس کے بعد عمر اپنی اہلیہ کے ساتھ اپنے گھر واپس آ گیا، اس کے بعد عمر کی بیوی کا الزام ہے

کہ زید نے میرے ساتھ بد فعلی کی، مگر زید اس الزام کا انکار کرتا ہے اور اس فعل کا کوئی عینی شاہد نہیں

ہے، عمر کی بیوی حلفیہ کہتی ہے کہ ایسا ہوا ہے، اور زید بھی حلفیہ کہتا ہے کہ ایسا نہیں ہوا، تو ایسی صورت

میں شریعت کیا حکم دیتی ہے؟

(۱) فی فتح القدیر کتاب الحدود ج: ۵ ص: ۴ (طبع رشیدیہ کوئٹہ) الزنا یثبت بالبینة والاقرار وعلى ص: ۸ والاقرار أن یقر البالغ العاقل علی نفسه بالزنا أربع مرات فی أربعة مجالس من مجالس المقر.

فی الجواهر النيرة کتاب الحدود ج: ۲ ص: ۲۲۳ (طبع قدیمی کتب خانہ) الزنا یثبت بالبینة والاقرار (وبعد أسطر فی المتن) والاقرار أن یقر البالغ العاقل علی نفسه بالزنا أربع مرات فی أربعة مجالس من مجالس المقر.

جواب:- صورتِ مسئلہ میں جب عمر کی بیوی حلفیہ اقرار کر رہی ہے اور ایسے اکراہ کا بھی ذکر نہیں کرتی جس سے وہ بالکل مجبور ہو گئی ہو، تو اس کا گناہ تو ثابت ہو گیا، جس کا علاج بجز اس کے کچھ نہیں کہ وہ توبہ و استغفار کرے، صدقِ دل کے ساتھ توبہ کر لے گی تو ان شاء اللہ گناہ معاف ہو جائے گا۔^(۱) لیکن زید چونکہ نہ اقرار کرتا ہے نہ اس کے گناہ پر کوئی گواہ ہے، لہذا اس کے خلاف جرم ثابت نہیں ہوا۔^(۲)

واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی

۱۳۸۸/۵/۲۳ھ

(فتویٰ نمبر ۵۹۷/۱۹ الف)

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع

۱۳۸۸/۵/۲۳ھ

صرف ایک گواہی سے زنا کی شرعی سزا جاری نہیں ہو سکتی، البتہ گواہ کے معتبر ہونے کی صورت میں تعزیری سزا جاری کی جاسکتی ہے

سوال:- اگر کوئی شخص کسی مجاہد یا علاقے کے کمانڈر کو یہ اطلاع دیدے کہ فلاں پرانے گھر میں ایک جوان اور لڑکی کو زنا کرتے ہوئے دیکھا اور اس خبر کی ایک شخص تائید بھی کرے، تو یہ مجاہد اور کمانڈر وہاں جا کر دیکھے تو وہ جوان وہاں سے نکل رہا ہو اور پرانے گھر میں لڑکی موجود ہو اور جو بھی ان سے سوال کرے جواب نہ دے، تو وہ مجاہد اور کمانڈر اس جوان کو بے تحاشا بے دردی بڑی عزتی کے ساتھ مارے لیکن وہ جوان اس مار سے مرا بھی نہیں اور نہ اس کا کوئی عضو ٹوٹا، تو کیا اس مجاہد اور کمانڈر پر شرعی طور پر کچھ عائد ہوتا ہے یا نہیں؟

(۱) وفي فتح الباری ج: ۱۲ ص: ۱۶۹ (طبع مكتبة الرشد) وقد يتمسك به من قال أنه اذا جاء ثانياً سقط عنه الحد وقواه بأن الحسنه التي جاء بها من اعترافه طوعاً بخشية الله وحده تقاوم بالسينة التي عملها لأن حكمة الحدود الردع عن العود وصنيعه ذلك دال على ارتداعه فناسب رفع الحد عنه لذلك الخ.

وفي رد المحتار مطلب التوبة تسقط الحد قبل ثبوته ج: ۴ ص: ۴ (طبع سعيد) الظاهر أن المراد أنها لا تسقط الحد الثابت عند الحاكم بعد الرفع اليه أما قبله فيسقط الحد بالتوبة (وبعد أسطر) رجل أتى بفاحشة ثم تاب وأتاب الى الله تعالى فإنه لا يعلم القاضي بفاحشته لاقامة الحد عليه لأن الستر مندوب اليه وفي شرح الاشباه للبيروني عن الجواهر رجل شرب الخمر وزنى ثم تاب ولم يحد في الدنيا هل يحد له في الآخرة؟ قال الحدود حقوق الله تعالى إلا أنه تعلق بها حق الناس وهو الانزجار فإذا تاب توبة نصوحاً أرجو أن لا يحد في الآخرة فإنه لا يكون أكثر من الكفر والردة وأنه يزول بالاسلام والتوبة.

(۲) وفي الدر المختار كتاب الحدود ج: ۴ ص: ۷ و ۸ (طبع سعيد) ويثبت بشهادة أربعة رجال في مجلس واحد بلفظ الزنا ويثبت أيضاً باقراره صريحاً صاحباً ولم يكذبه الآخر الخ.

وكذا في البحر الرائق كتاب الحدود ج: ۵ ص: ۷ و ۱۲ (طبع رشيدية).

وفتح القدير كتاب الحدود ج: ۵ ص: ۴ و ۸ (طبع رشيدية كوثه).

جواب:- صرف ایک شخص کی گواہی سے زنا کی حد شرعی (سو کوڑے یا سنگساری) تو کسی حال نہیں دی جاسکتی^(۱)، البتہ اگر ایک معتبر شخص کی گواہی اور دوسرے معتبر قرائن سے یہ غالب گمان ہو جائے کہ مرد و عورت مشتبہ حالت میں پائے گئے ہیں، تو ان کو تعزیری سزا دی جاسکتی ہے^(۲)، لیکن اس میں تفصیل یہ ہے کہ اگر مجاہدین کی متعینہ حکومت کی طرف سے اس کمانڈر کو ایسے معاملات کی سزا دینے کا اختیار دیا گیا ہے تو وہ خود سزا دے سکتا ہے، ورنہ خود سزا دینے کے بجائے اپنے اس افسر کے سپرد کر دے جسے سزا دینے کا اختیار حاصل ہو۔

واللہ اعلم

۱۲۰۹/۱/۲۲ھ

(فتویٰ نمبر ۱۴۷/۴۰ الف)

حدود ترمیمی بل میں زنا بالجبر کی سزا سے متعلق سورہ نور کی آیت نمبر ۳۳ سے استدلال کی وضاحت

سوال:- محترم مفتی تقی عثمانی صاحب السلام علیکم

حدود قوانین کے بارے میں جو بحث اس وقت ملک میں جاری ہے، اُس کے حوالے سے آپ کا تفصیلی نقطہ نظر ”جنگ“ کے کالموں میں پڑھنے کا موقع ملا۔ اس ضمن میں میں آپ سے چند باتوں کی وضاحت چاہتا ہوں، اُمید ہے آپ اپنی گوناگوں مصروفیات کے باوجود جواب سے مطلع فرمائیں گے۔

پہلی بات یہ ہے زنا بالجبر موجب حد جس کے لئے حدود قوانین میں چار گواہ پیش کرنے کی شرط تھی، کیا پچھلے ۲۷ سال میں کسی مجرم کو دی جاسکی ہے؟ جب یہ ممکن ہی نہیں تو پھر اگر اس کو بل میں سے نکال دیا گیا ہے تو کیا فرق پڑتا ہے؟ جب ایک بات بعید از عقل ہے تو پھر اُس کے لئے اصرار کرنے کی بھلا کیا ضرورت ہے؟

دوسری بات یہ ہے کہ اگر ایک غیر شادی شدہ شخص زنا بالجبر کا مرتکب ہوتا ہے تو اُسے کیا سزا دی جائے گی؟ اگر اُس کی سزا بھی سو کوڑے ہے تو پھر یہ سزا تو اُس غیر شادی شدہ کے لئے بھی ہے جو زنا بالرضا کا مرتکب ہوتا ہے جبکہ آپ لکھتے ہیں: ”یہ عقل عام کی بات ہے کہ زنا بالجبر کا جرم رضامندی سے کئے ہوئے زنا سے زیادہ سنگین جرم ہے، لہذا اگر رضامندی کی صورت میں یہ حد عائد ہو رہی ہے تو جبر کی صورت میں اس کا اطلاق اور زیادہ قوت کے ساتھ ہوگا۔“ (جنگ مؤرخہ ۲۳/نومبر ۲۰۰۶ء) کیسے؟

(۱) حوالہ کے لئے دیکھئے سابقہ ص: ۵۳۸ کا حاشیہ نمبر ۲۔

(۲) دیکھئے الدر المختار مع رد المحتار ج: ۴ ص: ۶۲ و ۶۳ (طبع سعید)۔

میری تیسری گزارش یہ ہے کہ سورہ نور کی جس آیت کو آپ نے زنا بالجبر کا شکار ہونے والی خاتون کی بریت کے حوالے سے بطور دلیل پیش کیا ہے اُس کا اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں ہے، وہ آیت تو اُن لونڈیوں کے بارے میں ہے جن سے اُن کے مالک زبردستی پیشہ کرواتے تھے، اُن کے بارے میں ارشادِ ربانی ہے کہ چونکہ اُنہیں اس فعلِ بد پر مجبور کیا جا رہا ہے اس لئے اللہ تعالیٰ اُنہیں معاف فرمادے گا۔ اگر آیت کو سیاق و سباق میں رکھ کر دیکھا جائے تو دوسرا کوئی معنی لینا ممکن ہی نہیں ہے۔ شاید یہ اس وجہ سے ہوا ہے کہ ہمارے ہاں قرآن پاک کی آیات کو سیاق و سباق میں رکھ کر مطالعہ کرنے کا رُحمان بہت کم ہے، دوسری کوئی وجہ میری سمجھ میں تو نہیں آرہی ہے۔

موجودہ حکومت نے حدود قوانین میں جو ترمیمات کی ہیں وہ بھی حرفِ آخر نہیں ہیں، یہ بھی ایک انسانی کام ہے جس میں بہتری کی گنجائش موجود رہے گی۔ اسی طرح حدود آرڈی نینس مجریہ ۱۹۷۹ء بھی ایک انسانی کام تھا جس کے اندر بنیادی خامیاں موجود تھیں، میں تو حیران ہوتا ہوں کہ مجھ جیسا ایک عام طالب علم بھی سمجھتا ہے کہ اُن قوانین میں بنیادی نوعیت کی خامیاں تھیں اور انہیں بہت جلد دُور ہو جانا چاہئے تھا، لیکن ہمارے مذہبی حلقے اُسے حدود اللہ میں مداخلت کا رنگ دینے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں جذبات و تعصبات سے بالاتر ہو کر سوچنے کی توفیق عطا فرمائے اور ہمیں مقلدانہ اندازِ فکر سے آزاد ہونے کی توفیق عطا فرمائے آمین۔

والسلام علیکم

ناصر مصطفیٰ

جواب:- محترمی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ

سفروں کی وجہ سے آپ کے خط کے جواب میں تاخیر ہوئی، معذرت خواہ ہوں۔

سورہ نور آیت ۳۳ کے بارے میں عرض ہے کہ جن لونڈیوں سے زبردستی پیشہ کرایا جا رہا ہے، اُن سے زبردستی زنا کرنے والے، خواہ پیسے دے کر کرتے ہوں، زنا بالجبر ہی کے مرتکب تو ہیں^(۱)۔ اس صورت میں اللہ تعالیٰ نے لونڈیوں کی تو مغفرت کا اعلان فرمادیا، لیکن جن لوگوں نے ان سے زنا بالجبر کیا، اُن کی معافی کا تو کوئی اعلان نہیں^(۲)، لہذا سورہ نور کی آیت نمبر ۱ میں بیان کی ہوئی سزا اُن پر بھی عائد ہوگی۔ میرے استدلال کی یہ وجہ تھی۔

والسلام

۱۴۲۸/۴/۷ھ

(۱ و ۲) وفي أضواء البيان سورة النور ج: ۵ ص: ۵۳۲ (طبع دار الفكر بيروت) فإن الله من بعد إكراههن (لهن) غفور رحيم، ذكره عنه القرطبي، وذكره الزمخشري عن ابن عباس رضي الله عنهم جميعا. فزيادة لفظة لهن في قراءة من ذكرنا استشهاد بقراءة شاذة لبيان بقراءة غير شاذة أن الموعود بالمغفرة والرحمة، هو المعذور بالإكراه دون المكره؛ لأنه غير معذور في فعله القبيح. (بقي الـ ص ۲)

صرف توبہ اور ستر سے حد ساقط ہو سکنے کے باوجود حضور صلی اللہ علیہ وسلم

کے زمانے میں خاتون نے اقرارِ زنا کیوں کیا؟

نیز زانی کے لئے ستر افضل ہے یا اقرار؟

سوال:- مکرمی و محترمی تقی عثمانی صاحب! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

”معارف القرآن“ سورہ مائدہ کی آیت نمبر ۳۳ کے مسائل کے مطالعے کے دوران ذہن میں

ایک اشکال نے جنم لیا، جو عرض کرتا ہوں۔ محترم محترم مولانا شفیع صاحب دامت برکاتہم نے شرعی سزاؤں کے ضمن میں پانچ حدود ذکر کی ہیں اور لکھا ہے کہ ان سزاؤں کی صورت میں توبہ کرنے سے اخروی حساب معاف ہو جاتا ہے لیکن دنیوی سزا نہیں۔ اس سے یہ بات ذہن میں پیدا ہوئی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ایک زانی عورت نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اعترافِ جرم (خود حاضر ہو کر، حالانکہ آپ کو علم نہیں تھا) کر کے سزا چاہی۔

مولانا مفتی محمد شفیع صاحب کے بیان کو سامنے رکھتے ہوئے اگر وہ عورت مخلصانہ توبہ کر لیتی

اور اپنے گناہ کو پوشیدہ رکھتی تو نہ صرف اخروی عذاب سے بچ جاتی بلکہ دنیاوی ذلت و رسوائی اور سزا سے بھی۔ اس نے ایسا کیوں نہیں کیا؟ کیا وہ اس مسئلے سے لاعلم تھی؟ کیا وہ ضمیر کے ہاتھوں تنگ آ کر جذباتی رو میں بہہ کر سزا چاہنے لگی تاکہ اس کے دل کا بوجھ ہلکا ہو جائے؟ اگر نہیں تو سزا سے پہلے حضور

(بقیہ حاشیہ گزشتہ).....

وفی الدر المنثور ج: ۷ ص: ۳۹۷ باب: ۳۳ (طبع موقع التفاسیر) (فإن الله من بعد إكراههن غفور رحيم) قال:

للمكرهات على الزنا.

وأخرج عبد بن حميد عن قتادة (فإن الله من بعد إكراههن غفور رحيم) قال: لهن وليست لهن.

وفی الباب باب: ۳۳ ج: ۱۲ ص: ۱۰۰ (ومن يكرههن فإن الله من بعد إكراههن غفور رحيم) ای غفور رحيم للمكرهات والوزر على المكره، وكان الحسن إذا قرأ هذه الآية قال: لهن والله لهن.

وفی كتاب الام ج: ۵ ص: ۱۷۳ (طبع بيروت) (فإن الله من بعد إكراههن غفور رحيم) نزلت في الإماء المكرهات أنه مغفور لهن بما أكرهن عليه وقيل غفور أي هو أغفر وأرحم من أن يؤخذهن بما أكرهن عليه وفي هذا كالدلالة على إبطال الحد عنهن إذا أكرهن على الزنى.

وفی تفسیر ابن ابی حاتم سورة النور ج: ۱۰ ص: ۱۲۷ عن ابن عباس رقم: ۱۵۳۲۰ أن جارية لعبد الله بن ابی كانت تزني في الجاهلية فولدت أولاداً من الزنا فقال لها مالك لا تزني قالت: لا والله لا أزني فضر بها فأنزل الله تعالى ولا تكرهوا فتياتكم. وكذا في تفسیر ابن كثير باب: ۳۲ ج: ۶ ص: ۵۵ (طبع مجمع الملك فهد) وكذا في تفسیر الألوسی باب: ۳۳ ج: ۱۳ ص: ۴۲۷.

وفی التفسیر الكبير ج: ۱۱ ص: ۳۲۳ (طبع موقع التفاسیر) فإن الله غفور رحيم بهن لأن الإكراه أزال الإثم والعقوبة لأن الإكراه عذر للمكرهه أما المكره فلا عذر له فيما فعل الثاني.

وفی تفسیر الشعراوي باب: ۳۳ ج: ۱ ص: ۶۳۷ لا تكرهوا الإماء على البغاء وقد كن يكرهن ويرفضن هذا الفعل وكن يؤذین ويتعرضن للغمز واللمز ويتجرا عليهن الناس.

وفی تفسیر روح البیان، سورة النور ج: ۶ ص: ۱۰۸ (طبع دار النشر) غفور رحيم أي لهن وفيه دلالة على أن المكرهين محرومون منهما بالكلية. نیز دیکھئے تفسیر معارف القرآن ج: ۶ ص: ۴۱۷۔

صلی اللہ علیہ وسلم نے اس عورت کو یہ مسئلہ بتایا نہیں؟ کہ اس طرح تم بچ سکتی تھیں، یا پھر اس میں کوئی شرعی حکمت ہے؟

جواب:- مکرری ومحترمی! السلام علیکم ورحمة اللہ وبرکاتہ

یہ درست ہے کہ اگر کسی شخص سے اس قسم کا گناہ خدا نخواستہ سرزد ہو جائے تو اس کے لئے بہتر یہ ہے کہ اسے چھپائے، اور توبہ کرے۔^(۱) لیکن جب ایسا شخص قاضی کے پاس آجائے اور اعتراف کر لے تو قاضی اسے صراحت چھپانے کا مشورہ نہیں دے سکتا، البتہ سنت یہ ہے کہ ایک مرتبہ اقرار کرنے پر قاضی منہ موڑ لے، جو ایک خفیف سا اشارہ ہے کہ تم واپس چلے جاؤ،^(۲) لیکن تین بار^(۳) منہ موڑنے کے بعد جب چوتھی بار وہ اقرار کرے تو پھر سزا جاری کی جائے گی۔^(۴) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس خاتون کے ساتھ ایسا ہی کیا تھا۔ بحیثیت قاضی آپ اس سے صراحت یہ نہیں فرما سکتے تھے کہ تمہارے اقرار کرنے سے چھپانا بہتر ہے۔ اُس خاتون کے قلب پر آخرت کا خوف اس درجہ طاری تھا کہ وہ ان خفیف اشاروں کو نہ سمجھی، اور سزا جاری کرنے پر اصرار کیا۔^(۵) اور تکوینی طور پر اس میں اللہ تعالیٰ کی یہ مصلحت تھی کہ اُس کے ذریعے دین کے ایک اہم حکم کا عملی نفاذ کرا کے ہمیشہ کے لئے قانون اور سنت کو محفوظ کرنا تھا۔^(۱۰)

واللہ اعلم

۱۴۲۲/۱/۷ھ

(۱ و ۲) وفي فتح الباری، باب لا یرجم المجنون والمجنونة ج: ۱۲ ص: ۱۵۸ (طبع مكتبة الرشد، مكة المكرمة) ویؤخذ من قضیته أنه یستحب لمن وقع فی مثل قضیته أن یتوب إلى الله تعالى ویستر نفسه ولا یذكر ذلك لأحد كما أشار به أبو بكر وعمر علی ماعز وان من اطلع علی ذلك یستر علیه بما ذكر ولا یفضحه ولا یرفعه إلى الإمام كما قال صلی الله علیه وسلم فی هذه القصة لو سترته بثوبك كان خیرا لك وبهذا جزم الشافعی فقال أحب لمن أصاب ذنبا فستره الله علیه أن یستر علی نفسه یتوب.

وفیه أيضًا ج: ۱۲ ص: ۱۵۹ وفيه أنه یستحب لمن وقع فی معصية وندم أن یبادر إلى التوبة منها ولا یخبر بها أحدًا ویستر بستر الله وان اتفق انه یخبر أحدًا فیستحب أن یأمره بالتوبة وستر ذلك عن الناس كما جرى لماعز مع أبی بكر ثم عمر وقد أخرج قصته معهما فی المؤطا وفي القصة أن النبی صلی الله علیه وسلم قال لهزال لو سترته بثوبك لكان خیرا لك قال الباجی المعنی خیرا لك مما أمرته به من إظهار أمره وكان ستره بأن یأمره بالتوبة والکتمان كما أمره أبو بكر وعمر وذكر الثوب مبالغة أى لو لم تجد السبیل إلى ستره إلا بردائك ممن علم أمره كان أفضل مما أشرت به علیه من الإظهار... الخ.

وراجع أيضًا إلى شرح البخاری لابن بطال ج: ۸ ص: ۴۴۳ (طبع دار النشر مكتبة الرشد).

وفي عمدة القاری (باب من أصاب ذنبا دون الحد فأخبر الإمام فلا عقوبة علیه بعد التوبة إذا جاء مستفتيًا) ج: ۲۳ ص: ۴۴۵ (طبع دار إحياء التراث العربی بیروت) إذا تاب قبل أن یقام علیه الحد سقط عنه.

(۳ و ۴) وفي عمدة القاری ج: ۲۳ ص: ۴۴۵ (طبع دار إحياء التراث العربی بیروت) ولا یجوز للإمام العفو عنه إذا بلغه. وفي الهندية ج: ۲ ص: ۱۴۴ (طبع رشیدیة) فإذا بین ذلك وظهر زناه سأله عن الإحصان فإن وصفه بشرائطه حکم برجمه کذا فی التبيين.

(۶ و ۷) وفي صحيح المسلم رقم الحديث: ۴۲۸۴ عن أبی هريرة قال: أتى رجل من المسلمین رسول الله صلی الله علیه وسلم وهو فی المسجد فناداه فقال: یا رسول الله! انی زنی، فأعرض عنه حتى ثنی ذلك علیه أربع مرات فلما شهد علی نفسه أربع شهادات دعاه رسول الله صلی الله علیه وسلم فقال: أبک جنون؟ قال: لا، (بقي الغلے صفحہ ۶)

(بقیہ حاشیہ مندرجہ) قال: فهل أحصنت؟ قال: نعم، فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم: اذهبوا به فارجموه. نیز مزید احادیث کے لئے دیکھئے حضرت والا دامت برکاتہم العالیہ کی کتاب تکملة فتح الملہم ج: ۲ ص: ۴۳۷ تا ۴۶۳۔
وفی الهندیة ج: ۲ ص: ۱۴۴ (طبع رشیدیہ) وینبغی للإمام أن یزجر المقر عن الإقرار ویظهر الکراهة ویأمر بتنحیقه کذا فی المحيط۔

وفی فتح الباری، کتاب الحدود ج: ۱۲ ص: ۱۵۶ (طبع مکتبۃ الرشد) ان رجلاً من أسلم قال لأبی بکر الصدیق ان الآخر زنی قال: فنب إلى الله واستتر بستر الله، ثم أتى عمر كذلك، فأتى رسول الله صلى الله عليه وسلم فأعرض عنه ثلاث مرار حتى إذا أكثر عليه بعث إلى أهله۔

(۵) وفی عمدة القاری ج: ۲۴ ص: ۶ (طبع دار إحياء التراث العربی بیروت) یقول الإمام للمقر لعلک لمست المرأة أو غمزتها بعینیک أو بیدیک وفی بعض النسخ بعد هذا أو نظرت... الخ۔

وفی فتح الباری ج: ۱۲ ص: ۱۵۹ (طبع مکتبۃ الرشد) وفیه الثبت فی ازهاق نفس المسلم والبالغة فی صیانتہ لما وقع فی هذه القصة من تردیده والایماء الیه بالرجوع والإشارة إلى قبول دعواه ان ادعی اکرأها وخطأ فی معنی الزنا أو مباشرة دون الفرج مثلاً أو غیر ذلك۔

وفی عمدة القاری ج: ۲۳ ص: ۴۴۰ (طبع دار إحياء التراث) وقال عیاض فائدة سؤاله أبک جنون استقرار لحاله واستبعاد أن یلح عاقل بالإعتراف بما یقتضی اهلاکة أو لعله یرجع عن قوله۔

وفی الهندیة ج: ۲ ص: ۱۴۴ (طبع رشیدیہ) وندب تلقینہ لعلک قبلت أو لمست أو وطئت بشبهة وقال فی الأصل لعلک تزوجتها أو وطئتها بشبهة والمقصود أن یلقنه ما یکون دارناً کأنما ما کان۔

(۸) وفی حدیث المسلم رقم: ۴۲۹۴..... ثم جائته امرأة من غامد من الأزد فقالت: یا رسول الله! طهرنی، فقال: ویحک ارجعی فاستغفری الله وتوبی الیه (الحديث)۔ (راجع للتفصیل إلى تکملة فتح الملہم ج: ۲ ص: ۴۴۸ طبع دار العلوم کراچی)۔

(۱۰۹) نیز اس اصل حکمت کے علاوہ اس خاتون کی طرف سے ستر کے بجائے اقرار کو اختیار کرنے کا ایک سبب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ بعض اوقات ستر اس وقت افضل ہوتا ہے جبکہ کوئی ایسی چیز نہ پائی جائے جو ستر کے مخالف ومتضاد ہو، اور اس متضاد امر کے پائے جانے کی وجہ سے ستر مشکل ہو۔ جیسا کہ غیر منکوحہ کا حاملہ ہونا۔ ایسی صورت میں بعض حضرات نے فرمایا کہ ستر کے بجائے اقرار اور مراۃ افضل ہے چنانچہ فتح الباری ج: ۱۲ ص: ۱۵۸ و ۱۵۹ (طبع مکتبۃ الرشد) میں ہے:

أن الغامدية كان ظهر بها الحمل مع كونها غير ذات زوج فتعذر الاستتار للإطلاع على ما يشعر بالفاحشة ومن ثم قيد بعضهم ترجيح الاستتار حيث لا يكون هناك ما يشعر بضده وان وجد فالرفع إلى الإمام ليقیم علیہ الحد أفضل۔

اور چونکہ یہ خاتون حاملہ ہو چکی تھیں لہذا انہوں نے اقرار کو افضل سمجھا، اسی لئے اس واقعے کی کئی احادیث میں یہ بات موجود ہے کہ جب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے اشارۃ لوٹ جانے اور توبہ واستغفار کرنے کا فرمایا تو خاتون نے عرض کیا کہ میں یہ سمجھتی ہوں کہ آپ نے جس طرح حضرت ماعز اسلمی رضی اللہ عنہ کو تعریض وغیرہ کے ذریعے رد فرمانا چاہا تھا تو شاید مجھے بھی اسی طرح تعریض فرما رہے ہیں، جبکہ میرا معاملہ ماعز سے یوں مختلف ہے کہ ان کے پاس تو صرف اقرار تھا اور ان کے لئے آپ کی تعریض کی بناء پر اقرار سے رجوع ممکن تھا مگر میرے معاملے میں واضح قرینہ موجود ہے کہ میں تو باقاعدہ حاملہ ہو چکی ہوں لہذا مجھے پاک فرما دیجئے۔

خلاصہ یہ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے انہیں توبہ واستغفار کرنے، لوٹنے اور تعریض وتردید کے کئی اشارے پائے جانے کے باوجود اس خاتون نے مذکورہ اسباب (جس کا حاصل خوف آخرت ہی ہے جیسا کہ حضرت والا دامت برکاتہم العالیہ نے تحریر فرمایا) کی بناء پر حد پر اصرار فرمایا۔

وفی حدیث صحیح المسلم رقم الحديث: ۴۲۹۴..... ثم جاءته امرأة من غامد من الأزد فقالت: یا رسول الله طهرنی، فقال: ویحک ارجعی فاستغفری الله وتوبی الیه، فقالت: أراک تريد أن تردنی کما رددت ماعز بن مالک، قال: وما ذاک؟ قالت: انها حبلى من الزنا، فقال: أنت؟ قالت: نعم، فقال لها: حتى تضعی ما فی بطنک۔ (الحديث)
وفی فتح الباری ج: ۱۲ ص: ۱۶۰ (طبع مکتبۃ الرشد)

وأما قول الغامدية تريد أن تردنی کما رددت ماعزاً فیمكن التمسک به لكن أجاب الطیبی بأن قولها انها حبلى من الزنا فيه إشارة إلى أن حالها مغایرة لحال ماعز لأنهما وان اشترکا فی الزنا لكن العلة غیر جامعة لأن ماعزاً کان متمکناً من الرجوع عن إقراره بخلافها فكانها قالت أنا غیر متمکنة من الإنکار بعد الإقرار لظهور الحمل بها بخلافه... الخ۔

وفی شرح سنن أبی داود ج: ۲۵ ص: ۴۰۶ فالترداد بالنسبة لها قد حصل ولكنها طلبت منه ألا یفعل کما فعل بماعز... الخ۔

﴿فصل فی القصاص والذیات﴾

(قصاص اور دیت کے مسائل کا بیان)

گاڑی کی ٹکر سے کسی کے مرجانے پر قصاص و دیت کا حکم

سوال:- گاڑی کے ایکسیڈنٹ کی وجہ سے کوئی مرجائے تو کیا ڈرائیور سے قصاص لیا جائے

گایا اس پر دیت واجب ہوگی؟

جواب:- اگر ایکسیڈنٹ ڈرائیور کی غلطی سے ہوا ہے، ارادہ مارنے کا نہیں تھا تب تو قصاص نہیں،

صرف عاقلہ پر دیت آئے گی اور کفارہ واجب ہوگا،^(۱) اور اگر قتل کرنے ہی کا ارادہ تھا تو قصاص ہوگا۔

واللہ اعلم

۱۴۲۲/۳/۲۲ھ

ایکسیڈنٹ میں موت واقع ہونے کی صورت میں ذمہ دار

ڈرائیور کی انشورنس کمپنی سے حاصل ہونے والی رقم ”دیت“

میں شمار کر کے وصول کرنے کا حکم

سوال:- امریکا میں پھوپھی کی بیٹی کو راستہ پار کرتے ہوئے ایک ٹرک کی خاتون ڈرائیور

نے سگنل توڑتے ہوئے بچی کو مار دیا، جس سے وہ انتقال کر گئی، ٹرک انشورڈ کی ہوئی تھی، اب انشورنس

کمپنی سے بچی کے والدین کو ہرجانہ لینا جائز ہے یا نہیں؟ کیا یہ ہرجانہ دیت ہے یا نہیں؟ کیا دیت کی

رقم سے زیادہ لینا جائز ہے یا نہیں؟ انشورنس کمپنی سے ملنے کی صورت میں حلال ہے یا نہیں؟

بندہ محمد عامر عفی عنہ

خادم جامعۃ الرشید، احسن آباد

جواب:- اصل ہرجانہ ٹرک ڈرائیور کے ذمے لازم تھا، جس کے بقدر دیت مطالبے کا حق

(۱) فی الدر ج: ۶ ص: ۵۲۷ (طبع سعید) القتل عمد، وهو أن يتعمد ضربه أي ضرب الآدمی فی ای موضع من جسده وموجه القود عینا والثالث خطأ وموجه الکفارة والذیة علی العاقلة والاثم دون اثم القتل اھ۔

تھا، اس سے زائد مطالبے کا حق نہیں، لیکن قاتلِ خطا خود زائد دے تو لینا جائز ہے۔ رہا انشورنس کمپنی سے وصول کرنا، تو انشورنس کرانے والے نے اب تک کسی بھی مد میں جتنا پریمیم جمع کرایا ہو اس حد تک تو وصول کرنا بے غبار طور پر جائز ہے، اس سے زائد میں یہ تاویل ہو سکتی ہے کہ انشورنس کمپنی اس کی عاقلہ کے قائم مقام سمجھی جائے،^(۱) اس کو عاقلہ بنانے کے لئے جو عقدِ ناجائز کیا گیا وہ دونوں کا اپنا عمل ہے، جس کے وہ خود ذمہ دار ہیں، لیکن جب عرفاً و قانوناً وہ عاقلہ کے قائم مقام بن گئی تو اس سے وصول کرنے کی بھی گنجائش معلوم ہوتی ہے، اور اگرچہ انشورنس کمپنی کا مال اکثر عقودِ فاسدہ کی وجہ سے حرام ہونے کا گمان غالب ہے، لیکن کفار اہل حرب کے مخاطب بالفروع نہ ہونے کی بنا پر گنجائش معلوم ہوتی ہے،^(۲) مگر اس پر پورا جزم نہیں، غور کر لیا جائے، اور دوسرے علماء سے بھی رجوع کر لیا جائے۔ والسلام

۱۳۲۵/۱۲/۲۹ھ

۱:- موجودہ دور میں قتلِ شبہِ عمد کی صاحبین کی

بیان کردہ تعریفِ اختیار کرنے کا حکم

۲:- صلح عن دم العمد یا دیتِ عمد میں تین سال کی مہلت

ضروری نہیں

سوال:- امام ابو حنیفہؒ نے قتلِ شبہِ عمد کی تعریف یہ کی ہے کہ ”عمداً ایسی چیز سے قتل کیا جائے

جو نہ ہتھیار ہو اور نہ ہی ہتھیار کے قائم مقام ہو۔“ (ہدایہ ج: ۴ ص: ۵۶۰، کتاب الجنایات)۔

صاحبین نے یہ تعریف کی ہے: ”شبہ العمد ان يتعمد ضربه بمالا يقتل به غالباً“ (ہدایہ

ج: ۴ ص: ۵۶۰)۔ امام شافعیؒ بھی صاحبین کی تائید فرماتے ہیں لہذا بڑے پتھر اور بڑی لاٹھی سے قتل یا

زیادہ پانی میں غرق کر کے یا پہاڑی سے گرا کر غرضیکہ ہر اس چیز سے جو اجزاء کو جدا نہ کر سکے، امام

صاحب کے نزدیک یہ قتلِ شبہِ عمد ہوگا اور صاحبین کے نزدیک قتلِ عمد ہوگا۔

امام صاحب نے آلہ قتل ”سلاح“ کو نیتِ قتل کا مظہر قرار دیا ہے، لہذا ”سلاح“ سے قتلِ عمد

قتل ہوگا، اور ”بما ليس بسلاح ولا اجري مجروح السلاح“ سے قتلِ شبہِ عمد ہوگا، اور صاحبین کے

ز نزدیک آلہ قتل ”ما يقتل به غالباً“ سے قتلِ عمد ہوگا اور ”بما لا يقتل به غالباً“ سے شبہِ عمد ہوگا۔

(۱) وفي الهداية ج: ۴ ص: ۲۲۸ و ص: ۲۲۹ کتاب المعاقل (طبع مکتبہ رحمانیہ) والأصل في وجوبها على العاقلة قوله عليه السلام في حديث حمل بن مالك رضي الله عنه للأولياء قوموا فدوه وانما خصوا بالضم لأنه انما قصر لقوة فيه وتلك بأنصاره وهم العاقلة فكانوا هم المقصرين في تركهم مراقبته فخصوا به لأن العقل كان على أهل النصرة وقد كانت بأنواع القرابة والحلف والولاء والعد. وفي عهد عمر رضي الله عنه قد صارت بالديوان فجعلها على أهله اتباعاً للمعنى ولهذا قالوا: لو كان اليوم قوم تناصرهم بالحرف فعاقلتهم أهل الحرفة... الخ.

(۲) دیکھئے الدر المختار مع رد المحتار ج: ۴ ص: ۱۲۸ و ۱۲۹ (طبع سعید).

۱- اب قابلِ استفسار بات یہ ہے کہ اس دور میں قتل بالمشکل کے واقعات بکثرت ہیں، اسی طرح آلہ غیر جارحہ سے بھی قتل روزمرہ کا معمول ہے، امام صاحبؒ کی تعریف کو اگر ملکی قانون کا درجہ دیا جائے تو ڈر یہ ہے کہ قتل کے واقعات میں اضافہ ہو جائے گا، کیونکہ شبہ عمد کی سزا دیت ہے، آج کل لوگوں کے پاس روپیہ عام ہے، پھر روپیہ ادا کرنے میں بھی سہولت ہے کہ اول تو عاقلہ دیت ادا کرے گی، پھر اس پر مستزاد یہ ہے کہ تین سال تک ادا کرنے کی مہلت بھی ہے، اس کے مقابلے میں صاحبینؒ کی تعریف اس دور کے مناسب ہے اور عقود رسم المفتی کی عبارت سے واضح ہے کہ قضاء کے معاملات میں امام ابو یوسفؒ کے قول پر فتویٰ ہوگا۔ وفي القنية من باب المفتي الفتوى على قول أبي يوسف فيما يتعلق بالقضاء لزيادة تجربته كذا في البزازية من القضاء. (ص: ۲۹، مطبوعہ دار الاشاعت کراچی)۔ اور اس بات کی اس کتاب میں تصریح ہے کہ صاحبینؒ کا قول درحقیقت امام صاحبؒ ہی کی کسی بنیاد کی فرع ہوتا ہے (ص: ۱۷) اور خود امام صاحبؒ بھی شبہ عمد ہونے کی شرط لگاتے ہیں کہ مارنے والے کا ”قصد تادیب کا ہو اتلاف نفس کا نہ ہو“ جس کا حاصل یہ ہے کہ اگر قصد اتلاف نفس کا ہو تو ان کے نزدیک بھی قتل بالمشکل سے قتل عمد ہوگا، عبارت یہ ہے: ”يشترط عند أبي حنيفة أي في شبه العمد ان يقصد التأديب دون اتلاف“ (الدّر المختار ج: ۵، ص: ۳۵۱ فصل فيما يوجب القود وما لا يوجبه بولا ق مصر)۔^(۱)

اعلاء السنن جز: ۱۸ میں بھی قتل بالمشکل بشرط القصد سے قصاص واجب ہونے کا ذکر موجود ہے۔^(۲) اس پس منظر کے پیش نظر گزارش یہ ہے کہ کیا اس دور میں صاحبینؒ کے قول پر فتویٰ دینے کی گنجائش ہے یا نہیں؟ اگر جواب اثبات میں ہو تو امام صاحبؒ کے متدل کا جواب کیا ہوگا؟ ان کی ایک دلیل یہ حدیث ہے: ”قتيل السوط والعصا شبه العمد“ نیز ”الا ان قتل خطاء العمد بالسوط والعصا والحجر فيه الدية مغلظة مائة من الابل منها أربعون خلقة في بطونها اولادها“ (بحوالہ احکام القرآن للخصاص ج: ۲، ص: ۲۲۹، ۲۳۰، باب شبه العمد، مطبوعہ بیروت)۔ ان روایات میں آلہ غیر سے قتل کو شبہ عمد میں شمار کیا گیا ہے۔

۲- دوسرا سوال یہ ہے کہ کیا قاضی دیت قتل کی مہلت نہ دے تو کیا اس کی کوئی گنجائش پیدا ہو سکتی ہے یا نہیں؟ شبہ یہ ہے کہ ایک تو ایک شخص کا قریبی قتل ہوا، یہ الگ اس کو صدمہ ہوگا، پھر تین سال

(۱) رد المحتار ج: ۶، ص: ۵۳۰ (طبع سعید)۔

(۲) اعلاء السنن ج: ۱۸، ص: ۸۷ (طبع ادارة القرآن والعلوم الاسلامية)۔

وفي كنز العمال: لا عمد الا بالسيف ج: ۱۵، ص: ۱۱ کتاب القصاص حدیث: ۳۹۸۴۲۔

وفي اعلاء السنن ج: ۱۸، ص: ۸۱ (طبع ادارة القرآن) ليس معناه ان آلة القود ليس الا السيف كما توهمه الطحاوی۔

تک وہ دیت کا انتظار کرے گا، اس سے اس کی تسلی نہ ہوگی۔ راقم کو باوجود تلاش کے مہلت ختم کرنے کی کوئی صورت نظر نہ آئی۔
المستفتی

بندہ بشیر احمد

قاضی عدالت باغ، آزاد کشمیر

جواب ۱:- موجودہ حالات میں قتلِ شبہ العمد کی وہ تعریف اختیار کی جائے جو صاحبینؒ نے اختیار فرمائی ہے، تو وہ مناسب اور مستساغ ہے، آپ نے اس کے جو دلائل ذکر فرمائے ہیں وہ کافی ہیں، اور شاید اس سے قبل میں نے انہی دلائل کی بناء پر آپ سے اپنی رائے ظاہر کر دی تھی۔

۲:- صلح عن دم العمد یا دیتِ عمد جو خود قاتل پر ہوتی ہے، اس میں تو تین سال کی مہلت ضروری نہیں، بلکہ باہمی اتفاق سے جو مدت بھی مقرر ہو جائے وہ درست ہے، صرح بہ فی البدائع،^(۱) بلکہ شافعیہ اور مالکیہ کے نزدیک مہلت دینا جائز نہیں، لیکن شبہ العمد اور خطاء کی دیت چونکہ عاقلہ ادا کرتی ہے، اس لئے اس میں مہلت دینا عین موافق حکمت ہے اور اس کے خلاف فقہاء کا کوئی قول نظر سے نہیں گزرا، اور شبہ العمد میں صاحبینؒ کا قول اختیار کرنے کے بعد اس کی کوئی ضرورت بھی نہیں۔

واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۹/۱۰/۲ھ

(فتویٰ نمبر ۱۷۱۰/۳۰ د)

قتلِ شبہ عمد میں امام ابوحنیفہؒ کا مسلک اور اُن کے دلائل کی تحقیق اور موجودہ دور میں شبہ عمد میں صاحبینؒ کی تعریف اختیار کرنے کا حکم

سوال:- کیا فرماتے ہیں علمائے دین درج ذیل مسئلے میں:-

۱:- احناف کے نزدیک قتل بالمشغل موجب قصاص نہیں ہے، بشرطیکہ دھاری دار نہ ہو، دلیل

میں حدیث ”لا قود الا بالسيف“ پیش فرماتے ہیں۔

۲:- پھر استیفاء قصاص میں بھی اسی حدیث کو اپنا مستدل بنا کر فرماتے ہیں کہ قصاص مثل فصل

دم میں ہوگا بلکہ بہر حالت میں سیف سے ہوگا۔

حدیث بالا کا محمل موجب قصاص ہے (یعنی قصاص کن حالات کن آلات کی ضرب سے

واجب ہوتا ہے) یا استیفاء قصاص ہے؟

(۱) تفصیل کے لئے اگلا فتویٰ اور اس کے حوالے ملاحظہ فرمائیں۔

(۲) دیکھئے: البدائع الصنائع ج: ۷ ص: ۲۴۷ (طبع سعید)۔

جواب ا:- تمام ائمہ احناف نہیں بلکہ صرف امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک قتل بالمشکل موجب قصاص نہیں ہوتا، صاحبینؒ اس سے اختلاف فرماتے ہیں، اور امام ابوحنیفہؒ کے بارے میں بھی علامہ ظفر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کی تحقیق یہ ہے کہ امام ابوحنیفہؒ صرف اس صورت میں قتل بالمشکل کو غیر موجب قصاص کہتے ہیں جبکہ قاتل کا مقصد قتل کرنا نہ ہو، وہ لکھتے ہیں:-

بل مذهبہ ان القتل بالمشکل غیر موجب للقتل إذا لم یکن القتل مقصوداً
للقاتل کما نص علیہ فی المجتبى ونقل عن العینی فی البناية. (اعلاء السنن
ج: ۱۸ ص: ۷۵)۔^(۱)

امام ابوحنیفہؒ کی دلیل میں عموماً حدیث: ”لا قود الا بالسيف“ پیش کرتے ہیں، لیکن ان کے پاس اس بارے میں متعدد صریح دلائل بھی ہیں، مثلاً:-

۱:- مسند احمد میں حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے: ”ولا عمد الا بالسيف“ (کنز العمال ج: ۷ ص: ۲۸۳ حدیث: ۳۱۳۲ کتاب القصاص)۔^(۲)

۲:- طبرانی اور بیہقی میں حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ ہی سے مرفوعاً مروی ہے: ”کل شیء خطاء الا الحديد والحديد والسيف“ اور عبدالرزاق کی روایت کے الفاظ یہ ہیں: ”کل شیء سوى الحديد خطاء وللکل خطا أرس.“ (حوالہ بالا)۔^(۳)

لہذا امام ابوحنیفہؒ کے اس ارشاد کی تائید میں مرفوعات صریحہ موجود ہیں، البتہ زمانہ حاضر میں جبکہ قتل نفس ایک کھیل بن کر رہ گیا ہے، اور قتل کی وارداتیں بے حد بڑھ گئی ہیں، اور قتل کے نت نئے طریقے ایجاد ہو گئے ہیں، احقر کا طبعی رجحان یہ ہے کہ ملکی قانون بناتے وقت امام شافعیؒ یا کم از کم صاحبینؒ کا قول اختیار کیا جائے تو بہتر ہے، احقر نے اس کا تذکرہ کراچی کے بعض اہل فتویٰ علماء سے کیا تو انہوں نے اس سے اتفاق فرمایا، اور اس کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ زہر سے ہلاک کرنے کی صورت میں علامہ حمویؒ وغیرہ نے قصاص واجب ہونے پر فتویٰ دیا ہے، اور علامہ رافعیؒ نے علامہ سمرقندیؒ سے نقل کیا ہے کہ العمل علی هذه الرواية فی زماننا لأنه شاع فی الأرض بالفساد فيقتل دفعا لشره (التحریر المختار ج: ۲ ص: ۳۲۳)۔ تاہم دوسرے اہل فتویٰ علماء سے بھی استصواب مناسب ہے۔^(۴)

(۱) اعلاء السنن ج: ۱۸ ص: ۸۷ (طبع ادارة القرآن).

(۲ و ۳) کنز العمال ج: ۱۵ ص: ۱۱ کتاب القصاص حدیث: ۳۹۸۴۲.

(۴) اب چونکہ پاکستان میں قصاص کا قانون جمہور کے مسلک کے مطابق بنایا گیا ہے، اس لئے اس پر عمل متعین ہے، لأن حکم الحاكم رافع للخلاف۔ (حاشیہ از حضرت والا دامت برکاتہم العالیہ)

۲:- ”لا قود الا بالسيف“ کے جملے میں دونوں معنی کا احتمال ہے، یہ بھی کہ قصاص اس صورت کے سوا واجب نہیں ہوتا جبکہ تلوار سے قتل کیا گیا ہو، اور یہ بھی کہ قصاص کا استیفا سوائے تلوار کے کسی اور چیز سے نہ ہونا چاہئے، اعلاء السنن میں پہلے معنی کو ترجیح دی ہے، وہ لکھتے ہیں: ”لیس معناه أن آلة القود ليس إلا السيف كما توهمه الطحاوی“ (اعلاء السنن ج: ۱۸ ص: ۷۰)۔^(۱)

لیکن علامہ ظفر احمد عثمانی رحمہ اللہ نے آخر میں یہ نتیجہ نکالا ہے کہ: ”فالظاهر انهما حدیثان احدهما فی ایجاب القود انه لا یجب الا بالسيف والثانی فی استیفائه به لا لتوفی الا بالسيف والمراد به اسلام.“ (ایضاً ج: ۱۸ ص: ۷۹)۔^(۲)

بہر حال! حدیث میں دونوں معنوں کا احتمال ہے، اور اس کے معنی متبادر یہی ہیں کہ استیفاء قصاص صرف تلوار سے ہونا چاہئے، اور قتل بالمشکل کے موجب قصاص نہ ہونے پر اس حدیث سے استدلال صریح نہیں ہے اور دوسری احادیث کی موجودگی میں اس حدیث سے استدلال کرنے کی کوئی ضرورت بھی نہیں۔ ہذا ما عندی

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

ھ ۱۳۹۸/۴/۲۷

(فتویٰ نمبر ۲۳۵/۲۹ الف)

قتلِ خطا میں قاتل پر گناہ ہے یا نہیں؟ (مختلف عبارات کی تحقیق)

سوال:- السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

بعد از سلام مسنون عرض ہے کہ بندہ لاہور کے ایک دارالافتاء میں بطور معاون دارالافتاء کام کرتا ہے، ہمارے دارالافتاء میں قتلِ خطا سے متعلق ایک مرتبہ ایک سوال آیا جس کے جواب میں من جملہ قتلِ خطا کے دیگر احکام کے یہ حکم بھی لکھا گیا کہ قاتل اس قتل کی وجہ سے گناہگار بھی ہوا ہے، لہذا توبہ و استغفار کرے، اگرچہ یہ گناہ قتلِ عمد کے گناہ جیسا نہیں جیسا کہ کتب فقہ میں یہ مسئلہ واضح طور سے موجود ہے۔ اس موقع پر بندے کے خیال میں حدیث: ”ان الله تجاوز عن امتی الخطأ الخ“ کی وجہ سے اشکال پیدا ہوا، وجہ اشکال یہ تھی کہ حدیث میں خطا کے مرفوع ہونے سے مراد حکمِ اخروی کا مرفوع ہونا ہے، جو کہ عقاب ہے۔

جب حدیث کی رو سے خاطی سے حکمِ اخروی یعنی عقاب مرفوع ہے تو قتلِ خطا کی صورت میں

(۱) اعلاء السنن ج: ۱۸ ص: ۸۱ (طبع ادارة القرآن).

(۲) اعلاء السنن ج: ۱۸ ص: ۹۲ (طبع ادارة القرآن والعلوم الاسلامية).

قاتل پر گناہ کیوں؟ اور اس سے حکم اُخروی مرفوع کیوں نہیں؟

اس اشکال کا جواب تلاش کرنے کے لئے بندے نے اپنی سی بساط کے مطابق کتب فقہ و فتاویٰ اور کتب تفسیر و شروح حدیث کو دیکھا لیکن جو توجیہات ان حضرات نے قتلِ خطا میں قاتل کو گناہگار قرار دینے کی اختیار فرمائی ہیں، ان میں سے کسی توجیہ سے تسلی نہیں ہوئی بلکہ بعض عبارات سے قاتل کے گناہگار ہونے کے خیال کو مزید تقویت پہنچی، چنانچہ احکام القرآن للجصاص میں ہے:

لیست هذه الكفارة مستحقة بالمأثم فيعتبر عظم الاثم فيها لأن المخطئ

غير آثم فاعتبار الاثم فيه ساقط.

مرقات شرح مشکوٰۃ میں ہے:

والمعنى أنه عفا عن الاثم المستوجب عليه بالنسبة الى مأثر الاثم وإلا
فالمواخذة المالية كما في قتل النفس خطأ وإتلاف مال الغير ثابتة شرعاً
ولذا قال علماءنا في أصول الفقه: الخطأ عذر صالح لسقوط حق الله اذا
حصل من اجتهاد ولم يجعل عذراً في حقوق العباد حتى وجب عليه ضمان
العدوان. (ج: ۱۰ ص: ۲۶۳ طبع کوئٹہ)

حاشیہ مشکوٰۃ میں لمعات سے منقول ہے:

ولعل المراد بالتجاوز عدم الاثم فيها لا عدم المواخذة عليهما مطلقاً لأنه
يثبت الدية والكفارة في قتل الخطأ ومع ذلك الاثم مرفوع في الكل وهو
المراد بالتجاوز. (مشکوٰۃ ج: ۲ ص: ۵۸۴ طبع قدیمی کتب خانہ)

ہدایہ میں ہے:

والخطأ على نوعين وموجب ذلك الكفارة والدية على
العاقلة ولا اثم فيه. (ج: ۴ ص: ۵۶۱)

اگرچہ صاحب ہدایہ نے ”لا اثم فيه“ سے قتل کا گناہ مراد لیا ہے، باقی ترکِ عزیمت اور ترکِ مبالغہ فی الثبوت کا گناہ مرفوع نہیں ہوگا۔

لیکن اشکال تو یہی ہے کہ خطا میں ترکِ عزیمت اور ترکِ مبالغہ فی الثبوت تو ہوتا ہی ہے اس کے باوجود شارع نے اس سے گناہ کو رفع فرمایا ہے۔

نیز بعض حضرات نے کفارہ کی مشروعیت کو بھی گناہ کی دلیل بنایا ہے، لیکن اس کا جواب احکام القرآن للجصاص کی عبارت سے ہو جاتا ہے کہ یہ کفارہ گناہ کی وجہ سے نہیں۔

بندے کو فقہائے کرام پر کوئی اعتراض نہیں ہے، البتہ ان حضرات کی بات سمجھنے میں اپنے قصورِ فہم کا اعتراف ہے۔

اس لئے بندہ بڑوں کی بات کو بڑوں سے سمجھنے کی غرض سے تکلیف دہی پر انتہائی معذرت خواہی کے ساتھ آنجناب سے راہنمائی کا متمنی ہے۔ وللارض من کاس الکرام نصیب۔

فقط والسلام

عرض کنندہ

محمد رفیق

معاون دارالافتاء والتحقیق

چوبرجی پارک لاہور

جواب:- قتلِ خطا میں قاتل پر گناہ ہے یا نہیں؟ اس کے بارے میں فقہائے کرام کی عبارتیں مختلف ہیں، بعض حضرات نے فرمایا ہے کہ اس میں گناہ ہے، اگرچہ قتلِ عمد کے گناہ سے کم ہے، اور کفارہ اسی کے ازالے کے لئے مشروع ہوا ہے، چنانچہ درمختار میں فرمایا گیا ہے:

والاثم دون اثم القتل اذ الكفارة تؤذن بالاثم لترك العزيمة.

اس کے تحت علامہ شامیؒ نے فرمایا ہے کہ:

قوله لترك العزيمة، وهي هنا المبالغة في الثبوت. قال في الكفاية: وهذا

الاثم اثم القتل، لأن نفس ترك المبالغة في الثبوت ليس باثم، وانما يصير

به آثما اذا اتصل به القتل، فتصير الكفارة لذنب القتل، وإن لم يكن فيه اثم

قصد القتل اهد تأمل. (رد المحتار ج: ۶ ص: ۵۳۱) (۱)

اور بعض فقہائے کرام نے گناہ کی نفی کی ہے، جیسا کہ امام ابو بکر جصاص رحمہ اللہ تعالیٰ کی عبارت آپ نے خود نقل کی ہے، اور امام طحاویؒ کی عبارت سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے، وہ فرماتے ہیں:

ان الكفارات قد تجب في الأشياء التي لا آثام فيها على من كانت منه، من

ذلك قوله تعالى في كتابه: "ومن قتل مؤمناً خطأ" الآية.

(مشکل الآثار ج: ۱ ص: ۳۹۲) (۲)

اور بعض فقہاء نے گناہ کے ذکر سے سکوت فرمایا ہے۔

لیکن درحقیقت دونوں قسم کے اقوال میں یہ تطبیق بھی ممکن ہے کہ جنہوں نے گناہ کی نفی کی ہے،

(۱) طبع سعید.

(۲) مشکل الآثار للطحاوی باب من اقتطع مال امری مسلم بيمين كاذبة. ج: ۱ ص: ۲۵۰ رقم: ۳۸۳.

اس سے مراد قتل کے گناہ کی نفی ہے، اور جنہوں نے اثبات کیا ہے اس سے مراد عدمِ تثبت کے گناہ کا اثبات ہے، اور اختلاف کو حقیقی بھی مانا جائے تو یہ محض نظریاتی اختلاف ہے، جس کا کوئی عملی نتیجہ نہیں نکلتا، اس لئے کہ:

- ۱- اس بات پر سب کا اتفاق ہے کہ کفارہ واجب ہے۔
- ۲- اس بات پر کسی کا اختلاف نہیں کہ کفارہ نہ دیا جائے تو گناہ ہوگا۔
- ۳- اس بات پر بھی سب کا اتفاق ہے کہ کفارہ ادا کرنے کے بعد اس پر کوئی اخروی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی۔

ان تمام عملی نتائج پر متفق ہونے کے بعد تعبیر میں یہ اختلاف ہے کہ بعض حضرات نے فرمایا کہ گناہ تھا، مگر کفارے سے ختم ہو گیا، اور بعض حضرات نے فرمایا کہ گناہ ہی نہ تھا، اور کفارہ ایک امرِ تعبیدی کے طور پر واجب ہوا۔

البتہ قرآن کریم کے الفاظ سے ظاہراً یہ معلوم ہوتا ہے کہ گناہ تھا، مگر کفارہ سے معاف ہو گیا، اس لئے کہ قرآن کریم نے کفارہ کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ: ”تُوبَةُ مِنَ اللَّهِ“ (النساء: ۹۳)۔ اس آیت کا ترجمہ حضرت حکیم الامت مولانا تھانوی قدس سرہ نے اس طرح فرمایا ہے: ”(یہ آزاد کرنا، اور وہ نہ ہو سکے تو روزے رکھنا) بطریقِ توبہ کے (ہے) جو اللہ کی طرف سے مقرر ہے۔“

اس آیت کریمہ میں صراحت ہے کہ کفارہ بطور توبہ کے مشروع ہوا ہے، اور ظاہر یہی ہے کہ توبہ کسی گناہ پر ہوتی ہے، اور چونکہ اللہ تعالیٰ نے خود ارشاد فرمایا ہے کہ کفارہ سے توبہ ہو جائے گی، اس لئے الگ سے توبہ واستغفار کی ضرورت نہ رہی۔

اب صرف یہ بات رہ جاتی ہے کہ قتلِ خطا پر گناہ کا ہونا حدیث ”رَفَعَ عَنْ أُمَّتِي الْخَطَا وَالنَّسِيَانَ“^(۱) کے معارض معلوم ہوتا ہے، اس کے دو جواب ممکن ہیں:

ایک یہ کہ اس حدیث کا مقصود یہ ہے کہ اُس فعل کا اصل گناہ خطا کی صورت میں مرفوع ہے، چنانچہ قتل کی صورت میں اصل گناہ قتلِ عمد کا گناہ تھا جو خطا کی وجہ سے مرفوع ہو گیا، لیکن کسی اور جہت سے گناہ ہونا، اس کے معارض نہیں، مثلاً قتلِ تثبت کا گناہ پھر بھی ہو سکتا ہے جو ایک جان کی ہلاکت کا سبب بنا۔

(۱) وفي جامع الأحاديث حرف الرّاء ۱۲۷۶۳ رفع عن أمتي الخطاء والنسيان.

وكذا في الجامع الكبير للسيوطي ۱۲۹۱۱ أخرجه الطبراني ج: ۲ ص: ۹۷ رقم: ۱۳۳۰.

دوسرا جواب یہ ہو سکتا ہے کہ قتلِ خطا اس کلیہ سے بنصِ قرآن مستثنیٰ ہے، اور اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ کسی معصوم جان کا ہلاک ہو جانا انتہائی سخت معاملہ ہے۔ اور اس میں بلا قصد تسبیب بھی موجبِ گناہ ہے۔ اور ترکِ مبالغہ فی التحرز والتثبت دوسرے معاملات میں چاہے موجبِ گناہ نہ ہو، لیکن اس سنگین معاملے میں موجبِ گناہ قرار دیا گیا ہے۔ البتہ عدمِ قصد کے عذر کی وجہ سے معافی کے لئے صرف کفارہ کو توبہ کے قائم مقام قرار دے دیا گیا ہے، الگ سے توبہ کی ضرورت نہیں قرار دی گئی۔

هذا ما ظهر لي

والله سبحانه وتعالى اعلم

بندہ محمد تقی عثمانی

۱۰ شعبان ۱۴۳۰ھ

(فتویٰ نمبر ۳۴/۱۱۸۶)



﴿فصل فی التعزیر﴾

(تعزیر اور سزا دینے کے مسائل کا بیان)

بہتان اور الزام تراشی پر تعزیری سزا کا اختیار

صرف عدالت کو ہے، عوام کو نہیں

سوال :- زید اور بکر ایک تنظیم کے ذیلی ادارے کے عہدے داران تھے، زید بکر کے ماتحت کام کرتا تھا، بکر نے زید کے خلاف کچھ باتیں کیں اور زید نے بکر پر الزامات لگائے، انتظامی کمیٹی نے بکر کے خلاف الزامات کا کوئی نوٹس نہ لیا اور فیصلہ کر دیا کہ چونکہ زید اور بکر کے درمیان اختلافات کی وجہ سے اعتماد کی فضا باقی نہیں رہی، اس لئے ماتحت ملازم زید کو ادارے سے برطرف کیا جاتا ہے۔ جس کے بعد زید اپنا چارج چھوڑ کر گھر چلا گیا۔ اس کے چند دن بعد بکر نے ایک پریس ریلیز جاری کر کے اخبارات میں شائع کروایا اور مختلف ذمہ داروں کو دیا، اور بھجوا دیا کہ میں نے انتظامی کمیٹی کے مشورے سے زید کو مالیات میں خورد برد کرنے، قواعد و ضوابط کی خلاف ورزی کرنے اور نظم کی پابندی نہ کرنے، غلط بیانی اور ڈائری میں فرضی اندراج کرنے کی بناء پر برطرف کر دیا ہے۔ زید نے جب رسائل و اخبارات میں پڑھا تو اس نے ان بہتانوں کے خلاف تنظیم کے مجاز سربراہ کے پاس تحریری شکایت اپیل کی، مجاز سربراہ نے اپنا نمائندہ انکوائری کے لئے مقرر کیا، انکوائری اور تحقیقات کے دوران بکر زید پر لگائے گئے بہتانوں ثابت نہ کر سکا، اور انکوائری آفیسر کے متنبہ کرنے اور کہنے کے باوجود بکر نے اس صریح ظلم پر زید سے معافی مانگنے سے صاف انکار کرتے ہوئے کہا کہ زید اگر چاہے تو عدالت میں میرے خلاف دعویٰ کر دے، میں خود بھگت لوں گا۔ اور کہا کہ ”اس شخص سے تو معذرت نہیں کروں گا“ اس پر انکوائری آفیسر نے اپنی رپورٹ میں شدید دکھ کا اظہار کیا ہے، اور مزید لکھا ہے کہ مجلس عاملہ کے فیصلے میں جو الزامات درج نہیں وہ بھی پریس ریلیز میں بلاوجہ اور بغیر کسی معقول ثبوت کے اپنے غصے کی

وجہ سے اور اپنی توہین کا انتقام لینے کی غرض سے شامل کر دیئے گئے۔ انہوں نے ایسی سنگین غلطی کی ہے جس کی مثال نہیں ملتی۔ انکوائری آفیسر نے بدیں وجوہ بکر کے خلاف تادیبی کارروائی کی سفارش کی ہے۔ بکر نے پریس ریلیز میں مزید دروغ گوئی یہ کی کہ اس نے زید کو برطرف کیا ہے، مزید یہ کہ انتظامی کمیٹی کے مشورے سے برطرف کیا ہے۔

زید کا کہنا ہے کہ جب یہ ثابت ہو گیا ہے کہ بکر نے اس پر بہتانات (قذف) لگائے ہیں، نیز خلاف واقعہ دروغ گوئی کر کے زید کو خود برطرف کرنے انتظامی کمیٹی کے مشورے سے برطرف کرنے اور اخبارات وغیرہ کے ذریعے مشتہر کر کے اُسے چار دانگ عالم میں رسوا کیا ہے، جس سے اس کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا ہے، اور مزید یہ کہ بکر نے تنظیم کے سربراہ کے نمائندے کی عدم اطاعت کی ہے، تو ان جرائم کی وجہ سے جو کہ قابل تعزیر ہیں بکر مردود الشہادت اور ساقط الاعتبار اور منصب کے لئے نااہل ہو گیا ہے، اس لئے تادیب کے طور پر بکر کی بنیادی رکنیت تنظیم ختم کی جانی چاہئے، اور ادارے کے عہدے سے برطرف کیا جانا چاہئے، اور تعزیر کے طور پر سزا دی جانی چاہئے۔ براہ کرم شرعی نقطہ نگاہ سے صراحت فرمائیں کہ زید کا یہ مطالبہ کہاں تک حق بجانب ہے؟

جواب:- اگر واقعات مندرجہ درست ہیں اور زید اُن الزامات سے واقعہ بری ہے جو بکر نے اس پر لگائے ہیں، تو بکر نے بہتان طرازی کا ارتکاب کر کے سخت گناہ کا ارتکاب کیا ہے، اگر وہ اپنے اس گناہ سے تائب نہ ہو اور زید سے معافی نہ مانگے، تو کسی ایسے عہدے کا مستحق نہیں ہے جس

(۱ و ۲) وفی سنن أبی داؤد ج: ۲ ص: ۳۲۷ (طبع مکتبہ رحمانیہ) قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: کل المسلم علی المسلم حرام ماله وعرضه ودمه حسب امرئ من الشر أن يحقر أخاه المسلم.

وفی سنن أبی داؤد کتاب الأدب باب من رد عن مسلم غیبة ج: ۲ ص: ۳۲۷ (طبع رحمانیہ) عن سهل بن معاذ بن أنس الجهنی عن أبیه عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: من حمى مؤمناً من منافق أراه قال بعث اللہ ملکاً یحمی لحمه یوم القيامة من نار جهنم، ومن رمى مسلماً بشيء یريد شینه به حبسه اللہ علی جسر جهنم حتی یخرج مما قال.

وکذا فی مسند أحمد حدیث معاذ بن أنس الجهنی رقم الحدیث: ۱۵۵۸۶ ج: ۱۲ ص: ۲۵۸ (طبع دار الحدیث القاہرہ) ومشکوۃ المصابیح ج: ۵ ص: ۴۲۴ (طبع قدیمی) وفی مرقاة المفاتیح ج: ۹ ص: ۲۳۸ (طبع امدادیہ ملتان) ای قذف مسلماً بشيء ای من العیوب یرید به شینه ای عیبه حبسه اللہ ای وقفه علی جسر جهنم وهو صراط ممدود حتی یخرج مما قال ای من عہدته والمعنی حتی ینقی من ذنبه ذلک بارضاء خصمه أو بشفاعه أو بتعذیه بقدر ذنبه وکذا فی بذل المجہود ج: ۵ ص: ۲۵۵ (طبع معہد الخلیل کراچی).

وفی شرح الفقہ الاکبر مسئلة فی التوبة وشرائطها ص: ۱۵۹ و ۱۶۰ (طبع قدیمی) اما اذا قال بهتاناً بأن لم یکن ذلک فیہ فانه یحتاج الی التوبة فلیس شیء من العصیان أعظم من البهتان الخ.

سے ماتحتوں کے حقوق وابستہ ہوں۔ ایک اسلامی عدالت اس بہتان طرازی پر اُسے تعزیری سزا بھی دے سکتی ہے، لیکن یہ تعزیری سزا عام لوگوں کو دینے کا اختیار نہیں ہے، صرف عدالت کے ذریعے دلوائی جاسکتی ہے۔^(۱)

واللہ اعلم

(فتویٰ نمبر ۱۰۲۵/۳۹ د)

مجلس گناہ میں شرکت نہ کرنے کا وعدہ توڑنے پر شرعاً کوئی
تعزیر مقرر نہیں، نیز تعزیری سزائیں جاری کرنے کا اختیار
صرف قاضی شرعی کو ہے

سوال :- برادری نے ایک ماتم کے موقع پر فیصلہ کیا کہ آئندہ شادیوں میں ڈھول بجانے اور لاؤڈ اسپیکر میں گانوں پر پابندی کی جائے، اور جو نہ مانے اس کا بائیکاٹ کیا جائے، تمام برادری اس پر متفق ہو گئی، اس موقع پر امام مسجد نے بھی بطور دھمکی و تنبیہ کہا کہ جو یہ حرکت کرے گا اس کا نکاح نہیں پڑھایا جائے گا۔ کچھ دن بعد برادری میں ایک شادی ہوئی جس میں ڈھول کا بجانا اور لاؤڈ اسپیکر پر گانے شروع ہو گئے، امام مسجد نے لوگوں کو بتایا کہ وعدہ خلافی ہو رہی ہے، امام نے ذمے دار لوگوں کو بھیجا کہ ان کو وعدہ خلافی سے منع کریں، لیکن اہل تقریب نہ رُکے، ڈھول بجاتے رہے، اس کے بعد جب موقع نکاح کا آیا تو یہاں سوشلسٹ آدمی جو اپنے نظریے میں سوشلزم کو دین سمجھتا ہے، وہ امام کو کہتا ہے کہ نکاح مت پڑھاؤ کیونکہ تم نے کہا ہے کہ جو ایسا کرے گا اس کا نکاح نہیں پڑھایا جائے گا، امام نے کہا کہ میں نے یہ بطور دھمکی کہا ہے، حقیقت میں یہ کام مانع نکاح نہیں ہے، نکاح کے جواز کی شرائط اور ہیں، امام نے نکاح پڑھایا اور نکاح کے وقت ڈھول بند کر دیا گیا۔ اب وہ اشتراکی لیڈر یہ افواہ پھیلا رہا ہے کہ امام نے چونکہ وعدہ خلافی کی، اس وجہ سے اس کو تعزیر دے دی جائے۔ امام مسجد فرما رہا ہے کہ میں سرکاری نکاح رجسٹرار ہوں، مجبوری کی وجہ سے میں نے نکاح پڑھایا ہے، اس کے علاوہ اگر نکاح نہ پڑھاتا تو فساد کا خطرہ تھا، کیونکہ ساری برادری نکاح میں شرکت کر چکی تھی، اور امام محلہ بھی ہے نہ پڑھانے کی صورت میں امامت سے نکالنے کا بھی خطرہ تھا، تو کیا اس صورت میں امام کے لئے تعزیر شرعی ہے؟

جواب :- پہلے یہ سمجھ لیجئے کہ امام نے لوگوں کے سامنے جو یہ وعدہ کیا تھا کہ وہ کوئی نکاح

(۱) وفي الهندية كتاب الحدود ج: ۲ ص: ۱۴۳ (طبع رشیدیہ) و رکنۃ اقامة الامام او نائبه في الاقامة.

وفي بدائع الصنائع كتاب الحدود ج: ۷ ص: ۵۷ (طبع سعید) اما الذي يعم الحدود كلها فهو الامامة وهو ان يكون المقيم للحد هو الامام او من ولاه الامام وهذا عندنا.

نہیں پڑھائے گا جس کی تقریب میں ڈھول باجا، یا گانا بجانا ہو، تو اب کسی ایسی مجلس نکاح میں جا کر نکاح پڑھانا اس کے لئے دو وجہ سے ناجائز تھا، ایک اس وجہ سے کہ جس مجلس میں یہ لہو و لعب ہو رہے ہوں اس میں جان بوجھ کر شرکت کرنا ناجائز ہے، دوسرے اس وجہ سے کہ یہ وعدہ خلافی ہے، جہاں تک پہلی وجہ کا تعلق ہے وہ تو صورتِ مسئلہ میں محقق نہیں ہوئی کہ جس وقت امام صاحب نکاح پڑھانے گئے اس وقت ڈھول باجا موقوف کر دیا گیا تھا۔ اب دوسری وجہ رہ جاتی ہے، سو درحقیقت امام صاحب کا یہ وعدہ پوری برادری کے ساتھ ایک معاہدے کی حیثیت رکھتا تھا، جب پوری برادری نے یہ معاہدہ پہلے توڑ دیا تو اب امام صاحب کے لئے بھی بحیثیت معاہدہ اس کی خلاف ورزی کی گنجائش تو نکل آئی، لیکن اگر امام صاحب کا اعلان برادری کے ساتھ معاہدے پر موقوف نہیں تھا، بلکہ انہوں نے ذاتی طور پر لوگوں کے سامنے یہ وعدہ کیا تھا تو انہیں اس وعدہ خلافی پر توبہ و استغفار کرنا چاہئے، اس قسم کے معاملات میں شریعت کی طرف سے کوئی تعزیر مقرر نہیں ہے، اور نہ قاضی شرعی کے سوا کسی اور کو تعزیر جاری کرنے کا اختیار ہے۔

واللہ اعلم

۱۳۹۰/۱۱/۷ھ

(فتویٰ نمبر ۱۱۱۲/۲۱ الف)

(۱) وفي مرقاة المفاتيح شرح المشكاة ج: ۶ ص: ۲۵۴ و ۲۵۵ (طبع امداديه ملتان) عن سفينة ان رجلاً ضاف على بن ابي طالب رضي الله عنه فصنع له طعاماً فقالت فاطمة: لو دعونا رسول الله صلى الله عليه وسلم فاكل معنا، فدعوه فجاء فوضع يديه على عضادتي الباب فرأى القرام قد ضرب في ناحية البيت فرجع قالت فاطمة رضي الله عنها فتبعته فقلت: يا رسول الله! ما ردك؟ قال: انه ليس لي - أو - لنبي أن يدخل بيتاً مزوقاً. رواه أحمد وابن ماجه. قال الملا علي القاري رحمه الله وفيه تصريح بأنه لا يجاب دعوة فيها منكر وفيه أنه لو كان منكراً لأنكر عليها ولكن نه بالرجوع الى أنه ترك الاولى فإنه من زينة الدنيا وهي موجبة لنقصان الأخرى.

رشي تبیس الحقائق کتاب الکراهیة فصل فی الأكل والشرب ج: ۷ ص: ۲۹ و ۳۰ (طبع دار الكتب العلمية بيروت) وان كان هناك لعب وغنا قبل أن يحضرها فلا يحضرها لأنه لا يلزمه اجابة الدعوة اذا كان هناك منكر.

وفي الهديّة كتاب الكراهية الباب الثاني عشر في الهدايا والضيافات ج: ۵ ص: ۳۲۲ و ۳۲۳ (طبع رشيدية).

ومن دعى الى وليمة فوجد ثمة لعباً أو غناء فلا بأس ان يقعد ويأكل فان قدر على المنع يمنعه وان لم يقدر يصبر وهذا اذا لم يكن مقتدى به اما اذا كان ولم يقدر على منعهم فإنه يخرج ولا يقعد ولو كان ذلك على المائدة لا ينبغي أن يقعد وان لم يكن مقتدى به وهذا كله بعد الحضور واما اذا علم قبل الحضور فلا يحضر.... الخ.

وفي الهداية كتاب الكراهية ج: ۴ ص: ۴۵۵ (طبع شركت علميه) هذا اذا لم يكن مقتدى فان كان ولم يقدر على منعهم يخرج ولا يقعد لأن في ذلك شين الدين وفتح باب المعصية على المسلمين. (وفي طبع رحمانيه ص: ۴۵۳ و ۴۵۴)

وفي الهداية ج: ۴ ص: ۴۵۴ (طبع مكتبة رحمانيه) ومن دعى الى وليمة أو طعام فوجد ثمة لعباً أو غناء فلا بأس بأن يقعد ويأكل..... وهذا اذا لم يكن مقتدى فان كان ولم يقدر على منعهم يخرج ولا يقعد لأن في ذلك شين الدين

وفتح باب المعصية على المسلمين والمحكى عن أبي حنيفة في الكتاب كان قبل أن يصير مقتدى ولو كان ذلك على المائدة لا ينبغي أن يقعد وان لم يكن مقتدى لقوله تعالى: "فَلَا تَقْعُدُوا بِغَدِ الذِّكْرِى مَعَ الْقَوْمِ الظَّالِمِينَ" وهذا كله بعد الحضور ولو علم قبل الحضور لا يحضر لأنه لم يلزمه حق الدعوة.

وفي الفتاوى البزازية على الهنديّة ج: ۶ ص: ۳۵۹ (طبع رشيدية) استماع صوت الملاهى كالضرب بالقضيب ونحوه حرام قال عليه السلام استماع الملاهى معصية والجلوس عليها فسق والتلذذ بها كفر أى بالنعمة.

لواطت کی شرعی سزا جاری کرنے کا اختیار حکومت کو ہے

سوال:- ایک صاحب کا ابتلاء باللواط بمعہ تعیین مقام یہ صاحب امام مسجد تھے، آخر پکڑے گئے، اور نکال دیئے گئے، اور رُوپوش ہو کر کہیں دُور دراز مقام میں ملازمت کر لی۔ سائل اس امام صاحب کے تعاقب میں ہے، اور شرعی سزا معلوم کر کے اُس پر جاری کرنا چاہتا ہے..... الخ۔

جواب:- لواطت کا مرتکب فاسق ہے، اور جب تک وہ اس عمل سے صدقِ دل سے توبہ نہ کرے، اس کو امام بنانا جائز نہیں۔ البتہ شرعی سزائیں جاری کرنے کا حق صرف اسلامی حکومت کو ہوتا ہے،^(۱) اور موجودہ قوانین میں چونکہ شرعی حدود نافذ نہیں ہیں اس لئے اس عمل کی سزا معلوم کرنا بے کار ہے۔

نوٹ:- اس قسم کے سوالات میں کسی معین شخص کا نام و نشان استفتاء میں ذکر نہ کرنا

واللہ اعلم وعلمہ اتم واحکم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

ھ۱۳۸۷/۱۰/۲۶

(فتویٰ نمبر ۱۳۱۸/۱۸ الف)

چاہئے۔

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع

ھ۱۳۸۷/۱/۲۷



(۱) وفي الهندية كتاب الحدود ج: ۲ ص: ۱۴۳ (طبع رشیدیہ) وركنه اقامة الامام أو نائبه في الإقامة.

وكذا في بدائع الصنائع ج: ۷ ص: ۵۷ كتاب الحدود ومثله في كتاب الفقه على المذاهب الأربعة ج: ۵ ص: ۲۴۹ كتاب الحدود.

﴿فصل فی القسامۃ﴾

(قسامت یعنی کسی جگہ پائے جانے والے مقتول پر
اہل محلہ سے قسم لینے کا بیان)

کسی بستی کی طرف منسوب اُس کی مخصوص شارع عام میں پائی جانے
والی لاش کی قسامت اُس بستی والوں پر ہوگی

سوال :- ایک لاش ایک بستی کے قریب اُس کی سڑک پر ملی، وہ سڑک ایسی ہے کہ اُسے اسی
بستی کی طرف ہی مکمل طور پر منسوب کیا جاتا ہے۔ تو کیا اس سڑک پر اگر لاش ملے تو اس بستی والوں پر
قسامت آئے گی یا نہیں؟ واضح رہے کہ اس سڑک سے اس بستی کا کچھ فاصلہ بھی ہے لیکن بہت زیادہ نہیں
ہے، نیز یہ سڑک اسی بستی کے لئے تقریباً مخصوص ہے، پہلے ایک فتویٰ دیا گیا تھا جس میں لکھا گیا تھا کہ
اس بستی والوں پر قسامت نہیں آئے گی، صحیح شرعی صورت حال سے برائے کرم آگاہ فرمائیں۔

جواب :- مخدوم گرامی قدر و مکرم جناب مولانا تاج محمد صاحب مدظلہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

میں نہایت شرمندہ ہوں کہ آنجناب نے جو استفتاء دستی طور پر احقر کو دیا تھا، اس کے جواب
میں بہت تاخیر ہوئی، اس سے آنجناب کو جو تکلیف پہنچی، اس پر معذرت کے لئے احقر کے پاس الفاظ
نہیں، اُمید ہے کہ معاف فرمائیں گے۔ اب آنجناب نے دوبارہ سوال و جواب متعلقہ عبارتوں کے
ساتھ ارسال فرمائے تو مسئلے پر غور کرنے کا موقع ملا، دونوں سوال و جواب اور متعلقہ عبارتیں دیکھنے سے
اندازہ ہوا کہ دونوں فتوؤں میں اصل حکم کے اعتبار سے کوئی تعارض نہیں۔ یہ مسئلہ غیر مختلف فیہ ہے کہ اگر
شارع عام پر ایسی جگہ لاش ملے جو کسی بستی سے اتنی قریب ہو کہ وہاں تک مقتول کی آواز پہنچ سکتی ہو تو
اس بستی والوں پر قسامت ہوگی، لیکن اگر وہ جگہ بستی سے اتنی دُور ہے کہ مقتول کی آواز بستی تک نہیں پہنچ
سکتی تو اس صورت میں بستی والوں پر قسامت نہیں، چنانچہ متعلقہ تمام مسائل کو نہایت جامع انداز میں
علامہ رافعیؒ نے اس طرح بیان فرمایا ہے :-

و ظهر منه انه كما لا يناسب العمل بإطلاق المتون لا يناسب الإفتاء
بوجوب القسامة والدية على أهل أدنى الحال مطلقاً، والحاصل أن القتل
إن وجد في الشارع الأعظم ونحوه فإن وقع عند الإزدحام فلا قسامة،
وديته على بيت المال، وإن وقع في موضع لو صيح فيه يسمعه أهل
العمران فالقسامة والدية على أدنى المحال، وفي موضع بعيد منتفع به بين
المسلمين فهي على بيت المال، وإلا فهدر اهـ۔“

(تقريرات الرافي ج: ۶ ص: ۳۳۹) (طبع جديد، ط سعيدي)

لہذا اس عبارت میں جو مسئلہ بیان کیا گیا ہے، اس میں کوئی اختلاف نہیں، البتہ جس استفتاء
کے جواب میں ابتداءً فتویٰ جاری ہوا، اس میں یہ صراحت تھی کہ جس جگہ مقتول پایا گیا وہ بستی سے ۵۰۰
میٹر دور تھی، اور اس جگہ اور بستی کے درمیان کھیت اور کنویں بھی حائل تھے، لہذا جواب دینے والے
صاحب نے سمجھا کہ ۵۰۰ میٹر یعنی نصف کلومیٹر کے فاصلے سے عام طور پر آواز نہیں پہنچتی، بالخصوص جبکہ
درمیان میں کھیت اور کنویں بھی حائل ہوں، البتہ مناسب یہ تھا کہ وہ جواب میں یہ صراحت کر دیتے کہ
یہ جواب اس صورت میں ہے جب واقعہً فاصلہ اتنا ہو کہ آواز نہ پہنچے۔

در اصل حکم کا مبنیٰ یہ ہے کہ شارع عام اگر بستی والوں کی طرف اس طرح منسوب کی جاسکتی ہو
کہ اس کی حفاظت اور اس کی نگہداشت کی ذمہ داری ان پر عائد ہوتی ہو، تو شارع عام کے اس حصے پر
پائے جانے والے مقتول کے سلسلے میں قسامت ان پر عائد ہوگی، اس بات کی علامت کے طور پر
فقہائے کرام نے چیخ کی آواز پہنچنے کو ذکر فرمایا ہے۔

لہذا نفس مسئلہ میں کوئی اختلاف نہیں ہے، سارا مدار صورت مسئلہ کے صحیح صحیح تعین پر ہے،
ظاہر ہے کہ آپ وہاں سے قریب ہیں، اور آپ تمام باتوں کو مد نظر رکھ کر فیصلہ فرما سکتے ہیں، اگر وہ جگہ
واقعہً ایسی ہے کہ اسے آواز پہنچنے کی وجہ سے بستی سے منسوب کیا جاسکتا ہو تو بے شک قسامت ہوگی،
ورنہ نہیں۔ یہ بات آپ خاص طور پر ملاحظہ فرمائیں کہ اگر واقعہً فاصلہ ۵۰۰ میٹر کا ہے، اور بیچ میں کھیت
وغیرہ حائل ہیں تو بظاہر آواز کا پہنچنا بعید معلوم ہوتا ہے، اس کے علاوہ جو سوال سب سے پہلے آیا تھا، اس
میں غیر واضح انداز میں یہ بھی تذکرہ تھا کہ دو گروہوں کے درمیان لڑائی ہوئی تھی، اور اس جگہ پر کوئی خون
بھی نہیں پایا گیا، ان پہلوؤں پر بھی تحقیق اور غور کی ضرورت ہے۔

والسلام

(حضرت مولانا محمد تقی عثمانی (مدظلہم)

بقلم: عبداللہ میمن

﴿کتاب الجنایات﴾ (جنایت کے مسائل کا بیان)

مالک کی اجازت کے بغیر اس کے باڑے میں کسی کا اپنا اُونٹ لے جانا اور اس جانور کا دوسرے جانوروں کو ہلاک کرنے کا حکم

سوال :- زید کا ایک اُونٹ ہے، اور عمرو کا اُونٹوں کا ایک گلہ، ایک دن زید نے چاہا کہ وہ اپنا اُونٹ عمرو کے اُونٹوں کے گلے کے ساتھ کر دے، لیکن عمرو نے یہ کہتے ہوئے کہ تمہارا (یعنی زید کا) اُونٹ بہت بدمعاش ہے اور خطرہ ہے کہ وہ میرے اُونٹوں کو ہلاک نہ کر دے منع کر دیا، مگر زید نے عمرو کے منع کرنے کے باوجود اپنا اُونٹ عمرو کے گلے میں چھوڑ دیا، دوسری صبح عمرو کے اُونٹوں میں سے دو اُونٹ مردہ پائے گئے اور زید کا اُونٹ ان کے ساتھ پایا گیا، (واضح رہے کہ زید کے اُونٹ کے ساتھ عمرو کا صرف ایک ہی اُونٹ برابر ہے باقی سب چھوٹے ہیں) مردہ اُونٹوں کے جسموں کے مختلف مقامات پر اُونٹ کے دانتوں کے نشانات اور کف پایا گیا، اس کے علاوہ اُونٹوں کے رگیدنے کے نشانات بھی پائے گئے ہیں، قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ عمرو کے اُونٹوں کو زید کے اُونٹ نے ہلاک کیا ہے جو مندرجہ ذیل شک کو یقین میں بدلنے کے موجب ہیں۔

۱:- زید کا اُونٹ بدمعاشی اور نقصان رسانی میں مشہور ہے، اور علاقے کے لوگ اس سے

خوف زدہ رہتے ہیں۔

۲:- بقول بکر (جس سے زید نے یہ اُونٹ خریدا تھا) اُس نے اپنا یہ اُونٹ اسی لئے بیچا تھا کہ

اس کی عادات بد تھیں اور خطرہ تھا کہ کہیں کسی انسان کو ہلاک یا زخمی نہ کر دے۔

۳:- اس وقوعہ سے چند دن قبل علاقے کے نمبردار نے ایک ایسی پنچائت میں جس میں زید

بھی حاضر تھا اُونٹوں کی نگرانی کے موضوع پر تقریر کرتے ہوئے زید کا نام بطور خاص لیا اور صریح الفاظ میں اُس کو تنبیہ کی کہ وہ اپنے اُونٹ کی خطرناکی کے پیش نظر کسی بھی متوقع حادثے سے بچنے کے لئے اپنے اُونٹ کی نگرانی کرے۔

۴:- معززین قوم نے مردہ اُونٹوں کا موقع پر معائنہ کیا اور اس نتیجے پر پہنچے کہ زید کے اُونٹ

نے ہلاک کیا ہے۔

الف:- شرع کی رُو سے زید پر عمرو کے اُونٹوں کا ضمان آئے گا یا نہیں؟ اگر آئے گا تو کس

شرعی اصول کی رُو سے؟

ب:- اُونٹ کی ہلاکت کے عینی شاہد نہیں ہیں، کیا زید کے اُونٹ کا بدمعاش مشہور ہونا ثبوت

کے لئے کافی ہے یا کوئی اور ثبوت دینا ہوگا؟

ج:- کیا بکر کا بیان اور نمبر ۳ میں نمبردار کی تنبیہ زید کے اُونٹ کا عمرو کے اُونٹ کو ہلاک کرنے

کے لئے کافی ہے؟

جواب:- اگر سوال میں مندرجہ تمام واقعات درست ہیں، اور زید نے واقعہ عمرو کی

اجازت اور اطلاع کے بغیر اپنے شریر اُونٹ کو عمرو کے اُونٹوں کے باڑے میں چھوڑا تھا تو صورت

مسئولہ میں زید پر عمرو کے ہلاک شدہ اُونٹوں کا ضمان واجب ہے، بشرطیکہ سوال میں مندرج قرائن اس

قدر واضح ہوں کہ بستی کے تجربہ کار لوگوں کو اس بات کا گمان غالب ہو جائے کہ عمرو کے اُونٹوں کو زید

کے اُونٹ ہی نے ہلاک کیا ہے، اس مسئلے میں فقہائے کرام کی متعلقہ تصریحات حسب ذیل ہیں:-

فتاویٰ بزازیہ میں ہے: ”فی دارہ أبعرة أدخل عليها آخر بعيرًا مغتلمًا أو غير مغتلم

بإذن صاحبها فقتل الداخل ذلك الأبل لا يضمن، وإن بلا اذنه يضمن.“ (بزازیہ علی هامش

(۱)

الهنديہ ج: ۶ ص: ۴۰۳)۔

(۱) هامش الهندي (الرابع في الجنایة علی غیر بنی آدم... الخ) (طبع رشیدیہ کوئٹہ).

وفی رد المحتار، کتاب الجنایات، باب جنایة البهيمه والجنایة علیها ج: ۶ ص: ۶۱۲ (قبیل باب جنایة المملوک والجنایة علیہ) (طبع سعید) اذا كان فی داره بعیر فأدخل علیه آخر بعیرًا مغتلمًا أو لا فقتل بعیرہ ان بلا اذن صاحبها یضمن كما فی البزازیة أقول ویظهر أرجحیة هذا القول لموافقتہ لما مرّ أول الباب من أنه یضمن ما أحدثته الذابة مطلقًا اذا أدخلها فی ملک غیرہ بلا اذنه لتعديہ.... الخ.

وفی مجمع الضمانات الفصل الخامس فی جنایة البهيمه ج: ۴ ص: ۴ وان أدخل بعیرًا مغتلمًا فی دار رجل وفی الدار بعیر صاحب الدار فوقع علیه المغتلم اختلفوا فیہ قال بعضهم لا یضمن صاحب المغتلم وقال الفقیہ أبو اللیث ان أدخله باذن صاحب الدار لا یضمن وان أدخله بعیر اذنه ضمن وعلیه الفتوی لأن صاحب المغتلم وان كان مسببا فاذا أدخله باذنه لم یکن متعديا وان أدخل بعیر اذنه كان متعديا فیضمن کمن ألقى حیة علی انسان فقتله كان ضامنا.

وفی الهنديہ، کتاب الجنایات، الباب الثانی عشر فی جنایة البهائم والجنایة علیها ج: ۶ ص: ۵۲ (طبع رشیدیہ کوئٹہ) رجل أدخل بعیرًا مغتلمًا فی دار رجل وفی الدار بعیر صاحبها فوقع علیه المغتلم فقتله اختلف المشائخ رحمهم الله فیہ منهم من قال لا ضمان علی صاحب المغتلم وقال بعضهم ان أدخل صاحب المغتلم بعیر اذن صاحب الدار فعليه الضمان وان كان أدخله بلا اذنه فلا ضمان وبه أخذ الفقیہ أبو اللیث رحمه الله تعالى وعلیه الفتوی کذا فی المحيط.

وفی الهنديہ، کتاب الغصب، الباب الرابع عشر فی المتفرقات ج: ۵ ص: ۱۵۲ (طبع رشیدیہ کوئٹہ) وان أدخل فی دار رجل بعیرًا مغتلمًا وفی الدار بعیر صاحب الدار فوقع علیه المغتلم اختلفوا فیہ قال الفقیہ أبو اللیث ان أدخله باذن صاحب الدار لا یضمن وان أدخله بعیر اذنه یضمن وعلیه الفتوی.... الخ.

ربط حماره فی ساریة فجاء آخر بحماره وربطه، فعضّ أحدهما الآخر وهلك إن
فی موضع لهما ولاية الربط لا یضمن، وإلا ضمن، بأن لم یکن ذلك الموضع طریقاً ولا ملكاً
لأحد لا یضمن إذا کان فی المكان سعة، وفی الطريق یضمن لأن الربط ثمة جنایة. (حواله مذکوره و
شامی ج: ۴ ص: ۳۹۲)۔^(۲)

اور ایسے مواقع پر ایسے قرائن کی بنیاد پر ضمان عائد کیا جاسکتا ہے جن کی موجودگی میں ظن
غالب قائم ہو جائے، چنانچہ معین الحکام میں ہے: ”على الناظر أن يلحظ الأمارات والعلامات إذا
تعارضت، فما ترجح منها قضی بجانب الترجيح وهو قوة التهمة، ولا خلاف فی الحکم بها
وقد جاء العمل بها فی مسائل اتفق عليها الطوائف الأربع من الفقهاء.“ (معین الحکام
ص: ۲۰۳، باب: ۵۱، فی القضاء بما یظهر من قرائن الأحوال والامارات). هذا ما عندی

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

ھ ۱۳۹۷/۶/۷

(فتویٰ نمبر ۵۷۰/۲۸ ب)



(۱) البزازیة علی هامش الهندیة، کتاب الجنایات (الرابع فی الجنایة علی غیر بنی آدم.... الخ) ج: ۶ ص: ۴۰۳ (طبع رشیدیہ کوئٹہ).

(۲) وفی الشامیة، باب جنایة البهیمة والجنایة علیها قبیل باب جنایة المملوک والجنایة علیہ ج: ۶ ص: ۲۱۲ (طبع سعید) ربط حماره فی ساریة فربط آخر حماره، فعض حمار الأول ان فی موضع لهما ولاية الربط لا یضمن وإلا ضمن ملخصاً واللہ تعالیٰ اعلم.

﴿کتاب الصلح﴾ (صلح کے مسائل کا بیان)

کلیم کے ذریعے حاصل کی گئی جائیداد سے بدلِ صلح لے کر دستبردار
ہونے والے کو دوبارہ مطالبے کا اختیار نہیں

سوال:- الف:- محمد اسماعیل ولد حاجی اللہ دیا، ساکن سرگودھا (داماد)

ب:- ملک دین محمد، ساکن کراچی (سسر)۔

ج:- اصل دکان دار جس سے پکڑی پر ”الف“ نے عارضی طور پر دکان خریدی۔

”الف“ نے ”ج“ سے تقریباً تین ہزار روپے میں پکڑی پر دکان خریدی، (تحقیق معلوم نہیں) یہ صرف ”الف“ کی زبانی ہے، یہ سرکاری طور پر بیع نہیں ہو سکتی تھی لیکن ایک شرط پر کہ مہاجر کو متروکہ جائیداد کے بدلے پاکستان کی متروکہ جائیداد مل سکتی ہے، چونکہ ”الف“ کے پاس کوئی جائیداد نہیں تھی، بدیں وجہ ”الف“ نے ”ب“ کی متروکہ جائیداد کا کلیم حاصل کیا، جو کہ پانچ ہزار کا تھا۔ ”ب“ نے اس شرط پر کلیم دیا کہ آدھی دکان ”الف“ کی ہوگی اور آدھی ”ب“ کی ہوگی، یہ سب زبانی اقرار ہوا جس کو ”الف“ نے بخوشی قبول کیا۔

لیکن سرکاری طور پر یہ دکان بہ قیمت پانچ ہزار میں مل جانے پر ”الف“ نے بدعہدی کی، اور پانچ ہزار کے کلیم کا آدھا حصہ دینا چاہا، لیکن ”الف“ کے والد کے ڈانٹنے پر کلیم یعنی پانچ ہزار نقد ادا کر دیا (بذریعہ اقساط) چونکہ ”ب“ کی مالی حالت اچھی نہ تھی دوسرے رشتہ داری کا معاملہ، تیسرے بوجہ مجبوری کلیم کی رقم وصول کر لی، اب جواب طلب امر یہ ہے کہ کیا ”ب“ کا آدھا حصہ برقرار ہے (بشرطیکہ پورے خرچ کا آدھا حصہ ادا کر دے) یا کہ نہیں؟

کیا ”الف“ از روئے شرع بدعہدی کا گنہگار ہے یا کہ نہیں؟ اگر ہے تو کیا اپنے آپ کو اللہ کی پکڑ سے بچنے کے لئے آدھی دکان دیدے، اس دکان سے برسوں سے تین سو، چار سو، پانچ سو ماہوار

کرایہ کھا رہا ہے، اب مرتے وقت مسجد کے نام اللہ کے نام پر دکان دے رہا ہے، کیا یہ جائز ہے؟
 جواب:- کلیم کے ذریعے حکومت جو جائیداد کسی کو دیتی ہے وہ حکومت کی طرف سے اُس کو عطیہ ابتدائی ہوتا ہے، اور اُس کا مستحق وہی شخص ہوتا ہے جس کے کلیم پر وہ جائیداد عطا کی گئی، لہذا کلیم میں حاصل ہونے والی اس دکان کا اصل مستحق ”ب“ تھا، لیکن اس نے ”الف“ کو آدھی دکان دینے کا جو معاہدہ کر لیا، یہ درحقیقت کلیم حاصل کرنے کی اجرت تھی (جو جعالہ یا سمرہ کے اصول پر درست ہو سکتی ہے)، لہذا ”الف“ پر واجب تھا کہ وہ دکان کا آدھا حصہ خود رکھے، اور آدھا حصہ ”ب“ کو دے، اُس نے اس معاہدے کی خلاف ورزی کر کے بدعہدی کا گناہ کیا، لیکن جب اس نے پانچ ہزار روپے کی رقم ”ب“ کو دے دی اور ”ب“ نے وہ رقم بغیر کسی اعتراض کے رکھ لی اور اس وقت دکان کے نصف حصے کا مطالبہ نہیں کیا، تو فقہی اعتبار سے وہ بدل صلح لے کر دکان سے دستبردار ہو گیا، اب پوری دکان ”الف“ کی ہو گئی، ”الف“ کو چاہئے کہ اس نے شروع میں جو بدعہدی کی تھی اُس پر توبہ و استغفار کرے، اور ”ب“ سے بھی اس پر معافی مانگے، لیکن بدل صلح وصول کرنے کے بعد ”ب“ اس دکان سے دستبردار ہو چکا ہے، لہذا اب دکان ”الف“ ہی کی ہے، اب اس پر اس کا نصف حصہ ”ب“ کو دینا واجب نہیں۔^(۴)

واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم

۱۳۹۶/۱۱/۲۸ھ

(فتویٰ نمبر ۲۷۵۰/۲۷ و)



(۱ تا ۴) وفي الدر المختار، كتاب الصلح ج: ۵ ص: ۶۲۹ (طبع سعيد) وحكمه وقوع البراءة عن الدعوى ووقوع الملك في مصالح عليه وعنه لو مقراً أو هو صحيح مع اقرار أو سكوت أو انكار فالأول حكمه كبيع ان وقع عن مال بمال وحينئذ فتجرى فيه أحكام البيع. وفي الشامية تحته (قوله كبيع) أي فتجرى فيه أحكام البيع فينظر ان وقع على خلاف جنس المدعى فهو بيع وشراء كما ذكر هنا وان وقع على جنسه فان كان بأقل من المدعى فهو حط وإبراء..... اعتبر بيعاً ان كان على خلاف الجنس..... الخ.

﴿ کتاب الوكالة ﴾ (وکالت کے مسائل کا بیان)

عقد وکالت میں مضاربہ کے طور پر ادھار چیز فروخت کرنے اور
وکیل سے فوری ثمن کی ادائیگی کا مطالبہ کرنے کا حکم

سوال:- فضيلة القاضي محمد تقی العثماني المحترم

السلام عليكم ورحمة الله وبركاته

تنوی شركة تيباستی لتجارة السيّارات شراء سيّارات من شركة تويوتا اليابانية
بطريقة الدفع المؤجل بعد ١٨٠ يوماً من تاريخ استلام البضاعة وترغب المضاربة الاسلامية
الدخول في هذه الصفقة حسب الخطوات التالية:-

١- تقوم شركة تويوتا بتعيين المضاربة الإسلامية وكيلة لها فيما يتعلق بتداول
ومعالجة جميع وثائق إتمام العملية بما في ذلك سندات الدفع والضمانات والأموال الأخرى
المتعلقة بها.

٢- تقوم المضاربة الإسلامية بإبلاغ شركة تيباستی بأمر تعيين المضاربة وكيلة
لتويوتا لهذه العملية وتحصل على قبولها بذلك.

٣- تقوم المضاربة بدفع قيمة السيّارات إلى شركة تويوتا فور تسلم شركة تيباستی
لهذه السيّارات وذلك بعد خصم نسبة مئوية من هذه القيمة كعمولة للمضاربة بصفتها
وكيلة للشركة البائعة.

٤- تقوم المضاربة بتحصيل كامل قيمة السيّارات لحسابها من شركة تيباستی بعد
١٨٠ يوماً من تاريخ استلامهم لهذه السيّارات.

أرجو من فضيلتكم التكرم بابداء رأيكم بصحة هذه العملية من الوجهة الشرعية
ليسنى اعتمادها أو تعديلها بما هو مناسب وذلك قبل الشروع بها.

زياد على صبري

مدير برج المؤسسة العربية المصرفية المنطقية المنامة دولة البحرين

جواب :-

الى سيادة الأخ زياد على صبرى

مدير المضاربة الاسلامية فى المؤسسة العربية

السلام عليكم ورحمة الله وبركاته

استلمت رسالتكم التى سئلتم فيها عن شرعية عقد الوكالة مع شركة تويوتا ونظرت فى شرط هذا العقد، فتبين لى أن هذا العقد يمكن بطريقتين، أحدهما جائز، والآخر غير جائز. الأول أن تلتزم المضاربة الاسلامية فى عقد الوكالة مع شركة تويوتا (وهى البائعة) أنها ستقوم بدفع الثمن إليها من قبل شركة تيباستى (وهى المشتريّة) فور استلامها للسيارات. وباستلام الثمن منها عند حلول أجل ١٨٠ يوماً فهذا الشرط فى عقد الوكالة شرط فاسد لا يجوز شرعاً، وذلك لأن مقتضى هذا الشرط من قبل الموكل أنه توكل ببيع السيارات بثمن مؤجل على أن يدفع الوكيل الثمن إلى الموكل حالاً. وهذا مناقض لعقد الوكالة^(١).

والطريق الثانى: أن لا يشترط ذلك فى عقد الوكالة مع شركة تويوتا بل توكل شركة تويوتا المضاربة الاسلامية ببيع السيارات بيعاً حالاً وتعقد المضاربة الاسلامية البيع الحال مع شركة تيباستى، كوكيل عن شركة تويوتا، ثم تستقرض شركة تيباستى مبلغ الثمن من المضاربة الاسلامية بعقد منفصل من عقد البيع، وحينئذ تدفع المضاربة الاسلامية ثمن السيارات إلى شركة تويوتا بعد خصم أجرة الوكالة منه ثم تدفع شركة تيباستى المبلغ المستقرض من المضاربة بكامله.

وهذا الطريق جائز شرعاً ما دام كل من عقد الوكالة وعقد البيع وعقد الاستقراض منفصلاً عن الآخر^(٢).

والله سبحانه وتعالى أعلم

١٣٠٨/١١/٢٨ هـ

(فتاوى رقم ٣٩/٢٣٩٣ ج)



(١) فى الدر ج: ٥: ص: ٥٢٢ (طبع سعيد) وصح بالنسبة ان التوكيل بالبيع للتجارة وان كان للحاجة لا يجوز..... لكنه لا يطالب الا بعد الاجل كما فى تنوير الأبصار.

(٢) فى مسند أحمد بن حنبل رقم: ٣٤٨٣ ج: ٣: ص: ٣٠ (طبع دار الحديث القاهرة) نهى رسول الله صلى الله عليه وسلم عن صفقتين فى صفقة واحدة. نيز دیکته: ص: ٤٨: كاشيه نمبر ٥٤: كاشيه نمبر ٢٠١.

﴿ کتاب القسمۃ ﴾ (تقسیم کے مسائل کا بیان)

چار بھائیوں کے درمیان زمین کی تقسیم پر تنازعے کا حل

سوال :- حاجی علی محمد صاحب ۱۹۲۸ء میں فوت ہوئے، ان کے چار بیٹے محمد علی، محمد شریف، محمد عارف اور انور علی تھے، ۹۲ ایکڑ رقبہ بذریعہ ثالثان چار حصوں میں برابر تقسیم کر کے قرعہ اندازی سے خانگی تقسیم کی گئی، محکمہ مال میں مشترکہ کھاتہ رہا، محمد علی اپنے قرعے کے مطابق اپنے حصے کا رقبہ لے کر جدا ہو گیا، باقی تین بھائی دو سال اکٹھے رہنے کے بعد ان میں سے ایک بھائی محمد عارف بھی قرعہ والا رقبہ لے کر جدا ہو گیا، رقبے میں کوئی فرق تاحال نہ آیا تھا، اس کے بعد پتہ چلا کہ محمد شریف کے حصے والے رقبے میں ۱۱۵ ایکڑ کا پانی نہیں ہے جو کہ بارانی قسم کا ہے، باقی تین بھائیوں کے حصے میں تمام نہری قسم کا رقبہ ہے، محمد شریف نے پنچایت کی کہ بارانی قسم والا رقبہ حصہ رسدی تقسیم ہونا چاہئے جو کہ لاعلمی کی وجہ سے اکیلے محمد شریف کے حصے میں ان کی قدر رقبہ یعنی بارانی قسم کا ہے اس کی وجہ یہ تھی کہ تین بھائیوں کے حصے میں پندرہ پندرہ ایکڑوں میں کہیں کہیں کھڑ والا رقبہ تھا، محمد شریف کے حصے میں (پندرہ ایکڑ میں) بھی کہیں کہیں ٹیلہ تھا، پنچایت نے فیصلہ کیا کہ دوبارہ تقسیم کر لی جائے، لیکن دو بھائی محمد علی اور محمد عارف نے کہا کہ اب ہم دوبارہ تقسیم نہیں کرتے، اور نہ ہی خرچہ ان کی مدد کا ادا کرتے ہیں، لہذا محمد شریف اور انور علی دو بھائی اکٹھے رہ رہے تھے اور ان کے قبضے کے رقبات بھی اکٹھے تھے، ان دونوں نے مل کر محکمہ انہار میں دعویٰ کر دیا، دونوں بھائیوں نے اپنے خرچے سے ان ٹیلوں کو آباد کیا، محکمہ انہار میں ۱۵ سال دعویٰ دائر رہا، فیصلہ ہوا کہ بارانی قسم کی بری قسم میں منظور کیا جاتا ہے۔ دونوں بھائی اتفاق و محبت سے کئی سال تک اکٹھے رہے اب جھگڑا پڑ گیا ہے، محمد شریف کہتا ہے کہ میں وہی رقبہ جو کہ آج سے پچیس سال پہلے میرا حصہ تھا وہی لے کر جدا ہوں گا، انور علی کہتا ہے کہ ہم دونوں بھائیوں والا حصہ ازسرنو تقسیم ہو، کیونکہ رقبے میں کافی فرق آچکا ہے، محمد شریف کے سوا تمام ۱۲۳ ایکڑ اراضی اچھی حالت میں ہیں، انور علی کے پندرہ ایکڑ کھڑ ہو چکے ہیں، شرعاً کیا فیصلہ ہے کہ چاروں بھائی ازسرنو تقسیم کریں یا صرف ہم شریف اور انور علی کی زمین ہی ازسرنو تقسیم ہو، یا بالکل نہ ہو؟

جواب :- صورت مسئلہ میں محمد شریف اور انور علی کو صرف اپنے اپنے حصوں کی تقسیم ازسرنو کرنی چاہئے، دراصل جب چاروں بھائیوں کے درمیان زمین تقسیم ہوئی اُس وقت یہ غلطی رہ گئی کہ

لا علمی کی وجہ سے ایک حصے میں پندرہ ایکڑ رقبہ بارانی آگیا، جبکہ باقی تمام حصوں میں رقبہ نہری تھا، اُس وقت محمد شریف نے تقسیم پر جو اعتراض کیا وہ درست تھا، اور چاروں بھائیوں کو چاہئے تھا کہ تقسیم ازسرنو کرتے (کما يفهم من العبارة الأولى)۔ لیکن جب دوسرے بھائیوں نے ازسرنو تقسیم کرنے سے انکار کیا تو محمد شریف زمین کو نہری قرار دینے کی درخواست دے کر اور انور علی کے ساتھ شرکت کر کے عملاً دوبارہ تقسیم کے حق سے دستبردار ہو گیا، اب انور علی کے ساتھ شرکت قائم کرنے سے ان دونوں کے درمیان جو تقسیم ہوئی تھی وہ فسخ ہو گئی، اور محمد شریف اور انور علی کے حصوں کی زمین ان دونوں کے درمیان پھر سے مشترک ہو گئی، (کما يفهم من العبارة الثانية)۔ اب جبکہ یہ دونوں الگ ہونا چاہتے ہیں انہیں ازسرنو تقسیم کر کے الگ ہونا چاہئے، اس سلسلے میں عبارات فقہیہ درج ذیل ہیں:-

العبارة الأولى:- "إذا اقتسما داراً فلما وقعت الحدود بينهما إذا أحدهما لا طريق له فإن كان يقدر على أن يفتح لنصيبه في حيزه طريقاً آخر فالقسمة جائزة وإن كان لا يقدر على أن يفتح لنصيبه طريقاً إن علم وقت القسمة أن لا طريق له فالقسمة جائزة وإن لم يعلم فالقسمة فاسدة." (عالمگیریہ ج: ۵ ص: ۲۱۱، کتاب القسمة، باب: ۳)۔^(۱)

العبارة الثانية:- "القسمة تقبل النقص، فلو اقتسموا وأخذوا حصتهم ثم تراضوا على الاشتراك بينهم صح) وعادت الشركة في عقار أو غيره لأن قسمة التراضي مبادلة ويصح فسخها ومبادلتها بالتراضي" (درمختار مع شامی ج: ۵ ص: ۱۷۰، کتاب القسمة)۔^(۲)
هذا ما ظهر لي

والله سبحانه وتعالى أعلم

۱۳۹۶/۱۲/۲۳ھ

(فتویٰ نمبر ۲۸۲۳/۲۷ و)

(۱) وفي الهداية ج: ۳ ص: ۲۱۷، كتاب القسمة (طبع شركت علميه).

وفي البسر الرائق، كتاب القسمة (طلب بعض الشركاء القسمة) ج: ۸ ص: ۱۵۳ (طبع سعيد) ولو أقسموا داراً فإذا لا طريق لأحدهم وقدر على أن يفتح في نصيبه طريقاً يمر فيه الرجل دون الحموله جازت القسمة لأنها لم تتضمن تفويت منفعة وإن لم يقدر ينظر إن لم يعلم أنه لا طريق له فالقسمة فاسدة وإن علم أنه لا طريق له جازت القسمة لأنه رضى بهذه القسمة.

وفي المحيط البرهاني، كتاب القسمة، فصل في بيان ما يقسم وما لا يقسم... الخ ج: ۱۱ ص: ۱۵۰ (طبع ادارة القرآن) وإذا اقتسم الرجلان داراً فلما وقعت الحدود بينهما فإذا أحدهما لا طريق له فإن كان يقدر على أن يفتح في حيزه طريقاً في القسم جائز وإن كان لا يقدر أن يفتح لنصيبه طريقاً فإن لم يعلم وقت القسم أن لا طريق له فالقسمة فاسدة لأنها تضمنت تفويت منفعة على بعض الشركاء بغير رضا وإن علم وقت القسمة أن لا طريق له فالقسمة جائزة... الخ.

(۲) الدر المختار ج: ۶ ص: ۲۶۸ (طبع سعيد)

وفي بدائع الصنائع، كتاب القسمة، فصل وأما صفات القسمة... الخ ج: ۷ ص: ۲۸ (طبع سعيد)
وأما في قسمة التراضي فيجوز الرجوع لأن قسمة التراضي لا تتم إلا بعد خروج السهام كلها وكل عاقد بسبيل من الرجوع عن العقد قبل تمامه كما في البيع نحوه.

وفيه أيضاً ج: ۷ ص: ۲۶ (طبع سعيد) إن قسمة الجمع في الدور بالتراضي جائزة بلا خلاف ومعنى المبادلة وإن كان لازماً في نوعي القسمة لكن هذا النوع بالمبادلات أشبه وإذا تحققت المبادلة صح البناء... الخ.

تبصرے

مُتَعَدِّدِ کُتَابُوں پَر تَحْرِیْکَے گئے تبصروں کا مُجْمُوع

حَضْرَتِ مولانا مُفْتِی مُحَمَّد تَقِی عُمَا نِی صابِ دَا مَنّتِ کَا تَم

تَرْتِیْبَے

مولانا مُحَمَّد حَنِیْف خَالِد

اُمّتَاذِ جَامِعَۃ دَا رِ الْعُلُوْم کَراچی

مِکْتَبَتُ مِجَارِ الْفِیْزِ کَراچی